ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

ج : ۵
ش : ۱

جنوری ۱۹۸۸ء

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

☆ محترمہ عائشہ بیگم رباب ☆ یوسف ناظم ☆ ڈاکٹر محمد یوسف الدین
☆ پروفیسر رضی الدین احمد ☆ منیر احمد صدیقی ☆ محمد منظور احمد منظور
☆ اے جی فاروقی ☆ ڈاکٹر نشاء الرحمٰن خان نشا ☆ پروفیسر میر تراب علی

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپئے	150 روپئے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپئے
دوسال	90 ,,	270 ,,	65 ,,	36 ,,	225 ,,
تاحیات	1000 ,,	2500 ,,	450 ,,	300 ,,	2000 ,,

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 147-5-11، ریڈہلز - حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپواکر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈہلز، حیدرآباد 500004، آندھراپردیش سے شائع کیا: ٹیلیفون: 229161

فہرست

حرفِ اول

① نوبت پہاڑ کے بلند و بالا مقام اور انتہائی پر فضا ماحول میں واقع برلا پلانے ٹیریم
ں ۲۲/ ڈسمبر ۱۹۸۷ء کو قدیم ہندوستانی علم فلکیات پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار کو خطاب کرتے
ے ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا "ہماری نئی قومی تعلیمی پالیسی کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ ہمارے
ں میں تجسس اور کھوج کی صلاحیت کو اجاگر کیا جائے، ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نمایاں کیا جائے
ان میں جو متعدد عظیم سائنسدان، مفکر اور محقق چھپے ہوئے ہیں انہیں سامنے لایا جائے تاکہ
ہمارے مشہور عالم عظیم ماہر فلکیات ڈاکٹر جینت نارلیکر اور آنجہانی وینو باپو کے ہمرکاب
ہم پلہ ہو سکیں۔ پروفیسر سی۔ الوانی زلوسکا، صدر انٹرنیشنل اسٹرانومیکل یونین نے اپنے خطاب
ں مطالبہ کیا کہ اسکول کے نصاب میں جدید علم فلکیات کو شریک کر کے بچوں میں اس علم سے
لچسپی پیدا کی جانی چاہئیے۔ انھوں نے کہا جہاں دنیا کی ۲۵ فی صد جامعات میں یہ علم شریک نصاب
ہے صرف چار ممالک ایسے ہیں جہاں اسکول میں اسے پڑھایا جاتا ہے اور وہ ملک یونان،
جنٹائن، جی ڈی آر اور یو ایس ایس آر ہیں۔ پروفیسر جینت نارلیکر نے "اسکائی شو"
اپنی تقریر میں بتایا کہ فلکیاتی تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور اس کام میں پلانے ٹیریم سے بڑی
دد ملتی ہے۔ نیز اس سے نان فارمل تعلیم میں بھی استفادہ کیا جا رہا ہے۔ مسٹر جی۔ پی۔ برلا
اپنے خیر مقدمی خطاب میں بتایا کہ پلانے ٹیریم میں ایک سائنس و ٹکنالوجی سنٹر اور سائنس میوزیم
م ہو نگے۔ میوزیم کے ماڈلوں سے بچوں کو موقع ملے گا کہ وہ سائنسی کھیل کھیلیں اور سائنسی
ات سے واقف ہو سکیں، انھوں نے بتایا کہ جدید پلانے ٹیریم مدراس اور جے پور میں بھی
ئے جائیں گے۔ نوبت پہاڑ پلانے ٹیریم میں ایک سفید چھتری نما گنبد ہے جو درحقیقت
یلان کا دائرہ نما اسکرین ہے جو ایک پروجیکٹر کے ساتھ مربوط ہے جس کے ذریعہ رات
ے وقت آسمان کی کیفیت، تارے اور ان کے محل وقوع کی عکاسی کی جاتی ہے۔ منی پلانے ٹیریم
دسرے مقامات پر لے جا کر بھی علم فلکیات اور کائنات کے رازوں کی نمائش کی جا سکتی ہے
پلانے ٹیریم میں خلاء سے متعلق ویڈیو فلموں کی نمائش اور تصاویر کے ذریعہ لکچرس کا بھی انتظام

ماہنامہ شاداب حیدرآباد جنوری ۱۹۸۸ء

۴

ملک بھر میں آرسنٹرڈ اسکول اور اسکائی شو اسپشل لئے کے بچوں کے اسکول یہاں پہنچا اپنی نوعیت کا عصری سہولت ہے جس کا مقصد بچوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنا اور اسے فروغ دینا ہے۔

حیدرآباد کے سمینار میں امریکہ، برطانیہ، چین، مغربی جرمنی، سعودی عرب، پولینڈ آسٹریا، ایران اور انڈونیشیا کے سرکردہ ماہرین فلکیات نے حصہ لیا۔ اس بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کرکے ایک بار اور اس شہر نے ایک نہایت اہم سمت میں ملک کی رہنمائی کی ہے اور ایسے راستے کی نشاندہی کی ہے جس پر چل کر اس علم میں ہندوستان کی قدیم مہارت کو نہ صرف پھر سے حاصل کیا جاسکتا ہے بلکہ رہنمائی کا منصب دوبارہ پالیا جاسکتا ہے۔ اب یہ ہمارے ماہرین تعلیم کا کام ہے کہ بچوں کو سائنس ٹکنالوجی کے ان مراکز سے استفادہ کی طرف راغب کریں اور ان میں سائنسی مزاج پیدا کریں تاکہ وہ ان مراکز سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کے راستے طے کریں۔

(۲) اعلیٰ ریاضی سے متعلق قومی اوارڈ کی جانب سے ماہر ریاضیات سرینواسا راما نجم کی سالگرہ تقریب سے مدراس میں ۲۲/ڈسمبر ۱۹۸۷ء کو خطاب کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا کہ خداداد قابلیت کے حامل سرینواسا راما نجم اگر کسی امتحان میں کامیاب نہ ہوسکے تو اس سے ان کی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ ملک کے تعلیمی طریقۂ کار کی خرابی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اسی لئے اب نئی قومی تعلیمی پالیسی کا نفاذ کیا جارہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ بچوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں مواقع فراہم کئے جائیں، ہر قسم کی مدد دی جائے تاکہ راما نجم جیسے ریاضی کے ماہر بھارت میں پھر سے پیدا ہوں، ہندوستان نے بھاسکرا کے زمانے میں ریاضی کے میدان میں دنیا کی قیادت کی، اس کے بعد (۸۰۰) سال تک خواب خرگوش میں پڑا رہا۔ تا آنکہ راما نجم نے ریاضی میں نام پیدا کیا، اس کے بعد پھر ہم پیچھے پڑ گئے اب وقت آگیا ہے کہ سائنس ٹکنالوجی کے میدان میں ہم پھر سے آگے بڑھیں اور اسکولی بچوں کی صلاحیتوں کو بیدار کریں تاکہ وہ ہندوستان کی قدیم عظمت کو دوبارہ حاصل کرلیں۔ کیا ہمارے وزیر اعظم کی یہ ایسی خواہش نہیں ہے کہ ہم اس کی تکمیل کے لئے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مصروف عمل ہوجائیں؟

(۳) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں قومی اجلاس منعقدہ مدراس میں بتاریخ ۲۴/ڈسمبر ۱۹۸۷ء ہمارے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے کہا کہ آنجہانی وزیر اعظم

بھی اندرا گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام سے اقلیتی طبقے کو فائدہ ہوا اور اس کی تعلیمی سطح
میں اضافہ ہوا تاہم موصوف نے اس کا اعتراف کیا کہ مختلف وجوہ کی بناء پر مسلم فرقہ تعلیمی اعتبار سے
ت پیچھے ہے خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا اوسط تو بہت کم ہے۔ اس خصوص میں اقلیتی تعلیمی اداروں
لیمی میدان میں اہم کردار ادا کرنا چاہئے۔ خصوصاً یہ ادارہ جو اس کانفرنس کا میزبان ہے جو اپنے
نتظام تقریباً چار سو ادارے چلا رہا ہے اسے اس سمت میں قیادت و رہنمائی کرنی چاہئے۔

ر اعظم نے کہا کہ مرکزی حکومت نے جدید قومی تعلیمی پالیسی نافذ کی ہے جس کا مقصد محض ڈگریوں
صول نہیں ہے بلکہ پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف زیادہ رغبت پیدا کرکے تعلیم کو ہر لحاظ سے نفع آور بنانا ہے
سوسائٹی کے صدر اور سابق مرکزی وزیر مملکتی برائے امور خارجہ مسٹر اے اے رحیم نے
زی اور ریاستی حکومتوں پر زور دیا کہ وہ تعلیمی طور پر پس ماندہ طبقوں کو ٹکنکی اور پیشہ ورانہ تعلیمی
روں کے قیام کے لئے زیادہ سے زیادہ منظوریاں دے۔

مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے مسلمانوں کے تعلیمی اور معاشی مسائل پر حکومت کو توجہ دلائی
، ۔ خود بھی اس سمت میں کافی کام کیا ہے۔ مسلمانوں کے دوسرے ادارے بھی اس جانب متوجہ ہیں
ن ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی جانب سے خاطر خواہ تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے برخلاف اس
، ریاستی حکومتوں کی جانب سے تو مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جارہی
)۔ ہماری ریاست میں میڈیکل، انجینئرنگ اور ایجوکیشن کالجوں کے راستے میں طرح طرح کی
لات پیدا کی گئیں اور ان کالجوں کو اپنی بقا کے لئے سپریم کورٹ تک جانا پڑا۔ اب وقت آگیا ہے
سلمانوں کے تعلیمی اداروں اور اردو کی بقا اور ترقی کے لئے مرکزی حکومت آگے بڑھے اور
استی حکومتیں جو رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں انہیں نہ صرف دور کرے بلکہ ان اداروں کی بقا اور
ستحکام کے لئے امداد بھی مہیا کرے اور ایسے حالات پیدا کرے کہ دستور کے تحت دئے گئے
ضمانات سے اقلیتیں استفادہ کرسکیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوکر بھارت کی ترقی میں اپنا
ستحقہ حصہ ادا کرسکیں۔ یہ ایک خوش آئند امر ہے کہ وزیر اعظم نے مدراس میں منعقدہ مسلم
یجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی۔ ساتھ ہی مرکز کے متعدد وزراء بھی کانفرنس میں شریک
ہے، لیکن صرف شرکت کافی نہیں ہے ضرورت ہے کہ اقلیتوں کے مسائل میں عملی اور ٹھوس
ماون کیا جائے اور زبانی وعدوں کا رویہ ترک کر دیا جائے تاکہ صحت مند ترقی یافتہ
قلیت ملک کے استحکام کا باعث بنے

(۴) "شاداب" نے اپنی عمر کے چار سال پورے کرلئے ہیں اور پانچویں سال میں قدم

باقی بر صفحہ (۶۴)

ماہنامہ شاداب حیدرآباد　　　　جنوری ۱۹۸۸ء

ڈاکٹر مجید بیدار

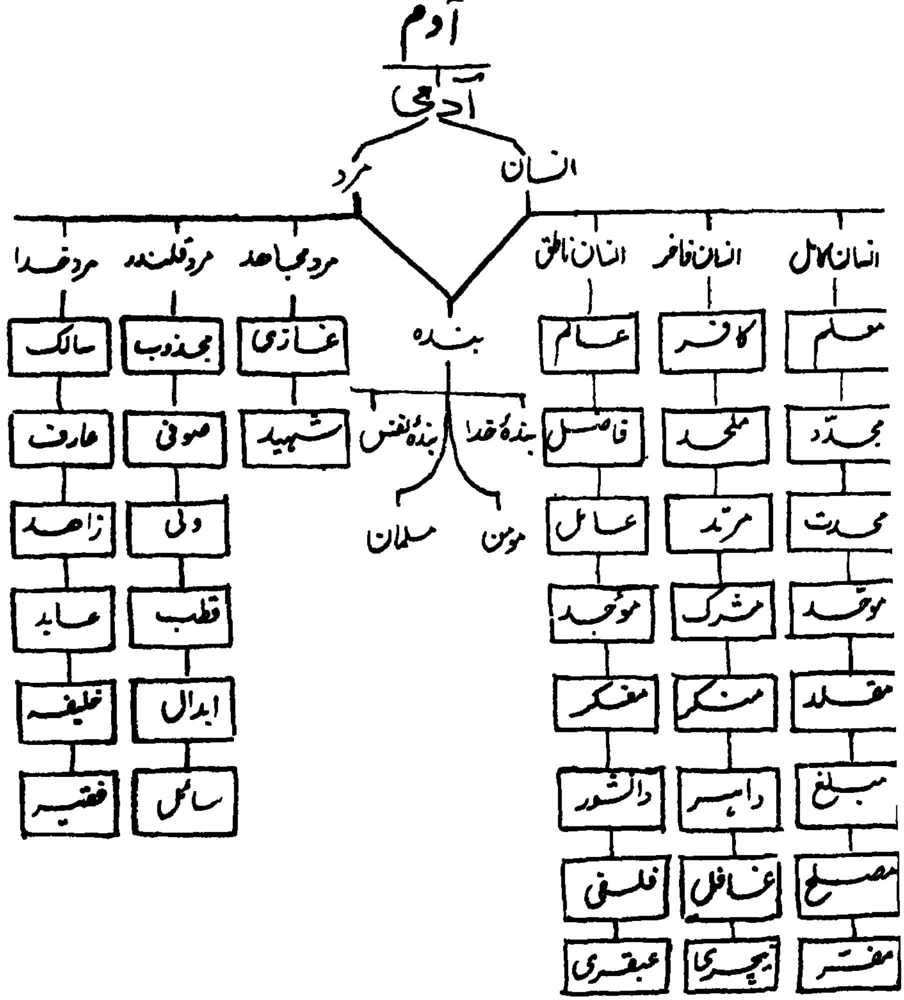
قرآن کی رو سے

کائنات میں انسان کا موقف

فلسفہ، منطق، سائنس، عمرانیات اور فطرت کے مطالعہ کی طرح علوم قرآنی کا مطالعہ بھی کئی تقاضے رکھتا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن حکیم نے انسانی شعور و دانش پر انقلابی اثرات مرتب کئے ہیں اور اس کا سلسلہ ۱۴ سو سال سے جاری ہے۔ اس واضح حقیقت کو عقیدہ کے طور پر مان لینا تو عام بات ہے لیکن عقلی طور پر قبول کرنے کے لئے شہادتیں درکار ہیں۔ دور حاضر کے سائنسی اور ٹکنالوجی ذہن نے عقلی اور عملی شہادتوں کی بنیاد رکھ کر قرآنی علوم سے عقلی شہادتیں فراہم کرنے کی ذمہ داری نئی نسل کے عالموں کے سر دے دی ہے اور لازمی ہے کہ ہم اپنے عقیدہ کی حد میں رہتے ہوئے قرآنی تصورات اور اس کے تقاضوں کو سائنٹفک انداز میں پیش کریں۔ ڈاکٹر سید احمد معین الدین حبیبی نے اپنے مضمون " انسانی شعور و دانش پر قرآن حکیم کے اثرات " میں بجا طور پر کہا ہے کہ قرآن حکیم ایک " دستور العمل انسانی حقوق و وقار کا نقیب، انسانیت کے فوز و فلاح کا نصاب کامل اور ایک مکمل نظام حیات کا مظہر اور آئینہ دار ہے "۔ چودہ سو سال سے اس قسم کی توضیحات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ تاہم یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو کون کون سے موقف عطا کئے ہیں اور کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ قرآن حکیم نے انسان کو آدم، آدمی، انسان، بشر، مرد اور بندے کے موقف عطا کئے ہیں۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ، لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی، اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ، مِنْ کُلِّ رَجُلٍ تَسْعٰی جیسی آیات سے قرآن میں انسان کے موقف کا پتہ چلتا ہے جس کو بنیاد بنا کر ہم ایک ایسا تجزیہ تیار کر سکتے ہیں جس سے انسانی شعور و دانش پر

شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج اورنگ آباد

قرآن حکیم کے اثرات اور کائنات میں انسانوں کے موقف کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل میں شجرہ پیش ہے:



جس طرح انسان سے مراد انسان کامل، انسان فاخر اور انسان ناطق اور اس کی متعلقہ حیثیات لی جائیں گی، اسی طرح مرد کا موقف مرد مجاہد، مرد قلندر اور مرد خدا اور اس کی حیثیات سے قائم رہتا ہے۔ لفظ "بندہ" کی بندۂ خدا اور بندۂ نفس کے موقف کا حامل ہے۔ غرض قرآن حکیم کے الفاظ انسان، مرد، بندہ، اور آدمی کی توضیح کے لیے بیک وقت کائنات میں موجود انسان کی تمام حیثیات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے تب کہیں قرآن حکیم کے معنی و مفاہیم کی بازیافت ممکن ہے۔ انسان اور مرد کی یہ تمام خصوصیات معروضی [illegible] دنیا میں ان کا وجود ہے۔ انسان اور مرد کی

معروضیت Subjectivity اپنی جگہ اٹل ہے اور انسان اور مرد کی متعلقہ حیثیات جن کا تجزیہ میں ذکر کیا گیا ہے اپنی شناخت، بذات میں موجود معروضیت سے کرتی ہیں۔ قرآن حکیم میں انسان کو جس جس انداز سے مخاطب کیا گیا ہے ان عنوانات کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے ۔

آدم: سب سے پہلا وجود جسے زمینوں، آسمانوں، فرشتوں اور پہاڑوں پر افضلیت حاصل ہوئی۔

آدمی: تہذیب اور تمدن کے علاوہ آداب و مراتب سے زیادہ روایات اور رسومات کی پابندی کرنے والا

انسان: عقل، فراست، ذہانت اور فکر کی صلاحیت سے مالا مال، سوجھ بوجھ رکھنے والا، سود و زیاں کا ادراک

مرد: زندگی کو مخصوص لائحہ عمل کا تابع رکھ کر ذات کو فرزانگی کے حوالے کرنے والا۔ خدا پرست

بشر: خیر و شر سے آشنا، ضروریات زندگی اور فطری طور پر مجبور، تمام صلاحیتوں کا مجسم

بندہ: خود کو خدا کی خدمت اور انسانوں کی فلاح کے لئے عملی اور جسمانی طور پر پیش کرنے والا۔

مومن: ایمان پر قائم رہتے ہوئے احکامات اسلامی کی مکمل تعمیل کرنے والا، روحانی لذتوں سے آشنا۔

مسلمان: عبادتوں اور ریاضتوں سے خود میں نیکی پیدا کرنے اور باصلاحیت بننے کا خواہاں

ہر لفظ اپنے اندر معنی کی کئی تہیں رکھتا ہے۔ اس مختصر سی وضاحت کا مقصد یہی ہے کہ قرآن حکیم میں ہر لفظ اپنے معنی کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ انسان کو بشر کے ہم معنی سمجھنے یا پھر ایسے آدمی سے خلط ملط کر دینے سے معنی کی کئی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں چنانچہ احتیاط لازمی ہے۔ قرآن حکیم میں انسان کے تخاطب سے مختلف الفاظ استعمال کر کے خدائے بزرگ نے ہر لفظ کو معنویت کا پیراہن دیا ہے۔ آج کے دور میں انسان، مرد اور بندوں کی جتنی قسمیں موجود ہیں اور مومنین و مسلمین کا طرز دنیا میں دکھائی دیتا ہے ان تمام کا احاطہ قرآن حکیم نے چند الفاظ میں کر دیا ہے۔ زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا اور علوم و فنون کا ارتقا ہوگا انسان کے لئے قرآن حکیم میں مستعمل الفاظ کی تشریحات میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا ۔

شجرہ میں لکھے گئے ناموں اور ان کی خصوصیات سے آشنا کئی انسان دنیا میں دکھائی دیتے ہیں اور ہر فرد روزمرہ زندگی میں کئی خصوصیات کے انسانوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شجرہ میں درج شدہ ناموں سے زیادہ خصوصیات کے انسان روئے زمین پر پائے جائیں اور ان کے طرز عمل بھی تمام انسانوں سے جداگانہ ہوں لیکن ایک سوچتے ذہن اور دیکھتی آنکھ کی جہاں تک رسائی ہے اس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ شعور و دانش اور فہم و فراست کے علمبردار مزید کئی عنوانات اور تشریحات کے ذریعہ موسومات کی وضاحت کریں۔ اسی طرح شخص، فرد اور فنکار کی خصوصیات کی درجہ بندی بھی ضروری ہے۔ ایک طالب علمانہ کوشش کے ذریعہ چند پراگندہ خیالات کو قرطاس پر بکھیرا گیا ہے

باقی بر صفحہ (۶۴)

مولانا ڈاکٹر غلام محمد مدظلہ العالی

اُدعُوا اِلیٰ سَبِیلِ رَبِّکَ

نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا من یھدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ ورسولہ ، اما بعد ، فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، ادعوا الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ، صدق اللہ مولانا العظیم

ختم نبوت اس بات کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے کہ اب جو امت پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنالی ہے اس پیغمبرانہ دعوت کی ذمہ داری ساری امت پر ڈالی گئی ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح فرماتے ہیں کہ نبیؐ کی دو بعثتیں ہیں۔ انؐ کی بعثت اولیٰ تو وہ ہے کہ جو ان کی حیات مبارکہ میں انؐ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے اور نبیؐ بہ حیثیت داعی الی اللہ انسانیت کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سنتے جو لوگ اس پیغام کو قبول کرتے ہیں ان کا تزکیہ نفس کرتے ہیں ، ان کو تعلیم کتاب دیتے ہیں ، قرآن پاک رموز و اثرات ان پر کھولتے ہیں اور اپنی دعوت کے ذریعہ سے ایک طبقہ تیار کرتے ہیں جس میں سے ہر فرد کو وہ سند کمال عطا کریں ، ایسا طبقہ تیار کر کے وہ انسانیت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنے وقت موعود پر وہ اس دنیا سے پردہ فرما ہو جاتے ہیں۔

چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہوگیا اس لئے کارہائے نبوت کی ذمہ داری اب اس طبقہ پر منتقل ہوگئی اس امت کی ذمہ داری کو اور اس امت کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح نے نبیؐ کی بعثت ثانیہ قرار دیا ہے۔ اس طرح نبیؐ کی بعثت جو ان کی پردہ فرمائی کے بعد انسانیت کے لئے ہے وہ امت کی صورت میں ہے جو کام نبیؐ نے تنہا انجام دیا تھا اب من حیث الامت اس امت کو انجام دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو انسانیت تک قیامت تک کے لئے پیش کرتی رہے۔

ہم داعی بن کر اس دنیا میں زندہ رہیں گے اور ہمارے علاوہ دنیا میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے دین کا پرچار کرے، اس کی اشاعت کرے۔ ایک غیر مسلم نے مجھ سے پوچھا کہ جس طرح آپ اپنے دین کو حق سمجھتے ہیں ہم بھی اپنے دین کو حق سمجھتے ہیں اور جس طرح آپ کو اپنے دین کی اشاعت کا حق حاصل ہے ہم کو بھی حق حاصل ہے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ دین صرف اسلام ہے اور اس کی تبلیغ کا حق تنہا مسلمانوں اور امت مسلمہ کو ہی حاصل ہے اس کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے دیگر ادیان ہیں اور جتنی اور قومیں ان ادیان کو ماننے والی ہیں ان میں کے کسی داعی نے یہ دعویٰ نہیں کیا وہ ساری انسانیت کے لئے آیا اور اس کا پیام ساری انسانیت کے لئے ہے اور قیام قیامت تک کے لئے ہے اس بات کے تو ہم خود قائل ہیں کہ لکل قوم ھاد ہر قوم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہادی ضرور بھیجے ہیں بعضوں کے نام اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتائے اور ہم ان کو بہ حیثیت نبی کے مانتے ہیں اور نام لے کر ان کی نبوت کے قائل ہیں اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ دنیا کا کوئی خطہ، دنیا کی کوئی قوم آدم علیہ السلام کے بعد ایسی نہیں رہ گئی جہاں اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ پیغمبر بنا کر بھیجا نہ گیا ہو۔ لیکن جتنے پیغمبر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے آئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہیدی نوعیت رکھتے تھے یہ نبی آئے اس لئے تاکہ انسانیت کے مختلف گروہوں کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں لاکر اللہ تعالیٰ کا وہ پیام، جو ان کی اس وقت کی ضرورت کے مطابق ہو اور ان کی صلاحیت کے لحاظ سے کافی ہو اپنی قوم اور گروہوں کو دیتے رہیں یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح تیار ہو جائے اور جب وہ شباب کو پہنچے اور اس قابل ہو کہ وہ ایک پیام کو قبول کر سکے جو عالمگیر بھی ہو اور دوامی بھی ہو تو پھر نبی خاتمؐ کا ظہور کیا جاتا اور پھر ان کے ذریعہ وہ پیام اس کو عطا کیا جاتا۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جہاں کہیں بھی کوئی ہادی آیا، جہاں کہیں بھی ہم کو ہدایت کی روشنی دکھائی دیتی ہے ہم نام لے کر اس کو پیغمبر چاہے نہ سمجھیں لیکن ہے وہ ہادی۔ جیسے ہندوستان میں بھی آئے لیکن ان کی تعلیمات سے کہیں بھی کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ ساری دنیا کے لئے بھیجے گئے تھے یا ان کی تعلیمات کو ساری دنیا میں پھیلنا تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو معلوم اور معروف پیغمبر آئے وہ عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ وہ ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے اور ان کا پیغام ہمیشہ دنیا تک کے لئے ہے۔ دنیا کے کسی داعی، کسی دین کے پیشوا کی تعلیمات میں یہ چیزیں نہ ملتیں۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں آئے، اپنے اپنے وقتوں میں کام کیا۔ ان کے جو ضوابط اور قوانین تھے، وہ محض تھے ایک وقت کے لئے۔ لیکن تاریخ ہدایت میں صرف ایک ہستی ایسی ملے گی جس نے نہ صرف اپنی نبوت کا دعویٰ کیا بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا کہ میں ساری کائنات

کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھ پر نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب کوئی نبی آنے والا نہیں اب کسی اور پیغام کی کوئی حاجت نہیں۔ جو پیغام میں لے کر آیا ہوں وہ اس قدر جامع ہے، اس قدر ہمہ گیر ہے کہ انسانیت کی جتنی ضروریات قیام قیامت تک پیدا ہوتی رہیں گی ان سب کی تکمیل کی کفالت اس کے اندر موجود ہے، ضمانت اس کے اندر موجود ہے۔

اس نبی خاتم کے ماننے والے ہم ہیں اس لئے ہم کو ہی اس بات کا حق ہے کہ ہم دنیا کے سامنے داعی بن کر کھڑے ہو جائیں۔ کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے سامنے آکر کھڑے ہو کر یہ کہے کہ ہم کو بھی اس کا حق ہے۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہیں یہ نہیں بتایا تھا لیکن ان کے پیروؤں نے دین عیسوی کو اتنا پھیلایا کہ آج عددی اعتبار سے عیسائی ہم سے زیادہ موجود ہیں، ان کا مشنری زیادہ کام کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چونکہ ان کے پاس پیام ہی کوئی موجود نہیں ہے، کوئی ایسا نظام حیات ہی موجود نہیں ہے جو انسانیت کی تمام ضروریات کا کفیل ہو، اس لئے وہ مجبور ہیں اور وہ اثر پیدا نہیں کر سکتے جو ہمارے دین کی دعوت پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دین کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی اپنے پرچار میں لگے ہوئے ہیں۔ آج یورپ میں جا کر آپ پتہ چلے گا کہ ان لوگوں نے اپنی تبلیغ کا کام کس قدر وسیع پیمانہ پر شروع کر دیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اب ساری کی دنیا کرب و اضطراب میں ہے، کسی کو قلبی سکون حاصل نہیں ہے اس لئے ہماری طرف آؤ، ہم تم کو ایسے حیلہ کشی کے طریقے بتائیں گے کہ جس سے قلبی سکون حاصل ہوگا۔ بڑے بڑے اشتہارات وہاں لگے ہوئے ہیں، ان کے سادھو وہاں پہنچے ہیں اور وہاں تقریر و تبلیغ کر رہے ہیں لیکن کہیں کرشن جی کی تعلیم میں یہ نہیں بتا سکتے کہ کرشن جی نے یہ کہا تھا کہ تم قیامت تک یہ کام کرتے رہنا یا ساری انسانیت کے سامنے یہ تعلیمات پیش کرنا۔ دعوت کا حق صرف امت محمدیہ ﷺ کو حاصل ہے کیونکہ جتنے ہادی، جتنے پیغمبر، جتنے مصلحین اقوام آئے وہ وقتی طور پر آئے۔ ان کا دور ختم ہو چکا! اب دور صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

اس دور کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک وہ دور ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس عالم ناسوت میں اپنی حیات مبارکہ کے ساتھ موجود تھے اور ایک دور وہ ہے جو آپ ﷺ کی پردہ پوشی کے بعد آپ ﷺ کی امت کے ذریعہ ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ وہی پیغام، وہی ہدایات وہی تقویٰ، وہی طور، وہی اعمال۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سانچہ چھوڑا ہے اس میں ڈھل ڈھل کر مسلمان جب دنیا کے سامنے پیش ہوگا۔ اس وقت دین کا فریضہ ادا

سے ادا ہوگا۔ تو یہ امت داعیانہ امت ہے۔

ہر فرد امت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا داعی بن کر پیش ہو مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر فرد امت وہ کرے جو طبقۂ علماء کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی حیثیت میں، استعداد میں، اپنی ان معلومات کے مطابق جو ٹھیک طور سے اسے حاصل ہوئی ہیں چاہے وہ ذرائع کے ذریعہ سے ہو اس حد تک وہ اس کا داعی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اخلاق اور اطوار کی حیثیت سے وہ داعی ہے۔ صحابہ کرامؓ میں مفسرین کتنے تھے، فقہا کتنے تھے؟ محدثین کتنے تھے؟ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ کوئی دس تھے تو کوئی بارہ تھے کوئی بیس تھے کوئی تیس تھے اور یہ صداقت تھی۔ لیکن ہر صحابی داعی اسلام تھا اس اعتبار سے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے رنگ میں وہ اس قدر رنگ گیا تھا کہ اس کا چلنا پھرنا، اس کا بیٹھنا اٹھنا اس کے معاملات کی صفائی، اس کے عہد کی پابندی، یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ جن کی وجہ سے دین پھیل گیا۔ آج باوجود اس کے کہ ہم کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ہیں لیکن تبلیغ دین کے بارے میں خود ہمارا کردار رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اغیار تو ہم پر طعنہ زنی کریں گے ہی لیکن ہم آپس میں کیا یہ نہیں کہتے کہ جہاں تک معاملات کا تعلق ہے انگریز اس میں معتبر ہیں، مسلمان قابل بھروسہ نہیں؟ آج ہمارے معاملات میں غیر شخصیت پر ہم کو اپنوں سے زیادہ اعتماد آتا ہے۔ یہ بڑی شرمناک بات ہے جبکہ ہم داعی اسلام ہیں۔ داعی بننے کے یہ معنی نہیں کہ سارے کے سارے مسلمان علماء بن جائیں، خطیب بن جائیں، مواعظین بن جائیں، مفسرین بن جائیں یا جس انداز سے علماء تقریر کرتے ہیں سب تقریر کرنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ سماج ہوگا تو اس میں غلطیاں بھی ہونگی، نقائص بھی ہوں گے۔ داعی اسلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ آپ جس موقف میں ہیں، جس حیثیت میں ہیں، داعی ہیں۔ حضرت سلیمان ندویؒ فرماتے تھے کہ امت کا ہر فرد داعی ہے لیکن وہ دعوت اسلام کو پیش کرے گا اپنے اپنے موقف اور حیثیت کے اعتبار سے۔ جو تاجر تجارت کی دوکان پر بیٹھا ہوا ہے اور ترازو سے تول رہا ہے وہ تولنے کے اندر اپنے آپ کو داعی اسلام بنا کر پیش کرے، جو جج کرسی پر بیٹھا ہے وہ اپنے فیصلے کے صادر کرنے میں اپنی دیانت، اپنے اخلاص اپنی صداقت کے اعتبار سے وہ اپنا فریضہ ادا کرے۔ تبلیغ کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص مقرر بھی بن جائے۔ ہم داعی ہیں، جس حیثیت میں بھی اور جس موقف میں بھی ہم جہاں کہیں بیٹھے ہیں ہمارے کردار سے، ہمارے اخلاق سے، ہمارے اطوار سے، ہمارے معاملات سے دین کی تبلیغ ہو۔ اور یہی صحابہؓ کے اندر شان نظر آتی ہے کہ جس حیثیت میں بھی وہ جہاں کہیں دیکھے گئے ان کو دیکھ کر دنیا ان کے سامنے گرویدہ ہوگئی۔ باقی یہ کہ

پھر قرآن مجید نے یہ بھی بتایا دعوت دین جب پیش کرتا ہے تو مسلمان کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ تین قسم کے طبقات سے اس کا واسطہ ہے۔ جیسا کہ آیت زیر عنوان کا مفہوم ہے کہ تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ تین ذرائع سے، حکیمانہ انداز سے، ناصحانہ انداز سے اور جدال احسن کے ذریعہ سے۔ حق تعالیٰ کا خود فرمانا ہے کہ ان تین طریقوں سے تم کو دعوت اسلام پیش کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس کے یہی معنی ہوں گے کہ تین قسم کے طبقات سامنے آئیں گے:

ایک وہ ہیں جو علم کے اندر منہمک ہیں اور دانائی سے ان کو سبق دینا ہوگا۔ اب ظاہر ہے جہاں دین کی روشنی نہیں ہے، ایمان کی روشنی نہیں ہے، قرآن کی روشنی نہیں ہے اور جب ان میں وہ تعلق اور عوامی نہیں ہے تو وہ اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ مسلمان اگر دین کا داعی بن کر ان کے سامنے جائے تو اس کے لئے طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ دین کو ان کے سامنے موعظت سے نہیں بلکہ حکمت کے ذریعہ سے پیش کرے، اتنی اس کے اندر صلاحیت ہونی چاہئے۔ یہ طبقہ مخالف نہیں، اس کے دل میں بغض و عناد نہیں ہے مگر وہ تحقیق کرنا اور ہر چیز کو عقل سے سمجھنا چاہتا ہے اور جب عقل سے سمجھنے کا موقع آئے گا تو اس کی دو شکلیں ہوں گی یا تو جواب تحقیقی دینا پڑے گا یا جواب ایسا دینا پڑے گا جو دراصل تحقیقی نہ ہو لیکن ایسا حکیمانہ ہو کہ اس کے ذہن پر جاکر ایک چوٹ لگ جائے اور وہ قائل ہو جائے کہ بات حقیقتاً ایسی ہی ہے۔ مثلاً میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت حیدرآباد کے آخری نظام کا واقعہ ہے کہ یہ شیعیت کی طرف مائل تو ہو ہی گئے تھے، عزا خانہ بنایا، ماتم کیا یہ سب کچھ کیا۔ ایسے میں کچھ قادیانی ان کے پاس آئے اور انھوں نے اپنا لٹریچر ان کو دیا اب وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے پاس ذہن تھا، تدبر تھا، علم تھا۔ دریں اثنا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تشریف لائے۔ اعلیٰحضرت نے ان سے کہا کہ مولانا! یہ مرزا غلام احمد صاحب اور ان کی جو دعوت ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کوئی اور عالم ہوتا جو ذہین اور طباع نہ ہوتا اور حکیمانہ تبلیغ اس کو نہ آتی تو ظاہر ہے کہ وہ قادیانی کا رد کرتا اور اس کے اندر بیسیوں دلائل لاتا، گھنٹہ دو گھنٹہ کا وقت اس کے اندر صرف ہوتا اور پھر بھی معلوم نہیں کہ نتیجہ وہ حاصل ہوتا کہ نہ ہوتا۔ مولانا شبیر عثمانی بڑے ذہین اور طباع تھے، معلوم تو تھا کہ یہ زیادہ تر شیعیت کی طرف مائل ہیں، فرمایا کہ سرکار! آپ کس کا ذکر کرتے ہیں، وہ کم بخت تو یہ کہتا ہے کہ صد حسین است در گریبانم سو حسین تو میرے گریبان کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی اعلیٰحضرت نے کہا کہ لعنت اللہ علیہم، لعنۃ اللہ علیہ۔ وہ قادیانی وہاں سے ہٹ گئے اور قصہ ختم ہو گیا۔ تو لوگوں (؟) حکمت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام صرف وہ کر سکتا ہے جو نہ صرف عالم ہو بلکہ عالم ہونے کے

ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے حکیمانہ ذہن بھی دیا ہو کہ جس وقت جو انسان اس کے سامنے آئے اس کے اعتبار سے اس کو وہ جواب دے ۔ تبلیغ کا ایک طبقہ وہ ہوا جو کہ خارج از اسلام ہے لیکن اسی راستہ حکمت و دانائی سے وہ سمجھ سکتا ہے ۔ ایسے داعی ہمارے اندر ضروری ہیں جو اس حیثیت سے اس کی تشفی کر سکتے ہوں ۔ ان کے سامنے موعظت اور نصیحت کی جائے تو کارگر نہیں ہوتی ۔

پھر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک طبقہ ایسا ہے کہ جس کے لئے حجت اور دلیل کی زیادہ ضرورت نہیں ہے گویا حکمت کی ضرورت نہیں ۔ عام سطح کا ، کھلے ذہن کا یہ طبقہ ہر دور میں سب سے زیادہ رہتا ہے ، اس کو موعظۂ حسنہ کی ضرورت ہوتی ہے ، ان کو تلقین کی جائے ان کے سامنے دین کو نہایت ناصحانہ انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نصیحت کے لئے سب سے زیادہ جو چیز چاہئے وہ ہے داعی کے دل کی رافت ، اس کے دل کا گداز ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داعی اسلام بن کر آئے ، قلب مبارک رافت ، محبت اور شفقت کے جذبات سے مملو تھا جس کی قرآن بھی شہادت دیتا ہے ۔ اگر آپ کے اندر ذرا بھی سختی کا شائبہ ہوتا اور رافت نہ ہوتی تو آپ کے اطراف لوگ گھر کیسے جاتے ؟

موعظۂ حسنہ کے اندر جو چیز سب سے زیادہ تاثیر پیدا کرتی ہے وہ ناصح کے خود اپنے دل کی کیفیت ہے ۔ اس کے دل میں اگر گداز موجود ہے اور اس کا دل خود پگھل رہا ہے تو جو الفاظ اس کی زبان سے نکلیں گے وہ دوسرے کے دل کو پگھلا دیں گے ۔ دین کی تبلیغ محض طوطا مینا کی طرح نہیں ہوتی ۔ دین کی تبلیغ تو اسی طرح ہوگی کہ پہلے اندر اور پھر باہر ۔ پہلے اپنا تزکیۂ نفس پھر دوسروں کے لئے داعی بن کر آئے ۔

زیر خاکستر شرار اندوختم　　　شعلہ گردیدم دلم را سوختم

کہ اپنے خاکستر کے اندر پہلے محبت الٰہیہ کی آگ کو بھڑکانا اور پھر شعلہ بن کر جو خس و خاشاک خارج میں موجود ہیں ان کو جلا دینا ۔ اس طبقہ کے لئے زیادہ علم کی ، زیادہ قوت استدلال کی ضرورت نہیں عام طور سے ناصحانہ انداز سے دین پیش کیا جائے تو جن قلوب میں استعداد موجود ہے وہ دعوت کو ضرور قبول کرلیں گے ۔ یہ طبقہ دراصل ہمیشہ سب سے زیادہ رہا ہے ، اسی لئے دین کی تبلیغ کے لئے ہر مسلمان اسی حد کے اندر کام کرسکتا ہے اور اس کو کرنا چاہئے ۔

تیسرا طبقہ جس کے لئے جدال احسن کی ضرورت ہوتی ہے ۔ دلائل ، مناظرہ ، مذاکرہ ، مجادلہ یعنی علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور قوت استدلال کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ محض تقاریر

یہاں کافی نہیں جب تک اس کے اندر قوت استدلال نہ ہو ۔ یہ علم کا محدود طبقہ ایسا ہے بن کے افراد اپنے اندر عناد بھی رکھتے ہیں، مخالفت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں، ان کے ذہن میں تفاخر بھی ہوتا ہے کہ ہم علم رکھتے ہیں، ہم بڑے ہیں، ہمارے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے؟ ایسوں لئے نہ صرف گہرے علم کی بلکہ قوت استدلالیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ استدلال کی قوت بھی تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر گہرا عالم اچھا مناظر بھی ہو۔ ہمارے علمائے قدیم نے ضرورت کے لئے ایک فن تیار کیا جس کا نام ہے "کلام"۔ علم کلام وہ فن ہے جس میں اسلام حقائق ہوں، عقلی استعداد کے ذریعہ سے ان کو ثابت کیا جا سکے۔ یہ علم کلام ایک تلوار تھی جو ہاتھ لے کر اپنے دشمن کا سر قلم کیا کرتے تھے۔ زمانے کے گزران کے ساتھ ساتھ جس تلوار سے ہم دوسروں کے غرور کا سر قلم کیا کرتے تھے اس کو ہم نے باعث افتخار سمجھا اور مسلمان پندار اور غرور کے شکار ہو گئے۔ اب بڑا عالم وہ سمجھا جائے گا جو دوسرے عالم کو پچھاڑ دے۔ اختیار تو گئے آپس مجادلے شروع ہو گئے اور اس مجادلے کا نتیجہ اپنے اندر فخر، غرور، آخرت فراموشی، حق تعالیٰ سے غفلت۔ یہی وہ چیز تھی جو بہت زیادہ فروغ پا گئی تو حق تعالیٰ نے امام غزالیؒ کو کھڑا لیا اور انہوں نے علماء کو جھنجھوڑا کہ تم کس فخر و غرور میں مبتلا ہو؟ یہ کوئی علم ہے اور کیا اس کے لئے م بھیجے گئے تھے؟ پھر ان کو اللہ تعالیٰ کے کرم سے اخلاص کی طرف، صداقت کی طرف بلایا اور اب سمجھا جانے لگا کہ یہ علم کلام انسان کے اندر تفاخر پیدا کرتا ہے، علوم عقلیہ انسان کے اندر تفاخر پیدا کرتے ہیں کیونکہ جو چیز دوسروں کے مقابلے کی تھی جب ہم آپس میں استعمال کرنے لگے تو ظاہر ہے اس سے تضاد تو پیدا ہوں گے۔ اس طرح سے یہ چیز بری سمجھی گئی۔ لیکن ضرورت اس کی ہر وقت موجود ہے، آج بھی علم کلام کی ضرورت ہے اور ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے ہر دور میں اس وقت کے جیسے جیسے مسائل پیش آتے ہیں اور علم جس جس سمت میں ترقی کرتا ہے ان ان جہت میں اس کے مقابلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ امت محمدیہ کے اندر ایسے لوگ بھی برابر پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے ہر وقت کے اعتبار سے علم کلام پیدا کیا اور اسلام کا اس محاذ پر دفاع کیا اور اس راستے سے وہ اسلام کو آگے لے کر بڑھتے چلے گئے۔

معروضہ یہ ہے تین محاذ خود قرآن مجید بتاتا ہے کہ موجود ہوں اور ان تین محاذوں پر لڑنے والوں کی ضرورت ہو تو اب جو جس محاذ پر لڑ رہے ہیں وہ اسلام ہی کی خدمت کر رہے ہیں۔ مستشرقین کی ایک یلغار اس وقت ہو رہی ہے اور مسلمانوں کے اندر وہ طبقہ جو اہل علم کہلاتا ہے تمام تر مستشرقین کی اس یلغار سے مجروح ہو چکا ہے، انہی کے ذہن سے سوچتا، انہی کے

ذہن میں سمجھتا، اسی پر یقین کرتا ہے۔ اب ان سب دلائل کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ وہ کام ایک طبقہ کر رہا ہے، موعظہ حسنہ کا کام ایک طبقہ کر رہا ہے، حکمت و دانائی کے ساتھ اس تبلیغ کا فریضہ ایک اور طبقہ انجام دے رہا ہے، تحریر کے ذریعہ سے بھی، تقریر کے ذریعہ سے بھی۔ یہ سب خادمان اسلام ہیں اور فرائض نبوت سب کے اوپر بٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو صلاحیت دی ہے اس کے اعتبار سے وہ کام کر رہا ہے، اب اس کے اندر ایک چیز یہ پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جو کام کر رہا ہے وہ سمجھے کہ بس یہی کام ہے اور دوسرا کام نہیں ہے بلکہ یہ سمجھے کہ حق تعالیٰ نے میرے اندر اسی کام کی استعداد بخشی ہے اور میں یہ کام کر رہا ہوں۔ دوسرے کے اندر دوسری استعداد ہے اور وہ کام کر رہا ہے۔ خالد بن ولیدؓ کے اندر قتال بالسیف کی اللہ تعالیٰ نے استعداد رکھی تھی وہ کر رہے تھے۔ حسانؓ بن ثابت کو وہ ملی نہیں وہ نہیں کر سکے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت حسان بن ثابت کو عورتوں کے خیمہ پر رکھ دیا گیا کہ وہ چوکیداری کریں ایک کافر ادھر سے تلوار سونتے چلا آرہا تھا۔ صفیہؓ نے کہا کہ حسانؓ! بڑھ کر اس کے اوپر وار کر دو ورنہ یہ وار کرے گا۔ حسانؓ نے عرض کیا کہ حسانؓ کو یہ آتا تو یہاں کیوں کھڑا ہوتا؟ وہ بڑھیں اور انھوں نے اس کافر کا سر قلم کر دیا اور کہا کہ حسانؓ! اس کی لاش کو گڑھے میں ڈھکیل دو۔ آپ نے کہا کہ حسان سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ صحابہؓ میں پھیل گیا اور صحابہؓ حضرت حسانؓ کی ہنسی اڑانے لگے کہ ایسے بزدل ہیں یہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جب یہ بات پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ حسانؓ پر ہنسو نہیں۔ حسانؓ کے اشعار (الفاظ) مجاہدین کے تیر کے برابر ہیں۔ مجاہد جو تیر چلا رہا ہے حسانؓ اگر ان کے رجز کے مقابلے میں رجز کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہی صلاحیت دی ہے۔ جیسا وہ تیر ہے ویسا یہ رجز ہے۔

اس بات کو میں آپ کے سامنے دلسوزی کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت اشتراک کی ضرورت ہے۔ جو اسلام کا خادم ہے اسلام کی خدمت اپنی اپنی حیثیت میں صحیح طریقے پر انجام دے رہا ہے۔ سب اپنے ہی بھائی بھائی ہیں، وہ سب شریک کار ہیں اور وہ سب دعوت اسلام کے پھیلانے والے ہیں۔ سب کو مل جل کر یہ کام کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اس مختصر سی گفتگو کو قبول فرمائے اور اس کا جو منشا ہے آپ کے دلوں میں اس کو بٹھائے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا سچا خادم بنائے اور بہ حیثیت خادم کے اللہ تعالیٰ ہم کو اس دنیا سے اٹھائے اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو جائے

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ◎◎◎

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا تاریخی کردار

نبوتِ محمدی کا اعجاز اور انقلابی کارنامہ:

اگر کوئی واحد ہستی ایسی ہے جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے اس نے حقیقتاً "تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے، جس نے انسان کو جہالت کے بجائے علم، فرسودہ روایات کے بجائے تعقل اور آباؤ اجداد کے نقش قدم کی کورانہ پیروی کے بجائے، عقل و بصیرت، اور تفکر و تدبر سے کام لینے کا عادی بنایا ہے، تو وہ ذات گرامی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، آپ تاریخ کے اس دوراہے پر نظر آتے ہیں جہاں سے عقل و استدلال اور توہم پرستی کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ آپ کی تعلیمات نے انسان کو عقل کی روشنی عطا کی اور اس کی مبصرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی میں خالق کائنات نے نوع بشری کو علم عطا کرنے کے احسان کا ذکر کیا ہے اور اس قلم کو اس کا وسیلہ قرار دیا، جس سے علم کا تاریخی سفر وابستہ ہے اور جس سے تصنیف و تعلیم کی عالم گیر تحریک جاری ہوئی اور علم ایک فرد سے دوسرے فرد، ایک قوم سے دوسری قوم، ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا، دنیا میں علم کی اشاعت اور انسانی ضرورت کے مطابق اس کی عمومیت کا فخر اسی کو حاصل ہے۔ اور اس کی گردش و جنبش سے مدارس و جامعات اور علمی اداروں اور کتب خانوں کی دنیا آباد ہے۔

جہاں تک بشری قرائن و قیاسات کا تعلق ہے، اس بات کا کوئی تاریخی و عقلی قرینہ نہ تھا کہ پہلی وحی کے ذیل میں "قلم" کا ذکر بھی آ سکتا ہے، کیونکہ یہ وحی ایک امی انسان، ایک ان پڑھ قوم کے درمیان اور ایک پسماندہ علاقہ میں نازل ہو رہی تھی جہاں وہ پارۂ چوب جس کا نام "قلم" ہے سب سے زیادہ نادر و نایاب شئی کی حیثیت رکھتا تھا، اسی لئے

عربوں کا لقب ہی "امین" پڑ گیا تھا۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة ق وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ؀

(وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے درآنحالیکہ یہ لوگ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)۔

ایک غیر متوقع آغاز: غار حرا میں نبی امی پر یہ پہلی وحی اترتی ہے (جب کہ چھ سو سال کے طویل وقفہ کے بعد زمین کا آسمان سے بلکہ صحیح تر الفاظ میں آسمان کا زمین سے وحی و نبوت کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا تھا) تو اس میں عبادت کا حکم اور اللہ کی معرفت اور اطاعت وغیرہ کوئی ایکائی، یا بتوں کے ترک کرنے یا جاہلیت اور اس کے عادات و اطوار پر نکیر جیسی کوئی سلبی بات نہیں کہی گئی اگرچہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اہم تھیں اور اپنے اپنے موقعہ پر ان کی وضاحت و تبلیغ کی گئی بلکہ کلمۂ "اقرأ" سے اس وحی کا آغاز ہوا۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۞ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۞ ؀

(آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے آپ قرآن پڑھا کیجئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے (جس نے) انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جنھیں وہ نہیں جانتے تھے۔

(اس طرح یہ تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا جس نے مورخین و مفکرین کے غور و فکر کے لئے نئے اور وسیع آفاق مہیا کئے اور یہ اس حقیقت کا مبیع اور واضح اشارہ تھا کہ اس نبی امی صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت اور مذاہب کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا جو وسیع اور عمیق معنوں میں قرات (خواندگی) اور پڑھنے لکھنے کا وسیع و عمیق معنوں میں وترقی یافتہ دور اور علم کی حکمرانی کا عہد زریں ہوگا اور علم و دین دونوں مل کر نئی انسانیت کی تکمیل و تشکیل کریں گے۔

انفس و آفاق اور اقوام و ملل کے ماضی پر غور و فکر کی دعوت اور اسکے فائدے

قرآن، علم کے مختلف ذرائع کے تذکرے کے ساتھ ان اشیاء کی جانب توجہ دلاتا ہے جن کا مطالعہ حصول علم کے لئے کیا جانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں اس نے انفس و آفاق اور گذشتہ اقوام کے احوال

(جنہیں قرآن نے "ایام اللہ" "سنۃ اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور آج جسے تاریخ کہا جاتا ہے) کی جانب توجہ دلائی ہے تاکہ انسان ان پر غور و خوض کر کے مفید نتائج بر آمد کر سکے، اور بڑے قیمتی اور دور رس رازہائے امکان اور انسانی مستقبل پر گہرائی سے اثر انداز ہونے والے نتائج تک پہنچ سکے۔

علامہ اقبال، عقل انسانی اور علم کے وسائل و مصادر کی اسلام کے ذریعہ وسعت و نتیجہ خیزی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مشہور خطبات میں لکھتے ہیں:

"لیکن مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کے دو اور سر چشمے ہیں، ایک عالم فطرت، دوسرا عالم تاریخ، جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا ہے۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس و قمر، یہ سایوں کا امتداد یہ اختلاف لیل و نہار، یہ رنگ و زبان کا فرق، اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد و شد، حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے۔ حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں، اور اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور و تفکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ٹھوس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی، جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے، وہ متناہی ہے اور اضافہ پذیر، تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر، جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتدا میں انہوں نے بڑے شوق و ذوق سے مطالعہ کیا تھا، اتر آئے۔ شروع شروع میں تو انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفۂ یونان کے منافی ہے اور اس لئے حکمت یونان پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا لیکن چونکہ قرآن مجید کا زور محسوس اور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کے بجائے نظریات پر، لہذا ظاہر ہے کہ یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب و ثقافت کی حقیقی روح بر سر کار آئی، حتیٰ کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھئے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت ہے"۔　　وہ مزید لکھتے ہیں

"قرآن پاک نے تاریخ کو "ایام اللہ" سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام و امم کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں لحاظ

سے کیا جاتا ہے، مزید یہ کہ انھیں اپنی بداعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے، اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے تاریخ سے بار بار استناد کیا۔"

علاوہ ازیں قارئین کو توجہ دلائی کہ نوعِ انسانی کے گذشتہ اور موجودہ احوال وشئون کے مطالعہ میں غور وفکر سے کام لیں۔

* ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا ان اخرج قومك من الظلمات الی النور وذکرھم بایام اللہ ان فی ذلك لآیات لکل صبار شکور۔

(اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جاؤ اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ، اس میں ان لوگوں کے لئے جو صابر و شاکر ہیں (قدرت خدا کی) نشانیاں ہیں۔)

وممن خلقنا امة یھدون بالحق وبه یعدلون۔ والذین کذبوا بآیٰتنا سنستدرجھم من حیث لا یعلمون ۝

(اور ہماری مخلوق میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔)

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین ۝

(تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں تو تم زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔)

" وتلك الایام نداولھا بین الناس ۝

(اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔)

" ولکل امة اجل ج فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون ۝

(اور ہر فرد کے لئے (موت کا) ایک وقت مقرر ہے، جب وہ آجاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی۔)

علمی منشر اکائیوں میں وحدت و ربط:

علم کے صحیح مقصد کی طرف رہنمائی اور اسے مثبت تعمیری ومفید اور ذریعہ یقین بنا

کے سلسلے میں بعثت محمدی اور دعوت اسلامی کے رول کی اس سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت ہے جو اس نے علمی تحریک کی فعالیت وسعت کے سلسلہ میں ادا کیا ہے ۔

علم کی کڑیاں بکھری ہوئی بلکہ بسا اوقات متضاد تھیں، علم طبعیات وحکمت دین سے برسرِ پیکار تھے، حتیٰ کہ ریاضی وطب جیسے معصوم علم کے ماہرین بھی بعض اوقات سلبی والحادی نتیجے نکالتے تھے، چنانچہ یونان کے علماء (جنھوں نے کئی صدیوں تک فلسفہ و ریاضیات میں اپنا امتیاز قائم رکھا تھا) یا تو مشرک تھے یا ملحد تھے اور یونان کے علوم اور مدارس فکر دین کے لئے خطرہ اور ملحدین کے لئے سند اور نمونہ بنے ہوئے تھے، اس صورت حال میں یہ اسلام کا بڑا احسان تھا کہ اس نے ایسی وحدت قائم کی جو تمام علمی اکائیوں کو مربوط کر دیتی تھی اور اس کے لئے ایسا کرنا اس لئے آسان ہوسکا کہ اس کا علمی سفر صحیح نقطۂ آغاز (Starting Point) سے ہوا تھا، اس نے اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس سے مدد طلبی اور اس پر اعتماد کے ذریعہ اور اقرأ باسم ربك الذي خلق ○ کی تعمیل میں شروع کیا تھا اور آغاز کی صحت اکثر اوقات انجام کی صحت وخیریت کی ضمانت ہو جاتی ہے، اسلام نے قرآن و ایمان کے فیض و فضل سے ایسی وحدت کا انکشاف کیا جو تمام وحدتوں کو مربوط کر دیتی ہے اور وہ وحدت اللہ تبارک وتعالیٰ کی معرفت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی تعریف کی ہے:

"ويتفكرون في خلق السموات والارض ع ربنا ما خلقت هذا باطلاع سبحانك فقنا عذاب النار ○ (اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار تو نے یہ (سب) لایعنی نہیں پیدا کیا ہے، تو پاک ہے، سو محفوظ رکھ ہم کو دوزخ کے عذاب سے۔)

زمانۂ ماسبق میں کائناتی وحدتیں (یعنی اس کے مظاہر اور حوادث وتغیرات) انسان کو متضاد نظر آتے ہیں اور اسے حیرت واستعجاب میں ڈالتے تھے اور کبھی کفر والحاد اور خالق عالم اور مدبر کائنات کے اوپر طعن واعتراض تک پہنچا دیتے تھے، اسے دیکھتے ہوئے ایمان وقرآن پر مبنی، اسلامی علم نے دنیا کو ایسی وحدت عطا کی جو کائناتی وحدتوں کو جمع کرتی ہے اور وہ اللہ کا غالب ارادہ اور اس کی حکمت کاملہ ہے۔)

ایک بڑے جرمن عالم ہیرالڈ ہوفڈنگ (HARALD HOFFDIN) اس وحدت کی دینیات اور انسانی زندگی اور علم واخلاق کے تاریخی سفر کے موثر کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہر مذہب کا ایمان توحید پر ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئی کی علت وجود ایک ہی ہے (اس فکر سے لازمی طور پر پیش آنے والی مشکلات سے قطع نظر یہ ایمان واعتقاد

فطرت انسانی پر بڑا مفید اور اہم اثر مرتب کرتا ہے اور اس کے ماننے والوں کے لئے یہ عقیدہ رکھنا آسان ہوجاتا ہے کہ (بعض اختلافات و تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے) عالم کی تمام چیزیں ایک قانون میں منسلک ہیں، کیونکہ علت کی وحدت، قانون کی وحدت کا بھی تقاضہ کرتی ہے۔

از منۂ وسطیٰ کے دینی فلسفہ نے کثرت میں وحدت کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں بٹھا دیا، جس سے غیر مہذب انسان طبعی مظاہر کی کثرت کے سبب اس سے غافل تھا اور اس کثرت کے مشاہدے میں اس لئے غلطاں و پیچاں رہتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں ان میں ربط ذاتی پیدا کرنے کا کوئی سررشتہ نہ تھا۔

مغرب کی بیداری اور علم و تہذیب کے نئے دور کے آغاز میں اسلام کا حصہ:

رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIEFAULT) اپنی کتاب The making Humanity میں لکھتا ہے: "یورپ کی ترقی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر اسلامی تمدن کا احسان اور اس کے نمایاں آثار کی گہری چھاپ نہ ہو۔" وہ آگے چل کر لکھتا ہے: "صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہوجاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں"۔

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ فکر یونان کے احیاء کا نتیجہ تھی۔ مشہور مورخ ایچ۔جی۔ویلس (H. G. Wells) نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ موجودہ دنیا کو قوت اور علم کی روشنی یونان سے ہی ملی ہے، وہ لکھتا ہے:

"جس علم کی ابتدا کرنے کے بعد اسے یونانیوں نے خیرباد کہہ دیا تھا، اسے ایک نئے زاویہ اور نئے جوش و خروش کے ساتھ (عربی ذہن) نے نظم و ترتیب کے ساتھ اپنا موضوع بنالیا، اگر یونانی حقیقت کے سائنسی طریقۂ انکشاف کے باپ تھے تو عرب اس کے مربی تھے جنہوں نے انتہائی صاف گوئی آسان اور سہل تشریحات۔ باقاعدہ اور منجھے تلے الفاظ اور جامع تنقید سے اسے سنوارا تھا، یہ صرف عرب تھے نہ کہ لاطینی جن سے جدید دنیا کو علم اور قوت کا تحفہ حاصل ہوا ہے:

قدیم دنیا میں مسلمانوں کا علمی تفوق، اور مفید اور تجربی علوم میں ان کی قیادت

میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ مسلمانوں نے صرف عظیم الشان اور وسیع سلطنتوں کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ ایک زمانہ میں وہ دنیا کی تمام اقوام پر علم و فضل میں بھی فائق تھے، مسلمانوں میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جو حصول علم کے شوق، اس کی بے لوث

ریت اور مختلف علوم میں بیش بہا تصنیفات کے لئے ممتاز رہے ہیں۔ قرن اول کے ائمہ، محدثین
و فقہاء مجتہدین سے قطع نظر (جن کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی) مسلمانوں نے دینی اور دنیاوی
علوم میں ایسے مفکرین اور مصنفین پیدا کئے جس کا مقابلہ دوسری قوموں کے بڑے سے بڑے عالم
سے کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں نے اپنے تحصیل علم کا دائرہ صرف مذہبی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ
و مذاہب کے تقابلی مطالعہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انہوں نے جغرافیہ، طبعیات، نباتات، ہندسہ
طب، کیمیا، فلسفہ، تاریخ و مذاہب و تمدن جیسے علوم کی خدمت بھی کی، ان کے اکثر علماء نے صدیوں
تک مختلف علوم و فنون میں دنیا کی رہنمائی کی ہے اور کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں، یہاں صرف
چند مسلمان علماء کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، کیونکہ کسی طویل تعارف کے لئے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔

مسلمان موجدین فن اور ماہرین علوم: الخوارزمی (م ۸۵۰/۲۳۶) نے سب سے
پہلے عالمی جغرافیہ پر کتاب لکھی اور پھر محمد بن محمد الادریسی (م ۱۱۵۳/۵۶۰) نے "الممالک والمالک"
میں عالم اسلام کے تجارتی راستوں کو نقشہ جات کے ساتھ وضاحت سے بیان کیا۔ ابن الہیثم
(م ۱۰۲۹/۴۳۱) نے تقریباً دوسو کتابیں تصنیف کیں جن میں سینتالیس علم ہندسہ پر اور اٹھاون
انجینیرنگ کے موضوع پر تھیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے اسوان ڈیم کی تعمیر کی تجویز پیش کی اور
علم بصارت OPTICS میں مفید انکشافات کئے، اس نے اپنی کتاب المناظر میں بصری ادراک
کے سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ کسی شئی کی بصارت اس سے ٹکرا کر واپس آنے والی شعاعوں پر
منحصر ہے، محمد بن موسیٰ الخوارزمی (م ۸۵۰/۲۳۶) نے علم ہندسہ میں ایک سے نو تک اعداد کے
ساتھ صفر کا اضافہ کیا اور سب سے پہلے اعداد کی حیثیت کا تعین کیا، الخوارزمی نے ہی الجبر (الجبرا)
ایجاد کیا، البتانی (م ۹۲۹/۳۱۷) جسے مغرب البیٹگنی (Albategni) اور البیاطینوس
Albatenius کے نام سے یاد کرتا ہے، عظیم عرب ماہر فلکیات تھا جس نے گہن کی کجی کا بالکل
صحیح اندازہ لگایا، شمسی سال کی مدت، موسموں کی تبدیلی اور سورج کے اوسط مدار کا پتہ چلایا
اور بطلیموس کے اس نظریہ کی تردید کی کہ سورج کا مدار غیر متحرک ہے۔ ابوبکر محمد الرازی (م ۹۳۲/
۳۲۱) جسے مغرب نے ریزز (Rhazes) کا نام دے رکھا ہے عہد وسطیٰ کا سب سے بڑا
طبیب ہونے کے ساتھ عظیم فلسفی اور ماہر کیمیا بھی تھا اس نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف کتاب
الحاوی میں یونانی، مصری، قدیم عرب اور ہندوستانی طب کا جائزہ پیش کیا۔

ابن البیطار (م ۱۲۴۸/۶۴۶) اپنے زمانہ میں عظیم ترین ماہر ادویات تھا، اس نے اپنی دو

مشہور تصانیف "المغنی فی الادویہ والاغذیہ" اور "الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ" مختلف بیماریوں کے علامات بیان کئے ہیں اور حروف تہجی کے اعتبار سے تقریباً چودہ سو ۱۴۰۰ حیوانات، نباتات اور معدنیات کا تفصیلی تذکرہ خود اپنے یا دوسرے ۱۵۰ ماہرین کے مشاہدات کی بناء پر پیش کیا ہے، مشہور عالم بوعلی سینا (Avicenna) (م ۱۰۳۷/۴۲۸) نے فلسفہ کے موضوع پر "النجاۃ الشفاء" طب کے موضوع پر، "القانون فی الطب" اور نفسیات کے موضوع پر احوال النفس، تصنیف کی، اب تک اس کی ۲۳۱ تصنیفات کا انکشاف کیا جا چکا ہے اور ۱۱۰ دوسری کتابوں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ طب میں اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی کتاب منظر عام پر آنے کے بعد تقریباً پانچ سو برسوں تک یعنی سترہویں صدی کے اختتام تک اپنے موضوع پر سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی، علم کے ان درخشندہ ستاروں میں ابن خلدون (م ۱۴۰۶/ ۸۰۸) بھی شامل ہے جو دنیا کا سب سے پہلا ماہر سماجیات ہے اور جس نے انسانی سماج کو رخ دینے والے قوانین تلاش کرنے کی جانب توجہ دلائی اور مغرب کے فلسفی Comte کامٹی سے پچاس سال پہلے سماجی علوم کی جانب توجہ مبذول کرائی، دنیائے علم وفن ابوریحان البیرونی (م ۱۰۵۱/۴۴۳) کی سعی بھی مشکور ہے، جیسے طبعیات مابعد الطبعیات، علم الادویہ، کیمیا، جغرافیہ اور تاریخ پر یکساں مہارت حاصل تھی، اس نے اور دوسرے مسلمان سائنس دانوں مثلاً ابن الہیثم نے موجودہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد ڈالی تھی۔

علم کی تاریخ کا سب سے بڑا مغالطہ اور تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ!

اس مقالہ کے اختتام سے پہلے میں آپ کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، انسان اپنی ذات سے علم کا نہ تو مرجع ہے اور نہ مصدر، وہ صرف اللہ کی مرضی کو پورا کرنے والا نائب یا نمائندہ ہے۔ قرآن مجید نے حضرت آدمؑ کو تعلیم اسماء (جو کہ علم کی بنیاد ہے) کا ذکر ان کے زمین میں خلافت الٰہی کے منصب پر سرفراز ہونے کے تذکرے کے بعد اور اسی سیاق وسباق میں کیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا استعمال خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے کرنے پر مامور تھے علم کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ انسان نے یہ فراموش کر دیا کہ وہ خالق کائنات کا نائب اور خلیفہ ہے، اسے اس دنیا کی امانت سپرد کی گئی تھی، مالک اور آقا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ زمین کے اوپر اور اس کے اندر پائے جانے والے خزانوں کو اپنے ذاتی، قومی، نسلی، طبقاتی مفاد کے لئے یا

باقی صفحہ ۳۱ پر

ڈاکٹر حافظ بدرالدین

تعلیم اور ذریعۂ معاش

مُسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا چند سال سے برابر احساس بڑھ رہا ہے۔ خاص طور پر میں نے سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سید ہاشم علی اختر صاحب موجودہ وائس چانسلر اور احمد رشید شروانی صاحب کی کئی تقریروں اور مضامین میں اسی کا تذکرہ پایا، اگرچہ ان لوگوں کا خطاب تو خاص طور پر مسلم یونیورسٹی، مسلم کالجز یا مسلم اسکولوں سے ہوتا ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس بھی اس زبوں حالی سے خالی نہیں ہیں۔

اور اسباب پر نظر ڈالئے تو اساتذہ کی بے توجہی، عدم دلچسپی یا صرف مشاہرہ کی حد تک لگاؤ تقریباً ہر جگہ عام ہے۔ پھر طلباء سے جب کوئی کام لینے والا یا کام کا احساس دلانے والا نہیں تو وہ کیوں محنت کریں اور کیسے محنت کریں؟

سرپرست اس لئے تعلیم سے بددل ہیں کہ اسکول بھیجنے میں ۸، ۱۰ سال مسلسل خرچ کریں، اولاد کی سفید پوشی کا سامان فراہم کریں پھر نوکری نہ ملے تو مزید بوجھ برداشت کریں۔ آخر وہ یہی فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ پڑھانے کے بجائے کسی ہنر یا دستکاری میں ڈالیں تو اولاد پر خرچ کرنے کے بجائے آمدنی کا ذریعہ نکلے گا۔ اب اگر سرپرست کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اولاد کو انسانیت، سلیقہ مندی اور علم کے زیور سے آراستہ کرنا بھی بجائے خود ایک مقصد ہوتا ہے تو ان کی سمجھ میں یہ بات اس لئے نہیں آتی کہ پیٹ روٹی مانگتا ہے اور بدن چھپانے کے لئے کپڑا ضروری ہے، یہ کہاں سے آئے؟

گویا آج کا انسان علم برائے علم نہیں، علم برائے زندگی کا خواہشمند ہے۔ اس خواہش کو ہمارے تعلیمی ادارے کس حد تک پورا کر پاتے ہیں یہ قابل غور ہے۔

ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

میرے خیال میں یونیورسٹیوں میں جہاں مختلف کورسز کے ذریعہ فنی مہارتیں پیدا کرنے کی سہولیات موجود ہیں، ان سے طلباء خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتے اور رہے ہمارے دینی مدارس جو دین کے قلعے سمجھے جاتے ہیں وہ اپنے تقلیدی کتابی علم سے الگ ہر کام اور ہر علم کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ چاہے عملی زندگی سے یہ نظریہ کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔

اب ذرا مندرجہ ذیل واقعہ میں دو طلباء کا احساس ملاحظہ فرمائیے۔

چند روز قبل میں ایک ضرورت سے موری گیٹ دہلی کی ایک ویران مسجد میں گیا، جہاں قرب و جوار میں تمام غیر مسلم آباد ہیں۔ مسجد سے متصل ایک مسلمان ٹھیکیدار کا لکڑی کا کارخانہ ہے اور مسجد کے حجرے میں دو نوجوان لڑکے رہتے ہیں۔ ایک آسامی لڑکا جو چند سال قبل دینی تعلیم حاصل کرنے وطن سے آیا تھا مگر مدرسہ کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر اب درزی کا کام کر رہا ہے اور کامیاب ہے مطمئن ہے۔ دوسرا لڑکا بھی بنگال کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ عربی پڑھنے گھر سے آیا تھا مگر چار پانچ سال دینی مدارس میں گزار کر ادھوری تعلیم چھوڑ دی۔ اب دلی یونیورسٹی کے مراسلاتی کورس کے ذریعہ بی۔ اے کر رہا ہے اور مستقبل سے پر امید ہے۔

میں چونکہ تقریباً چوتھائی صدی سے درس و تدریس سے تعلق رکھتا ہوں اور عرصہ تک مدارس اور یونیورسٹیوں کی خاک چھانی ہے۔ اس لئے اس میدان سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے لڑکوں سے سوالات شروع کر دئیے۔ جب میں نے پوچھا کہ تم نے مدرسے کی تعلیم کیوں چھوڑی؟ درزی کا کام کرنے والا لڑکا پھوٹ پڑا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جواب دینے کے لئے بھرا بیٹھا ہو۔ کہنے لگا میں کیا پڑھتا اور کہاں پڑھتا؟ میں وطن سے نکل کر ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں گیا۔ کئی مدرسوں میں پڑھنے کی کوشش کی مگر کسی جگہ مجھے نہ کوئی پڑھنے والا نظر آیا نہ پڑھانے والا۔ اکثر مدرسوں میں آنے والے ہزاروں طلباء کی آمد کا مقصد صرف وظیفہ کھانا اور رہائش کی سہولت حاصل کر کے وقت گزارنا ہوتا ہے۔ اساتذہ کلاسوں میں آتے ضرور ہیں مگر چند منٹ پڑھاتے ہیں باقی غیر درسی گفتگو میں گزار کر چلے جاتے ہیں۔ طلبہ مدرسے سے قیام گاہ میں آکر کبھی درسی کتاب اٹھا کر نہیں دیکھتے بلکہ فلمی یا جذباتی تصاویر کے رسالوں سے تسکین حاصل کرتے ہیں یا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے محلہ میں ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ کسی کو اپنے مستقبل کی ادنیٰ فکر نہیں۔ جس حال میں وقت گزر رہا ہے وہ اسی میں مطمئن ہے۔

پورے مدرسے میں شائد چند طلباء اور دو ایک استاد ایسے نکلتے ہیں جن کو پڑھنے پڑھانے سے دلچسپی ہو۔ بیشتر منتظمین کی دلچسپی مدرسے سے اس حد تک ہوتی ہے کہ طلباء

تعداد بڑھتی رہے تاکہ مہمانانِ رسولؐ کے نام پر علمِ دین کی تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ چندہ وصول
ہوتا رہے۔ اپنی قیام گاہوں میں جملہ سہولیات فراہم ہوں، اس کے علاوہ معتقدین اور متوسلین
کی تعداد میں ایسے افراد کا اضافہ ہوتا رہے جو ملکی اور غیر ملکی دورے کے مواقع فراہم کرتے رہیں
اس کے علاوہ مدرسے کی تعمیرات میں ایسا شاندار اضافہ ضرور ہوتا رہے جو لوگوں کے لئے جاذب نظر ہو۔

میں نے ان دونوں طلباء کے بیان میں کسی حد تک مبالغہ تو پایا مگر میری یہ ہمت نہیں تھی
کہ ان کے بیان کو سراسر غلط قرار دے دوں، کیونکہ میں خود بہت سے مدارس کے حالات سے
واقفیت رکھتا ہوں۔

اب ذرا ایک دینی مدرسے کے ذمہ دار کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مرتبہ میں ایک
بڑے دینی مدرسے کے مہتمم صاحب سے ملا اور عرض کیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے
مدارس کے طلباء کے لئے ایک اچھا موقع فراہم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن مدارس کو جامعہ ان کی
درخواست پر منظوری دے دیتا ہے، ان کے طلباء براہ راست یہاں بی۔ اے سال اول میں
داخلہ لے سکتے ہیں بشرطیکہ انھوں نے ہائر سکنڈری معیار کی انگریزی کا امتحان پاس کیا ہو، یا جس
مدرسے سے آرہے ہیں اس میں ہائر سکنڈری معیار کی انگریزی کا مضمون داخل درس ہو۔ اس طرح
ایک فارغ التحصیل طالب علم تین سال لگاکر تمام مضامین میں بی۔ اے کر سکتا ہے اور آگے کی
اعلیٰ تعلیم کا راستہ کھل جاتا ہے۔

مہتمم صاحب نے بہ جبر میری باتوں کو سن تو لیا مگر ناگواری کے ساتھ فرمایا: ہمیں اس کی
ضرورت نہیں۔ ہمارے اکابر دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیوی تعلیم حاصل کرنے کو ایسا فرماتے
جیسے گھوڑے کی سواری کرنے کے بعد کوئی گدھے کی سواری کرے"۔ میں اس جواب پر خاموش
رہا مگر میں نے بارہا مذکورہ مہتمم صاحب کو دیکھا کہ وہ اپنے مسند پر بیٹھ کر اپنے خطوط پر انگریزی
پتہ لکھوانے کے لئے اپنے ماتحت پرائمری اسکول کے ایک ماسٹر کو بلوایا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہہ
سکتا کہ اس شکل میں ایک اسپ تازی کا شہسوار، خرسوار سے مدد حاصل کرنے میں کوئی توہین محسوس
کرتا تھا یا نہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں میں اساتذہ کی عدم دلچسپی سے طلباء کی بددلی اور ترک تعلیم نیز بعض ذمہ داروں
کی ذہنی پر اسرار ہی اہم کشمکش ہے جو آج دینی تعلیم کی زبوں حالی کا سبب ہے۔
مگر اس سے میرا مقصد کوئی دینی مدارس سے بددلی پیدا کرنا یا ذمہ داروں پر محض نکتہ چینی
کرنا نہیں ہے کیونکہ میرے سامنے دوسرے نمونے بھی ہیں۔

ابھی مارچ ۱۹۸۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مرکز فروغ سائنس کی طرف سے دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کے عنوان پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں تقریباً ۶۰-۷۰ مدارس کے مہتمم حضرات اور اساتذہ کرام جمع ہوئے تھے۔ یہ وہ تمام روشن خیال اصحاب تھے جو موجودہ عصری تقاضوں کے مطابق مدارس کے نصاب میں تبدیلی، اضافہ اور انگریزی وغیرہ کی شمولیت کے خواہشمند تھے اور چاہتے تھے کہ مدارس کی بنیادی تعلیم کو ہاتھ لگائے بغیر جدید مضامین کا اضافہ کیا جائے، توقع ہے کہ اس کانفرنس کے عنقریب دور رس مثبت نتائج نکلیں گے۔

عربی مدارس کے طلباء کی تصویر کا ایک رخ آپ نے اوپر ملاحظہ فرمایا۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ گزشتہ ۸-۱۰ سال میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مدرسۃ الفلاح بلریا گنج سے آنے والے میں نے ایسے بہت سے باصلاحیت طلباء دیکھے اور ان سے تدریسی تعلق قائم ہوا جنھوں نے جامعہ ملیہ میں آکر بی۔اے کیا۔ ان کی عربی استعداد پہلے ہی بہت اچھی تھی یہاں آکر انگریزی میں محنت کی، عربی ٹائپ سیکھا، ترجمہ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بی-اے کرتے ہی اچھی معقول ملازمتوں پر چلے گئے ان میں بیشتر آج عربی ممالک میں معیاری مناصب پر فائز ہیں

دینی تعلیم اور معاشی ذرائع:

دینی مدارس کے بعض ذمہ دار حضرات کے اس نظریے کو میں ہمیشہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش کو صرف درس نظامی کی تدریس میں منحصر رکھنا چاہئے۔ یہی دین کی خدمت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے خیالات رکھنے والے لوگ سیاسی مقاصد کے لئے گرفتاری دینے اور جیل جانے کو دین کا ایک حصہ سمجھتے ہوں یا جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے میں عوام کی خدمت کا پہلو نکال لیتے ہوں مگر اس تعلیمی روش سے ہٹ کر اگر کوئی انگریزی یا ہندی پڑھانے لگے یا سبزی بیچنے لگے تو بہرحال اس کا علم بے فیض ہوگیا یا دینی مدرسہ سے اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کا کوئی حق ادا نہیں کیا' یہ وہ باتیں ہیں جو بعض علماء کی محفل میں میرے علم میں آئیں۔

اس سلسلے میں ہمارے لئے صرف ان صحابہ کرامؓ کی حیات مقدسہ کے نمونے کافی ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست علم دین حاصل کرتے تھے اور اپنی تجارت و زراعت کے کاموں کو بدستور جاری رکھتے تھے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد جب اپنے ذریعہ معاش کے لئے تجارتی کپڑے کی گٹھری کندھے پر اٹھانے کی ضرورت محسوس کی تو آج ہم دین کی خدمت کے ساتھ دوسرا ذریعہ معاش کیوں نہیں اختیار کرسکتے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقیہ امت اور امام اعظم ہوتے ہوئے اگر کپڑے کے ایک تاجر کی حیثیت سے مشہور ہو سکتے ہیں تو ان کے ادنی پیرو کار کیوں نہیں ہو سکتے۔

میرے خیال میں تبلیغ دین اور تدریس علم دین کو مخصوص انداز اور جماعت بندی کے ساتھ درس نظامی ... تدریس اور کلمہ و نماز کی تلقین کے دائرے میں محصور کر دینا دینی تعلیم کو محدود کر دینا ہے۔ مسلمان اگر ... ان ہے تو اس کی تجارت، ملازمت، دوکان اور گھر باہم معاملات، انفرادی اور اجتماعی ... یت دین کی تبلیغ ہوگی وہ ہر جگہ ہر وقت اسلامی تعلیمات کی منہ بولتی تصویر ہوگا، وہ صرف ... کو زبانی دین کی تلقین کرنے سے زیادہ غیروں کو اپنے روزمرہ کے کاموں میں عملی زندگی میں ... ئے گا کہ میں مسلمان ہوں۔

قابل رشک نوجوان:

دو تین سال ہوئے تیونس سے ایک بزرگ تشریف لائے تھے۔ دہلی کے کئی اداروں نے انھیں ... لیا اور ان کی بزرگی، علمیت اور دین داری سے بہت متاثر ہوئے۔

ان کے ساتھ ایک ۲۵، ۳۰ سال کا باریش نوجوان تھا جو اکثر ان کی خدمات میں رہتا تھا۔ ... نے اس سے تفصیل بات کی تو پتہ چلا یہ حافظ قرآن ہے۔ تیونس کی ایک مسجد میں امام اور ... ہے، انگریزی، عربی اور فرنچ خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ تینوں زبانوں کا ٹائپسٹ ہے ... مذکورہ عالم کی جملہ خط و کتابت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ان کی کار بھی ڈرائیو کرتا ہے ... اس نوجوان کی زندگی پر بڑا رشک آیا۔

مدارس اور فنی تعلیم:

کسی بھی ادارے میں تمام طلباء یکساں صلاحیت اور یکساں ذوق کے نہیں ہوتے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر مدرسے کا ہر طالب علم مفسر، محدث اور فقیہ یا ادیب بن کر نکلے۔ ظاہر ہے کچھ ... اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق افتاء، تفسیر یا حدیث و فقہ، خطابت و امامت میں ... مقام حاصل کر سکتے ہیں مگر کچھ ایسے ضرور ہوں گے جن کا رجحان تعلیم کے بعد تدریس لائن اختیار ... نے کے بجائے اپنے معاشی حالات کی وجہ سے جلدی کوئی روزگار اختیار کرنے کا ہوگا۔ میں سمجھتا ... اگر مدرسے کے ذمہ دار ان کے روزگار کے لئے معاون بن جائیں تو یہ بھی ایک دینی خدمت ہوگی ... ہر ہے مدارس کے مخصوص ماحول اور طرز زندگی میں کسی دستکاری کی ٹریننگ کا شعبہ قائم ... مشکل ہوگا۔ مگر کم از کم صنعتی شہروں میں وہاں کی خاص صنعت سے رابطہ قائم کر کے استفادہ ... ہو سکتا ہے۔ مثلاً بنارس اور اس کے قرب و جوار میں قالین سازی اور بنارسی کپڑے

[redacted]

کے ایسے کارخانے ہیں جن کے مسلمان مالک خود مدارس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور مالی تعاون بھی کرتے ہیں، ان سے درخواست کی جائے کہ اپنے کارخانوں میں مدرسے کے شوقین طلباء کو حسب استطاعت جز وقتی کام کرنے کا موقع دیں اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

میرٹھ میں قینچی سازی، علی گڑھ میں تالا، مراد آباد میں برتن، لکھنؤ میں لکھنوی کرتے اور دیگر شہروں میں مشہور صنعتیں بہت کارآمد ہو سکتی ہیں۔ دہلی میں اردو کے بہت سے رسائل اور اخبارات نکلتے ہیں ان میں کام کرنے کے لئے طلباء کو پروف ریڈنگ اور کتابت کے فن سے واقفیت مفید ہو سکتی ہے۔ دہلی اور قرب و جوار کے مدارس میں عربی ٹائپنگ کی سہولت مہیا ہو تو بہت ... طلبا، اس صاف ستھرے کام کو ذریعۂ معاش بنا سکتے ہیں

سیاسی برتری کے لئے استعمال کرے۔ انسانیت اور تاریخ اور علم دونوں کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا جب انسان نے تباہی کے اس راستہ کا انتخاب کیا، صرف یہ احساس کہ انسان اس دنیا کا مالک ہونے کے بجائے خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اسے صراط مستقیم پر قائم رکھ سکتا ہے کیونکہ اس حقیقت کا عرفان ہی اسے من مانی کارروائی کرنے میں مانع ہو سکتا ہے۔

علم کا اس کے مالک سے رشتہ منقطع ہونا واقعتاً بہت بڑا فتنہ ہے۔ انسان نے علم تو حاصل کر لیا لیکن اس کے ذہن نے علم کے خالق کو فراموش کر دیا۔ آج دنیا تباہی کے دہانہ پر کھڑی ہوئی ہے یورپ اور امریکہ کے سیاست دانوں اور عالموں اور ان تمام لوگوں سے معذرت کے ساتھ جو مغرب کی تہذیب پر نازاں ہیں، میں یہ عرض کروں گا کہ انسان کا اپنے آپ کو خود مختار اور اس دنیا کا حقیقی مالک سمجھ لینا ایک بہت بڑی غلطی تھی، انسان جب اپنی ابتدا کو بھول گیا تو اسے اپنی حیات کا مقصد اور انتہا بھی فراموش ہو گئے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ انسان اس وقت تک اس دنیا کے حالات کو سدھارنے میں ناکام رہے گا، جب تک وہ تسلیم نہ کرے گا کہ وہ صرف ایک مخلوق ہے جسے اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی بھی کرنا ہے۔ اسے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اسے جتنا بھی علم حاصل ہوا ہے وہ اس کے ایک سرے پر کھڑا ہے اور دوسرے سرے پر علم کا خالق، اس کا آقا اور مالک موجود ہے اگر یہ رشتہ منقطع ہو گیا تو انسان اپنی تخلیق کا مقصد بھی فراموش کر دے گا، اور ہماری دنیا ایک میدان جنگ اور انسانیت کے ایک ایسے مذبح میں تبدیل ہو جائے گی، جہاں غلامی کی لیے شمار ... بے انصافیوں اور انسانیت کی تذلیل کا دور دورہ ہوگا۔

م۔ک۔مہتاب

ہندوستانی دستکاروں کی جادوگری

فرانس، انگلستان، امریکہ اور روس میں حال ہی میں ہندوستان کے میلے لگائے گئے جہاں کے ہنرمند کاریگروں اور فن کاروں نے ہندوستان کی روایتی حرفتوں اور فنون کے مظاہرے کئے۔ یلوں میں مٹی، پتھر، دھاتوں، کپڑے، لکڑی اور نگینوں سے مصنوعات تیار کرنے والے ماہر دستکاروں ن ملکوں کے باشندوں کو سب سے زیادہ متوجہ کیا، مرد، عورتیں اور بچے ان میلوں میں ہندوستان ماہر فنکاروں کے پاس کھڑے ان کی جادوگری کو دیکھتے رہے۔

ہندوستان کو آج سے نہیں بلکہ ہزاروں برس سے اپنی رنگارنگ دستکاریوں اور ہنرمند کاریگروں کی دنیا میں شہرت حاصل رہی ہے۔ دستکاریوں کو ملکی معیشت میں اہم مقام حاصل رہا ہے قی و مغربی ممالک کے ساتھ تجارت میں دستکاریوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ زمانہ قبل از یخ میں بھی سمندری جہاز اور بری قافلے ملک میں تیار کردہ سوتی اور ریشمی کپڑوں، چینی، تانبے پیتل کے ظروف، موتی، منکے، زیورات اور کھلونے، ہاتھی دانت کے لئے آرائشی مصنوعات دور دور تک لے جایا کرتے تھے۔ روم، یورپ اور مصر کی منڈیاں اور بازار ہندوستانی ستکاریوں کے سامان سے بھرے رہتے تھے۔ ہندوستان مشرق میں کپاس پیدا کرنے والا ک بہت بڑا ملک ہے اس لئے ہندوستانی کاریگروں نے سب سے زیادہ شہرت سوتی اور ں کے بعد ریشمی پارچہ جات کی تیاری میں حاصل کی۔ ہندوستانی کپڑوں کا استعمال باعث خیال کیا جاتا تھا۔ روم کے ایک بادشاہ سے رومن عورتوں کے ہندوستان کی ململ کی ید کے جنون کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک کہا تھا کہ انھوں نے ہندوستانی کپڑوں کی ید کے لئے ملک کے سونے کے خزانے خالی کر ڈالے ہیں۔

جہاں بڑی تجارتی قافلے دلی اور لاہور سے بلخ اور بخارا اور روس و ترکی کے شہروں تک جاتے تھے وہاں کھمبائت کی بندرگاہ مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا ایک بڑا مرکز تھی عرب جہازراں یورپ اور عرب ممالک سے سونا اور چاندی لاتے تھے اور ہندوستان سے کپڑے اور دستکاریوں کی مصنوعات بھر کر لے جاتے تھے۔ مسولی پٹم کی بندرگاہ میں چین، پرتگال، فرانس، انگلستان اور اطالوی ملکوں کے جہاز سال سال بھر لنگر انداز رہتے۔ تاجر مطلوبہ مال آرڈر پر بنواتے اور جہاز بھر کر لے جاتے۔ ریتی راستے سے آنا سوتی اور ریشمی کپڑا روس اور وسط مشرق کو جاتا کہ اس راستے کا نام بھی شاہراہ ریشم ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں دستکاریوں کی گوناگونی اور عمدگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں عوامی فنون اور حرفتیں زندگی کا جزو ہیں۔ ساخت کے لحاظ سے دستکاروں کی اکثر اشیاء کا روزمرہ زندگی سے تعلق ہے۔ یہ مصنوعات فنکاروں کی تخلیقی خواہشات اور صلاحیتوں کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ کاریگر اور فنکار اپنے گرد و پیش کی زندگی میں جو رنگارنگی اور تنوع دیکھتے ہیں اسے اپنی تخلیقات میں سمو دیتے ہیں۔ چونکہ یہ مصنوعات ملبوسات سے لے کر رسومات تک استعمال میں لائی جاتی ہیں اس لئے دستکار جب اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار ان اشیاء میں کرتے ہیں تو ان کی خوبصورتی اور مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستانی دستکاروں نے دنیا کے کونے کونے میں اپنے فن و کمال کی دھاک بٹھائی ہے۔ مثلاً جا نماز لیجئے جو قالین یا چٹائی پر نہایت خوبصورت رنگوں اور نمونوں میں بنائے جاتے ہیں۔ ان پر مکہ کے رخ اور محراب بنی ہوتی ہے۔ یہ جا نماز ملک و بیرون ملک عقیدت مند مسلم گھروں میں موجود رہتے ہیں۔ اسی طرح طہارت اور مطبخ میں کام آنے والے ظروف ہیں۔ چاندی سے لے کر پیتل تک مختلف دھاتوں سے بنائے جانے والے برتنوں کو یہ دستکار اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے جو آرائش اور خوبصورتی عطا کرتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ دستکاریوں کے مال کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جہاں مشین ایک ہی قسم کا مال تیار کرتی ہے وہاں ایک دستکار اپنی ہر تخلیق میں ایک نیا رنگ بھرتا ہے اور استعمال کرنے والوں کے ذوق کی تسکین کرتا ہے۔

ہندوستان میں حکمرانوں، عوام اور غیر ملکی تاجروں نے ہمیشہ دستکاروں اور دستکاریوں کی سرپرستی کی ہے۔ خاص طور پر مسلم سلاطین اور مغل بادشاہوں کے ادوار میں ہندوستان کی اعلیٰ حرفتیں تکمیل کے عروج تک جا پہنچی ہیں۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے دنیا بھر کے فنکاروں اور اہل حرفہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جس سے ہندوستان کے کاریگروں

ور فن کاروں کی ہنرمندی کے بیش قیمت خزانوں میں اور بھی اضافے ہوئے۔ ابوالفضل نے
ئین اکبری میں لکھا ہے کہ اکبر کو دستکاریوں کا اتنا شوق تھا کہ وہ ہر ہفتے مصنوعات کی نمائش
لوایا کرتا اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اس دور
ں زیورات پر پتھر کے کام یعنی مینا کاری، سوتی کپڑے کی مصنوعات اور قالین سازی نے
نون لطیفہ کی حدوں کو چھو لیا تھا۔

لیکن مغل دور کے بعد یہ سرپرستی کم ہونے لگی۔ غیر یقینی حالات کی وجہ سے تجارت اور
رآمدات کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ پھر بھی ڈھاکہ اور اودھ کے نوابوں، نظام دکن، میسور اور
اجستھان کے راجاؤں نے دستکاروں کی سرپرستی جاری رکھی اور وہ مقامی ضروریات پوری
رتے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جب غالب آ گئی تو اس نے یورپ کی منڈیوں میں ہندوستانی
ستکاریوں کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کے لئے دستکاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن یہ سلسلہ
یادہ دیر جاری نہیں رہ سکا کیونکہ صنعتی انقلاب آنے کے سبب انگلستان کی منڈیوں میں ہندوستانی
کپڑے کی درآمد کی سخت مخالفت ہوئی۔ بلکہ ہندوستان کے بازار سستے مشینی کپڑے کی آمد سے بھر گئے
س نے ہندوستان کے دستی کپڑوں کو بازار سے نکال باہر کیا۔ ہزاروں ہندوستانی دستکار
بے کار ہو گئے۔ جو لوگ مشین کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے انھیں اپنے مال کی خوبیوں اور
خوبصورتی کو قربان کرنا پڑا۔

لیکن چونکہ بیشتر دستکار دور افتادہ علاقوں اور دیہات میں تھے اس لئے بے شک
ان کے مال کی مانگ کم ہوئی لیکن انھوں نے اپنے فن کو زندہ رکھا اور مقامی ضروریات پوری کرتے رہے۔

گاندھی جی کی سودیشی مال کے استعمال کی تحریک نے نہ صرف ہندوستانی کاریگروں کی
بدحالی کی طرف توجہ دلائی بلکہ دستکاریوں کی روایات کو زندہ رکھنے پر بھی زور دیا۔ آزادی
کے پانچ برس بعد کل ہند دستکاری بورڈ قائم کیا گیا جس نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے دستکاروں
کا پتہ لگایا اور انھیں منظم کرنے کی کوشش کی تاکہ انھیں کام دے کر نہ صرف ان لوگوں کو مفلسی
سے بچایا جائے بلکہ ملک کی روایتی دستکاریوں کو پھر سے ان کی شہرت عطا کی جائے
ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے تعاون سے یہ بورڈ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں بہت حد تک
کامیاب رہا ہے۔ انگلیوں کا جادو پھر سے مشین پر غالب آنے لگا ہے اور مشینی کپڑوں کے
دلدادہ لوگ پھر سے دستکاروں کے مال کی قدر کرنے لگے ہیں۔

نئی دہلی میں مرکزی کاٹیج انڈسٹریز ایمپوریم نے بہترین قسم کی دستکاریوں کی تیاری اور نمائش

میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہماری دستکاریوں کی روایات پر پھر فخر کیا جانے لگا ہے ہمارے لوک فن کے لئے ذوق پیدا ہوا ہے۔ ہندوستانی ہنرمندی کی اس نمائش گاہ نے ہزاروں غیر ملکیوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے جو ایک بار پھر یورپی منڈیوں کے لئے ہندوستانی مال خریدنا چاہتے ہیں۔ ملک کے استاد اور کامل دستکاروں کو ہر سال صدر جمہوریہ بڑے بڑے انعامات اور اعزازات عطا کرتے ہیں۔ ملک سے ہر سال قریب 13 ارب روپئے کا دستکاریوں کا مال برآمد کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں ہندوستان، ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے لئے بھی اپنے روایتی فنون اور دستکاریوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے باعث ترغیب بن گیا ہے۔

ترقی اور سرکاری امداد

آزادی کے فوراً بعد ہی دیہی معیشت کو مضبوط کرنے، دستکاروں کو پھر سے روزگار مہیا کرنے نیز ان کے مال کو سرکاری وغیر سرکاری ذرائع سے فروخت کرنے کی لگاتار کوششیں کی جارہی ہیں۔ دستکاروں کو خام مال بھی مہیا کیا جارہا ہے۔ ان کی کوآپریٹیو انجمنیں بھی قائم کی گئیں اور ان کی اعلیٰ ٹکنیکی تربیت کا بھی انتظام کیا گیا۔ لہٰذا دستکاریوں کی پیداوار، فروخت اور برآمد تینوں مدوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ پیداوار کے اعداد و شمار کل ہند پیمانے پر منظم کرنے کا کوئی سلسلہ موجود نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس تحریک نے زور پکڑا۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ 80-1979 میں ملک میں 2050 کروڑ روپئے کا مال تیار کیا گیا۔ حکومتی امداد باہمی کی کوششوں سے یہ پیداوار 85-1984 میں 3500 کروڑ روپئے تک پہنچ گئی۔ چھٹے منصوبے کے آغاز پر ملک سے 854 کروڑ روپئے کی مالیت کی دستکاری کی مصنوعات برآمد ہوتی تھیں۔ لیکن منصوبہ کے آخر میں یہ مالیت بڑھ کر 1700 کروڑ روپئے ہوگئی۔ اسی دور میں دستکاری کے شعبے میں روزگار پانے والے افراد کی تعداد بھی 20 لاکھ 30 ہزار سے بڑھ کر 27 لاکھ 40 ہزار ہوگئی۔

ہاتھ سے بنائے جانے والے قالینوں، دھات کے بنے ہوئے فن کارانہ برتنوں، ہاتھ کی چھپائی کے کپڑے اور لکڑی کے سامان کے لئے جو برآمدی شعبے میں دستکاری کی چار اہم مصنوعات ہیں کاریگروں کی تربیت کے لئے مرکزی حکومت نے ایک بہت بڑا پروگرام شروع کیا۔ سری نگر اور مرزا پور کے علاقے میں قالین سازی کے تربیتی اسکول قائم کئے گئے۔ ان چاروں حرفتوں کے ایک ایک لاکھ چالیس ہزار کاریگروں کو پانچ برس میں تربیت اور روزگار مہیا کیا گیا۔ تعلیم یافتہ دستکاروں کو مال فروخت کرنے اور برآمد کرنے کی بھی تربیت اور روزگار

یا کیا گیا اور تربیت دی جا رہی ہے۔ کاریگروں کو نمونہ سازی اور تکنیکی خوبیوں سے آگاہ کرنے ے لئے رنگ تنتر نام سے ایک خودمختار ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں نمونہ سازی اور تکنیکی ترقی کے چار مراکز بھی کام کر رہے ہیں۔ ہاتھ کی چھپائی کے کپڑے کا ایک جی انسٹی ٹیوٹ اترپردیش میں بھادوہی کے مقام پر قائم کیا گیا ہے۔

دستکاروں کو مال کی فروخت میں مدد دینے کے لئے ریاستی سطح پر انجمنیں اور کارپوریشنیں ائم کی گئی ہیں جو ہر سال کروڑوں روپیئے کا مال خرید کر کے اپنے ایمپوریم کے ذریعہ فروخت کرتی ہیں۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ثقافتی وراثت پر مبنی دستکاریوں کی ہنرمندی کو برقرار رکھنے اور ن دستکاریوں کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں کے تحفظ پر زور دیا جا رہا ہے۔ کاریگروں کی تربیت بتر سامان کے استعمال اور مال کی فروخت کے بہتر انتظامات کے ذریعہ دستکاروں کی آمدنی میں ضافہ کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ دستکاری کے جن شعبوں میں اقلیتی طبقوں یا درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے زیادہ لوگ کام کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کے صوصی پروگرام بنائے گئے ہیں۔ چونکہ ساہوکار اور دلال ان لوگوں کی محنت کا بہت سا ثمر ڑا اٹھا لیتے ہیں اس لئے ان طبقوں کو ان کی حرفتوں میں کام آنے والے خام مال، قرضے فراہمی اور مال کی فروخت میں خصوصی طور پر امداد دی جا رہی ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ حکومت کی حوصلہ افزائی اور امدادی کوششوں سے ملک میں ستکاریوں کے مال کی پیداوار 2500 کروڑ سے بڑھ کر چھ کروڑ روپیئے اور برآمدات 71 کروڑ روپیئے سے بڑھ کر 2590 کروڑ روپیئے ہو جائیں گی اور دستکاریوں پر گزربسر رنے والے لوگوں کی تعداد 27.40 لاکھ سے بڑھ کر قریب 36 لاکھ ہو جائے گی۔

ستکاریوں کی اقسام : ہندوستان میں جو دستکاریاں زیادہ مقبول اور شہرت یافتہ یں ان میں سوتی کپڑے، چٹائیاں، قالین، مٹی اور چینی مٹی کے ظروف، لکڑی کی مصنوعات ھات کے برتن، زیورات پتھر سے تراشے اشیاء، ہاتھی دانت، ہڈی اور سینگ کی صنوعات، کشیدہ بنی ہوئی ٹوکریاں اور پیپیر میشی یعنی شلمدانی کا سامان شامل ہیں۔

کپڑا : ہندوستانی دستکاروں نے کپڑے کی دستکاری میں جو کمال حاصل کیا ہے یہ ان ہی حصہ ہے۔ اگر ڈھاکے کے کاریگر ململ کا تھان ایک انگوٹھی میں سے نکال دیتے تھے تو شمیر میں شال تیار کرنے والے کاریگر پشمینے کے ایک شال کو ایک انگوٹھی میں سے نکال کر سکتے تھے۔ بہرحال کپڑے کی دستکاریوں کے لحاظ سے ملک کے مختلف حصے الگ الگ

مصنوعات کے لئے شہرت رکھتے ہیں ۔

اترپردیش میں موٹے کپڑے کا نام گاڑھا اور عمدہ اقسام کے کپڑوں کا نام تن زیب ہے تن زیب تیار کرنے والے بڑے بڑے مراکز میں بنارس، مرزاپور، فیض آباد اور بریلی ۔ علی گڑھ میں دوھری بتی کا کپڑا جسے توہیر کہا جاتا ہے تیار ہوتا ہے ۔ ناخونہ اور دمشق اقسام سے سفید سوت کی اعلیٰ اقسام کے کپڑے راجپور میں تیار کئے جاتے ہیں۔ مشرقی بنگال کے جامدانی دستکار آب رواں اور شبنم نام کے شہرۂ آفاق سوتی کپڑے اور ڈھاکے کی ساڑیاں تیار کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد یہ فن مغربی بنگال، بہار اور اترپردیش کے باشندوں نے بہت حد تک اپنا لیا ہے۔ ٹانڈہ اترپردیش میں ڈھاکے کا مہین سوتی کپڑا جامدانی کے نام سے تیار ہوتا ہے جیسے کسی زمانے میں سارے شمالی ہند میں امرا اور شرفا اکثر لھوں کے لئے استعمال کرتے تھے ۔

آندھرا پردیش میں کاکناڈا، راجمندری، وشاکھاپٹنم، مسولی پٹنم کپڑا تیار کرنے کے بڑے مراکز ہیں۔ وشاکھاپٹنم کا بجسم اور مسولی پٹنم کی چھینٹ زرمبادلہ کمانے کے لئے شہرت رکھتے ہیں ۔

کمخواب یا زردوز

ہندوستانی دستکاروں کا تیار کردہ ایک عجوبہ ہے جس میں ریشم کے کپڑے پر بال جیسے باریک چاندی اور سونے کے تاروں سے پھول بنائے جاتے ہیں اور انواع و اقسام کی نقش و نگار ابھارے جاتے ہیں۔ زردوزی کے کام میں اترپردیش کے کاریگروں کو ہمیشہ شہرت حاصل رہی ہے اور ان کا تیار کردہ مال یورپ افریقہ اور مشرق وسطیٰ و مغرب کی منڈیوں پر غالب رہا ہے۔ امریکہ اور وسط مشرق میں آج کل اس کپڑے کی بہت مانگ ہے ۔ بنارس کے دستکاروں نے مغل دور میں اس دستکاری کو عروج تک پہنچا دیا ۔ آج بھی بنارس کا نام اس صنعت کے میدان میں سب سے زیادہ بلند ہے حالانکہ تعداد کے لحاظ سے سورت میں بنارس سے زیادہ زربفت تیار ہوتا ہے

ہمرو

کمخواب یا زربفت کی ایک ہلکی قسم ہمرو کہلاتی ہے جس میں ریشم کے ساتھ سوتی دھاگہ بھی شامل کیا جاتا ہے ۔ یہ زربفت کم خرچ اور عوامی پسند کا ہوتا ہے اس کی مقبول اقسام کے نام ہیں سادات بیل، گلزار عثمانی، بوستان آصفی، اشرفی

دکن کا پھول ۔ حمرو تیار کرنے کے بڑے مراکز حیدرآباد اور اورنگ آباد میں ہیں ۔ شاہ محمد تغلق ہنرمند کاریگروں کو احمد آباد، بنارس اور گجرات سے اورنگ آباد لایا تھا اس سے یہ دستکاری آندھرا پردیش کی دستکاریوں میں ہی شمار کی گئی ۔

ساڑیاں

ساڑی ہندوستانی عورتوں کا مشہور لباس ہے اس لئے اس کے تیار کرنے کے مراکز ملک کے کونے کونے میں پائے جاتے ہیں ۔ ہر خطے کے اپنے رنگ اور نمونے ہیں۔ لیکن اس کا ساڑیاں تیار کرنے میں اپنا مقام ہے وہاں ملک کے ہر خطے کے ذوق اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے سوت اور ریشم کی ساڑیاں تیار ہوتی ہیں۔ ہزاروں دستکاروں کی گزر بسر اس صنعت پر ہے ۔

کشیدہ کاری

کشیدہ کاری یعنی کپڑے پر سوزن کاری سے نقش نگار بنانا ہندوستان کا ایک قدیم اور روایتی فن ہے جس کی اشکال اجنتا اور ایلورا میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ آج کشمیر، پنجاب، کچھ، کاٹھیاواڑ، اتر پردیش، کرناٹک، بنگال اور کیرل کشیدہ کاری کے بہترین نمونے تیار کر کے ملک کی اس روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کشمیر کی کشیدہ کاری اپنے خوبصورت نمونوں اور لاتعداد رنگوں کے سبب ملک ہی نہیں غیر ملکوں میں بھی مشہور ہے کشمیر کی کشیدہ کاری عموماً ریشم یا اونی کپڑے پر کی جاتی ہے ۔ بہترین کشیدہ کاری وہ خیال کی جاتی ہے جو کپڑے کے دونوں جانب ایک جیسا دکھائی دے ۔ وہاں کشیدہ کاری کے اہم مراکز سری نگر، شالیمار، دچار ناگ، مساگام، بڈگام وغیرہ میں ہیں۔ کشیدہ کاری کا بہت سا کام نمدوں اور گبوں پر اونی دھاگے سے ہوتا ہے ۔ لیکن دستکاروں کی اجرت محنت کے مقابلے میں مناسب نہیں ہوتی ۔ بہت سی خواتین اپنے خالی وقت میں کشیدے کا کام کرتی ہیں ۔

اتر پردیش کی چکن

سوتی یا ریشمی کپڑے پر سوتی یا ریشمی سفید یا رنگ دار دھاگے سے بیل بوٹے بنانے کی صنعت کا نام چکن کاری ہے اور یہ کام پورے شمالی ہند میں بہت پسند کیا جاتا ہے ۔ دہلی، آگرہ، لکھنو، کانپور، بنارس، الہ آباد، پٹنہ اور گیا ہندوستان میں چکن کاری کا سامان تیار کرنے کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔ جیسے واسکٹیں، ٹوپیاں وغیرہ چکن سے تیار کئے جاتے ہیں۔ کم از کم تیس نمونوں میں چکن تیار کی جاتی ہے

یہ چکن کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے جس میں کشیدہ کاری کپڑے کے پشت پر ہوتی ہے بن نقش و نگار باریک ریشمی یا سوتی کپڑے کی دوسری جانب سے ابھر کر دکھائی دیتے ہیں

سونے اور چاندی کے تاروں سے کشیدہ کاری کی صنعت ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے موجود ہے لیکن مغل دور میں یہ بہت مقبول ہوئی۔ دہلی، لکھنو، بنارس، احمدآباد، سورت، ورنگ آباد اور حیدرآباد میں ہزاروں دستکار خاص طور پر اقلیتی طبقوں سے تعلق رکھنے والی خواتین اس فن کی امین ہیں اور اس دستکاری سے اپنے کنبوں کی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں

قالین سازی

قالین ایک اعلیٰ آرائشی چیز ہے جو بہترین خام مال اور ہنرمندی سے تیار ہوتا ہے۔ قالین کے بارے میں روایتی طور پر فرض کیا جاتا ہے کہ رنگ اور نمونے کے لحاظ سے یہ ایسا ہو کہ اس پر بیٹھنے والے کو جسمانی راحت اور ذہنی آسودگی حاصل ہو۔

قالین تیار کرنے کا نمونہ پہلے باقاعدہ لکھا جاتا ہے جسے تعلیم کہتے ہیں اور اس کے بعد باقاعدے یک ساتھ بیٹھ کر اس تحریک کے مطابق دھاگوں پر عمل کرتے ہیں۔ جتنی پتلی انگلیاں ہوں اتنا ہی اچھا قالین بنتا ہے۔ اسی لئے اس کام میں چھوٹے بچوں کو بھی لگایا جاتا ہے۔ مغلوں کے دور میں قالین سازی کی صنعت نے بہت بڑی خوشحالی کا دور دیکھا۔ اکبر نے بہترین کاریگروں کو بلا کر عمدہ قالین تیار کرنے کا کام سونپا۔ آگرہ، فتح پوری، مراد آباد، لاہور اور کشمیر کے قالینوں نے ایران اور توران کے قالینوں کو مات دے دی۔ شاہجہاں کے دور میں یہاں ایک مربع انچ سطح پر 1258 سے لے کر 2552 گانٹھوں تک کے قالین تیار کئے گئے۔ کشمیر میں زمانہ قدیم سے جو قالین تیار ہو رہے ہیں ان کا کچھ اپنا ہی مقام ہے جہاں کے کاریگر کشمیر کی پوری خوبصورتی اپنی مصنوعات میں سمو دیتے ہیں جس کے سبب وہاں کے قالین دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ شاہ زین العابدین اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر میں قالین سازی کی صنعت کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ قالین سازی کا اس وقت دوسرا بڑا مرکز اتر پردیش ہے جہاں مرزا پور، بنارس، جام پور اور باندیا کے 12 مربع میل کے علاقے میں تقریباً بیس ہزار کھڈیوں پر ہر برس لاکھوں میٹر قالینوں کا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ یہاں پر تیار ہونے والے قالینوں کے نمونے اب بھی ایرانی، ترکی اور افغانی نمونوں کے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہاں سے بہت سا مال برآمد ہوتا ہے اس لئے درآمد کرنے والوں کے ارسال کردہ نمونوں کے مطابق بھی قالین تیار کئے جاتے ہیں۔ مرزا پور نے تو حال ہی میں

اس کام میں عالمگیر شہرت حاصل کرلی ہے جہاں یہ صنعت ہزارہا لوگوں کی گزر بسر اور خوش حالی کا سبب بن گئی ہے۔

پیپر میشی یعنی کوٹے ہوئے کاغذ اور چکنی مٹی سے تیار کردہ ظروف اور آرائشی اشیاء پر رنگ و روغن سے نقش و نگار بنانے کا فن زیادہ تر کشمیر میں پایا جاتا ہے اور اس کی ابتدا یہاں مغل دور میں ہوئی۔ 18 ویں صدی میں سلطان زین العابدین نے سمرقند کے کاریگروں کو بلاکر اس فن کا وہاں عروج کیا اور آج یہ دستکاری مقامی لوگوں کے روزگار کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ سیاح پیپر میشی کی اشیا بڑے ذوق و شوق سے خرید کر لے جاتے ہیں۔ کئی بار وہ نقش و نگار جو شالوں اور قالینوں پر بنائے جاتے ہیں پیپر میشی کے سامان پر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ زیورات اور پاوڈر کے ڈبے، سگریٹ کیس، پیالے، اگردانیاں، موم بتی کے اسٹینڈ اور کئی دوسری اشیا کی بازار میں بہت مانگ ہے۔ وادی کشمیر کے بالخصوص شیعہ مسلمانوں میں اس فن نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ راجستھان میں جے پور، مدھیہ پردیش میں گوالیار اور مدراس میں تنجور میں بھی پیپر میشی کا خوبصورت سامان تیار کیا جاتا ہے۔

لکڑی کا سامان ہندوستان میں فن کے اظہار کے لئے پہلے پہل لکڑی کا استعمال کیا گیا جس کی مثالیں موریا خاندان کی راجدھانی پاٹلی پتر سے ملتی ہیں۔ لیکن مورتیوں کے علاوہ زندگی میں استعمال ہونے والی اشیاء کے لئے یہ بھی لکڑی کام میں لائی گئی۔ جہاں بھی نرم اور عمدہ لکڑی دستیاب تھی کاریگروں نے اس کا ہنرمندانہ استعمال کیا۔ لکڑی میں کندہ کاری اور ہاتھی دانت یا پیتل سے پچی کاری اس دستکاری کی دو اہم اشکال رہی ہیں۔ اگر اتر پردیش کو شیشم یا ساگوان کی لکڑی کا ایسا سامان بنانے کے لحاظ سے شہرت حاصل ہے جس پر پیتل اور ہاتھی دانت سے نقش و نگار بنائے گئے ہوتے ہیں تو کشمیر کو اخروٹ کی لکڑی سے کم وزن اور ہلکے رنگوں کے انواع و اقسام کے ظروف اور کھلونے بنانے کی صنعت میں کمال حاصل ہے۔ کشمیر میں اخروٹ کی لکڑی سے بنائی گئی اشیاء فرنیچر سے لے کر تصویروں کے فریم تک ہماری روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہیں۔ اتر پردیش میں   کا مقام لکڑی پیتل اور تانبے کے کام کے لحاظ سے ملک گیر شہرت رکھتا ہے جسے تارکشی کہا جاتا ہے

پیتل بھیت بھی اس کام کے لئے مشہور ہے ۔

ہاتھی دانت کا کام

ہاتھی دانت کا کام ۔ ہاتھی دانت سے دستکاریوں کے سامان کی تیاری ملک کے کم و بیش ہر اس حصے میں کی جاتی ہے جہاں نوابوں اور راجاؤں نے اس قیمتی مال کی سرپرستی کی ہے ۔ لکھنؤ میں ہنرمند دستکار ہاتھی دانت سے کنگھے، کھلونے مہرے دانیاں، شطرنج، تاج اور دوسری عمارتوں کے نمونے، چاقو، پیپر ویٹ، چھڑیوں کے دستے اور آرائش ڈبیاں بناتے ہیں ان کی روایتی نمونے اپنی خوبصورتی کے لئے ملک بھر میں مقبول ہیں ۔ بنارس میں بھی ہاتھی دانت کا بہت سامان تیار ہوتا ہے ۔ دہلی میں بھی اس صنعت نے مغل دور کے زوال کے بعد زوال دیکھا لیکن آزادی کے بعد پھر سے ترقی کی ہے ۔ یہاں تاج محل قطب مینار، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے، راکھ دانیاں، چوڑیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں جنھیں غیر ملکی سیاح بڑے شوق سے خرید کر لے جاتے ہیں ۔ یہاں خالص ہندوستانی روایت اور نمونوں کے مطابق ہاتھی دانت کا مال تیار ہوتا ہے ۔

دھات کا سامان

آثار قدیمہ سے ظاہر ہے کہ پانچ ہزار برس پہلے بھی ہندوستان کے دستکار دھات سے اشیاء کے فن کو عروج پر پہنچا چکے تھے اور اب تک ملک کے ہر حصے میں لاکھوں لوگ دھات کے ڈلوں یا چادر سے اشیاء تیار کرنے کا کام کرتے ہیں ۔ آندھرا پردیش میں بیدر کا مقام دھات پر تارکشی اور بیل بوٹے بنانے کے لئے مشہور ہے جس سے حقے، پاندان، اگالدان پھولدان، طشتریاں اور آفتابے بنائے جاتے ہیں ۔ جے پور، دہلی، لکھنؤ اور مرادآباد میں پیتل اور تانبے کے برتنوں اور اشیاء پر کندہ کاری کرکے ان میں کئی اقسام کے رنگ بھرے جاتے ہیں آگرہ اور لکھنؤ دھات کے برتنوں کے لئے مشہور ہیں ۔ پیتل کا سامان مرادآباد اور اترپردیش کے مغربی حصوں میں عام ہے ۔

زیورات

انسان نے جب سے اپنی آرائش شروع کی زیورات کا فن وجود میں آیا مگر لگے یہ فن اور اس کے نمونے ملک کے کونے کونے میں موجود ہیں لیکن چند سو برس کا مغل دور ہندوستان میں زیورات تیار کرنے کے فن کا سنہری دور تھا ۔ وہ غیر ممالک کے ماہر کاریگروں کو بھی ہندوستان لائے اور زیورات کے فن کی نئی نئی اقسام یہاں رائج کیں ۔

باقی پر صفحہ

ماہنامہ شاداب حیدرآباد
جنوری ۱۹۸۸ء

۴۱

ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ

آلودگی کیا ہے؟

قدرتی ماحول کو پاکیزگی سے محروم رکھنے کی کیفیت ہی آلودگی ہے

یہ ایک غیر فطری کیفیت ہے۔ چند زہریلے اشیاء کا قدرتی وسائل میں ملاپ ہوتا ہی غیر معمولی تبدیلی کا واقع ہونا ہے۔ ایسا مضر عمل ہی آلودگی ہے۔

کرہ ارض پر ہر طرف تہذیب کا چرچا ہے، ترقی کے کارنامے ہیں، صنعتی کارخانوں کی کمی نہیں، وسائل کی بھرمار ہے، ساتھ ہی ساتھ کوئی بیس پچیس سال سے آلودگی کے گھنے بادلوں سے دنیا گھری ہوئی ہے۔ انگلستان ہو یا ہندوستان، چین ہو یا امریکہ، روس ہو یا افریقہ، ہر ملک میں کسی نہ کسی پیمانہ پر آلودگی کے آثار نمایاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں ہولینڈ نہایت ہی آلودگی سے متاثر ہے۔ ہولینڈ کے لوگ پندرہ فیصد دموی امراض میں، ۴۰ ٪ ورم میں، ۴۷ ٪ پھیپھڑوں کے امراض میں مبتلا ہیں۔ ایک سو بیانوے صنعتی مراکز چھ لاکھ پچاس ہزار ٹن کا دھول خصوصاً سلفر ڈائی آکسائیڈ سے ملا ہوا پھیلاتے ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے شاہراہوں پہ، چوراستوں پر، مرکز پر مجسمے کھڑے کردئے جاتے ہیں چاہے وکٹوریہ کا ہو، لینن کا ہو یا نہرو کا، گاندھی کا ہو یا کارل مارکس کا، ہوا میں مضرت رساں ذرات جو موجود رہتے ہیں ان پر آکر جم جاتے ہیں۔ سمنٹ کے ہوں تو تڑخ جاتے ہیں، لوہے کے، کانسہ کے، تانبہ کے ہوں تو گرد کی پرتیں جم جاتی ہیں اور کیمیائی تاثرات واضح ہو جاتے ہیں۔

اکٹوبر ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتہ میں "ڈونرا" کے مقام پر سلفورک ایسڈ کارخانہ سے بلا کا دھواں نکل پڑا تھا جس کی وجہ سے چودہ ہزار ایک سو افراد متاثر ہوئے، بیس لوگ موت کے منہ اتر گئے۔ ۱۹۵۲ء کے لندن سماگ ڈساسٹر سے (لندن کا کالی دھواں کا حادثہ)

2-2-1144/1/B، پوسٹ آفس گلی، نیو نلاکنٹہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۴

چار ہزار لوگ مرگئے۔ آندھرا پردیش کے "کوور" میں چھ سو افراد ۱۹۷۶ء میں کھاد کے کارخانہ کے گیس واخراج سے بے ہوش ہو گئے۔ بھوپال کا شیطانی حادثہ جو ۱۹۸۴ء میں ہوا۔ میتھل آئیسوسیانیٹ سے دو ہزار افراد فوت ہوگئے اور ایک لاکھ لوگ متاثر ہوئے۔ کئی ہزار بچے یتیم ہو گئے ہندوستان کے ۴۲ شہروں میں "نیری" (NEERI) کے مطابق ۸ شہروں میں گندے پانی کو لے جانے والی موریوں، نالیوں کو نکالنے کا بندوبست ہے۔ ندی، دریا، تالاب، جھیل کے پانی کا ستر فیصد آلودگی کا شکار ہے۔ آلودگی انسان کے لئے حل طلب مسئلہ بن گیا ہے۔

ماحول کے دائرے میں ہوا ہے، پانی ہے، زمین ہے، گیس و الکحلات ہیں، جانور ہیں، پودوں کی، درختوں کی کمی نہیں۔ گرد، دھول، بخارات، ذرات، تابکاری، بدبو، جراثیم تپش کی کمی نہیں، شور و غل تو ہر طرف موجود ہے۔

آلودگی کے کئی اقسام ہیں۔ مثلاً (۱) ہوائی آلودگی (فضائی آلودگی)۔(۲) آبی آلودگی۔ (۳) زمینی آلودگی (۴) تابکاری آلودگی (۵) تھرمل آلودگی (۶) آوازکی آلودگی (۷) بینائی کی آلودگی۔

معدنی کانوں اور کارخانوں سے نکلے ہوئے گیس و ذرات سے فضائی آلودگی واقع ہوتی ہے مثلاً پٹرولیم کے کارخانے (گجرات، آسام، آندھراپردیش میں ہیں) صنعتی کارخانے (جو ہر ریاست کے شہروں کے وسط میں ہیں)، ولسبیتی کے کارخانے، تیل کے کارخانے، ان سے خارج کردہ زہریلے مالکات و گیس، بخارات و ذرات، دھواں شہر کو گھیر لیتے ہیں اور آسمان کا نیلگوں پن دکھ نہیں پاتا شہریوں کو، دھواں سرما کے زمانے میں کہر سے مل کر "سماگ" پیدا کرتا ہے۔ سلفورک ترشہ، ہیڈروکلورک ترشہ، کپڑے کے کارخانوں سے ہیڈروجن سلفائیڈ، کلورین گیس کا اخراج ہوتا ہے۔ یہ ماحول میں وبا پیدا کر دیتی ہے، پودوں میں ان کی وجہ سے نمو رک جاتا ہے۔ جانوروں میں، انسان میں تشنج کے امراض پھیلتے ہیں، خون کے امراض بھی آجاتے ہیں، سر کا درد بھی آسکتا ہے، عمارات پر بھی گرد کی تہہ جم جاتی ہے۔ متھرا کے تیل کے کارخانوں سے نکلے ہوئے ذرات تاج محل کے اوپر جم جانے کا منظر ہمارے سامنے ہے۔ آندھرا یونیورسٹی کے ممتاز ماہر ماحولیات شری شیلواجی راؤ نے "تاج محل بچاؤ" کتابچہ بھی شائع کیا ہے۔ بس، اسکوٹر، موٹر سائیکل، موپیڈ، ریل گاڑی، ڈیزل انجن سے نکلے ہوئے دھوئیں میں ادھ جلے ہیڈروکاربنس موجود ہوتے ہیں۔ یہ سانس کے ذریعہ تنفس میں داخل ہوجاتے ہیں۔ استھما کی کیفیت نمودار ہوتی ہے مریض میں۔ اسکول کے بچے شہروں میں اس طرح کی حالت میں پھنسے رہتے ہیں۔

پینے کا پانی دریا سے، کنویں سے، تالاب سے، جھیل سے، نہر سے دستیاب ہوتا ہے جس نہ کہیں غلاظت کی ملاوٹ ہو ہی جاتی ہے، کچرے کی وجہ سے، فضلہ کی وجہ سے، زہریلے مائعات کی وجہ سے بھیانک تبدیلی جو پانی میں ہو جاتی ہے اسے آبی آلودگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گومتی، گنگا، جمنا، کاویری، گوداوری، کرشنا کے پانی میں آلودگی اونچائی پر ہے۔ حال ہی میں گنگا کو صاف رکھنے کی مہم مرکزی سطح پر شروع کر دی گئی ہے۔

اتر پردیش کے کئی جامعات میں منصوبے بھی تحقیق کے لئے بنائے گئے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اساتذہ و اسکالرس نے حسین ساگر کے پانی پر تحقیقی مقالے پیش کئے ہیں۔ قومی ماحولیاتی تحقیقاتی ادارہ ناگپور میں قائم کردہ ہے۔ جس کی ایک شاخ حیدرآباد میں ہے۔ آبی آلودگی سے ہیضہ، ٹائیفائیڈ، یرقان پھیل جاتے ہیں۔

سمندر میں کوڑا کرکٹ، غلاظت، فضلہ، صنعتی اخراجات، ٹن کے ڈبے، موٹر کار کے ناقص حصے، ناکارہ اشیاء بے رحمی سے پھینک دیئے جاتے ہیں۔ مضر مائعات جیسے پارہ، سیسہ بھی سمندری پانی میں گھل مل جاتا ہے۔ مچھلیاں و دوسرے انواع بھی اچانک مرجاتے ہیں۔ بعض اوقات مچھیرے بھی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ جاپان میں متاثرہ مچھلیوں کو کھانے سے ایک دفعہ ۶۴ لوگ مرگئے۔ ہندوستان میں کنا نور کے ساحل پر بھی خوفناک حادثہ ہوا تھا۔

چند حراثیم کش مائعات وادویات کے چھڑکاؤ سے کیڑے مرجاتے ہیں، فصل بھی اچھی نکل آتی ہے لیکن مائعات کا اثر زمین پر رہ جاتا ہے، زرخیزی میں فرق آجاتا ہے۔ اسے زمینی آلودگی کہتے ہیں۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی، پیسٹی سائیڈس کے بجائے کیڑے مکوڑوں میں اگر تولید کی روک تھام کریں متبادل فصل اگاؤ کو اپنائیں تو زمین کی آلودگی میں کمی ہو سکتی ہے۔

ایٹمی توانائی کے تجربات وانسان سوز استعمال سے اطراف واکناف کے ممالک کے باشندوں کو کئی نسلوں تک تابکاری کا خدشہ رہ پاتا ہے۔ ہیروشیما وناگاساکی کے حادثے ہمارے دماغوں میں بس گئے ہیں۔ وہ ہماری بھیانک یادیں ہیں۔ ایک فیصد تابکاری بھی مضر ہے صحت کے لئے خون کا کینسر، ہڈی کا کینسر بھی آجاتا ہے تابکاری آلودگی سے۔

چند کارخانوں سے گرم پانی تالاب میں بہتر ملنے کی وجہ سے تپش میں اضافہ ہوتا ہے۔ الجی، کائی، پھپھوندیاں بھی متاثر ہو جاتی ہیں۔ ان کی حیاتیاتی توازن میں فرق آجاتا ہے۔ آبی ماحول میں بھونچال سا ہوتا ہے۔ یہ تھرمل آلودگی کی کیفیت ہے۔

شورش ایک غیر ضروری آواز کا مظاہرہ ہے۔ ٹن و موٹر کے کارخانوں سے، فرنیچر کے کارخانوں سے، ریلوے پلاٹ فارم سے، بس اسٹانڈ سے، ٹرینوں کی مسلسل آمدورفت سے شور ہمارے کانوں کو متاثر کرتا ہے۔ ڈیسیبل آواز کی اکائی ہے۔ انسان کے کان ایک سو ڈیسیبل تک سہہ لیتے ہیں۔ اس سے بڑھ جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آواز کی آلودگی ہوگئی ہے۔ کپڑے کے کارخانہ میں، چھپائی کے پریس میں و دیگر صنعتی کارخانوں میں بھی آواز کا طوفان رہتا ہے آواز کی آلودگی کا اثر انسان کی شریانوں پر ہوتا ہے۔ آنکھ کی پتلیاں دھیمی ہوجاتی ہیں معدہ میں ہاضمی اس کا اخراج سست ہوجاتا ہے۔ اچانک بھیانک آواز سننے سے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ آجکل شاہراہوں پر، ہوائی اڈوں پر گونج کی وجہ سے، شور کی وجہ سے آواز کی آلودگی میں اضافہ ہورہا ہے۔ جشن کے مواقع پر شور کا زیادہ ہونا ہر شہر میں شہری کے لئے روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ ہوائی اڈے کے دس کلو میٹر کے احاطہ میں کسی قسم کی تعمیر عمل میں نہیں آنا چاہیے۔ اسکول، دواخانہ، دفتر کے قریب میں شورش نہ کرنے کا نشان لگانا ضروری ہے قانون کے ذریعہ آواز کی آلودگی کی روک تھام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

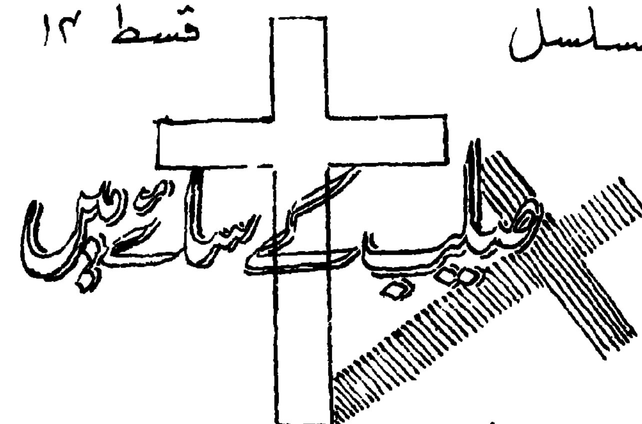
سیان سین، چمکنے والی گھڑیوں سے، جگمگاتی روشنی سے انسان کی بینائی میں بھی فرق آجاتا ہے۔ ٹی۔ وی کو مسلسل دیکھنے سے خصوصاً نزدیک سے دیکھنے سے بھی آنکھیں کمزور ہوجاتی ہیں نیز روشنی سے بھی بینائی کی آلودگی واقع ہوتی ہے۔

دور حاضرہ میں ہر ملک میں امراض کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ ماحول کو صاف رکھنے کے لئے سٹاک ہوم میں کانفرنس بلائی گئی۔ عالمی ادارہ صحت کی سرکردگی میں ماحول صاف نہ رہے تو صحت عامہ کو خطرہ ہے۔ ائیر پولیوشن کنٹرول ٹکنالوجی کا چرچہ امریکہ میں زیادہ ہے۔ ہندوستان میں کلین ایر ایکٹ پارلیمان میں منظور کردہ ہے۔ ہماری ریاست میں بھی واٹر پولیوشن کنٹرول بورڈ بھی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں انڈین سائنس کانگریس سشن میں "ماحول کا تحفظ" کے عنوان پر کافی بحث کی گئی۔ آلودگی سے بچنے کے لئے کئی مدافعتی تدابیر پر بھی غور کیا گیا۔ ماحولیاتی آلودگی کا مطالعہ ہر شہری کے لئے ضروری ہے۔ ماہرین محققین تحقیقاتی امور کو عام فہم و سہل زبان میں لانا ضروری ہے۔ آئے دن درسی کتب میں ان امور پر اسباق اگر لکھوائیں تو بچے ان مضر رساں اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ کہاوت مشہور ہے "آج کے بچے کل کے شہری ہیں" ہر طرح کی آلودگی سے بچنے کے لئے، صحت عامہ کی سرفرازی کے لئے کافی لٹ ٹہیر بھی ضروری ہے۔ البرٹ آئن اسٹائن نے کہا تھا۔

"دو چیزیں لامحدود ہیں ایک کائنات، دوسرا انسان کی نادانی، ماحول میں بگاڑ، بدنظمی پھیلانا ہی ہماری سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ شاید مزید مہذب بننے کی سمت میں۔"

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

مسلسل قسط ۱۴



عوامی جدوجہد

۱۷ فروری ۱۱۱۱ء بروز جمعہ قاضی ابن الخشاب اپنے ساتھیوں سمیت جامع مسجد بغداد میں دراتا گھس آیا۔ اس کے ساتھ والوں میں اہالیان الیو کے منجملہ ایک شریف ہاشمی، کئی مرتاض صوفیاء، ماماں مساجد اور تجار شامل تھے۔ ابن قلانسی رقمطراز ہے :

"انھوں نے زبردستی خطیب جمعہ کو منبر سے گھسیٹ کر نیچے اتار دیا، منبر کو توڑ دیا، پھر انھوں نے بآواز بلند بین کرنا شروع کر دیا کہ ہائے افسوس عالم اسلام پر آج یہ وقت آگیا ہے کہ مغرب کی طرف سے آنے والے فرنگی مسلمان مردوں کو دن دھاڑے قتل کر رہے ہیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا رہے ہیں چونکہ ان کی یہ چیخ و پکار نماز جمعہ کی ادائیگی میں حارج ہو رہی تھی جس کے لئے حسب معمول ایک خلقت اکٹھی ہوئی تھی اس لئے عمالان مسجد نے انھیں سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ بے شک سلطانی فوجیں ان کافر فرنگیوں کے ظلم سے عامتہ المسلمین کو نجات دلانے کے لئے ضرور روانہ ہوں گی ۔"

لیکن یہ خوشنما الفاظ ان کی تسلی کے لئے کافی نہ تھے۔ دوسرے جمعہ کو انھوں نے دوبارہ اپنے مظاہرہ کا آغاز کیا۔ اس مرتبہ یہ مظاہرہ خلیفہ کی مسجد میں ہوا۔ جب خلیفہ کے سپاہیوں نے انھیں مسجد میں داخل ہونے سے روکنا چاہا تو وہ انھیں ڈھکیل کر اندر گھس آئے اور منبر کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا اور خود خلیفہ کے خلاف نعرہ ہائے مذمت بلند کرنے لگے۔ سارے بغداد میں ایک ہلڑ مچ گیا۔

"ایسے وقت میں سلطان محمد کی بہن جو خلیفہ مستظہر باللہ کی بیوی تھی اصفہان سے اپنے قافلے کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئی۔ ملکہ کے ساتھ بے شمار ہیرے جواہرات زریں ملبوسات، اعلیٰ نسل کے گھوڑے مع ساز پائے زریں، ریشم واطلس میں ملبوس لونڈیاں اور غلام اور دوسرے لاقیمت تحائف تھے۔ بغداد میں اس مظاہرے کی گڑبڑ اور آوازیں سن کر ملکہ کی طبیعت بہت منغض ہوئی۔ خود خلیفہ نے بھی اپنی شدید ناگواری کا اظہار کیا اور کہا کہ ان گڑبڑ پھیلانے والے اشرار کی تادیب کی جائے۔ لیکن سلطان نے خلیفہ کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔ مظاہرین کی خطائیں معاف کیں اور اپنے امرا اور سرداروں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے صوبوں کو واپس ہو کر فرنگیوں کے خلاف جہاد کی تیاری کریں۔"

خلیفہ کے لئے ناراضی کی خاص وجہ موجود تھی۔ وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اس ہلڑ نے اس کی نوجوان بیوی کی طبیعت کو منغض کر دیا تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ گلی کوچوں میں لوگ خلیفہ کو برا بھلا کہنے لگے تھے، کہنے لگے تھے کہ بغداد کے اس امیر المومنین سے تو قسطنطنیہ کا قیصر روم ہی بہتر مسلمان ہے اور وہ جانتا کہ ان کا یہ کہنا کچھ غلط نہ تھا کیونکہ ان لوگوں کا اشارہ اس مکتوب کی طرف تھا جو حال ہی میں خلیفہ کے دیوان کو قیصر روم ایلکسس کومی نینس کے پاس سے وصول ہوا تھا جس میں قیصر روم نے خلیفہ کو دعوت دی تھی کہ وہ فرنگیوں کو ملک سے باہر نکالنے میں اس کی مدد کرے۔

قاضی الیو ابن الخشاب اور قیصر روم ایلکسس کے درمیان اس اتحاد مقصد و خیال کی وجہ ایک ہی تھی وہ تھی فرنگی سردار ٹینکرڈ کے ہاتھوں ان کی ذلت اور رسوائی۔ ہوا یہ کہ جب قیصر روم کے ایلچی ٹینکرڈ کے دربار میں یہ یاد دلانے کے لئے پہنچے کہ تیرہ سال پہلے فرنگیوں نے ایلکسس سے وعدہ کیا تھا کہ فتح کے بعد وہ انطاکیہ قیصر روم کو واپس کر دیں گے۔ لیکن اتنا زمانہ گزر جانے کے باوجود انھوں نے ہنوز اپنا وعدہ ایفا نہیں کیا۔ ٹینکرڈ نے انطاکیہ دینے کے بجائے ان ایلچیوں کو دھکے مار کر دربار سے نکلوا دیا ادھر رضوان پر اس کی دوستی کے صلے میں یہ تاوان عائد کیا گیا کہ وہ سالانہ بیس ہزار دینار، الیو کے دوا ہم قلعے اور اعلیٰ نسل کے دس گھوڑے ٹینکرڈ کی بالادستی کی قبولیت کے اظہار کے طور پر ادا کرے۔ رضوان نے ہمیشہ ہی کی طرح ڈر کر ہر طرح کی شرط منظور کر لی لیکن اہل شہر میں اس تازہ ذلت اور رسوائی کی وجہ سے غیض و غضب کی ایک زبردست لہر اٹھی۔

ابن الخشاب الیو کی سب سے معزز اور مقدس شخصیت تھی۔ اس کے آبا و اجداد لکڑی کا کاروبار کیا کرتے تھے اور خاصے امیر لوگ تھے اور شہر کے نظم و نسق میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک شیعی قاضی کی حیثیت سے اس کی بڑی تعظیم و تکریم ہوا کرتی تھی اور اس کی لیاقت کے سبھی معترف

تھے اور اس کے فیصلوں کے مداح بھی۔ قاضی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ رئیس شہر بھی تھا۔ اس عہدہ کی بنا پر وہ ملک التجار بھی کہلاتا تھا اور امیر عساکر بھی۔

لیکن ابن الخشاب نے اپنا دائرہ عمل ان معمولی فرائض سے اور زیادہ وسیع کر لیا تھا جب سے کہ اس علاقے میں فرنگیوں کی آمد شروع ہوئی تھی اس نے اپنے حلقہ کے لوگوں کے ذریعہ سے ملک میں ان فرنگیوں کے خلاف مجاہدانہ اور وطن پرستانہ خیالات کی ترویج شروع کر دی تھی وہ ایک ایسی رائے عامہ کی تربیت کی دھن میں لگا ہوا تھا جو ان غیر ملکی فرنگیوں کو ملک سے نکالنے کے لئے شدید اقدامات کا مطالبہ کر سکے۔ وہ رضوان کو برملا اس کی بزدلی اور خود غرضی پر لعنت ملامت کیا کرتا تھا۔ جب ٹینکرڈ نے رضوان کو مجبور کر کے الیپو کی جامع مسجد کے گنبد پر ایک صلیب آویزاں کروائی تو الخشاب نے شہر میں نفرت اور بغاوت کا ایسا طوفان برپا کیا کہ رضوان کو مجبوراً وہ صلیب مسجد کی گنبد سے اتار کر سینٹ ہیلن کے کلیسا پر نصب کرنی پڑی۔ اس وقت سے رضوان قاضی الخشاب سے کسی بھی مڈبھیڑ سے کترانے لگا اور اپنے قلعہ میں خانہ نشین ہو کر بیٹھ گیا۔ جب تک اس کے اقتدار پر کوئی آنچ نہ آتی تھا وہ رائے عامہ کو برداشت کرنے آمادہ تھا۔

لیکن الخشاب نے اسے اپنے قلعے میں بھی چین لینے نہ دیا۔ وہاں جا کر بھی اس نے رضوان کو رعایا میں پھیلی ہوئی ناراضگی سے خبردار کرنا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ مسلمان اس خبر سے سخت برافروختہ ہیں کہ انھیں ان فرنگی کافروں کو رقم تاوان ادا کرنی ہوگی اور الیپو کی ساری تجارت اس وقت سے سخت خطرے میں پڑی ہوئی ہے جب سے انطاکیہ پر فرنگیوں کا قبضہ ہوا ہے اور چونکہ اس فرنگی خطرے کے اندفاع کی طاقت اس علاقے میں نہیں ہے اس لئے لوگ چاہتے ہیں کہ شہر کے سارے سنی اور شیعہ مسلمانوں کا ایک وفد سلطان محمد کے پاس مدد کے لئے بغداد روانہ کیا جائے۔ رضوان کو العراق کے مشن کا حشر یاد تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس بار بھی کسی وفد کی کسی کارروائی کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے اس لئے اس نے روانگی وفد کی حامی بھر لی۔

لیکن اس بار رضوان کا خیال غلط نکلا۔ توقع کے خلاف فروری ۱۱۱۱ء میں بغداد کے مظاہرہ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ سلطان کو جب شہر صیدا کے سقوط کی اطلاع دی گئی اور بتایا گیا کہ کس قسم کا صلح نامہ الیپو پر عائد کیا گیا ہے تو اسے بھی فرنگی کے عزائم سے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس نے موصل کے نئے حاکم مودود کو حکم دیا کہ ایک طاقتور فوج لے کر الیپو کی مدد کے لئے روانہ ہو جائے۔ ابن الخشاب نے جب بغداد سے واپس آ کر رضوان کو سلطان محمد

ایک بڑی فوج کے ساتھ الیپو کو مدد روانہ کرنے کی خبر سنائی تو رضوان نے بظاہر بڑی خوشی کا اظہار کیا لیکن دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ یہ مدد کبھی نہ پہنچے یہاں تک کہ جب ماہ جولائی ۱۱۱۱ء میں رضوان کو سلطان محمد کی فوج کے آلیپو کے قریب پہنچنے کی خبر سنائی گئی تو وہ اپنے کو نہ روک سکا۔ اس نے شہر کے دروازے بند کرنے، راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور ابن الخشاب اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کیا۔ ترک سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آلیپو کے شہریوں کو کسی صورت سلطان محمد کی فوجوں کے لوگوں سے ملنے سے روکیں۔ ادھر جب رضوان کے مقاطعہ کی وجہ سے سلطانی افواج کو رسد ملنے میں دشواری ہونے لگی تو انھوں نے شہر کے اطراف لوٹنا شروع کر دیا۔ ادھر مودود اور اس کے ساتھی سرداروں میں اس حد تک اختلافات ہو گئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے موصل کی ساری فوج تتر بتر ہو گئی۔

اس کے دو سال بعد سلطان کے حکم پر مودود دوبارہ ملک شام کو لوٹا۔ سلطان کا حکم یہ تھا کہ رضوان کو چھوڑ کر شام کے سارے حاکموں کو فرنگیوں کے خلاف جہاد کے لئے طلب کیا جائے۔ مودود نے دمشق کو اپنا مستقر قرار دے کر یروشلم پر حملے کی بڑے پیمانے پر تیاریاں شروع کر دیں۔ دمشق کے حاکم تغتگین نے سلطانی افواج کی آمد اور دمشق کا مستقر بنانے کی عزت افزائی پر بڑی خوشی کا اظہار کیا لیکن دل میں رضوان کی طرح وہ بھی فکرمند اور متردد تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مودود کا اصل منشاء دمشق پر قبضہ کرنا ہے اس لئے وہ اس کے ہر عمل سے خائف تھا۔

ابن قلانسی لکھتا ہے ۲/اکتوبر ۱۱۱۳ء کو مودود لنگڑے اتابک تغتگین کے ہمراہ فولادی گیٹ کے راستے سے مسجد امیہ کو گیا جیسا اس کا ہر روز کا معمول تھا۔ جب نماز فرض ختم ہوئی اور مودود نے نوافل بھی ادا کر لئے تو دونوں حکام واپس لوٹے۔ اتابک تغتگین آگے بڑھ گیا ان دونوں کے ساتھ ان کے محافظ دستے کے سپاہی تھے جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ تھے۔ جوں ہی وہ مسجد کے صحن میں پہنچے نمازیوں میں سے ایک شخص سوالی کے انداز میں مودود کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر دفعتاً اپنی قبا سے اس نے خنجر نکالا اور اس خنجر سے اس نے دو بار مودود پر نہایت کاری وار کئے۔ تغتگین کے محافظ دوڑے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ادھر مودود اسی زخمی حالت میں فولادی گیٹ تک پیدل پہنچا اور پھر ڈھیر ہو گیا۔ ایک جراح کو طلب کیا گیا جس نے بعض زخم سی بھی دئے لیکن مودود ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

اس دن جب کہ گورنر موصل مودود فرنگیوں کے خلاف اقدام کرنے والا تھا کس نے
ـے قتل کیا؟ تغتگین نے اس کا سارا الزام رضوان اور اس کے باطنی ساتھیوں پر عائد
لیکن اکثر دمشق والوں کو پختہ یقین تھا کہ یہ سب کیا کرایا تغتگین ہی کا تھا۔ ابن الاثیر
تا ہے کہ بالڈوِن پر اس قتل کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے ایک تعزیت نامہ تغتگین کو روانہ
۔ اس نے لکھا جو قوم اپنے قائد کو خانۂ خدا میں قتل کرنے سے نہ چوکے اسے دنیا کی
ی طاقت ہلاکت و بربادی سے نہیں بچا سکتی۔ سلطان محمد کو جب اس قتل کی اطلاع
) تو غیظ و غضب کے عالم میں شیر کی طرح دھاڑنے لگا اور اس نے ملک شام
ـ سارے حاکموں کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ اس نے ہزاروں کا ایک لشکر اکٹھا
جس کی قیادت بہترین سلجوق امیر کر رہے تھے اور تمام شاہان شام کے نام حکمنامے
ری کئے کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر سلطانی جہاد میں شامل ہونے کے لئے حاضر ہو جائیں۔
لیکن ۱۱۱۵ء کے موسم بہار میں سلطانی فوجیں ملک شام میں داخل ہوئیں تو ان کی
رت کی انتہا نہ رہی جب اس کے مقابلے میں نہ صرف یروشلم کا بالڈوِن اور انطاکیہ
ر تریپولی کے حکمران ہی تھے بلکہ دمشق کا تغتگین اور الیپو کا راضوان بھی ان میں شامل
ما۔ اپنے خلاف اس متحدہ محاذ کو دیکھ کر سلطان محمد مایوس ہو گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ
ئندہ وہ کبھی اہل شام کے معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا اور یوں بغیر لڑے
مڑے وہ بغداد واپس ہو گیا۔
۱۱۱۱ء میں یروشلم کے بالڈوِن نے عسقلان پر فوج کشی کی۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ
فرنگیوں کو دیکھ کر ہی والیٔ عسقلان شمس الخلیفہ کے چھکے چھوٹ گئے اور اس نے بہ پیش کشی
زر کثیر ان سے صلح کی درخواست کی۔ عسقلان کے شہر کی اہمیت یہ تھی کہ فلسطین پر حملے سے
پہلے مصری فوجیں اسی بندرہ کے ذریعہ فلسطین میں جمع ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اہلیان شہر اس
ذلت اور رسوائی سے سخت ناراض ہوئے اور انھوں نے وزیر الافضل کو مدد کے لئے لکھ بھیجا
کہ اس والی عسقلان کو برطرف کر کے کسی اور کو وہاں کا والی مقرر کیا جائے۔ اس پر
شمس الخلیفہ گھبرا گیا۔ اس نے مصری عمال کو شہر سے نکلوا دیا اور اپنے آپ کو
فرنگیوں کی حفاظت میں دے دیا۔ بالڈوِن نے اس کی حفاظت کے لئے تین سو
فرنگی سپاہی روانہ کئے جنھوں نے عسقلان کے قلعہ پر قبضہ کر لیا
لیکن اہل شہر نے ہمت نہیں ہاری اور ایک دن جب شمس الخلیفہ اپنے گھوڑے

پر سوار محل کی طرف جارہا تھا سازشیوں نے اس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ یہ گویا بغاوت کا اشارہ تھا۔ مسلح شہریوں اور گیریزن کی محافظ فوج کے بربری دستوں نے قلعہ پر ہلہ بول دیا اور سارے فرنگیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح آئندہ چالیس سال تک یہ شہر فرنگی تسلط سے محفوظ رہا۔ عسقلان کی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے بالڈون نے ٹائر کا رخ کیا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں سے یوروپا (جس کے نام پر اس براعظم کا نام یورپ رکھا گیا تھا) کا بھائی کیڈمس قدیم فونیقی دور میں اپنے حروف تہجی کے ساتھ بحیرہ روم کے ملکوں کو روانہ ہوا تھا۔ شہر کے تین طرف سمندر اور صرف ایک سمت میں خشکی تھی اور سکندر اعظم کی بنائی ہوئی ایک تنگ شاہراہ اسے خشکی سے ملاتی تھی یہ قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اور اسی وجہ سے فرنگیوں کے ہاتھ پڑنے والے شہروں سے پناہ گزیں بھاگ کر یہاں جمع ہوگئے تھے اور شہر کی دفاع میں سب سے بڑا ہاتھ انہی پناہ گزینوں کا تھا۔ یہاں ذیل میں ہم ابن قلانسی کی چشم دید شہادت درج کرتے ہیں:

"فرنگیوں نے شہر پناہ کے قریب لکڑی کا بنا ہوا ایک متحرک برج ایستادہ کیا تھا جس میں ایک دروازہ شکن شہتیر نصب تھا۔ اس شہتیر کی ضرب سے قلعہ کی دیواریں لرزنے لگیں اور کئی پتھر زمین پر آرہے اور محصورین نے اپنے آپ کو تباہی کے دہانے پر کھڑا محسوس کیا۔ ایسے وقت تریپولی کا ایک ملاح جو دھاتوں کو پگھلانے کے فن سے واقف تھا اور جس کو تریپولی کے محاصرے کا بھی تجربہ تھا اس نے آہنی آنکڑوں grapnel کی وضع کا ایک ہتھیار ڈھالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان پنجے نما قلابوں کو رسوں کی مدد سے دروازہ شکن شہتیر پر اس طرح پھینکا جاتا کہ وہ اس شہتیر سے لپٹ جاتے اور پھر ان رسوں کو ایک زبردست جھٹکا اس طرح دیا جاتا کہ متحرک چوبی برج اپنا توازن قائم نہ رکھ کر زمین پر آرہتا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے کئی برج بیکار کر دئے گئے اور باقی کو بچانے کے لئے ان شہتیروں کو برجوں سے جدا کرکے ان کو ٹوٹنے سے بچایا گیا۔"

لیکن کچھ عرصے بعد فرنگی بہرحال ایک بڑے برج کو قلعے کی دیواروں کے قریب لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں ایک زبردست شہتیر لگا ہوا تھا۔ جس کا سر لوہے کا تھا اور وزن دس من کے قریب تھا۔ لیکن تریپولی کے ملاح نے بھی ہار نہیں مانی تھی۔

اس نے گندگی اور غلاظت سے بھری ہوئی بڑی بڑی مشکیں اس برج اور اس میں کھڑے ہوئے سپاہیوں کے سروں پر پھکوا دیں۔ گندگی اور چکنا ہٹوں میں لت پت سپاہی جب

دماغ بدبو سے پھٹا جا رہا تھا اور ہاتھ اور پیر اتنے چکنے اور پھسلوان ہو رہے تھے کہ کھڑا ہونا اور کسی چیز کو تھامنا مشکل ہو رہا تھا زیادہ دیر وہاں ٹھیر نہ سکے۔ اس کے بعد اس نے مزید کوڑا کرکٹ پھکوانے کے بعد روغن نفت کے ذریعہ اس برج کو آگ لگادی اور اس مزید کوڑا کرکٹ، تیل اور روغن نفت کی بارش برساتے رہے یہاں تک کہ سارا برج جل کر تباہ ہوگیا۔"

فرنگی سپاہ کو پسپا ہوتا دیکھ کر قلعہ کے سپاہیوں نے ان پر حملہ کیا اور بہت سا ساز و سامان اور ہتھیار لوٹ کر قلعے میں واپس آگئے۔ ۱۲/ اپریل ۱۱۱۳ء کو ۱۳۲ دن کے محاصرے کے بعد اہل ٹائر نے فرنگیوں کو شکست فاش دے دی۔

بغداد کے مظاہرے، عسقلان کی بغاوت اور ٹائر کی مقاومت نے اس خطۂ ارض میں بغاوت کی ایک ایسی آندھی کو جنم دیا جس نے ایک سو سال کے اندر فرنگیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

اس راستے میں کئی نشیب و فراز آئے لیکن رائے عامہ میں پہلی بار ایسی بیداری پیدا ہوئی جو اس سے پہلے مفقود تھی۔ اب عوام نے فرنگیوں کے ساتھ اپنے مفاد پرست، مطلبی اور خود غرض بادشاہوں اور امیروں سے بھی نفرت کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنے حاکموں کی آرام طلبی پست ہمتی اور غداری پر بھی لعنتیں اور ملامت کے تیر برسانے لگے۔ سب سے پہلے یہ بیداری آلیپو سے شروع ہوئی جہاں قاضی الخشب کی قیادت میں لوگوں نے عزم کیا کہ وہ اپنی تقدیر خود لکھیں گے۔ انھوں نے خود اپنے لیڈروں کا انتخاب کیا اور انھیں مجبور کیا کہ وہ ان کی منشاء کے مطابق عمل کریں۔

لیکن ابھی کچھ عرصہ اور آلیپو کو اپنے ناہموار اور غیر یقینی دور سے گزرنا تھا۔ نومبر ۱۱۱۳ء کے آخر میں قاضی الخشب کو پتہ چلا کہ رضوان سخت بیمار ہے اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے کہا کہ وہ عمل کے لئے تیار ہوجائیں۔ ۱۰ / دسمبر ۱۱۱۳ء کو رضوان کا انتقال ہوگیا جیسے ہی اس کے مرنے کی خبر عام ہوئی مسلح شہریوں کے دستے شہر کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور انھوں نے بڑی بڑی عمارتوں پر قبضہ کر لیا اور رضوان کے بے شمار ساتھیوں کو جن میں بڑی تعداد باطنیوں Assasins کی تھی فوری موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

▲▲▲

طوفان کر رہا ہے مرے عزم کا طواف   دنیا سمجھ رہی ہے کہ کشتی بھنور میں ہے

سید حامد

انگریزی روزنامہ — ایک اپیل

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی محرومی یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی انگریزی اخبار نہیں جو ان کی بات کو ان کے اہلِ وطن اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں تک پہنچا دے۔ بات نہ پہنچے گی تو انصاف کیسے ہوگا؟ بات پہنچانے (ابلاغ) کے اس وسیلہ کی کمی کی وجہ سے اہلِ وطن کے دلوں میں مسلمانوں کے تعلق سے طرح طرح کی بدگمانیاں سر اٹھاتی ہیں اور خود حکومت ان کی صورتِ حالات سے بے خبر رہتی ہے۔ چنانچہ مختلف سطحوں پر اکثر ایسے فیصلے ہو جاتے ہیں جو مسلمانوں کے حق میں نہیں ہوتے۔ جمہوریت کی عمارت رائے عامہ کی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ اخبار ہی رائے عامہ کو بناتا ہے اور وہی اسے ظاہر کرتا ہے۔

گزشتہ چالیس سال کے تجربے نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ناانصافی کے ردِعمل کے طور پر کنارہ کش ہو کر سلگتے رہنے یا شکوہ سنج ہونے سے بات نہیں بنتی۔ کسی جمہوری حکومت میں عام دوسروں کی ہمدردی اور تائید حاصل کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ ناانصافی، ظلم اور محرومی کا علاج علاحدگی اور انتہا پسندی نہیں ہوتا اور نہ ٹکراؤ اور تصادم سے ہوتا ہے۔ اس کا موثر جواب صرف یہ ہے کہ خود کو مضبوط اور متحد کیا جائے، ملک کے باشندوں کے سامنے اپنی صورتِ حالات نرمی، وضاحت اور استدلال کے ساتھ رکھا جائے۔ ان میں سے بہتوں کے دل جن پر مہریں نہیں لگی ہیں ہماری حالت پر ضرور پسیجیں گے۔ خود اکثریت میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو اپنے دل کو انصاف اور رواداری کے تقاضوں کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ ایسے لوگ دراصل اقلیتوں کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو جیتنا ہے، ان کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہے اور ان کو تعصب، تناؤ اور سوءِ ظن کی پھیلتی ہوئی وبا سے بچانا ہے اور یہ کام ایک انگریزی اخبار کے ذریعہ سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے اشد ضروری ہے یہ بات کہ وہ اپنے حقوق، اپنے دین، ثقافت، روایات اور مفادات کا حرارت اور آشتی کے ساتھ تحفظ کریں اور اپنے اہلِ وطن کے ساتھ وطن

سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ترقی اور خیر اندیشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ انگریزی اخبار خود مسلمانوں کو صلح، آشتی، شوق طلبی، تعلیم، جدوجہد اور ترقی کے جملہ تقاضے پورے کرنے کی طرف مائل کرے گا۔ اس کی حیثیت ایک اعلیٰ قومی اخبار کی ہوگی جو روزناموں کے اعلیٰ اوصاف کو شامل رکھتے ہوئے اقلیتوں کی ترجمانی، شارحانہ اور عادلانہ اور متوازن انداز سے کرے گا۔ اس کے وسیلے سے ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف اقلیتوں کے مابین رابطہ استوار ہوگا۔ دوسری طرف مسلمانوں اور اکثریت کے درمیان تعلقات میں مفاہمت اور شگفتگی آئے گی۔ ہمارا اخبار ایسا ہونا چاہیئے جسے غیر مسلم قارئین بھی شوق سے پڑھیں۔

گزشتہ چالیس سال میں تین چار بار اور یہ کوشش ہوئی کہ ایک معیاری روزنامہ نکالا جائے۔ لیکن غالباً تیاری اور سرمایہ کی کمی کے سبب سے یہ کوششیں ناکام ہوئیں۔ انگریزی اخبار ایک ایسا خواب ہے جسے ہندوستانی مسلمان گزشتہ چار دہائیوں کے دوران برابر دیکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتھ میں ہر بار تعمیر کے بجائے حسرت آئی۔

قارئین کو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے وہ ہندوستان میں سب سے پیچھے ہیں۔ ان معیشت بگڑ رہی ہے، ان کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ ان کی سیاست انتشار کا شکار ہے۔ ان کی بستیاں اکثر و بیشتر روشنی اور تازہ ہوا اور علمی فضا سے محروم ہیں۔ ان کی صحتیں بگڑ رہی ہیں اور جہالت نے انھیں شکنجہ میں جکڑ لیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ان کے حوصلے کو بار بار مجروح کیا ہے، انھیں اس کا یارا نہیں، نہ خواہش کہ اپنے مسائل کو کھول کر ملک کے سامنے رکھیں۔ ایسے میں ایک سنجیدہ، اعتدال پسند، ہموار اور مدلل انگریزی اخبار کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ اخبار ایک طرف مسلمانوں کی توجہ توازن، ترقی اور ترقی علم کی طرف مبذول کرے گا اور دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں، اور مسلمانوں اور حکومت کے درمیان ایک مضبوط پل تشریح اور تفہیم کا بنائے گا۔ مسلمانوں کو بیک وقت علم، آگہی، واقفیت اور ابلاغ کی ضرورت ہے۔ انگریزی اخبار کے بعد مرکزی طور پر ایک ہندی اخبار نکالا جائے گا۔ اردو اخبارات بفضلہ ہمارے پاس ہیں ہی۔ ساتھ ہی ساتھ کوشش کی جائے گی کہ ریاستوں سے متعلقہ علاقائی زبانوں میں اخبارات جاری کئے جائیں جو کم و بیش مذکورہ پالیسی کو ملحوظ رکھیں۔ ان اخبارات کو باہمی داد و ستد سے مضبوطی اور استقامت حاصل ہوگی۔

انگریزی اخبار نکالنے کا منصوبہ ایسے اشخاص نے بنایا ہے جو بفضلہ ملت کی نگاہ میں محترم اور معتبر ہیں۔ مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، حکیم عبدالحمید صاحب صدر ہمدرد۔

نیشنل فاؤنڈیشن (اخبار کا تعلق ہمدرد تنظیموں سے نہیں ہے)، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (سکریٹری بین الاقوامی تعلیمی کونسل)، ڈاکٹر ممتاز احمد خان (الامین سوسائٹی بنگلور)، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا (صدر انجمن اسلام بمبئی)، مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور) جناب عابد علی خان (سیاست حیدرآباد) ان کے علاوہ جغرافی نمائندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے چھ ارکان اور ہیں جن میں دو غیر مسلم حضرات — مسٹر اندر کمار گجرال اور ڈاکٹر امریک سنگھ — شامل ہیں۔ اول الذکر نے ملک کی وزارت و سفارت کے علاوہ اردو کی زبردست وکالت کی ہے اور آخر الذکر نے تعلیم میں تخصیص و امتیاز مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ایک ٹرسٹ انگریزی روزنامے کو نکالنے کے لئے بنایا اور رجسٹر کیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے NATIONAL INFORMATION AND WELFARE TRUST (قومی وقف برائے اطلاع و رفاہ) ایک ماہر فن سے اخبار کی پروجکٹ رپورٹ بنوائی گئی ہے کہ تخمینے کے مطابق اخبار پر سوا دو کروڑ روپیے کی لاگت آئے گی۔ یہ رقم ہمیں چار ماہ کے اندر جمع کر لینا ہے، تب کہیں اخبار ڈسمبر ۸۸ء تک نکل سکے گا۔ اخبار کی شدید ضرورت کو دیکھتے ہوئے مزید تاخیر مناسب نہ ہوگی۔ دہلی کے پاس پریس لگانے کے لئے ایک قطعۂ اراضی مع عمارت پیدا جا رہا ہے۔ دو لاکھ روپیے بطور بیعانہ کے ادا کر دئے گئے ہیں۔ دو ماہ کے اندر بقیہ آٹھ لاکھ روپیہ ادا کرنے ہیں۔ اس وقت ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں صرف ۳۲،۶۵۲/۴۱ روپیے ہیں۔ روپیہ جمع کرنے کے لئے دو طریقہ اختیار کئے گئے ہیں۔ بڑے عطیات حاصل کرنے کے لئے رسید بکیں چھاپی ہیں اور چھوٹی رقوم کے لئے کوپن چھاپے ہیں جن کی رقوم پانچ، دس، پچیس، پچاس اور سو روپیے کوپن ہے۔ آپ ہمیں ایک ہفتہ کی تنخواہ یا آمدنی دے دیجئے۔ جو لوگ یہ نہیں کر سکتے وہ ایک دن کی تنخواہ یا آمدنی دے دیں۔ کار خیر میں حصہ لینے میں بڑی برکت ہے اور اس کار خیر کا فائدہ آپ کو عقبیٰ کے علاوہ خود اس دنیا میں پہنچے گا۔

ٹرسٹیوں میں کسی کو اس کا یارا نہیں کہ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جا کر چندہ کرے۔ اس کے لئے ایک طرف تو عمری اور دوسری طرف عمر خضر درکار ہوگی۔ اگر بڑے بڑے عطیات تعداد میں میسر ہوتے تو بھی ہم چھوٹے چندوں کا اہتمام ضرور کرتے کہ ان سے اخبار کو عام تائید دستیاب ہوتی ہے۔ غور فرمائیے کہ گیارہ بارہ کروڑ مسلمانوں کے لئے یہ کام ہرگز مشکل نہیں ہے کہ ایک ماہ کے اندر تین چار کروڑ روپئے وقت کی سب سے بڑی ضرورت کے لئے عطا کر دیں۔ اگر فی کس ایک روپیہ بھی دیا جائے تو گیارہ بارہ کروڑ روپئے ہو جاتے ہیں۔ ہم قارئین سے اپیل کرتے ہیں کہ ملت کی فلاح کے اس اہم منصوبے کی تکمیل کے لئے

ن من دھن سے ہماری مدد کریں۔ ٹرسٹ کا اکاونٹ بینک آف انڈیا، نئی دہلی نہرو پیلیس
ایکسٹنشن کاونٹر میں کھولا گیا ہے۔ اس کا نمبر ہے S.B.8650 ۔ اپنی رقم کراس چیک
بینک ڈرافٹ کے ذریعہ اس بینک کو ارسال کر دیں اور ارسال کرنے کی اطلاع راقم الحروف
مندرجہ ذیل پتے پر دے دیں۔ وہ حضرات جو منی آرڈر سے روپیہ ارسال کرنا چاہتے ہیں
براہ راست راقم الحروف کو بھیج دیں۔ منی آرڈر سے وہی حضرات بھیجیں جنھیں چیک یا
بینک ڈرافٹ سے بھیجنے میں دقت ہو۔ جو صاحب دہلی آنے والے ہوں وہ اکٹھا کی ہوئی رقم
بنفس نفیس لاکر یہاں جمع کر سکتے ہیں۔ ٹرسٹ کے آڈیٹر مسٹر کمال فاروقی چارٹرڈ اکاونٹنٹ
دہلی چیمبر دہلی میں ٹرسٹ کا اکاونٹ سال بہ سال آڈٹ ہوگا اور سالانہ رپورٹ کے ساتھ بورڈ
آف ٹرسٹیز میں پیش کیا جائے گا۔ ہم وقتاً فوقتاً اردو اخبارات کے ذریعہ (جنھوں نے کمال
فراخ دلی سے ہماری طرف دست تعاون بڑھایا ہے) قارئین کو بھی اخبار اور چندہ، دونوں کی پیش
رفت کی اطلاع دیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہماری رسائی ہر شہر کے اہل خیر اور اہل اعتبار تک نہیں ہے۔ لہٰذا اس
اپیل کے ذریعہ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے اپنے شہروں میں ایک چھوٹی سی غیر رسمی انجمن
یا کمیٹی اخبار کے وسائل فراہم کرنے کے لئے قائم کر دیں اور تین معتبر اور معروف اور دستخطوں اور
پتوں کے ساتھ راقم الحروف کو ایک خط ارسال کر دیں اور مطلوبہ کتابیں کوپنوں کی اپنے حلقے کے کسی
صاحب کے نام طلب کر لیں۔ جو خط ٹرسٹ کے سکریٹری کو اس سلسلے میں بھیجا جائے گا، اس کا
نمونہ منسلک ہے۔ ان کتابوں کی حفاظت اور ان پر چندہ کرنے کے لئے وہ صاحب ذمہ دار ہوں گے۔
کتابوں کی حفاظت اور ان پر چندہ کرنے کے لئے کوپنوں کی کتابیں وہ ان لوگوں کو دے سکتے
ہیں جن پر انھیں اعتبار ہو اور جو اپنا وقت اس بڑے کار خیر کے لئے دے سکتے ہیں جن پر انھیں
اعتبار ہو۔ البتہ کوپنوں کا حساب ٹرسٹ کو وہی صاحب دیں گے جن کے نام کوپن، ٹرسٹ کی طرف
سے جاری کئے گئے ہوں۔ کوپن کی کتابیں دوکانوں پر بھی رکھی جا سکتی ہیں۔ مسجدوں میں نماز کے
بعد ان پر چندہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا انتظار نہ کیا جائے کہ جب سب کوپن بک جائیں جبھی
روپیہ بھیجا جائے۔ جیسے جیسے روپیہ آتا جائے، اسے بینک ڈرافٹ کی شکل میں بینک یا
راقم الحروف کو بھیج دیا جائے۔

یہ مسئلہ دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و عزت اور موت و ذلت کا مسئلہ ہے
اور ان سارے وقتی، ہنگامی اور مقامی مسائل سے کہیں زیادہ اہم اور دور رس ہے جن کی طرف

بھی وقتاً فوقتاً متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ راقم، ٹرسٹیان کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں کی، ملی حمیت سے اپیل کرنے کی جسارت کر رہا ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یقین ہے کہ اس کے مسلمان بھائی اس اپیل کی اہمیت اور اس لمحہ کی نزاکت کو سمجھیں گے اور اس ملک میں باعزت زندگی بسر کرنے اور ملک کے انتظام، تعمیر اور ترقی میں حصہ لینے کی غرض سے ایک اعلیٰ انگریزی روزنامہ جاری کرکے دم لیں گے۔ اس مقصد کے لئے وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جن لوگوں نے اخبار کی مہم اپنے ذمے لی ہے ان کی کوئی ذاتی غرض اس جریدے سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ بار گراں انھوں نے فی سبیل اللہ اٹھایا ہے۔ آپ بھی فی سبیل اللہ ان کی دستگیری کیجئے۔ لوگوں نے انھیں ڈرایا ہے کہ مسلمانوں کے پاس نہ اتنا سرمایہ نہ اتنی صلاحیت کہ موجودہ بڑے بڑے روزناموں کا مقابلہ کر سکیں۔ اٹھئے اور ثابت کر دیجئے کہ ملی کام کے لئے مسلمان ضرورت پڑے تو پیٹ کاٹ کر سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں اور صلاحیت بروئے کار لا سکتے ہیں۔ ہمارے ناصیہ پر یہ بہت بڑا داغ ہے کہ ہم آج تک ایک اعلیٰ معیار کا انگریزی روزنامہ نہیں نکال سکے۔ یہ داغ ہماری جبیں سے آپ ہی مٹا سکتے ہیں۔ للّٰہ اٹھئے اور اس بڑے کام کو ضروری سرمایہ فراہم کرکے پایۂ تکمیل تک پہنچائیے۔ یہ نہ سوچئے کہ کوئی دوسرا شخص آپ کے شہر میں اس کام کو شروع کرے گا۔ آپ خود پیش قدمی کیجئے، پھر یہ کام آسان ہو جائے گا، جو انجمنیں تعلیم یا رفاہ کے دوسرے کاموں میں لگی ہوئی ہیں، وہ بھی اس کام کو بہت اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں مقامی اسکولوں کی مجالس منتظمہ کے سپرد بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کے انتظام پر اہل شہر کو اطمینان اور اعتماد ہو۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ اس بڑے کار خیر میں روپیہ دینے کے لئے لوگ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شہر میں اس کام کو سلیقے سے کرنے کے لئے کچھ اہل خیر اور اہل درد مل کر ایک چھوٹی سی تنظیم بنالیں اور یہ طے کریں کہ ہمیں اتنا روپیہ اتنے عرصے کے اندر جمع کرکے ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں داخل کرنا ہے اور اس لائحہ عمل کے مطابق جدوجہد کریں۔ روپیہ صرف ٹرسٹ کی رسید بکوں یا کوپنوں پر جمع کیا جائے گا جن پر ٹرسٹ کے سکریٹری کی دستخطی مہر ہوگی۔ عوام سے گزارش ہے کہ وہ ٹرسٹ کی مہر رسید بک یا کوپن کے بغیر اخبار کے لئے چندہ ہرگز نہ دیں۔

یہ مہم فرقوں، مسالک، سیاسی پارٹیوں اور گروہ بندیوں اور ذاتیات کے اختلافات سے بالاتر ہے۔ ٹرسٹیاں، بحث اور مباحثے اور نزاع میں خود کو الجھانا نہیں چاہیں گے کہ ان کا مقصود ملت کی مجموعی تعداد اور ان کا مدعا ملت کی ہمہ جہت پیش رفت ہے۔ وہ روشنی

اور علم، اتفاق واتحاد، امن وآشتی، تعمیر وتنظیم کی اشاعت کے لئے مکلف اور مسئول ہیں۔ علاوہ بریں ان کے پاس نزاع کے لئے وقت بھی نہیں ہے۔

کوپن طلب کرنے کے لئے خط کا خاکہ

ہم لوگ، جن کے دستخط اور پتے ذیل میں درج ہیں، یہ تصدیق کرتے ہیں کہ جناب .... ولد ....

ساکن محلہ .... شہر ...... ضلع ......

ایک معتبر اور رفاہی ذہن رکھنے والے انسان ہیں، جن سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ مجوزہ انگریزی روزنامہ کے واسطے فی سبیل اللہ چندہ جمع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم تجویز کرتے ہیں کہ انھیں .... روپیے کی مجموعی قیمت کے کوپن کی کتابیں ہمارے علم واطلاع میں بھیج دی جائیں۔ ہم اس امر میں ذاتی طور پر دلچسپی لیں گے کہ روپیہ جلد جمع ہو جائے اور ٹرسٹ کو اولین فرصت میں اس کا حساب بھیج دیا جائے۔

نام	مکمل پتہ	پیشہ/عہدہ	دستخط
۱.			
۲. "	"	"	"
۳. "	"	"	"

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی وہ دین و دنیا کا فرق ہے، دین کا کام الگ گیا اور دنیا کا کام الگ، خدا کا حکم الگ ٹھہرایا گیا اور قیصر کا حکم الگ، دنیا کے حصول کا الگ راستہ بتایا اور دین کے حصول کا الگ، تو نہالانِ اسلام! یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو دنیا میں پھیلی تھی، اس غلطی کا پردہ امِ محمدی کی نور افگن شعاعوں نے چاک کر دیا، اس نے بتلایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اسی دنیا کے کام جو خدا کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق انجام دئیے جائیں دین ہے، یعنی خدا کے اصول کے مطابق دنیا داری ہی دین داری ہے، سمجھتے ہیں کہ ذکر و فکر، گوشہ نشینی و عزلت گیری، کسی غار اور پہاڑ کے کھوہ میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرنا دین داری ہے۔ دوست و احباب، آل و اولاد، ماں باپ، قوم و ملک اور خود اپنی آپ مدد، فکر معاش اور پرورش اولاد دنیا داری ہے، ہم نے اس غلطی کو مٹایا اور بتایا کہ خدا کے حکم کے مطابق ان حقوق و فرائض کو بخوبی ادا کرنا بھی دینداری ہے: مولانا سید سلیمان ندوی

محسنِ اعظم

حسینی جاوید

جہاں پر سانس پھولنے لگتی ہے فکر کی
اور اک دم توڑ دیتا ہے
اور حواس گم ہو جاتے ہیں جہاں وجدان کے
وہاں علم
دہائی استعداد کی دیتا ہے
اور منظر سے خود کو ہٹا لیتا ہے
دلائل بھی جہاں خود کو محصور پاتے ہیں
سر تا سر مجبور خود کو پاتے ہیں
نظر
ـد نظر سے ٹکرا کر بکھر جاتی ہے
و کم مائیگی پر اپنی آنسو بہاتی ہے
دھر
لا ہر کی ضرب سے ہے مضمحل دانائی
ے کہاں اب اس میں بھی وہ توانائی
عقل قاصر ہے
ر اس ذات کی عظمت کا وہ کر بھی نہیں سکتی!

★

زمیں
جو گھوم پھر کر
اپنے مدار پر واپس آتی جاتی ہے
علو کے تحفظ
اور اپنی استطاعت کا ہے اسے احساس
احسان وہ مانتا ہے
محسنِ اعظم کا
حسن کے جسد نے اسے مسکن اپنا بنایا ہے!

★

نظامِ شمسی
ہاں پابندِ تسلسل رہتا ہے
یہ کبھی حد سے تجاوز کرتا ہے
اس کے پیروں میں
رجعتِ شمس اور شق القمر کی بیڑیاں
وہ ان بیڑیوں کا تقدس جانتا ہے
ہاں فخرِ کون و مکاں کو پہچانتا ہے

★

سمندر، فضا اور ہوا بھی
اپنی بساط سے خوب واقف ہیں
اس ذاتِ والا صفات کے
ممنونِ کرم رہتے ہیں
جو
بنی وجہِ تخلیقِ کائنات
اور کائنات پر ہیں جس کے بے شمار احسانات
بے شک
رب العالمین کے بعد
وہی تو واحد رحمۃ للعلمین ہے!!

★ ★ ★

غزل

سکندر توفیق

کہیں گرے برگِ خزاں پیچ و تابِ دریا کا
"گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا"

سوال بن کے اٹھا تھا حباب دریا کا
دیا ہے ساحلِ غم نے جواب دریا کا

طائے سرِّ نہاں، ذوقِ جلوہ فرمائیٔ
بدلتے چہرے چلا آفتاب دریا کا

بدائے تشنہ لبی ہے، سکوتِ صحرا کا
مذاق کیوں نہ اڑائے سراب دریا کا

صیب راہ روان درد کے بگولے ہیں
شناوروں کا مقدر، حساب دریا کا

سفینہ لے کے ہتھیلی پہ موج موج چلی
ہے بادباں سے سوا اضطراب دریا کا

قائے نخلِ تمنا ہے رازِ فطرت کا
ہے پانی پانی بہت اجتناب دریا کا

جگر کے زخم کبھی لالہ زار رکھتے ہیں
ہے سیلِ اشکِ ندامت جواب دریا کا

چلے چلو کہ ابھی منزلیں بلاتی ہیں
بھنور کی آنکھ میں پھرتا ہے خواب دریا کا

لوں کی گمشدہ راحت ہی نشترِ جاں ہے
لہو سے رنگ چھڑائے نہ آب دریا کا

یہ پیچ سیل، کہیں دامِ تشنگی جس کو
فروں فزوں کا بہت رعب و داب دریا کا

ات، وقت کا زینہ، قدم قدم اترو
ہے نقش آب نہ یہ انتساب دریا کا

یا صبح وہی ہے، دلیلِ شام وہی
اٹھا نہ سر پہ شفق، لاجواب دریا کا

لی ہوئی ہیں غمیں نیکیاں زمانے کی
کہ آب شور نہیں جن سے آب دریا کا

تماشہ دیکھنے والے نقوشِ ساحل ہیں
ہے شرطِ زیست نباہنا حباب دریا کا

بیت شمیم ۔ تلک نگر ۔ حیدرآباد ۲۹

فارسی غزل

مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی

ترجمہ اردو قاضی سجاد حسین

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
کل ہمارا پیر، مسجد سے میخانہ کی طرف آ گیا
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما
یارانِ طریقت اس کے بعد ہماری کیا تدبیر ہے؟

در خرابات مغاں ما نیز ہم منزل شویم
آتش پرستوں کے شراب خانے میں ہم بھی پیر کے ہم منزل ہو جائیں
کایں چنیں رفت ست در عہد ازل تقدیر ما
اس لئے کہ ازل میں ہماری تقدیر اسی طرح بنی ہے

ما مریداں روبسوئے کعبہ چوں آریم چوں
ہم مرید کعبہ کی طرف رخ کیسے کریں جبکہ
روبسوئے خانہ خمار دارد پیر ما
ہمارا پیر، بھٹی کی جانب رخ رکھتا ہے

عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش ست
عقل کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دل اس کی زلف کی قید میں کیسا خوش ہے
عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما
تو ہماری بیڑی کے لئے عقلمند دیوانے بن جائیں

روئے خوبت آیتے از لطف بر ما کشف کرد
تیرے حسین چہرے نے، مہربانی کی ایک آیت ہم پر کھول دی
زاں سبب جز لطف و خوبی نیست در تفسیر ما
اسی لیے مہربانی اور بھلائی کے سوا ہماری تفسیر میں کچھ بھی نہیں

با دل سنگینت آیا ہیچ در گیرد شبے
تیرے سنگین دل میں کسی رات کو کیا کچھ اثر کرے گی؟
آہ آتش بار و سوز نالہ شب گیر ما
ہماری آگ برسانے والی آہ اور تمام رات کے نالے کی جلن

مرغ دل را صید جمعیت بدام افتادہ بود
دل کے پرند کے لیے اطمنان کا شکار جال میں پھنسا تھا
زلف بکشادی و باز از دست شد نخچیر ما
تو نے زلف کھول دی، ہمارا شکار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا

باد بر زلف تو آمد شد جہاں بر من سیاہ
تیری زلف کو ہوا لگی جہاں ہم پر تاریک ہو گیا
نیست از سودائے زلفت بیش ازیں توفیر ما
تیری زلف کے عشق میں اس سے زیادہ ہمارا حاصل وصول نہیں ہے

تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جانِ عزیز
اے جان عزیز ہماری آہ کا تیر آسمان سے گزر جاتا ہے
رحم کن بر جان خود پرہیز کن از تیر ما
اپنی جان پر رحم کر، ہمارے تیر سے بچ

بر در میخانہ خواہم گشت چوں حافظ معیم
میں بھی حافظ کی طرح شراب خانے کے دروازے پر مقیم ہو جاؤں گا
چوں خراباتی شد اے یار طریقت پیر ما
جبکہ اے یار طریقت، ہمارا پیر خراباتی ہو گیا ہے

"دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما"

منظوم ترجمہ اردو غزل حافظ شیرازی

مولوی محمد احتشام الدین حقی دہلوی

یہ میخانہ نکل مسجد سے آیا پیر ہے / اب اے یاران طریقت اپنی کیا تدبیر ہے
سجدہ سوئے کعبہ کیوں کر سکیں گے ہم مرید / قبلہ منخانہ کو پکڑے اپنا قبلہ پیر ہے
نیا خرابات مغاں میں ہم بھی پیٹیں تالیاں / کیا ازل سے اپنی قسمت میں یہی تحریر ہے
عقل نے جانا کبھی گر عیش بند زلف کا / پائے ہر عاقل میں دیکھوگے پڑی زنجیر ہے
لطف وخوبی کی اک آیت جب سے جانا روئے دوست / اپنے قرآں کی اسی دو حرف میں تفسیر ہے
ہ آتش بار و سوزِ نالۂ شب گیر کو / تیرے سنگیں دل میں کچھ بھی سچ بتا تاثیر ہے؟
ام دل میں ہو گئی تھی جمع خاطر اک شکار / زلف جاناں کھل پڑی آہو ہوا نخچیر ہے
لف تو چھیڑی صبا نے مجھ پہ کیوں عالم سیاہ؟ / مجھ پہ کیوں ظلم؟ اس میں بھی کیا کچھ مری تقصیر ہے
تیر آہ اپنے جان جاں گردوں سے جاتا ہے نکل / چھیڑ مت، کر رحم خود پر، یہ بلا کا تیر ہے
ہم بھی حافظ ڈال دیں چوکھٹ کے باہر بسترا / ہم نشیں رندوں کا اندر یار اپنا پیر ہے

غزل

ڈاکٹر غوث محی الدین کاوش

مدت سے ترے نام کا خالی ہے یہ گھر، آ / سونی ہے مرے دل کی ہر اک راہ گذر، آ
جب حد سے گزر جائے گی دیدار کی حسرت / خود جلوے پکاریں گے نگاہوں کو ادھر آ
اس آس پہ میں خود کی طرف دیکھ رہا ہوں / تو مجھ میں اگر ہے تو پھر اک بار نظر آ
ہے تو بھی بڑا، تیری سماعت بھی بڑی ہے / سننے کو زمیں پر کبھی روداد بشر آ

کیوں حشر کے میدان سے گھبراتا ہے کاوش
سرکار پکاریں گے گنہگار ادھر آ

معظم جاہی مارکٹ، کوچہ لیاقت جنگ، حیدرآباد

غزل

محمد منیر (منیر حیدرآبادی)

سینے پہ ہاتھ رکھ کر تم نے کبھی نہ دیکھا
دل ڈوبنے کا منظر تم نے کبھی نہ دیکھا

کیوں پوچھتے ہو الفت کتنی ہے تم سے ہم کو
دل میں کبھی اتر کر تم نے کبھی نہ دیکھا

وجہِ سکوں ہیں آنسو، آنسو کہاں سے لاؤں
ٹھہرا ہوا سمندر تم نے کبھی نہ دیکھا

موجوں میں گھر چکا تھا میرا سفینہ لیکن
ساحل سے آگے بڑھ کر تم نے کبھی نہ دیکھا

آنسو بہا بہا کر تو ہیں غم نہ کرنا
اشکوں کو اپنے پی کر تم نے کبھی نہ دیکھا

ہر حال میں ہیں خوش ہم واقف منیر تم تو
شکوہ مری زباں پر تم نے کبھی نہ دیکھا

16-9-827، قدیم ملک پیٹھ، حیدرآباد دکن

غزل

سلیم محی الدین سلیم

آئینوں کے سنورنے کا موسم کہاں
اس کی پلکوں پہ ڈھونڈو گے شبنم کہاں

ہے وہ دل کی حویلی نہ دروازہ ہے
اب کہے گا کوئی کھل جا سم سم کہاں

بند جس میں تھا اک خوشبوؤں کا جہاں
کھو گیا ہے نہ جانے وہ البم کہاں

اُلجھے دھاگے سلجھنے بھی پائیں اگر
میری سوچوں میں شامل ہے ریشم کہاں

آج کی شام تو فاحشہ سی لگی
کوئی دہلیز پر آنکھ تھی نم کہاں

میری نظریں جسے ڈھونڈتی ہیں سلیم
آج اخبار میں ہے وہ کالم کہاں

گاڑی پورہ، نزد عاشور خانہ، پربھنی

عزیز ناگپوری

جہاں حوصلہ مندی پہ اُتر آتے ہیں
حادثے خوف زدہ ہم کو آتے ہیں

ہ عدو میرے مقابل جو نظر آتے ہیں
موت آتی ہے تو چیونٹی کے بھی آتے ہیں

نے والے تو ذرا دیکھ تو میری جانب
میری آنکھوں میں کہیں اشک نظر آتے ہیں

ے بھی آتا ہوں میں بنیادِ نشیمن رکھنے
پیشوائی کے لئے برق و شرر آتے ہیں

وں باتوں میں چبھوتے ہیں جو خنجر دل میں
دوست کی شکل میں دشمن وہ نظر آتے ہیں

نے والوں کو ہنسانے کا ہے دعویٰ ہم کو
ہم مسرت کی ابھی لے کے خبر آتے ہیں

ے ہنر کے لیے دشوار ہے جینا لیکن
ہو کے ناکام کہیں اہلِ ہنر آتے ہیں

اُن کی محفل میں عزیز آ تو گیا ہوں لیکن
کتنے الزام نہ جانے مرے سر آتے ہیں

نامپلی - درگاہ یوسفین - حیدرآباد - آندھرا پردیش

مقبول احمد مقبول

دشمنی کیجئے، دوستی کیجئے
میرے حق میں نہ ہرگز کمی کیجئے

میں بھی حاضر ہوں دل بھی ہے حاضر مرا
کیجئے شوق سے دل لگی کیجئے

کام کل پر اٹھا کر نہ رکھئے کوئی
جو بھی کرنا ہے صاحب ابھی کیجئے

مشورہ آپ دنیا سے کیجے مگر
آپ کا دل جو چاہے وہی کیجئے

یاد جگنو کی مانند روشن رہے
کم ہے کم اس قدر روشنی کیجئے

راہ تاریک ہے دل پریشان ہے
اب خدارا ذرا رہبری کیجئے

خواہشِ دید مقبول کو ہے بہت
اس پہ چشمِ کرم تو کبھی کیجئے

14-1-184/۲ سیتارام پیٹھ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

رکھ رہا ہے۔ اس ا[illegible] صفحہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ "شاداب" اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ نیز قارئین سے خواہش ہے کہ وہ اپنی تجاویز اور مشورے روانہ کریں جو وہ اپنے ماہنامہ "شاداب" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں قارئین کے مشوروں کا انتظار رہے گا۔

[illegible] (۴۰) سے آ گئے۔

[illegible] دور میں سونے اور چاندی کی اشیا اور زیورات تیار کرنے کے لحاظ سے : رس، متھرا [illegible]، لکھنؤ نے بہت ترقی کی۔ دہلی مینا کاری کے لئے اب بھی ایک بہت بڑا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں سونے چاندی کی صراحیاں، چائے کے سیٹ طشتریاں، نمکدانیاں، شکر دانیاں بنتی ہیں جن پر کشمیری طرز پر نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔ کشمیر کے سوزن کاروں نے مغل دور میں انہی کے فن کاروں سے بہت کچھ سیکھا۔ چنانچہ وہاں زیورات تیار کرنے کی بہترین روایات اب بھی موجود ہیں۔ دہلی، آگرہ، متھرا اور مغل طرز کے زیورات کے مرکز ہیں جہاں سونے اور چاندی میں بیش قیمت ہیروں اور موتیوں کو جڑا جاتا ہے اور قیمتی پتھروں سے مینا کاری ہوتی ہے۔ راجستھان میں جے پور کا شہر مینا کاری کے لئے ملک گیر شہرت رکھتا ہے جہاں اکبر کے دوست راجہ مان سنگھ نے اس دستکاری کو فروغ دیا۔

جو قطعی نہیں اور اس میں کئی سقم بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اہل نگاہ سے توقع ہے کہ قرآن حکیم نے کائنات میں انسان کے موقف کی جس انداز سے وضاحت کی ہے اسے ضبط تحریر میں لاکر مجھ جیسے طالب علموں کی تشنگی مٹائیں گے۔

اجتماع ضدین کا دونوں کے حق میں ایک ہے
بھاپ بن جاتا ہے پانی، راکھ بن جاتی ہے آگ

شہر میں اونچے مکانوں کی قطاریں کم نہیں
جلسوں کے جھونپڑوں سے کیوں لپٹ جاتی ہے آگ

ج: ۵ — ش: ۲
حیدرآباد
فروری ۱۹۸۸ء

ماہنامہ شاداب

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

محترمہ عائشہ بیگم رباب * یوسف ناظم * ڈاکٹر محمد یوسف الدین
پروفیسر رضی الدین احمد * منیر احمد صدیقی * محمد منظور احمد منظور
اے جے فاروقی * ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشا * پروفیسر میر تراب علی

زرتعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپیے	150 روپیے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیے
دوسال	90	" 270	" 65	" 36	" 225 " "
تاحیات	1000	" 2500	" 450	" 300	" 2000 " "

زرِ سالانہ کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 147-5-11، ریڈہلز، حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر
دفتر شاداب 147-5-11، ریڈہلز، حیدرآباد 500004، آندھرا پردیش سے شائع کیا: ٹیلیفون 229161

فہرست

حرفِ اول

جامعۂ عثمانیہ کے شعبہ لسانیات کی سلور جوبلی کے موقعہ پر "زبان اور قومی ترقی"
موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ٹی۔ نونیت راؤ
وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے توقع ظاہر کی کہ یہ کانفرنس ایسی تجاویز پیش کرے گی جس کے
ذریعہ مختلف زبانوں کو قومی کردار کے تعین اور اس کے ارتقاء کا ذریعہ بنایا جا سکے ۔
پروفیسر بی۔ ایچ کرشنا مورتی وائس چانسلر یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کانفرنس کے
اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں طالب علم پر مختلف زبانیں سیکھنے
کا بوجھ انتہائی اہم اور کلیدی مسئلہ ہے، زبانوں کی معتدبہ تعداد نے مسائل کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اسی
لئے ہندوستان ایسے لسانی مسائل پر غور و خوض کے لئے انتہائی موزوں مقام ہے۔ چنانچہ اس
سہ روزہ کانفرنس میں مختلف ممالک اور ملک کے مختلف حصوں کے (۱۵۰) مندوبین نے حصہ لیا
ماہر لسانیات پروفیسر فرگوسن نے بتایا کہ قومی ترقی کے لئے لسانی مفاہمت کا مسئلہ ہندوستان میں
زیادہ اہمیت کا حامل ہے لیکن دوسرے کئی ممالک بھی اس سے دوچار ہیں اور آج یہ ایک
بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ گورنر شریمتی کمود بین جوشی نے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے
کہا کہ جس طرح ہر شخص کو اپنی ماں سے محبت کرنے کا اختیار ہے اسی طرح اپنی مادری زبان کو عزیز رکھنے
کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ کسی کو دوسرے کی مادری زبان کے خلاف نفرت و حقارت کے اظہار کی
اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لسانی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور تمام ہندوستانی زبانوں کو ترقی و ترویج
کے یکساں مواقع فراہم کرنا نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ لسانی ہم آہنگی اسی وقت حاصل کی جا سکتی ہے
کہ مختلف زبانوں کے ادب اور دیگر مواد کے تراجم کو بڑھاوا دیا جائے۔ گورنر نے کہا کہ آزادی سے
قبل عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا جو شاندار اور کامیاب تجربہ کیا گیا آج بھی اس کی
مثال نہیں مل سکتی۔ سائنس، انجینئرنگ، طب جیسے علوم میں بھی پوسٹ گریجویٹ اور ڈاکٹریٹ کے
سطح کی اعلیٰ تعلیم اردو میڈیم میں دی جاتی تھی۔ ہمارے عظیم قومی رہنما اور پہلے گورنر جنرل سی۔
راج گوپال آچاریہ نے بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے اسی عظیم تجربہ کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ مادری زبان
کو ذریعہ تعلیم بنانے کی یہ شاندار مثال قابل تقلید ہے۔ گورنر نے اس بات پر خصوصاً زور دیا کہ
اہم کتابوں کا علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہئے تاکہ نصاب میں شامل کر کے ان سے استفادہ

کیا جا سکے۔

اس کانفرنس میں قومی یک جہتی کے لئے لسانی ہم آہنگی پر بجا طور پر زور دیا گیا کہ ملک کی تمام علاقا
زبانوں کو ابھرنے اور آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔ عصری کتابوں کا ان میں ترجمہ کیا جائے اور مادر
زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہمارے ملک
یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ یہاں بین الاقوامی رابطہ کی زبان اور قومی زبان کے ساتھ ساتھ علاقا
زبان بھی طالب علم کو سیکھنی ہوتی ہے اور لسانی اقلیتوں خصوصاً اردو والوں کے لئے تو یہ
مسئلہ اور مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی مادری زبان اردو کہیں علاقائی زبان بھی نہیں ہے حالانکہ پور
ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نتیجتاً اردو مادری زبان وا
طالب علم کو چار زبانیں سیکھنی ہوتی ہیں۔ اردو والے اس زائد محنت کے لئے تیار ہیں اور اردو
اعلیٰ تعلیم کے لئے علمی و فنی کتب کے تراجم بھی موجود ہیں۔ دارالترجمہ جامعہ عثما
میں یونیورسٹی تعلیم کے تمام علوم و فنون کی دیگر زبانوں کی اعلیٰ درجہ کی کتب کا ترجمہ کیا جا چکا ہے
اور ان کی مدد سے اعلیٰ تعلیم بھی دی جا چکی ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو یونیورسٹی قائم کی جا
اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا جائے اور جامعہ عثمانیہ کے کامیاب تجر
کو آگے بڑھایا جائے۔ زبان اور قومی ترقی کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں سبھی نے اس ا
سے اتفاق کیا کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جانا چاہئے۔ یہ بات بھی کھل کر
سامنے آئی کہ جامعہ عثمانیہ کی شاندار مثال قابل تقلید ہے۔ اس سمت میں عملی اقدام
راہ جامعہ عثمانیہ نے آسان کر دی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

دعوتِ دین کے میدانِ عمل

[مکہ مکرمہ میں ۱۸-۲۳ صفر ۱۴۰۸ھ م ۱۱-۱۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا تیسرا اجتماع ہوا جس میں ۱۲۲ ملکوں سے اسلامی تنظیمات، جامعات اور مسلم زعماء و مفکرین نے شرکت کی، اس کانفرنس کا رہبر مقالہ (کانڈ لائن) ہندوستان کے عالم جلیل مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندوی مدظلہ کا تھا، جس کو سن کر حاضرین مؤتمر نے مطالبہ کیا کہ اس کو مؤتمر کی اولین دستاویز قرار دیا جائے، رابطہ عالم اسلامی کے نائب سکریٹری جنرل علامہ محمد العبودی نے جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اس تجویز سے اتفاق کیا اور قرارداد مرتب کرنے والی کمیٹی کے حوالے کرنے اور علیحدہ سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنے کا اعلان کیا۔

یہ مقالہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی مدظلہ کے ذوق و رجحان اور فکر و ضمیر کا ترجمان بھی ہے، جس میں بلکہ ان کے مطالعہ تاریخ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت اور وہاں کی ہر تحریک سے براہ راست علم رکھنے اور ماضی کے تمام تجربات دعوت کے نتائج کا صحیح جائزہ بھی ہے۔

یہ مقالہ ماہنامہ "ذکر و فکر" دسمبر ۸۷ء سے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے] (ادارہ)

الحمد للہ وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔

ہم سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور ان لوگوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے میرے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ آپ سے دعوت اسلام کے موضوع پر کچھ عرض کروں۔ میرے لئے یہ باعث مسرت ہے کہ میرے مخاطب وہ حضرات ہیں جو امت کی فکری رہنمائی کر رہے ہیں اور اسلامی جمعیتوں اور تنظیموں کے ذمہ دار ہیں اور سب ہی دین کی خدمت سے وابستہ ہیں اور سب سے زیادہ یہ بات میرے جذبات کے لئے مہمیز کا کام کر رہی ہے کہ یہ گفتگو وہاں ہو رہی ہے جو دعوت اسلام کا اولین مرکز، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی جگہ اور بلد امین ہے۔ میں اگر اپنے آپ کو مخاطب کر کے ایک عرب شاعر کا یہ شعر پڑھوں تو بیجا نہ ہوگا کہ:

تمتع من شمیم عرار نجد ... فما بعد العشیۃ من عرار

فانتما بمرای من سعاد و مسمع ... متجری حومۃ الجندل اسجمی

دعوت اسلامی کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے، اس پر بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور عصر حاضر میں تو اس پر کافی ریسرچ کیا گیا ہے۔ تحقیقی مقالات اور کتابیں لکھی گئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس موضوع پر پوری لائبریری تیار ہو چکی ہے جو اپنی صوری اور معنوی لحاظ سے ممتاز ہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ اپنی گفتگو صرف ایک موضوع پر محدود رکھوں اور وہ ہے "دعوت دین کے فیصلہ کن محاذ اور اس کے مرکزی میدان عمل" جن سے نہ صرف دعوت کار متعین کیا جا سکے گا بلکہ عالم اسلام کی منزل کا تعین ممکن ہو سکے گا۔ میں اپنے محدود مطالعہ، ماضی کے تجربات اور حقائق کی روشنی میں صرف انہی عملی گوشوں کی نشاندہی کروں گا، وباللہ التوفیق۔

مسلم عوام اور ان کے تمام گروہوں میں ایمان کی قوت کو بیدار کرنا، اور اس کو جلا دینا کہ ان گروہوں اور ان عوام کا اسلام سے وابستہ رہنا اور اس کے لئے ان کے دلوں میں جوش کا قائم رہنا ایک مستحکم اور بلند شہر پناہ کی حیثیت رکھتا ہے جس پر اس شہر اسلام کی بقاء کا دارومدار ہے، یہ نہیں بلکہ بہتیری اسلامی حکومتوں اور سربراہوں کو بھی جبراً اسلام سے وابستہ رکھنے پر مجبور کر سکتی مسلمانوں کے دینی احساس کا ابھرنا اسلام کی قوت کا سرچشمہ اور اس کا راس المال ہے، اور یہی خام مال ہے جو ہر پاک و مفید مقصد کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اور ایسے افراد کا وجود جوش عمل اور وسعت قلب و نظر اور اخلاص کے لحاظ سے پوری انسانی آبادی کا جوہر اور اس کا سب سے مفید اور مضبوط ترین مجموعہ ہوگا۔

ایمان کی پختگی اور دین کے لئے سرگرمی اور جوش عمل اسی وقت کارآمد ہوگی جب اس کے شرا(ئط) بھی پورے ہوں اور ان افراد میں وہ اوصاف بھی پائے جائیں جن کی بنا پر وہ نصرت خداوندی کے مستحق ہوں اور مشکلات پر قابو پا لے اور دشمنوں پر غالب آنے کے سزاوار ہوں، وہ بنیادی شرائط یہ ہیں، عقیدہ کی تصحیح، صرف خدائے واحد کی عبادت اور ہر قسم کے شرک اور غلط عقائد سے مبرا ہونا، جاہلیت کے رسوم اور غیر اسلامی شعائر نفاق، عمل اور عقیدہ میں دورخی اور قول و عمل کے درمیان تضاد اور گزشتہ اقوام کی روش سے اجتناب جو اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور بے تعلقی کی مستحق قرار دی گئیں، نیز موجودہ اقوام کی روش سے پرہیز جو اللہ تعالیٰ کو بھول گئیں تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو فراموش کر دیا اور وہ دنیا کو تباہی اور ہلاکت کے راستے چلا رہی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دینی شعور کو صحیح راستہ پر لگانا اور اس شعور کی پرورش کرنا بھی ضروری ہے جس سے وہ مسائل و حقائق کو اچھی طرح سمجھ سکیں، دوست و دشمن میں تمیز کر سکیں

نت نئے انداز کی تحریکوں کے دھوکہ میں نہ آئیں تاکہ ہماری اگلی زندگی میں وہ المیے دوبارہ نہ پیش آئیں جو قومی نعرہ بازیوں اور جاہلیت کی تحریکوں کا شکار ہونے کے سبب پیش آئے یا جو لسانی تعصب اور رسم و رواج کی پابندی کی وجہ سے، نیز چالاک و ناپاک قیادتوں اور بیرونی سازشوں کے سبب مسلم عوام کی تباہی کا سبب بنیں اور دینی شعور اور فراست ایمانی کی کمی کی وجہ سے مسلم عوام اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گئے۔

۲۔ مذہبی حقائق اور دینی تصورات کو تحریف اور عصر حاضر کے مغربی تصورات سے محفوظ رکھنا، سیاسیات و اقتصادیات کی اصطلاحوں کو دینی مقاصد کے بیان کرنے کے لئے استعمال کرنے سے باز رکھنا چاہئے اور دین کو خالص سیاسی نظریہ کے طور پر پیش کرنے اور عصر حاضر کے فلسفیانہ اصول سے اسلامی اصول کو مطابق کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش کے نقصانات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے کیونکہ دینی حقائق اسلام کے بنیادی اور ہمیشہ یکساں رہنے والے اصول ہیں، وہ اپنی جگہ پر مستقل بالذات ہیں اور وہ خود اپنے معیار ہیں، ان معیاروں کو کسی دوسری کسوٹی پر جانچنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو ناپنے کے لئے خود اسی کا گز ہے انبیاء کرام کی دعوت کا موضوع یہی اصول تھے، اور اسی کے لئے انھوں نے جہاد کیا اور اسی کے لئے انھوں نے سعی و جد و جہد کی، اور انہی پیمانوں پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

اسی طرح ان باتوں سے پرہیز بھی ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلق کو کمزور کردے، آخرت پر ایمان کی اہمیت کو گھٹائے اور مومن کے دل سے احکام خداوندی پر عمل کرنے کے جذبے کو، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے شوق کو، اللہ تعالیٰ سے تقرب کی تمنا کو اور اس کی رضا کے لئے اور اس کے ثواب کی امید میں کاوش کرنے کو بے اہمیت قرار دے، کیونکہ یہ باتیں اگر پیدا ہو گئیں تو امت کا تشخص اور اس کی انفرادیت مجروح ہوگی، اور بعد ازاں ایسے لوگوں کا کوئی وزن نہیں رہے گا۔ اسی طرح بت پرستی کے عقیدوں، صریح شرک، اور جاہلی عقیدہ و رواج کی برائیاں بھی ذہن نشین ہونا چاہئے۔ اور صرف دستور و نظام پر تنقید اور غیر اسلامی حکومتوں کی زبانی مخالفت کو کافی سمجھنا دین کے قدیم سادی اسلوب سے روگردانی اور جدید سیاسی اسلوب کی پیروی ہے۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی، جذباتی اور عملی تعلق کی پختگی اور آپؐ کی ذات گرامی سے گہری محبت جو اپنی ذات، اہل و عیال اور آل و اولاد سے ہو جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حیثیت سے ایمان کہ آپؐ خاتم الرسل، مولائے کل اور ہادی سبل ہیں اور آپؐ سے تعلق خاطر دین کی بنیاد ہے لہٰذا ان عوامل سے بچنا ضروری ہے

جو اس محبت کے سرچشمہ کو خشک کرنے کا سبب بنیں یا کم از کم ان کو کمزور کریں، جذبات و احساسات میں سرد مہری پیدا کریں اور اس کے نتیجہ میں سنت پر عمل میں کوتاہی پیدا ہو، بے مائیگی اور دریدہ دہنی پیدا ہو، مزاج و افتاد ایسے رخ پر پڑ جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرمایۂ فخر یاد کرنے اور آپؐ کی سیرت پڑھنے اور سمجھنے کا شوق کم ہو اور آپؐ کی محبت کو ابھارنے اور اس کو غذا دینے کے ذرائع سے روگردانی مذاق عام بن جائے، ہمارے موضوع کے اس پہلو پر ہر ایک کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور خاص طور پر عرب بھائیوں کو اس کی زیادہ فکر کرنا چاہیئے کیونکہ عرب قومیت کی تحریکوں اور ماضی قریب کے حوادث نے ان کو اس سرچشمہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کا سرمایۂ حیات ہے اور جس کے وہ زیادہ حقدار اور زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ بعثت محمدیہؐ سے یہی سرزمین مشرف ہوئی اور قرآن کریم ان کی زبان میں نازل ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی زبان میں گفتگو فرمائی۔

۴۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اور اس طبقہ میں اسلام پر اعتماد کی بحالی جس کے ہاتھوں میں تعلیم و تربیت اور وسائل ابلاغ کی باگ ڈور ہے، اسلام پر اعتماد کی بحالی کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اس بات کا یقین ہو کہ اسلام کے اندر نہ صرف زمانہ کو ساتھ لے کر چلنے اور تعمیر و ترقی کے میدان میں ہر ایک سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے بلکہ وہ پوری انسانی آبادی کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور وہی زندگی کی کشتی کو ماہرانہ صلاحیت سے کھے کر سلامتی و خوش حالی کے کنارے تک پہنچا سکتا ہے، انسانی آبادی کو ہلاکت اور خودکشی کی راہ سے نکال سکتا ہے جس میں مغرب کی بوڑھی اور اندھی قیادت نے اس کو ڈال دیا ہے اور وہ سمجھ سکیں کہ وہ ایسی شریعت نہیں ہے جو ڈسچارج ہو چکی ہے یا وہ دیا نہیں ہے جس کا تیل خشک ہو چکا ہو اور جس کی بتی جل چکی ہو بلکہ وہ ایک عالمی و سرمدی پیغام ہے اور سفینۂ نوح کی طرح تنہا سفینۂ نجات ہے جس پر سوار ہونے والے ہی غرق ہونے سے نجات پا سکتے ہیں۔

دین کی صلاحیت کے متعلق اعتماد کی کمی یا اس کا معدوم ہونا دراصل اس تعلیم یافتہ طبقہ کا مرض ہے جس نے مغربی ثقافت کے آغوش تربیت میں شعور کی آنکھیں کھولی ہیں یا جس کو مغرب کی بالادستی نے باور کرایا ہے، یہی طبقہ بہت سے ملکوں کی تباہی کا ذمہ دار اور ذہنی ارتداد کا سبب ہے، بہت سے دستوری یا تمدنی بدعنوانیاں جو پورے عالم اسلام کو کھوکھلا کر رہی ہیں وہ اسی طبقہ کی کم نگاہی یا بے راہ روی کا نتیجہ ہے، مگر یہی لوگ مسلم اقوام پر مسلط ہیں، ان اقوام پر مسلط ہیں جو فرد ایمان و قرآن کی زبان سمجھتا تھا اور جس کے اندر جوش عمل تھا اور دین کے لئے قربانی کا جذبہ تھا، غرض اسی نظام تعلیم نے حکمراں طبقہ اور جمہور کے درمیان گہری اور وسیع خلیج حائل کر دی

جس کی وجہ سے ہر جگہ ایک عمومی بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ ہے اور اس بات نے افراد کی ذہنی و عقلی قوتوں کو ایسے کاموں میں لگا دیا ہے جس کا کوئی فائدہ ان اقوام کو حاصل نہیں ہوا

۵۔ ضرورت ہے کہ مغرب سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم جو پورے عالم اسلام میں رائج ہے ایک بار نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا جائے اور پوری طرح کھنگالا جائے اور اس کو ایسے قالب میں ڈھالا جائے جو مسلم اقوام کے قد و قامت پر راست آئے، اس کے عقیدہ و پیغام سے ہم آہنگ ہو اور جس سے مسلم قوم کی معنوی خصوصیت نمایاں اور اس کی انفرادیت آشکارا ہو اور الحادی عناصر سے پاک ہو تاکہ کائنات کا صرف مادی تصور اس کے سامنے نہ ہو کیونکہ جہاں تک علوم کا تعلق ہے وہ سب ایک دوسرے کا کاٹ کرنے والی اکائیاں ہیں جب کہ نظام فطرت ایک بے قدر اور سب کو پامال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تاریخ انسان کے اضطراب و بے چینی اور آپس کی جنگوں کے لامتناہی افسانوں کا پلندہ ہے ان کو بنیاد بنا کر جب بھی عقل انسانی کی پرورش اور اس کے نمو و بالیدگی کی کوشش کی جائے گی تو کامیابی کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوگا ۔

نظام تعلیم میں جزوی اصلاحات اور معمولی کتر بیونت کارآمد نہیں ہو سکتی اس لئے ضرورت ہے کہ خواہ جس قدر بھی وسائل اور غور و فکر کی ضرورت پڑے اچھے سے اچھے ذہن و فکر سے مدد لی جائے، بہتر سے بہتر وسائل اختیار کئے جائیں تاکہ ایک پائیدار اور مفید نظام تعلیم و تربیت امت کو مل جائے کیونکہ اس کے بغیر عالم اسلام اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اپنی عقل اور اپنے ارادہ کے مطابق کام نہیں کر سکتا، اس کے بغیر نہ تو حکومتوں کو مسلمان کارندے مل سکتے ہیں نہ مخلص منتظمین مل سکتے ہیں، نہ ایسے مومن و مخلص افراد مل سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے مطابق سرکاری دفاتر، عوامی رفاہیت کے اداروں، انتظامیہ اور عدلیہ دانش گاہوں اور وسائل اعلام کو پابند کر سکیں تاکہ اسلام کا نظام معاشرت و حکومت پورے جمال و کمال کے ساتھ سامنے آئے اور مسلم سوسائٹی اپنی خصوصیات اور انفرادی امتیازات کے ساتھ دنیا کے سامنے آئے ۔

۶۔ اس مقصد کے لئے ایک بین الاقوامی پیمانہ پر مضبوط تحریک ہونی چاہیے کہ دنیا کے پڑھے لکھے سمجھدار طبقہ میں اسلام کے علمی خزانوں کا تعارف کرایا جائے اور مسلمانوں کے علمی و دینی کارناموں سے انھیں آگاہ کیا جائے۔ علوم اسلامیہ میں زندگی کی نئی روح پھونک کر متمدن دنیا پر واضح کر دیا جائے کہ اسلام کے عائلی و اجتماعی قوانین دنیا کے بلند ترین اور وسیع ترین اصول پر مبنی ہیں، وہ اصول جو نظام فطرت سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں کبھی کسی تبدیلی کا امکان نہیں

اور اس کی نفع بخشی اور قوت کسی زمانے میں نہ کم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے اور وہ انسانی زندگی رہنمائی وقت کے دھارے پر اور زندگی کے ہر موڑ پر پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دے سکتی ہے اور لوگوں کے بنائے ہوئے "قانون" جن کو وضعی قانون" کہا جاتا ہے سے بدرجہا بہتر و پائیدار ہیں۔

۷۔ انسانی نفوس اور قوموں وجدان میں تمدنی نظام کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں، خاص کر ایسا نظام معاشرت جو دینی بنیادوں اور اس کی تعلیمات کے سائے میں پروان چڑھا ہو اور جس تعمیر میں ایک خاص انداز کے مذہبی ذوق کو دخل ہو اور جس پر اس قوم کی چھاپ ہو ایسے نظام معاشرت (یا تمدن) سے کسی قوم کو الگ کرنا اس کو زندگی کے میدان سے خارج کر دینے اور عقیدہ وعبادت اور مذہبی مراسم کے تنگ چوکھٹے میں قید کر دینے اور اس کے حاضر کا رشتہ ماضی سے توڑ دینے کے مرادف ہے۔ لہٰذا اسلامی حکومتوں اور مسلم سوسائٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایک مستقل بالذات تمدن کی باریک بینی کے ساتھ تشکیل کریں جو مغرب کی کورانہ تقلید، تغیر پسندانہ کے سرسری اقدام، اور احساس کمتری کے آثار سے پاک ہو، اسلامی تمدن کی نمائندگی پورے طور پر اس کے مرکزی قیادت میں، اداروں میں، گھروں میں، اجتماعی جگہوں میں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں میں اور کسی حد تک اس کے دفتروں اور ہوائی جہازوں میں اور سفارت خانوں میں ہونا چاہئے۔ اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ اسلامی ممالک اسلامی زندگی کا ایک نمونہ پیش کریں گے بلکہ اسلام کی ایک خاموش تبلیغ بھی ہوگی۔

۸۔ مغربی تمدن بشمول مغربی علوم و نظریات کو ایجادات و امکانیات کے ایک خام مال کی حیثیت سے قبول کیا جائے جس سے عالم اسلام کے فکری رہنما اور سربراہ ایک ایسا پائیدار رہنما و قوت تمدن تیار کریں جس کی بنیاد ایمان و اخلاق، پرہیزگاری اور رحم و انصاف پر ہو، دوسری طرف اس میں نمو و افزائش کی گنجائش ہو، اس میں قوت و تیج ہو، جس کا اثر تمام شعبۂ حیات پر پڑے، پیداوار بڑھے اور عوام میں خوشحالی آسکے۔ خلاصہ یہ کہ مغربی علوم سے وہ چیزیں لی جائیں جن کی مسلم عوام یا مسلم ممالک اور حکومتوں کو ضرورت ہے جس سے عملی فوائد میسر ہوں اور جس پر مغرب و مشرق کی چھاپ نہ ہو اس کے علاوہ وہ چیزیں جس کی انہیں ضرورت نہیں ہے ان سے استغنا برتا جائے۔ مغرب سے معاملہ ایک ہمراہی اور مدمقابل کے سا ہو، کیونکہ اگر مشرق اس بات کا محتاج ہے کہ مغربی علوم سے بقدر ضرورت اخذ کرے تو مغرب بھی بہت سی چیزیں مسلم ممالک سے لے سکتا ہے۔ [illegible]

سیکھنے اور حاصل کرنے کی زیادہ ضرورت ہو ۔

۹۔ مسلم ممالک میں چند ایسے ملک بھی ہیں جنھوں نے ماضی میں دعوت اسلامی اور اسلامی تمدن کی قابل ذکر اور شاندار خدمتیں انجام دی ہیں اور عصر حاضر میں جو اس بات پر تلی ہوئی ہیں کہ جس طرح ممکن ہو اسلامی عنصر کو ناپید کردیا جائے یا جن کے یہاں " پروگریسیو اسلام" کو مقبول بنانے کی کوشش ہورہی ہے اور اسلام کی تفسیر سیاسی مصالح اور حکمرانوں کے شخصی ذوق و مزاج کے مطابق کی جارہی ہے ۔ ان حکومتوں کو باور کرایا جائے کہ یہ سیاست ایک ناکارہ اور بانجھ سیاست ہے جو کبھی اسلامی ملک میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور حکمراں اسلام سے صلح کل، تسلیم کا معاملہ کرتے ہیں وہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کی ضرورت ہے اور اس کے لئے فضا کو سازگار بنانے کی حاجت ہے، جو اسلامی قوانین کو نافذ کرنے میں معاون ثابت ہوں، اور قوانین اسلام کے نافذ کرنے کے نتیجہ میں جو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور برکت و سعادت حاصل ہوگی اسے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ نیز ان ممالک میں کوشش ہونی چاہئے کہ ایک مرکزی قیادت ہو جس کی بنیاد اسلام کے نظام شوریٰ پر ہو اور خیر و نفع کے کاموں میں ایسی تعاون جس کی اساس ہو ۔

۱۰۔ وہ ممالک جو غیر اسلامی ہیں وہاں اسلام کی دعوت اور اس کا تعارف حکمت و بصیرت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے اور وہ نہج اختیار کرنا چاہئے جس میں اسلامی تعلیمات کی روح جلوہ گر ہو، زمانہ کے مزاج کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہو ۔

رہے وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اس بات کی فکر رکھنی ہے کہ اسلام کی صحیح نمائندگی ہو، اسلامی زندگی ایسی ہو جو دوسروں کو متوجہ کرے اور جس کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوں، اخلاقی اور روحانی قدروں کی قیادت مسلمانوں کو سنبھالنا چاہئے اور ملک کو گراوٹ اور تباہی سے بچانے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہئے، اسلام صرف اس صورت میں اپنی ضرورت اور اہلیت ثابت کرسکتا ہے اور مسلمان اپنی دعوتی مہم اور قائدانہ کردار ان ملکوں میں ادا کرسکتے ہیں ۔

اور آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جو اس سلسلہ کی انتہائی بات نہیں ہے کہ اسلام کی فطرت، اس کی تابناک تاریخ اور فطرت سلیمہ کا تقاضہ اور بنی نوع انسان کی طبعی خصوصیت کا یہ مطالبہ ہے کہ ایک دعوتی، ایمانی حرکت مسلمانوں میں ضرور قائم رہے جو ایجابی انداز کی ہو اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو، داعیوں میں مردانہ صفات ہوں، بلند حوصلگی ہو، ان کی نگاہیں دوررس ہوں اور وہ دنیا کی

عظیم طاقتوں کا مقابلہ کر سکیں، وہ طاقتیں جنہوں نے ناجائز اور ناحق مسلم و غیر مسلم سب ہی فیصلے کے انجام کار کے مسائل اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، لیکن یہ بات کہ داعی الی اللہ ان صفات کا حامل ہو یا ان کے اندر یہ صفتیں پیدا ہو جائیں اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ پورے یقین اور اطمینان قلب کے ساتھ ایک طاقتور دعوتی تحریک میں شریک ہوں اور ان کے اندر اسلام کی برتری کا عقیدہ ہو اور اس بات پر ان کو یقین ہو کہ بشریت اس دین کی محتاج اور ضرورت مند ہے دعوت اسلام کی سرگرمی میں قربانی کا جذبہ، سرفروشی کی دھن، کوہ کنی کی ہمت، ماتکلفات سے عاری زندگی گزارنے کی عادت اور اگر ضروری ہو تو خطرات میں کودنے کی جرأت (مخاطرہ Risks) بھی مطلوب ہے کیونکہ فطرت انسانی یہ ہے کہ وہ اسی ایمان کی عزت کرے جس میں قوت ہو، اس فرد کی عزت کرے جس کو اپنے اصول و عقائد پر اعتماد ہو اور قابل فخر سمجھتا ہو جس کے یہاں لذت اندوزی اور مال و جاہ کی بے وقعتی ہو اور جس کے اندر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کی ہمت ہو۔ انسانی فطرت ہمیشہ اس چیز کو اہمیت دیتی ہے جو شئے نایاب اور اس کی دسترس میں میں نہ ہو۔ لہٰذا کمزور انسان قوی انسان کے احترام پر فطرتاً مجبور ہے۔ غریب آدمی امیر کی عزت کرتا ہے، ناخواندہ پڑھے لکھے آدمیوں پر رشک کرتا ہے یہاں تک کہ ایک کمینہ بھی شریف انسان کی عزت اپنے دل میں عزت رکھتا ہے، اسلامی تاریخ جاں بازی کے کارناموں اور خطرات کا مقابلہ کرنے کے واقعات سے پُر ہے، وہ اصحاب علم و بصیرت جو اقوام و ملل کی تاریخوں سے واقف ہیں اور وہ لوگ جن کے ضمیر زندہ ہیں وہ مشرق و مغرب کی قیادتوں سے اکتا چکے ہیں اور ان سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

ایک خلا کا پایا جانا، یعنی ایسی تحریک ایمانی اور دعوت دینی کا نہ پایا جانا جو ایسی جگہ پر قوی بھی ہو، اور اجتماعی بھی، اور ایک ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور مادی تمدنوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک ہو اور جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی قدروں کی محافظ ہو۔ ایسی سوسائٹی کا نہ پایا جانا، اور دعوتی خلا اسلامی وجود کے لئے بڑا خطرہ ہے، صحیح عقائد اور اسلامی زندگی کے لئے خطرہ ہے کیونکہ کسی ضروری چیز میں خلا جو بشریت کی نفع بخشی کے لئے ضروری ہو زیادہ طویل عرصہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسے خلا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی دوسری تحریک سامنے آئے گی جو بے راہ روی کی دعوت دے گی، بے مقصد و بے فائدہ عقائد کے لحاظ سے لغو اور ناقص، سلبی انداز کی تحریک جو تباہی و بربادی کا ذریعہ بنے گی، جن لوگوں نے مذاہب، تحریکات اور مختلف قسم کی دعوتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب کوئی صحیح اور پائیدار اسلامی تحریک

سامنے نہیں ہوگی تو ایک غلط قسم کی تحریک اس کی جگہ [illegible] لیکن اس غلط قسم کی تحریک نے کسی درجہ میں خطرات کا مقابلہ کر لیا اور کچھ قربانیاں دکھا [illegible] اور بادی النظر میں اپنے آپ کو ذرا بلند دکھا دیا اور [illegible] ملک میں اسلامی تعلیمات [illegible] وجہ سے جو فساد ہے اس کی نشاندہی کر دی اور بڑی طاقتیں [illegible] سے وفا کو اپنے حق میں استوار کر لیا اور پروپیگنڈوں سے اپنے تصور کے [illegible] کو بہادر بنا کر پیش کر دیا تو پھر کیا ہے لوگوں پر اس کا سحر چل جاتا ہے اور سب آنکھ بند اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، خاص طور پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کی دھوم مچ جاتی ہے، اور وہ لوگ جو بعض ممالک کی راہ روی سے نالاں ہیں ان پر اس طرح کی تحریکوں کا ایک جادو چل جاتا ہے جس کا نہ کسی کا دماغ غور کر سکتا ہے اور نہ کسی صاحب ضمیر کا قلم، اور نہ کوئی منطقی استدلال کام دیتا ہے اور نہ کوئی علمی جائزہ اور تحقیق، پہلی صدی ہجری میں خوارج کی تاریخ، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں باطنیوں اور فدائیوں کی تحریک کی تاریخ، حسن بن الصباح کے افسانے اور جو اس کے مرکز عمل "قلعہ موت" میں ہوا کرتا تھا اور بہتیری فوجی اور انقلابی تحریکوں کی تاریخ جو اسلام کے نام پر بگڑی ہوئی صورت حال کو از سر نو الٹ کر درست کرنے کا دعوی کرتی اٹھیں اور محض جھوٹ اور مکر و فریب کا لبادہ اوڑھ کر ملک کے سامنے آئیں، اسی طرح بعض معاصر انقلابی و عسکری طاقتیں جنھوں نے اپنی غلط رخ پر چلنے والی تحریکوں کی مدد کے لئے اور اپنے سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہزاروں نوجوانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا جو ہر قربانی کے لئے تیار رہتے یہاں تک کہ بعض وہ حلقے اور گروہ جو اسلامی تعلیمات کے محافظ سمجھے جاتے تھے اور ان کے فکر و عمل میں بیداری پائی جاتی تھی وہ بھی اس زد میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور قرآنی نصوص اور اسلامی عقائد کی روشنی میں کسی کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور نہ انھوں نے اسلام سے منسوب فرقوں کا انصاف کے ساتھ مطالعہ کیا۔

مسلم زعماء و مفکرین کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ سیلاب کی رو کو ایک سیلاب ہی روک سکتا ہے طوفان کا مقابلہ اس سے زیادہ قوت کا طوفان ہی کر سکتا ہے، عالم اسلام کی موجودہ جو حالت ہے اس کو معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ جمود کی حالت میں ہے، اس پر راحت طلبی اور گراں خوابی طاری ہے، اس کے اندر کوئی ایمانی مضبوط دعوت نہیں ہے نہ صحیح عقائد و بلند و پاک مقاصد کے لئے قربانی اور فدائیت کا جذبہ ہے، فکری اور عسکری لحاظ سے بھی وہ خود کفیل نہیں ہیں اور یہ بات ہمیشہ ایک خطرناک صورت حال کے پیدا ہو جانے کی آگاہی دیتی ہے اور ہر طور پر غلط قسم کی کھوکھلی تحریکوں کے جال میں نوجوانوں کو ڈال دینے

کے لئے زمین ہموار کرتی ہے کیونکہ نوجوان موجودہ صورتِ حال سے نالاں اور جن کو صحیح میدانِ عمل نہیں مل رہا ہے، ان تحریکات کے شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو وہاں کسی قدر سکون میسر آتا ہے۔ اگرچہ ان تحریکات کی حیثیت اس سراب کی ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتیٰ اذا جاءہ لم یجدہ شیئاً و وجد اللہ عندہ فوفّاہ حسابہ" (نور ۳۹)

"مثل سراب کے چٹیل میدان میں کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آیا تو اس نے کچھ بھی نہ پایا اور اس کے پاس (قضائے) الٰہی کو پایا، سو اللہ نے اس کا پورا حساب چکا دیا۔"

لیکن یہ انسانی فطرت اور اقوام و ملل کا تجربہ ہے اور جو لوگ بھی "عصرِ جدید میں اسلام" اور اسلام کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں اور جن کو عقیدہ کی صحت، خدا اور رسول پر ایمان کی عظمت اور تعلیماتِ دین عزیز ہے ان کو اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے"۔

میں اپنا یہ مختصر مقالہ ایک قرآنی آیت پر ختم کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کی اولین مختصر جماعت کو مخاطب فرمایا ہے اور ان میں رشتۂ مواخات کے قیام سے ساری دنیا اور انسانیت کے مقدر کو مربوط کیا ہے۔

"اِلَّا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر" (انفال ۷۳)

"اگر یہ نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔"

مولانا محمد عبداللہ طارق

اساتذہ سے بلا لحاظ مسلک استفادہ

کوئی بہت پرانا واقعہ نہیں، ہمارے بچپن کی بات ہے۔ ہمارے پڑوس کی مسجد بنگلے والی میں ایک بزرگ مولانا عبدالسبحان صاحب مرحوم رہتے تھے۔ دہلی کے مشہور عالم مولانا عبدالمنان مرحوم کے والد، بڑے محقق عالم اور کم سخن بزرگ تھے۔ ایک بار مذکورہ مسجد کے طلبہ اور مولانا مرحوم کے مدرسہ کے طلبہ کی آپس میں کبڈی ٹھنی ہوئی اور ہمایوں کے مقبرہ میں یہ مقابلہ ہوا۔ اگلے روز مولانا کو پتہ چلا کہ ہمارے مدرسے کے لڑکے مسجد بنگلے والی کے لڑکوں سے مقابلہ کے لئے بستی حضرت نظام الدینؒ گئے تھے تو سب طلبہ کو بلایا اور انھیں بہت برا بھلا کہا اور ڈانٹا اور فرمایا کہ تم لوگ وہاں کے لڑکوں سے مقابلہ کرنے گئے تھے! تمھیں شرم نہ آئی وہ ہمارے استادوں اور بزرگوں کی جگہ ہے۔ میں تو وہاں کا کتا بھی دیکھ لوں تو ادب سے کھڑا ہو جاتا ہوں، تم وہاں کے طالب علموں سے مقابلہ کے لئے گئے تھے؟

تبلیغی جماعت کے موجودہ امیر مولانا انعام الحسن کے والد مولانا اکرام الحسن صاحب بنگلے والی مسجد کے دروازے سے اتر رہے تھے کہ سامنے سے حضرت خواجہ سید حسن نظامی مرحوم کار سے گزرے۔ نظر پڑی تو اتر کر سلام کیا۔ مولانا نے فرمایا: حسن نظامی تو بہت بڑا آدمی بن گیا! موٹر سے سفر کرتا ہے؟ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ حضور آپ کا تو اسی طرح شاگرد ہوں اور یہ کہہ کر ان کا بستر لیا اور کاندھے پر رکھ چل دیئے۔ ڈرائیور کو واپس کر دیا اور پورے راستے اپنے ہی کاندھے پر لئے رہے۔ ساتھ والوں نے لینے کی کوشش کی کسی کو نہ دیا (روایت سید محمد یحییٰ نظامی)

میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی ایک جید عالم اور فن حدیث کے مانے ہوئے استاد تھے مسلکاً اہل حدیث تھے۔ مگر بلا امتیاز ہر مسلک کے لوگ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے ان کے شاگردوں کی اکثر تعداد احناف کی ہے۔ حضرت مولانا علی میاں کے والد مولانا عبدالحی حسنی بھی ان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے نزہۃ الخواطر میں اس دور کے علماء کے حالات

میں بلا شمار لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ میاں صاحب محدث کے شاگرد تھے۔

دہلی کے مشہور مدرسہ ریاض العلوم (مچھلی والان) کے بانی اور اپنے دور کے دہلی کے بڑے عالم مولانا عبدالسلام صاحب بستوی مرحوم اہلِ حدیث تھے۔ مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم تھی۔ اپنے اساتذہ جو تمام حنفی مسلک تھے کا بے حد احترام کرتے رہتے۔ دہلی میں جب کوئی ان سے مسئلہ پوچھنے آتا تو اس سے اس کا فقہی مسلک دریافت کرتے اگر وہ حنفی ہوتا اسے حنفی فقہ سے جواب دیتے اور اہلِ حدیث ہوتا تو اس کے مطابق مسئلہ بتاتے۔

حال ہی کی بات ہے حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ وطناً دیوبندی، مسلکاً دیوبندی حنفی، ہر وقت دیوبند والوں کی آمد ورفت تھی۔ دیوبند کے مدرسہ میں ایک عرصے تک فتوے کی خدمت انجام دی تھی۔ کون ہے جو ان کے دیوبندی ہونے سے بے خبر ہوگا۔ مگر آج! دہلی میں ہزاروں لوگ ہیں جنھوں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے پاس صبح سے شام تک آنے والوں کی لائن لگی رہتی تھی جن میں اہلِ دیوبند، جمعیۃ کے لوگ، جماعت اسلامی کے بڑے اور چھوٹے، اہلِ حدیث، اہلِ خانقاہ، شیعہ حضرات، بوہرہ جماعت کے مختلف قسم کے حضرات، کانگریس والے، مسلم لیگ والے اور دوسری سیاسی تنظیموں کے لوگ، غیر مسلم ایک سے ایک اعلیٰ اور ادنیٰ نہایت قرب و یگانگت کے ساتھ اپنے ملکی، ملی، تنظیمی، گھریلو اور ذاتی ہر قسم کے مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔ ہر ایک کی خوشی اور غم میں مفتی صاحب شریک ہوتے تھے، ان کے مسائل میں دلچسپی لیتے تھے، ہر شخص سے سچی ہمدردی کرتے تھے، نہ کبھی ان کو مسلک کا فرق ایک لمحہ کے لئے دامن گیر ہوتا تھا نہ آنے والے اس فرق کی وجہ سے کبھی ذرہ برابر کوئی غیریت اور اجنبیت محسوس کرتے تھے۔

یہ تھا ہمارا ماضی، صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پورے ملک کا یہی حال تھا۔ ہندو مسلمان تک کا فرق اتنا نہ تھا جتنا کہ آج آپس کے معمولی مسلک کا فرق بن گیا ہے۔

پندرہ دن قبل کی بات ہے کہ میرے پاس ایک دین دار شخص آئے جو بہت پریشان تھے وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فلاں مقام کے ایک اہلِ حدیث عالم نے یہ کہہ دیا کہ حنفیوں کے پیچھے اہلِ حدیث حضرات نماز درست نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں حنفی حضرات نے بھی کوئی نہ کوئی ایسی کارروائی کی ہوگی بلکہ پہلے ہی سے کوئی منافرت چل رہی ہوگی جس کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوا۔

میں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ دہلی کی جماعت اہلِ حدیث کے چند علما رحضرات

کے پاس جائیں اور صورت حال بیان کرکے ان سے کوئی مناسب تحریر حاصل کریں ۔ چنانچہ مولانا عبدالحمید صاحب رحمانی ، مولانا ابوالکلام صاحب ، مولانا عبدالمنان صاحب اور مفید رباز ارکے مدرسہ کا ان کو پتہ دیا کہ یہ جماعت اہل حدیث کے ممتاز علماء ہیں اور سنجیدہ ہیں یہ اس صورت حال کو سنبھالنے میں دلچسپی لیں گے ۔

اس اسلامی تعلیمی سال کے شروع میں ایک صاحب اپنے بچے کے متعلق مشورہ کرنے تشریف لائے کہ کس مدرسہ میں داخل کروں ؟ میں نے ایک مدرسہ کا نام لیا تو انھوں نے وہاں نام نہاد طرز فکر کے فرق کا ذکر کیا ۔ میں نے پوچھا جو علم آپ اپنے بچے کو سکھانا چاہتے ہیں وہ وہاں معیاری ہے یا نہیں ! انھوں نے تسلیم کیا کہ ہاں کہ تعلیم تو وہاں کی معیاری ہے ۔ میں نے کہا پھر مسلک اور طرز فکر کے فرق سے آپ کو کیا پریشانی ہے ؟ اگر بالفرض علوم شرع کی روشنی میں بہت سے بہت یہ بھی ہوا کہ آپ کے بچے نے وہی خیالات اختیار کرلئے تو بھی کون سی آفت آگئی ؟ یہ کوئی کفر اور اسلام کا فرق تو نہیں ہے ۔

ایک عالم نے ایک موقع پر اپنے ممتاز اساتذہ کا ذکر کیا ۔ بعد میں میں نے تنہائی میں ان سے پوچھا کہ فلاں صاحب بھی تو آپ کے اساتذہ میں ہوں گے ؟ اور غالباً اہم اساتذہ میں ہیں ؟ بولے ہاں ہیں تو سہی مگر میں ان کا ذکر مسلک کے فرق کی وجہ سے نہیں کرتا ۔ مجھے سخت افسوس ہوا ، میں نے کہا : یہ تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ اپنے اساتذہ کی فہرست میں ان کو رکھیں یا نکال دیں اور معاف کیجئے وہ اس بات سے بلند ہیں کہ آپ کی شاگردی سے ان کا کچھ مقام بلند ہو گا کہ عنقا را بلند ست آشیانہ ۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ تمام عمر آپ کو اس خاص فن سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا جو ان صاحب سے حاصل کیا تھا ۔ حضرت امام مالک رح اور متعدد دیگر اکابر کا قول ہے (من برکة العلم ان ینسب القول الیٰ قائلہ) (جو بات جس سے حاصل ہوا ہے اسی کے حوالے سے بیان کرنے سے علم میں برکت حاصل ہوتی ہے) ۔

یہ صورت حال دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہائے ہم کہاں چلے جارہے ہیں ۔ ارشاد نبوی ہے کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ۔ یہ روایت بہت سی کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرام رض سے روایت کی گئی ہے ۔ یعنی جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا ۔ انسانوں سے انسانوں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے اور ان کو شکریہ ادا کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا شکر ادا کرنا ہے ۔ علم یا کوئی اور فائدہ جس سے حاصل کیا ہو تو اس کا اعتراف کرنا بھی بہت بڑا شکر ہے ۔ خواہ احسان کرنے والا

باقی بر صفحہ ۱

موجود ہو یا نہ ہو ، زندہ ہو یا وفات پا چکا ہو ، یہ ایک ایسا راز ہے کہ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے ہیں کہ اپنے محسنوں کو یاد رکھنا اور ان کے احسانوں کا بوقت مناسب ذکر کرنا ان احسانات کی برکتوں میں اضافہ کرتا ہے ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور مقولہ ہے کہ جس نے مجھے ایک حرف سکھا دیا میں اس کا غلام ہوں وہ چاہے تو مجھے بیچ دے چاہے اپنی غلامی میں رکھ لے ۔ یہی چیز ہے جس نے حضرت علیؓ کو علم نبوت کے شہر کا باب الاعظم بنا دیا ہے ۔

ضرورت ہے کہ ہم لوگ اپنی گفتگو میں تحریروں میں اور اپنے معاملات میں اس تنگ ذہنی ناقدری اور احسان فراموشی سے خود بھی گریز کریں اور دوسروں کو بھی توجہ دلائیں ورنہ یہ فتنہ بڑھتے بڑھتے ہمارے معاشرے کے مزید ٹکڑے کر دے گا اور یہ خلیجیں ہمارے ملی شیرازے کو پارہ پارہ کر دیں گی ۔

گھٹتے گھٹتے خار بن جائے گا راستے میں نیشتر
بڑھتے بڑھتے دل کا چھالا آسمان ہو جائے گا

ایک اپیل = انگریزی روزنامہ

ماہنامہ شاداب جنوری ۸۸ء میں ایک اپیل شائع ہوئی ۔ اس میں جناب سید حامد سکریٹری ٹرسٹ کا پتہ شائع ہونے سے رہ گیا ۔ جناب محمد امیم فاروقی شکاگو ۔ امریکہ نے شاداب سے ربط پیدا کر کے پتہ حاصل کیا ۔ پتہ درج ذیل ہے ۔

Janab Syed Hamid, Secretary ;
National Information and Welfare Trust,
NEW DELHI.

محمد صدر الحسن رحمانی قاسمی

مدارس اسلامیہ میں سائنسی تعلیم

مدارس اسلامیہ میں سائنسی تعلیم کی ترویج و اشاعت کی ضرورت ہے یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تاریخ ماضی کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس کی ضرورت سے کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ اب یہ ضرورت بحث و نظر کی منزل سے گزر کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ جو چیز بدیہی ہو اس کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب "مرکز فروغ سائنس" نے مدارس اسلامیہ میں اس کی ضرورت اور عدم ضرورت کی بحث چھیڑ دی ہے تو پہلے ہم تاریخ ماضی کا ایک مختصر جائزہ لیں۔ پھر اس کی ضرورت و افادیت کو آپ کے سامنے رکھیں

امت اسلامیہ کا ادارہ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے اہم مظہر رہا ہے۔ زمانہ ماضی میں ہمیشہ مسلمانوں کی درس گاہیں مختلف علوم و فنون کا مرکز رہی ہیں اور علوم و فنون میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ درسگاہیں حکومت کے تعاون اور حکومت کے بغیر تعاون کے دونوں طرح چلتی رہی ہیں۔ ان درس گاہوں نے اگر ایک طرف مذہبی تصورات اور عقائد کی تعلیم کو رائج کیا تھا تو دوسری طرف قومی تشکیل میں سائنس کو بھی اپنے پہلو میں جگہ دی ہے جن کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ افراد کو ان کے ذوق و استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں صنعتوں کے لئے تیار کریں اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی صلاحیت پیدا کریں

چنانچہ ایک انگریز سیاح لکھتا ہے کہ "عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و مذہب میں پھولا پھلا تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر باقی دنیا میں ان کا وجود نہ تھا۔" اے ج۔ جی لکھتا ہے کہ "سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ دیں تو عربوں کو منہ بولا باپ کہنا چاہئے۔ جدید زمانے کو علم کی روشنی لاطینی کے ذریعہ سے

ہیں بلکہ عربوں کے توسل سے ملی ہے۔ صدیوں کے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے مہمیز ملی اور عرب بیدار اور متجسس ہو کر دنیا میں سب سے زیادہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کئے، علم ہیئت کو بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کر دئے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں ہے۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست خدمت کی اور یورپ کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی۔ جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بدنظمی کے گڑھے میں پڑے ہوئے تھے عرب اس وقت دنیا کی ذہنی اور دماغی رہنمائی کا منصب ادا کر رہا تھا اور چار سو برس تک کرتا رہا۔"

عراقی ماہر تعلیم کا قول ہے کہ یورپ کی "نشاۃ ثانیہ" مسلمان عربوں نے کی۔ افلاطون، ارسطو اور اقلیدس ہم نے یورپ کو دئے اور یورپ کو ایک متمدن براعظم بنا دیا۔

مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے وسط سے گیارھویں صدی کے آخر تک دوسرے تمام مذاہب و اقوام پر سبقت لے جانے کا ثبوت پیش کیا اور گیارھویں صدی مسلمانوں کو تمام دنیا کے علم و حکمت کا رہنما بنا کر ختم ہوئی۔

فتح اللہ شیرازی صاحب علوم میں مہارت رکھتے تھے اس میں آپ بیلس "حیرالتعال" کر گئے۔ ہندوستان میں حکمت کا فخر تھا۔ اس کی مصنوعات میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو خود حرکت کرتی تھیں اور اس سے آٹا پیسا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک آئینہ حرکت بھی تھا جس میں دور کے عجیب و غریب تماشے ہوتے تھے اور ایک بندوق تھی جو ایک گردش میں بارہ آواز دیتی۔

حکیم علی نے وہ مشہور تالاب بنایا تھا جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی کو سیڑھیاں ملتیں ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے کے بعد فرش و فروش کے سجائے کمرے میں آدمی داخل ہوتا جس میں دس بارہ آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دسترخوان چنا ہوتا اور فانوس جلتے تھے۔ حکیم علی کے اس طلسمی تالاب میں اکبر بادشاہ بھی گیا تھا۔

حکیم علی کا وہ چراغ بھی مشہور ہے جس سے حمام (غسل خانہ) بھی روشن رہتا تھا اور چراغ بھی نہیں بجھتا تھا۔ اسی طرح حکیم علی نے ایک ایسی دوا ایجاد کی جس سے پانی برف بن کر جم جاتا تھا۔

فیروز تغلق کے زمانے میں لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہندوستان میں ایجاد ہوئی [illegible]

رتی تھی اور یہ شعر سنائی دیتا تھا ؎

ہر ساعتے کہ بر در ایں شاہ می زنند نقصان عمر می شود آں یاد می دہند

ترجمہ (بادشاہ کے دروازے پر ہر گھنٹہ میں جو گھڑیال بجاتے ہیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہوگیا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد میں کیا کیا چیزیں یہی مدرسہ کے حاشیہ نویس ایجاد کر چکے تھے۔ اسلامی سلاطین کا کوئی زمانہ ہو، نہروں، تالابوں، اور پلوں کی تعمیر کے لیے سے جو حیرت انگیز کام انجام دئے گئے اور تعمیرات کا جو سلسلہ ان بادشاہوں کے عہد میں آتا ہے اور باغبانی اور کاشتکاری کے متعلق جو اصلاحات مسلمانوں نے اپنے عہد میں جاری کیں اُن کی نظیر اس زمانے میں بھی پیش نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے کہ باضابطہ انجنیروں اور ماہروں کے بغیر ایسے کام کا انجام پانا ناممکن ہے۔

آج جبکہ ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا جال پھیلا ہوا ہے اور اس میں مسلمان بچے تعلیم پاتے ہیں تو سماج اور قوم کی تعمیر و تشکیل میں ان کا بھی حصہ ہے۔ یہ بچے قوم کے لئے مذہب اور ملت کے لئے اسی وقت سود مند ثابت ہوسکتے ہیں جب ان کی استعدادی قوت صلاحیت کو جدید تقاضوں کی روشنی سے اجاگر کیا جائے اور ان کو ہمہ جہت علم سے آراستہ کیا جائے جیسا کہ زمانہ ماضی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

آج مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب اور طرز تعلیم، اساتذہ کا انداز فکر، طلباء کا نظر، زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، زندگی اپنا چولا علوم و فنون بدل گئے، ہمارے مسائل کی نوعیت دوسری ہوگئی، طرز فکر اور انداز بیا ۔ ہر چیز قانون ارتقار کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی۔ دنیا کے جن جن زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقار میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے رہے۔ کائنات کی ترقی پذیر روح حیات کو جذب کئے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسلامیہ کی پہلی درسگاہ "صفہ" ہے جس میں صحابہ رضؓ کے سامنے نہ صرف ج اور زکوٰۃ کے مسائل بیان کئے جاتے تھے بلکہ عصری علوم سے بھی ان کو جاتا تھا۔ نیزہ بازی، تیر اندازی اور فنون حرب کے دیگر طریقوں سے بھی ان جاتا تھا اللہ قرآن نے بھی ان کو ہوشیار اور مستعد رہنے کے لئے خبردار کیا ہے

مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ ۔

(ان کافروں کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے سامان درست رکھو)۔ (بیان القرآن)

اب اس ایٹمی دور میں نیزہ بازی، تیراندازی اور فنون حرب کے پرانے طریقے بیکار ہو گئے لیکن قرآن کا ابدی پیغام اپنی جگہ پر باقی ہے کہ تمہیں اپنی قوت کے اکٹھے کرنے کے لئے استعداد اور صلاحیت کو بروئے کار لانا ہوگا تو اب ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ دشمنوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کے لئے ہم اپنے اندر ایٹمی قوت اور صلاحیت پیدا کریں۔ اس کے لئے اپنی اقتصادی حالت کو مضبوط کرنا ہوگا اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے مدارس میں ایسی تعلیم کا بھی انتظام ہو جو جدید تقاضوں کو پورا کر سکے اور یہ کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" چنانچہ انسانی تہذیب و تمدن کی دنیا میں اسی ضرورت کے پیش نظر مغربی ممالک نے حیرت انگیز انقلاب برپا کیا۔ انھوں نے اپنے کارناموں اور اپنی ذہنی اور دماغی تخلیقات کے ذریعہ نہ صرف اپنے ملکوں کا بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ انھوں نے انسانی تہذیب و تمدن کو ایک نئی زندگی بخشی ہے اور فطرت کے راز ہائے سربستہ کو بے نقاب کر کے فکر و نظر کے لئے وسعتیں اور نئی فضائیں پیدا کی ہیں۔ آج ان ہی لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مغربی ممالک سیاسی اعتبار سے ایشیائی اقوام کے تعاون و اشتراک کا خواہ کتنا ہی محتاج ہوں لیکن پوری دنیا پر اس کی ذہنی اور دماغی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ ابھی عرصے تک اس سے نجات پانا ناممکن ہے۔ اگر آج ہم بھی اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہونے کا عہد کر لیں تو ہندوستان روزآنہ کی ایجادات سے لبریز ہو جائے گا ——

ایجاد و تحقیق میں کسی چیز کا پیدا کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس ایجاد کے ذریعہ حقیقت میں ہزاروں برس کی جہالت کا اعتراف ہے یعنی جو چیزیں ہزاروں برس سے عالم میں موجود تھیں اور ہم اس سے جاہل اور ناواقف تھے اب اس کا علم ہوا اور اسی کا نام سائنس ہے۔ عالم میں ہزاروں حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں لیکن اس کا علم اور اس کی ترتیب کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر بندھا ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں رہے اور جد و جہد جاری رکھتا ہے ناکامی پر ہمت نہیں ہارتا اور کامیابی پر ہتھیار نہیں ڈالتا ہے بلکہ ہر تحقیق کے بعد ایک نئی تحقیق اس کے سامنے آتی ہے۔ لہٰذا سائنس سے اسلام کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے اور اسلام کی حقانیت واضح ہوتی جاتی ہے اسی بنا پر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

"فلسفۂ قدیم اسلام سے بہت دور ہے اور سائنس یعنی فلسفۂ جدید اسلام سے بہت

اور فرمایا کہ
"سائنسی اکتشافات کو اسلام کے لئے بطور تائید استعمال کیا جا سکتا ہے"۔

قرآن کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاشرتی و معاشی ۔ اخلاقی و سیاسی اور تہذیبی و تمدنی وغیرہ تمام چیزوں کے لئے احکام موجود ہیں۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ قیام و بقا کے لئے ان سب چیزوں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دوسرے یہ کہ قرآن کی نظر میں صاحب صلاحیت قوم وہی ہو سکتی ہے جس نے مجموعی حیثیت سے اس کی بیان کردہ چیزوں میں اہمیت و صلاحیت پیدا کی ہے۔ اگر زندگی کے ایک گوشے میں جد و جہد کرنے سے قرآنی صلاحیت کا سرٹیفکٹ مل جاتا تو پھر آسمے اس قدر تفصیل سے بیان کرنے اور تمام گوشوں کے احاطہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

آسمان عظیم الشان وسیع و عریض آسمان اور اس میں آفتاب و ماہتاب اور دوسرے سیارے ان میں کچھ تو ثوابت ہیں اور کچھ ایسے سیارات ہیں جن کے دوسرے نظام شمسی و قمری کے انداز میں نہایت محکم و مضبوط قانون کے تحت مقرر اور متعین ہیں۔ اسی طرح زمین کا پورا کرہ، اس کے دریا اور پہاڑ دونوں میں طرح طرح کی مخلوق، درخت اور جانور، زمین تہ میں چھپی ہوئی معدنیات زمین و آسمان کے درمیان چلنے والی ہوا اور اس کے مخصوص نظام، یہ سب چیزیں عقل والوں کو دعوت فکر دے رہی ہیں۔ اسی لئے قرآن پاک میں عقل والوں کی صفات میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران)

[اور آسمان اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں] (بیان القرآن)

اور اس نظام فلکیات و ارضیات پر جب کوئی بندہ غور و فکر کرتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران)

[اے ہمارے رب! تو نے اس کو لایعنی نہیں پیدا کیا۔]

چونکہ دنیا اس وقت مادی لحاظ سے ترقی کرتی جا رہی ہے، اس لئے قرآنی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے زمانے کے تقاضے کی مناسبت سے جد و جہد کرنا لازمی اور ضروری ہے یہ دینی تعلیمات کے منافی نہیں ہے بلکہ آدم کی تخلیق کے عین منشاء کے مطابق ہے جس وقت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو فرشتوں نے اشکال پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا امتحان لیا،

لْاَسْمَاءَ كُلَّهَا [اور آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کا علم دے دیا]

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے خواص، اس کے آثار اور اس کی ماہیت کا علم دیا گیا تھا، خواہ وہ چیزیں موجود تھیں یا آئندہ اس کا ظہور ہو۔

اگر ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی چاہے وہ کیسی ہی حالات و ظروف میں ہو اس کو اسلامی بنایا جا سکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کر لیا تھا۔ مدرسوں میں عصری روح کو جذب کرنا ہوگا۔ تعلیم کو زندگی سے مربوط کر کے آگے بڑھانا ہوگا۔ ان درسگاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا کہ طلبہ کو یہ درسگاہیں اسلام کی متحرک قوتوں سے آشنا کریں گی۔

قیام و بقا کی جدوجہد میں قومی زندگی میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اگر اپنی کھوئی ہوئی چیزیں دوسری قوموں سے مل جاتی ہیں تو ہمیں اس کے لینے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے اور اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے:

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن الخ

[حکمت کی باتیں مومن کا گم شدہ متاع ہیں جہاں کہیں بھی اس کو پائے، لے لے]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس میں کسی قسم کا دریغ نہیں فرمایا۔ آپؐ جس صالح معاشرے اور سوسائٹی کے قیام و بقا کی ضمانت لے کر آئے تھے اخلاقی تربیت کے ساتھ اس زمانے کے لحاظ سے تہذیب و تمدن کی تمام ضروریات کو لازمی قرار دیا تھا بشرطیکہ اس کا تصادم اسلام اور مسلمانوں سے نہ ہو۔ آپؐ نے تعلیم پر بہت زور دیا اور اس کو عام کرنے کے لئے مختلف انتظامات کئے۔ آپؐ نے صحابہؓ کو دوسری زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی زبانیں سیکھ لی تھیں اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کثیر زبانوں کے ماہر تھے۔ اسی طرح مختلف علوم و فنون کے سیکھنے کی تاکید فرمائی۔ ریاضی، طب، علم ہیئت، علم انساب، نشانہ بازی، تیر اندازی، تیراکی، شہسواری وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے تقاضے کے مطابق "مدارس اسلامیہ" میں بھی عصری علوم و فنون کو جگہ دینی چاہئے بالخصوص سائنس کو ترجیحی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

علامہ اقبالؒ

سائنس کا شہر — تری یستے

اٹلی کا شہر تری یستے (TRIESTE) میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کے قائم کردہ بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبعیات International Centre for Theoretical Physics کی جانب سے ایٹمی و سالماتی طبعیات کی عالمی کانفرنس (۹ مارچ تا ۳ اپریل ۱۹۸۷ء) میں شرکت کی دعوت ملی۔ کسی بھی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے کا یہ میرا دوسرا موقع تھا۔

میں علی گڑھ سے اپنے شعبہ کے دو اور شرکاء کے ساتھ دہلی کے نئے ہوائی اڈے (اندرا گاندھی نیشنل ایرپورٹ) سے صبح پانچ بجے ایرانڈیا بوئنگ ۷۴۷ سے روانہ ہوئی۔ ہندوستانی وقت کے مطابق دن کے ڈھائی بجے اعلان ہوا کہ ہم لوگ اب روم ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ وہاں وقت کے مطابق صبح کے سوا نو بجے تھے اور اس وقت کا درجۂ حرارت ۲ ڈگری سیلسیس تھا۔

جہاز سے اترتے ہی اٹلی کی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں نے ہماری وہ خاطر کی کہ ہم اکڑ کر رہ گئے۔ ہوائی اڈے میں داخل ہوتے ہی یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اندرا گاندھی ہوائی اڈہ اسی کی نسبت روم کا ہوائی اڈہ رقبہ کے اعتبار سے کافی بڑا ہے۔ اس میں اہم دروازے ہیں جو زمین دوز خلئے کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں ہر دو منٹ پر ایک جہاز آتا یا جاتا نظر آتا ہے۔

روم سے اپنی منزل مقصود تری یستے پہنچنے کے لئے یہاں کی لوکل فلائٹ ال اطالیہ ملی۔ ایک گھنٹہ میں جہاز اترا۔ ہوائی جہاز کی بس نے تری یستے کے ریلوے اسٹیشن لے جا کر چھوڑ دیا۔ پھر وہاں سے ذریعہ ٹیکسی ہم لوگ بخیر و عافیت سینٹر پہنچ گئے جہاں مجھے (Adriatics Palace Hotel) ایک ترکی خاتون پروین اری کان کے ساتھ ٹھہرا دیا گیا۔

اس سینٹر کا قیام پروفیسر عبدالسلام کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل انرجی ایجنسی نے حکومت اطالیہ کے تعاون سے قائم کیا۔ بعد میں یونیسکو اور دوسری حکومتوں نے مالی تعاون فراہم کرنا شروع کیا۔ اب یہ مرکز دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی منازل سر کر رہا ہے

اٹلی کے وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ کوئی وزیر اگر مجھ سے سو ڈالر مانگتا ہے تو میں منع کر دیتا ہوں لیکن پروفیسر سلام اگر مجھ سے دس لاکھ ڈالر کی فرمائش کرتے ہیں تو مجھے منع کرنا گوارا نہیں ہوتا۔

اس مرکز کے اغراض و مقاصد میں سے کچھ یہ ہیں:

تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے ماہرین طبعیات کو عصر حاضر کی ترقی سے روشناس کرانا لائق سائنسدانوں کی ہمت افزائی کرنا اور ان میں جوش اور لگن سے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا وغیرہ

ابتدا میں یہاں صرف طبعیات کے مختلف موضوعات پر کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اکتوبر ۱۹۸۶ء سے ریاضی کی کانفرنس کا بھی انعقاد ہونے لگا۔ عبدالسلام کا ارادہ اسے تیسری دنیا کے ممالک کے لئے سارے سائنسی علوم کا مرکز بنانے کا ہے۔ اگلے برس سے ماہرین کیمیا کی بھی کانفرنس شروع ہونے کا امکان ہے۔ اس وقت سینٹر کے پاس تین عمارتیں ہیں جہاں بیک وقت دو کانفرنسیں بآسانی چلتی رہتی ہیں۔ سینٹر کی خاص بلڈنگ (ICTP) کہلاتی ہے۔ اس میں ڈائرکٹر عبدالسلام کا کمرہ ہے۔ ایک لائبریری ہے جس میں ۳۵ ہزار کتابیں اور ۵۰۰ بین الاقوامی جرائد آتے ہیں۔ کمپیوٹر ہے۔ فوٹو کاپی کرنے کی مشینیں ہیں سینٹر کا بہت بڑا عملہ ہے جو حسن وخوبی اپنا کام تن دہی اور نیک نیتی سے انجام دیتا ہے۔ یہ عملہ اطالوی انگریز، افریقی غرض کئی ممالک کے افراد پر مشتمل ہے۔

۹ مارچ کو صبح آٹھ بجے رجسٹریشن ہوا بعد ازاں سب شرکاء کو ایک آئی کارڈ (I-Card) دے دیا گیا۔ اٹلی میں ہر شخص کے پاس آئی کارڈ ہونا ضروری ہے۔ سلام صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے (I.C.T.P) کی مختصر تاریخ بیان کی اور بار بار سخت محنت و لگن سے کام کرنے کی تلقین کی بعد ازاں سارے شرکاء کا تعارف ہوا۔ کانفرنس میں ۹۷ شرکاء تھے۔ چینی اور ہندوستانی شرکاء کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بقیہ پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش ملیشیا، انڈونیشیا، فلسطین، ویتنام ترکی، ارجنٹینا، مصر، نائجیریا، ایتھوپیا اور پیرو وغیرہ کے تھے۔ چار نامور سائنسداں ڈائرکٹر کے عہدے پر مامور کئے گئے تھے جو کچھ شرکاء کو ایک ساتھ بلا کر یکے بعد دیگرے انٹرویو لیا کرتے تھے۔

کانفرنس کے اوقات صبح سوا نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک اور پھر دو سے پانچ تک تھے جس میں نامور سائنسداں لکچر دینے آتے اور جاتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ شرکاء کو سمینار لکچر بھی دینے تھے۔ جس میں انھیں تحقیقی کام پیش کرنا تھا۔ چنانچہ ۲ اپریل کو مجھے اپنا ریسرچ پیپر پیش کرنا تھا جو بخیر و خوبی ہو گیا۔

کانفرنس کے سبھی شرکاء اطالوی کھانے کھاتے تھے جو قدرے مختلف تھا۔ گائے کا گوشت مرغ اور مچھلی زیتون کے تیل میں بھنے ہوئے تھے جن پر نمک چھڑکا ہوتا تھا۔ مسالوں سے دور دور

سطہ نہ تھا۔ چاول روز ملتے تھے۔ یہاں کے مخصوص کھانے پزا، میکرونی اور پاستہ وغیرہ
گوشت مشین کا کٹا برتھے سنا ہوتا تھا جس میں ہڈی نام کی کوئی چیز کبھی نظر نہ آئی۔
ایک روز سلام صاحب کی سکریٹری نے اردو جاننے والوں کو طلب کیا، اردو میں سائنس
کی کتاب کے لئے سلام صاحب سے ایک پیغام لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ سلام صاحب
پیراگراف انگریزی میں لکھ کر اپنی انگریز سکریٹری کو یہ کہہ کر دے گئے تھے کہ کسی علی گڑھ
والے سے اس کا ترجمہ کرا کے بھیج دینا۔ اس ترجمے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ وہ ترجمہ یہ تھا:

"مجھے مکمل یقین ہے کہ امن، خصوصاً نیوکلیائی امن و امان جلد ہی قائم ہو سکے گا
درحقیقت انسانیت اس نیوکلیائی خطرے سے پوری طرح باخبر ہو چکی ہے اور عظیم طاقتوں
کو بھی اس کا احساس ہو چکا ہے کہ اپنی حفاظت کی ضمانت کی حد سے زیادہ اسلحوں کا انبار لگانا لغو
فضول ہے۔ نیوکلیائی امن کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کم از کم سو ارب ڈالر، جو کہ عالمی اسلحوں پر خرچ کئے جا رہے
ایک ہزار ارب کا دسواں حصہ ہے، انسانی فلاح و بہبود کے لئے مہیا کیا جا سکے گا۔ دنیا
کے سیاست دانوں سے میری استدعا ہے کہ وہ کم از کم اس سو ارب کا دسواں حصہ یعنی دس
ارب ترقی پذیر ممالک کی امداد پر خرچ کریں، جس میں سے ایک ارب انہیں ترقی پذیر ممالک
سائنس اور تعلیمی ترقی پر خرچ کیا جائے۔ اگر یہ ممکن ہو سکا تو ایک انقلاب رونما ہوگا۔ میری
تمنا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ میں تہ دل سے دعا گو ہوں کہ بنی نوع انسان کلی طور سے حقیقی امن
و سکون سے ہم کنار ہو اور جس انقلاب کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں وہ جلد ہی حقیقت بن
کر ہمارے سامنے آئے۔"

کانفرنس میں "سائنس اور اس کی ترقی" کے موضوع پر لیکچر بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک روز
مان کے نسیم احمد کا لیکچر تھا۔ یہ بھٹو کے زمانے میں ڈنمارک میں سفیر رہے تھے۔ آج کل تیسری
سائنس کی اکادمی کے مشیر کار ہیں۔ لیکچر کے دوران انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں سائنسی ترقی میں
کی سب سے بڑی وجہ روایتی مذہب پرستوں کی بیجا دخل اندازی ہے۔ ان کی یہ بات سن کر
شرکاء بھڑک اٹھے مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔

نسیم صاحب نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں سر سید نے ایم۔ اے او
قائم کر کے سائنسی تعلیم پر زور دیا تو مذہبی علماء کے ایک طبقہ نے نہ صرف انھیں برا بھلا کہا
ان پر کافر اور مرتد کا فتویٰ بھی عائد کر دیا۔

دوسری مثال انھوں نے سلیم اتاترک کی دی جس کے زمانے میں نئی نئی پرنٹنگ مشین آئی تھی

وہ اس مشین سے قرآن پاک چھپوانا چاہتا تھا لیکن مذہبی لیڈروں نے ایسا کرنے سے منع کیا وہ نہ مانا اور قرآن پاک چھپوا لیا جس پر اس کے خلاف کفر کا فتویٰ دے کر اسے قتل کرا دیا گیا کراچی یونیورسٹی کے فزکس کے ہیڈ محمد رفیع صاحب نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی تھی بہت پرلطف آدمی تھے۔ ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے ارے بھئی! تم ہندوستانی ہم کو زندہ کیوں نہیں رہنے دیتے۔ ذرا سی بندر بھبکیوں سے ڈر جاتے ہو کہ پاکستان بم بنا رہا ہے ہم لوگ تمہارے خوف سے یہ بھی نہ کہیں تو کیا کریں!

سویڈن کے پروفیسر سوان برگ جو ہماری کانفرنس کے ڈائرکٹر بھی تھے اور کبھی ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے، ایک روز رات کے کھانے پر سارے ہندوستانیوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ ان کو پہلے یہ بتایا گیا کہ ہم لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے مذاہب اور اس کے رسم و رواج پر بات ہوئی۔ جہیز کا رسم پر بہت دل برداشتہ ہوئے۔ کہنے لگے کہ میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ اگر اس قسم کی رسم ہمارے یہاں ہوتی تو میں بھی زندگی بھر پریشان رہتا مگر اس بات سے ضرور متاثر ہوئے کہ شادی میں والدین کی مرضی شامل حال رہتی ہے۔ چوں کہ ان کے ملک میں معاملہ مختلف ہے۔ بعد ازاں مسلم خواتین زیر بحث آئیں۔ ایک غیر مسلم نے فوری لقمہ دیا کہ اب تو مسلم پرسنل لا بدل چکا ہے جس کے مطابق مسلم خواتین کے حقوق ان سے چھین لئے گئے ہیں۔ میں نے کہا، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، یہ قانون تو ہمارے حق میں بنا ہے، آپ اسے سمجھ نہیں پائے! پھر سوان برگ نے میری رائے پوچھی تو میں نے بتایا کہ اسلام میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ نباہ نہ ہونے کی صورت میں خواتین طلاق لے سکتی ہیں۔ لڑکیوں کو جہیز کم لانے کی صورت میں جلانے کا رواج زیادہ تر اکثریتی طبقہ میں ہے۔ یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوئے۔

میری ترکی روم پارٹنر یروین ارسلان سیدھی اور پیاری سی مسلم خاتون تھی۔ کوئی اسے فرانسیسی سمجھتا تھا اور کوئی اطالوی۔ اس کا رہن سہن یورپین تھا۔ نماز پڑھنا نہیں جانتی تھی جس کا قصوروار وہ اپنے والدین کو ٹھہراتی تھی۔ ہاں! ہر روز صبح اٹھ کر 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' پڑھنا اس کا معمول تھا۔ عربی زبان سیکھنے کی اسے حسرت تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ روزہ رکھتی ہے۔ اس کے ملک میں اکثر سنی مسلمان کی حکومت ہے اور ۹۹ فیصد آبادی انہی لوگوں پر مشتمل ہے شادی اسلامی طریقے سے ہوتی ہے۔ جہیز دیا جاتا ہے جسے ترکی زبان میں چیز کہتے ہیں۔ لڑکی کی شادی میں خاندان کے سبھی افراد سونے کا زیور اسے تحفے میں دیتے ہیں۔ چلتے وقت اس نے کئی ہندوستانی افراد کو ترکی سے لائے ہوئے تحائف پیش کئے۔

۲۸ مارچ کو اطلاع ملی کہ رات کو دو بجے سے سب لوگ اپنی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کرلیں
لوگوں کے لئے یہ چیز بڑی عجیب تھی مگر یہاں آفس کے اوقات میں تبدیلی کرنے کے بجائے
گرمیوں میں ایک گھنٹہ پیچھے اور جاڑوں میں گھڑی ایک گھنٹہ آگے کرلی جاتی ہے ۔

ری یستی : یہ پورا شہر نصف دائرہ نما ہے جس کے ایک طرف سمندر اور دوسری جانب
پہاڑوں کا سلسلہ ہے ۔ یہ سمندر آبنائے (GULF) ہے جسے (ADRIATICO SEA)
کہتے ہیں ۔ یہاں جاڑوں میں بہت تیز اور برفیلی ہوا چلتی ہے جسے عرف عام میں بوراہ کہا جاتا
ہے ۔ اس ہوا کی رفتار اکثر دو سو کلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے جس وقت یہ ہوا چلتی ہے آمد و رفت
کا سلسلہ قطعی منقطع ہوجاتا ہے ۔

اس شہر کی آبادی صرف دس لاکھ ہے ۔ مکان چھوٹے مگر خوبصورت ہوتے ہیں جن کی
چھتیں عموماً کھپریل کی بنی ہوتی ہیں ۔ چودہ پندرہ منزل سے اونچی عمارتیں نظر نہیں آتیں ۔ کرایہ پر
مکان ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ ان بلند و بالا عمارتوں میں رہنے والے ہر شخص کے پاس
ایک ٹیلی فون ہوتا ہے جس کا اسپیکر دروازے پر لگا ہوتا ہے ۔ گھنٹی بجنے کی صورت میں اوپر
سے ہی بذریعہ ٹیلی فون نام معلوم کرکے دروازے کا بٹن دبانے پر دروازہ کھل جاتا ہے ساتھ
ساتھ بجلی بھی مل جاتی ہے ۔ ایک خاص وقفہ بعد دروازہ اور بجلی از خود بند ہوجاتے ہیں ۔

یہاں ہفتہ پانچ دن کا ہوتا ہے ۔ سنیچر اتوار کو سارے ادارے بند رہتے ہیں ۔ بازار صبح
صبح ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک اور پھر شام کو تین سے سات بجے تک کھلا رہتا ہے
بازار اتوار اور پیر کو بند رہتا ہے ۔ کہیں کہیں اِکا دُکا ہی کی دوکانیں کھلی مل جاتی ہیں ، جہاں سے سگریٹ
اور اخبار خریدے جاسکتے ہیں ۔

ونڈو شاپنگ کا رواج عام ہے ۔ عموماً فروخت ہونے والا ہر سامان شوکیس کی زینت بنا رہتا ہے
جس پر قیمت بھی لکھی رہتی ہے ۔ ونڈو شاپنگ کے ذریعہ پسند کرکے سامان خرید لیا جاتا ہے ۔
اس سے دوکاندار کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے ۔

شہر بھر میں نہ تو کوئی دوا کی دوکان نظر آئی اور نہ ہی کسی درزی کی ۔ ہر عمر کے لوگوں کے لئے
ریڈی میڈ کپڑے با آسانی مل جاتے ہیں ۔ زیادہ تر دوکانوں کا کام خواتین نے سنبھال رکھا ہے جو عموماً
سیلز گرلز ہوتی ہیں جبکہ مرد فیٹ کار اور اسکوٹر کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں ۔
شہر میں قدم قدم پر ہوٹلیں ہیں اور ہر ایک میں سیلف سروس ہے ۔ خواتین بھی گھر جانے کے بجائے
کھانا ہوٹلوں میں کھالیتی ہیں ۔ مردوں سے زیادہ عورتیں سگریٹ نوشی کے میدان میں آگے

ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔

یہاں کے لوگ دانستہ انگریزی بولنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اب نئی نسل انگریزی بول رہی ہے۔ بوڑھے لوگ انگریزی سے قطعی نابلد ہیں۔ ہر شخص اپنے آپ میں مگن رہتا ہے ایک دوسرے سے ان کا ربط صرف لفٹ میں ہلو تک ہی محدود رہتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کی ذمہ دا حکومت نے سنبھال رکھی ہے۔

سڑک کے قوانین ہندوستان سے کچھ مختلف ہیں۔ یہاں دائیں جانب گاڑیاں چلتی ہیں اور صرف اسٹاپ پر ہی رکتی ہیں۔ راستے میں آپ انہیں کہیں نہیں روک سکتے۔ بسوں میں تین در ہوتے ہیں جنہیں ڈرائیور اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بند کرتا اور کھولتا ہے۔ ڈرائیور کے لئے الگ کیبن ہوتا ہے۔ بسوں میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا۔ پورے ماہ بسوں میں سفر کرنے کا پاس ہوتا ہے جسے (Rete) ریتے کہتے ہیں۔ ریتے نہ ہونے کی صورت میں بس کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے جو سڑک کنارے سب مشینوں سے پانچ سو لیرا ڈال کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر ٹکٹ کی چیکنگ ہوتی ہے۔ ٹکٹ نہ ہونے کی صورت میں بیس ہزار لیرا بطور فائن لیا جاتا ہے۔ اس ڈر سے ہر شخص بس میں ٹکٹ لے کر ہی سوار ہوتا ہے۔ بس کے اندر ایک مشین لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ٹکٹ کو اس مشین میں ڈال کر (Punch) کرتے ہیں جس کی اطلاع ڈرائیور کو سرخ رنگ کی روشنی سے ہو جاتی ہے۔ پورے شہر میں ایک بس بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کا شیشہ چٹخا یا ٹوٹا ہوا ہو۔ بسوں میں بیٹھنے کے لئے سیٹیں کم ہوتی ہیں اور ہر بس میں کچھ نشستیں معذور لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ سنیچر اور اتوار (WEEK END) کو بسوں کے اوقات بدل جاتے ہیں اور کچھ کا سرے سے راستہ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ چیز غیر ملکیوں کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے

عموماً شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں مگر کہیں کہیں تنگ بھی ہیں۔ پتلی سڑکوں پر موٹریں صرف آتی یا جاتی ہیں جب کہ کشادہ سڑکوں پر آمد و رفت دونوں کا انتظام ہے۔ کاریں سڑک کے دونوں جانب پارک کی جاتی ہیں۔ رات میں کاریں سڑک کے کنارے ہی کھڑی رہتی ہیں، کیوں کہ چوری کے واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔

یہاں کے باوردی پولس والے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے موٹر سائکل پر پورے شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ کسی حادثے یا واقعے کی اطلاع ملتے ہی دو منٹ کے اندر پولس جائے واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ اس موقع پر پولس کی گاڑی آمد و رفت کے قوانین کی پروا کئے بغیر زول زوں کی صدا بلند کرتے ہوئے اسی انداز سے جاتی ہے جس طرح ہندوستان

آگ بجھانے والی گاڑی۔

مارچ اپریل میں ہر سمت یہاں خزاں رسیدہ درخت ہی نظر آتے ہیں۔ بعد ازاں گرمی شروع ہو جاتی ہے۔ موسم گرما میں یہاں کے لوگوں کا محبوب مشغلہ کشتی رانی ہے۔ بیشتر لوگوں کی اپنی کشتیاں ہوتی ہیں جنھیں یہ کار کے پیچھے ٹرالی میں رکھ کر گھر لے جاتے ہیں۔ ہر کشتی میں وائرلیس لگا ہوتا ہے تاکہ وقت ضرورت پولس کی امداد لی جا سکے۔

پرندوں میں (SEA GULLS) سمندر کے پانی پر بیٹھی ہوئی ہر طرف نظر آتی ہیں۔ سردی کے باعث کوّے بالکل نہیں پائے جاتے۔ کبوتر، بلیاں اور انواع و اقسام کے کتے ہر طرف دوڑتے نظر آتے ہیں۔ لوگ ان جانوروں کو بڑے شوق سے پالتے ہیں۔

ایک روز علی الصباح چار پانچ سو لوگ سائیکلوں پر دوڑتے نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج (SUNNY DAY) ہے۔ سمندر کے کنارے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ گو کہ اب بھی کوٹ پہننے کی ضرورت تھی۔ کچھ لوگ نیم برہنہ سمندر کے کنارے بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے اور کچھ کشتیوں پر سیر کر رہے تھے۔ شام کی گھما گھمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں ذرا سی دیر میں سڑکوں پر سناٹا ہو جاتا تھا وہاں آج چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بھیڑ دیکھ کر اسپیشل بسیں فوراً چلائی گئیں اور پولس کا گشت لگاتار ہوتا رہا۔

یہاں کے لوگ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ کوڑا ہمیشہ کوڑے دان میں پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کرکے ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ ایک روز ہم لوگ ایک پارک میں گھومنے گئے۔ لوٹتے وقت ذرا سی دیر ہوگئی۔ دیکھا گیٹ بند ہو چکا ہے۔ بمشکل تمام وہاں کی صفائی کرنے والی نے گیٹ کھول تو دیا مگر بار بار ہاتھ کے اشارے سے یہ جتاتی رہی کہ پارک ٹھیک پانچ بجے بند ہو جایا کرتا ہے۔

سنٹر کے قیام کے بعد سے یہاں غیر ملکی سائنس دانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس لئے لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ شہر جلد ہی "سائنسی شہر" کے نام سے شہرت اختیار کر لے گا۔

مشہور مقامات: یہاں کا مشہور چرچ سینٹ جسٹو (St. Justo) ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے جو کسی بھی ہندوستانی قلعہ کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ علاقہ جرمن فوجوں نے مسمار کر دیا تھا۔ یہاں ایک مجسمہ ہے جس میں چار افراد ایک آدمی کو پچھاڑ کر مختلف ہتھیاروں سے مارنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہاں سے سارا تریسٹے صاف نظر آتا ہے۔

غالباً لوہے کے شہتیروں پر قائم ہیں۔ یہاں کی مشہور عمارات میں ڈکل محل (Ducal Palace)
اور سینٹ مارکو (Saint Marco) قابل دید ہیں۔

ڈکل محل میں بہت باریک نقاشی کی گئی ہے اس کے پتلے پتلے در دور تک چلے گئے ہیں۔ یہ محل آمنے سامنے ایک جیسا بنا ہوا ہے اور فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے اس کے صحن میں کبوتروں کا جھنڈ سیاح کو دانہ کھلانے پر مجبور کئے بغیر نہیں رہتا۔

سینٹ مارکو ایک چرچ ہے جس کی چھت پر سونے کے پانی سے مختلف تصاویر بنی ہوئی ہیں۔ یہ سونے کا پانی ... مربع گز کے رقبہ میں کیا گیا ہے جسے پورا ہونے میں کئی سو برس لگ گئے۔

ڈکل محل کے قریب ایک جیل خانہ ہے۔ تقریباً ۸۰ سال قبل کچھ قیدی بذریعہ ایک پل اس میں لائے گئے تھے جنھوں نے بہت آہ و فغاں کی تھی۔ جب سے اس پل کا نام "آہ و فغاں پل" رکھ دیا گیا۔ اس سے آگے اطالوی موسیقار انٹونیو ولوالدی Antonio Vivaldi کا محل ہے جو کلاسیکی ہونے کا مانا ہوا استاد تھا۔ یہاں سے آگے جائیے تو بہت بڑی نہر نظر آتی ہے جسے ریالٹو نہر اور اس پر تعمیر شدہ پل کو ریالٹو پل کہتے ہیں۔ یہ کافی پرانا پل مگر دلکش ہے یہاں سے راستہ بازار کی طرف جاتا ہے۔ بازار ہر طرف سے زیورات سے آراستہ و پیراستہ نظر آتے ہیں۔ یہ زیورات مورینہ گلاس کے بنے ہوتے ہیں جو اس شہر کا مخصوص تحفہ ہے۔ وینس بڑا سیاحی مرکز ہے اس لئے ہر جگہ ہوٹل اور ریسٹورانٹ نظر آتے ہیں۔ یہاں کا بندرگاہ بھی بہت پرانا ہے۔ رات میں وینس کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جھلملاتے برقی قمقموں کا پانی میں دور تک عکس اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

ایک مہینہ لکھنے پڑھنے، لیکچر سننے، گھومنے اور تفریح کرنے کے بعد ہم نے ICTP کو خیرباد کہا۔ یہ جانے کتنے سائنس داں روز آنہ یہاں آتے ہیں اور یہاں سے فیضیاب ہو کر واپس جاتے ہیں یہ سب ایک واحد شخص پروفیسر عبدالسلام کی بدولت ہے جن کا اطالوی عوام لوہا مانتے ہیں۔ سینٹر کا قیام تیسری دنیا کے ممالک کے لئے عموماً اور مسلم سائنس دانوں کے لئے خصوصاً ایک اہم مقام رکھتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس قسم کے مراکز مسلم ممالک میں بھی قائم ہوتے۔ ہمارے عرب کے شیخ کرکٹ پر پانی کی طرح روپیہ بہا سکتے ہیں۔ ایران و عراق اپنے زعم میں ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کاش یہ لوگ عبدالسلام صاحب سے کچھ سبق حاصل کر سکتے۔ ہم لوگوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر عبدالسلام کو اٹلی میں جو عزت و توقیر اور ان کے سینٹر کو جو عظمت بخشی ہے وہ دنیا تک قائم رہے۔ آمین۔

آپ کے کُنبے میں جب بھی کوئی

پیدائش

یا

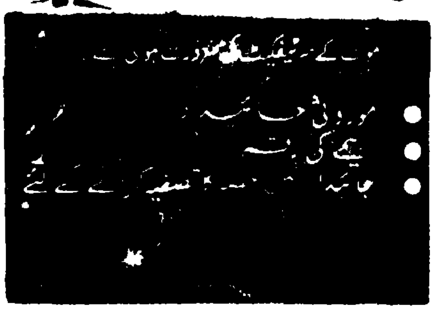
موت

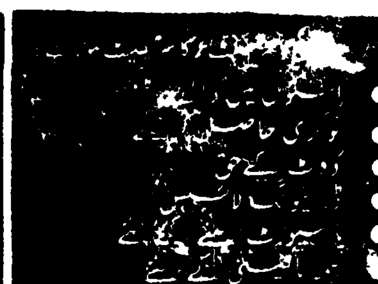
ہو

اُسے مقامی اندراج دفتر میں درج

ضرور کرائیں

یہ معاون ہوتا ہے





اندراج بروقت کرائیے

اور سرٹیفکیٹ بلا معاوضہ حاصل کیجئے

پیدائش اور موت کا اندراج کرانا قانوناً لازمی ہے

تاخیر سے کئے گئے رجسٹریشن بھی قابلِ قبول ہوں گے۔

رجسٹرار جنرل، انڈیا

/۱۹۹

ولی قادری صاحب نے انگریزی میں طبع زاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ تاریخی عمارت "چارمینار" پر آپ کی طویل نظم پانچسو اشعار پر مشتمل ہے۔ آپ نے بتایا کہ یہ نظم ۱۹۸۱ء میں پندرہ دن میں مکمل ہوئی تھی۔ آپ نے اقبال کی نظم "ہمالہ" اور "ستارہ" کا ۱۹۸۲ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

میرے اس استفسار پر کہ شعر گوئی کی طرف آپ کی طبیعت کیوں اور کیسے مائل ہوئی۔ آپ نے کہا کہ آپ کی غزل گوئی کی ابتدا ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ ایگزیکیوٹیو انجنیئر آفس واقع ارم منزل (پنجہ گٹہ، حیدرآباد) میں تعیناتی کے دوران اس آفس کے بعض صاحب ذوق ساتھیوں اور دوستوں کے گھروں پر ہر ماہ شعری نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ دس بارہ پرخلوص احباب کا ایک گروپ تھا۔ جن میں شیخ عبدالرحمٰن انصاری، اعجاز احمد اور رضا کی حیدرآبادی شامل تھے۔ یہ نشستیں بھی شعر گوئی کی محرک ہوئیں۔ علی گڑھ کلب، سالارجنگ میوزیم اور رائیلڈرس کونسل آف انڈیا کے زیر انتظام منعقدہ محفلوں اور مشاعروں میں آپ نے اپنا کلام سنایا ہے۔ آپ نے بتایا کہ اب تک آپ نے ایک سو غزلیں کہی ہیں۔ کبھی کبھی مزاحیہ نظمیں بھی ہوجاتی۔

آپ نے کہا کہ آپ کی پرورش و پرداخت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اچھی سوسائٹی ملی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد ہمیشہ شامل حال رہی۔ ۱۹۷۳ء میں آپ نے فریضۂ حج بھی ادا کیا۔

موجودہ دور کے تعلیم کے معیار پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ نے کہا آج کل ٹکنیکل تعلیم کا معیار پست ہے۔ طلباء کے لئے یہ لے حد ضروری ہے کہ وہ ٹکنیکل لٹریچر کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ ہم نے انٹرویو کے لئے جناب ولی قادری کا شکریہ ادا کیا۔

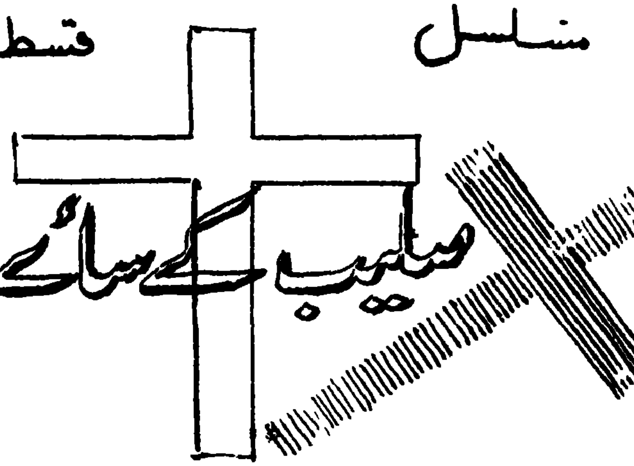
میری خواہش پر انٹرویو کے آخر میں آپ نے نئی نسل کے لئے ایک مختصر لیکن رہنما پیام عنایت کیا۔ آپ نے کہا کہ

"نام کی خاطر نہیں۔ بلکہ کام کی خاطر کام کیجئے۔"

□□△△○○

امین مالوف — قاضی جلیل احمد

مسلسل قسط ۱۵



صلیب کے سائے میں

قاضی الخشب کا مقصد خود اقتدار حاصل کرنا نہ تھا بلکہ رضوان کے بیٹے اور نئے
حدار الپ ارسلان پر ایسا اثر ڈالنا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے رضوان کی پالیسی کو چھوڑ کر
پالیسی کو اپنالے۔ اور ابتداءً الپ ارسلان نے قاضی الخشب کا اثر قبول کرتے ہوئے
پالیسی کو اپنایا تھی۔ اس نے رضوان کے سارے ساتھیوں کو گرفتار کر کے قتل کروا دیا لیکن
ں سارے عمل میں مدبرانہ اقدامات کے بجائے تشدد اور خون آشامی سے بچکانی لگاؤ کا اظہار
ا جس کی وجہ سے الخشب فکرمند ہو رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شہر میں خون
رانے کی کاروائیوں کو بند کرا کر اپنے عمل کو صرف خاطیوں کو سزا دینے کی حد تک محدود رکھے۔
یں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نوجوان بادشاہ کو خونریزی ہی میں مزہ آنے لگا تھا۔ لہٰذا اس نے
اضی کی نصیحت کو ان سنا کر کے قتل و خون کا سلسلہ اسی جوش و خروش سے جاری رکھا۔ دیکھتے
ہی دیکھتے خود بادشاہ کے دو بھائی، حکومت کے کئی عمال اور عہدہ دار اور بے شمار معصوم لوگ
موت کے گھاٹ اتر گئے۔ تب لوگوں نے جانا کہ ان کا بادشاہ دراصل ایک فاتر العقل آدمی ہے
، نئے الپیوسی کے ایک وقائع نگار کا نوشتہ درج ذیل ہے جس کا نام کمال الدین تھا:
" ایک دن الپ ارسلان نے بعض امرا کو جمع کیا اور انھیں قلعے کے تہ خانے میں لے گیا
جب وہ سب لوگ وہاں پہنچ گئے تو اس نے کہا کہ اگر میں یہ حکم دوں کہ سب کے سر
کاٹ دیے جائیں تو تم کیا کہو گے؟"

"ہم سب سرکار کے غلام ہیں" ان میں سے ایک بدقسمت امیر نے جواب دیا اور اس طرح سے وہ سب اپنی جان بچا کر واپس آ گئے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا بادشاہ کی من مانیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کا سب سے چہیتا غلام اور خواجہ سرا لولو بھی اس کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا۔ بالآخر ستمبر ۱۱۱۳ء کو لولو نے الپ ارسلان کو سوتے میں ہلاک کر کے رضوان کے ایک چھ سالہ لڑکے کو تخت نشین کروا دیا۔

الیپو میں بدامنی اور مزاج دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قلعہ میں غلاموں اور سپاہیوں کے غول قتل اور غارت گری میں لگے ہوئے تھے اور مسلح شہری ان قاتلوں اور لٹیروں سے اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھنے کے لئے مسلح پہرے دینے لگے تھے۔ لیکن اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر الیپو پر قبضہ کرنے کا خیال کسی فرنگی حکمران کے ذہن میں نہیں آیا۔ رضوان سے ایک سال پہلے ٹنکرڈ اس جہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور اس کے جانشین سر راجر (جس کو کمال الدین "سرجال" لکھتا ہے) میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی مہم سے عہدہ برآ ہو سکتا۔ لیکن یہ مہلت بہت قلیل عرصے کے لئے تھی کیونکہ انطاکیہ کے سر راجر کی یہ بے عملی عرصہ تک قائم نہیں رہی اور انطاکیہ پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے الیپو کے قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور چونکہ اس کی راہ میں کوئی مزاحم نہ تھی لہٰذا اس نے حج کو جانے والے زائرین پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا

اپریل ۱۱۱۷ء میں لولو خواجہ سرا قتل کر دیا گیا۔ کمال الدین کے بیان کے مطابق لولو کے محافظ دستے کے سپاہیوں نے اس کے قتل کی سازش کی۔ ایک دن جب وہ شہر کے مشرقی علاقے میں سے گزر رہا تھا محافظ دستے کے سپاہیوں نے خرگوش خرگوش کا شور بلند کر کے تیر برسانا شروع کر دیا۔ جیسے وہ کسی خرگوش کا شکار کر رہے ہیں لیکن دراصل وہ سارے تیر لولو کے جسم میں پیوست ہو گئے اور وہ راستے ہی میں ہلاک ہو گیا۔ لولو کے مرنے کے بعد اقتدار ایک اور غلام کے ہاتھ میں آیا جس نے اپنے آپ میں اپنے مخالفین کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پا کر انطاکیہ کے راجر کو الیپو پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد جو بدامنی پھیلی وہ ناقابل بیان ہے۔ باہر فرنگیوں نے شہر کا محاصرہ شروع کیا اور اندر سرداران لشکر ایک دوسرے سے جنگ و جدال میں مصروف ہو گئے۔ ایسے میں ابن الخشاب نے پھر سے میدان عمل میں آنے کی ٹھان لی۔ انہوں نے تمام شہر کو جمع کر کے ان کے آگے ایک

رکھی جس کے بہت دوررس نتائج نکلنے والے تھے۔ اس نے کہا کہ ایک سرحدی شہر کی حیثیت سے آلیپو کو کاروان جہاد میں ہراول کی حیثیت حاصل ہے۔ لہٰذا اس شہر کی عنان حکومت ایک ایسے طاقتور امیر کے سپرد ہونی چاہیئے جو دینی مفاد کو ذاتی اغراض پر مقدم رکھے۔ قاضی کی تجویز کو بڑی اکثریت نے منظور کر لیا اگرچہ اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے نزدیک دین سے زیادہ آلیپو کا اپنا مفاد زیادہ اہم تھا۔ اب ایسے امیر کی تلاش شروع ہوئی جو اس معیار پر پورا اتر سکے۔ سلطان محمد نے پہلے ہی سیریا کے معاملات سے اپنے آپ کو بے تعلق کر لیا تھا۔ تفتگیں ایک طاقتور امیر تھا لیکن حاکم دمشق آلیپو والوں کے لئے قابل قبول نہ تھا آخر میں الخشب نے مردان کے والی الغازی Ilghazi کا نام پیش کیا۔ مردان عراق میں واقع ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کا رویہ کسی اعتراض سے بالاتر نہ تھا۔ دو سال پہلے اس نے سلطان محمد کے خلاف ترکوں اور فرنگیوں کے اتحاد کی تائید کی تھی۔ اور اس کی کثرت شراب نوشی بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ جب وہ پینا شروع کرتا تو کئی کئی دن نشے کی حالت میں گزار دیتا اور اس زمانے میں اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ احتراز نشہ اور قابلیت جنگ یہ دو ایسی صلاحیتیں تھیں جن کا بیک وقت کسی مسلم سردار میں پایا جانا تقریباً ناممکنات میں سے تھا۔ الخشب کے نزدیک سب سے اہم چیز یہ تھی کہ الغازی ایک بہادر جنرل تھا۔ اس کا خاندان کافی عرصہ تک یروشلم پر حکمرانی کر چکا تھا اور اس کا بھائی سوکمان وہی شخص تھا جس نے جنگ حران میں فرنگیوں پر زبردست فتح پائی تھی۔ بالآخر آلیپو کے امیروں کی اکثریت نے الخشب کی رائے سے اتفاق کیا اور الغازی کو آلیپو آنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ۱۱۱۸ء کے موسم گرما میں خود الخشب نے شہر کے دروازے الغازی کے لئے وا کر دئے۔ نئے امیر نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ رضوان کی لڑکی سے شادی کر لی اور اس طرح آلیپو اور مردان کا قانونی الحاق عمل میں آیا اور الغازی کی قانونی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے عساکر کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔

اور اس طرح فرنگی حملہ کے ۲۰ سال بعد آلیپو کے تخت پر ایک ایسا شخص مسند آرا ہوا جو واقعی طور پر فرنگیوں سے لوہا لینے آمادہ تھا۔ اس کا نتیجہ حیران کن تھا۔ ۲۸ رجون ۱۱۱۹ء کو آلیپو کی فوجوں کی انطاکیہ والوں سے سرمدا کے مقام پر مڈبھیڑ ہوئی۔ کمال الدین یوں رقمطراز ہے:

"بادسموم سے فریقین کی آنکھیں دھول اور گرد سے اٹی جا رہی تھیں۔ الغازی نے اپنے سرداروں سے قسم لی کہ وہ میدان جنگ میں ہرگز کوئی بزدلی نہیں دکھائیں گے

اور نہ میدان کو پیٹھ دکھائیں گے اور خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کر دیں گے
اس کے بعد فوج کو صف در صف دشمن کے اطراف پھیلا دیا گیا۔ یہ عمل رات کی تاریکی میں انجام پایا۔ صبح سویرے فرنگیوں نے دیکھا کہ اسلامی فوجیں اپنے علم لہراتی چاروں طرف سے ان پر یلغار کر رہی ہیں۔ قاضی الخشب بھی ایک گھوڑے پر سوار اس جنگ میں شامل تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بڑھ کر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن الغازی کے سپاہیوں کو ایک عمامہ پوش کی قیادت گراں گزری۔ انھوں نے کہا کیا ہم اتنی دور سے اس لئے آئے ہیں کہ ایک شملہ پوش کے حکم پر عمل کریں۔
لیکن قاضی الخشب دراتا ہوا بے باکانہ ان کی صفوں سے باہر نکلا اور دشمن کی طرف بڑھتے ہوئے ایسے پراثر الفاظ میں اپنے ساتھیوں کو للکارا کہ فرط اثر سے ان کے آنسو نکل پڑے اور اس کے پیچھے ہی وہ بھی دشمن کی طرف لپکے۔"
گھمسان کا رن پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ فرنگی شکست کھا کر بھاگے۔ مرنے والوں میں سر راجر بھی تھا۔ اس کے سر میں ایک تلوار اس کے سر اور پیشانی کو چیرتی ہوئی ناک کی پھننگ تک اتر آئی تھی۔

اس فتح کی خبر الپو اس وقت پہنچی جب مسلمان نماز ظہر کا سلام پھیر رہے تھے۔ شہر میں کئی روز تک فتح کا جشن ہوتا رہا۔ لوگ مال غنیمت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے جا رہے تھے۔ تلواریں برچھیاں، زرہیں اور خود سینکڑوں کی تعداد میں۔ قیدیوں میں سے جو امیر اور مالدار تھے انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ اب صرف چند غریب اور محتاج ہی باقی بچ رہے تھے جنھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جا رہا تھا۔ بازاروں اور چوراستوں پر بھرے مجمعوں میں الغازی کی تعریف میں قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ "خدا کے بعد آپ اے الغازی بس ہم تم ہی پر بھروسہ کرتے ہیں" سال ہا سال سے الپو کے لوگ خوف و ہراس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پہلے بوہیمنڈ، پھر ٹینکرڈ، پھر راجر۔ لوگ سمجھتے تھے کہ تریپولی والوں کی طرح الپو پر بھی ایک دن ایسا آئے گا جب کہ انھیں موت یا جلاوطنی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ سرمدا کی فتح کے بعد انھیں ایسا لگا جیسے انھیں نئی زندگی مل ہو۔ الغازی کی اس فتح سے عالم عرب میں امید کی ایک کرن پھوٹی۔ ابن قلانسی لکھتا ہے " اس سے پہلے اسلام کو ایسی فتح کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی"
تعریف و توصیف اور خوشی و مسرت کے اس مبالغانہ اظہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا حوصلہ اس وقت کس حد تک پست ہو چکا تھا کہ فرنگ کے خلاف انھیں کسی کامیابی کا تصور

بھی باقی نہ رہا تھا ۔ اور اسی کے ساتھ فرنگیوں کے غرور اور تعلی کی بھی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی اور اسی کے ساتھ فرنگیوں کے غرور اور تعلی کی بھی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی ۔ مارچ ۱۱۱۸ء میں یروشلم کے بالڈون نے صرف ۲۱۶ نائٹوں اور ۴۰۰ پیادوں کے ساتھ مصر پر چڑھائی کی ٹھانی اور ریگستان سینا کو پار کرتا ہوا الفرما پر بلا مزاحمت قابض ہوگیا اور پھر آگے بڑھتا ہوا دریائے نیل کے کنارے تک پہنچ گیا ۔ ممکن ہے کہ وہ اور بھی آگے جاتا لیکن اتفاقاً بیمار پڑ گیا اور یروشلم واپس ہوتے ہوئے العریش کے مقام پر اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس تازہ ذلت سے وزیر الافضل کبھی سر نہ اٹھا سکا اور تین سال بعد قاہرہ کی گلیوں میں اسے قتل کر دیا گیا ۔ یروشلم میں بالڈون کی جگہ ایڈیسہ کے بالڈون ثانی کی حکومت قائم ہوگئی ۔

سنائی میں سے فرنگیوں کی اس تاخت کے فوری بعد سرمدا کی جنگ میں مسلمانوں کی فتح کو لوگوں نے فال نیک تصور کیا اور سمجھا کہ اب فرنگیوں کی شکست، پسپائی اور واپسی کا دور شروع ہوگیا ہے ۔ انھیں یقین تھا کہ الغازی اب بلا انتظار انطاکیہ کی طرف کوچ شروع کر دے گا کیونکہ انطاکیہ میں اب نہ سپاہی باقی تھے اور نہ سپہ سالار ۔ ادھر انطاکیہ میں فرنگی قلعہ بند ہونے کی تیاریاں کرنے لگے تھے ۔ پہلے تو انھوں نے سوچا کہ سیریا والوں، آرمینیا والوں اور گریک کرسچین لوگوں سے ہتھیار لے کر انھیں ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا جائے کیوں کہ ان سب سے فرنگیوں کو یہ خطرہ تھا کہ وہ ترکوں سے مل جائیں گے ۔ فرنگیوں اور دیسی عیسائیوں کے بیچ تنازعات نے شدت اختیار کرنا شروع کر دیا ۔ دیسی عیسائیوں کو ہمیشہ ہی سے یہ شکایت تھی کہ فرنگی ان کے رسوم عبادت کا احترام نہیں کرتے ۔ لیکن فرنگیوں کی یہ ساری احتیاطی کارروائیاں غیر ضروری تھیں کیونکہ الغازی نے انطاکیہ کا رخ بھی نہیں کیا شراب کے نشے میں بدمست وہ فتح کے جشن کی رنگ رلیوں ہی میں مگن رہا ۔ اس کا سارا وقت رضوان کے شاہی محل کی آسودگیوں میں بسر ہوتا تھا ۔ اس نے اتنی شراب پی، اتنی شراب پی کہ بالآخر اس کا کلیجہ دختر رز کی ابکاری کی تاب نہ لا سکا ۔ جس دن وہ بخار میں پھنکتا رہا تاآنکہ یروشلم کی فوجیں بالڈون ثانی کی قیادت میں انطاکیہ پہنچ گئیں ورلوں الغازی سرمدا میں ہونے والی فتح کا کوئی فائدہ اٹھائے بغیر تین سال تک بستر پر ایڑیاں رگڑنے کے بعد راہی ملک عدم ہوا ۔ اور گو اس نے آلیپو کو فرنگی خطرے سے بچایا تھا پھر بھی اس کے مابعد کی بے اعتدالیوں کی بدولت آلیپو کی کوئی آنکھ اس کے لئے نمناک نہیں ہوئی ۔ بلکہ لوگ اس کے جانشین کی تلاش میں مصروف ہوگئے اور بالآخر الغازی کی جانشینی کے لئے بلبق کا انتخاب عمل میں آیا ۔

ستمبر ۱۱۲۲ء میں بلق Balak نے ایڈیسہ پر یلغار کر کے جوسلین کو گرفتار کرلیا جو بالڈون ثانی کی جگہ وہاں کا حاکم بنا تھا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ بلق نے جوسلین کو اونٹ کی کھال میں سی کر ایک قلعہ میں قید کردیا اور اس کے لئے فدیہ کی ہر پیشکش کو رد کردیا اور اس طرح انطاکیہ کے راجر کے بعد یہ دوسرا فرنگی فرمانروا تھا جو صفحۂ ہستی اور بساط سیاست دونوں جگہ سے مٹ گیا۔ ایڈیسہ کے سقوط کی خبر جب یروشلم کے بالڈون کو پہنچی تو وہ فوج لے کر ایڈیسہ پہنچ گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کی آرام طلبی اور عیش پسندی فرنگیوں پر بھی اثر کرنے لگی تھی۔ بالڈون نے ایڈیسہ پر حملہ کرنے کے بجائے اپنا وقت لہو و لعب میں گزارنا شروع کیا۔ چنانچہ ایک دن موقع پاکر بلق نے بالڈون اور اس کے ساتھیوں کو گھیر کر گرفتار کرلیا

ان کارناموں سے فراغت پاکر بلق فاتحانہ آلیپو میں داخل ہوا۔ (جون ۱۱۲۳ء)۔ یہاں الغازی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی رضوان کی لڑکی سے شادی کرلی۔ اس کے بعد فرنگیوں نے آلیپو کی طرف جتنے قلعے فتح کر کے اپنے قبضے میں کرلئے تھے یکے بعد دیگرے ان سب پر اس نے دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس چہل سالہ ترک امیر کی مہارت جنگ، اس کا استقلال اور پامردی، فرنگیوں کے ساتھ کسی بھی سمجھوتے سے انکار، اور اس کی مسلسل فتوحات، اسے اس علاقے کے دیگر مسلمان امرا سے ممتاز اور ممیز کرتی ہیں۔

ٹائروالوں نے تو بالخصوص اس کی بروقت آمد کو تائید غیبی سمجھا۔ کیوں کہ فرنگی ہنوز ان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے اور قلعہ کی دفاع کرنے والوں کی حالت دن بہ دن زار ہوتی جارہی تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ اب سمندر کا راستہ بھی فرنگیوں نے بند کر رکھا تھا۔ ایک سو بیس اطالوی جہازوں کا ایک بیڑہ فلسطینی ساحل پر لنگر انداز تھا جس نے عسقلان میں لنگر انداز ایک مصری بحریہ پر اچانک چھاپہ مار کر اسے تباہ کردیا تھا اور اب اسی اطالوی بیڑے نے ٹائر کے سمندر کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور شہر میں کسی طرف سے بھی کوئی رسد پہنچنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اور گو ٹائر کے لوگ بڑی ہمت اور دلیری کے ساتھ اپنی دفاع میں مصروف تھے لیکن ان کی ہمت دن بدن جواب دیتی جارہی تھی۔ شہر میں پینے کے پانی کی قلت ہونے لگی۔ شہر کی فصیلوں کے اندر سربراہی آب کا کوئی انتظام نہ تھا۔ زمانہ امن میں پینے کا پانی نلوں کے ذریعہ باہر سے لایا جاتا تھا اور جنگ کے زمانے میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں سمندر کے راستے تازہ پانی قلعے میں پہنچاتی لیکن فرنگیوں کے اس دو طرفہ محاصرے کی وجہ سے سربراہی آب تقریباً ختم تھی۔

ڈاکٹر ع۔ ض۔ ابراھیمی*

حقائق الطب، دقائق العلاج، جوامع العلاج اور کتاب قانون کے مؤلف عالم ربانی، حکیم صمدانی مولانا حاج محمد کریم خان کرمانیؒ

کتاب " دقائق العلاج " ان گراں قدر کتابوں میں سے ایک ہے جو سنت کے مطابق عمل طب کے بارے میں اسلامی اطباء کے وسیلے سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے مولف عالم ربانی حکیم صمدانی حاج محمد کریم خان کرمانی اعلی اللہ مقامہ ہیں کہ بیشتر حضرات جو ان کی اکثر تالیفات سے آشنا ہیں انھیں ایک فقیہہ، ایک فلسفی کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر سوائے چند ایک کے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ وہ حکیم الہٰی ایک حاذق طبیب ریاضی داں اور دانشمند بھی تھے۔ ان کی چار تالیفات یعنی " حقائق الطب " (علم طب نظری کے بارے میں) " دقائق العلاج " (عملی علم طب کے متعلق) " جوامع العلاج " عام معالجات کے بیان میں) اور ایک رسالہ جو کہ انھوں نے ابو علی سینا کی " کتاب قانون " کے ۔ ۔ رالباب کی شرح میں لکھا ہے اور ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں کہ جن کے اصلی نسخے اب بھی خود مولف اعلیٰ مقامہ کی اپنی تحریر میں موجود ہیں اس ادعا کی گواہ ہیں۔ قارئین کے ملاحظہ کے لئے کتاب " دقائق العلاج " کے تعارف میں کچھ لکھنے سے پہلے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے خود ان مرحوم کے حالات کا مختصر سا تذکرہ کیا جائے۔

مرحوم الحاج محمد کریم خاں کرمانی اعلیٰ اللہ مقامہ فرزند ابراہیم خان قاجار مرحوم بروز پنجشنبہ تاریخ ۸ محرم الحرام ۱۲۲۵ھ قمری بمقام کرماں متولد ہوئے۔ ان کی والدہ محترمہ میرزا رحیم متوفی کی دختر تھیں۔ مرحوم نے پانچ برس کے سن سے ابتدائی تعلیم کا حصول شروع کر دیا اور چیدہ برس کے سن تک وہ صرف و نحو منطق کے موضوعات پر چند کتابیں بھی لکھ چکے تھے۔ ساتھ ہی وہ فقہ اور اصول کے مقدمات بھی سیکھتے رہے اور انھوں نے ریاضیات، علوم عربیہ کے سیکھنے کے علاوہ صنعت و فنون میں تحصیل علم کیا۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں آپ کے والد نے تہران میں انتقال کیا اور مرحوم الحاج محمد کریم خان جو ہمیشہ اعلیٰ تر علم کی تحصیل کی جستجو میں رہتے تھے مرحوم شیخ احمد احسائی کے ایک شاگرد کی رہنمائی میں یزد کے روانہ ہو گئے یہاں مرحوم کاظم رشتی اعلیٰ اللہ مقامہ کی خدمت میں پہنچے اور ایک مدت کے بعد ایران واپس چلے آئے اور یہ مختلف تھوڑی سی مدت کے بعد ہی دوبارہ استاد کی خدمت میں

---

* ریسرچ اسکالر

پھر دو سال کی تعلیم و استفادہ کے بعد سید اعلی اللہ مقامہٗ کے حکم سے کرمان لوٹ گئے اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی، تصنیف و تالیف اور نشر فضائل محمدؐ و آل محمدؐ میں مشغول ہو گئے۔ پھر ۲۲ ر شعبان سنہ ۱۲۸۸ھ کو عتبات عالیات کی زیارت کے سفر کے دوران قریہ تہ رود میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ دو سو چھیالیس ۲۴۶ کتابیں متفرق علوم و فنون کے موضوعات پر تالیف فرما چکے تھے۔ ان کتابوں میں چھیالیس کتابیں حکمت الٰہی کے موضوع پر، اٹھائیس کتابیں اعتقادات حقہ، پانچ جلدیں سلوک الی اللہ کے طریق، نو کتابیں بعض آیات و سور ہائے قرآنی کی تفسیر، تین کتابیں فقہا کے اخبار سولہ کتابیں اصول فقہ، تینتالیس کتابیں احکام فقہ، پانچ کتابیں دعائیات، سترہ کتابیں طبیعیات موسیقی حیات ریاضیات نجوم، چودہ کتابیں علم کیمیا و اکسیر، نو کتابیں ادب سے متعلق مثلاً صرف و نحو عربی و فارسی سات کتابیں علم غریبہ، اکیاسی کتابیں مختلف سوالات کی جواب کے موضوعات پر تحریر کی گئی ہیں، اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے چار کتابیں علم طب کے بارے میں موجود ہیں۔ ان تمام مجموعوں کے علاوہ آپ کے مواعظ اور درس بھی شمار کئے جا سکتے ہیں جو ضبط تحریر میں آ چکے ہیں اور جو کہ مجموعی طور پر ۴۶۵۳۴ سطور پر مشتمل ہیں (ہر سطر میں پچاس حرف ہیں)

مگر کتاب دقائق العلاج جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ عملی طب کے بارے میں وہ کتاب ہے جو ۱۲۶۴ سے ۱۲۶۷ کے دوران لکھی گئی سوائے اس کے آخری باب مقالہ پنجم کے جو مولف اپنی آخر عمر تک لکھتے رہے۔ مگر بہر حال اس کتاب کی تالیف "حقائق الطب" کے تمام کرنے کے بعد ہی شروع کی گئی۔ جو ۱۲۶۴ھ میں تکمیل پائی تھی۔ طب کی باقی تمام قدیم کتابوں کے مقابلے میں کتاب دقائق العلاج کی خصوصیت یہ ہے کہ مرحوم مولف اعلی اللہ مقامہٗ کی دیگر تمام تالیفات کی طرح اس کتاب کی تالیف میں بھی آیات قرآنی اور اخبار محمدؐ و آل محمدؐ کی بنیاد پر کی گئی ہے اور کہیں بھی سابق مولفین بشمول یونانی مولفین کی اندھی تقلید کا اثر ان میں نظر نہیں آتا۔

یہ کتاب عملی علم طب کے تمام مسائل پر مشتمل ہے۔ یعنی بیماری کی تشخیص، علاج، مختلف دواؤں اور ان کی تیاری کا طریقہ ہے اس طرح مولف نے عملی طب کے مسائل اور دواؤں کی تیاری کی مساوی طور پر شرح بیان کی ہے۔ مقدمہ کتاب بعض علمی اور عملی طب کے بعض بنیادی اصولوں کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے اور اس کے بعد عام معالجے کے بارے میں مقالہ تحریر کیا گیا ہے۔ دوسرا مقالہ چند خاص معالجات کے بارے میں تیسرا مقالہ دواؤں کی تیاری سے متعلق چوتھا مقالہ مرکبات ساری کے بارے میں اور پانچواں مقالہ واردات کے بارے میں اس توضیح کے ساتھ ہے کہ مولف نے مختلف مسائل اور چند ایسے معالجات جو اہل سنت علیہم السلام سے روایت کئے گئے ہیں اور بعض دواؤں کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال

کا طریقہ و نیز علم طب کے مفردات کا ذکر کیا ہے۔

قابل ذکر یہ نکتہ ہے کہ مولف اعلیٰ مقامہٗ نے کئی مقامات پر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہر ایک علاج اور ہر ایک دوا کی یا تو خود ان مرحوم نے شخصی طور پر یا اپنے بہت قریبی فرد پر آزمائش کی ہے۔ خصوصی توجہ کے لائق یہ بات ہے کہ مرحوم تمام علمی و عملی مسائل بشمول طب اور کیمیا کے مسائل میں اس بات کے بہت زیادہ قائل تھے کہ ان چیزوں میں عملی تجربہ اہمیت رکھتا ہے۔ خواہ یہ کتاب ہو یا ان کی دیگر تمام کتابیں انھوں نے اس بات کی ہمیشہ تاکید فرمائی ہے خصوصاً کتاب "دقائق العلاج" میں اس بات کی مکرر سفارش کی ہے کہ طبیب کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ خود اپنے سامنے کئے گئے تجربوں یا اپنے کسی معتمد کے تجربوں پر جو نتیجہ حاصل ہوا ہو اس پر تکیہ کرے۔ فقط گزشتہ تجربات و آثار کے مطالعے پر قناعت نہ کرے۔ انھوں نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ معالجہ میں دقت مقام اور اشخاص کے اعتبار سے فرق پڑ جاتا ہے اور طبیب پر لازم ہے کہ وہ اس بات کا خصوصی طور پر لحاظ کرے۔ بہرحال اہم نکتہ یہ ہے کہ دیگر تمام سلسلہ شیخیہ کے مشائخ اعلی اللہ مقامہم کی طرح مولف اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے بھی اپنی تمام تالیفات میں تمام علمی موضوعات کے مسائل کے لئے دلائل کے ساتھ دیگر تمام دانشوروں سے توسل کیا ہے۔ خود کتاب دقائق العلاج میں بے شمار مسائل پر حکمت الٰہی اور دیگر صنعتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔

وہ بات جو کتاب دقائق العلاج کو اس موضوع پر لکھی گئی دوسری تمام کتابوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں جو عقلی استدلال کئے گئے ہیں وہ قرآن اور اخبار اہل بیت صلوات اللہ علیہم اجمعین پر انحصار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولف نے چند نئے مسائل بھی دریافت کئے ہیں جن میں اہم ترین وہ نکتہ ہے جو اس مفروضے کے بارے میں ہے کہ وہ خلئے جو بیماری کا سبب بنتے ہیں وہ صاحب روح اور زندہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض روح حیوانی بعض روح نباتی اور بعض روح جمادی کے حامل ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر تیرھویں باب کے مقالہ دوم میں ملیریا کے بارے میں تحقیقی گفتگو کے ضمن میں اور پانچویں مقالے کے چوتھے باب کی انیسویں فصل کے علاوہ کتاب رجوم الشیاطین میں بھی گفتگو کی گئی ہے جو کہ دقائق العلاج کے بعد تالیف کی گئی۔ اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ یہ کتاب سنہ ۱۸۵۰ء یا سنہ ۱۸۵۴ء میں لکھی گئی ہے اور سیاہ زخم (مینڈھوں کی ایک خطرناک بیماری جو انسانوں میں منتقل ہوسکتی ہے) کے بارے میں قازی میر داد (فرانسیسی) کے ذریعہ سنہ ۱۸۵۰ء میں ابتدائی معلومات حاصل ہوئی اور یہ کہ سنہ ۱۸۵۷ء میں پاسچر PASTURE نے تخمیر (رکھی ہوئی سیال چیزوں پر خمیر پیدا ہونا) کے موضوع پر تحقیق شروع کی اور سنہ ۱۸۶۵ء میں جنوبی فرانس میں ریشم کے کیڑوں

پیدا ہونے والی ایک عام بیماری پر تحقیق شروع کی گئی اور یہ تمام تحقیقات وہ ہیں جو جراثیم سے پیدا ہونے والے بنیادی مسائل سے متعلق کی گئی ہیں تو کتاب دقائق العلاج کے مولف کے خداداد کمال اور اعلیٰ ذہنی صلاحیت ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے مولف کے اس بیان کو بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ بغیر کسی سابقہ تجربہ سے مدد لیئے ہوئے انھوں نے الہامی طور پر بعض کیمیادی مواد دوا سازی اور علاج کے راستے دریافت کئے ہیں

اس کتاب کے ماخذ قرآن وسنت اور اخبار آل محمد کے علاوہ دیگر شیخی تجربات و نظریات ہیں جن کی شرح کتاب کے اصلی نسخہ کی پشت پر خود مرحوم نے اپنی تحریر میں فرمائی ہے۔

مزید توضیح کے طور پر اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ چونکہ اصلی نسخہ کتاب میں (کہ جس کی من وعن عکس کشی کی گئی ہے اور ایران کے تمام بڑے کتب خانوں کے علاوہ دنیا کے دیگر مراکز کو بھی روانہ کیا گیا ہے) متعدد حواشی تھے اور سطروں کے درمیان بھی بعض وضاحتیں اضافہ کی گئی تھیں پھر مولف اعلی اللہ مقامہ کے دستور کے مطابق اسے دوبارہ لکھا گیا اور پر بار خود مرحوم نے اس کی تصحیح کی اور پھر بعض حاشیہ لکھے تھے اس لئے اس کی بعض فصلوں کی ترتیب بگڑ گئی تھی۔ اس کا ایک اور صاف نسخہ وہ ہے جو سنہ ۱۳۱۵ھ قمری مطابق ۱۲۵۵ھ شمسی و ۱۸۹۶ء میں بمبئی میں چھپا اور تقسیم کیا گیا۔ اس بات کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ ایک بار فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا جو ناقص تھا مگر اس کا سلیس فارسی میں دوبارہ ترجمہ کیا گیا ہے اور مترجم نے کتاب کے آخر میں ان دواؤں کے ناموں کی ایک مکمل فہرست بھی دی ہے جن کا ذکر کتاب کے متن میں کیا گیا ہے۔ ان دواؤں کے نام عربی، فارسی، لاطینی کے علاوہ بعض جگہ ہندی و ترکی میں بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ طباعت کی ان تمام ضروریات کی تکمیل کے ساتھ یہ ترجمہ فراہم کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ قارئین اگر اس کتاب یا مولف اعلی اللہ مقامہ کی دوسری کتابوں یا دیگر تمام مشائخ شیخیہ کی کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو ذیل میں دیئے گئے پتہ پر مراسلت فرمائیں :

"چاپ خانہ سعادت کرمان، خیابان باستانی پاریزی کرمان۔ ایران"

محمد منظور احمد منظور

جناب ولّی قادری سے انٹرویو

پچھلے چند ہفتوں سے سوچ رہا تھا کہ جناب ولّی قادری سے ملوں اور ایک انٹرویو کی ت میں، ان کی زندگی، شخصیت اور سماجی و ملی خدمات کا ایک مختصر سا خاکہ روزنامہ "منصف" رئین کے لئے پیش کروں۔ حسن اتفاق سے ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی ئی سے اپنے آفس پر انٹرویو کے لئے دن اور وقت مقرر کر دیا۔

میں اس روز وقت مقررہ پر پہونچا اور جناب ولی قادری نے مسکراتے ہوئے میرے سلام کا جواب لشیر باغ میں واقع ان کے آفس میں انٹرویو کا دلچسپ سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی گوناگوں مصروفیات یح اندازہ مجھے اس انٹرویو کے دوران ہوا۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے، وہ مسلسل متعدد مرتبہ ن ٹیلیفون کالس کا بھی بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ اور دھیمے لہجے میں جواب دیتے رہے۔ ی بات چیت کے دوران، فون کرنے والوں کے علاوہ، آفس پر ملاقات کے لئے آنے والوں کا لہ بھی جاری رہا۔ ان ملنے والوں میں انجنیرنگ کی اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ایسے نوجوان بھی تھے جو قادری صاحب کے آفس میں اپنے فن کے کسی شعبہ سے متعلق کچھ عرصہ کے لئے ٹریننگ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ایسا محسوس ہوا کہ "انکار" یا "نہیں" کا لفظ جناب ولی قادری کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں۔ ہر ے لئے پریشان حال اپنے مستقبل سے متعلق متفکر نوجوان سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے اور اس کی حوصلہ ائی کرتے ہوئے مفید مشورے دیتے اور اسے اپنے آفس میں یا کہیں اور کسی نہ کسی کام سے لگا دیتے طرح جناب ولی قادری صاحب نہایت خاموش طریقے سے نئی نسل کے لئے شمع راہ کا کام دے رہے ہمارے سماج کی پر خلوص خدمت انجام دے رہے ہیں

انھوں نے انٹرویو کے دوران، مجھ سے کہا کہ وہ ۱۹۷۹ء میں بحیثیت اگزیکیوٹیو انجنیر سرکاری یت سے اپنی مرضی سے قبل از وقت وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ اس وقت ان کا آفس ارم منزل

(پہنچ گئے) حیدرآباد میں تھا۔

انٹرویو کی ابتدا میں انھوں نے کہا کہ وہ شہر حیدرآباد کے محلہ دبیر پورہ میں ۲۶ رمئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ والدین نے سید عبدالولی قادری نام رکھا لیکن آج کل علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں ولی قادری کے نام سے بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ انھوں نے کہا ضلع اورنگ آباد کے تین گاؤں ۱۔ گھوڑے گاؤں ۲۔ برم گاؤں ۳۔ بھٹ جی گاؤں، ان کی آبائی جاگیر میں شامل تھے ان جاگیرات کی دیکھ بھال کے لئے، ان کے والد جناب سید عبدالقیوم قادری، اورنگ آباد میں قیام پذیر تھے۔ ان کے پردادا کا تعلق نیک نور ضلع بیڑ سے تھا جہاں ان کی انعامی زمینات تھیں)۔ انھیں امرائی کا شوق تھا۔ ولی قادری کے والد جناب سید عبدالقیوم قادری کے نانا سید رفیع پاشا صاحب کی جاگیرات باسم، ضلع اکولہ میں تھیں۔ انھیں اولاد نرینہ نہیں تھی۔ والد صاحب کی قضات بھی باسم ضلع اکولہ میں تھی۔ جناب ولی قادری کے والد کے پھوپا جناب غلام محمود صاحب پن چکی ضلع اورنگ آباد میں حضرت بابا شاہ مسافر رح کی درگاہ کے آخری سجادے تھے۔ مولانا سید شیخن احمد شطاری مرحوم جناب ولی قادری کے حقیقی ماموں یعنی والدہ صاحبہ کے بھائی تھے۔

اپنی فوقانی تعلیم کے بارے میں، میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جناب ولی قادری نے کہا کہ ساتویں جماعت تک، ان کی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول اورنگ آباد میں ہوئی اور ساتویں سے میٹرک تک دھرم ونت ہائی اسکول (حیدرآباد) میں۔ ہائی اسکول میں ان کا مضمون اختیاری اعلیٰ ریاضی تھا۔ فزکس، کیمسٹری اور اعلیٰ ریاضی کے ساتھ، انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان اورنگ آباد کالج سے کامیاب کیا اور ۱۹۴۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کامیاب کیا۔ بی۔ ایس۔ سی میں ان کے مضامین فزکس، کیمسٹری اور اعلیٰ ریاضی تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے مسرت سے بھرپور لہجے میں آپ نے کہا کہ فزکس، کیمسٹری اور اعلیٰ ریاضی کا پورا اسٹاف نہایت قابل اساتذہ پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مضمون کا ماہر تھا، اساتذہ کو اپنے مضامین سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ احساس فرض، محنت اور دلچسپی کے ساتھ لکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ تدریس ایسا تھا جس سے طلباء کے دل میں حصول علم کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ شعبۂ فزکس میں جناب نصیر احمد عثمانی، جناب پروفیسر مہدی علی، جناب ڈاکٹر رام لعل اور جناب ستیہ نارائن راؤ جیسے قابل اساتذہ مامور تھے۔ کیمسٹری اسٹاف میں جناب پروفیسر جمیل الرحمٰن، جناب طاہر، جناب محمود اور جناب شاہ محمد شامل تھے۔ شعبہ ریاضی میں چودھری برکت علی، جناب خواجہ محی الدین، جناب عبد[illegible] اور صدر شعبہ ریاضی پروفیسر کشن چند صاحب ہمارے اساتذہ تھے۔ اس زمانے میں عثمانیہ

وائس چانسلر جناب قاضی محمد حسین تھے۔ قاضی صاحب کے بعد جناب ولی محمد اور نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر کے جلیل القدر عہدہ پر مامور ہوئے۔

ولی قادری صاحب نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بی۔ ایس۔ سی کی طالب علمی کے زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے طلباء اور ریلوے والوں کے درمیان اچانک جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ طلباء نے بطور احتجاج ہڑتال کردی۔ طلباء کے قائدین میں سید شاہ بلیغ الدین، احمد خاں، اونکار پرشاد اور عبدالرحمٰن رئیس "وقت" (روزنامہ "وقت" حیدرآباد کے ایڈیٹر) شامل تھے۔

آپ نے کہا کہ یونیورسٹی کی طالب علمی کے اس دور میں خصوصیت یہ تھی کہ عام طور پر طلباء ڈسپلن کے سختی سے پابند تھے۔ ان میں تحصیل علم کا والہانہ شوق تھا ــــ ہمارے دور کے طلباء یونیورسٹی کے ریڈنگ روم اور لائبریری سے پورا پورا استفادہ کرتے تھے اور وہ تمام اساتذہ کے لکچرس میں نہایت پابندی سے حاضر رہا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں 'طالب علم' اساتذہ کی دل سے تعظیم کیا کرتے تھے طلباء کے ساتھ اساتذہ کا برتاؤ بھی شفقت آمیز ہوا کرتا تھا۔ اساتذہ طلباء کے ہمدرد تھے۔ طلباء کے لئے نیلے رنگ کا یونیفارم لازمی تھا۔ یونیفارم کی سختی سے پابندی کروائی جاتی تھی۔ شیروانی یا کوٹ کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی کے ایمبلم والے بٹن بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

کبھی کبھی لکچر کے دوران، طلباء اور اساتذہ دونوں کی طرف سے زندگی، زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی کے مظاہرے بھی ہوا کرتے تھے لیکن شائستگی کے ساتھ، جس سے کلاس روم میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ طلباء عموماً ذہین اور حاضر دماغ تھے۔ اور جب ان کی زبان سے برمحل بے ساختہ چست فقرے نکل پڑتے تو کلاس قہقہہ زار ہوجاتی تھی۔ ہمارے پراکٹر جناب مہندر راج سکسینہ تھے۔ ان دنوں جناب پروفیسر بی۔ کے۔ داس، صدر شعبہ زوالوجی تھے۔

گیمس اور اسپورٹس سے اپنی دلچسپی کے بارے میں جناب ولی قادری نے کہا کہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ میں، اسکول اور کالج کی حد تک بعض گیمس مثلاً بیڈ منٹن وغیرہ میں حصہ لیا کرتا تھا یا پھر مخصوص دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ، ان کھیلوں میں حصہ لیتا تھا۔ ٹورنمنٹ میں حصہ لینے سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی

جناب ولی قادری نے کہا کہ گریجویشن کے بعد میں نے بی۔ اے (سیول) میں ۱۹۴۷ء میں داخلہ لیا۔ ...ای کا نصاب تین سالہ تھا۔ اس وقت بھی بی۔ ای میں شرکت کے لئے "انٹرنس ٹسٹ" میں ...کت لازمی تھی۔ اس ٹسٹ میں کامیابی کے بعد ہی داخلہ کا مرحلہ طے ہوا کرتا تھا۔ ولی قادری صاحب ...تایا کہ انھوں نے سررشتہ تعلیمات میں بھی بحیثیت مدرس مختصر سے عرصے کے لئے کام کیا تھا۔ ۲۱ ... ملازمت کے بارے میں کہا کہ ۱۹۴۷ء میں بی۔ ای (سیول) میں داخلہ سے ایک سال:

یعنی ۱۹۴۶ء میں محکمۂ تعلیمات میں ٹیچر کی حیثیت سے انھوں نے ملازمت اختیار کی۔ گورنمنٹ پراکٹسنگ (مشقی) ہائی اسکول خیریت آباد (حیدرآباد) میں (120 - 90) کے گریڈ پر تعیناتی عمل میں آئی۔ اسکول کے صدر مدرس جناب زاہد حسین تھے۔ ولی قادری صاحب کو آٹھویں اور نویں جماعت میں ادنیٰ ریاضی اور اعلیٰ ریاضی کی تدریس کا کام سپرد کیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں بی۔ ای (سیول) میں داخلہ کے بعد ہائی اسکول کی اس ملازمت کو چھوڑ دیا۔

ولی قادری صاحب نے کہا کہ انجینئرنگ کالج میں ہمارے پرنسپل جناب مسیح اللہ شاہ صاحب تھے ہمارا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ نصاب کی تمام کتابیں اردو میں موجود تھیں۔ جناب پی۔ کے۔ گھوش انجینئرنگ کالج کے پروفیسر تھے اور خالص اور شستہ اردو میں بڑی روانی کے ساتھ لکچر دیا کرتے تھے۔ گھوش صاحب کچھ عرصے کے بعد نظام کالج کے پرنسپل بھی ہوئے۔ IRRIGATION کے پروفیسر جناب ضیاء الدین انصاری تھے جب میں بی۔ ای کے تیسرے یعنی آخری سال میں آیا تو جناب ضیاء الدین انصاری، انجینئرنگ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انجینئرنگ کالج کے دیگر اساتذہ میں جناب حفیظ اللہ قابل ذکر ہیں۔

جناب ولی قادری نے کہا کہ وہ بی۔ ای۔ سال دوم میں زیر تعلیم تھے کہ حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا۔ انھوں نے کہا کہ بی۔ ای (سیول) کے امتحان میں کامیابی کے بعد ان کا پہلا تقرر سوپروائزر کی حیثیت سے مسٹر سیتارام ملکو نے چیف انجینئر کے آفس واقع کنگ کوٹھی روڈ پر عمل میں آیا۔ یہاں انھوں نے ۱½ سال تک کام کیا۔ اس کے بعد تنگبھدرا پراجکٹ کے سروے ڈویژن میں تقریباً ½ ۲ سال کام کرتے رہے۔ اس وقت ڈویژن ہیڈکوارٹر ضلع رائچور میں تھا اور سب ڈویژن سروارکیمپ میں رائچور سے ۲۲ میل دور تھا۔ سوپروائزر کی حیثیت سے چیف انجینئر آفس کے ڈیزائن سکشن میں ان کی دوبارہ تعیناتی عمل میں آئی۔ اس زمانے میں چیف انجینئر مسٹر ڈی۔ وی۔ راؤ تھے۔ یہاں ولی قادری صاحب سوپروائزر کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک کام کرتے رہے۔

تنظیم جدید (لسانی تقسیم) کے بعد ۱۹۵۷ء میں وہ اسسٹنٹ انجینئر کے عہدہ پر مامور کئے گئے (ضلع نلگنڈہ) میں ناگرجنا ساگر سروے ڈویژن پر ان کی تعیناتی عمل میں آئی۔ آپ کا سب ڈویژن کوداڑ (ضلع نلگنڈہ) میں تھا۔ بحیثیت اسسٹنٹ انجینئر انھوں نے ... تک کام کیا۔

انھوں نے اضلاع کی ملازمت کے دوران، شام کے وقت، انھیں فرصت لئے فرصت کے دوران وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل لیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں انجینئرنگ ... ناگرجنا ساگر میں انھوں نے ا

مماثل پوسٹ، اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر اور کچھ عرصے کے بعد ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا ریسرچ آفیسر کا پوسٹ ایگزیکیوٹیو انجنیئر کے عہدہ کے مماثل تھا۔

۱۹۷۷ء میں جناب ولی قادری، ڈپٹی ڈائرکٹر GUAGING کے عہدہ پر مامور کئے گئے۔ یہ آفس ارم منزل (پنجہ گٹہ) میں تھا۔ پورا آندھراپردیش آپ کے JURISDICTION میں تھا۔ چونکہ یہ عہدہ ایگزیکیوٹیو تھا اس لئے آپ کو آندھراپردیش کے اضلاع کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر آپ ڈپٹی ڈائرکٹر (ڈیزائن) کے عہدہ پر مامور کئے گئے۔ یہ آفس دوارکا ہوٹل (خیریت آباد) کے متصل تھا۔

۱۹۷۹ء میں آپ نے سرکاری ملازمت سے قبل از وظیفہ Volutary Retirement لے لیا۔ اس وقت آپ انجنیئرنگ ریسرچ لیباریٹری (حمایت ساگر) میں ریسرچ آفیسر تھے۔ سرکاری ملازمت سے اپنی مرضی سے قبل از وقت سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۷۹ء ہی میں آپ نے "سیول انجنیئرنگ کنسلٹنسی۔ ولی قادری اینڈ اسوسی ایٹس" کے نام سے اپنا دفتر علی گڑھ کلب بلڈنگ بشیر باغ، پل فورٹ روڈ پر قائم کیا۔ اسٹرکچرل ڈیزائننگ سے آپ کو گہری دلچسپی ہے۔ اب آپ نے رہائشی مکانات کے کامپلکس، سینما، تھیٹر، کمرشیل کامپلکس کی اسٹرکچرل ڈیزائننگ کے ذریعہ اپنے کمال فن کا ثبوت دیا۔ آپ نے یہ نئی مصروفیت، نئے خوابوں اور نئے منصوبوں کے ساتھ شروع کی تھی اور گہری لگن سے مختصر سے عرصے ہی میں اسٹرکچرل ڈیزائننگ میں آپ کی مہارت کے چرچے ہونے لگے اور اس شہرت نے آپ کی مقبولیت میں اس قدر اضافہ کردیا ہے کہ آج کل آپ کا شمار حیدرآباد کی بے حد مصروف شخصیتوں میں ہونے لگا ہے۔

آپ کے آفس کا اسٹاف، سینیئر انجنیئرس، جونیئر انجنیئرس، ڈرافٹسمن، ٹریسر، سرویئر، بلوپرنٹ آپریٹرس، کمپیوٹر پروگرامر، کلرک اور مینجر یا ریسپشنسٹ پر مشتمل ہے۔ آفس ½ ۹ بجے صبح سے ½ ۵ بجے شام تک کام کرتا ہے میں نے ولی قادری صاحب سے پوچھا کہ اس خشک اور ٹکنیکل کام میں آپ نے کس طرح حیرت انگیز مہارت حاصل کی؟ آپ نے کہا کہ مجھے بفضل خدا ہمیشہ ماحول اچھا اور حوصلہ افزا ملا۔ اس کے علاوہ یہ میرے ذوق اور دلچسپی کی چیز تھی۔ سررشتہ تعمیرات کے اعلیٰ عہدہ دار بالخصوص جناب اقبال علی صاحب کے ساتھ کام کرنے میں مجھے دلی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک قابل انجنیئر تھے۔ چونکہ مجھے ریسرچ ڈیزائننگ سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی اس لئے کام کرتے ہوئے میں نے بار محسوس نہیں کیا۔

جناب ولی قادری، جدید ملک پیٹ میں مدرسہ اعزہ سے متصل قیام پذیر ہیں۔ اپنے پیشہ [illegible] مصروفیات کے باوجود جناب ولی قادری بعض سماجی تنظیموں اور اداروں سے وابستہ ہیں۔ [illegible] پروگراموں اور پراجکٹس کو آگے بڑھانے میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی سماجی اور تہذیبی

کی وجہ سے بھی ولی قادری قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ بشیر باغ میں واقع نئے آفس میں آپ کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ انھیں اپنے محبوب اور پسندیدہ مشغلہ "مطالعہ" کے لئے بہت مشکل سے وقت ملتا ہے۔ اس کے باوجود مطالعہ کا مشغلہ جاری ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ انگریزی کے کن ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف اور تخلیقات کا آپ نے مطالعہ کیا ہے؟ ولی قادری صاحب نے مجھے بتایا کہ انھیں طالب علمی کے زمانے سے ہی انگریزی ناول اور شاعری کے مطالعہ سے دلچسپی رہی۔ الگزینڈر ڈوماس، ڈکنس، سروالٹر اسکاٹ، ولیم ورڈس ورتھ اور شکسپیر ان کے پسندیدہ ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ شکسپیر کے پورے ڈرامے پڑھ چکے ہیں۔

اپنے فن سے متعلق یعنی ٹکنیکل عنوانات اور موضوعات پر مضامین لکھنے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ان کے اس قسم کے کئی مضامین مختلف انگریزی جرنلس میں شائع ہو چکے ہیں۔ آبپاشی کے مرکزی بورڈ کے (۳۳) ویں سیشن منعقدہ بمبئی میں حیدرآباد کے انسٹی ٹیوٹ آف انجینیرس میں، آئی۔ جی ٹی۔ ایس کے اجلاس میں آپ نے ٹکنیکل موضوعات پر اپنے مقالے پیش کئے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج کے "مختصر مدتی کورس" میں بھی ٹکنیکل عنوانات پر آپ نے لکچر دئے تھے۔ حیدرآباد کے علاوہ بمبئی، بنگلور، ترونڈرم، کیپ کیمورن، مدراس، کلکتہ، ناگپور، سری نگر، چنڈی گڑھ اور دہلی میں سنٹرل بورڈ آف اریگیشن کے اجلاسوں میں آپ نے مقالے پڑھے ہیں۔

مختلف اداروں، انجمنوں اور سماجی تنظیموں سے اپنی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں انڈین جیو ٹکنیکل سوسائٹی دہلی اور نان فارمل ٹکنیکل ایجوکیشن کے بورڈ کے علاوہ (C.E.T.I.O) کا رکن ہوں جہاں انجینیرنگ کالج میں داخلہ کے امتحانات کے لئے کوچنگ کا باقاعدہ انتظام ہے۔ جناب ولی قادری، بالماس (دبیرپورہ حیدرآباد) کے چیرمین اور علاء الدین قرارت اینڈ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی پرنسپل ہیں۔ وہ سلطان العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی حیدرآباد کے گورننگ بورڈ کے فاونڈر ممبر اور خواجہ بندہ نواز کالج آف انجینیرنگ، گلبرگہ (میسور) کے گورننگ بورڈ اور انجمن یارجہ بانی حرمین شریفین کے رکن ہیں جس نے حیدرآباد میں، مدینہ ٹکنیکل کالج قائم کیا ہے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ میں نے انگریزی کے بعض مشہور شعرا کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور کی بعض نظموں کے بھی اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ جناب حسن الدین احمد کی مرتب کردہ کتاب "ساز مغرب" کے حصہ دہم میں ایسے چھ ترجمے شامل ہیں۔ "ساز مغرب" کے گیارھویں حصے میں اشاعت کے لئے میں نے بعض انگریزی شاعروں کی (۱۶) نظموں کے ترجمے دئے ہیں۔ ..

باقی بر صفحہ ۳۴

When lovely woman stoops to folly
　　And finds too late that men betray,
What charm can soothe her melancholy,
　　What art can wash her guilt away?

The only art her guilt to cover
　　To hide her shame from every eye,
To give repentence to her lover
　　And wring his bosom, is — to die.

— Oliver Goldsmith

ہو حسیں عورت کسی کے عشق میں گر مبتلا
اور بعد از وقت پہچانے، ہے عاشق بے وفا
ہے کوئی چارہ مداوا کر سکے اس پاپ کا
ہے کوئی فن دھو سکے جو اس کا جرمِ ابتلا

جھوٹ مل جائے اسے ٹک از ندامت از گناہ
چھپ سکے دنیا کی نظروں سے ہے ایسی کوئی راہ
اور ندامت کا سبق سیکھے وہ مردِ روسیاہ
راہ اس کے واسطے کوئی نہیں جز مرگ — آہ

ترجمہ از
ولی قادری

ماہنامہ شاداب حیدرآباد فروری ۱۹۸۸ء

مومن خان شوق

یادِ ماہر

حضرت عبدالکریم ماہر (بانی و سرپرست مرکزِ ادب حیدرآباد) کی یاد میں

رخصت ہوئے جہاں سے عبدالکریم ماہر
لائیں گے ہم کہاں سے عبدالکریم ماہر

وہ خیر تھے مجسم، باغِ جناں میں پہنچے
ایسوں کے درمیاں سے عبدالکریم ماہر

وہ کامیاب گزرے اور شاد کام ٹھہرے
ہر ایک امتحاں سے عبدالکریم ماہر

زندہ رہیں گے بیشک، جب تک سخن ہے باقی
معجز رقم بیاں سے عبدالکریم ماہر

شعر و ادب کا مرکز، یادوں کا پھولبن ہے
گو، جا چکے یہاں سے عبدالکریم ماہر

اے شوق! ہیں سخنور کتنے ہی انجمن میں
پائیں گے ہم کہاں سے عبدالکریم ماہر

○

سپرنٹنڈنٹ، زرعی یونی ورسٹی
اشرف ولا، ۲۲۳-۳-۱۱، ملے پلی، حیدرآباد

عـــزیز بھارتی

آہ! حضرت عبدالکریم ماہر حیدرآبادی مرحوم

آج کے اس نمائشی دور میں جہاں خود نمائی اور خود ستائی کی بیماری عام ہے وہاں چند ایسی شخصیتیں بھی ہیں جو باوجود اپنے بلند و بالا کردار کے گوشۂ گمنامی میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ وہ اونچی اونچی عمارتوں کو شہرت دینے کے لئے خود کو زمین کے اندر بنیاد کے روپ میں گھو دیتی ہیں۔ لوگ عمارتوں کی ظاہری خوبصورتی اور زیبائش کی تعریف کرنے کے عادی رہے ہیں وہ بھول کر بھی اس بنیاد کی طرف نہیں دیکھتے جس پر عمارتوں کی خوبصورتی ٹکی ہوئی ہے۔ ایسی ہی ایک بنیاد حضرت عبدالکریم ماہر حیدرآبادی بھی تھے۔ انھیں " تھے " کہتے ہوئے، " مرحوم " کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کیوں کہ فن کار اور شاعر بروح پر ڈھکی مٹی تو چھوڑ سکتا ہے لیکن روح آزاد رہتی ہے۔ شاعر اپنے کلام میں اور فنکار اپنے فن میں زندہ جاوید رہتا ہے۔ لہٰذا میں انھیں آج بھی لافانی سمجھتا ہوں۔ جب تک وہ اپنے جسم کے ساتھ تھے میں نے لاکھ چاہا کہ ان پر کچھ لکھوں، چھپواؤں تاکہ دنیا دیکھے اور پڑھے اور سنے لیکن انھوں نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی، اجازت نہیں دی لیکن آج میں اپنی سعی کرنے کے لئے آزاد ہوں۔ لہٰذا آج ان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔

عبدالکریم ماہر صاحب یوں تو ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے لیکن رباعی کہنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک سے ایک نازک اور عمیق مضمون کو انھوں نے رباعی میں پیش کیا اور رباعی کو پسند کرنے والوں سے داد تحسین حاصل کی۔ میں یہاں ان کے فن شاعری پر کچھ کہنا نہیں چاہتا، اگر میں چاہوں بھی تو کچھ نہیں سکوں گا کیونکہ ماہر حیدرآبادی صاحب فن کے

سمندر و تھے اور میں ایک بوند بھی ہیں ۔

عبدالکریم ماہر حیدرآبادی ۴ رمئی ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے ۔ والدین کا سایہ ان کے بچپن ہی میں اٹھ گیا ۔ شفیق تایا صاحب کی زیر سرپرستی آپ پرورش پاتے رہے ۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نظامت طبابت وصحت عامہ میں اہلکاری کی جائیداد پر مامور ہوئے ۔ معتمدی تنظیم مابعد جنگ میں محاسب اور پھر پولیس ایکشن کے بعد معتمدی تعمیرات عامہ میں منتظم کے عہدہ پر ترقی پائی ۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو ریاستوں کی تنظیم جدید کے سلسلے میں دیگر سینکڑوں ملازمین کے ساتھ ان کی خدمات بھی ریاست میسور (کرناٹک) کے تفویض کردی گئیں ۔ وہاں کچھ عرصہ بعد مددگار معتمد صنعت وحرفت کے عہدہ پر فائز ہوئے ۔ ۳۴ سال سے زائد مدت تک اہم ذمہ دارانہ خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۶ء میں وظیفہ پیرانہ سالی پر اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے ۔ شہر بنگلور میں ملازمت کے دوران آپ نے مقامی اور حیدرآبادی شعراء اور دانشوروں سے ربط ضبط برقرار رکھا ۔ وہیں اپنے ساتھیوں علیم تبسم ، صابر کوسگوی ، رزاق ساجد اور غلام خواجہ ذکی مرحوم کے تعاون سے " ایوان ادب " قائم کیا اور کئی برسوں تک اس ادبی انجمن کے صدر رہے ۔ جیسا کہ ماہر حیدرآبادی صاحب نے اپنے مجموعہ کلام " رنگ ونور " میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۵ سال کی عمر میں اپنا پہلا شعر کہا ۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول اور سٹی کالج میں طالب علمی کے زمانے میں آپ محمد ثناء اللہ شریف ایم ۔ اے (عثمانیہ) مرحوم کی مشفقانہ رہبری اور ان کے اعلیٰ کردار سے فیض یاب ہوتے رہے ۔

۱۹۶۷ء میں جب حیدرآباد لوٹ آئے تو حضرت قدر عریضی کی سرپرستی میں قائم شدہ ادارۂ قدر ادب سے وابستہ ہوگئے ۔ اس ادارے نے رباعی کو چلانے میں جو اہم رول ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے ۔ ماہر حیدرآبادی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف کے سلسلہ میں ۱۹۷۹ء میں ادارۂ قدر ادب کے سالانہ جشن کے موقع پر " خیام دکن " کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے ۔ موصوف ادارۂ مرکز ادب حیدرآباد کے بانی اور سرپرست بھی تھے ۔ اس ادارہ کی بقا کے لئے آخری سانس تک جدوجہد بھی کرتے رہے ۔ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج مرکز ادب ، حیدرآباد کے چند نامور اور پرخلوص ادبی اداروں میں گنا جاتا ہے ۔ ماہر صاحب نے اس ادارے کے معاونین کو ایک خاص نصیحت کی تھی کہ چاہے بدترین مخالف ہی کیوں نہ سامنے آجائے ہمیں اس کے ساتھ بھی خلوص اور رواداری کا برتاؤ کرنا چاہئے کیونکہ

خلوص ایک بے پناہ ڈھال کی طرح کام کرتا ہے۔ موصوف کا یہی وصف تھا وہ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ انتہائی خلوص کا مظاہرہ فرماتے تھے۔

ماہر حیدرآبادی صاحب نے نظم، غزل، قصیدہ، ہزل، قطعات اور رباعیات ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی۔ آپ کی رباعیات تو گویا امجد حیدرآبادی کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں۔ خمریات کے عنوان پر یہ رباعی دیکھئے۔

دنیا یہ سمجھتی ہے بہک جاتا ہے
کچھ بات تو ہے رند جو اتراتا ہے
اک دانۂ گندم نے زمیں پر پھینکا
اک قطرۂ مئے عرش پہ لے جاتا ہے

جسم کی جنت:

ہر عیش کے ساماں پہ جھگڑنے والو
آسائش دوروزہ پہ اڑنے والو
کیوں روح کو دیتے ہو جہنم کی سزا
اے جسم کی جنت پہ اکڑنے والو

موصوف نے ہر موضوع پہ رباعی تخلیق کی۔ یہاں ان سب کو پیش کرنا دشوار امر ہے۔ آپ نے قطعات بھی خوب کہے ہیں۔ ایک قطعہ دیکھئے جس کی ہر دور میں اور خصوصاً ہمارے آج کے دور میں بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

طیش میں بھی عیش کا ساماں ہونا چاہیئے
زیست کا ہر مرحلہ آساں ہونا چاہیئے
دوستوں کے عیب سارے دفن کرنے کے لئے
دل کے اک گوشہ میں قبرستان ہونا چاہیئے

ایک اور قطعہ ملاحظہ کیجئے:

دوست ہو کر بھی جو بھلا نہ کرے
جانے وہ دشمنی میں کیا نہ کرے
رائے کا اختلاف برق سہی
دوستی پر گرے خدا نہ کرے

غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

مجھے تو اس کی منزل ہی جدا معلوم ہوتی ہے
نگاہ دوست مطلب آشنا معلوم ہوتی ہے

بہار زندگی سمجھا تھا میں نے جس تبسم کو
شکن ماتھے کی اس کا سلسلہ معلوم ہوتی ہے

زباں چلتی رہی جب تک سخن میرا ادھورا تھا
مری چپ میں سخن کی انتہا معلوم ہوتی ہے

غرض کہ اردو ادب کے ایک پرنور ماہتاب کو ہم نے کھو دیا ہے، لیکن ان کے ارشادات ہمارے لئے مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔

OO

غزل

مولانا شمس الدین محمد حافظ شیرازی

ترجمہ اردو: مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

صوفی بیاکہ آئینہ صاف ست جام را
اے صوفی! آ، جام کا شیشہ صاف ہے
تا بنگری صفائے مئے لعل فام را
تاکہ تو لعل جیسی شراب کی صفائی دیکھے

راز درون پردہ ز رندان مست پرس
پردے کے اندر کے راز مست رندوں سے معلوم کر
کیں حال صوفیٔ عالی مقام را
اس لئے کہ صوفیٔ عالی مقام کا یہ مقام نہیں ہے

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں
عنقا کسی کا شکار نہیں بنتا اب جال اٹھالے
کانجا ہمیشہ باد بدست ست دام را
اس لئے کہ یہاں جال کے ہاتھ میں ہمیشہ ہوا آتی ہے

من آں زمان طمع ببریدم ز عافیت
میں نے اسی وقت عافیت کا لالچ ختم کر دیا
کایں دل نہاد در کف عشقت زمام را
جبکہ اس دل نے تیرے عشق کے ہاتھ میں ہماری باگ (ڈوری)

ما را بہ آستان تو بس حق خدمت ست
تیری چوکھٹ پر، ہمارا بہت حق خدمت ہے
اے خواجہ باز بیں بترحم غلام را
اے خواجہ! پھر غلام پر رحم کی نگاہ ڈال دے

در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند
موجودہ عیش حاصل کر اس لئے کہ جب دانہ پانی نہ رہا
آدم بہشت روضۂ دار السلام را
آدم نے جنت کا باغیچہ چھوڑ دیا

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو
دور (شراب) کی محفل میں ایک دو پیالہ چڑھالے اور چلدے
یعنی طمع مدار وصال دوام را
یعنی دائمی وصال کی تمنا نہ کر

اے دل شباب رفت و نچیدی گلے ز عمر
اے دل جوانی رخصت ہوئی اور تو نے عمر کا ایک پھول بھی نہ چنا
پیرانہ سر مکن ہنرے ننگ و نام
بڑھاپے میں ننگ و نام کی ہوس نہ

حافظ مرید جام جم ست اے صبا برو
حافظ تو جام جم کا مرید ہے اے صبا جا
وز بندہ بندگی برساں شیخ جام را
اور خادم کی جانب سے جام کے شیخ کو بندگی پہنچادے

"صوفی بیا کہ آئینہ صافیست جام را"

منظوم ترجمہ اردو غزل حافظ شیرازی

مولانا محمد احتشام الدین حقی دہلوی

صوفی چمک کے نکلا ہے آئینہ جام کا
قائل ہو تو صفائے مئے لعل فام کا
راز نہفتہ پوچھ تو رندان مست سے
رتبہ نہیں یہ صوفیٔ عالی مقام کا
عنقا شکار ہوگا نہ بس دام کھینچ لے
حاصل بجز ہوا نہیں کچھ اہل دام کا
امید عافیت نہ رہی عشق یار کو
دل نے دیا ہے مرتبہ مختار عام کا
مت چھوڑ عیش نقد، کیا ترک اعتماد
آدم نے قحط دانہ سے دار السلام کا
دو ایک جام بزم میں پی کر روانہ ہو
پیشہ کسی کے نام نہیں یاں دوام کا
اے دل شباب آ کے گیا بے گل مراد
پیری میں بھی ہے خبط وہی ننگ و نام کا
اس کے بھی تجربے ہیں حق خدمت ہزار ہا
دیکھو آنکھ سیر کے حال تو صاحب غلام کا
حافظ مرید جام ہوا ہے شیخ جام کو
پہونچا سلام جا کے صبا اس غلام کا

غزل

مرزا غفار بیگ اثرؔ گلشن آباد

غیض میں ہر وقت رہتی ہے غضب ڈھاتی ہے آگ
جلتے جلتے کڑھتے کڑھتے راکھ بن جاتی ہے آگ
سردیوں میں تنگ آ کر راکھ کو اوڑھے ہوئے
تھرتھراتی، کانپتی، چپ چاپ سو جاتی ہے آگ
اس ملن کو دوستی یا دشمنی کا نام دوں
جب ہوا ملنے کو آتی ہے بھڑک جاتی ہے آگ
شہر میں اونچے مکانوں کی قطاریں کم نہیں
مفلسوں کے جھونپڑوں سے کیوں لپٹ جاتی ہے آگ
دو ضدوں کا اجتماع دونوں کے حق میں ایک ہے
بھاپ بن جاتا ہے پانی، راکھ بن جاتی ہے آگ
اختلاف باہمی خود موت کا پیغام ہے
بانس ٹکراتے ہیں آپس میں تو لگ جاتی ہے آگ

غزل

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خان ندیمؔ

جو حقیقت ہو وہی سوچ سمجھ کر لکھنا
اپنے سائے کو نہ تم قد کے برابر لکھنا
جو ہو جیسا، اسے ویسا ہی لکھا کرتا ہوں
مجھ کو آتا ہی نہیں موم کو پتھر لکھنا
میرے اشعار پہ تنقید اگر لکھنی ہو
ایک اک لفظ کی گہرائی میں جا کر لکھنا
سنگ ریزہ ہو یا مٹی ہو یا ادنیٰ کنکر
جو بھی وہ پیار سے بخشے اسے گوہر لکھنا
لوگ اس شخص کو بھی اہلِ قلم کہتے ہیں
جس نے سیکھا یا نہیں "تا" سے سمندر لکھنا
شاعری ہی کی بدولت ہوا آسان ندیمؔ
ورنہ ممکن نہ تھا حالِ دلِ مضطر لکھنا

غزل

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشا

ہماری خامشی نے ساری بات پھیلا دی
ہمیں سے ہو نہ سکی احتیاط پھیلا دی

ہم اہلِ دل نے بصد شان اپنی بوئے وفا
بصد خلوص بصد التفات پھیلا دی

عذابِ جاں کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا
سمٹ سمٹ کے کٹا دن، تو رات پھیلا دی

ہزار جلوے بہر سو بکھیر کر کس نے
خود اپنی روشنیٔ حسن ذات پھیلا دی

فلک پہ چاند ستاروں کے جال کی صورت
نظر کے واسطے رنگیں بساط پھیلا دی

جہاں جہاں بھی گئے ہم حیات ساماں لوگ
وہاں وہاں تب و تابِ حیات پھیلا دی

بس ایک دردِ محبت اٹھالیا ہم نے
کسی نے سامنے جب کائنات پھیلا دی

خدا کا شکر ہے منشا کو شعر گوئی نے
تمہاری شہرتِ خوشبو صفات پھیلا دی

۱۱ اسٹار کی ٹاؤن ، ناگپور

غزل

محمد حمید الحق بیتاب صدیقی

جام شراب زہر سمجھ کر پیا نہیں
ہم نے کبھی بہار کا ماتم کیا نہیں

اس سالک کو حیات کی کوئی منزل ملی نہیں
دامن کا تیرے جس نے سہارا لیا نہیں

خود بڑھ کے جام چھین لیا میں نے ہاتھ سے
ساقی نے جام ہاتھ بڑھا کر دیا نہیں

اچھا ہوا کہ اپنا جنوں کام آگیا
ورنہ خرد نے کب مجھے دھوکہ دیا نہیں

موسم کی قید کفر ہے پینے کے واسطے
ہم نے تو انتظار بہاراں کیا نہیں

اس دور بے اماں میں بھی بیتاب کی غزل
جلتا ہوا چراغ ہے، بجھتا دیا نہیں۔

۳۹۲ - بی، یو آغا پورہ، حیدرآباد ۱

غزل

ایس۔ ایم۔ تفسیر

لازم ہے جان لینا کچھ راز زندگی کا
پھر درد بانٹ لینا ہر ایک آدمی کا

کس درجہ گر گیا ہے معیار زندگی کا
ہے آدمی ہی دشمن افسوس آدمی کا

افسوس ہے کہ وہ خود ظلمت پرست نکلے
سمجھا تھا میں نے جن کو مینار روشنی کا

خود اجنبی سہی میں تیرے شہر میں لیکن
میں نے سمجھ لیا ہے انداز ہر کسی کا

پیشانی آستاں سے اٹھتی نہیں ہے یارو
ملتا ہے جب بھی دل کو کچھ لطف بندگی کا

خون جگر قلم پر کرتا ہے رقص اکثر!
آساں نہیں ہے سودا تفسیر شاعری کا

غزل

کلیم ضیاء

اب نہ گرجا ہوں نہ مسجد اور نہ اب مندر ہوں میں
آج دنیا کی نظر میں صرف اک پتھر ہوں میں

مظہر تخلیق تھا جن کے لئے میرا وجود!
آج ان کی بزم میں تفریقِ بام و در ہوں میں

ساقیا اپنی نظر سے چند قطرے بخش دے
عصر محرومی ہوں، اک ٹوٹا ہوا ساغر ہوں میں

خونِ دل سے میں نے سینچا ہے گلستاں کو مگر
اہلِ گلشن کی نظر میں خار ہی اکثر ہوں میں

میری فطرت سے جنھیں یہ عزت و عظمت ملی
خوب ان کے سامنے اک دل نشیں منظر ہوں میں

جن کے زخموں کا مداوا کل کیا کرتا تھا میں
آج ان کی آنکھ میں چبھتا ہوا نشتر ہوں میں

صوبہ ہستی کو دیتا ہوں میں تحریک ضیاء
طرۂ صدر شکِ عصرِ نو کا پیغمبر ہوں میں

غزل

عرفان پربھنوی

ریاضِ فکر و سخن جب ہرا بھرا ہوگا
تو نکہتِ گل رنگیں کا معجزہ ہوگا

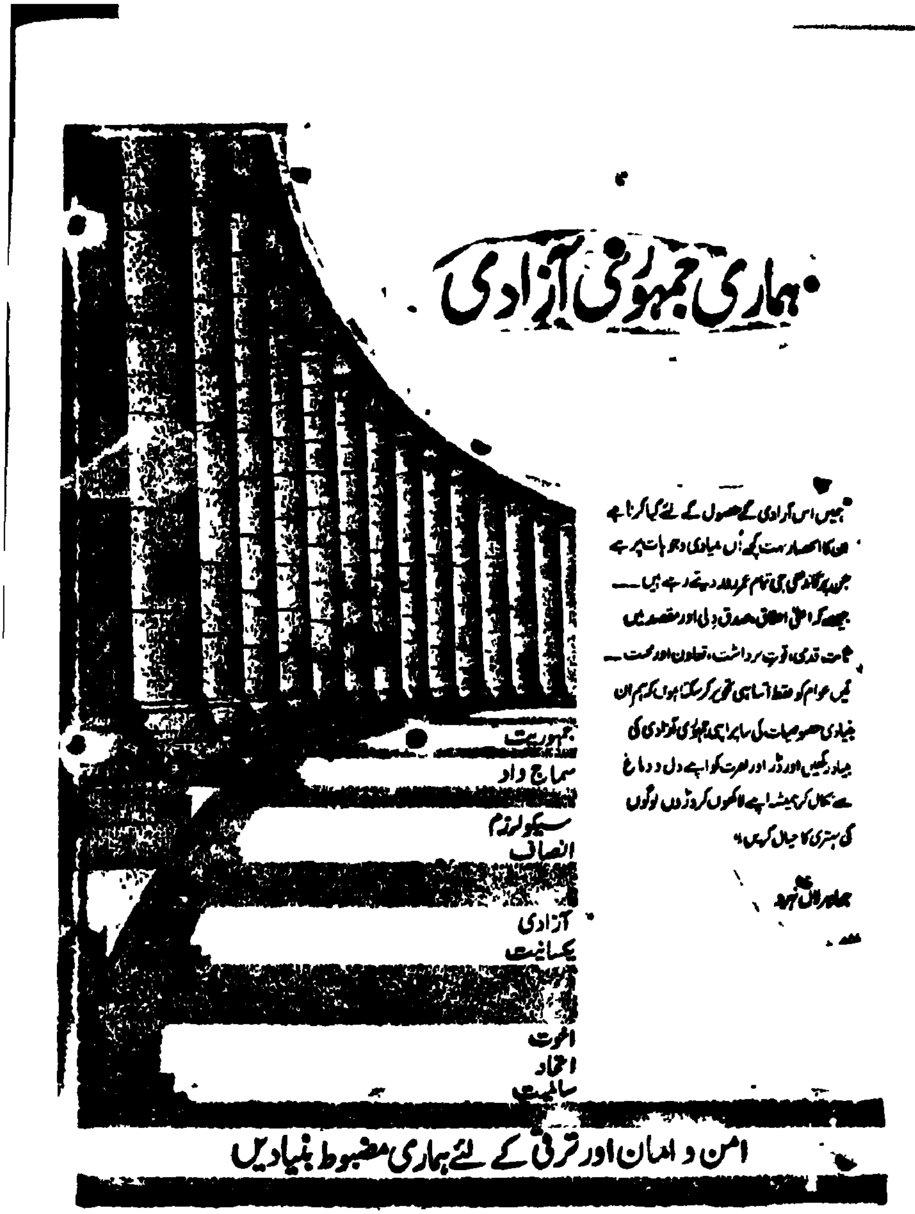
نہ نغمہ ہوگا، غزل ہوگی اور نہ گیت کوئی
مرا کلام حسیں تجھ سا دلربا ہوگا

اسی امید پہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں
کہ شب کے بعد اجالوں کا سلسلہ ہوگا

وہ ہر تقاضے کو پورا کرے گا موسم کے
جو موسموں کے تقاضوں سے آشنا ہوگا

رہائی قید بدن سے ملے گی جب مجھ کو
مری حیات کا وہ ایک سانحہ ہوگا

وہ کیا زمانے سے آنکھیں ملائیں گے عرفاں
دلوں میں جن کے زمانے کا ڈر بھرا ہوگا


ہماری جمہوری آزادی
"ہمیں اس آزادی کے حصول کے لئے کیا کرنا ہے
اس کا انحصار بہت کچھ ان بنیادی وجوہات پر ہے
جن پر گاندھی جی تمام عمر زور دیتے رہے ہیں ——
جیسے کہ اعلیٰ اخلاق، صدق دلی اور مقصد میں
ثابت قدمی، قوت برداشت، تعاون اور محنت ——
میں عوام کو فقط آسا ہی تحریر کر سکتا ہوں کہ ہم ان
بنیادی خصوصیات کی بنا پر اپنی جمہوری آزادی کی
بنیاد رکھیں اور ڈر اور نفرت کو اپنے دل و دماغ
سے نکال کر ہمیشہ اپنے لاکھوں کروڑوں لوگوں
کی بہتری کا خیال کریں"
جواہر لال نہرو
جمہوریت
سماج واد
سیکولرزم
انصاف
آزادی
یکسانیت
اخوت
اتحاد
سالمیت
امن و امان اور ترقی کے لئے ہماری مضبوط بنیادیں

ج: ۵
ش: ۳

حیدرآباد

۱۹۸۸ء
مارچ

ماہنامہ شاداب

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپیے	150 روپیے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیے
دوسال	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپواکر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا۔ ٹیلیفون 229161۔

فہرست

حرفِ اوّل

مرکزی حکومت نے نئی قومی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا اور اس پر عمل بھی شروع ہوگیا ہے ہماری اسٹیٹ گورنمنٹ بھی اس خصوص میں کئی نئے اقدام پہ عمل کررہی ہے ان میں ایک اہم اقدام تعلیم بالغان کا انتظام ہے۔ لیکن یہ کام اتنا بڑا اور وسیع ہے کہ صرف حکومت اسے تکمیل کے درجے تک نہیں پہنچا سکتی ضرورت ہے کہ رضاکارانہ خدمات انجام دینے والے تعلیمی ادارے بھی اس خصوص میں اپنی ذمہ داری کو پورا کریں' یہ ادارے شہروں کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں بھی نان فارمل ایجوکیشن کا انتظام کرسکتے ہیں۔ جب تک وسیع پیمانے پر ایسی تعلیم کا اہتمام نہ کیا جائے یہ عظیم کام ادھورا رہیگا۔ ہمارے محکمہ تعلیم بالغان نے ابھی تک رضاکار تعلیمی اداروں کو وہ مدد نہیں دی ہے۔ جو وہ دے سکتے ہیں۔ بلکہ ایسے اداروں کے کام میں رکاوٹ ہی ڈالی گئی ہے لیکن اب اس محکمہ کے موجودہ ڈائرکٹر نے رضاکار تعلیمی اداروں سے اپیل کی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور تعلیم بالغان کے فروغ میں محکمہ سے تعاون کریں۔ ایسے اداروں کو ہر ممکنہ امداد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم ایسے جملہ اداروں سے خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس اپیل سے استفادہ کریں' حکومتی رعایتوں سے استفادہ کرتے ہوئے تعلیم بالغان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں اور ملک کے تعلیمی سفر میں اپنا حصہ ادا کریں۔

شاداب کی کتابت میں گذشتہ چند شماروں سے وہ معیار برقرار نہ رہ سکا جو شاداب کے پیش نظر تھا۔ ہمارے کئی قارئین اس جانب توجہ دلائی اور کتابت کو شاداب کے مواد کے ہم پلہ کرنے کی خواہش کی۔ ادارے نے اس بارے میں مشکلات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ اس شمارے سے کتابت کا نیا انتظام کیا گیا ہے توقع ہے کہ کتابت کی بہتری کا یہ سفر جاری رہیگا۔ قارئین سے خواہش ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

ڈاکٹر سیدہ وسیم دردانہ باسط

علم : مرد و عورت دونوں کے لئے

علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لئے ضروری ہے۔ خواہ وہ بچہ ہو، نوجوان ہو یا بڈھا۔ زندگی بغیر تعلیم کے ادھوری رہتی ہے۔ دراصل LEARN AND LIVE ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یعنی زندگی سیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے لئے نہ عمر کی قید ہے ورنہ ہی کتابوں کی حد مقرر ہے کہ اتنی کتابیں پڑھنے کے بعد یا فلاں ڈگری حاصل کرنے کے بعد تعلیم مکمل ہو جاتی ہے۔ کیا انسان "انسان کامل" کہلاتا ہے۔ ہم سب کچھ کتابوں ہی سے حاصل نہیں کر سکتے۔ اسٹیونسن STEVENSON (انگریزی ادب کا مشہور ادیب) کہتا ہے کہ BOOKISH EDUCATION صحیح ایجوکیشن نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں گلیوں میں ہونے والے حالات اپنے اطراف و جوانب میں گزرنے والے واقعات سے بہت کچھ سیکھنا چاہیئے۔ اچھے اور برے واقعات سے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت جب تک پیدا نہ ہوگی، ہماری نظر ہمارے عیبوں پر نہ ہوگی اپنے عیبوں کو دور کرنا، دوسروں کے کام آنا، ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں اپنے پرائے میں فرق کرنا وغیرہ وغیرہ خوبیاں جب تک ہم میں پیدا نہیں ہوتیں ہماری تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔

ویدوں کے زمانے میں آج کل کی طرح اسکول کالج نہ تھے اور نہ ہی ڈگریاں ملتی تھیں، بلکہ آشرم ہی میں گرو سب کچھ سکھاتے تھے اور دیکھتے کہ تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ تو اپنے شِشیہ (طالب علم) کو آشرم سے باہر جانے کی اجازت دیتے۔ قصہ مشہور ہے۔ کہ آشرم کے تین لڑکے جب اپنی پڑھائی کی مدت ختم کر چکے تو گرو نے کہا امدہ اصباح ملنا دوسرے روز جب لڑکے گرو کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ آشرم کے دروازہ پر زہریلے کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک لڑکا تو

قریب کانگریس نگر۔ امراؤتی ۴۴۴۶۰۵ مہاراشٹرا

تو د: کر بھاگ نکلا دوسرا کود پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ لیکن تیسرے نے سب کانٹے راستے سے ہٹائے اور راستہ [illegible] صاف کر کے اندر داخل ہوا گرو نے پہلے لڑکے سے کہا کہ تم ابھی باہر نہیں جا سکتے اور دوسرے سے کہا کہ تمہیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ تیسرے سے کہا کہ اچھا اب تم آشرم سے باہر جا سکتے ہو۔

ہم ڈگریاں لیکر اپنی تعلیم کی تکمیل کا اعلان تو کرتے ہیں لیکن وہ صلاحیت جو ہمیں انسانِ کامل بنا دے پیدا نہیں ہوتی اور یہی چیز ہماری ترقی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے آزادی کی اسقدر لمبی مدت میں ہم بہت کم ترقی کر سکے ہیں۔

کسی مذہب نے علم کو بُرا کہا اور نہ ہی علم حاصل کرنے سے روکا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اُطلبوا العلم ولو بالصین یعنی علم حاصل کرو اس کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے ظاہر ہے کہ عرب سے چین کا کتنا فاصلہ ہے کہنے کا مطلب یہ کہ علم حاصل کرو تمہیں اس کے لئے کتنی ہی مشکلات اٹھانی پڑے۔ حضرت سعدی شیرازی قابل تو تھے ہی لیکن ان کے علم کی پیاس بجھی نہ تھی چالیس سال کی عمر میں انہیں مزید علم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ آج کل کی طرح جگہ جگہ اسکول کالج یونیورسٹی تو تھے نہیں وہ بغداد کے لئے روانہ ہوئے لیکن یہ خیال ان کے ذہن میں تھا کہ اس عمر میں میں کیا سیکھ سکونگا۔ چلتے چلتے پانی پینے کے لئے ایک کنوئیں کے پاس پہنچے دیکھا کہ کنوئیں کی منڈھیر کے پتھروں پر گول گڑھے بنے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پانی بھرنے والی عورتوں سے دریافت کیا کہ آپ نے گھڑے رکھنے کے لئے یہ گول گڑھے بنائے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا نہیں بلکہ ہمارے گھڑے رکھنے سے یہ گڑھے بن گئے ہیں۔ اس پر سعدی صاحب کا شوق اور بڑھا کہ جب مٹی کے گھڑے رکھنے سے پتھر میں گڑھا پڑ سکتا ہے تو کیا میں کچھ سیکھ نہ سکونگا لہذا انہوں نے اتنا سیکھا اتنا سیکھا اور ایسی ایسی کارآمد کتابیں لکھیں کہ آج تک فارسی میں ایسی کتابیں نظر نہیں آئیں۔

ذوق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

تعلیم بالغان میں اس کی بہترین مثال البیرونی کی ہے۔ البیرونی بہت ہی قابل تھے۔ وہ محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آئے اور اپنا سفرنامہ لکھا جس سے ہمیں ہندوستان کی

تواریخ کا پتہ چلتا ہے وہ بہت بوڑھے ہوگئے تھے اور اکثر بیمار رہتے جب قریب المرگ ہوگئے اور بے ہوش رہنے لگے ان سے ملنے بہت علماء آتے رہتے اسی میں ایک بڑے جید عالم تشریف لائے ان کی آواز سن کر البیرونی نے آنکھ کھول کر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ بہت اچھا ہوا آپ آگئے بہت عرصہ سے ہی ایک مسئلہ سمجھنا چاہتا تھا۔ جسے آپ اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں مسئلہ مشکل تھا۔ آنے والے بزرگ نے تعجب کے لہجے میں کہا کتنا مشکل مسئلہ آپ اب سمجھنا چاہتے ہیں۔؟ اس پر البیرونی نے جواب دیا کہ تعجب تو جب ہوتا کہ مسئلہ سمجھنے سے پہلے میں مرجاتا۔ ان کا شوق دیکھ کر بزرگ نے سمجھانا شروع کیا اور اسی میں البیرونی کی موت واقع ہوگئی۔

مردوں کی تعلیم سے زیادہ ضروری عورتوں کی تعلیم ہے۔ مردوں کو روزی کمانے اور زمانہ کی الجھنوں سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ بچوں کی تربیت کرسکیں۔ بچوں کی پہلی اور صحیح تربیت گاہ ماں کی آغوش ہے۔ دراصل عورت کا علم وعمل شادی کے بعد ہی زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ بیوی اور ماں دونوں حیثیتوں میں عورت کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں مرد کی بہترین مددگار اور صلاح کار بیوی سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہوسکتا یہ عورت اور عورت ہی کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کو اچھی غذا کے ساتھ انکی روحانی تربیت بھی کرے اچھی اچھی باتیں بتائے ان کی نگرانی کرے شوہر کے لئے اچھی بیوی دنیا میں جنت ہے۔ اور اولاد کی جنت تو ماں کے قدموں کے نیچے ہے ہی ظاہر ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے والی شخصیت کے لئے تعلیم کس قدر ضروری ہے اسی لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے فرمایا ہے۔

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اسکی
کہ شرف ہے اسی شرف کا در مکنون
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

نپولین نے کہا VE ME GOOD MOTHERS AND I WELL GIVE YOU A GOOD NATION یعنی مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں اچھا معاشرہ

حبیب اللہ حکیم ڈائرکٹر آف ایجوکیشن گجرات اسٹیٹ ہمیشہ کہا کر تے کہ عورتوں کو تعلیم نہایت ضروری ہے کیونکہ ایک عورت کا تعلیم یافتہ ہونا۔

باقی بر صفحہ

پروفیسر محمد شبیر خاں

قومی بینکوں، بیمہ کمپنیوں وغیرہ کا منافع اسلام میں جائز ہے

مشہور ماہر معاشیات پروفیسر شبیر خاں، سابق صدر شعبۂ معاشیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے
سلام میں معاشرتی ڈھانچہ اور معاشی تبدیلی" کے موضوع پر خوابخش توسیعی خطبات پیش کرتے ہوئے اس بات
ور دیا کہ قومی بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور سرمایا کاری کے دیگر اداروں کے منافع قرآن کی معاشی تعلیمات کی
شنی میں جائز ہیں ۔ پروفیسر موصوف نے اسلام کے معاشی و معاشرتی نظام پر مفصل بحث کرتے ہوئے
سلام کے ذریعہ قائم کردہ معاشی وسماجی عدل کو تمام انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا ۔ مسلمانوں کی
وجودہ معاشی بدحالی کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ مسلمان جن
کے ومدلل معاشرتی و معاشی نظام ہے ۔ انھوں نے جدید معاشیات و معاشی ترقی کے اداروں سے
ستفادہ کرنے سے اس لئے گریز کیا کہ وہ قرآن کے ذریعہ حرام کئے گئے ربوٰ کا مفہوم متعین کرنے میں قرآن
کے الفاظ کے ساتھ اس کی صحیح اسپرٹ پر غور نہ کر سکے ۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بینک کے
علاوہ دیگر معاشی ادارے بھی ہیں جو منافع کی بنیاد پر سرمایہ کاری کے ذریعہ کاروبار کرتے ہیں ۔ مسلمان
بینک کے سود کو جو در اصل "سود نہیں منافع ہے" غلط تصور کرتے ہیں تو پھر وہ ایسے یونٹ ٹرسٹ اور
سرمایہ کاری کے اداروں سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے جو نفع اور نقصان میں یکساں شرکت کی
بنیاد پر کاروبار کرتے ہیں اور بڑی بڑی صنعتوں میں سرمایہ لگا کر فائدہ حاصل کرتے ہیں ۔ پروفیسر
شبیر خاں نے اسلامی نظریات پر گفتگو کرنے سے پہلے نہایت خاکساری کے ساتھ یہ بات واضح کر
دی کہ اپنی بات پیش کرنے اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ میں آپ سے
کچھ سیکھ سکوں اور جو کچھ میں نے اب تک غور و فکر کیا ہے اس پر گفتگو کر کے اپنے خیالات
اور اپنی معلومات میں مزید اضافہ کروں ۔

پروفیسر شبیر خاں نے اپنے سہ روزہ لکچر میں قرآنی اعجاز اور اس کے سماجی و معاشی احکام

تفصیل سے روشنی ڈالی اور حضور اکرمؐ کی معاشی زندگی کو جس میں نہایت سادگی تھی سماج کے لیئے آئیڈیل بتایا۔ انھوں نے قدیم مسلم معاشرے اور جدید معاشرے کے تقابلی مطالعہ میں اس بات پر زور دیا کہ قدیم زمانہ کے مسلمان نہایت محنتی اور دیانتدار تھے اقدیم مسلم معاشرے میں محنت کی قدر و منزلت تھی اور مزدور کو عزت و وقار حاصل تھا۔ جب کہ آج کے مسلم معاشرے میں مسلمان اکثر کاہل اور محنت سے جی چرانے والے ہیں، اور اسلام کی یہ خوبی کہ محنت کی قدر و منزلت کی جائے ۔۔۔ مغربی ممالک نے اختیار کرلیا ہے۔ وہاں کسی کام کو ذلیل اور حقیر نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ محنت کرنے والوں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ جس زمانے میں وہ امریکہ میں زیر تعلیم تھے، وائس چانسلر کی بیٹی ایک معمولی خادمہ کی حیثیت سے پارٹ ٹائم کام کرنے کے لیئے ان کے گھر آیا کرتی تھی۔

پروفیسر رحمان نے اپنے سہ روزہ لکچرس میں حقوق اللہ و حقوق العباد اور حقوق النفس کے موضوع پر نہایت سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو فرمائی اور قرآنی ضابطے کی وضاحت نہایت معروضی طریقے پر کی۔ انھوں نے قومی بینکوں کے "سود" کو "منافع" قرار دیا ہے۔ اور اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے یونٹ ٹرسٹ اور دیگر معاشی اداروں کے مثل قرار دیا۔ انھوں نے قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہ "آپس میں مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ" اور "اپنے نفس کو قتل نہ کرو" کے اشارات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ بینک چونکہ ایک قومی ادارہ ہوگیا ہے اور اب وہ اپنے سرمایے سے کاروبار کے ذریعہ منافع حاصل کرتا ہے اس لیئے نہ اس کے منافع کو سود نہیں کہا جا سکتا اور یہ حرام نہیں ہے۔

توسیعی خطبات کی صدارت پروفیسر حشمت موئنڈ (شکاگو) اور دوسرے دن مولانا سید شاہ اسماعیل صاحب نے فرمائی۔ لکچروں کے بعد نادیان ہمکشن، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر اوم پرکاش، محترمہ سہیلا الحائری (ہالینڈ) عابد رضا بیدار، محمود عالم اور دیگر حاضرین نے سوالات کیئے اور بحث میں حصہ لیا۔

سلسلہ ص ۳۵ سے

مصر میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع بھیج سکتا تھا کہ میدان صاف ہے۔ فوج لے کر آگے بڑھیں اور اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس حاصل کرلیں۔

نومسلم محمد مارماڈیوک پکھتال

مارماڈیوک پکھتال ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کو انگلستان میں سفاک کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چارلس پکھتال مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ وہ فوت ہو گئی تو دوسری بیوی سے مارماڈیوک پیدا ہوئے۔

مارماڈیوک نے ہیرو کے مشہور پبلک اسکول میں تعلیم پائی اُن کے ہم عصر طلبہ میں سے جن لوگوں نے آگے چل کر برطانیہ کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سر ونسٹن چرچل بھی شامل ہیں دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے یہ دوستی آخر وقت تک قائم رہی۔ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر مارماڈیوک کے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہو جائے یا پھر ایک دوست مسٹر ڈولنگ کے ساتھ فلسطین کی سیر و سیاحت کی جائے۔ فلسطین پر اس زمانے میں ترکوں کی حکومت اور ڈولنگ کو وہاں انگریزی سفارت خانے میں ملازمت مل گئی تھی۔ مارماڈیوک پکھتال نے دوسرا راستہ اختیار کیا آکسفورڈ کے پروگرام کو خیرباد کہہ کر فلسطین روانہ ہو گئے یہیں سے گویا ان کی زندگی میں وہ انقلابی موڑ آیا جس نے ہمیشہ کے لئے ان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔

پکھتال غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مختلف زبانیں سیکھنے کا انہیں بہت (شوق) تھا چنانچہ انہوں نے مادری زبان کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی میں (ماہر)انہ عبور حاصل کیا۔ مشرق وسطیٰ میں وہ برسوں مقیم رہے۔ اور شام، مصر اور عراق تک (سیاح)ت کرتے رہے۔ بیت المقدس میں انہوں نے عربی سیکھی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ (اسی ز)مانے میں وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مسجد اقصیٰ میں شیخ الجامعہ سے عربی (پڑھ)تے پڑھتے انہوں نے تبدیلی مذہب کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے۔ اور جہاں دیدہ

انہوں نے یہ دیکھ کر کہ نوجوان لڑکے میں جذباتی فیصلہ نہ ہو۔ انہیں اپنے والدین سے مشورہ کرنے کی رائے دی۔ پکھتال لکھتے ہیں " اس مشورے نے میرے دل پر عجیب اثر کیا، اس لئے کہ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کے لئے بے تاب رہتے ہیں مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوگیا کہ مسلمانوں کو خواہ مخواہ متعصب ظاہر کیا جاتا ہے۔

اسلام کے بارے میں پکھتال کا بہراہ راست مطالعہ جاری رہا اور وہ شدت کے ساتھ اس کا اثر قبول کرتے رہے۔ مصر و شام کے مسلم معاشرے کا بھی انہوں نے گہرا اور قریب مشاہدہ کیا اور ان ساری چیزوں نے مل کر ان کے دل و دماغ کا یوں احاطہ کیا کہ انہوں نے عربی لباس پہننا شروع کر دیا۔ اور اسلام کی حقانیت ان کی روح میں گہری اترتی چلی گئی۔

۱۹۱۳ء میں پکھتال ترکی گئے جہاں انہوں نے ترکوں کی سیاسی و معاشرتی اور اور تہذیبی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ترکوں کی سماجی اور طبعی خوبیوں نے انہیں مکمل طور پر اپنا اسیر بنالیا چنانچہ غازی طلعت بک اور دوسرے نوجوان ترکوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

" ایک روز میں نے طلعت بک سے کہا آپ یوں ہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں آپ کو اپنے ساتھ مسلح محافظ رکھنے چاہئیں۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں مجھے اسی پر اعتماد ہے اسلامی تعلیم کے مطابق موت وقت سے پہلے کبھی نہیں آسکتی۔ "

پکھتال غازی انور پاشا، شوکت پاشا اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ والہانہ میں کیا کرتے تھے ان کا تاثر تھا " لوگ خاص ترکوں پر لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا ہے۔ "

قیام ترکی کے دوران انہوں نے قبول اسلام کا مصمم ارادہ کرلیا چنانچہ انہوں نے غازی طلعت بک سے کہا "میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں" جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ قسطنطنیہ میں اپنے اسلام لانے کا اعلان نہ کیجئے ورنہ ہم لوگ بین الاقوامی مشکلات پھنس جائیں گے۔ بہتر ہے۔ اس کا اعلان لندن سے ہو۔ یورپ میں اس!

ئے زیردست رہیں گے۔ اسی مشورے کا نتیجہ تھا کہ پکھتال نے لندن جاکر دسمبر ۱۹۱۴ء
اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیا جس سے وہاں کی علمی اور سیاسی دنیا میں ہلچل مچ گیا
اور عیسائی کہنے لگے کہ جس مذہب کو پکھتال جیسا شخص قبول کرسکتا ہے اس میں یقیناً
موہ لینے والی اچھائیاں ہوں گی۔

قبول اسلام پر پکھتال کے تاثرات یہ تھے۔ "میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان ہوا
اور میرے دل میں اس کی بے حد قدر ہے۔ مسلمانوں کو اسلام ورثے میں ملا ہے
لیے وہ اس قدر نہیں پہچانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں جتنے مصائب
پریشانیاں آئیں ان میں امن و عافیت کا واحد گہوارہ اسلام ثابت ہوا۔ اس نعمت
خدائے بزرگ و برتر کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔

جنگ عظیم کے دوران محمد مارماڈیوک پکھتال لندن میں تبلیغ اسلام کا کام کرتے
ے وہ جمعہ کا خطبہ دیتے، امامت کرتے، عیدین پڑھاتے اور رمضان میں تراویح کے
م ہوتے رسالہ اسلامک ریویو کی ترتیب و تدوین بھی انہیں کے سپرد تھی اس دوران
ادارہ معلومات اسلامی سے بھی منسلک رہے۔

پکھتال ۱۹۲۰ء میں عمر سبحانی کی دعوت پر بمبئی آئے۔ جہاں "بمبئی کرانیکل" کی
ارت شروع کی اور ۱۹۲۴ء تک اس کے مدیر رہے۔ اس دوران میں
ہوں نے ترکوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کی کھل کر حمایت کی اور قومی
ریکوں میں سرگرم حصہ لیا۔

۱۹۲۴ء میں محمد مارماڈیوک پکھتال کو حضور نظام نے حیدرآباد بلالیا۔
ہاں انہیں چادر گھاٹ ہائی اسکول کا پرنسپل اور ریاست کی سول سروس کا اتالیق
رر کیا گیا۔ حیدرآباد ہی سے انہوں نے "اسلامک کلچر" کے نام سے ایک سہ ماہی
سالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا مقصد غیر اسلامی دنیا کو اسلامی ثقافت اور علوم و فنون
سے روشناس کرانا تھا۔

تقریباً دس سال تک اس رسالے سے منسلک رہے اور بڑے خلوص
و لگن سے علمی اور تبلیغی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضور نظام ہی کی سرپرستی میں پکھتال نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں
نا شروع کیا۔ حضور نظام نے انہیں دو سال کی رخصت عطا کی۔ اور انہوں نے مصر

میں جاکر علمائے ازہر کی مشاورت سے اس ترجمہ کی تکمیل کی۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جسے ایک نومسلم انگریز نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس میں بائبل کے ترجمہ کا سا لطف آتا ہے اور صحت، سلاست اور وضاحت کے لحاظ سے مقبول ترین ہے۔ اس سے قبل پامر، راڈویل اور سیل وغیرہ کے تراجم رائج تھے مگر پکتھال مرحوم نے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں بجا طور پر لکھ دیا:

"ایک ایسا شخص جو کسی مقدس کتاب کے الہامی ہونے کا قائل نہ ہو، وہ کبھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا"۔ یہی سبب ہے کہ عیسائی دنیا ان ریما رکس سے بہت چراغ پا ہوئی۔ یہ امر بہرحال مسلّم ہے کہ پکتھال کا ترجمہ نہ صرف پُر شکوہ اور آتشیں ہے بلکہ ساری دنیا میں مقبول ترین بھی۔ گذشتہ چند برسوں میں صرف امریکہ میں اس کی کم از کم پانچ لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال حیدرآباد ایجوکیشن سروس سے مستعفی ہو کر لندن چلے گئے۔ حضور نظام نے انہیں تاحیات پنشن عطا کی اور وہ انگلستان میں ہمہ تن تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ "اسلامک کلچر" یہیں سے چھوڑا۔ اشاعت اسلام کے لئے انہوں نے ایک انجمن بھی قائم کی۔ ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء کو وہ حرکت قلب بند ہونے سے یکایک انتقال کر گئے اور لندن میں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔ اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا یہ تھی کہ ان کی موت ہسپانیہ میں ہو۔ جہاں کے اسلامی دور سے انہیں بے حد محبت تھی۔

پکتھال یورپین تھے مگر اسلامی اخلاق سے پوری طرح آراستہ، پنج وقتہ نمازوں اور رمضان کے روزوں میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ سچے مسلمان کی طرح وہ خدا پر مکمل بھروسہ کرتے اور ہر کام کو اس کی رضا پر چھوڑ دیتے تھے۔ قدم قدم پر اللہ ا[illegible] رسولؐ کا ذکر رہتا۔ انتہائی شریفانہ جذبات کے مالک تھے ان سے مل کر ا[illegible] میں تازگی پیدا ہوتی تھی انہوں نے قابل قدر تبلیغی اور علمی خدمات انجام دی[illegible]

ترجمہ قرآن کے علاوہ [illegible]

[illegible] Side of [illegible] خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ان خطبات کا مجمو[illegible]

[illegible] دس بارہ نہایت اعلیٰ پائے کے ناول بھی لکھے

تسنیم فاطمہ برلاس

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بلند پایہ عالم دین بھی تھے۔ اور مجاہد آزادی بھی۔ انھیں قرآن، فقہ، علم الکلام، علم حدیث پر غیر معمولی عبور تھا۔ وہ فلسفی، مفکر اور مدبر بھی۔ تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی مولانا کا شمار اُردو کے بلند پایہ اعلیٰ انشا، پردازوں میں ہوتا ہے اگر ان کا اسلوب نگارش تھا تو تقریر میں بھی اُن کا کوئی ثانی ملنا مشکل تھا اُن جیسے شعلہ نواز اور جادو بیاں ہندوستان نے بہت کم پیدا کئے مولانا کی خدمات ماہر تعلیم کی حیثیت سے فراموش نہیں کی جاسکتیں غرض مولانا اپنی افتادِ طبع علم ذہانت و خطانت، اہلیت و صلاحیت، معاملہ فہمی اور دُور اندیشی کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے ایسے انسان جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں شاید ایسے انسان کے تعلق سے خدائے سخن میر تقی میر نے فرمایا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی ان کا ابتدائی زمانہ بھی یہیں گزرا۔ ان کی مادری زبان عربی تھی مولانا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک خالص مذہبی ماحول تھا ان کے والد مولوی خیرالدین ایک بہت بڑے عالم، مذہبی کتابوں کے مصنف جادو بیاں اعلیٰ بااثر شخصیت اور ایک پیر طریقت تھے وہ علاج کی غرض سے مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں قیام کیا۔ اور یہیں کے ہو رہے مولانا کی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی ویسے تو مولانا نے عربی، فارسی کی تعلیم مکہ معظمہ میں حاصل کی تھی البتہ درسیات کی تکمیل کلکتہ میں ہوئی اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذہن رسا ہونے کی وجہ سے

[illegible] (فائنل) [illegible] یونیورسٹی آف حیدرآباد

بارہ برس کی عمر میں تعلیم سے فراغ پائی

مولانا آزاد کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ نثر نگاری کی طرف انھوں نے بعد میں توجہ کی۔ دس گیارہ برس کی عمر میں ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور کم و بیش اسی زمانے میں صحافت کی دنیا میں بھی قدم رکھا۔ اور ۱۸۹۹ء میں انھوں نے کلکتہ سے "نیرنگ عالم" کے نام سے ایک گلدستہ جاری کیا۔ ۱۹۰۰ء میں بمبئی میں کلکتہ کے ہفتہ روزہ اخبار "المصباح" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر "احسن الاخبار" کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیتے رہے۔ خدنگ نظر، الندوہ، وکیل وغیرہ کی اشاعت و ادارت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق پیدا کیا۔ اس دور کے بیشتر موقر رسالوں میں بھی ان کا کلام نظم و نثر شائع ہونے لگا۔ لیکن یہ وابستگی ان کے ذوقِ جمال و جلال کی تشنگی کو سیراب نہ کر سکی اسی لئے انھوں نے مختلف اوقات میں تین ایسے رسالے جاری کئے جو ادبی نہیں تھے بلکہ یہ ایک خاص مقصد کے تحت نکالے گئے تھے۔ تین رسالے یہ ہیں ماہانہ "لسان الصدق" ہفتہ روزہ "الہلال" اور پندرہ روزہ "البلاغ" لسان الصدق سرسید کی تہذیب الاخلاق کے طرز پر تھا ہفتہ روزہ الہلال اس دور میں نکالا گیا جب مولانا کی فکر میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی نے علی گڑھ کے طلسم کو توڑا۔ یہ اردو کا پہلا سیاسی سماجی اور معاشرتی جریدہ تھا جس نے مسلمانان ہند کو بیدار کیا۔ ان کے کانوں میں آزادی کا صور پھونکا۔ اور مسلمانوں کو آزادی کی جد و جہد میں شریک کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس کے مضامین میں سچائی، خلوص، ایمانداری، سنجیدگی، ذہانت، طباعی، خطابت اور مقصد کی عظمت اور مولانا آزاد کی شخصیت کے مکمل اوصاف و خصائص جلوہ فرما تھے۔ مولانا آزاد بنیادی طور پر صحافی تھے وہ صحافت کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ الہلال کی صحافتی تحریروں کا طنطنہ آج تک برقرار ہے یہ اخبار انھوں نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا تھا۔ اخبار کے اجراء پر کسی صاحب نے مالی معاونت کی پیشکش کی اس پر مولانا نے ۲۷ جولائی ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھا۔

"جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم جائز رکھتا ہے وہ "اخبار" بلکہ اس فن کے لئے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے ہم اخبار کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں"

مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک اخبار نویسی مشن تھی اور انھوں نے یہ کام مشنری جذبے ہی سے کیا۔ مولانا نے اپنی صحافت کا معیار یہ رکھا تھا کہ جو بات بھی بیان کی جائے وہ علمی و ادبی اصول کے لحاظ سے مسلمہ و دلیل ہو اور اس کو ادب لطیف کے لبادے جامہ میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے کہ قارئین کے دل میں اتر جائے مولانا نے اردو صحافت کو کلاسکس کے بلند مقام پر پہونچا دیا انھوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا۔ آزادی اور حریت قوم کے لیے اُن کا دل تڑپ اٹھا۔ اور اس تڑپ اور جوش کو انھوں نے الہلال میں سمودیا تاکہ وہ تڑپ عوام تک پہونچ کر اُن کو بیدار کر سکے۔ اسی تعلق سے محشر اعظمی لکھتے ہیں

"الہلال کیا تھا آزادی فکر و ضمیر کا ایک پیغام تھا اس کے لفظ لفظ نے ایمانوں میں گرمی اور طبیعتوں میں اُمنگ پیدا کر دی۔ اس کے ہر جملہ میں بجلیوں کی کڑک، بادل کی گھن گرج آندھیوں کی سنسناہٹ، سیلاب کی روانی، انقلاب کی گونج اور آزادی کی للکار اور وہ سب کچھ تھا۔ جس کی وقت کو ضرورت تھی۔

مولانا آزاد ہماری جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو کے "مولانا آزاد نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی تھی اس کی وجہ سے ہماری قومی تاریخ میں انھیں بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔"

متحدہ قومیت مولانا آزاد کا عقیدہ تھا۔ اُن کی سادی زندگی ہندو مسلم اتحاد کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ انھوں نے اس اتحاد کے لئے خود بھی جدوجہد کی اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۵ ر ڈسمبر ۱۹۲۳ء کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے مولانا نے کہا "آج اگر ایک فرشتہ آسمان بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سورج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو، مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سورج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیوں اگر سورج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے"

مولانا آزاد نے اپنی کم عمری کے زمانے ہی سے اپنی تقریر کے جادو سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اور عوام میں ان کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ان کی بے مثال خطابت تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان کی خطابت کے تعلق سے کہا تھا۔ "خدا نے ان

کو خطابت کا جوہر دیا تھا اور ایسا جوہر دیا تھا میں اپنی محدود معلومات کی بناء پر کہہ سکتا ہوں ہندوستان کے باہر شاید دنیا کے کسی ملک میں ایسے آتش نوا اور ایسے شعلہ بیاں اور ایسے آتش ریز مقرر پیدا کیے ہوں"

مولانا آزاد کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی تھیں جو ایک کامیاب خطیب کے لیے درکار ہیں۔ طاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انھیں بے مثال حافظہ کی نعمت حاصل تھی۔ ان کی تقاریر میں جادو تھی اثر آفرینی تھی۔ وہ دھیمی دھیمی آنچ تھی جو قلب کو آہستہ آہستہ گرماتی ہے انھوں نے ۱۹۴۷ء میں دلی میں ایک یادگار تقریر فرمائی تھی اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا۔ تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گی۔ اس کے عہد شباب میں، میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری روایتیں تازہ کر دیں"

ابوالکلام آزاد اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کے موجد ہیں۔ یہ اسلوب سرسید کے طرز سے یکسر مختلف ہے۔ سرسید نے جس اسلوب سے بغاوت کی تھی اور جس کو انھوں نے نکال باہر کر دیا تھا۔ ابوالکلام نے اس کی از سرِ نو تجدید کی۔ انھوں نے وہی عالمانہ انداز اختیار کیا جو سرسید سے قبل رائج تھا۔ لیکن ایک بیّن فرق کے ساتھ۔ اس میں انھوں نے دریا کی سی رواقی، جوش اور خطیبانہ انداز کو شامل کر دیا۔ اور اس کے خمیر میں مقصدیت کو غالب کر کے ایک نیا پیرایہ تیار کیا۔ یہ مقصدیت انھوں نے سرسید سے مستعار لی ان کی پُر شکوہ اور پُر عظمت تحریریں دلوں کو اتنا ہی گرماتی ہیں جتنا سرسید کی نرم و نازک سیدھی سادی اور سلیس تحریریں۔

مولانا آزاد اپنے عہد کے سب سے نمایاں اور فعال ادیب تھے اس لئے ان کی تحریروں میں ان کے عہد کی اسی کیفیت کا انعکاس سب سے زیادہ پایا جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ خود کو سب سے بلند رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے غبارِ خاطر کے خطوط میں بظاہر لہجہ خود کلامی کا ہے مگر اندرونی تہوں میں گرد و پیش اور ہر طرف سے تکتی ہوئی گھورتی

ہوئی نگاہوں کا احساس پنہاں ہے۔ انھوں نے خود کو ایک رومانی ہیرو کے روپ میں پیش کیا جو ناکامیوں، محرومیوں اور ناشناساؤں کے ہجوم میں لعنت و ملامت کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود ان ہی سے مخاطب ہے وہ تنہا ہیں مگر یہ تنہائی ہجوم میں ہی چمکتی ہے وہ خاموش ہوتے ہیں تو اس لئے کہ آوازوں کے محشر میں ان کی خاموشی ہی الگ دکھائی دیتی ہے اور سب کچھ کہہ جائے۔ اور یہی ان کی نثر کا وہ جوہر ہے جو ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے۔

مولانا آزاد کے مکاتیب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جزئیات نگاری اور منظر نگاری پر پوری قدرت حاصل تھی۔ غبار خاطر کے زیادہ تر خطوط انشائیہ کی تعریف میں آتے ہیں۔ انشائیہ نگار ایک ذہین تماشائی اور حساس دل کا مالک ہوتا ہے وہ زندگی کا تماشا کھلے ذہن اور روشن آنکھ سے کرتا ہے۔ انشائیہ نگار بنیادی طور پر اپنے رویہ، مزاج اور طرز فکر میں منفرد ہوتا ہے۔ وہ کبھی اشیاء اور مظاہر کو صوفی کی نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے کبھی وہ جمالیاتی فکر میں ڈوب کر زندگی کے مختلف گوشوں میں حسن و رعنائی کی تلاش کرتا ہے۔ کبھی اپنے مثبت رویہ اور عارفانہ بصیرت سے زندگی کی تلخیوں، پریشانیوں اور دشواریوں کو آسانیوں اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔ کبھی خیال اور جذبہ کا یہ امتزاج مناظر فطرت کی پیکر تراشی کرتا ہے اور انھیں متحرک بنا کر نظروں کے سامنے لے آتا ہے۔ مولانا کے ہاں ایسے ہی ایک منظر کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے۔ یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے۔ اور سمندر کو بھیج رہے تھے تاکہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے۔

یا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگی تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں سے ہی ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا بلکہ قید خانوں کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے اور کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی چہرے سے نقاب اُلٹتی ہے تو سب کو یکساں طور پر نظارہ حسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف گرد و پیش میں ہی کھوئے رہتے ہیں

مولانا آزاد اپنی نثری شاعری میں ہر دو تین جملوں کے بعد ایک شعر بڑی خوبصورتی

سے ٹانک دیتے ہیں۔ یہ شعر عموماً عربی، فارسی اور اُردو کا ہوتا ہے۔ مگر اس شعر کی اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایسا برمحل اور برجستہ ہوتا ہے کہ گویا مضمون نگار نے عبارت کو زیادہ پراثر اور رنگین بنانے کے لیے خود ہی شعر کہہ دیا ہے یا یہ شعر صرف اسی موقع و محل کے لیے کہا گیا تھا۔ ابوالکلام کی نثر دیکھنے کے بعد نظم میں کچھ مزہ نہ رہنے کی کیفیت اسی اسلوبِ شاعرانہ کی رہینِ منت ہے

پروفیسر گیان چند جین "غبارِ خاطر" کے اسلوب کے تعلق سے یوں رقمطراز ہیں

"میں مولانا کی ادبی تحریروں میں غبارِ خاطر کو گل سرسبد سمجھتا ہوں"۔

مولانا آزاد کی شخصیت اور ادبی افکار کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ وہ ایک ایسا بے کنار سمندر ہیں جن کی آغوش میں معلوم نہیں کتنے دریاؤں نے روانی سیکھی۔ ادب، سیاست، مذہب، سماجیات، تنقید یہ سب ان کے سمندر کی لہریں ہیں لطف یہ ہے کہ ان سب موضوعات میں ان کا مخصوص اندازِ نگارش نمایاں ہے۔

فارم نمبر ۴

تختہ تفصیلات ملکیت بابتہ ماہنامہ شاداب، حیدرآباد

زبان، جسر احت وقفہ = اردو ماہنامہ "شاداب"
مقام اشاعت = ۵-۱۴۷-۱۱ ریڈ ہلز، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۴
ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر اور مالک کا نام = محمد قمرالدین صابری
قومیت اور پتہ ہندوستانی = ۵-۱۴۷-۱۱ ریڈ ہلز، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴
اس ماہ نامہ کے کوئی اور مالک یا شراکت دار نہیں ہیں۔

میں محمد قمرالدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع اور یقین کی حد تک صحیح ہیں۔ فقط: محمد قمرالدین صابری۔

ایم آئی حبیب اللہ

گاندھی جی کی لافانی مناسبت

گاندھی جی تعلیمات نے آج کی پرتشدد اور کشیدگی میں مبتلا دنیا میں نئی اور زور دار مناسبت حاصل کرلی ہے۔ تجربے نے یہی سکھا دیا ہے کہ معشیت کے بارے میں گاندھی کے عقائد سے باہر بھارت کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ گاندھی جی کا قول تھا کہ "اصلی بھارت دیہات میں رہتا ہے؟" جب تک دیہات ترقی نہیں کریں گے بھارت صحیح معنوں میں ترقی نہیں کرسکتا۔ جب تک لوگوں کو پوری خوراک نہیں ملے گی پورا کپڑا نہیں ملے گا اور وہ ناقص غذا اور بیماری کا شکار رہیں گے۔ گاندھی کی تعلمات کی مسلسل مناسبت یہی رہے گی۔

دیہات کا سدھار، خواتین کی ترقی، مواقع کے لحاظ سے مردوں کے ساتھ ان کے مساوات ناخواندگی کا خاتمہ، بھوک بیماری اور ناقص غذا کا ہٹایا جانا، اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کا فروغ ایسے ہیں جن کی آج بھی بہت ضرورت اور اہمیت ہے۔

دیہی ہندوستان کی ترقی

گاندھی جی چھوت چھات کا دور کرنے، ہندو مسلم اتحاد، مکمل نشہ بندی، کھادی، سودیشی اور دیہی صنعتوں کی بحالی پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مجھے کسی بھارتی گاؤں میں ہی دفنایا جائے"۔ انھوں نے کانگریس کے میں بھی بعض تبدیلیاں تجویز کیں تاکہ اسے زیادہ موثر تنظیم بنایا جاسکے انہوں نے تجویز کیا کہ کانگریس کے میں "جائز اور پرامن" کے الفاظ کی بجائے "سچے اور عدم تشدد" کے الفاظ شامل کئے جائیں۔ انھوں نے کانگریس کارکنوں کے لئے ضروری قرار دیا کہ وہ کھادی پہننے کی عادت ڈالیں اور ہاتھ سے سوت کاتنے کا فن سیکھیں کانگریس نے گاندھی جی کے دیہی صنعتوں کے پروگرام کی بھرپور حمایت کی دیہی صنعتوں کی اہمیت میں اضافہ کرنے

کے لیئے گاندھی جی نے دیہی صنعتوں کی ایک کل ہند انجمن قائم کی جسے مگن واڑی کے نام دے دیا گیا۔ اس انجمن کے سیکریٹری کمار نے نہایت سرگرمی سے دیہی کے بھم سے اجرا اور دیہات کے لیئے موزوں نئی صنعتوں کے قیام کا کام شروع کیا۔ مگن واڑی دیہی صنعتوں کی تربیت اور تحقیق کا بھی صدر مقام بن گئی۔

اس انجمن نے گرام اودیوگ پتریکا کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا جس میں قدیم گھریلو صنعتوں کو پھر سے رائج کرنے اور نئی صنعتیں شروع کرنے کے بارے میں ضروری ہدایات دی جاتی تھیں۔ دیہات کی ترقی کے کام کو نئی شکل دینے کے لیئے گاندھی جی خود کسی گاؤں میں رہنا چاہتے تھے تاکہ کے مسائل سُن سکیں۔ اسکے لیئے انھوں نے سیگاؤں نام کے ایک گاؤں کو چنا اور اسے سیوا گرام کا نام دیا۔

خود کفیل یونٹ

سیوا گرام میں انھوں نے دیہات کے لیئے اپنی نئی اصلاحات کو شروع کیا بعد از اں انھوں نے ماہرین تعلیم اور کانگریس کے زیر انتظام ریاستوں کے وزراء تعلیم کے مشورے سے "تعلیمی سنگھ" کی بنیاد رکھی۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ تعلیم حقائق اور سرگرمی پر مبنی ہو جب بچہ آٹھ برس تک اسکول میں تعلیم حاصل کرے تو اُسے نہ صرف کافی کتابی علم حاصل ہو جائے بلکہ اُسے دیگر شعبوں کا بھی عملی تجربہ حاصل ہو جائے اور اس اس مقصد کے لئے انھوں نے سیوا گرام اور اس کے گرد و نواح میں اسکول کھولے۔

دیہات کے لوگوں کو صفائی کی اہمیت اور کم خرچ سے کوڑا کرکٹ کرنے کے طریقوں کی تعلیم دی گئی وہ دھواں نہ دینے والے چولہے بھی دیہات میں مقبول کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کے رسوئی گھروں کو بہتر بنایا جا سکے اور اسی مقصد کے لیئے انھوں نے ایک دھواں نہ دینے والا چولہا تیار کیا۔ ان کے خیال میں ہر گاؤں ایک خود مختار جمہوریت ہونی چاہیئے جو ضرورتِ زندگی کے لحاظ سے خود کفیل ہو۔ دیہات کو پسماندگی سے نکال کر صفِ اول میں لانے کے لئے انھوں نے تجویز کیا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس شہروں کے بجائے دیہات میں بلائیں جائیں اور کانگریس کا ایسا اجلاس مہاراشٹرا کے گاؤں میں ہوا۔

حقیقی نظریہ

گاندھی جی کے خیالات تخلیقی ذہن کا وصف تھا۔ وہ بہت حد تک ایک انسان تھے۔ انھوں نے ایسا بہت کچھ لکھا ہے جس کا عام طور پر مسائل حل کرتے سے تعلق ہے۔ جب بھی انھیں عوام کے بارے میں کوئی خیال آتا یا منصوبہ سوجھتا تو وہ اس موضوع کے بارے میں ماہرین سے اس کے متعلق مشورہ کرتے۔ وہ اپنا وقت لائبریوں اور ریسرچ گروں میں صرف نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں سے براہ راست رابطے کے ذریعہ علم عام حاصل کرتے تھے چونکہ وہ "عوامی آدمی" تھے اس سے وہ عوام کے ساتھ ان کی سیدھی سادھی زبان میں بات کرتے تھے۔

گاندھی جی سیکولر تھے اور ان لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے جو کسی ایک مذہب کی بات کرتے تھے۔ وہ سب درجوں کو برابر سمجھتے تھے اور لوگوں سے اس طرح مخاطب کرتے تھے۔ آؤ ہم بھول جائیں کہ میں ہندو ہوں تم مسلمان ہو یا میں ایک گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو آؤ ہم " میں " اور " میرے " کے الفاظ کو مشترکہ ہم میں جذب کر دیں ہم اسی آزاد ہوں گے جب ہمارے لوگوں کی بھاری تعداد اکٹھے تیرنا اور اکٹھے ڈوبنا سیکھ لیں۔

گاندھی جی نے لوگوں کو شراب پینے سے منع کیا جو سارے کنبے کو برباد کر دیتی ہے عوام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ "اگر مجھے پورے بھارت کا ایک گھنٹے کے لیے بھی ڈکٹیٹر مقرر کر دیا جائے تو میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ میں کوئی معاوضہ لیے بغیر ملک میں شراب کی سب دکانیں بند کروا دوں گا

کی رسم کے خلاف تھے اور نوجوانوں کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ شادی کے موقع پر جہیز نہ لیں

دیہات میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا'' نوجوانوں شادی کے موقع پر جہز کی شرط عائد کرتا ہے وہ اپنے ملک کے لیے باعثِ شرم ہے اور انسانیت کی بے ادبی کرتا ہے۔

گاندھی جی سماج کی بات نہیں کرتے تھے لیکن وہ ''سماجی انصاف'' کا اکثر ذکر کرتے تھے اپنے نظریہ پر زور دینے کے لیے انھوں نے ایک گاؤں میں بہت بڑے عوامی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''سادگی عالمگیری کا جوہر ہے جو چیز کروڑوں لوگوں کے فائدے کے لیے درکار ہے اس کے لیے کسی عالمانہ فضیلت کی ضرورت نہیں ۔ یہ فضیلت صرف چند لوگ حاصل کر سکتے ہیں لہٰذا اس سے صرف امیروں کو ہی فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔ لیکن ہندوستان چھوٹے چھوٹے دور افتادہ دیہات میں رہتا ہے ۔ میں ایسے ہی کسی گاؤں میں جاکر رہنا چاہتا ہوں وہی حقیقی ہندوستان ہے مرا ہندوستان جس کے لیے میں جیتا ہوں ''۔

گاندھی جی کو مزدور افراد کی بہت فکر تھی ۔ اپنے گاؤں سیوا گرام میں وہ کوڑھ کے مریضوں کا علاج کرتے تھے ان کا کہنا تھا کوڑھ کا علاج صرف طبی راحت پہنچانے ہی میں نہیں بلکہ زندگی سے ہی مایوسی کی حالت کو لگن اور خوشی اور بے لوث خدمت سے تبدیل کرنے کا م ہے ۔ اگر آپ مریض کی زندگی میں تبدیلی لاسکتے ہیں اور اس کی زندگی کی قدروں کو تبدیل کر سکتے ہیں تو آپ گاؤں بلکہ ملک کو تبدیل کر سکتے ہیں''

گاندھی جی اپنے نکتہ چینیوں اور اختلاف رکھنے والوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی اپنے عقیدت مندوں سے ان کی کسی عام نکتہ چینی کی جاتی تھی اور بعض اوقات تو ان کے قریبی دوست اور یہی نہیں بھی ان کا مذاق اڑاتے تھے لیکن یہ نکتہ چینی انھیں ان کے نشچتہ راستے سے ہٹا نہیں سکتی تھی ۔ گاندھی جی ہندوستانیوں اور غیر ملکیوں سے ایک جیسا پیار کرتے تھے اس کے لیے ایک انگریز سیاست داں نے ان پر نکتہ چینی کرتے ہو کہا'' تو آپ کے سوراشٹر کا کیا ہوا'' گاندھی جی نے جواب دیا ''یہی نوع انسان کی خدمت سب سے اچھا کام ہے''۔

برت کا ہتھیار

گاندھی جی اپنے مقصد کو حل کرنے کے لیے برت رکھا کرتے تھے اور یہ ان کا عمدہ طریقہ تھا ایک بار احمد آباد کپڑا مل میں جہاں محنت کشوں کو ان کی محنت کا بہت کم معاوضہ ملتا تھا ہڑتال ہو گئی۔ یہ سن کر گاندھی جی وہاں بھاگے بھاگے گئے۔ انھوں نے مل کر منتظمین سے بات چیت کر کے یہ جھگڑا مٹانے کی کوشش کی لیکن منتظمین کی سخت گیر پالیسی کے سامنے وہ کامیاب نہیں ہو سکے لہٰذا انھوں نے مزدوروں سے کہا کہ وہ انتظامیہ کے خلاف ہڑتال جاری رکھیں۔

گاندھی جی نے دیکھا کہ یہ مزدور ہڑتال میں تعاون نہیں دے رہے ہیں لہٰذا انھوں نے ان مزدوروں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے برت شروع کر دیا۔ وہ بائیس دن تک ہڑتال پر رہے اور اچانک ہی مل کے منتظمین گاندھی جی کے ساتھ محنت کشوں کے مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ 1922ء کی عدم تعاون کی تحریک کے بعد گاندھی جی نے محسوس کیا کہ لوگوں میں اخوت اور بھائی چارے کا احساس ختم ہو رہا ہے لہٰذا انھوں نے لوگوں کو اتحاد کا احساس کرانے کے لیے انھوں نے 18 ستمبر سے 21 روز کا برت رکھا۔ گاندھی نے آخری برت 13 جنوری 1948ء کو رکھا اس کے ذریعہ وہ لوگوں کے دلوں میں پیار پیدا کرنا چاہتے تھے اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے کیوں کہ گاندھی جی فرقہ وارانہ فسادات سے دکھی تھے۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے دوسروں کے مفاد کے لیے برت رکھنا جس میں بے لوث محبت اور بنی نوع انسان کی خدمت شامل ہو کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔

عادل صدیقی

غالب کی انسان دوستی

غالب کی تخلیقی اور اختراعی صلاحیت کے سبھی قائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نثر میں وہ ایک طرز خاص کے موجد ہیں شاعری میں جو زور کلامی ہے اس کا جواب نہیں الفاظ اور معنی دونوں میں ندرت، رفعت، بندش اور ترکیب کی دوستی، چستی اور شوخی وغیرہ بہت اہم ہیں۔ مضمون آفرینی نازک خیالی جودت طبع ان کے کلام کا جزو بن گئے ہیں۔ اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی انسان دوستی ہی تھی جس نے انھیں شاعری کی دنیا میں مقام بخشا

غالب کی انسان دوستی اور عظمت کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے دوسرے شاعروں کی بڑائی کو جن سے وہ فی الواقعی متاثر ہوئے کھلے دل سے بیان کیا۔ انھوں نے اپنے پیشروؤں میں اشعار کی قدر کی ہے اور معاصر شاعروں میں اشعار کی بھی کھل کر داد دی۔ ذوق کے اس شعر کو پسند کیا ہے حالانکہ ذوق سے ان کی معاصرانہ چشمک تھی۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب نے مومن کے اس شعر کی داد دی۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے متعلق غالب نے لکھا ہے " یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا اس کی افسوس کی سی تھی یہ ضرور ہے کہ ایسے شاعروں کی تعداد کم ہے جن کے کلام کو انھوں نے پسند کیا۔ ان کے انتخاب کا معیار بہرحال بہت بلند تھا البتہ میر سے ان کی عقیدت یوں کہا:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

ایک بار غالب نے میر کی تعریف کی۔ ذوق بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے
میر پر مرزا رفیع سودا کو ترجیح دی اس پر مرزا نے ان سے کہا کہ " میں تو تم کو ویسری کا سمجھتا تھا مگر آج
ہوا کہ آپ "سودائی" ہیں کہہ کر انھوں نے جو نشتر زنی کی اس کا لطف اصل ذوق ہی لے
۔۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حسب ضرورت اپنے معاصرین کی تعریف کرتے ہوئے
تے تھے اور یہ ان کی فراخدلی ایک ثبوت ہے کیونکہ ہم عصر شاعروں میں چشمک زیادہ ہوتی
ر کوئی مشکل ہی سے دوسرے کی تعریف میں لب کشائی کرتا ہے۔

غرض کہ غالب انسان دوستی کا ایک ایسا مینارہ نور ہیں جہاں سے وہ تمام انسانیت پر
وسیع نگاہ ڈالتے ہیں۔ غالب دراصل ایک آفاقی شاعر تھے اور انسانیت آفاقیت ان کے
م اور ان کے نثر سے بخوبی واضح ہوتا ہے وہ اصول اور فطرت و طریق کے حکمت کے
ہوں کی پاس داری کرتے ہوئے اپنے اشعار کو نوع انسانی سے سجاتے ہیں۔ غالب کا
مال یہی ہے کہ ان کی نثر اور اردو ان کے اشعار دونوں سے موانست اور غمخواری کے جذبات
ج ہوتے ہیں اور ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں بلا لحاظ مذہب و ملت
انوں سے پریم و محبت کا شدید جذبہ ہے مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

میں تو بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا
نے یا نا مانے۔

سہ
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مرزا غالب کے بارے میں غلام رسول لکھتے ہیں کہ وہ حد درجہ بالکل معمور اور تعاصب
ذاداری سے بالکل پاک تھے ہندوؤں، مسلمانوں سب کے ساتھ ان کے
ے تعلقات تھے تفتہ یا منشی بہاری یا منشی شیو نرائن یا ہیرا سنگھ یا ان کے والد جمل کے
انھیں جتنی محبت و الفت تھی اس کا مقابلہ ان کا کوئی مسلمان شاگرد نہیں کر سکتا تھا۔ خواجہ
نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ نہیں لکھا اور صرف ایک قطعہ ان
ی مسودات میں دستیاب ہوا ہے جو مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں اس کے دیکھنے سے معلوم
ہے کہ غالب نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا
س کا جواب مدت دراز تک نا ملا تو تقاضے کے طور پر یہ قطعہ بھیجا جس کو مشکل سے
کہا جا سکتا ہے حالانکہ یہ قطعہ "سبد چین" میں موجود ہے۔ اس بات پر سبھی کا اتفاق ہے

کہ مرزا غالب کی ہجو دوسرے ہجو گو شاعروں کی طرح سے سوقیانہ پن سے پاک ہے۔ بنیادی طور پر وہ انسان کی عظمت کے قائل تھے۔ ان کی آنکھ میں لحاظ تھا، مروت تھی، دوسروں کا پاس تھا۔ ان کا دردمند دل انسان کا مذاق اڑانے کے لیے کبھی آمادہ نہ ہو سکا۔

مرزا غالب اتنے فراخ حوصلہ انسان تھے کہ دوسروں کی سفارش ہمیشہ ہی لکھتے رہتے کیا کرتے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں "سفارشوں کے باب میں وہ بڑے مستعد تھے۔ نواب میر علی نقی خاں بڑے عالی خاندان آدمی تھے۔ نواب ذوالفقار خاں اور نواب اسد خاں عالمگیری کی اولاد میں سے تھے وہ نوکری کی جستجو میں نکلے تو غالب نے سید بدرالدین احمد کو سفارشی خط لکھا۔

"آپ ان کی (علی نقی خاں) تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں اور ان کا حال سب ان پر ظاہر کریں اور انھیں اہالی سرکار سے ملا دیں اور بابو صاحب سے جو ان کو ملوائیے تو میرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجئے۔ کیا خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر ... ہو جائیں ....." ایسا نہیں کہ ان کا دردمند دل کسی ایک انسان کے غم میں ہی تڑپتا ہو بلکہ وہ تمام تر انسانی ہمدردی کا مجسمہ تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"قلندری و آزادی و ایثار و کرم کے جو میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہیں۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان ہو جاؤں، اگر تمام عالم نہ ہو سکے، نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔" خواجہ حالی نے مرزا غالب کی انسان دوستی کا ذکر اس پیرائے میں کیا ہے۔

"مرزا غالب کے اخلاق نہایت وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے ملتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا، دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دلی میں بلکہ ہندوستان میں بے شمار تھے اور جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غم خواری و یگانگت ٹپکتی ہے۔ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔"

ان کے مکان کے آگے لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیے ماہواری ہوگئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی پھیلا چوڑا تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔"

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی غالب کی انسان دوستی کا کھلا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

"غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہوگئی تھی ینٹ کے فرغل پہنے ہوئے ملنے آئے۔ غالب نے انھیں کبھی مالیدہ یا جامہ دار کے حقوں ے سوا نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کے فرغل میں دیکھ کر غالب کا دل بھر آیا۔ امداد کا خیال را ہوا لیکن دوست کی دلداری کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسے طریقہ پہ سلوک یا جائے کہ اسے اپنی بے چارگی اور بے بسی کا احساس نہ ہو اور پیش کردہ عطیہ کو دل کرتے ہوئے عار نہ آئے۔ غالب نے اس غرض کو مد نظر رکھ کر چھینٹ کے غل کی بے حد تعریف کی۔ پوچھا کہ یہ چھینٹ کہاں سے لی ہے اور درخواست کی ے بھی اسی کا فرغل بنوا دیا جائے۔ دوست نے بلا تکلف کہا کہ اگر آپ کو یہ بہت پسند ہے تو یہی لے لیجیے۔ غالب نے کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ابھی چھین ں لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے۔ ں کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا تیا چغہ انہیں پہنا دیا۔"

پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں۔

غالب اپنی تہذیب اور اس کے عقائد و اصول کے پوری طرح وفادار تھے اور دار ی کا یہی وہ تصور اور جذبہ ہے جس نے ہمارے تخلیقی ادب کی تاریخ میں الب سے وہ کام کرایا۔ جس کی بدولت وہ غالب ہو گئے۔ غالب کے گرد و پیش طرف ان کی تہذیب کے ستون ایک ایک کر کے گر رہے تھے اور وہ ثقافت مسمار رہی تھی جس نے سات سو سال تک ہندوستان کے دل و دماغ پر فرماں روائی ی تھی۔ ہر سو تباہی اور بربادی کے آثار پھیلے ہوئے تھے سماج ایک خرابہ بن چکا تھا ملک کی کشتی زمانے کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی تھی اور سطح پر اس کے ارتز ے تیرتے نظر آ رہے تھے ...... غالب کو حالات کی سنگینی کا نہایت شدید

احساس تھا۔ ان کی روح مضطرب ہو اٹھی اور کہتے ہیں۔

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غرض کہ مرزا غالب بہت ہی وسیع المشرب، انسان دوست اور دردمند انسان تھے انسانوں سے ہمدردی اور مروت ان کی طبعیت کا خاصہ بن گئی تھی۔ خلوص و محبت ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ ان کے اشعار فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہیں وہ کہتے ہیں۔

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مرزا غالب نے مثنوی ابر گہربار میں ایک مناجات میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

"میرے کردار و افعال کا حساب نہ لے۔ اگر محاسبہ ناگزیر ہو تو پھر مجھے بھی اجازت دے تاکہ جو جو حسرتیں دل میں باقی رہیں، انھیں تفصیل سے بیان کر دوں۔ تیرے محکمہ عدل و انصاف کی طرف سے جو جرم میرے ذمہ ثابت ہو، اس کے مقابلے میں حسرتوں کی ایک صف کھڑی کر دوں اس طرح تجھ پر آشکارا ہو جائے گا کہ میرے جرموں کے مقابلے میری حسرتیں زیادہ ہیں۔ زندگی میں جو کچھ مجھ پر گذری اسے کیا بیان کروں بیان کرنے کا وقت بھی نا رہا۔ بہاریں آئیں لیکن میں بے سروسامانی کا ماتمی رہا۔ افق پر شادمانی افزا بادل چھائے لیکن میرا جام سفالیں شراب سے خالی رہا۔ اگر عیش کا کوئی لمحہ نصیب بھی ہوا تو اس کی حیثیت رقص بسمل کی سی تھی۔ رشتہ درست ہوا تو گوہر ٹوٹ گیا۔ شراب مہیا ہوئی تو پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ گویا دولت اور رعب کی خواہش تھی تو اپنی ذات کے لئے اور اپنی راحت کے لیے نہ تھی بلکہ آرزو یہ تھی کہ بادشاہ بلائے، ہمہ مرتبہ ہاتھ پر لاد کر زر و جواہر عطا کرے۔ غالب ہاتھی کو لے کر باہر نکلے اور زر و جواہر فقیروں پر برسائے جائیں"۔

مرزا غالب کہتے ہیں۔

؎ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو اذیت ناک اور دردناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا، وہ شاعر کے نزدیک بہت بڑا حادثہ تھا۔ دوست کے جانے کے بعد اس کی یاد اسے ستاتی ہے۔ دوست سے ملاقات میں تاخیر کو وہ قیامت کے دم لینے سے تعبیر کرتے ہیں۔

یا وہ کہتے ہیں۔

؎ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس طرح سے وہ قاری کو انسان کے درجہ، کمال تک پہنچنے کے راستہ کی دشواریوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

یا وہ کہتے ہیں ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
ایک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

؎ بہرا ہوں میں تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اس طرح کے فطرت انسانی پر مبنی اشعار کسی ایسے شخص کے قلم سے ہی نکل سکتے ہیں جو پاکیزہ اور نازک احساسات کے مالک ہوں۔

بلاشبہہ شاعری میں اس وقت تک عظمت پیدا نہیں ہوگی جب تک شاعری کی شخصیت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ شاعری کا قالب و لہجہ، تیور اور اس کا زیرو بم شاعر کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ غالب کے شاعری کلام کا مطالعہ ہو یا ان کے نثری شہہ پاروں کا، ہر جگہ ان کی انسان دوست شخصیت واضح صورت میں نظر آتی ہے ان کی تحریریں ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں مقبول میر تقی میر

؎ دل نے ہم کو مثال آئینہ　　ایک عالم کا روشناس کیا

جو طبیعت غم سے متاثر ہوتی ہے وہ دوسروں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ دنیا

کے تمام ادبی شاہکار انہی سے ہی عبارت ہیں۔ درد انگیز شاعری وہی کر سکتا ہے جس کے دل پر چوٹ پڑی ہے، مرزا غالب نے غدر کے زمانے کی چھ چیرہ دستیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ طبعاً ایک شریف انسان تھے، اسی لیے اپنے غم کو ساتھ لے کر انھوں نے پورے عالم کے ساتھ غم خواری کا رویہ اپنایا۔ ان کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا متوازن امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے ان کے دردِ دل آشنا نے سماجی اور معاشرتی اور مذہبی انقلابات دیکھے اور اسی وجہ سے ان کے محسوسات شدت اختیار کر گئے اور آفاقی ادب کا محرک بن سکے۔ ان کی شاعری کی مجموعی فضا میں دردمندی اور سوز و گداز کا عنصر غالب رہا جس نے انھیں ایک دردمند انسان کی حیثیت سے نہ صرف ادب میں بلکہ دنیائے انسانیت میں ایک لازوال مقام دلایا۔

سلسلہ صفحہ ۶ —

کا تعلیم یافتہ ہونا ہے۔"

اس سلسلہ میں دو مثالیں پیش ہیں جن کو صرف ماں نے تربیت دی ہے شیواجی مہاراج کی تربیت شاہ جی نے نہیں بلکہ جیجا بائی نے کی تھی۔ شیواجی مہاراج نے نہ صرف مہاراشٹرا پر حکومت کی بلکہ اسے اچھی طرح نبھایا ہے۔ دوسری مثال نواب اسماعیل خاں پنی مہدوی کی ہے ان کے والد نواب سلطان خاں کو جنگوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ بچے کی تربیت کریں۔ ان کی والدہ نیک اور خواندہ تھیں انہیں جنگوں کے حالات، بہادری کے قصے سناتیں، راست گوئی، راست روی کی طرف متوجہ کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ نواب اسماعیل خان نہایت نیک، شجاع، منصف مزاج، راست گو، بہادر، علم و ہنر کے قدردان تھے۔ ان کے عہد میں ایلچپور (اچلپور) علم ہنر، خوبصورت عمارت، باغات اور فوجی تنظیم کی وجہ سے گلستان کہلاتا تھا شہر کی خوبصورتی شادابی اور تنظیم دیکھنے لوگ آتے تھے۔ نواب اسماعیل خان کی بہادری، رحمدلی اور منصف مزاجی کی دور و نزدیک شہرت سنکر انکی والدہ نے فرمایا تھا کہ کیوں نہ ہو میں نے اپنے بچہ کو کبھی بے وضو دودھ نہیں پلایا ہے۔"

اختتام پر میں صرف اتنا کہونگی کہ علم ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے اگر اس کی بہت پر ہماری نظر ہو۔

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

مسلسل قسط ۱۶

صلیب کے سائے میں

اہل مصر سے جب مدد کی تمام اُمیدیں ختم ہوگئیں تو ٹایر والوں کو بلق سے مدد لینے کا خیال پیدا ہوا۔ جو اس وقت آلیپو کے ایک نواحی قلعے منجیب کی تسخیر میں مصروف تھا۔ مورخ کمال الدین لکھتا ہے کہ جب ٹایر والوں کی درخواست بلق کو پہنچی تو اُس نے منجیب کی فتح کی ذمہ داری اپنے ایک ماتحت کے سپرد کی اور اُسے تسخیر شہر کے سلسلے میں مناسب ہدایتیں دینے کے لئے اس کے ساتھ قلعے کے اطراف تنصیبات کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ کمال الدین لکھتا ہے۔

سر پر خود اور پشت پر ڈھال اوڑھے ہوئے بلق قلعہ منجیب کے قریب جا پہنچا تاکہ منجنیقوں کی تنصیب کے لئے مناسب مقامات کی نشاندہی کرے۔ اور ایک جگہ کھڑے ہو کر جب وہ اس سلسلے میں احکامات صادر کررہا تھا کہ قلعے سے ایک تیر آکر اس کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے کھینچ پھینکا اور پھر بڑی حقارت سے فضا میں تھوکتے ہوئے بڑبڑایا۔ یہ وار سارے مسلمانوں کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ پھر وہ زمین پر گر کر ڈھیر ہوگیا۔

بلق کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ جب اُس کی موت کی اطلاع ٹایر پہنچی تو مدافعین کی ہمتیں پست ہوگئیں۔ اب اُن کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا تھا کہ محاصرین سے شرائط صلح کی سلسلہ جنبانی کریں۔ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ ۷/ جولائی ۱۱۲۴ء کو شہر ٹایر کے تمام نوجوان اور صحت مند اشخاص شہر سے باہر نکلے اور فرنگی فوجوں کی دو قطاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بعض نے دمشق کا رُخ کیا اور بعض مختلف مقامات کو راہی ہوئے۔ اس دوران فرنگیوں نے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔ شہر میں صرف کمزور اور بیمار ہی بچ رہے۔

اور گو اس شکست کے نتیجے میں کوئی قتل عام نہیں ہوا لیکن شکست کی ذلت

سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بلق کی موت سے صرف ایل غازی ہی کو زک پہنچی۔ آلیپو میں بلق کے مرنے کے بعد اقتدار الغازی کے بیٹے تیمورتاش کے ہاتھ آیا جس کو ابن الاثیر کے بیان کے مطابق لہو لعب کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اُسے آلیپو سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ جلد از جلد مردان واپس ہونا چاہتا تھا کیوں کہ آلیپو میں رہنے کی صورت میں فرنگیوں سے لڑائیوں کا سلسلہ کبھی ختم ہونے کی امید نہ تھی۔ تیمورتاش نے نہ صرف آلیپو کا تخلیہ کردیا بلکہ صرف ۲۰ ہزار دینار کے بدلے یروشلم کے تاجدار کو رہا بھی کردیا۔ یہی نہیں اُس نے بالدون ثانی کے ساتھ بڑا فیاضانہ برتاؤ کیا۔ اُسے خلعت و دستار زریں۔ اور کفش مرصع سے سرفراز کیا۔ اور وہی اسلحہ اور مرکب اس کے حوالے کیا جس کے ساتھ وہ قید کیا گیا تھا۔ فیاضانہ سہی لیکن بدبختانہ اور ناعاقبت اندیشانہ بھی کیوں کہ اپنی رہائی کے چند ہی ہفتوں بعد یہی بالدون کا فوج کثیر کے ساتھ آلیپو کے دروازوں کے سامنے نمودار ہوا۔

اب شہر آلیپو کے دفاع کی ذمہ داری قاضی الخشب پر آپڑی جس کے پاس دفاع شہر کے لئے صرف چند سو آدمی رہ گئے تھے۔ قاضی الخشب نے ایک ہرکارے کو الغازی کے بیٹے کے تعاقب میں روانہ کیا کہ وہ اس تازہ صورت حال سے اُمید تاش کو واقف کرے الخشیب کا نامہ بردار جان جوکھوں میں ڈال کر فرنگیوں کی نظروں سے بچتا ہوا تیمورتاش کے پاس مردان پہنچا اور اُس سے بہ منت اہل آلیپو کی امداد کی درخواست کی۔ لیکن اُس پر نامہ بردار کی الحاح وزاری کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اُس نے اُسے مقید زندان کردیا۔

اب قاضی الخشب نے مدد کے لئے موصل کے نئے والی ایک ترک امیر برسوقی نے قاضی الخشب کی درخواست پر لبیک کیا اور آلیپو کی طرف روانہ ہوگیا۔ فرنگیوں نے جب برسوقی کی ترک فوجوں کو یوں اچانک اپنے سروں پر دیکھا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ قاضی الخشب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ امیر برسوقی کا استقبال کیا اور اُسے فوراً.. فرنگیوں کا تعاقب کرنے کی صلاح دی۔ لیکن امیر برسوقی اس طویل سفر سے تھک گیا تھا اور اس کے علاوہ اپنے نئے مقبوضہ شہر کے دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی تھی۔ اس لئے اُس نے قاضی الخشب کا مشورہ رد کردیا۔ اور جس طرح پانچ سال پہلے الغازی نے دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کا موقعہ کھو دیا تھا۔ برسوقی نے بھی وہی کیا اور اس طرح فرنگیوں کو پھر اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر بھی موصل اور آلیپو۔ علاقوں کے انضمام سے بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ اور فرنگیوں کے عزائم کی راہ میں ایک

موثر رکاوٹ کی بنیاد یوں ۱۱۲۵ء میں پڑی۔

قاضی الخشب کی بالغ نظری اور جوان ہمتی نے نہ صرف شہر آلیپو کو بچایا بلکہ مستقبل کے غازیان جہاد کے لئے ایسی مشعل روشن کر گیا۔ جو عرصہ دراز تک روشنی اور ہدایت کا منبع بنی رہی۔ لیکن اب الخشب کا وقت آخر بھی آپہنچا تھا ۱۱۲۷ء کے موسم گرما کی ایک شام جب وہ نماز مغرب کے بعد گھر واپس ہو رہا تھا کہ ایک فرقہ پوش نے مصافحہ کے بہانے اس کے قریب پہنچ کر اپنا خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا۔ کہتے ہیں کہ قاتل کا تعلق باطنیوں کے گروہ سے تھا۔ الخشب اس جماعت کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اور اُس فرقے کے لوگوں کے خون سے اُس کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ الخشب کا قتل اُسی کے انتقام میں تھا۔ ایک ثلث صدی تک کوئی شخص باطنیوں کے انتقام سے بچ نہ سکا تھا۔

باطنی فرقہ :- اس فرقہ کا بانی حسن بن صباح ایک نہایت شائستہ اور مہذب انسان تھا۔ اُسے شاعری اور سائنس دونوں سے دلچسپی تھی اُس نے اپنے آپ کو سائنس کے جدید ترین نظریات سے باخبر رکھا تھا۔ ۱۰۹۰ء میں اُس نے اس فرقہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۰۳۴ء میں وہ شہر رئے میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں سے بالکل قریب آجکل طہران واقع ہے۔ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ عمر خیام کا ساتھی اور دوست تھا یا نہیں مخفی مباد کہ عمر خیام خود بھی شاعر مہندس اور ریاضی دان تھا۔

حسن کی ولادت کے زمانے میں شعیت کا بول بالا ہو رہا تھا۔ شام فاطمی خلفا کے زیر نگین تھا اور ایران پر بوئید خلفا کی حکمرانی تھی اور ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ بغداد کے عباسی خلفیہ کو بھی اُن کے حکم کی تعمیل سے انکار کرنا مشکل تھا۔ لیکن حسن کے عنفوان شباب میں داخل ہونے تک حالات نے بہت کچھ پلٹا کھایا اور سارے علاقوں پر سلجوقی ترکون کا قبضہ ہو گیا۔ جو مذہباً سنی تھے۔ اور شعیت کو بس گوارہ کر لیا جاتا تھا۔

اس صورت حال سے حسن بہت کڑہتا تھا کیوں کہ وہ بھی شیعہ تھا۔ ۱۰۸۱ء میں اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ایران کی سکونت ترک کر کے مصر میں رہائش اختیار کریگا۔ کیوں کہ مصر کے فاطمی حکمران شیعہ تھے۔ لیکن مصر پہنچ کر حسن کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ بغداد کے عباسی خلیفہ کی طرح مصر کے فاطمی خلیفہ کی حیثیت بھی ایک کٹھ پتلی کی تھی۔ وہ تو اپنے ارمنی وزیر بدر الجمال کے حکم کے بغیر محل کی چوکھٹ کے باہر قدم بھی نہ رکھ سکتا تھا۔

الافضل اسی کا لڑکا تھا۔ البتہ مصر میں حسن کو اپنے ہم خیال بہت سے لوگ مل گئے جو شیعی خلافت کی اصلاح کے ذریعے سلجوقی ترکوں کا خاتمہ کرنے کے خواہش مند تھے۔

چنانچے جلد ہی اس خیال نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی جس کا سرغنہ خلیفہ کا بڑا لڑکا نثار Nisar تھا۔ یہہ شہزادہ جسے شاہی عیش وعشرت اور لہولعب سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو بہت متقی اور پرہیزگار تھا۔ وزیر الجمال کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے رہنے کو تیار نہ تھا۔ خلیفہ اب کافی ضعیف ہو چکا تھا۔ اور ولی عہد نثار چاہتا تھا کہ اُس نے مرنے کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہوکر اصلی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چنانچے اُس کے لئے قبل از قبل ایک مکمل منصوبہ تیار کرلیا گیا۔ جس کا تیار کرنے والا حسن بن صباح تھا۔ اس منصوبہ کی رو سے حسن سلجوقی علاقے میں فاطمی خلافت کی تائید میں رائے عامہ کی تیاری کا کام انجام دے گا تاکہ اقتدار حاصل ہونے کے بعد خلیفہ نثار کی فوجیں جب سلجوق علاقوں کا رُخ کریں تو اُن کے ہمنوا اور ہی خواہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہوں۔

حسن بن صباح کو اپنے اس مشن میں زبردست کامیابی ہوئی۔ لیکن اس کے لیے اس نے جو طریقے اختیار کئے وہ وہ نہ تھے۔ جو نثار چاہتا تھا۔ ۱۰۹۰ء میں اس نے ایک چھاپہ مار کر قلعہ الایموط پر قبضہ کرلیا۔ یہہ قلعہ کوہ البرز کی ایک دشوار گزار چوٹی پر واقع تھا۔ جہاں تک کسی بڑی فوج کا پہنچنا بہت مشکل تھا۔ یوں اپنے لئے ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کرلینے کے بعد حسن نے ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت کی بنیاد ڈالی جس کے ڈسپلن اور نظم و ضبط کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس جماعت کے سارے ارکان نو آموز سے لے کر گرینڈ ماسٹر تک کے مدارج اُن کے علم وفضل بھروسہ اور ہمت اور بہادری کے لحاظ سے مقرر کیے گئے تھے۔ ان کی مذہبی تعلیم وتربیت اور جسمانی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اپنے حریفوں میں ہراس اور پریشانی پھیلانے کا سب سے موثر ذریعہ حسن نے جو اختیار کیا وہ تھا قتل۔ اس جماعت کے ممبروں میں سے کسی فرد واحد یا شاذ ونادر صورت میں دو یا تین افراد کو کسی کے قتل پر مامور کردیا جاتا تھا۔ یہہ لوگ تاجر یا کسی درویش کے بھیس میں اس شہر میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ جہاں کسی کو قتل کرنا مقصود ہوتا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنے شکار کی عادات واطوار طرز رہائش اور باہر آنے جانے کے اوقات سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر کرلیتے تھے۔ اس طرح تمام ضروری معلومات حاصل کرلینے کے

بعد وہ اپنے شکار پر جھپٹتے اور اس کا کام تمام کردیتے۔ اگرچہ یہہ تمام معلومات خفیہ طریقے سے حاصل کی جاتی تھیں لیکن قتل کا عمل روز روشن میں سب کے سامنے انجام دیا جاتا تھا۔ تاکہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی ہیبت قائم ہوجائے۔ اس لئے اس عمل کے لئے اہم حصہ اور مقام مسجد کا چنا جاتا تھا۔ اس عمل سے حسن کو دو فائدے حاصل ہوتے تھے۔ ایک تو اس کا مخالف دن دھاڑے قتل ہوجاتا تھا۔ دوسرے قتل کرنے والا بڑے فخر کے ساتھ اپنے قاتل ہونے کا اعلان کر کے خود اپنی جان بھی فدا کردیتا اور اس طرح فدائی کہلاتا تھا۔ اور لوگ اُن سے خائف ہوجاتے تھے۔

اس گروہ کے ممبر جس اطمینان قلب کے ساتھ خود اپنی موت کو لبیک کہتے تھے۔ اس کی بنا پر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں حشیش وغیرہ جیسی کوئی چیز پلا دی جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کو حشیشین کہا جاتا تھا۔ جس سے انگریزی لفظ Assassin ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں قاتل۔ یہہ روایت یقیناً قابل قیاس ہے۔ لیکن کیا حسن خود اپنے پیروں کو حشیش پلاتا تھا یا وہ لوگ بطور خود اس کا استعمال کرتے تھے۔ تاکہ اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرسکیں ؟۔ یا وہ اپنے زور بیان کے ذریعہ اُن کی دماغی حالت کو اس حد تک غیر متوازن کردیتا تھا تاکہ وہ اپنا ہوش کھو بیٹھتے تھے ؟۔ یا وہ محض اُن کے ایمان اور یقین پر بھروسہ کر کے اُن سے کام لیا کرتا تھا ؟ اس کا جواب خواہ کچھ ہو۔ خود سوالات ہی حسن کی غیر معمولی ذہنی صلاحیت کے اُمیدوار ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے مشن میں اس کو حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ اس فرقے کے قیام کے دو سال کے اندر اندر ہی پہلے قتل کا واقعہ پیش آگیا۔ جو تاریخ اسلام میں رزمیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایشیا میں سلجوقی اقتدار اپنے پورے بام عروج پر تھا۔ اُن کی سلطنت کا ستون، وہ شخص جس نے ترک بدو دماغوں کی فتوحات کو ایک عظیم سلطنت میں تبدیل کیا تھا۔ جو ایشیا میں سنی اقتدار کے بازاجرا کا موجب اور شیعہ اقتدار کے زوال کا بانی بنا تھا۔ اس کا نام تھا نظام الملک طوسی۔ ۱۴/ اکتوبر ۱۰۹۲ء کو حسن بن صباح کے ایک پیرو نے اُسے روز روشن میں قتل کردیا۔ ابن الاثیر رقمطراز ہے کہ نظام الملک کی موت سے سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور سلجوقی اقتدار اپنی وحدت کو پھر کبھی پانہ سکا۔ اور سلجوقی تاریخ بیرونی فتوحات کے بجائے اندرونی خانہ جنگیوں اور خلفشار کی داستان بن کر رہ گئی۔ اس کارنامے کے بعد حسن بن صباح مع

باقی بر صفحہ ۸

پریس انفارمیشن بیورو

مرکز اور ریاستوں کے تعلقات سے متعلق سرکاریہ کمیشن کی رپورٹ

مرکز اور ریاستوں کے تعلقات سے متعلق سرکاریہ کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پچھلے 37 برس
بی آئین کی کارکردگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اسکیم اور دفعات بنیادی طور پر صحیح ہیں اور اسے کہ ڈھانچے
بی کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم رپورٹ میں مرکز اور ریاستوں کے درمیان روابط کے عملی پہلوؤں
میں بعض تبدیلیوں کی سفارش کی گئی ہے۔

کمیشن نے کہا ہے کہ بھارتی حالات میں طاقتور مرکز کا ہونا نہ صرف ملک کی آزادی، سالمیت اور
اتحاد کے تحفظ کے لئے ضروری ہے بلکہ قومی مفاد کے بنیادی مسائل کے بارے میں مربوط پالیسی کے تال
میل کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مرکز مضبوط ہو۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ آئین سازوں کے سامنے
آئین کی تشکیل کے وقت مرکز کو اہم رول دینے کی جو بنیادی محرکات تھے۔ ان کی معنویت آج بھی ختم نہیں
ہوئی ہے۔ اور مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات سے متعلق مسائل کا جائزہ لیتے وقت انہیں ذہن
نشین رکھنا ہوگا۔ آئین کے ذریعہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم میں ایک مضبوط
مرکز کی ضرورت اور ریاستوں کی خود مختاری دونوں کا ہی خیال رکھا گیا ہے۔

کمیشن نے مرکز اور ریاستوں کے درمیان خوشگوار روابط کو یقینی بنانے کے لئے ڈھانچے میں
تبدیلی کئے بغیر عملی پہلوؤں میں کچھ رد و بدل کئے جانے کے بارے میں تجاویز اور سفارشات کی ہیں ان
میں سے زیادہ اہم تجاویز کا تعلق گورنر کی تقرری سے قبل متعلقہ وزیر اعلیٰ سے صلاح مشورہ صدر
کو منظوری کے لئے بھیجے گئے ریاستی بلوں اور ہائی کورٹوں کے ججوں کے تقرر میں تاخیر کو دور کرنے مرکز
اور ریاستوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے آئین کی دفعہ 263 کے تحت بین ریاستی کونسل تشکیل
دینے، مشترکہ فہرست درج امور کے بارے میں قانون سازی کے سلسلے میں احتیاط برتنے اقتدار
کو زیادہ سے زیادہ غیر مرکوز کرنے، ریاستی فہرست کے امور سے متعلق مرکزی اسکیموں پر

پابندی عائد کرنے قومی ترقیاتی کونسل منصوبہ بندی کمیشن اور آل انڈیا سروسیز جیسے اداروں کو مستحکم کرنے سے ہے۔

ریاستی سرکار اور سیاسی پارٹیوں وغیرہ سے موصولہ میمورینڈا اور عرضداشتوں پر مبنی اور 4,900 ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل کی اس رپورٹ کو گذشتہ روز یہاں عام کیا گیا۔ یہ کمیشن جون 1983 میں جسٹس آر ایس سرکاری کی قیادت میں تشکیل کیا گیا تھا۔ ارکین ڈاکٹر بی سوامن اور شری ایس آر سین تھے۔ اس کمیشن کو تمام شعبوں میں اختیارات، کارکردگی اور ذمہ داریوں سے متعلق مرکز اور ریاستوں کے موجودہ انتظامات کا جائزہ لینا اور اس سلسلے میں مناسب تبدیلیوں اور اقدامات کی تجویز پیش کرنا تھی۔

رپورٹ میں جن امور پر توجہ دی گئی ہے وہ عاملانہ، قانون سازی اور انتظامی شعبوں میں مرکز اور ریاستوں کے روابط سے براہ راست متعلق ہیں۔ اس کی رپورٹ میں شامل بعض امور میں مرکز اور ریاستوں کے درمیان نیز ریاستوں کے مابین تال میل، گورنروں، ایمرجنسی سے متعلق دفعات، مرکزی افواج کی تعیناتی صدر جمہوریہ کے غور و خوض کے لئے ریاستی بلوں کو روکنا اور آل انڈیا سروسیز شامل ہیں۔ رپورٹ میں ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی سے متعلق امور بشمول مالی روابط اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی، بین ریاستی تجارت، دریاؤں سے متعلق بین ریاستی تنازعے، معدنیات، جنگلات اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ کمیشن نے کل ملا کر 247 سفارشات کی ہیں۔

قانون سازی سے متعلق روابط:- قانون سازی کے شعبے میں کمیشن نے دفعہ 246 اور 254 کے تحت مرکز اور ریاستوں کے مشترکہ امور میں پارلیمنٹ کی بالادستی کو اصولی طور پر صحیح مانا ہے۔ قانون سازی سے متعلق فہرست میں ترمیم کے لئے بعض ریاستی سرکاروں نے تجویز پیش کی تھی۔ کمیشن کا خیال ہے کہ ڈھانچے میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سے قومی مفاد کے امور پر مرکز کو ایک مربوط یکساں پالیسی اپنانے میں دشواری ہوگی۔ لیکن کمیشن نے ریاستوں کو زیادہ اختیارات دینے کے لئے آئین میں بعض ترامیم کی سفارش کی ہے۔ ان میں ایک ایسی بھی ترمیم شامل ہے جس کی رو سے ریاستیں اپنے اختیارات کی فہرست میں شامل امور کے بارے میں پارلیمانی قانون کو صدر کی منظوری سے ترمیم کر سکیں اور پارلیمانی قوانین پر تین برس کی حد بندی عائد کر سکیں۔ رپورٹ میں مرکزی فہرست میں اندراج نمبر 97 کو [illegible] کرنے کی سفارش کی گئی ہے تاکہ ٹیکس عائد کرنے سے متعلق اختیارات کے علاوہ باقی ماندہ امور بھی مشترکہ فہرست میں شامل کئے جائیں۔

کمیشن نے سفارش کی ہے کہ پارلیمنٹ کو مقامی اداروں کے انتخاب پابندی سے کرانے اور

ان کی مناسب کارکردگی کو یقینی بنانے کے لئے قانون سازی کے اختیارات بھی ہونے چاہیئں -

مشترکہ فہرست میں درج امور پر قانون بنانے کے لئے مرکز کے ذریعہ ریاستوں سے مشورہ لینے کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے کمیشن نے سفارش پیش کی ہے کہ اس سلسلے میں مضبوط روایت پر عمل کیا جانا چاہیئے - کمیشن کے خیال میں "جنگلات" کے شعبے کو ریاستی فہرست میں منتقل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے -

عاملانہ اختیارات :- کمیشن نے کہا ہے کہ دفعات 256 میں عاملانہ امور میں مرکزی بالادستی کا اصول ایسے ہی برقرار رہنا چاہیئے - لیکن کمیشن نے مرکزی حکومت کے اختیارات کو بتدریج غیر مرکوز کرنے کے لئے دفعہ 258 کے وسیع تر اور زیادہ فراخدلانہ استعمال کی سفارش کی ہے

کمیشن نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ کسی شخص کے ریاستی گورنر کی حیثیت سے تقرر سے پہلے وزیر اعلیٰ سے مشورے کو ضروری بنانے کے لئے اس کو آئین میں درج کیا جانا چاہیئے - کمیشن نے کہا ہے کہ اگر صحیح شخص کو گورنر کی حیثیت سے منتخب کیا جائے تو گورنر کے عہدے پر ہونے والی تنقید کافی حد تک ختم ہو جائے گی - اس کے علاوہ گورنر کو عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد گورنر یا نائب صدر کے علاوہ منفعت کے کسی اور عہدے پر فائز ہونے کا حق نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہی اسے سیاست میں آنا چاہیئے -

کمیشن نے وزیر اعلیٰ کی تقرری اور وزارت کی برخاستگی سے متعلق اصول بھی وضع کئے ہیں - لیکن کمیشن کی نظر میں گورنر کے اختیارات کے استعمال کے لئے رہنما اصول وضع کرنا قابل عمل نہیں ہے -

ریاستی بلوں کو منظوری کے لئے مرکز کے پاس بھیجنے کے گورنر کے اختیارات کے موضوع پر کمیشن نے مرکز اور ریاستوں کو ہدایت کی غرض سے مفصل تجاویز پیش کی ہیں جن میں اس طرح بلوں کے سلسلے میں وقت تعین کئے جانے کی بھی سفارش کی گئی ہے -

ایمرجنسی اور صدر راج :- ایمرجنسی سے متعلق اختیارات اور صدر راج سے متعلق قواعد (آرٹیکل 352، 355 اور 356) کا جائزہ لیتے ہوئے کمیشن نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مذکورہ قواعد قومی سالمیت کو یقینی بنانے کے لئے وضع کئے گئے تھے نہ کہ مرکز کو ضرورت سے زیادہ اختیارات دینے کے لئے -

آرٹیکل 356 کے تحت مخصوص صدر راج کے نفاذ کا حوالہ دیتے ہوئے کمیشن نے کہا ہے کہ اگرچہ یہ اختیار ضروری ہے تاہم اس کا استعمال بہت کم اور صرف ان ہی سنگین نوعیت کے معاملات

میں کیا جانا چاہیے جب دستیاب متبادل اقدامات آئینی مشنیری کی مکمل طور پر ناکامی کو روکنے میں ناکام رہے ہوں۔ کمیشن نے کہا ہے کہ 1977 اور 1980ء میں جو صدر راج نافذ کیا گیا تھا اس کا زیادہ تر حصہ واضح طور پر غیر مناسب تھا۔ کمیشن نے ایسے کچھ حالات کا ذکر بھی کیا ہے جہاں کے اسطرح کے نفاذ کو جائز قرار دیا جاسکے۔ اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے کمیشن نے مزید کہا کہ گورنر کی رپورٹ میں تمام متعلقہ حقائق کی واضح تفصیل ہونی چاہیے اور رپورٹ کی بڑے پیمانے پر پبلسٹی (تشہیر) کی جانی چاہیے آئین دفعہ 356 میں ترمیم کی تجویز رکھی گئی ہے جس کے تحت صدر راج کی نفاذ کی صورت میں اس کو جائز قرار دینے سے متعلق تمام حقائق اور وجوہات کی تفصیل ہونی چاہیے۔ کمیشن کی تجویز ہے کہ صدر راج کا نفاذ کرنے کی صورت میں قانون ساز اسمبلی کو اس اقدام کی پارلیمنٹ کی طرف سے منظوری دئے جانے سے قبل توڑا نہیں جانا چاہیئے۔

جہاں تک مرکز کی طرف سے مسلح افواج کے استعمال کا سوال ہے کمیشن نے کہا ہے کہ یہ طے کرنے کا اختیار کلی طور پر مرکز کو حاصل ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ آیا حالات ایسے ہیں کہ اسے اپنی مسلح افواج کو ریاست میں تعینات کرنا چاہیئے یا نہیں تاہم اپنی مسلح افواج تعینات کرنے سے قبل متعلقہ ریاست سے پوچھ لینا زیادہ بہتر ہوگا یا پھر مسلح افواج کی تعیناتی ریاست کی درخواست پر ہی کی جانی چاہیئے۔

آل انڈیا سروسیز:۔ کمیشن نے آل انڈیا سروسیز کے ادارے کو آج بھی اتنا ہی اہم مانا ہے جتنا کہ آئین سازی کے وقت یہ ادارہ تھا۔ کمیشن نے مذکورہ سروسیز کو مزید مستحکم بنانے اور ان خدمات کے سلسلے میں مرکز اور ریاستوں کے مابین مسلسل صلاح و مشورے کی بھی سفارش کی ہے۔ کمیشن نے اس مقصد کے لئے کیبنٹ سکریٹری کی قیادت میں ایک مشاورتی کونسل تشکیل دئے جانے کی بھی تجویز پیش کی ہے۔ کمیشن نے یہ بھی تجویز رکھی ہے کہ ریاستوں کو مزید آل انڈیا سروسیز کی تشکیل کے لئے رضامند کیا جانا چاہیئے۔

مالیاتی تعلقات:۔ کمیشن نے آئین میں ترمیم کی تجویز رکھی جس کے ذریعہ پارلیمنٹ کارپوریشن کے ٹیکس میں حصہ دار ہو جائے گی۔ کمیشن نے انکم ٹیکس اور ایکسائز ٹیکس میں حصہ داری کے لئے بھی مناسب تجاویز پیش کی ہیں۔ کمیشن نے آئین کی ترمیم کے ذریعہ آرٹیکل 269 کے تحت نشریات کے اشتہارات پر عائد ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی بھی سفارش کی ہے۔ کمیشن نے پیشو اور تجارتوں پر عائد کئے جانے والے ٹیکس کی حد بندی میں اضافے کی تجویز بھی رکھی ہے۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ انکم ٹیکس میں عائد ہونے والا سرچارج مخصوص

فاصد اور معینہ مدت کے لئے ہونا چاہیئے۔ خصوصی محصول ایک معینہ مدت اور مخصوص مقاصد کے لئے عائد کیا جانا چاہیئے۔

کمیشن نے مخصوص اشیاء کی درج شدہ قیمتوں کی تجدید اور بڑی وصولیوں مثلاً کمپلیری پیلانٹ سے ہونے والی آمدنی میں اشتراک کی تجویز کو منظور نہیں کیا ہے۔ کمیشن نے چند ریاستوں کے ذریعہ مجوزہ اختراعاتی کمیشن کے قیام کی تجویز سے بھی اتفاق نہیں کیا ہے۔

کمیشن نے تجویز رکھی ہے کہ ریاستوں کو ریل کے مسافروں سے ہونے والے کرایے کی آمدنی کے بدلے میں مالی امداد دی جانی چاہیئے جیسا کہ مالیاتی کمیشن نے سفارش کی ہے۔ کمیشن نے معدنیات وغیرہ پر عائد رائلٹی کی شرح پر چار سال میں ایک بار کی بجائے دو برسوں میں ایک بار نظرثانی کئے جانے کی تجویز رکھی ہے۔ کمیشن نے ریاستوں کی جانب مقررہ شدہ رقم سے زیادہ حاصل کرنے، خزانے کے نظام کی جدید کاری اور ریاستوں کو غیرملکی زرمبادلہ دیئے جانے کے سلسلے میں بھی تجاویز پیش کی ہیں۔ کمیشن نے سفارش کی ہے کہ مرکز کو ریاستوں کو ایک سال سے کم مدت کے لئے بینکوں وغیرہ سے قرض حاصل کرنے کی اجازت دے دینی چاہیئے ٹیکس سے میونسپل بانڈوں کا سلسلہ شروع کیا جانا چاہیئے۔ قدرتی آفات کی صورت میں امداد کے لئے ریاستوں کو امدادی فنڈ کی رقموں کو اپنے طور پر استعمال کرنے کے اختیار دے جانے سے چاہیئں اور ان فنڈوں کے استعمال ہیرا پھیری اور غبن سے متعلق معاملات کے سلسلے میں سخت سزائیں دی جانی چاہیئں۔

کمیشن نے مرکز اور ریاستوں کے ٹیکس کے ذرائع اور وسائل میں اضافے کی غرض سے اصلاحات کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کئے جانے کی سفارش کی ہے۔ کمیشن نے حکومت کی جانب سے دی جانے والی رعایتوں پر ایک جامع مقالہ تیار کئے جانے اور اقتصادی پالیسیوں میں تال میل پیدا کرنے کے سلسلے میں مناسب اقدامات تجویز کرنے کے لئے اور مالیاتی امور میں مکمل اتفاق رائے کو یقینی بنانے کے لئے ایک سرکاری کمیٹی کے قیام کی تجویز بھی رکھی ہے۔

مالیاتی کمیشن کے اہم رول کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی موثر طور پر کارکردگی کے لئے تفصیلی تجاویز رکھی گئی ہے۔ سرکاریہ کمیشن نے تجویز رکھی ہے کہ اختیارات اور شرائط ریاستوں سے صلاح مشورے کے بعد طے کی جانی چاہیئں اور سفارشات پر عملدرآمد میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔

منصوبہ بندی کمیشن: کمیشن نے منصوبہ بندی کمیشن کی کارگردگی کو بہتر

بنانے کے لئے متعدد تجاویز پیش کی ہیں جن میں ہر مرحلے پر ریاستوں کے ساتھ مکمل اور کارگر مشورے کرنا اور ریاستوں کو ترجیح دینے کے لئے اچھی روایتیں قائم کرنا شامل ہے -

سرکاریہ کمیشن نے قومی ترقیاتی کونسل کا نام بدل کر معاشی اور ترقیاتی قومی کونسل رکھے جانے کی تجویز پیش کی ہے جو سیاسی سطح پر سب سے اعلیٰ بین حکومتی تنظیم کے طور پر کام کرے گی اور یہ کونسل منصوبہ بند ترقی کو ایک سمت اور رفتار عطا کرے گی - مذکورہ کونسل کو آئین ہند کی دفعہ 263 کے تحت آئینی حیثیت دی جانی چاہیئے - مذکورہ کونسل کو شروع سے ہی منصوبوں کی تشکیل کے کام میں شامل کیا جانا چاہیئے اور اس کو وسائل کی تلاش اور ان کے استعمال کے سوال پر اتفاق رائے پیدا کرنے سے متعلق ایک ادارے کے طور پر کام کرنا چاہیئے -

سرکاریہ کمیشن نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے - مرکزی سرکار کی جانب سے قرضے کے طور پر رقوں اور اخراجات کے لئے رقم مخصوص کئے جانے کے نظام کی نظرثانی بھی کی جانی چاہیئے - مرکزی سرکار کی اسکیموں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان اسکیموں کی تعداد کم سے کم رہنی چاہیئے اور ان اسکیموں کی عمل آوری میں مثلاً ان اسکیموں سے کن افراد اور شعبوں کو فائدہ پہنچنا چاہیئے اور ان اسکیموں کی تشکیل کیا ہونی چاہیئے اس کام میں ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کیا جانا چاہیئے -

بین ریاستی کونسل :- مذکورہ کمیشن نے آئین کی دفعہ 263 کے تحت ایک بین ریاستی کونسل کو بحیثیت ایک مستقل ادارے کے قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے - مذکورہ کونسل مختلف معاملوں کے علاوہ سماجی و معاشی منصوبہ بندی اور ترقی کے معاملات طے کرے گی - یہ کونسل خود سے یہ طے کرے گی کہ اس کے سامنے کون سے مسائل پیش کئے جاسکتے ہیں - اور کونسل کے ممبران میں وزیر اعظم، کابینہ کے دیگر مرکزی وزراء اور سبھی وزراء اعلیٰ شامل ہو سکتے ہیں - کمیشن کا یہ خیال ہے کہ علاقائی کونسلیں اہم ثابت ہو چکی ہیں اور انہیں پھر سے متحرک کئے جانے کی ضرورت ہے -

بین ریاستی دریاؤں کے تنازعوں کو حل کرنے کی غرض سے طریقہ کار کو بہتر بنانے کے لئے بھی متعدد اقدامات تجویز کئے گئے ہیں - مذکورہ کمیشن نے دریاؤں کے بین ریاستی ٹریبونلوں سے متعلقہ قانون میں ترمیم کرنے کی سفارش کی ہے تاکہ اس فیصلے کو اس صورت میں پانچ برسوں کے اندر لاگو کئے جانے یقینی بنایا جاسکے جب تک کہ مرکز اس مدت میں توسیع نہ کردے ساتھ ہی ایسے سپریم کورٹ کے ایک فرمان حیثیت حاصل ہونی چاہیئے -

صنعت اور تجارت :- صنعتی لائسنسوں کے اختیارات کے شعبے میں کمیشن نے

بہت زیادہ اختیارات دینے کے دلائل کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ مرکزی حکومت کو صنعتی شعبے میں مداخلت سے زیادہ سے زیادہ گریز کرنا چاہیئے۔ کمیشن نے کسی صنعت پر مرکزی کنٹرول کے سلسلے میں ہر تیسرے سال نظرثانی کرنے اور اس کنٹرول کو پوری صنعت کے بجائے کچھ مخصوص شعبوں تک بھی سفارش کی ہے

ریاستوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً بات چیت ہوتی رہنی چاہیئے تاکہ رائلٹی کی شرحوں کی نظر ثانی اور ریاستوں کے ذریعہ محصول وغیرہ لگائے جانے سے متعلق تنازعات کا حل تلاش جاسکے نظرثانی کی درخواستوں پر انتظامیہ کی بجائے عدالتی ٹربیونلوں کے ذریعے فیصلے دیے جانے چاہیئے۔

کمیشن نے بین ریاستی تجارت اور بیوپار پر پارلیمانی کنٹرول پر کی حمایت کی ہے جیساکہ کہ آئین میں درج ہے۔ تاہم کمیشن یہ محسوس کرتا ہے کہ آئین کی دفعہ 307 کے تحت ماہرین پر مشتمل ایک مشاورتی اتھارٹی تشکیل دی جانی چاہیئے جو تجارتی آزادی کے معاملے کی دیکھ بھال کرے۔

عوامی ذرائع ابلاغ اور زبان:- کمیشن نے نشریات کے موضوع کو مشترکہ فہرست یا ریاستی فہرست میں منتقلی کے لئے اپنی مخالفت کا اظہار کیا ہے۔ نشریاتی ذرائع ابلاغ کو مکمل خود مختاری دیے جانے کے مطالبہ کی مخالفت کرتے ہوئے کمیشن نے کہا ہے کہ عوامی ذرائع ابلاغ کیونکہ ایک بہت ہی طاقتور اور بااثر حیثیت کے حامل ہیں اس لئے انھیں پوری عملی آزادی دینے کے بارے میں سوچنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ تاہم یہ کہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں اختیارات کو زیادہ سے زیادہ غیر مرکوز کیا جانا چاہیئے اور روزمرہ کے معاملات میں آزادی ہونی چاہیئے اور قومی مفاد اور ریاستوں و عوام کی آرزوؤں اور ضرورتوں کے درمیان ایک ایک توازن قائم رکھا جانا چاہیئے۔ قومی پروگرام اور سیاسی نشریات سے متعلق بنیادی اصول مرتب کرنے کے لئے چند تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

کمیشن نے محسوس کیا ہے کہ زبان کے معاملات کو سیاسی رنگ دینے سے ملک کی سالمیت اور اتحاد خطرے میں پڑا ہے۔ کمیشن نے اس سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کی ہے۔ کمیشن نے کہا ہے کہ سہ لسانی فارمولے کو اس کی حقیقی شکل میں یکساں طور پر لاگو کرنا ہے۔

دیگر تجاویز:- کمیشن نے آئین میں ایک ترمیم کی تجویز بھی پیش کی ہے جس کے تحت ہائی کورٹوں کے ججوں کی تقرری کے سلسلے میں مشاورتی رول رکھنے والے اداروں کے لئے اس کام کی تکمیل کے لئے ایک مدت کا تعین کیا جائے گا۔

ایوان بالا کے قیام اور اس کے توڑے جانے سے متعلق قانون پارلیمنٹ کا فیصلہ ہونا چاہیئے نہ کہ عاملانہ کا - دفعہ 285 کے تحت قانون کو مرکز کی ذمہ داریوں کے تحت ریاستوں میں ٹیکس لگانے کے لئے نافذ کیا جانا چاہیئے - ریاستوں کو اشیاء کے کنٹرول میں بہتر رول ادا کرنا چاہیئے۔

کمیشن کو دوسرے مسائل کے بارے میں بھی بہت سی تجاویز موصول ہوئی ہیں بعض میں بہت کم اہمیت والی تجاویز بھی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن میں غیر معمولی تبدیلیوں کی سفارش کی گئی ہے - کمیشن نے ان تمام تجاویز کا وسعت نظری کے ساتھ تفصیلی جائزہ لیا ہے کمیشن کو یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ مرکز کے اختیارات کو صرف دفاع غیر ملکی تعلقات کو کرنسی اور عام ترسیلات تک ہی محدود ہونا چاہیئے اور تمام دیگر اختیارات ریاستوں کو سونپ دئے جانے چاہیئے - ان تجاویز کے مکمل اور واقعی جائزہ کے بعد کمیشن نے کہا ہے کہ دنیا میں کہیں بھی ایسا مرکز یا وفاق نہیں ہے جہاں قومی حکومت کے پاس مالی وسائل اپنے ذاتی ہوں جو اس کے یونٹوں سے علیحدہ ہوں - اگر اس طرح کی کوئی انقلابی تبدیلی عمل میں لائی گئی تو ملک ایک متحد قوم کے طور پر برقرار نہیں رہ سکتا - آئین کی بنیادی اسکیم اور ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کمیشن کے اختیارات کی حدود سے باہر ہوں گی نیز دفعہ 368 میں آئین کی ترمیم کے اختیارات دیے گئے ہیں - ان کی حدود سے بھی وہ باہر ہوں گی -

رپورٹ کی کاپیاں پارلیمنٹ کی لائبریری میں رکھدی گئی ہیں - انہیں مرکز اور ریاست کی متعلقہ وزارتوں کو بھی روانہ کیا جارہا ہے - ان سفارشات پر پارلیمنٹ ریاستی حکومتوں اور عوام کے ذریعہ غور و خوض کئے جانے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا ۔

بلقیس شینہ

ٹوٹی طناب

ارشق نے گھر کی دہلیز میں قدم رکھا اور اُسے ایک زوردار چھینک آئی۔

فروزاں آپا کا مشین کے پیڈل پر چلتا ہوا پاؤں رُک گیا انہوں نے داہنے ہاتھ سے گھومتے ہوئے پہیے کو روک کر سر اوپر اُٹھا کر دیکھا ارشق پانی میں شرابور کھڑا تھا۔ آپا کی نظر پڑتے ہی وہ کھسیا کر کمرے کی جانب مڑ گیا۔ فروزاں نے پلٹ کر بہن کی طرف دیکھا۔ وہ آرام کرسی میں دھنسی ابن صفی کی کوئی ناول پڑھنے میں منہمک تھی۔

"رخشاں! ارشق آئے ہیں"۔ آپا نے اسے آگاہ کیا

"ہونہہ"۔ کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر رخشاں نے بے دلی سے کہا۔

"سنا تم نے"؟ آپا تھوڑا درشتی سے بولیں "وہ پانی میں بھیگ کر آئے ہیں"۔

"اچھا ..." اسنے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر آپا کی طرف دیکھا اور پھر پڑھنے لگی۔ کمرے سے ارشق کے پھر چھینکنے کی آواز آئی۔

"کتاب رکھو اور انھیں جاکر دیکھو"۔ آپا خود بھی کرسی پیچھے کھسکا کر مشین سے اٹھتی ہوئی بولیں "انہیں چھینکیں آرہی ہیں"

"اُفوہ"۔ رخشاں کتاب پٹک کر جھلائی۔ "کہیں بارش رکنے کا انتظار کیوں نہیں کرلیا۔ گھر آنے کی ایسی بھی کیا جلدی پڑی تھی۔ گاڑی تو نہیں چھوٹی جارہی تھی"۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے بچاؤ کو الفاظ کی مورچہ بندی کرنے لگی۔

"بارش کے موسم میں جب کوئی باہر جائے تو اُسے چھاتا یا رین کوٹ دینا یا لے جانے کی یاد دہانی کرانا خاتونِ خانہ کا کام ہے"۔ آپا کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا تھا۔ اور رخشاں کو ان کی یہی باتیں ناگوار لگتی تھیں۔ عورت کی ذمہ داری، عورت کے فرائض، عورت کے آدرش....

وشہشرد، سیر، آکولہ 444002 مہاراشٹرا۔

کیا مرد کا کوئی آدرش نہیں ؟ کوئی ذمہ داری نہیں ...... ؟

اب تو یہ ارشق کا کام تھا کہ باہر جاتے وقت چھاتا لے جائے ــــ اب وہ کوئی بچہ تو نہیں کہ میں ان کے ہاتھ میں کتابوں کا بیگ اور چھاتا بغل میں دیکر انگلی تھامے دروازے تک رخصت کروں ...... عورت سے خدمت لینے کے معاملے میں مرد ننھے بچے کی طرح معصوم بھولا اور کمزور بن جاتا ہے باقی پھر دوسرے معاملوں میں بڑا سیانا ۔ اپنی برتری جتانے والا عورت کو ناقص العقل کمزور بزدل کہنے والا ...... وہ دل ہی دل میں بڑبڑائے ۔

اگر آپا کے سامنے اپنے اِن خیالات کا اظہار کرتی تو آپا پھر نصیحت کا پلندہ کھول بیٹھیں ۔

وہ کمرے میں آئی ۔ ارشق ناول سے اپنے گیلے بال خشک کر رہا تھا اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ ناول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور خود اُس کے بال پونچھنے لگی ۔

ار رے ...... ارشق بری طرح تلملایا " یہ تم بال پونچھ رہی ہو یا نوچ رہی ہو "

رخشی نے تولیہ دور پھینک دیا اور الماری میں سے کرتہ پاجامہ نکال کر پلنگ پر رکھتی ہوئی بولی " یہ بدل لیجئے "

اتنے ہی میں آپا نے دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی نوراں کے ہاتھ کمرے میں بھجوادی آپا کے احتیاط کی بھی حد ہو گئی " ارشق انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگا ۔

کچھ دیر بعد ہی نوراں گرم گرم پکوڑے اور چائے لے آئی ۔ کیتلی کی نکلتی ہوئی بھاپ سے ادرک کی خوش ذائقہ چائے کی خوشگوار بو سے کمرہ مہک اٹھا ۔ ارشق نے اُچک کر پکوڑا منہ میں رکھا " بے حد لذیذ ...... " وہ منہ چلاتے ہوئے بولا ۔

" بھلا آپا کوئی چیز پکائیں اور وہ لذیذ نہ ہو " رخشاں کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ ارشق کو اندازہ نہ ہو سکا کہ اُس کے لہجے میں طنز ہے یا ستائش ۔

" آہا ! " چائے کی چسکی لگا کر ترنگ میں بولا " آج تو پانی میں بھیگنے کا مزہ آگیا "

ارشق بیوی کی طرف دیکھنے لگا لیکن رخشاں نے کوئی جواب نہ دیا جیسے کچھ سنا نہ ہو دراصل وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی ۔ ناول پڑھنے کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا تھا ۔ رم جھم برستے موسم میں دلچسپ جاسوسی ناول ...... لیکن ارشق نے اُس کا موڈ آف کر دیا تھا ۔

رخشاں کو بس یونہی سا بخار تھا ۔ ارشق یہاں فوزاں آپا کو خط لکھنے بیٹھے

تو برسبیل تذکرہ یہ بھی لکھ مارا۔ اور بے چاری آپا دوڑی چلی آئیں۔ یہ بھی نہ دیکھ کہ بچی کا امتحان شروع ہے ساس بیمار ہے ۔ ۔ ۔ چھوٹی بہن کے لیے ان کے دل میں بے پناہ محبت تھی۔

بس اک نظر اپنی رخشی کو دیکھ آؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور یاں جو آئیں تو بس ادھر کی ہو رہیں۔ بہن کی بکھری ہوئی گرہستی کو جتانے میں بھڑ گئیں۔

کبھی چھتوں سے جالے نکال رہی ہیں تو کبھی دیوار و در صاف کر رہی ہیں۔ کبھی کیاریاں بنا رہی ہیں تو کبھی پودوں کی سینچائی ہو رہی ہے۔ تمام دن مصروف، ان کے ہاتھوں کو چین نہیں ہے، مشین پر بیٹھ کر سلائی کر لی، تو کبھی ادھورے پڑے سوئیٹر کو مکمل کر لیا۔ اُدھڑے ہوئے لحاف دُرست کر ڈالے۔ اک پل کو بھی آرام نہیں۔ رات میں آدھی رات تک بیٹھیں رخشاں کے نئی ساڑیوں پر فال ٹکائی ہو گئی۔

غرض ان چند دنوں میں فروزاں آپا نے ڈھیروں کام کر ڈالے جنھیں رخشاں مہینوں میں تو کیا سالوں میں بھی نہ کر پاتی۔ بلکہ اس میں یہ سب کرنے کی دھمک ہی نہ تھی۔

جس دن سے آپا آئی تھی۔ سارے گھر کو جھاڑ جھنکاڑ کے گلزار کر دیا تھا۔ بڑی نفاست تھی اُن کی مزاج میں۔ اور غضب کی پھُرتی تھی ہاتھ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ذرا سی تھکی بھی چہرہ پر بشاشت لبوں پہ تبسم، اللہ میاں نے فروزاں آپا کو جانے کونسی مٹی سے بنایا تھا اُن کے رخشاں کے کردار گفتار اور مزاج میں زمیں آسمان کا فرق تھا۔ آپا جتنی کم گو، محنتی، خوددار اور ایثار کرنے والی تھیں۔ رخشاں اُن کے برعکس باتونی، آرام طلب، خودغرض اور تنک مزاج لڑکی تھی۔ بہن بھائیوں میں بڑی ہونے کے ناطے آپا میں بہت بڑا پن تھا۔ فطری طور پر زمانہ ساز بھی تھیں۔ اور جب سے بیوہ ہوئی تھیں۔ اور زیادہ بزرگی اور بردباری ہو گئی تھی۔ تیس پینتیس کی عمر میں اپنے آپ کو سن رسیدہ سمجھنے لگی تھیں۔ سفید ململ کی ساڑی، کلائیوں تک آستین کا بند گلے کا بلاؤز، پیشانی تک ڈھکا ہوا آنچل، مجال ہے جو کسی مرد کے سامنے ڈھلک جائے۔ شرم و حیا ایسی کہ رشتے کے مردوں سے بھی شاذونادر ہی بات کریں۔

سلیقہ اور ستھرائی کے بارے میں انھوں نے رخشاں کو بھی بہت تاکید کی۔

"تمہارے گھر میں کوئی بچہ نہیں۔ پھر یہ گھر کا سامان جہاں وہاں کیوں بکھرا پڑا ہے؟ کوئی چیز ٹھکانے نہیں۔ تم کیا کرتی رہتی ہو دن بھر؟"

"ساری افراتفری کے ذمہ دار ارشق ہیں آپا۔: وہ کیا کسی بچے سے کم ہیں، شیونگ کیس بستر پر، بلیڈ اور برش واش بیسن میں، جوتے اسٹول پر تو موزے سرہانے، رومال شب میں، لنگی کے بجائے چادر لپیٹ لی۔ تاول کے بجائے پردے سے منہ ہاتھ پونچھ لئے۔ رخشاں نے شوہر کی عیب جوئیاں شروع کردیں۔ سر میں تیل ڈالیں گے تو آدھا تیل ہتھیلی پر اور آدھا فرش یا بستر، قالین پر، شیشی کا ڈھکنا سدا کھلا چھوڑ دیں گے۔ اور کنگھا تو انکی کنگھی کرنے کے بعد ایسا غائب ہوتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ قسم لے لو جو کوئی چیز ٹھکانے رکھی ہو کبھی.....
وہ سر پر ہاتھ مار کر بیزاری سے بولی "کھڑے کھڑے کھانا کھالیا۔ بیٹھے بیٹھے اونگھ لے لی، لیٹے لیٹے میں گا رہے ہیں، کوئی حد بھی ہے .... میرا تو ناک میں دم آگیا ان بے اصولیوں سے بی.... !! آپا ملائمت سے بولیں۔ "گھر کی صفائی اور سامان کو سیٹ کرنا عورت کی ذمے داری ہے۔ اسی کا نام سلیقہ مندی ہے۔ گھر کو سجانے سنوارنے اور صفائی سے مرد کو کیا سروکار بھلا! گھر والی کس لئے ہوتی ہے؟"

آج پھر جمیلن نہیں آئی۔ جانے کیا آفت ٹوٹ پڑی مردار پر" رخشی کچن میں بڑبڑانے لگی۔
"شاید بیمار ہو"۔ آپا برامدے میں سے بولیں۔
"ارے نہیں ....: بڑی حیلہ جو ہوتی ہیں یہ عورتیں"۔ جھوٹے برتن اک طرف پھینکتی ہوئی وہ جھلا کر بولی۔
"آخر انھیں بھی تو دکھ بیماری لگی رہتی ہے رخشی، وہ بھی تو انسان ہیں"۔ فرزاں آپا کچن کی طرف آنے لگی۔
آپا بے چاری کیا جانیں نوکروں کی نفسیات۔ اپنے گھر میں کبھی انھیں نوکروں سے سابقہ پڑا ہی نہیں، رخشی دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ آپا کچن میں آئیں تو وہ ان سے بولی۔
"آپا! آپ اِن نوکرانیوں کی چالبازیاں نہیں سمجھ پائیں گی۔ جب آئے گی تو مسکین صورت بنا کر بولے گی "بی بی! میکو کل بوکھار آیا تھا" وہ جمیلن کے سے لب و لہجے میں بولی "مکار!! میں تو اِن فاقہ مستوں کی رگ رگ سے واقف ہوں"۔ وہ دانت پیستی ہوئی بولی۔
"اچھا بس اب ختم بھی کرو" آپا بات ٹالنے کے لئے بولیں۔ "تم تو نہ الجھو۔"
"کیسے نہ الجھوں" وہ اور زیادہ جھلا کر بولی۔ سارا کام پڑا ہے کھانا تیار نہیں ہوا اور ارشی آتے ہی ....
"لو بھئی ہم آگئے"۔ اچانک ارشق نمودار ہوتے ہوئے بولا "ٹیک دی نیم آف ڈیول

اینڈ ہی از ڈیر" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تم جاؤ۔" آپا رخشاں کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ "نوراں سے کہو ٹیبل پر کھانا لگائے۔ میں پھولکے سینک کر بھجواتی ہوں۔" وہ جھکی بیلن سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

"نوراں ......!! اری وہ نوراں ....." وہ دالان میں نکل کر حلق پھاڑ کر چلائی "کہاں دفن ہوگئی مردار ـــ" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا ارشق کمرے سے واپس برآمدے میں پلٹا ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "رخشی! پلیز آہستہ....."

"آپ تو چاہتے ہیں میری زبان بند ہوجائے۔" وہ تنک کر بولی۔

"غلط مطلب کیوں نکالتی ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں اِن دنوں نارمل رہنے کو کہا ہے" ارشق نے اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"قبر میں جانے کے بعد ہی اس گھر کے جہنم سے نجات ملے گی۔" وہ ڈائننگ ٹیبل پر زور زور سے ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔ غصّہ سے اس کا چہرہ سُرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

"جانِ من!" وہ اُسے باہوں میں بھرتا ہوا بولا "کیوں دل دُکھاتی ہو۔ ہم ہیں کہ جی جان سے تمہارے جئے جانے کی تمنا میں جی رہے ہیں۔"

"رہنے بھی دیں۔" وہ اُسے پرے کرتی ہوئی ٹیبل صاف کرنے لگی۔ "جمیلن ندارد نوراں رفو چکر۔ ان نوکروں کے ہاتھوں بے موت ماری جارہی ہوں"

"توبہ توبہ ...!!" اِن دو ٹکوں کے نوکروں کے لئے کیوں اپنا خون جلاتی ہو، یہ تمہارے لیے سخت نقصان دہ ہے۔"

"میرے نفع نقصان کی کسے فکر ہے۔" غصّے کے انگارے ماند پڑتے جارہے تھے۔

"اس خادم کو....." ارشق اپنے سینے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا "خود بھی خوش رہو اور اِس ناچیز کو بھی خوش ہونے کا موقع فراہم کرو۔"

"نوراں!!! بیٹی نوراں...." باورچی خانے سے آپا کی ملائم آواز ابھری۔

"جی آپا بی۔" آواز کے ساتھ نوراں زینے کے پاس پہنچ آئی "اوپر کا کمرہ صاف کر رہی"

"ذرا نیچے تو آنا بیٹی۔" وہ شفقت سے بولیں۔

"آرہی ہوں" وہ زینے سے اترتے ہوئے بولی۔

"دیکھا تم نے۔" ارشق بیوی سے بولا "آپا کی ایک آواز پر دوڑ چلی آئی۔"

"نمک حرام ہے وہ۔" رخشاں دانت پیس کر بولی "کسی دن چٹیا پکڑ کر دروازے

باہر کردوں گی کُتیا کو"

"ارے رے رے ..... پھر آگیئں جلال میں، دیکھو آپا کا سارویہ اپناؤ - نرم کلامی اور ......"

"ہاں! اور انھیں پُچکار پُچکار کر اپنے سر پر بٹھالوں" رخشاں شوہر کی بات کاٹ کر غصّہ سے بولی "آپا نے کوئی نوکر رکھا ہو تو جانیں کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا چاہیئے۔"

نوری دوڑی دوڑی کھانا لارہی تھی اور آپا اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

"شاباش!! بڑی کام کی بچی ہے .... یہ اَچار کی پیالی بھی دے آؤ، اور رخشاں بی بی سے کہو کہ وہ بھی ارشق میاں کے ساتھ بیٹھ جائیں کھانے کے لیے۔"

"آہا ..." گرم روٹی ہاتھ میں لیکر اسے پھونکتا ہُوا بولا۔ "کیسے ملائم، پتلے اور سبے داغ پھولکے ہیں"

"آپا نے جو پکائیں ہیں"۔ رخشی بظاہر مسکرا کر بولی "میں تو شیخ کباب بناتی ہوں روٹی کے..." اس کے لہجہ کا طنز وحسد ارشق سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

بہن کے گھر ایک ہفتہ رہ کر فوراً واں آپا چلی گئی۔ ارشق اور رخشاں نے مزید رکنے کے لیے کہا، لیکن اسکی ذمہ داریاں اس کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد ساس اس نند، ایک دیور اور اُن کی بیٹی ایک بچی، یہ چھ نفوس سے کنبے کی ذمہ داری اُس پر آپڑی تھی اساس ہمیشہ بیمار رہتی تھی انکی خدمت، تیمارداری اور دیکھ ریکھ اسے ہی کرنی پڑتی تھی۔ کیوں کہ نند اور بیٹی اسکول جاتی تھیں، دیور ماسٹر تھا، اس کی قلیل تنخواہ میں گزارہ ہو رہا تھا کچھ سلائی بنائی سے کمالیتی تھیں سلائی پر بچپن ہی سے ہاتھ بیٹھا ہوا تھا اسے ما میں سویٹروں اور شالوں کی بنائی سے بھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی ساس کے معالجے، بیٹی اور نند کی پڑھائی اور گھر کے اخراجات بڑی سے کر رہی تھیں۔ تاکہ مستقبل میں نند، بیٹی اور دیور کی شادی کے موقع پر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، بڑی غیور تھیں، بیوگی کے بعد خاندان والوں پر بوجھ نہ بنیں۔ بلکہ اب بھی اپنے بڑے پن کو بڑی خوش اسلوبی سے نباہ رہی تھیں۔ کسی کی بھی شادی، منگنی، عقیقہ، چلّہ، سالگرہ خاندان بھر میں ہر کسی کے خوشی و غم کی تقریب میں شریک ہوتی تھیں اور حسبِ حیثیت تحائف بھی لے جاتیں۔

ارشق آپا کو چھوڑنے اسٹیشن آیا تو انھوں نے رخشاں کے متعلق اسے ہدایتیں دیں

تیری رخشی کا بہت خیال رکھو۔ بعض عورتیں اِس عالم میں کچھ اُلجھن سی محسوس کرتی ہیں۔ بس کچھ مہینوں کی ہی بات ہے۔ تم اُسے کسی طرح سنبھال لو۔ اِن دنوں وہ کچھ زیادہ ہی چڑچڑی ہو گئی ہے اک دو بچوں کے بعد دیکھنا کتنی تبدیلی آجائے گی اُس میں، ویسے تم خود سمجھ دار ہو۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

گھر کے باہر ہی رخشی کی کرخت آواز نے ارشق کا استقبال کیا۔ وہ آنگن میں کھڑی جمیلن پر بگڑ رہی تھی، ارشق نے گھر میں پہلا قدم رکھا۔ اپنی آمد کا احساس دلانے کے لئے وہ تھوڑا سا کھنکارا۔ نوکرانی نیچا سر کئے وہاں سے کھسک گئی۔ رخشی نے پلٹ کر دیکھا۔

"آگئے آپ ......" اس کے لہجہ میں طنز، شکایت، ناگواری بے زاری بہت کچھ تھا۔

"جی ......" وہ مختصراً جواب دے کر برآمدے میں پڑے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

رخشی کمر پر ہاتھ رکھے اُس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ ارشق نے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں

"کیا پیدل چل کر آئے ہو"؟

اُس نے بیوی کے طنز کو بھانپ لیا۔ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا رخشاں فرش پر بیٹھ گئی۔

"دو روز کا کہہ کر گئے تھے" وہ شکایت بھرے انداز میں بولی "اور چار روز کے بعد لوٹ رہے ہو بیوی کی کوئی فکر ہی نہیں"۔

"کیا کریں آپا نے روک لیا تھا"

"ہو نہہ ......"! رخشی ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کی کہنی جما کر گال کو ہتھیلی کے پیالے میں جما کر غرائی۔ "تو آپا کے گھر سے آرہے ہیں آپ ...... گئے تھے یہاں سے آفس کے کام کا بہانہ بنا کر ......"

"بہانہ ــــ" ارشق بے حد حیرانگی سے بولا "ارے بھئی! آفس کے کام ہی سے گیا تھا وہاں سے آپا کا گاؤں قریب تھا سوچا اُن سے بھی ملتا چلوں ــ"

"پھر جاتے وقت اپنے آپا کے گھر جانے والی بات مجھ سے کیوں چھپائی"؟

"تمہاری بہن کے گھر جاؤں اور تم ہی سے چھپاؤں ــــ" بیوی کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ہنس کر بولا ــ "اور اگر چھپانا ہی ہوتا تو پھر اب آکر کیوں بتاتا ــ ہے نا۔ احمق تو تم ......" وہ پھر ہنسا "آپا نے سچ کہا ہے"

"کیا کہا آپا نے ...؟" وہ تجسس بھرے انداز میں بولی۔
"یہی کہ تم ان دنوں زیادہ چڑچڑی ہوگئی ہو۔"
ہائے اللہ ...." وہ سینے پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی "آپا نے آپ سے میری برائیاں بھی کر ڈالیں۔"
"نہیں بھئی!" وہ تردیدی انداز میں بولا "بلکہ انہوں نے مجھے یہ تاکید کی ہے کہ میں تمہارے غصے اور چڑچڑے پن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تمہارا بہت (اس نے بہت لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا) خیال رکھوں۔"
"سمجھ گئی" وہ پھنکارتی ہوئی بولی "آپا کی نظر میں میں غصیلی ہوں چڑچڑی ہوں۔"
"لگتا ہے فرشتوں تمہاری کھوپڑی میں تمہارے دماغ کی الٹی فٹنگ کی ہے۔ ہر بات کا بس الٹا مطلب نکالتی ہو تم۔" بیوی کی ناگواری کے خیال سے ارشق نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا
"آپا نے تو مجھے تمہارے متعلق اتنی ہدایتیں کی ہیں کہ میں اپنی طرف سے تمہیں بے حد آرام اور خوشی پہنچاؤں، بے حد پیار اور محبت دوں۔" وہ اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بے حد جذباتی انداز میں بولا "بلکہ ان دنوں زمین پر بھی نہ چلنے دوں اپنی ہتھیلی پر اٹھائے پھروں اپنی جانوں کو ......"
"جائیے بھی ......" وہ اٹھلا کر بولی "آپ کو ہماری پریشانی کا ذرا بھی خیال نہ رہا — اللہ! کیسے کیسے وسوسے آ رہے تھے ہمارے دل میں۔
"اوہ! سوری ڈیر ......" وہ اس کے دونوں گالوں کو تھپتھپاتا ہوا بولا۔ پھر جھک کر بیگ میں سے ایک پیکٹ نکالتا ہوا بولا "آپا نے تمہیں ڈھیر ساری دعائیں اور ایک خوبصورت تحفہ بھیجا ہے۔"
رخشاں نے جلدی سے پیکٹ کھولا۔ اس میں سے نیلے رنگ کی ساری نکلی، اس نے کھول کر اسے پھیلا دیا۔ اس کے آنچل میں اور باڈر پر موتیوں سے خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔
"اسے ہی خوبصورت تحفہ کہہ رہے تھے آپ۔" رخشاں بے دلی سے ساری فرش پر ڈالتی ہوئی بولی "آپا جانتی ہیں کہ میں ایسی گھٹیا چمک دمک والی ساڑیاں نہیں پہنتی میں تو گھر میں بھی امپورٹیڈ سلک ساڑیاں باندھتی ہوں۔" وہ بے حد رعونت سے بولی
"رخشی!" ارشق ملامت بھرے لہجے میں بولا "تحفے کی قیمت نہیں بلکہ بھجوانے والے کا خلوص و

محبت دیکھنا چاہیے۔ کتنی محبت سے بنایا ہوگا انہوں نے یہ انچل اور باڈر" ۔ وہ ساری کو ہاتھ میں لیکر دیکھتا ہوا بولا ۔ دیکھو تو نیلی ساری پہ سفید موتی ۔ جیسے آسمان پہ ستارے ....!

"مجھے نہیں پسند ۔" رخشی اس کے ہاتھ سے ساری اُچک کر پیکٹ میں ٹھونستی ہوئی بولی "ایسے کام تو وہ روز ہی بناتی ہیں اپنے گاہکوں کے لیے ۔ انھیں بچپن ہی سے ان باتوں کا ربا ہے ۔"

فروزاں نے بہت کوشش کی کہ ولادت کے وقت بہن کے پاس رہے لیکن عین وقت پر ساس کی حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ انہیں ہوسپٹل میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔ فروزاں بے حد پریشان تھی اس کی ساس کے پاس رکنا بھی ضروری تھا اور رخشاں کے پاس جانا بھی۔ وہ کیا کرے اسی کشمکش میں تھیں کہ اک دن ارشق کا ٹیلیگرام ملا لڑکے کی خوش خبری لئے۔ آپا خوشی نہال ہوگئیں، جلدی سے بچے کے موزے سویٹر، ٹوپی رخشاں کا جوڑا جو پہلے ہی سے تیار تھا بچے کو چاندی کا زیور، ان سب کا پارسل بھجوادی اور ڈھیر ساری دعائیں مبارکباد کے ساتھ لکھ دیا کہ میں بھی ساس کی طبیعت سنبھلتے ہی آرہی ہوں

آپا کی پارسل پاکر ارشق میاں ایسے خوش ہوئے جیسے ہفت اقلیم پالی ہو، دوڑ کر بیوی کے پاس گئے۔ وہ دالان میں چوکی پر بیٹھی بچے کو گود میں لئے جاڑے کی گلابی دھوپ سینک رہی تھی پارسل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ارشق بولا

" آپا کی طرف سے پارسل آئی ہے ۔ ذرا دیکھو تو ۔ وہ بچے پر جھکتا ہوا پیار سے توتلا ہوا بولا۔

" اس کی خالہ نے اپنے بھانجے کو کیا بھیجا ہے ۔"

" وہی چند چیتھڑے ہوں گے" رخشی نے پارسل لیکر حقارت سے زمین پر پٹک دیا۔" آنے کی توفیق نہ ہوئی، کیا میں ان چندیوں کی محتاج ہوں ۔"

"آپا کے لیے ایسے الفاظ زبان سے مت نکالو کتنی کی ذمہ داریاں ہیں ان کے سر، پھر بھی وہ آتیں ضرور کوئی مجبوری رہی ہوگی ۔"

" ہونہہ ہونہہ ... آپا کی مجبوریوں اور ذمے داریوں کا مجھ سے زیادہ آپ کو احساس .... آپ کے دل میں آپا کے لیے یہ درد کب سے پیدا ہوا ۔ ؟" وہ بے حد طنز سے بولی

" عجیب عورت ہو" وہ جھلا اٹھا " ہر بات میں لڑائی کا پہلو نکالتی ہو جب دیکھو بات الٹی سیدھی اور تیڑھی ترچھی باتیں کروگی ۔"

"ہاں ہاں میرا دماغ خراب ہے میں بہت بری ہوں، چڑچڑی ہوں بد مزاج لڑاکو ہوں ۔ بہت

باقی صف ۶۰ پر

کے ایس دگل

بھارت میں عالمی کتاب میلہ

پس منظر اور ابتداء

کتابوں سے متعلق میلہ محض بڑی اور چھوٹی کتابوں کی نمائش ہی نہیں ہوتا ۔ اس کی نوعیت تجارتی ہوتی ہے ۔ اور اس کا مقصد کتابوں کے ناشرین اور تقسیم کاروں کو کتابوں کے ترجمے کے حقوق، دوبارہ اشاعت ، بڑے پیمانے پر کتابوں کی خرید وغیرہ کے معاملات طے کرنے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے ۔ یہ میلہ ایک طے شدہ مدت کے لئے ہوتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو ایک ہی جگہ پر منعقد کیا جاتا ہے ۔ اس کے ساتھ دوسرے پروگرام مثلاً کتابوں کا ہفتہ ، سیمینار مذاکرے اور ورکشاپ وغیرہ بھی منعقد کئے جاتے ہیں ۔ جن کا مقصد کتابوں کی تصنیف ، ترجمے ڈیزائننگ اشاعت اور تقسیم کو فروغ دینا ہے ۔ اس میلے کے دوران تفریحی اور ثقافتی پروگرام بھی منعقد ہو سکتے ہیں کیونکہ میلے میں آنے والے افراد کے لئے کتابوں کی انفرادی فروخت کو کتابی میلے میں کم ترجیح دی جاتی ہے ۔ بعض عالمی کتاب میلوں مثلاً فرینک فرٹ میلے میں کتابوں کی انفرادی فروخت کی اجازت نہیں ہوتی ۔

بھارت میں پہلا کتاب میلہ ۱۹۶۶ء میں ، کراس میدان ، بمبئی میں ، ہوا تھا ۔ اس سے قبل ۱۹۶۴ میں نئی دلی میں کتابوں کی ایک نمائش ہوئی تھی ۔ کتابوں کی نمائش اور میلے میں بڑا فرق ہے ۔ کتاب میلہ بھارت کی اشاعتی برادری کا سب سے اہم سالانہ موقعہ ہوتا ہے ۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے سابق چیئرمین ڈاکٹر بی ۔ وی ۔ کیسکر نے سب سے پہلے کتاب میلہ منعقد کرنے کے بارے میں سوچا ۔ ڈاکٹر کیسکر تقریباً دس سال تک نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین رہے اور وہ ایک صاحب بصیرت شخصیت تھے ۔ انہیں ملک میں کتاب پسندی کا ماحول پیدا کرنے کی خاص فکر تھی ۔

ان کا خیال تھا کہ نیشنل بک ٹرسٹ کو کتابوں کی اشاعت سے زیادہ عوام میں کتاب بینی کی عادت پیدا کرنے اور عوام کے اندر زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدنے کا رجحان پیدا

پر توجہ کرنی چاہیے ۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے قیام کے وقت جواہرلال نہرو کا بھی خیال تھا ۔ وہ بھارت کے عوام میں کتاب بینی کے ذریعہ سائینسی مزاج پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ نیشنل بک ٹرسٹ کو کتاب بینی کے فروغ پر، اشاعتی سرگرمیوں سے زیادہ توجہ کرنی چاہئے اور اشاعتی سرگرمیوں میں کمی کو دور کرنا چاہئے ۔ اس کو جہاں تک ہوسکے اشاعت سے متعلق نجی شعبے کی مدد کرنی چاہئے ۔ اسی سے کتاب میلے کا تصور، عوام کو پڑھنے کے لئے اچھی کتابیں مہیا کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر سامنے آیا ۔ اسی سے علاقائی نمائشوں کا خیال پیدا ہوا ۔ اس کے بعد نیشنل بک ٹرسٹ نے 1972 میں عالمی کتاب میلہ منعقد کیا ۔ اس میلے میں شرکت کرتے ہوئے فرینک فرٹ کتاب میلے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس ٹابرٹ نے کہا تھا " اس میلے کی حقیقت پر یقین کرنے کے لئے اسے دیکھنا ضروری ہے ۔

جب یہ میلہ راجدھانی کے ونڈسر پلیس علاقے میں منعقد ہوا تو بڑی تعداد میں لوگ میلے میں آئے اور قومی اخبارات اور رسائیل میں اس کی بہت تعریف ہوئی ۔ اس وقت میلے کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے مجھے 1966 کے اس واقعے کی یاد آئی جب ٹرسٹ کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے کے کچھ ہی عرصے بعد مجھے پہلا قومی کتاب میلہ منعقد کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ۔ جب اس سلسلے میں تجویز مالیات کی منظوری کی غرض سے ٹرسٹ کی گورننگ کونسل کے سامنے رکھی گئی تو ایشیا پبلیشنگ ہاؤس کے شری پی ایس جے سنگھ مرحوم اور رومیش تھاپر نے اس تجویز کو مسترد کردیا ۔ شری جے سنگھ نے، جن کا شمار ملک کے اہم ناشرین میں ہوتا تھا ۔ اور جو ہر سال فرینک فرٹ کتاب میلے میں شریک ہوتے تھے، کہا کہ کتاب میلے کا تصور بنیادی طور پر غیر ملکی ہے ۔ یہاں یہ کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ انہوں نے سوال کیا کہ کتابوں جیسی نازک اشیاء کو عارضی طور پر بنے اسٹالوں میں کس طرح رکھا جاسکے گا؟ شری رومیش تھاپر نے بھی شری جے سنگھ سے مکمل اتفاق کیا ۔ طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ہم تجرباتی طور پر یہ میلہ منعقد کرسکتے ہیں ۔

یہ میلہ 90000 مربع فٹ کے پلاٹ پر کراس میدان، چرچ گیٹ، بمبئی میں منعقد کیا گیا نمائش کا پویلین 10000 مربع فٹ کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا ۔ بقیہ جگہ اسٹالوں، آڈیٹوریم، اور لاؤنج کے لئے تھی ۔ 150 اسٹال جو آٹھ فٹ لمبائی اور ۶ فٹ چوڑائی پر مشتمل تھے اس مقصد لئے کرائے پر دیئے گئے تھے ۔

اس میلے کی خاص کشش انگریزی سمیت مختلف ہندوستانی زبانوں میں 1964 سے شا ہوئی ۔ منتخبہ 8000 کتابیں تھیں ۔ تقریباً 2400 کتابیں ہندی میں، 2000 انگریزی میں ۱۵

راٹھی میں، 535 گجراتی میں، 410 بنگالی میں، اور 1780 دیگر ہندوستانی زبانوں مثلاً تیلگو، ٹامل
مالم، کنڑ، آسامی، اردو اور پنجابی میں تھیں۔

پویلین کا ایک خاص حصہ جو بہت مقبول ہوا اس میں بچوں کی منتخب کتابیں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھیں۔

اسٹال ہندوستانی اور غیر ملکی دونوں ہی ناشرین یا ان کے ایجنٹ کو، سفارتی مشنوں، کتابوں کی تجارت سے متعلق، دیگر اداروں کو کرائے پر دیئے گئے تھے۔ کتابوں کی اسٹالوں پر نمائش بھی کی جا سکتی تھی اور انہیں فروخت بھی کیا جا سکتا تھا۔ میلے میں کتابوں کی اچھی خاصی فروخت عمل میں آئی تھی۔

اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بی وی کیسکر نے قومی کتاب میلے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس میلے کو کتابوں اور اشاعت کے فروغ سے متعلق جنوبی ایشیا کی پہلی کوشش سے تعبیر کیا تھا۔

اس کتاب میلے سے ناشرین اور کتب فروشوں کی ایک کنونشن کے انعقاد کا بھی اچھا موقعہ فراہم کیا تھا۔ یہ کنونشن ناشرین اور کتب فروشوں کی فیڈریشن کے زیر اہتمام منعقد کئے گئے تھے۔ افتتاحی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق ذکریا نے اپنے اس اعتماد کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان میں کتابوں کی اشاعت کا مستقبل تابناک ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میلے میں عوام کی بڑی تعداد میں شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام کے پڑھنے کی خواہش میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میٹنگ میں کتابوں کی تقسیم سے متعلق مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی۔

اس کتاب میلے کے دوران کئی ملکی ادبی اور ثقافتی پروگرام میلے کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئے اور ہر شام کسی ایک ہندوستانی زبان کے نام وقف ہوتی تھی۔

اس دوران پورے ملک میں 8 سے 14 نومبر تک کتابوں کا ہفتہ منایا گیا۔ ناشرین اور کتب فروشوں نے ٹرسٹ کے ذریعہ تیار کردہ پوسٹر چپکائے اور اس ہفتے کے دوران خریدی گئی کتابوں پر خصوصی رعایت بھی دی۔

یہ میلہ ہر طرح سے بہت کامیاب رہا اور اس نے ملک میں کتاب بینی کا شوق اور ماحول پیدا کرنے میں کافی مدد کی۔ اخبارات اور رسائل، کتابوں کے ناشرین و تقسیم کاروں اور کتاب بینی کا شوق رکھنے والے عوام نے نیشنل بک ٹرسٹ کے ذریعہ یہ میلہ منعقد کئے جانے پر خوشی

کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی اور یہ میلہ منعقد کیا جائے گا۔ ٹرسٹ کو مغربی بنگال کے ناشرین اور کتب فروشوں نے اگلا میلہ کلکتہ میں منعقد کرنے کی دعوت دی۔

اس طرح قومی کتاب میلہ، ٹرسٹ کی سرگرمیوں کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ دہلی، کلکتہ اور مدراس میں اس طرح کے میلے منعقد کئے گئے اور آخر میں 1972 میں جسے یونیسکو نے کتابوں کا سال قرار دیا تھا، عالمی کتاب میلہ منعقد ہوا۔

اس عالمی میلہ کا افتتاح 18 مارچ کو اُس وقت کے صدر جمہوریہ شری وی۔ وی گری نے تقریباً تین ہزار مہمانوں کی موجودگی میں کیا جن میں اراکین پارلیمنٹ، سفارت کار، غیر ملکی مندوبین، مصنفین، ناشرین اور کتابوں کے شائقین شامل تھے۔

کیوں کہ 1972 ہندوستان کی آزادی کا پچیس واں برس تھا اس لئے میلہ کا شعبہ پچھلے پچیس برس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والی اہم کتابیں تھیں۔ اس نمائش میں، ہندی، انگریزی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، مراٹھی، ٹامل، تلگو، پنجابی، ملیالم اردو، آسامی، اڑیہ، سندھی اور سنسکرت کی تقریباً ۱۰ ہزار کتابیں نمائش کے لئے رکھی گئی تھیں۔ بچوں کی کتابوں اور پیپر بیک کتابوں کے لئے الگ الگ حصّے مخصوص کئے گئے تھے۔

کتابوں کی نمائش کے عالمی حصّے میں ہندوستان کے دوست ممالک میں شائع شدہ ہندوستانی کتابیں رکھی گئی تھیں اس کے ساتھ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن کی طباعت و اشاعت کافی دیدہ زیب تھی۔ بڑی تعداد میں ملکوں نے اپنی بہترین کتابیں نمائش کے لئے بھیجی تھیں۔ ان ممالک میں برطانیہ، روس، امریکہ، فرانس، اٹلی جرمن عوامی جمہوریہ، جرمن وفاقی جمہوریہ، سوئیزرلینڈ، نیوزی لینڈ، ہنگری، ترکی یونان، ایران، چیکوسلواکیہ، اسپین، سری لنکا، کمبوڈیا، ملیشیا، عوامی جمہوریہ کوریا تنزانیہ، افغانستان، کینیا اور زمبیا شامل تھے۔

اس میلے میں بہت سے غیر ملکی ناشرین اور عالمی تنظیم برائے صحت اور تعلیم و ثقافت کی عالمی تنظیم (یونیسکو) کے اشاعتی شعبوں کی جانب سے اسٹال لگائے گئے۔ بہت سے غیر ملکی ناشرین اپنے اسٹالوں پر خود موجود تھے۔

۱۰۰ سے زائد ہندوستانی ناشرین نے اپنے اسٹال یا خود اپنے پویلین لگائے بہت سی ریاستی سرکاروں (پنجاب، مدھیہ پردیش، یوپی، آندھرا پردیش، ٹامل ناڈو

کیرالہ، مہاراشٹرا، اڑیسہ، مغربی بنگال اور آسام) نے میلے میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ سرکاری دائرہ کار کے بہت سے اداروں (وزارت اطلاعات و نشریات کا پبلیکیشنز ڈویژن، حکومت ہند کے اشاعتی شعبے، سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل، یا رہندی کے ادارے، انڈین سائنس اکیڈمی اور آئی۔سی۔اے۔آر وغیرہ) نے بڑے پیمانے پر شرکت کی۔ وزارت تعلیم اور سماجی بہبود کے مختلف شعبوں کے لئے ایک الگ پویلین مخصوص تھا۔

میلے کے آخری تین دنوں میں میلے کے ہی مقام پر کتابوں کا بازار لگایا گیا۔ یہاں ناشرین نے سستے داموں پر کتابیں فروخت کیں۔ یہ بہت کامیاب رہا اور اس سے کافی تعداد میں لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔

اس عالمی کتاب میلے کا پروگرام طے کرتے وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ میلے کے دوران "لاکھوں عوام کے لئے کتابیں" کے عنوان سے ایک عالمی سمینار منعقد کیا جائے۔ سمینار کا مقصد پیپر بیک کتابوں سے متعلق امور پر تبادلہ خیال تھا۔ اس میں پڑھے گئے مقالے اور تبادلہ خیال کے دوران علم کے فروغ اور قارئین کو تفریحی مواد فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔ اس سمینار میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے ناشرین کو اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سمینار کے انعقاد کے لئے ایک اسٹیئرنگ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ کمیٹی نے مندرجہ موضوعات پر سمینار کے آٹھ اجلاس کرانے کا فیصلہ کیا۔

1۔ پیپر بیک ۔ ایک تاریخی جائزہ
2۔ پیپر بیک اور حقوق کا مسئلہ
3۔ پیپر بیک اور مصنّف
4۔ پیپر بیک کتابوں کی طباعت و اشاعت
5۔ پیپر بیک کی تقسیم
6۔ ترقی پذیر ممالک میں پیپر بیک
7۔ پیپر بیک اور مجلد کتابیں
8۔ امداد باہمی کے ذریعہ اشاعت

اس عالمی کتاب میلے کے دوران 26 سے 31 مارچ 78ء تک مصنفین

کا قومی کیمپ منعقد ہوا جس میں انگریزی اور مختلف ہندوستانی زبانوں کے 93 ممتاز مصنفین نے حصّہ لیا۔

قارئین کو ان کے پسندیدہ مصنفین سے ملاقات کرانے کے لئے "مصنفین سے ملئیے" پروگرام منعقد ہوا جس کے مختلف اجلاس میں مصنفین نے اپنے فن اور فلسفہ کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد مصنفین اور سامعین کے درمیان تبادلہ خیال ہوا۔

اس عالمی میلے کے دوران 18 سے 24 مارچ تک کتابوں کا ہفتہ سارے ملک میں منایا گیا۔ اس عرصے کے دوران کتابوں کے لئے شوق پیدا کرنے کی غرض سے وسیع پیمانے پر ایک تشہیری مہم بھی چلائی گئی۔

یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں، کتب خانوں اور ثقافتی تنظیموں نے کتابوں کا ہفتہ منایا تاکہ عوام کے اندر زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے اور خریدنے کے لئے شوق پیدا کیا جا سکے۔ ناشرین اور کتب فروشوں کی انجمنوں کی فیڈریشن نے اس عرصے میں خریدی گئی کتابوں پر ۱۰ فیصد کی خصوصی رعایت دی۔

میلے میں حصّہ لینے والے غیر ملکی اور ہندوستانی مہمانوں کے لئے بہت سے ثقافتی پروگرام بھی منعقد کئے گئے۔

23 مارچ 1972 کو مذکورہ فیڈریشن نے ناشرین کا کل ہند کنونشن منعقد کیا۔ جس میں نجی شعبے کے ناشرین اور کتب فروشوں اور سرکاری شعبے کے اشاعتی اداروں کے نمائندوں، کتب خانوں کے منتظمین حضرات اور کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔ "سرکاری اور غیر سرکاری سیکٹر میں اشاعت" کے موضوع پر ایک دلچسپ مذاکرہ بھی ہوا۔

اس فیڈریشن نے "اشاعتی انتظام" اور "کتابوں کے فروغ اور ان کی تقسیم کے بارے میں" تربیتی کورس بھی منعقد کئے۔

اس میلے کے دوران میں، 24 مارچ 1972 کو صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے انڈین لائبریری ایسوسیشن کی 19 ویں سالانہ آل انڈیا لائبریری کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔

31 مارچ 1972 کو انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی نے "سائنسی کتابوں کی اشاعت

پر ایک مذاکرہ منعقد کیا۔

ایسوسی ایشن آف ماسٹر پرنٹرس نے طباعت سے منسلک افراد کا کل ہند کنونشن منعقد کیا جس میں باہمی مفاد کے امور پر تبادلۂ خیال ہوا۔

21 مارچ کو بین الاقوامی مواصلات پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کی صدارت منصوبہ بندی کمیشن کے اس وقت کے سکریٹری شری اشوک مترا نے کی۔

جن ملکوں نے کسی نہ کسی حیثیت میں اس میلے میں شرکت کی تھی انہیں افغانستان، بنگلا دیش، سری لنکا، چیکوسلواکیہ، کمبوڈیا، فرانس، وفاقی جمہوریہ جرمنی، یونان، عوامی جمہوریہ جرمنی، ہنگری، اٹلی، آئیرلینڈ، ایران، جاپان، کینیا، ماریشس، ملیشیا، نیپال، نیوزی لینڈ، شمالی کوریا، پولینڈ، سوئیزرلینڈ، اسپین، تنزانیہ، ترکی، سوویت یونین، برطانیہ، امریکہ، یوگوسلاویہ اور زمبیا کے نام قابل ذکر ہیں۔

میلے کی عوام کے درمیان غیر معمولی مقبولیت کے سبب، میلے کی مدت میں دو دن کے لئے توسیع کر کے اس کو 4 اپریل تک بڑھا دیا گیا تھا تقریباً دو لاکھ لوگ یہ میلہ دیکھنے آئے تھے۔ ان افراد میں صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ وزیر اعظم، مرکزی کابینہ کے اراکین، سکم کی مہارانی، ریاستی گورنر اور وزراء سفارت کار، غیر ملکی مندوبین، مصنفین، ناشرین کتب خانوں کے منتظمین اساتذہ، طالب علم اور دیگر افراد شامل تھے۔

اس میلے میں رکھی گئی کتابوں کی تعداد دو لاکھ تھی جن میں سے 15 ہزار کتابیں جو انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کی تھیں ان کو قومی نمائش میں رکھا گیا تھا۔ بہت سے غیر ملکی وفود نے میلے میں شرکت کی۔ ان کا تعلق سوویت یونین جرمن عوامی جمہوریہ اور مشرقی افریقہ کے ممالک سے تھا۔

اس کے علاوہ یونیسکو نے ٹرسٹ کو دو ہزار ڈالر اور پانچ ہزار ڈالر کی دو گرانٹس بھی دی تھیں۔ دو ہزار ڈالر کی امداد ٹرسٹ کی تجویز پر دی گئی تھی تاکہ وہ فرینکفرٹ کتاب میلے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سگفرڈ ٹابرٹ کو میلے کے لئے مدعو کر سکے۔ اور پانچ ہزار ڈالر کی امداد غیر ملکی ناشرین کو میلے میں مدعو کرنے کے لئے دی گئی تھی۔

کتاب میلے کو ابتداء میں تو ضرور دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا تاہم یہ ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ اب اس نے ایک بہترین ادارے کی شکل اختیار کرلی ہے اور یہ ہندوستان کی اشاعتی برادری کے لئے باعث فخر ہے۔ ٹرسٹ ہر دوسرے برس یہ میلہ منعقد کرتا ہے جب کہ قومی کتاب میلہ سالانہ منعقد ہوتا ہے۔ جس برس عالمی کتاب میلہ ہوتا ہے اس برس قومی کتاب میلہ اس میں ضم کردیا جاتا ہے۔

دیگر باتوں کے علاوہ ہندوستان کی اشاعتی برادری کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنے اور انہیں ایک مشترکہ ادارہ مہیا کرنے کی سمت میں یہ میلہ ہندوستان میں کتابوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ادارے کے لئے کافی اہمیت کا حامل ہے۔

سلسلہ صفحہ ۵۲

دکھوں سے اس کے دل میں جو لاوا ابل رہا تھا وہ اخراج پھوٹ پڑا۔

"اور آپا ــ" وہ ارشق کے قریب منہ لے جاکر استفامیہ انداز میں بولی

"وہ بہت اچھی تھیں ــ کیوں؟ ان کی پکائی ہوئی چپاتیاں، ان کے خط کی تحریر، ان کے لہجے کی ملائمت، انکے ہاتھ کے سلے کپڑے، ہر چیز آپ کو پسند آتی ہے ــ کیوں آخر ــ؟"

ارشق کو جیسے سکتہ ہوگیا۔

"اپنی بیوی کے بجائے کسی غیر عورت کی تعریف کرتے شرم نہیں آتی آپ کو ــ"

حیرت، افسوس، غم و غصے کے جذبوں نے ارشق کو "تک تک دیدم - دم نہ کشیدم" کی تصویر بنادیا تھا، ادھر رخشاں پر جیسے ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی تھی پارسل کا پیکٹ اٹھا کر دور پھینکتے ہوئے وہ بولی۔

"وہی ہوں گے اس میں اپنی دستکاری اور ہنرمندی کے نمونے ..... کسی کو رجھانے کے لئے۔ اللہ!! تو مجھے موت دیدے ..... اب میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

غزلیں

پروفیسر عنوان چشتی

...شہر میں آتش بجاں نہیں ہے کوئی
مگر سکون سے یارو یہاں نہیں ہے کوئی

اپنے قتل کے محضر پہ دستخط کر دوں
ترے خلوص پہ مجھ کو گماں نہیں ہے کوئی

...ل دل ہے تہی کاسۂ نظر کی طرح
مگر یہ شہر کہ خالی مکاں نہیں ہے کوئی

...ہوئی ہے ازل سے عجب بساطِ وجود
ہے میزبان، مگر میہماں نہیں ہے کوئی

...پڑا ہے بہت شہرِ آرزو کی طرح
مگر یہ دل ہے کہ جیسے یہاں نہیں ہے کوئی

...دھوپ کا کوئی پیکر نہ سائے کا آسیب
یہ دشت، دشتِ انا ہے یہاں نہیں ہے کوئی

...ر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکاں نہیں ہے کوئی

...زندگی ہے اسے لوٹ کر نہ کیوں جاؤں
کہ اس کے بعد بہار و خزاں نہیں ہے کوئی

...د اپنی ذات پہ اُس کے وجود کی صورت
یقین ہو نہ ہو، لیکن گماں نہیں ہے کوئی

...وں کے بیچ ہے دیوارِ گریہ مانتا ہوں
محبتوں کے نگر در میاں نہیں ہے کوئی

...یاں ہوتے ہیں آنکھوں سے دل کے افسانے
یہ اور بات کہ دل کی زباں نہیں ہے کوئی

...ل و نگاہ یہ اک دوسرے سے پوچھتے ہیں
یہاں نہیں ہے کوئی یا عیاں نہیں ہے کوئی

...ٹا سکو تو لٹاؤ خلوص کے گوہر
یہ کام وہ ہے کہ اس میں زیاں نہیں ہے کوئی

دلوں کا قحط ہے عنوان آج دنیا میں
مکیں ہزار ہیں لیکن مکاں نہیں ہے کوئی

بی ۱۱/۷ - جامعہ نگر - نئی دہلی ۔ 110025

مرزا غفار بیگ اثر گلشن آبادی

اشارے ان کے تباہی میں پائے جاتے ہیں
یہ فتنے اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

یہ مصلحت کوئی دیکھے ادائے قاتل کی
ہماری لاش پہ آنسو بہائے جاتے ہیں

ادھر عدو کے عمل سے بھی چشم پوشی ہے
ادھر خیال پہ پہرے بٹھائے جاتے ہیں

نہ جانے کیا ہے اس طرح سبزہ و گل میں
یہ روندے جاتے ہیں وہ مسکرائے جاتے ہیں

ستم تو ہے ہم جیسے با اثر ہو کر
انہیں میں گردن جھکائے جاتے ہیں

غزل

سکندر توفیق

سہے ہیں گے برگِ خزاں پیچ و تابِ دریا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

سوال بن کے اٹھا تھا حباب دریا کا
دیا ہے ساحلِ غم نے جواب دریا کا

عطائے بسترِ نہاں، ذوقِ جلوہ فرمائی
بدلتے چہرے چلا آفتاب دریا کا

صدائے تشنہ لبی ہے سکوتِ صحرا کا
مذاق کیوں نہ اڑائے سراب دریا کا

نصیبِ راہرواں گرد کے بگولے ہیں
شناوروں کا مقدر، حسابِ دریا کا

سفینہ لے کے ہتھیلی پہ موج موج چلی
ہے بادباں سے اضطراب دریا کا

بقائے نخلِ تمنا ہے رازِ فطرت کا
ہے پانی پانی بہت احتساب دریا کا

جگر کے زخم کئی لالہ زار رکھتے ہیں
ہے سیلِ اشکِ ندامت جواب دریا کا

چلے چلو کہ ابھی منزلیں بلاتی ہیں
بھنور کی آنکھ میں پھرتا ہے خواب دریا کا

دلوں کی گم شدہ راحت ہی نشترِ جاں ہے
لہو سے رنگ چھڑائے نہ آبِ دریا کا

یہ بیچ سیل، کہیں دامِ تشنگی جس کو
فزوں فزوں ہے بہت سعیِ دادِ دریا کا

حیات، وقت کا زینہ، قدم قدم اترو
ہے نقشِ آب نہ یہ انتساب دریا کا

دلیلِ صبح وہی ہے، دلیلِ شام وہی
اٹھانا سر پہ شفق، لاجواب دریا کا

کھلی ہوئی ہیں عجیں نیکیاں زمانے کی
کہ آب شور نہیں جن کے آب دریا کا

تماشہ دیکھنے والے، نقوشِ ساحل ہیں
ہے شرطِ زیست نباہنا حباب دریا کا

غزل

سلیم محی الدین

دل سے گزرا نہ جاں سے گزرا
تیر جو تھا کماں سے گزرا

اپنے اندر سفر وہ کرتے ہوئے
جانے کس آسماں سے گزرا

وہ ہی کچھ پاس اب کرے تو کرے
میں تو اپنی زباں سے گزرا

آئینہ کرچیوں میں بکھرا تھا
حادثہ جب گماں سے گزرا

مل نہ پائی اماں جنگل میں
جب درندہ مچان سے گزرا

سکاڑی پورہ نزد عاشور خانہ پربھنی مہاراشٹرا

غزل

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

ہمیں تسلیم ہے کہ خانقاہوں میں بھی ہوتے ہیں
فقیرانہ روش کے لوگ شاہوں میں بھی ہوتے ہیں

فقط جاہل مریدوں ہی پہ کیوں الزام دھرتے ہو
گناہ تو مرشدوں کی بارگاہوں میں بھی ہوتے ہیں

جو فتنہ کاریوں میں رہبروں کو مات کرتے ہیں
وہ چنگیز و ہلاکو سربراہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ مانا لطف تو آتا ہے آغوشِ حسیناں میں
مزے کچھ اور طوفانوں کی باہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ زخموں پہ ہمیشہ تبصرہ کرتے ہیں ہنس ہنس کر
کرم فرما کچھ ایسے خیر خواہوں میں بھی ہوتے ہیں

سفر ہے شرط ہر اک گام ساماں میں اجالوں کے
چراغِ نقشِ پا ویران راہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ قتل و خوں کا منظر دیکھ کر خاموش رہتے ہیں
بالفاظِ دِگر قاتل گواہوں میں بھی ہوتے ہیں

ضرورت کے تحت ہر آدمی مجبور ہوتا ہے
طلب گارِ پناہ عالم پناہوں میں بھی ہوتے ہیں

فقط لفظ و معانی پہ نہیں موقوف اے منشاء
حسیں نکتے ادب کی اصطلاحوں میں بھی ہوتے ہیں

غزل

مقبول احمد مقبول

زندگی اک الم ہے اور کیا ہے
آدمی پر ستم ہے اور کیا ہے

جس پہ ہوتا نہیں اثر کوئی
پتھروں کا صنم ہے اور کیا ہے

تن کی زیبائش و من کالا
سب یہ جھوٹا بھرم ہے اور کیا ہے

شیخ صاحب ہو یا برہمن ہو
سب کا پیسہ دھرم ہے اور کیا ہے

زندگی بن گئی عذابِ جاں
آپ ہی کا کرم ہے اور کیا ہے

زندگی میں ہماری اے مقبول
بیکراں رنج و غم ہے اور کیا ہے

پتہ: ۱۴-۱-۱۸۴ سیتارام پیٹھ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۱۔ اے پی

غزل

پروفیسر جگناتھ آزاد

دل کی بستی کو نہ ویران بنائے رکھنا
کچھ نہ ہو اور تو یادوں کو سجائے رکھنا

رشتۂ درد سے پائندہ نہیں رشتہ کوئی
میری اس بات کو سینے سے لگائے رکھنا

بجھ گئے اب کے تو شاید نہ جلیں پھر یہ کبھی
ان چراغوں کو ہواؤں سے بچائے رکھنا

تو نہ دل سے کہ تم اشک سے ہو جیسے بھی ہو
پھول جو تم نے کھلائے ہیں کھلائے رکھنا

نہ سہی میل ملاقات کا یادوں کا ہی
ہم سے جیسے بھی بنے رشتہ بنائے رکھنا

تم ہوئے دور تو آنکھوں نے یہ فن سیکھ لیا
خشک دریاؤں میں طوفان اٹھائے رکھنا

دل کے ماحول کو ظلمت سے بچانے کیلئے
اپنی پلکوں پہ ستاروں کو سجائے رکھنا

شاید آنکلوں کسی رات پھر اس شہر کی سمت
جو دیے تم نے جلائے ہیں جلائے رکھنا

پتہ :- صدر شعبہ اردو دنیا فیکلٹی آف اورینٹل لرننگز، جموں یونیورسٹی ۔ جموں (جے اینڈ کے)

غزل

ثریا صولت حسین

مسلی کلیاں کھلا گیا کوئی
دل تھا ویراں بسا گیا کوئی

سانحہ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا
ہم نہ بھولے بھلا گیا کوئی

ریگ زاروں پہ پانو جلتے ہیں
راہ کیسی دکھا گیا کوئی

فرطِ غم میں بھی مسکراتے ہیں
دے کے مژدہ رلا گیا کوئی

میرے گلشن میں جس سے خوشبو تھی
وہ کلی تر چرا گیا کوئی

تجھ کو مہلت نہ دی زمانے نے
اے ثریا چلا گیا کوئی

ثریا صولت حسین ۔ پتہ نزد ہائی کورٹ سول لائنس ۔ ناگپور ۱۰۰۴۴

اپریل ۱۹۸۸ء

حیدرآباد

ج ۵ — ش ۴

ماہنامہ شاداب

قیمت فی پرچہ ۵ روپئے

زرتعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپئے	150 روپئے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپئے
دو سال	90 "	270 " "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 "	2500 " "	450 "	300 "	4000 " "

ترسیل زر کا پتہ: **ماہنامہ شاداب** 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل وائٹ پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا۔ ٹیلیفون 229161۔

فہرست

حرفِ اوّل

ادارہ "تعاون" پرنس مفخم جاہ کی رہنمائی میں رضاکارانہ خدمات میں لگے ہوئے تعلیمی اور سماجی اداروں کے درمیان ربط و تعاون کا ایک گرانقدر فریضہ انجام دے رہا ہے۔ "تعاون" کے زیر اہتمام تعلیم اور رضاکارانہ خدمات کے موضوع پر دو روزہ کل ہند سمینار ۱۲ و ۱۳ فروری ۸۸ء کو منعقد کیا گیا۔ جس میں اقلیتوں کے تعلیمی مسائل پر غور کیا گیا۔ ان مباحث کے دوران کسی ادارہ کے مسلم اقلیتی کردار کی واضح صراحت اور تشریح اور معیارات کا مسئلہ بطور خاص موضوع بحث رہا۔ جناب انصر بیگ صدر نشین اے پی اقلیتی کمیشن نے اس مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت نے اقلیتی کمیشن کو کسی بھی تعلیمی ادارے کو اقلیتی قرار دینے کا اختیار دیا ہے۔ لیکن جب کمیشن کسی ادارے کو یہ موقف عطا کرتا ہے تو طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں اور عدالتی فیصلوں کے نتیجہ میں کمیشن کے فیصلوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے تلاش کی ضرورت ہے۔ پروفیسر منظور عالم سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی نے بتایا کہ کسی تعلیمی ادارے کے اقلیتی کردار کے سلسلہ میں مسٹر جسٹس ہدایت اللہ کا فیصلہ ایک واضح نظیر کی حیثیت رکھتا ہے، مسٹر جسٹس اے رگھو دیر سابق کارگزار چیف جسٹس اے پی ہائیکورٹ نے بھی اعتراف کیا کہ کسی ادارہ کو اقلیتی قرار دینے کے مقررہ معیارات کی تشریح مشکل ہے گو اس سلسلہ میں مسٹر جسٹس ہدایت اللہ کے فیصلہ کو انہوں نے بھی ایک سنگ میل قرار دیا۔ نیز موصوف نے مشورہ دیا کہ ایسے ادارے راست بازی اور دیانتداری سے خدمات انجام دیں تو ان کے سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ سمینار میں قرارداد کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ دستوری دفعہ ۳۰ (۱) کے تحت اقلیتوں کو دیئے گئے تحفظات کی مکمل و موثر عمل آوری کی جانی چاہیئے، حکومت اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ترغیب

دینا اور ضروری سہولتیں مہیا کرنے کے علاوہ مسلمہ قرار دیئے جانے یا الحاق کے سلسلہ میں مالیاتی موقف کے مقررہ اصولوں کو لچکدار بنایا جائے' اقلیتی کیشن کو با اختیار اور قانونی موقف عطا کیا جائے اور اسے اقلیتوں کے مفادات اور حقوق کے تحفظ کی نگرانی کے مکمل اختیارات دیئے جائیں۔ حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ ۱۱ر جنوری ۸۸ء کے چیف منسٹر کے اعلانات کے مطابق ایجوکیشنل ایکٹ میں مناسب ترمیمات کی جائیں تاکہ اقلیتیں مطمئن ہوسکیں۔ ہر تعلیمی ادارہ کو حکومت گرانٹ ان ایڈ جاری کرے۔ اور ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے بھی مالیہ فراہم کرے۔ ساتھ ہی رضاکارانہ خدمات انجام دینے والے اداروں پر بھی زور دیا گیا کہ وہ تعلیمی اداروں کو تجارتی انداز میں چلانے سے احتراز کریں' اپنے اساتذہ کو سرکاری مدارس کے اساتذہ کے مساوی تنخواہ اور مراعات دیں اور حقوق کے عطا کرنے میں دیانتداری اور فراخدلی سے کام لیں تاکہ ان کے اپنے حقوق کی طلبی اور تحفظ کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ ادارے ان مشوروں عمل کریں تو ان کے سارے مسائل ان کے حسب منشاء حل ہونگے اور ان کے مقاصد کی تکمیل بھی ہوگی۔

×——×——×

ہیں مگر اقبال کا تصورِ الٰہ کے دل سے قائل ہیں۔ وہ اقبال کی "تشکیلِ الہیات جدید" کو اسلام کی نشاۃ الثانیا کے مترادف سمجھتے ہیں۔

اس زمانے میں جب میں ان کا باضابطہ طالب علم تھا وہ اقبال پر عموماً لکچر دیا کرتے تھے اور اکثر پوری پوری نظمیں زبانی سنا دیا کرتا۔ خاص طور سے لینن ۔ خدا کے حضور میں"۔ جبریل وابلیس (مکالمہ)" اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" وغیرہ ان کی محبوب نظمیں تھیں۔ ان نظموں کو جب وہ ڈرامائی انداز میں پڑھتے تو اکثر میرے دل میں خیال آتا کہ لینن تو خدا کا منکر تھا' اس کو خدا کے حضور پیش کرکے علامہ نے خود اپنے کسی جذبے کی تسکین چاہی یا اس یا اس کے نظریات سے اتفاق کرنے کے لئے ایک بہانہ تراشا۔ ! اسی طرح ابلیس کے لہجے کا باغیانہ انداز کبھی کبھی مجھے یہ سوچنے پر اکساتا کہ ابلیس کی نفسیات سے ہم آہنگ ہوئے بغیر یہ لہجہ کیسے اپنایا جاسکتا ہے ! چنانچہ ایک دن میں نے اختر صاحب سے پوچھ بھی لیا۔ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔

حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھی

قرآن ہم سے کیا کہتا ہے؟

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین یا منافقین کی جو صفات بیان فرمائی ہیں، اگر وہی صفات ہمارے اندر پیدا ہو جائیں تو کیا یہ رونے کا مقام نہیں ہے؟ حق تعالیٰ مشرکین کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا، أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

(ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ (ہی میں رہنے) کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے (نام کو تو) دل (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (حق بات کو) نہیں سمجھتے (چونکہ اس کا ارادہ ہی نہیں کرتے) اور جن کے (نام کو تو) کان (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (متوجہ ہو کر حق بات کو) نہیں سنتے (غرض) یہ لوگ (آخرت کی طرف سے بے توجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ یہ لوگ ان چوپایوں سے بھی زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ) یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں۔

اب آپ بتلائیے کہ اگر ہم قلوب سے نہ سوچیں اور آنکھوں سے جو چیز دیکھنے کی ہے سے نہ دیکھیں تو ہم اس آیت کا مصداق بن جائیں گے یا نہیں؟ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ہم کس مقام پر ہیں، جو شخص قرآن پر اور اللہ پر ایمان رکھتا ہے اسے سوچنا پڑے گا کہ قرآن ہم سے کیا کہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ دیکھو اللہ نے دل دیا ہے اور عقل و فہم عطا فرمائی ہے تو اسی لئے کہ ہم سوچیں کہ دنیا میں کس لئے آئے ہیں اور ہماری زندگی کا کیا مقصد ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۝

(ترجمہ: زمین میں ہے سب ... تمہارے (نفع) کے لئے پیدا فرمایا ہے۔

یہ آسمان و زمین، شجر و حجر، دریا و سمندر، دنیا کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے پیدا فرمائی ہیں اور بے شمار نعمتیں ہم کو عطا فرما رکھی ہیں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آنکھ دیا ہے جس سے ہم دیکھتے ہیں، کان دیا جس سے ہم سنتے ہیں، زبان دیا جس سے بولتے ہیں، ہاتھ پاؤں دیا جس سے ہم چلتے پھرتے اور اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں، دماغ اور دل دیا جس سے ہم سوچتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اتنی بڑی نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنے سے ہم قاصر ہیں ان نعمتوں کی قدر اس وقت معلوم ہوگی، جب خدانخواستہ ان میں سے کوئی تلف ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں بے کار ہو جائیں دماغ ماؤف ہو جائے تو کچھ نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ نے جو ان سب نعمتوں کو محفوظ رکھا ہے یہ بھی ان کا بہت بڑا کرم ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے فائدے کے لئے طرح طرح کے میوے اور ہر موسم میں رنگ برنگ کے پھل پیدا فرمائے ہیں یہ سب چیزیں حضرت انسان ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ آخر انسان کو کس لئے پیدا فرمایا ہے؟ تو سن لیجئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے پیدا فرمایا ہے، چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (ہم نے جن اور انس کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ ہماری عبادت کریں اور ہماری معرفت حاصل کریں۔)

پس ہم کو چاہیے کہ کسی وقت بیٹھ کر سوچیں کہ ہم دنیا میں جس مقصد کے لئے آئے ہیں اس کو کس قدر پورا کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ یہاں سے ہم کو جانا ہے اور اس زندگی کا جواب دینا ہے ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ لوگ اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، کتنے لوگوں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا کر دیا مگر تعجب ہے کہ ہم کو عبرت نہیں ہوتی اور یہ نہیں سوچتے کہ ہم پر بھی یہ وقت آنے والا ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ سب کاموں سے الگ ہو کر تھوڑی دیر بیٹھ کر یہ سوچیں کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اس کو ہم پورا کر رہے ہیں یا نہیں کیا انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ جس خالق و مالک نے ہم کو بے شمار نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں اسی کی ہم نافرمانی اور ناشکری کریں؟

بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ بھوک لگی کھانا کھا لیا۔ نیند آئی سو رہے اور خواہ

نفسانی کا جو تقاضا ہوا اسے پورا کرلیا؟ اگر اسی کو ہم نے زندگی کا مقصود اور حاصل سمجھا تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہا؟ اور اگر ہم نے مال و دولت جمع کرلیا، دنیاوی ساز و سامان اکٹھا کرلیا، بہت سے محل و مکان بنالیے جب بھی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہوا ایسی زندگی تو کافر کی زندگی ہوتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ ٥

(تھوڑے دن کھالو اور نفع اٹھالو، یقیناً تم لوگ مجرم ہو۔

مومن کے کھانے اور کافر کے کھانے میں بہت فرق ہے۔ مومن اس لئے کھاتا ہے کہ طاعت و عبادت پر قوت حاصل کرے۔ اگر ہم اس نیت سے کھائیں اور سنت کے مطابق کھانا کھائیں، تو کھانے پر بھی ثواب ملے گا۔ اور کھانا بھی کیا، تمام عادات میں اگر سنت کا لحاظ کیا جائے تو عادات بھی عبادات بن جائینگی۔

مثلاً جب استنجاء کرنا ہو تو پہلے دعا پڑھیں، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ اور بیت الخلاء میں بائیں پاؤں سے داخل ہوں اور واپسی میں پہلے داہنا پاؤں باہر نکالیں اور دعا پڑھیں:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَبْقٰی عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ۔ تو جتنا وقت استنجاء میں صرف ہوا وہ سب عبادت میں شمار ہوگا۔ یہ بھی ہماری شریعت کا کمال ہے کہ اس میں ہر چیز کی تعلیم موجود ہے حتیٰ کہ استنجاء کرنے کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے۔

ایک صحابی سے کسی یہودی نے ازراہ تمسخر کہا تھا کہ تمہارے نبی تو ایسے ہیں جو استنجاء کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ تو ان صحابی نے جواب میں فرمایا کہ بیشک ہمارے نبی ایسے ہیں جو ہر چیز کا طریقہ بتلاتے ہیں اور استنجاء کرنے کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں کہ بائیں ہاتھ سے استنجاء کرو اور پاک مٹی و پتھر سے استنجاء کرو لید، گوبر اور ہڈی سے استنجاء نہ کرو۔ اگر آپ اس کی تعلیم نہ فرماتے تو ہم کو استنجاء کرنا بھی نہ آتا۔

آئیے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کے انعامات میں غور کرو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی قدر کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بناکر بھیجا اور نہایت سہل اور آسان شریعت آپ کو عطا فرمائی۔ آپ حضرات کو معلوم ہے کہ شب معراج میں پچاس وقت کی نمازیں اور ایک سال کا روزہ فرض ہوا تھا۔ لیکن اللہ کے رسولؐ نے موسیٰ علیہ السلام کے فرمانے سے تخفیف کی درخواست کی تو پانچ وقت کی نماز اور

ایک ماہ کا روزہ باقی رکھا گیا۔ مگر اجر و ثواب کے اعتبار سے پچاس ہی وقت کی نماز رہیں یہ کتنا بڑا انعام ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ میں محض چالیسواں حصہ فرض کیا گیا۔ ان سب چیزوں میں غور کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کی معرفت ہو گی۔ اگر آدمی ان امور میں غور کرتا رہے تو اس کے نفس میں کبھی بڑائی اور غرور و پندار نہ پیدا ہو۔ اگر انسان کو خود اپنی معرفت ہو تو کبھی تکبر و غرور نہ کرے اور عجب و خود پسندی میں نہ مبتلا ہو۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو مناجات کی لذت و حلاوت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ پس دعا جو مغز عبادت ہے جب اس کی لذت چھین لی جاتی ہے تو پھر عبادت میں بھی لذت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے معصیت سے جہاں تک ہو سکے اجتناب کریں اور غفلت کے ساتھ زندگی نہ گزاریں۔ اللہ کو یاد کریں۔ توبہ واستغفار کرتے رہیں۔ موت کو یاد رکھیں۔ اس سے غفلت دور ہو گی۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت کو یاد کرو۔

لہٰذا اللہ و رسول کے حکموں کے مطابق زندگی گزاریں۔ جو لوگ علم رکھتے ہیں، وہ کتابوں کو دیکھ کر عمل کریں اور جو علم نہیں رکھتے وہ علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝ (ہم نے تم کو اسی مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ زندہ کریں گے) ان آیات میں غور کریں تو ہماری غفلت دور ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ آمین

☆ ☆ ☆

مولانا عبدالعرفان خاں ندوی

مطالعہ کیا.... اور کیسے؟

آج ہماری گفتگو کا موضوع "مطالعہ کیا اور کیسے" ؟ ہے، یہ موضوع ہمارے اور آپ دونوں کے لئے یکساں نافع اور مفید ہے، اور ہماری اور آپ کی ایک مشترک ضرورت ہے۔ میں نے شروع میں "... گفتگو کہا ہے اور میرے نزدیک یہ تعبیر اس وقت زیادہ صحیح ہے۔

... اپنے گھر میں آپ طلباء سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، آپ نے یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی گھرانے کا ... بڑا شخص اگر اپنے چھوٹوں کو کچھ نصیحت اور ان سے کام کی باتیں کرنا چاہتا ہے تو سب کو ... اکے سامنے تقریر کرتا ہو، لیکن آپ نے یہ بارہا سنا ہوگا کہ فلاں بزرگ نے اپنے بچوں کو ... میں ایک جگہ بٹھا کر یہ گفتگو کی، اپنوں میں تقریر و خطابت نہیں ہوتی بلکہ گفتگو اور نصیحت ہوتی ہے، اور آج میں آپ کے سامنے اس موضوع سے متعلق اپنی جانی بوجھی باتوں کو آ... کو بذریعہ گفتگو بتانا چاہتا ہوں۔

... اپنی اس گفتگو میں کوئی نئے نئے حقائق کوئی نئے نئے معانی نہیں بتاؤں گا حقائق و ... اقتیں پرانی ہیں۔ وہی پرانی باتیں میں عرض کروں گا یہ الگ بات ہے کہ اس کو نئے ... نئے اسلوب سے بیان کردوں۔ اس لئے کہ تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بنی نوع انسان کے اس دنیا میں وجود میں آنے سے پہلے سے قائم ہے " وعلّم آدم الأسماء کلها" یہاں سے تعلیم و تعلّم کا سلسلہ شروع ہوا ہی اور ظاہر کہ جب اللہ تعالیٰ نے وعلم آدم الأسماء کلها فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ و تعلّم آدم الاسماء کلها اور اس کے بعد کی بات قال یا آدم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم باسمائهم" اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تعلیم ان کو دی تھی اور فرمائی تھی اس کو انہوں نے حاصل بھی کرلی اور اس کا اظہار و ... بھی فرمادیا۔ سورۂ اقرأ میں کیا ہے؟ اقرأ باسم ربک الذی خلق،

خلق الانسان من علق، اقراء وربک الا کرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم، یعنی تعلیم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور انسانوں کا تعلیم حاصل کرنا یہ انسانی خصوصیات و امتیازات سے ہے۔ اس کی کوئی تاریخ ابتداء نہیں مقرر کی جاسکتی، جیسا کہ میں نے مثالوں سے آپ لوگوں کے سامنے عرض کیا۔

تعلیم و تعلم کے سلسلہ سے میرے نزدیک دو باتیں ایسی بنیادی ہیں کہ اگر وہ ذہن میں رہیں گی، تو انشاء اللہ تعلیم و تعلم کے میدان میں آپ کے لئے مفید ہوں گی پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ جن کی حیثیت علم و تعلیم کے میدان میں تخم ریزی کی ہے ایک اعتراف جہل ہے۔ اور دوسری چیز ہے دفع جہل، انسان کی فطرت میں تجسس ہے انسان جس چیز کو نہیں جانتا اس کا اعتراف چاہے زبان سے نہ کرے، لیکن زبان حال سے ضرور کرتا ہے۔ اس اعتراف کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ اس جہل و نادانی و ناواقفیت کو ہمیں دور کرنا چاہیے۔ یہاں سے اس کی تجسس جو اس کی فطرت ہی کام کرتی ہے وہ اپنی تلاش و جستجو کے ذریعہ سے نامعلوم کو معلوم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن میں اس کی تین راہیں مقرر کی گئی ہیں۔ آیت ہے " بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر " یعنی تحصیل علم کے تین طریقے ہیں۔ کسی شخص کا صحیح بات جاننا یا تو کسی کے بتانے سے ہوتا ہے۔ جیسے خدا ہدایت کہتا ہے۔ یا تو آدمی اپنے ذاتی غور و فکر سے اس کو جانے۔ اور یا یہ کہ لکھی ہو کتاب کے مطالعہ سے جانے۔

یہاں جو اللہ تعالیٰ نے یہ تین الفاظ فرمائے ہیں۔ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر،، علم سے مراد ذاتی مطالعہ یعنی اس پر غور و خوض، تدبر اور اس سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، ہدایت کے معنی دوسرے سے معلوم کرنا یا کوئی دوسرا بتائے اس کی حیثیت استاد کی سمجھئے، اور تیسری چیز یہ ہے کہ کوئی شخص بیچ میں نہ ہو، بلکہ کتاب ہو۔ کتاب میں آدمی پڑھے، تو یہ تین ذریعۂ علم ہیں۔ ان میں جس ذریعۂ علم کو اہمیت حاصل ہوئی ہے اور جو ذریعۂ علم زیادہ رائج ہے وہ ہے کسی سے معلوم کرنا یعنی کسی سے شاگردی کا تعلق قائم کرنا اور پھر اس کے بعد جب .. شاگردی کے تعلق کی ایک مدت گذر گئی اور استاد کی بتائی ہوئی چیزیں ذہن میں آگئیں تو ان کے ذریعہ سے اور ان کی بنیاد بنا کر ان پر غور و خوض کیا جائے۔ اور بات آگے

بڑھائی جائے علم کو وسیع کیا جائے۔ یا صرف کتابوں کے مطالعہ سے اس کو وسیع کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی کتابوں کا مطالعہ استاد کی رہنمائی کے بعد۔ اور پھر ایک یہ تیسرا مرحلہ آتا ہے کہ جو چیزیں آدمی نے جانی ہیں۔ یعنی کتابوں سے جانی ہیں یا استاد سے جانی ہیں۔ ان پر غور و خوض کر کے بغیر اس کے کہ سامنے کوئی کتاب ہو اپنی معلومات میں آدمی اضافہ کرے۔ یہ تین مرحلے ہیں۔

انسان کا معاملہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ انسان حصول علم کے لئے بے چین ہے، اس کی فطرت میں حصول علم ہے، چاہے یہ اصطلاحی علم نہ ہو، یعنی وہ انجانی بات کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ انسان کے وجود کے دن سے آج تک قائم ہے۔ یعنی انسان میں قناعت نہیں ہے علم کا کسی مرحلہ پر رک جانا یا اس بات سے مطمئن ہو جانا کہ بس ہو گیا۔ بس میں عالم و فاضل ہو گیا۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور پوری انسانی تاریخ بتلاتی ہے کہ انسان نے ایسا نہیں کیا۔ انسان نے بحیثیت مجموعی قناعت نہیں کی۔ آپ ان علوم میں دیکھئے جو علوم دنیاوی کہے جاتے ہیں۔ یعنی کون ایسے طریقے اور کون ایسی معلومات ہیں کہ ان کے ذریعہ سے زائد سے زائد راحت حاصل ہوتی ہے اور اس دنیا میں جو انسان زندگی بسر کرتا ہے وہ زائد سے زائد اس کے لئے آرام دہ ہو، یہ ہیں علوم دنیاوی۔

اب آپ غور کر لیجئے چاہے علم الحساب ہو چاہے علم الہئیت ہو چاہے علم الھندسہ ہو چاہے علم السیاسہ اور چاہے علم الطب ہو ان سب کی حقیقت کیا ہے، اور دوسرے جو بہت سے علوم پیدا ہو گئے ہیں موجودہ عہد کی سائنس یہ موجودہ عہد کی سائنس نہیں ہے۔ ہزاروں سال انسان نے محنت کی اجسام طبعیہ پر۔ اجسام طبعیہ کے خصائص جاننے کی کوشش کی اور صدیوں اور سیکڑوں محققین کی کوششوں کے نتیجے میں اب علوم اسی درجہ تک پہونچ گئے ہیں کہ انسان اس سے زائد سے زائد مستفید ہو رہا ہے۔ اور زائد سے زائد آرام حاصل کر رہا ہے۔

لیکن اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ قناعت نہیں ہے اگر سمجھیں کہ انسان نے بجلی کا پنکھا بنا لیا تو بس وہ قانع ہو گیا، اب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تو معاملہ ایسا نہیں ہے۔ انسان نے جہاز بنا لیا، معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اس نے کہا کہ بس بس اب بہت کافی ہے، بلکہ جہاز زائد سے زائد تیز رفتار بنائے جائیں، زائد سے زائد اس میں سہولت رکھی جائے، اور اس پر برابر غور و خوض ہو رہا ہے، تو انسان

کی فطرت میں عدم قناعت جو ہے یہ بھی تحصیل علم کی راہ میں انسان کے لیے معاون ہے بشرطیکہ ان صلاحیتوں کو آدمی سمجھے اور ان کو بروئے کار لائے، آپ اس دنیا کی جو بھی چہل پہل دیکھ رہے ہیں وہ اسی عدم قناعت کا نتیجہ ہے۔ ابھی میں علوم دینیہ کی بات نہیں کر رہا ہوں، علوم دنیادی وہ علوم ہیں جس سے روزمرہ آپ کو سابقہ ہے اور جن سے آپ متمتع و مستفید ہو رہے ہیں، ان علوم کے بارے میں میں کہہ رہا ہوں) یہ علوم جو صدیوں کی کوششوں کے بعد مرتب و مدون ہوئے ہیں اور صدیوں سیکڑوں انسانوں کی محنت اور ایک ایک قدم آگے بڑھ کر وہ کمال کے درجہ تک پہنچے ہیں۔ یہ علوم اور اس سے آپ کی زندگی سوچیئے کتنی راحت رساں ہو گئی ہے۔ لیکن نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ کئی صدیوں اور اس کے بعد کی صدیوں میں انسان قانع ہو کر نئی معلومات جاننے کی کوشش کو ترک کر دیگا۔ ایسا نہیں ہے وہ بڑھتی جا رہی ہے۔ تیز ہوتی جا رہی ہے اور چونکہ یہ علوم تمام بنی نوع انسان کی راحت کے لئے ہیں اس لئے اس میں کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں ہے ایک کافر و غیر مسلم بھی بڑے سے بڑا طبیب ہو سکتا ہے اور بڑے سے بڑا مہندس ہو سکتا ہے۔ اور بڑے سے بڑا حساب داں اور ریاضی داں ہو سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا جغرافیہ داں ہو سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ، یہ تمام علوم جو نافع ہیں حیات دنیادی کے لئے ان علوم کو علوم عقلیہ کہتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض کو علوم تجربیہ بھی کہتے ہیں یہ علوم عقلیہ اور تجربیہ کا معاملہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے، اِنَّ العلوم العقلیۃ لا یقلّد فیھا احد، اس میں کوئی مقلّد اور امام نہیں، اگر امام ہے تو شخص اس بنیاد پر کہ وہ اس فن میں بڑا ماہر گذرا ہے لیکن اس حیثیت سے وہ امام نہیں ہے کہ اس کی بات حرف آخر سمجھی جائے اور یہ کہہ دینے کے بعد کہ فلاں شخص نے یہ بات کہی ہے وہ صحیح ہو جائے، علوم عقلیہ میں یہ تعبیر نہیں ہوا کرتی، یہ تعبیر علوم انبیاء کی ہے۔ اور بجا ہے اور اسی وجہ سے آپ دیکھئے کہ علوم عقلیہ میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں اور علوم عقلیہ میں وضعیں بدلتی رہتی ہیں اور خاص طور سے یہ علوم سائنس جو علوم عقلیہ ہیں یا علوم طبعیہ کہہ دیجئے۔ جو آپ لوگوں کی اصطلاح ہے، علم طب ہے، ان کے نظریات ان کے آراء بدلتی رہتی ہیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا انداز بدلتا رہتا ہے۔ اور بدلا ہے۔ بطلیموس جو علم الافلاک و ہیئت کا مشہور امام ہے اسکی کتاب "مجسطی" ہے ایک ہزار برس تک

لوگوں نے اس کتاب کو انجیل و توارات کی طرح مانا۔ کوئی اس کے خلاف بول نہیں سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ایک کتاب حرف آخر لکھ دی۔ یہ علم الہئیت کی کتاب ہے۔ "بطلیموس" کی "مجسطی" لیکن ہوا کیا؟ جب وقت آیا تو "فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکا" پوری المجسطی" بکھر کر رہ گئی۔ اس کے سارے نظریات ختم ہو گئے، کیونکہ اس کے نظریئے کی اساس تھی زمین ساکن ہے۔ اور فلک متحرک ہے وہ بدل گیا۔ زمین فلک ہو گئی۔ فلک زمین ہو گیا یعنی زمین متحرک ہو گئی اور فلک ساکن ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ وہ کتاب المجسطی جو کسی زمانہ میں انجیل و توارات کی طرح سے مقدس سمجھی جاتی تھی ختم ہو گئی، تو علوم عقلیہ کا معاملہ یہ ہے۔ کسی وجہ سے شیخ الاسلام نے فرمایا "ان العلوم عقلیۃ لا یقلد فیھا احد" اور یہ علوم عقلیہ کسی قوم کی میراث نہیں ہیں یہ نہ کہہ دیا جائے کہ کوئی قوم اس کی مالک ہے۔ علوم دینیہ کا تو معاملہ یہ ہے کہ جو قوم اور جو ملت اور جو جماعت اس دین پر عمل کرتی ہے۔ اور اس دین سے اپنا تعلق رکھتی ہے وہ علوم دینیہ ان کی میراث ہیں۔ دوسرا لاکھ بولے، بڑے سے بڑا مستشرق کچھ کہے۔ لیکن حجت وسند کے موقعہ پر اس کا کلام نہیں پیش کیا جاتا کبھی نہیں پیش کیا جاتا اگر کوئی کتاب لکھی جائے مثلاً علم الحدیث پر یا کوئی کتاب لکھی جائے علم الفقہ پر تو جس طرح یہ کہا جائے گا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے۔ اور امام شافعیؒ نے یہ فرمایا ہے اور فلاں امام صاحب نے یہ فرمایا ہے۔ تو یہ نہیں لکھا جا سکتا کہ فلاں مستشرق نے یہ فرمایا ہے۔ اس سیاق میں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ علوم دینیہ، اس دین کی حامل کی میراث ہوتی ہے لیکن علوم عقلیہ اپنا جغرافیہ بھی رکھتے ہیں۔ اپنی آراء نظریات بھی بدلتے ہیں۔ اس کی وضع وشکل اور اس کی ہیئت بھی بدلتے ہیں۔ اور اپنے حاملین کو بدل دیتے ہیں۔ علوم عقلیہ کا ایک زمانہ میں چرچا یونان میں تھا۔ تو یونان سے وہ علوم عقلیہ اسکندریہ آئے پھر وہ علوم عقلیہ مابین النہرین آئے۔ وہاں سے پھر مسلمانوں کے پاس آئے۔ اور پھر مسلمانوں کے پاس سے یورپ چلے گئے۔ یہ آپ لوگ جو فخر کرتے ہیں کہ یورپ نے ہم سے لے کر یہ سب کیا ہے۔ اس میں یہ بھی جوڑ لیا کیجیئے کہ آپ نے کس سے لیا ہے۔ یہ طب ہے آجکل طب یونانی کے حامل زیادہ تر مسلمان ہیں۔ غیر مسلم بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر مسلمان ہیں۔ لیکن یہ لفظ ہی بتاتا ہے کہ ہم نے یونانی قوم سے اس طب کو لیا تھا۔ جب تک کسی جماعت یا کسی ملت کے پاس یہ علوم عقلیہ یا اس کی کچھ شاخیں

نظر آتی ہیں۔ اس وقت تک معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے بھی اضافہ کیا۔ علم طب میں کیا اور بھی بہت سے علوم مثلاً علم الادویہ میں کیا۔ لیکن اب یورپ میں جب گیا تو زمانہ اور آگے نکل چکا تھا۔ میں بہت دور نکل گیا۔ تحصیل علوم کی بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان کے اندر اعتراف جہل ہو۔

اگر پوچھا جائے کہ ابتداء کہاں سے ہے اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ تو کہا جائیگا کہ اعتراف جہل اور اس جہل کو دور کرنے کی کوشش ہے ایک چیز تو یہ ہوا، اور یہی تجسس ہے اس کے علاوہ آپ پوری تلاش کر لیجئے کوئی چیز آپ کو نہیں ملے گی اور یہی عدم قناعت ہے۔

دوسری چیز اور بھی روزمرہ کی مثالوں سے آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اصل چیز جو انسان کی ہے۔ وہ محنت ہے فن معاشیات کہتا ہے کہ یہ نقد روپیہ اصل چیز نہیں ہے بلکہ انسانی محنت لگتی ہے تو وہ چیز کیا ہو جاتی ہے؟ وہ چیز زیادہ یا وزن ہو جاتی ہے، زیادہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ ایک گیہوں کے چند دانے مان لیجئے کہ جن کی مقدار ایک کیلو ہے جب وہ کاشتکار نے اس پر محنت صرف کی کہ اس کو اس نے کھیت میں ڈالدیا، ایک مناسب زمین میں ڈال دیا اور مناسب وقت تک انتظار کیا تو وہ ایک کیلو ایک من ہو گیا۔ اس کا وزن بڑھا اس کی قیمت بڑھی اور اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اسی کو جب خریدار نے خریدا اور اس کا آٹا بنایا تو اس کی قیمت اور اہمیت اور افادیت مزید بڑھ گئی۔ دیکھئے محنت سب جگہ لگ رہی ہے اور پھر جب کسی روٹی پکانے والے نے روٹی بنائی تو اس کی افادیت و نافعیت براہ راست ہو گئی اور اب اس کی قیمت اور بڑھ گئی۔ تو انسان کو جو چیز کامیاب کرتی ہے یا انسان کو جو چیز کسی چیز کو دلاتی ہے وہ اصل محنت ہے۔ یہ تمام دنیا کے لوگوں کا اتفاق ہے کہ اصل چیز محنت ہے روزمرہ کی زندگی میں آپ دیکھ لیجئے ایک چھوٹی سی لکڑی پڑی ہوئی ہے ایک بڑھئی نے اس کو دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ میرے کام کی ہے، اس کو تراش خراش کر کوئی بامقصد چیز اس کی بنادی۔ اب اس کی قیمت بڑھ گئی، اس کی نافعیت بڑھ گئی، کیوں بڑھ گئی؟ اس لیئے کہ اس میں محنت صرف کی گئی ہے، اس کی نافعیت بڑھ گئی۔ اس کی نافعیت بڑھ گئی تو حصول علم کا معاملہ یہ ہے۔

اب براہ راست میں اس موضوع پر آنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے تعلیم کی تحصیل کا ایک طریقہ تو وہ ہے جس کو استاد سے پڑھنا کہتے ہیں جس کو کہہ لیجئے کہ درسی کتابوں کا پڑھنا

اور ایک یہ، ہے اُستاد براہ راست سامنے تو نہیں ہے بلکہ کسی مصنف یا کسی محقق کی کتاب کو پڑھنا اور اس سے علم حاصل کرنا، اور ایک چیز وہ ہے کہ کسی صاحب علم و فن کے ماہر یا ایک شخص معلومات عامہ رکھتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس سے سوالات کر کے یا سوالات نہیں تو مجلس میں گفتگو سے جو معلومات حاصل ہوئیں یہی تین چیزیں ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ قدر مشترک یہ ہے کہ جیسے آپ بازار گئے، آپ نے ایک دکان کپڑوں کی دیکھی، آپ نے ایک دکان فرنیچر کی دیکھی، آپ نے ایک ہوٹل دیکھا وغیرہ وغیرہ آپ نے کمالیات کا سب سامان دیکھا، چار گھنٹے بیٹھے رہے کھڑے رہے، کوئی چیز آپ کی نہیں ہوگی، آپ دن بھر گھومئے اور ایک سے ایک دکان دیکھئے۔ لیکن کوئی چیز آپ کی نہیں ہوگی۔ آپ کی کب ہوگی جبکہ آپ جیب سے پیسے نکال کر اس کو خرید لیں، اب وہ چیز آپ کی ہوگی اور آپ اس کو گھر لائیں اب وہ آپ کی خاص الخاص چیز ہوگی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ علوم کتابوں میں رکھے ہوئے ہیں کتابیں اس طرح سے علوم کا بازار ہیں اس بازار میں اگر آپ صرف مشاہد رہیں گے اور آپ کا ذہنی و فکری عمل اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہوگا تو اس کی تمام بارونق چیزوں میں سے کوئی چیز آپ کی نہ ہوگی ہو نہیں سکتی جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ محنت چیزوں کو بناتی ہے۔ آپ کسی کتاب کے پڑھنے کے وقت یہ دیکھئے اور یہ فیصلہ کیجئے کہ آپ جو کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اس میں آپ کی محنت کا کتنا حصّہ لگا ہے یہ فیصلہ کن بات ہو جائیگی، آپ نے کتنی محنت لگائی، اگر معاملہ اتنا ہی ہے کہ کسی کتاب کا گھنٹہ ہوا آپ نے کتاب کھول دی، اور آپ درجہ میں حاضر رہے اور وقتاً فوقتاً دماغ غائب رہا اور پھر آپ نے کتاب بند کر دی، تو آپ نے کوئی محنت اس میں صرف نہیں کی، آپ نے کیا عمل کیا؟ جس کی وجہ سے اس بازار کی وہ چیز آپ کی بن جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ کچھ عمل ایسا کریں کہ وہ چیز آپ کی بن جائے۔ آپ کی بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی فکر آپ کی ثقافت آپ کے علم کا وہ جزء بن جائے، اگر آپ کوئی غذا استعمال کرتے ہیں اور وہ آپ کے لئے طبی بنیاد پر مفید نہیں پڑی۔ تو وہ آپ کے جسم کا جزء نہیں بنتی۔ اور وہ آپ کے لئے مقصد پورا نہیں کرتی ہے جو غذا کھانے کا ہوتا ہے۔

اس لئے کہ آپ نے صحیح طریقہ سے اسے نہیں کھایا، صحیح وقت پر نہیں کھایا، آپ کا پیٹ بھرا ہوا تھا اس وقت آپ نے کھا لیا وغیرہ وغیرہ تو وہ غذا آپ کا جزء بدن نہیں

بنیں۔ یہی حال علوم کا ہے اور یہی کتاب سے متعلق معلومات کا ہے کہ آپ اس پر جو غور صرف کریں گے، اور آپ فکر کا جو حصہ دیں گے۔ وہی چیز آپ کی ہو گی، اگر آپ نہیں دیں گے تو وہ چیز آپ کی نہیں ہو گی۔

اس کی شکل کیا ہے؟ اس کی شکل بہت صاف یہ ہے کہ کتاب پڑھنے سے پہلے، استاد کے یہاں جانے سے پہلے اس کا مطالعہ کر لو کہ آج ہمیں کیا پڑھنا ہے، آپ میں ہر شخص کو وہی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ جو اس کتاب کو سمجھنے کی کسی درجہ میں صلاحیت رکھتا ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر سرے سے وہ سمجھ ہی نہیں سکتا ہے تو یہ ہمارے نظام تعلیم کا نقص ہے کہ وہ پاس و فیل ہونے کا معیار ہے اس کی بنیاد پر اس کو وہ کتاب دی گئی، کتاب کے پڑھنے کا مستحق وہی آدمی ہے جس کا اکثر حصہ خود محنت و توجہ سے نکال سکے، تو پہلا کام تو مطالعہ کا ہے، مطالعہ میں ایک صفحہ آپ کی نظر سے گذرا۔ پھر جو چیز آپ کے مطالعہ میں سمجھ میں نہیں آوے گی اس پر آپ کو فکر ہو گی کہ کیا مطلب ہے؟ نہیں سمجھ میں آیا، اچھا جب استاد پڑھائیں گے تو غور سے سن کر یہ مطلب حل ہو جائیگا سمجھیں گے کہ اس کا کیا مطلب ہے تو آپ کے ساتھ اس میں طلب لگی ہو گی اور یہ طلب بھی بہت نافع ہے یہ طلب و اشتیاق آپ کو مجبور کریگا کہ آپ سبق غور سے سنیں اور یہ جانیں کہ ان جگہوں پر جو میں نے نہیں سمجھا تھا استاد نے یہ بتایا، طلب کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ ذہن میں قائم رہنے والی ہوتی ہے اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو آپ نے پڑھا ہے۔ اس پر نظر ثانی کریں۔ یہ بات ٹھیک ہے یہ ہم کو نہیں آ رہی تھی یہ استاد نے بتایا اب آپ کا جب یہ تین عمل ایک ایک صفحہ کے ساتھ ہوا تو وہ چیز ظاہر ہے کہ آپ کی محنت سے تا دیر قائم رہے گی آپ کی فکر کا جزء بنے گی آپ کی ثقافت کا جزء بنے گی اور یوں کہئے کہ آپ کے دماغ کو اس کی غذا ملی، ذہن کو آگے بڑھانے کی اور آگے بڑھنے کی۔ آپ، ہم سے کہیں گے کہ یہ بہت بڑی بات ہے لیکن میں کیا کروں۔ اس کے علاوہ کوئی صورت مجھ کو بتلا دیجئے کہ آپ کچھ نہ کریں۔ کوئی عمل نہ کریں، اور یہ چاہیں کہ یہ صفحہ مجھ کو آ جائے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کو کچھ عمل کرنا ہو گا۔ جتنا زائد عمل کریں گے اتنے ہی وہ چیزیں آپ کو آئیں گی کہ آنے کا اتنا مطلب نہیں ہوتا کہ کتاب جب کھولی جائے تو آپ اس کا مطلب بیان کر دیں۔ آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات جس موضوع سے

متعلق ہے، جس سیاق وسباق میں ہے۔ اس کی وضع صحیح جان لی جائے، یہ حصہ جتنا حاصل ہوگا وہ آپ کا ہے۔ مثلاً اصول فقہ میں امر و نہی کی بحث ہے تو امر و نہی کا اصول فقہ میں کیا مقام ہے؟ اور اصول فقہ میں امر و نہی کی بحث کیوں آتی ہے؟ یونہی لکھ دی گئی ہے؟ اس سے اہم بات کتاب سے الگ ہو کر سوچنے کی ہے کہ کتاب میں تو اتنا پڑھا استاد نے اتنا بتایا لیکن کتاب سے بے نیاز ہو کر ہم کو جو ایک سوچنے کا میدان ملا ہے ایک افق ملا ہے اس میں ہم خود سوچیں کہ کیا کیا ہو سکتا ہے۔ اور کیا کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ اور یہ عمل جب آپ کو آجائے گا، اور اس میں آپ کو مہارت ہو جائے گی، تو آپ کو اس فن میں بھی مہارت ہو جائے گی، آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اس فن میں فلاں نے پچیس کتابیں پڑھی ہیں اس لئے زیادہ لائق ہے اور فلاں شخص نے اس فن کی بیس کتابیں پڑھی ہیں اسلئے وہ اس سے کم لائق ہے۔ ایسا ہے نہیں اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ ایسی توفیق دیتا ہے کہ کسی فن کی دو تین کتابیں پڑھنے سے آدمی کا افق وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ تمام مسائل کی وضع صحیح جان لیتا ہے وضع صحیح کا مطلب سمجھتے ہیں ہر چیز کا جز ا، علم میں مقام ہے، کون غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے جیسے درخت ہے اسکا جو تنا ہے۔ وہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ادھر ادھر کی شاخیں ہیں، لیکن اگر شاخیں کاٹ دی جائیں تو درخت موجود ہے لیکن اگر تنہ کاٹ دیا جائے تو درخت ختم ہے، تو جانئے یہی چیز کہ اس فن میں اساسی باتیں کون ہیں جن کی حیثیت تنا کی ہے، شجر کی ہے، اور اس علم میں شاخوں کی کیا حیثیت ہے کون کون مباحث وہ ہیں جو شاخ ہیں۔ ۵ ★ ★ ★

اور یہ سب کچھ علیحدہ علیحدہ کون سی تعلیم کے تحت کیا جاتا ہے۔ دین اسلام کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مساوات کی تعلیم ہے، حلقۂ اسلام میں بلا امتیاز سب مسلمان برابر ہیں، فضیلت ہے تو صرف نیکی، پارسائی و پرہیزگاری کی۔ مساجد میں حاکم و محکوم، گورے کالے، امیر غریب سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں، یہاں عیسائیوں کی مانند گوروں اور کالوں کے گرجے الگ الگ نہیں ہوتے امیر لوگ عبادت کے وقت کرسیوں پر نہیں بیٹھتے، نہ غریب اور ناتواندہ لوگ فرش پر بیٹھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تمام کی حیثیت برابر اور یکساں ہے۔ اسلام مساوات و احترام انسانیت کا مذہب ہے اور جس دین میں مساوات ہے۔ وہی دین حق ہے۔ ★ ★ ★

[illegible]

پریس انفارمیشن بیورو۔ گورنمنٹ آف انڈیا

1987-88ء بجٹ اقتصادی جائزہ

1987-88ء کے لیے قبل از بجٹ اقتصادی جائزہ ۲۶/ فروری ۱۹۸۸ء کو پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ جائزہ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۸۷ء کی ملک گیر خشک سالی سے ترقی کی رفتار کو ایک عارضی دھکا لگا جس سے اقتصادی نظم و نسق کے لیے نئے چیلنج پیدا ہوئے لیکن ساتھ ہی ملک کی اقتصادیات کی بنیادی مضبوطی اور کمزوریاں بھی سامنے آئیں۔ سالِ رواں میں اقتصادی نظم و نسق کی توجہ خشک سالی اور اس کے اثرات پر رہی۔ اس مقصد سے متعدد پالیسیاں ایک ساتھ وضع کی گئیں اور انھیں ایک وسیع محاذ پر عملی جامہ پہنایا گیا تاکہ قدرتی مسائل کے بڑے اثرات پر قابو پایا جا سکے۔

جائزہ کے مطابق ملک کی حالیہ اقتصادی کارکردگی کے جو اچھے پہلو عیاں ہوئے وہ یہ ہیں کہ متواتر خراب موسم کے سالوں کے باوجود ہماری زرعی معاشیات بنیادی طور پر مضبوط ہیں۔ صنعت اور دوسرے غیر زرعی زیرے سے زراعت میں خلل و انتشار کا مقابلہ کر سکتے ہیں نامساعد خیالات میں بھی بنیادی ڈھانچے کی ترقی کی رفتار کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی تجارت کے کھاتے میں صحت مند رجحانات اور ہمارا اقتصادی نظم و نسق اقتصادی میدان میں بڑی اور اچانک تبدیلیوں کے چیلنج کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہے۔

سخت سوکھے اور سیلابوں کے باوجود جائزے میں توقع کی گئی ہے کہ مجموعی قومی پیداوار میں اس سال تقریباً ایک سے دو فی صد تک کا مثبت اضافہ ہوگا۔ سخت سوکھے کی حالت میں ملک کی معاشیات کا یہ استحکام کئی اسباب سے ہے۔ مثلاً معاشیات میں تنوع، سوکھے کے آغاز کے وقت خوراک کے بڑے ذخیروں کی موجودگی اور

صحیح وقت پر ایسی پالیسیوں کی تشکیل جن سے سوکھے کے برے اثرات کو کم از کم کردیا گیا۔

زرعی پیداوار

ملک کے 35 منطقوں میں سے 21 میں بارش کم یا بہت کم ہوئی چونکہ یہ سوکھا چار مسلسل خراب مون سونوں کے بعد پڑا اس کا فصلوں کی پیداوار پر بہت برا اثر ہوا، خاص کر خریف فصلوں پر جو اب بھی بارش پر بہت زیادہ منحصر ہے۔ جائزے میں بتایا گیا ہے کہ پیداوار، پچھلے سال کی پیداوار کے مقابلے میں، سات سے دس فی صد تک کم ہوگی۔ خیال ہے کہ حال کے دوران اناج کی کل پیداوار میں بھی اتنی ہی کمی ہوگی۔

زرعی پیداوار میں کمی کے باوجود تقسیم عامہ کے نظام، روزگار کے پروگراموں، امدادی پروگراموں اور دوسرے ذرائع سے اناج کی زیادہ مقدار لوگوں کو مہیا کی گئی۔ یہ اسی سے ممکن ہوا کہ جون ۱۹۸۷ء تک دو کروڑ تیس لاکھ ٹن سے زیادہ کے ذخیرے موجود تھے یہی حکومت کی سوکھے کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کی خاص بنیاد رہی۔ اس سلسلے میں جو دوسرے قدم اٹھائے گئے وہ یہ تھے۔ خریف فصل کے نقصانات کو کم از کم کرنے کے لیے فوری اقدام، سینچائی کے لیے زیادہ وسائل کی فراہمی زیر تکمیل پراجیکٹوں کی جلد از جلد تکمیل، دوسری فصل اگانے کے لیے قرضوں کی فراہمی اور ربیع کی فصل کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی مہم جس میں زراعت کے لیے درکار بڑی بڑی چیزوں بشمولیت بجلی کی فراہمی شامل ہے۔

صنعتی کارکردگی

خشک سالی کے برے اثرات باوجود رواں سال کے پہلے آٹھ ماہ (اپریل ۱۹۸۷ تا نومبر ۱۹۸۷ کے دوران جس کے اعداد و شمار دستیاب ہیں۔ صنعتی کارکردگی کافی اطمینان بخش رہی ہے صنعتی شعبے میں اس مدت کے دوران مجموعی طور پر 10.2 فی صد

کی شرح ترقی رہی جو کہ پچھلے تین برسوں میں اسی مدت کے دوران حاصل کردہ 5.8 تا 9 فی صد کی شرح ترقی سے کافی زیادہ ہے۔ پچھلے تین برسوں کے دوران حاصل کی گئی یہ شرح ترقی بھی اس دہائی کے پہلے نصف حصے اور اس سے پہلے حاصل کردہ شرح ترقی سے کہیں زیادہ تھی ساز و سامان تیار کرنے کے شعبے کی شرح ترقی تو اس سے بھی زیادہ رہی جو رواں مالی سال کے پہلے آٹھ ماہ کے دوران گیارہ فی صد تھی۔ توقع ہے کہ مالی سال کے چار مہینوں کے دوران صنعتی شعبے کی سرگرمیوں میں آنے والی کمی کے دوران کے امکان کے باوجود صنعتی ترقی کی شرح پورے مالی سال کے لیے آٹھ فی صد سے زائد رہے گی۔

جائزے کے مطابق اگر ہم اپنی اس صنعتی ترقی کا تجزیہ سابقہ سالوں کی شدید خشک سالی کے پس منظر میں کریں تو دیکھیں گے کہ یہ شرح ترقی جن وجوہات کی بناء پر ممکن ہو سکی ہے وہ یہ ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کی بہترین کارکردگی، صنعتی پیداواریت کو بڑھانے کے لیے پالیسی میں حکومت کی جانب سے کی جانے والی وہ طویل مدتی تبدیلیاں اور اقتصادی اور صنعتی دونوں میدانوں میں کی جانے والی مدتی تبدیلیاں جن کی وجہ سے زراعت پر ہمارا انحصار اب کم ہو گیا ہے۔

بنیادی ڈھانچہ

ہماری صنعتی ترقی میں یہ اضافہ گذشتہ سال کے دوران، بنیادی ڈھانچے کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور اس سے توانائی اور نقل و حمل کے شعبوں میں کیے جانے والے متعدد اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں کافی مدد ملی ہے۔ جس کا مقصد خشک سالی سے نپٹنا تھا۔ اگرچہ بارش کم ہونے کی وجہ سے بجلی کی پیداوار میں کافی کمی ہوئی تھی۔ تاہم اس کمی کو رواں مالی سال کے پہلے نو ماہ کے دوران حرارتی بجلی کی پیداوار میں 15.7 فی صدی کے اضافے نے کافی حد تک دور کر دیا۔ نتیجے کے طور پر بجلی کی مجموعی پیداوار میں ۱۵ اپریل سے دسمبر ۱۹۸۷ء کے دوران سال کی اسی مدت کے مقابلے میں 6.7 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ جائزہ میں اس حقیقت کو کافی سراہا گیا ہے کہ حرارتی بجلی گھروں کی لوڈ برداشت کرنے کی صلاحیت اب 55 فی صد ہو گئی ہے۔ کوئلہ کی پیداوار اپریل سے دسمبر ۱۹۸۷ء کے دوران 10.2 فی صد بڑھی ہے۔

ذیل گاڑیوں کے ذریعہ مال و اسباب کی نقل و حمل میں بھی رواں سالِ مالی کے پہلے نو ماہ کے دوران ۱۰.۴ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ وسائل کی مشکل صورتِ حال کے پیشِ نظر بنیادی ڈھانچے کی خدمات کے مناسب فروغ کی غرض سے جائزے میں اس بات پر کافی زور دیا گیا ہے کہ سرمایہ کاری کی ہر اکائی پر شرحِ منافع زیادہ ہو اور ساتھ ہی اتنی کافی بچت ہو جسے بنیادی ڈھانچہ کی مزید توسیع کے لیے لگایا جا سکے۔

قیمتیں

خراب موسم اور 87-1986ء کے دوران زرعی ضروری اشیاء کی قلت کی وجہ سے سال کے شروع سے ہی قیمتوں پر کافی دباؤ پڑا ہے یہ دباؤ اس وقت اور بھی بڑھ گیا جب کہ جولائی ۱۹۸۷ء سے شدید خشک سالی شروع ہو گئی۔ قیمتوں کے عدد اشاریہ میں مارچ ۱۹۸۷ء کے اختتام سے جنوری ۱۹۸۸ء کے تیسرے ہفتے کے اختتام تک 9.1 فی صد کا اضافہ ہوا جب کہ صارفین کی قیمتوں کے عدد اشاریہ میں دسمبر ۱۹۸۷ء تک 9.6 فی صد کا اضافہ ہوا۔ زرعی اشیاء مثلاً خوردنی تیلوں، تلہنوں، مسالوں، کپاس، دالوں، کھانڈساری، اور اناجوں کی قیمتوں میں خاص طور پر اضافہ ہوا ہے اس سال افراطِ زر کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زرعی پیداوار میں کمی ہے جو خشک سالی کا نتیجہ ہے۔

چونکہ افراطِ زر کی بنیادی وجہ سپلائی کی کمی ہے اسی لیے افراطِ زر کی ہماری پالیسی سپلائی کے معاشرانہ انتظامات پر ہی مبنی ہے سرکاری نظامِ تقسیم اور دوسرے طریقوں سے خوردنی اشیاء کی مناسب مقدار میں سپلائی ضروری اشیاء کی سپلائی کے بندوبست کی پالیسی کی بنیاد رہی ہے۔ اس پالیسی کو کرنسی کی محدود توسیع اور ایسی مدتی مالی پالیسیوں سے مزید تقویت دی گئی ہے۔ جن کا مقصد بجٹ کے خسارے کو کم کرنا ہے۔ باوجودیکہ سوکھے اور سیلاب سے متعلق امدادی اخراجات میں زبردست اضافہ ہوا۔ جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتوں کی صورتِ حال کے مشکل ہونے کے باوجود افراطِ زر کی شرح سخت سوکھے کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں اس سال کم رہی۔

مالی پالیسی

سرکاری مالیے پر عوامی اور مختصر مدتی دباؤ کے باوجود، ترقیاتی کاموں کو ترجیح دینے کی کوشش برابر جاری رہی۔ خشک سالی اور سیلاب کی وجہ سے بڑھتے ہوئے اخراجات کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر سرکار نے ستمبر ۱۹۸۷ء میں آمدنی اور وسائل کو اکٹھا کرنے کے لیے اقدامات کا اعلان کیا۔ بہتر تحصیل کے لیے انتظامی اقدامات کو بھی تیز کیا گیا۔ جائزے کے مطابق ان اقدامات کا بنیادی مقصد سرکاری سرمایہ کاری میں کمی لائے بغیر خشک سالی اور سیلاب کی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے وسائل یکجا کرنا تھا۔ جائزہ میں 88 - 1987 کے مرکزی سرکار کے بجٹ میں اعلان کیے گئے اقدامات کا ایک تفصیلی بیان بھی ہے۔ ان اقدامات میں مودوات (MODVAT) نظام کی توسیع، مکانات کی تعمیر کے فروغ سے متعلق مالی اور دوسرے اقدامات بحث سے متعلق ایک نئی اسکیم، تعلیم کے شعبے کے لیے رکھی گئی رقم میں زبردست اضافہ اور غریبی دور کرنے اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی سے متعلق پروگراموں کو سب سے زیادہ ترجیح دیا جانا شامل ہے۔ سال کے دوران مالی اور قرضہ جاتی پالیسیوں پر دو طرح کی مجبوریاں تھیں ایک افراطِ زر کی روک تھام، تاکہ خشک سالی کی وجہ سے ہونے والے افراطِ زر کے دباؤ کو بڑھنے نہ دیا جائے اور دوسری طرف یہ ہے کہ افراطِ زر کی اتنی زیادہ روک تھام نہ ہو جائے کہ کساد بازاری کے حالات پیدا ہو جائیں۔ ان موٹے رہنما خطوط کی روشنی میں قانونی طور پر مقررہ نقدی کے نسبت عددی (Statutory Liquidity [illegible]) میں اس سال کے دوران دوبارہ (Cash Reserve Ratio) عددی [illegible] کے نسبت عددی [illegible]

[illegible] سال میں حاشر ہونے والی متعلقہ ہونے والی بجلی [illegible] کے دوران نتیجہ بنیاد پر قرضوں کی اول قسط [illegible] پیدا ہوا ہے۔ [illegible] سے متاثر کسانوں کو بھی نہیں بڑھا [illegible]

ادائیگیوں کا توازن

جائزہ میں گذشتہ دو سال کی بہتر برآمداتی کارکردگی کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو کہ 86-1985 اور 87-1986ء میں حکومت کی طرف سے کیے گئے اقدامات کی وجہ سے ہوئی۔

87-1986ء میں برآمدات میں 3.5 فی صد کے اضافہ کے بعد موجودہ سال کے پہلے نو مہینوں میں گذشتہ سال کی اسی مدت کے مقابلے میں برآمدات میں 6.24 فی صد کا اضافہ ہوا اس کے برخلاف درآمدات میں 87-1986 میں 2.2 فی صد اور اپریل سے دسمبر 1987 کے دوران 5.3 فی صد کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں 88-1987 کے پہلے نو مہینوں میں تجارتی خسارے میں مزید کمی واقع ہوئی۔

اس کے باوجود جیسا کہ گذشتہ کئی برسوں کے اقتصادی جائزوں میں اندازہ لگایا گیا تھا، ادائیگیوں کے توازن پر دباؤ ابھی قائم ہے جو بعید اوسط مدتی ناموافق وجوہات کی بنا پر ہے جیسے تیل کی اندرون ملک پیداوار کی شرح اضافہ میں کمی، دوسرے ممالک میں اپنی منڈیوں کو محفوظ رکھنے کا بڑھتا ہوا رجحان، بین الاقوامی مالی فنڈ اور دیگر قرض دہندگان کے تئیں ادائیگی کی ذمہ داریوں کا اکھٹا ہونا نیز رعایتی امداد کے لیے ناموافق فضا۔ جائزہ میں کہا گیا ہے کہ موجودہ سال میں تیل کی بین الاقوامی قیمتوں میں الٹی کمی اور خشک سالی کی وجہ سے مذکورہ دباؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے ضروری اشیاء مثلاً خوردنی تیل اور دالوں کی بڑی مقدار میں مزید درآمدات کرنی پڑیں۔

مسائل اور امکانات

ناموافق موسمی حالات کے سامنے زراعت کی ناتوانائی کو کم کرنے کے لیے ایک طویل مدتی حکمت عملی کو اختیار کیا جائے۔ اس حکمت عملی میں یہ چیزیں شامل ہونگی مستقل آبپاشی کے وسائل کی موجودگی اور ان کے استعمال کے دوران موجودہ بڑے فرق کو تیزی سے ختم کرنے کے لیے اقدامات پانی کے فراہمی کے انتظام کی بہتری، فصل اگانے کے صحیح طریقوں پر زور زمین دوز پانی کی صلاحیت کے استعمال کو بہتر بنانے کے لیے [illegible]شش نیز جنگل بانی اور ماحول کے احیاء کے پروگرام۔

[illegible]روری ہے کہ زرعی ترقی و فروغ کا ایک مزید وسیع طریقہ اپنایا جائے اس لیے [illegible]ان میں جہاں زراعت کی رفتار ترقی کم ہے آبپاشی کے انتظام، زمین کی بہتری

اور دیگر زرعی بنیادی ڈھانچہ پر خصوصی توجہ دی جائے۔ صنعتی حلقہ میں ہمارا نصب العین یہ ہے کہ صنعتی پالیسیوں اور بنیادی ڈھانچے کی کارکردگی کے حسین امتزاج کو، جس کی وجہ سے چار سال تک تیز صنعتی ترقی ہوئی ہے، قائم رکھا جائے اور صنعتوں میں بہتری لانے کے ایسے اقدامات کئے جائیں کہ وہ بین الاقوامی مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوسکیں۔ وسائل کی کمی کو پورا کرنے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ بنیادی ڈھانچہ کی پیداواری صلاحیت کی خاص اہمیت اور ضرورت ہے کیونکہ ان حلقوں میں بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ملک کی بجلی گھروں میں پلانٹ لوڈ فیکٹر (Plant Load Factor) میں مزید اضافے، ریلوے کی کارکردگی میں بہتری اور معاشیات میں توانائی کے بہتر استعمال کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

سرکاری اخراجات میں تیز اضافے کی وجہ سے افراطِ زر پر تشویش کن اثرات پڑسکتے ہیں اور عوامی سطح پر سرمایہ کاری کے نشانوں کو حقیقی معنوں میں حاصل کرنے کی ہماری صلاحیت متاثر ہوسکتی ہے۔ مالی وسائل حل کرنے کے لیے جائزے میں رواں اخراجات پر کنٹرول و مالی حل کرنے کی صلاحیت میں وسعت اور سرکاری سیکٹر کے کارخانوں کی کارکردگی میں بہتری لانے کے لیے اقدامات پر زور دیا گیا ہے۔

جائزے میں سرکاری خرچے میں اضافے کو روکنے کے لیے جس حکمت عملی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ شامل ہیں: مالی اور معاشی طور پر مشکوک افادیت کے پروگراموں میں سخت کٹوتی تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافے میں اعتدال، امدادی رقوم میں بہتر کارکردگی کے ذریعہ تخفیف نئے پروگرام شروع کرنے کی بجائے چالو پروگراموں کو مکمل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

سابقہ کچھ برسوں کی طرح اس سال کے اقتصادی جائزے میں بھی ادائیگیوں میں توازن پر دباؤ کے مسئلے پر خصوصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جائزے کے مطابق متوازن ادائیگی کی خاطر کسی کامیاب انتظام کا دارومدار برآمدات میں اضافے اور درآمدات کے متبادل تیار کرنے کی کوششوں کو تیز کرنے پر ہے۔ برآمدی شعبے میں حالیہ کامیابیوں کو برقرار رکھنے کے لیے مصنوعات کے معیار میں بہتری لانے اور بین الاقوامی منڈیوں میں ہندوستانی مصنوعات کی قیمتوں میں مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے ادائیگیوں کے توازن کا صنعتی پیداوار میں اضافے اور اس کی بہتر کارکردگی پر دارومدار ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں پٹرول پر مبنی مصنوعات کے صرف میں کمی

باقی بر صفحہ ۵۳

پریس انفارمیشن بیورو۔ گورنمنٹ آف انڈیا

پارلیمنٹ کے بجٹ سیشن میں

صدر جمہوریہ ہند کی افتتاحی تقریر

صدر جمہوریہ ہند شری آر وینکٹ رامن نے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ۲۲ر فروری ۱۹۸۸ء کو تقریر کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے بجٹ سیشن کا افتتاح کیا۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ صرف چند ہفتے پہلے ہم ایک عظیم انسان سے محروم ہو گئے اور آزادی کی جدوجہد کے ولولہ انگیز دور سے ہمیں ملانے والی کڑی ٹوٹ گئی۔ خان عبدالغفار خاں، جو مہاتما گاندھی کے ایک قریبی ساتھی تھے۔ عدم تشدد اور سیکولرازم کی علامت تھے۔ میں اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جو ہمارے درمیان اب نہیں ہیں۔ ان میں سابق وزیر اعظم چودھری چرن سنگھ شامل ہیں اور تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ شری ایم۔ جی۔ راماچندرن بھی جنہوں نے اپنی دور اندیشی سے قومی ایکتا کو مضبوط کیا۔

شری وینکٹ رامن نے کہا کہ ہمارا بھارت کا تصور ایک ایسی سرزمین کا ہے جس کی ایکتا اور سالمیت پر باہری خطروں اور اندرونی کمزوریوں کی آنچ نہ آسکے، جہاں ہمارے آئین میں درج جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کے آدرشوں کی پوری طرح تکمیل ہو سکے۔ جہاں ہر انسان کو برابر کے مواقع حاصل ہوں اور سماجی انصاف کا دور دورہ ہو۔ جہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے افلاس اور بیماری کا خاتمہ کیا جا سکے۔ جہاں اقتصادی ترقی قدرت کی رحمتوں کو ختم نہ کرے بلکہ اس کی مدد سے دولت پیدا کرے جہاں صنعت کاری اور جدید کاری اخلاقی قدروں کے ساتھ گھل مل جائے۔ جہاں تمام مذاہب اور ثقافتیں باہمی احترام اور تعاون کی فضا میں پھولیں پھلیں۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ ہم ایک ایسا بھارت چاہتے ہیں جس کی بین الاقوامی پالیسی کا مقصد امن اور بین الاقوامی تعاون اور ایک ایسا نیا عالمی نظام قائم کرنا ہو جس کی بنیاد میں

مساوات، آزادی اور انصاف پر ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پچھلے چالیس سالوں میں ہم اسی راستے پر آگے بڑھے ہیں۔ جیسے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے روشن کیا تھا۔ چاہے جو کچھ بھی ہو ہم اسی راستے پر قائم رہیں گے، اس ہمت کے ساتھ جو مہاتما گاندھی نے ہمیں دی تھیں۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد ملک کی خود انحصارانہ ترقی، سماجی آزادی اور بھارت کی انسانی تہذیب کی صف اوّل میں اس کا روایاتی اور تاریخی مقام پھر سے دلانے کی جدوجہد کا پیش رو تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہماری کامیابیاں قابل تعریف ہیں لیکن ہمارے لوگوں کی انتھک کوششیں، استقلال، خلوص لگن اور محنت ان سے بھی زیادہ قابل تعریف ہیں۔ ہمارے بنیادی مقصد غریبی کو تیزی سے دور کرنا اور اس کو ختم کرنا ہے اور غریبی دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں روزگار کے مواقع تیزی سے مسلسل پیدا کئے جائیں ہمارا طریقہ کار یہ ہے کہ غریبی دور کرنے کے براہ راست پروگراموں کے ساتھ ساتھ زیادہ تیز اور زیادہ متنوع ترقیاتی عمل کو جاری رکھا جائے جس میں اچھی تعلیم کا ایک بڑا پروگرام شامل ہو۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ ہمارے پاس جو بے مثال انسانی وسائل ہیں ان سے پوری فائدہ اٹھایا جائے، اس طرح کہ ملک کے تعلیمی نقشہ کو ہماری معاشیات کی ترقی کے تقاضوں اور روزگار کی ضرورتوں کے ساتھ سمویا جا سکے۔ ہم اپنے مقاصد کی تکمیل کی جانب بامقصد طور پر آگے بڑھے ہیں پچھلے سات برسوں میں ترقی کی رفتار نمایاں طور پر تیز رہی ہے لیکن آٹھویں منصوبہ میں اور بھی زیادہ تیز ترقی کا انتظام ہونا ضروری ہے کہ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جا سکے۔ اور علاقائی فرقوں کو کم کیا جا سکے۔ ہمیں ایسے طرز کی زیادہ تیز ترقی کی ضرورت ہے جس میں ہمارے لوگوں کی بنیادی ضرورتوں کا ہماری معاشیات اور سماج کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو برابر فوقیت حاصل ہو۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ ہم اپنی ترقی کی راہ پر دو اہم پیرائیوں کے تحت گامزن ہے ہمارے ملک کی آزادی اور ہمارے لوگوں کی آزادی۔ اس مقصد سے ہم نے مضبوط ادارے قائم کیے ہیں تاکہ ہمارے شہریوں کے جمہوری حقوق کو محفوظ رکھا جا سکے اور ہماری آزادی سالمیت اور قومی حیثیت کو درپیش متعدد چنوتیوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ہمارے جمہوری، سیاسی نظام کی تخریب اور بیخ کنی کے لئے ملک کے اندر اور باہر سے کوشیش کی گئی ہیں لیکن ہمارے [illegible] ان کوششوں کو ناکام بنادیا ہے۔

شری وینکٹ رامن نے کہاکہ سوکھے نے ہماری معاشیات کی مضبوطی اور ہماری پُر مقصدیت کو ثابت کردیا ہے۔ ہمارے کسانوں نے بلکہ ساری قوم نے اس سنگین معاشی چیتاونی کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ لوگ شاندار طریقہ سے حکومت کے ساتھ تعاون کررہے ہیں ملک کی کامیاب معاشی کارکردگی ہماری ترقیاتی حکمت عملی کی صحت اور مضبوطی کا ثبوت ہے۔

صدر جمہوریہ نے کہاکہ پنجاب اور دوسری جگہوں پر مضبوط اور مشترکہ قومی کوشش سے دہشت گردی کی چیتاونی کا مقابلہ کیا جارہا ہے پنجاب میں صدر راج کے نفاذ کے بعد حکومت نے پنجاب کے لوگوں کی قوت ارادی کو کام میں لاتے ہوئے گمراہ قوم دشمن عناصر کے خلاف ایک مضبوط مہم چلا رکھی ہے اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دہشت گردی کو کچلا جائے۔ اور علیحدگی پسندوں کو عوام سے الگ تھلگ کیا جائے۔ دہشت گردوں نے حال ہی میں اپنی کاروائیاں تیز کردی ہیں لیکن انھیں ہماری امن و امان کی قوتوں کے اعلیٰ حوصلے اعلیٰ تربیت اور سخت چوکسی کا مقابلہ کرنا ہے۔ انھیں لوگوں کی قوت ارادی کا بھی مقابلہ کرنا ہے جنھوں نے ڈرا دھمکی کے تحت ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا ہے صدر جمہوریہ نے کہاکہ ملک ایکتا اور سالمیت کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ کیا جائے گا ملک کے آئین کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے مسئلے کے پُرامن سیاسی حل کی تلاش میں حکومت ان تمام لوگوں سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے۔ جو تشدد کا راستہ چھوڑ دیں۔ ساری قوم معصوم جانوں کے جانے پر اُداس ہے ہم ان لوگوں کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں جنھوں نے قومی ایکتا کے لئے اپنی جانیں نچھاور کردیں۔

تریپورہ میں انتہا پسندوں نے دہشت گردی کی مہم تیز کردی تھی۔ تشدد میں اضافہ اور معصوم انسانی جانوں کے زیادہ تعداد میں تلف ہونے پر حکومت کے پاس اس کے سواء کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ تریپورہ کو بدامنی کا علاقہ قرار دیا جائے۔ ہمارا تہیہ ہے کہ وہاں تشدد کو ختم کیا جائے۔

صدر جمہوریہ نے کہاکہ تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ فرقہ واریت، بنیاد پرستی اور پھوٹ ڈالنے کے دوسرے رجحانات کو ملک سے ختم کیا جائے۔ قومی یکجہتی کونسل کی کمیٹیاں فرقہ وارانہ میل جول کے فروغ کے اقدامات میں سرگرم ہیں۔ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقلیتوں کے پندرہ نکاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلسل کوشش کرتی رہیں۔

شری وینکٹ رامن نے کہاکہ ہم صدیوں کی محرومی، امتیازی تفریق اور ظلم وستم کے

نتائج کو ختم کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم نے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے قومی کمیشن کی پھر سے تنظیم کی ہے اور کمشنر کے دفتر کو اور مضبوط کیا ہے ہم اپنے سماج کے ان کمزور طبقوں کی فلاح اور ترقی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اس بات سے ظاہر ہے کہ ساتویں منصوبے میں ان کے لئے ۱۱۰۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ رکھا گیا۔ یہ خاص طور پر اطمینان کی بات ہے کہ دیہی ترقی کے مربوط پروگرام (آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی) کے تحت جن درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو فائدہ پہنچا ہے ان کی تعداد ۱۸ فیصد ہو گئی ہے جب کہ منصوبے میں 30 فیصد کی حد مقرر کی گئی تھی۔

شری وینکٹ رامن نے کہا کہ سال مذکورہ میں جموں و کشمیر، کیرالا، مغربی بنگال ہریانہ، ناگالینڈ، میگھالیہ اور تریپورہ میں عام چناؤ ہوئے۔ تامل ناڈو میں جنوری میں جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کے پیش نظر وہاں آئین کی دفعہ 356 کو نافذ کرنا پڑا وہاں جلد ہی چناؤ کرانے کی تجویز ہے

صدر جمہوریہ نے کہا کہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات سے متعلق کمیشن نے جس کے چیرمین شری جسٹس آر ایس سرکاریہ تھے، اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اس کے بارے میں فیصلے لینے سے پہلے پارلیمنٹ، ریاستوں اور لوگوں کے خیالات کو مد نظر رکھا جائیگا

تعلیم سے متعلق ہماری قومی پالیسی آنے والی نسلوں کے لئے ہماری ایک عہد اور مستقبل کے ایک پیمانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک کے تمام افراد کے لئے معیاری تعلیم کی فراہمی، ہماری قومی ترقی کی کنجی ہے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق ایک پروگرام عمل ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس پالیسی پر عمل آوری کے سلسلے میں 1986 کے دوران کافی اہم اقدامات کئے گئے۔ ہماری سب سے بڑی ترجیح و تشویش ابتدائی تعلیم ہے۔ "بلیک بورڈ" اسکیم کو تعلیم کے معیار اور ابتدائی اسکولوں کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے کے لئے ہی شروع کیا گیا تھا۔ خاص توجہ تعلیمی طور پر پسماندہ ریاستوں کو دی جا رہی ہے ہر سال پانچ لاکھ اساتذہ کو تربیت دینے کا پروگرام مسلسل جاری ہے ایک قومی نصاب بھی وضع کیا جا رہا ہے جس میں ہمارے ورثے اور قومی حیثیت کے بارے میں عوام کے اندر بیداری پیدا کرنے کے مقصد پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے نوودیہ ودیالیوں کی تعداد بھی بڑھ کر 206 تک پہنچ گئی ہے ان اسکولوں کے داخلے سے متعلق امتحان کے بارے میں کئے گئے ایک جائزہ سے پتہ چلا ہے کہ ان اسکولوں میں جن بچوں کو داخلہ دیا گیا ہے

ان میں سے 41 فیصد کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جو کہ غریبی کی سطح سے نیچے ہیں 77 فیصد کا تعلق دیہی علاقوں سے ہے اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے بچوں کی ان اسکولوں میں داخلے کے فیصد، ملک کی پوری آبادی میں ان کی شرح سے کہیں زیادہ ہے ۔ ثانوی سطح پر لڑکیوں کو مفت تعلیم فراہم کرنے سے متعلق اسکیم پر اب سبھی ریاستوں میں عمل درآمد کیا جارہا ہے۔ تعلیم کو روزگار سے جوڑنے سے متعلق ایک جامع اسکیم بھی تیار کر لی گئی ہے۔ حکومت اعلیٰ اور تکنیکی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے بھی بہت سے اقدامات کر رہی ہے۔

چھوٹے کنبے کے نظریئے کا فروغ بھی ہماری سب سے اولین قومی ترجیح ہے گزشتہ سال دو کروڑ افراد نے مانع حمل طریقوں کو اپنایا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ خاندانی فلاح وبہبود اور صحت کے مسائل ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اسی لئے ان مسائل کو ایک مربوط طریقے سے حل کیا جارہا ہے لوگوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ٹیکے لگانے کا کام بھی تیزی سے چل رہا ہے۔

خواتین کو ہر طرح کے تعصب، امتیازانہ برتاؤ، استحصال اور ظلم و تشدد سے نجات دلانا ہمارا پہلا قومی فریضہ ہے۔ قومی زندگی میں خواتین کی مکمل اور مساوی شرکت ہماری قومی ضرورت ہے حکومت نے خواتین کے مسائل سے نپٹنے کے لئے 2000ء تک کے لئے ایک تناظری منصوبہ بھی تیار کیا ہے۔ حکومت نے خواتین سے متعلق پالیسیوں اور پروگراموں کا جائزہ لینے اور صلاح مشورے کے لئے قومی کمیٹی کی از سر نو تشکیل کی ہے ایک قومی کمیشن بھی قائم کیا ہے جو کہ غیر منظم شعبے میں خواتین کے مسائل کے بارے میں غور و خوض کریگا کمیشن کی رپورٹ جلد ہی پیش کی جائے گی۔

دیورالہ کے وحشیانہ واقعہ کے بعد ستی کی روک تھام سے متعلق 1987 کا کمیشن ایکٹ پاس کیا گیا۔ حکومت اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے اس سلسلے میں عوامی رائے عامہ کا وسیع پیمانے پر بیدار کیا جانا بہت ضروری ہے۔

ہمارے بدلتے ہوئے سماج کا ایک بہت ہی اہم عنصر ہماری آبادی کی شکل بدل رہا ہونے والی نمایاں تبدیلی ہے نوجوانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس لئے اس وقت ہماری سب سے اولین قومی ترجیح نوجوانوں کی ضروریات کو پورا کرنا اور انہیں قومی تعمیر کے کام میں لگانا ہے نوجوانوں سے متعلق نہرو مراکز (نہرو یووک کیندر) کافی سرگرم

ہیں۔ ہمارے ادارے این۔ ایس ایس (نیشنل سروس اسکیم) بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈ اور نیشنل کیڈٹ کور، ہمارے لاکھوں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی علمی اور جسمانی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے اور ان کے اندر ہم جوئی اور خود اعتمادی کے جذبات کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ کھیل کود سے متعلق ہمارے ادارے اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا نے ہمارے نوجوانوں کی کھیل کود کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں۔

اس سال صنعتی شعبے میں بھی فضا بہت اچھی رہی۔ ہم کارکنان اور منتظمین دونوں کو ان کے تعمیری رویہ پر مبارک باد دیتے ہیں۔ ہم صنعتی شعبے میں انتظامیہ کی بامعنی شرکت کو بڑھاوا دینا چاہتے ہیں حکومت صنعتی شعبے میں، انتظامیہ اور کارکنان کے درمیان تعلقات اور ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ ایکٹ میں خاص تبدیلیوں سے متعلق ایک جامع بل بھی پارلیمنٹ میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتی ہے

اگرچہ ہمارے کارکنان کے ایک بہت بڑے طبقے نے اپنے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے آپ کو منظم کر لیا ہے تاہم ہمارے کارکنان کی اکثریت ابھی بھی غیر منظم ہے اور اسی لئے وہ استحصال کا شکار ہیں۔ ان کے کام کرنے کے حالات سے متعلق جانکاری ابھی مکمل دستیاب نہیں ہے اور ان کی بہتری کے لئے جو کام کئے جانے چاہئیں۔ وہ ابھی بھی غیر اطمینان بخش ہیں۔ ہم لوگ ان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے فکر مند ہے۔ ہم ملازمین کے کام کرنے کے حالات کو بہتر بنانے کے اپنے عہد پر پوری طرح سے کاربند ہیں۔ ابھی لئے ہم نے دیہی مزدوروں کے لئے قومی کمیشن قائم کیا ہے ہم نے بچوں کی مزدوری سے متعلق ایک قومی پالیسی بھی تشکیل دی ہے۔ بندھوا مزدوروں کی شناخت اور ان کی آبادکاری کے کام میں رضاکار تنظیموں کا بھی تعاون حاصل کیا جا رہا ہے

20 نکاتی پروگرام نے دیہی علاقوں میں امید کی ایک نئی روح پھونکی ہے اس پروگرام کے تحت اس سال کے منصوبے میں سے تقریباً 30 فیصد رقم مختص کی گئی ہے۔ آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی، این۔ آر۔ ای۔ پی اور آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی کے پروگرام دیہی علاقوں میں غربت کے خاتمے کے ہمارے نصب العین کو پانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ آئی آر ڈی پی (IRDP) پروگرام سے پچھلے سات برسوں میں کمزور طبقوں اور غریبی کی سطح سے نیچے کے دوسرے پسماندہ طبقوں کے تقریباً دو کروڑ چھتیس لاکھ افراد کو فائدہ پہنچا ہے اس پروگرام سے فائدہ اٹھانے والے افراد میں تقریباً سولہ فیصد خواتین ہیں۔

پریل 1987 سے جنوری 1988 تک این آر ای پی (NREP) اور آر ایل ی جی پی (RLEGP) سے تقریباً 47 کروڑ افراد کا روزگار مہیا کیا گیا۔ پانی کو پہلی بار ایک اہم قومی وسیلے کے طور پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پانی سے متعلق ہماری نئی قومی پالیسی کے بارے میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور اس کو یہی بات ذہن میں رکھکر تشکیل دیا چاہیے اس طرح سے منصوبہ بند ترقی اور پانی کے ہمارے قومی وسائل کے بہتر اور موثر طریقے پر استعمال کی ہمارے لئے ایک نئی راہ ہموار ہوئی ہے۔

گنگا کی صفائی سے متعلق منصوبے نے قومی سطح پر لوگوں کی توجہ مبذول کی ہے اور صفائی کا کام 25 قصبوں اور شہروں میں پورے زور و شور سے چل رہا ہے۔ ماحولیاتی تحفظ ہماری قومی پالیسی کا ایک اہم عنصر بن چکا ہے 24 ترجیحی صنعتوں کو ماحولیاتی تحفظ سے متعلق اقدامات کرنے کے لئے حکم جاری کر دیا گیا ہے جنگلوں کے تحفظ اور پانی کی آلودگی کو روکنے کے لئے سخت قوانین بنائے جانے اور ان کے نفاذ کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

حکومت نے مکانات کی تعمیر سے متعلق قومی بینک بنائے جانے کے بارے میں ایک بل پارلیمنٹ کے موسم سرما کے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ اس بل کا سب سے اہم مقصد کمزور طبقات کو مکان کی تعمیر کے لئے روپیہ فراہم کرنا ہے۔

پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں بھی حکومت ملک کے کروڑوں بے گھر لوگوں کے لئے مکان کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے ایک قومی پالیسی پیش کرے گی۔

20 نکاتی پروگرام کا ایک اہم مقصد انتظامیہ میں کمزور طبقوں کے مسائل کے حل کے لئے زیادہ بیداری پیدا کرنا بھی ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں کے مسائل کے تئیں زیادہ بیدار اور ذمہ دار انتظامیہ کے موضوع پر ضلع کلکٹروں کی کئی ورکشاپ بھی چلائی جا رہی ہیں عوام کی شکایات کو دور کرنے سے متعلق مشنری کو بھی مزید مستحکم بنایا جا رہا ہے ضلع کی سطح پر منصوبوں کی تیاری سے متعلق افسران کو تربیت فراہم کرنے کے لئے خصوصی پروگرام بھی چلائے جا رہے ہیں۔

کمزور اور غریب طبقے کو جلد انصاف ملے اور انکا خرچہ بھی کم ہو اس کے متعلق منصوبوں میں بھی کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ غریب لوگوں کو قانونی صلاح اور امداد مہیا کئے جانے کے بارے میں بھی ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کے پیٹرن ان چیف چیف جسٹس آف انڈیا ہیں۔

اسمگلنگ، غیر ملکی زر مبادلہ کا غیر قانونی کاروبار کرنے والے افراد اور منشیات کے

ناجائز استعمال سے متعلق افراد کے خلاف کارروائیوں میں گزشتہ سال اور بھی تیزی لائی گئی! اقتصادی جرائم کی چھان بین سے متعلق سنٹرل انٹیلیجنس بیورو نے اسمگلروں اور غیر ملکی زرمبادلہ کا کاروبار کرنے والے افراد کے خلاف بہت سخت کارروائی کی ہے۔

عوام کے اندر منشیات کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اگر ہم لوگ محتاط نہ ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ یہ لعنت ہماری نوجوان نسل کو جو کہ ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہے بالکل کھوکھلا ہی نہ بنا دے ہمیں اس برائی کے خلاف اپنی لڑائی ہر قیمت پر جاری رکھنی ہے منشیات کی روک تھام سے متعلق بیورو نے اس سال کافی بڑی مقدار میں منشیات کا ذخیرہ پکڑا ہے لوگوں کو منشیات کی لعنت سے چھٹکارا دلانے اور اس لعنت کے شکار افراد کی آبادکاری کے لئے پروگراموں کو شروع کر دیا گیا ہے۔

ہم سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال غریبی کو دور کرنے خصوصی طور پر دیہی علاقوں میں غریبی کے خاتمے کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ ہمارے پانچ ٹکنکی مشنوں کا یہی نصب العین ہے ان پانچ مشنوں کو جو کام سونپے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہے: تمام گاؤں میں پینے کے پانی کی فراہمی، دو کروڑ حاملہ خواتین اور ایک کروڑ اسی لاکھ بچوں کو بیماری سے تحفظ کے ٹیکے لگوانا، تین کروڑ بالغ افراد کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانا، تلہن اور کھانے کے تیل کی پیداوار میں اضافہ کے لیے کوشش کرنا، اور لوگوں کو مواصلاتی سروس زیادہ سے زیادہ مہیا کرنا ان مشنوں نے 89 - 1988 اور ۹۰ - ۱۹۸۹ سے متعلق اپنے عملی منصوبے تیار کر لئے ہیں ان منصوبوں کی بہت گہرائی سے جانچ پڑتال کی جا رہی ہے

حکومت نے دیہی علاقوں کے لئے توانائی سے متعلق ایک مربوط حکمت عملی اختیار کی ہے توانائی کے قدرتی وسائل مثلاً سورج کی روشنی، ہوا پانی اور بہتر بنائے گئے چولہوں کی عوام کے اندر مقبولیت کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ تیل کی تلاش اور استعمال کے کام میں تیزی لائی جا رہی ہے۔ تیل صاف کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے تیل کی صفائی سے متعلق جدید ترین ٹکنالوجی کی تلاش اور استعمال سے متعلق ایک اعلیٰ ٹکنالوجی مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔ ایچ بی جے پائپ لائن کا پہلا حصہ اس سال پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔

الیکٹرانکس کے شعبے میں بھی کافی پیش رفت عمل میں آئی ہے۔ بھارت الیکٹرانک ایکسچینج تیار کرنے والے معدودے چند ممالک میں سے ایک ہے۔

ایٹمی سائنس کے شعبے میں ہم ان چند ممالک میں سے ہیں جو کہ ایٹمی بجلی تیار کرنے

بچے نے ایٹمی ایندھن کے مکمل سائیکل کی مہارت رکھتے ہیں اس شعبے میں ہماری ایک اہم کامیابی 500 ایم ڈبلیو ای صلاحیت والے ریئکٹر کی تیاری ہے ایٹمی توانائی سے بجلی کی پیداوار میں اضافے کی غرض سے ایٹمی بجلی سے متعلق ایک کارپوریشن بھی قائم کی جاچکی ہے۔

اگسٹ 1987 میں ہم نے ایک اور بڑی کامیابی حاصل کی جب کہ ہم نے سمندر کی تہہ میں کان کنی کی صلاحیت حاصل کرلی۔ انٹرنیشنل سی بیڈ اتھارٹی سے متعلق پر پیپر ٹری کمیشن نے بحر ہند کے ایک مقام پر بھارت کے کان کنی کے حقوق تسلیم کرلیا ہے یہ ایک قابل فخر بات ہے کہ بھارت پہلا ملک ہے جس کے حقوق کو اس سلسلے میں تسلیم کیا گیا ہے۔

INDIAN SPACE RESEARCH ORGANISATION خلائی تحقیق کی بھارتی تنظیم نے بھارت کے پہلے مصنوعی سیارے کا ڈیزائن تیار کیا ہے اور خود ہی اسے تیار بھی کیا ہے یہ مصنوعی سیارہ اگلے مہینے سوویت لانچر کے ذریعہ خلاء میں چھوڑا جارہا ہے ایس آر او ایس ایس III مصنوعی سیارے کے ساتھ ترقی یافتہ سٹیلائٹ لانچ وہیکل کی دوسری اڑان اپریل میں ہوگی۔ یہ مصنوعی سیارہ خلائی تحقیق کی بھارتی تنظیم اور مغربی جرمنی کا مشترکہ ساز و سامان لے جائے گا جون میں ہمارا مواصلاتی مصنوعی سیارہ انسیٹ آئی سی (INSAT – I C) فرینچ ایرین لانچر سے چھوڑا جائے گا۔

آخر میں صدر جمہوریہ نے اسے ظاہر کی کہ ہم مشترکہ قومی کاوشوں سے تمام چیلنجوں کا پُراعتماد مقابلہ کرسکیں گے اور آئندہ آنے والے کام مکمل کرسکیں گے ہم اپنے جمہوریہ کے مقاصد اور آدرشوں کے تئیں وفادار رہیں گے ہم ترقی کے مفاد کو محدود مفادات سے بالاتر رکھیں گے میں آئندہ برس کے دوران آپ کی کوششوں کی کامیابی کا خواستگار ہوں۔

مرسلہ

ظاہر ہے کہ خطیبانہ صلاحیت کے ساتھ اگر تدبر اور سیاسی فراست بھی ہو تو کلام کا اثر انگیزی کتنی بلندی پر پہونچ جاتی ہے مولانا آزاد کو یہ امتیاز حاصل تھی کہ ان کی تقریر میں جوش و خروش کے ساتھ ہوش و تدبیر کا عنصر بھی اتنا ہی غالب تھا۔ اسی لیے ان کی تقریر سامعین کے دلوں کی دھڑکن بن جاتی تھی۔

نومسلم شیخ بشیرالدین شاد (پاکستان)

اسلام کی جانب میرا سفر

میں ۱۹۲۸ء ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں دھیان کالو کے ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والد میتھاس صاحب مشہور پادری تھے اور تبلیغی خدمات کے سلسلے ہی میں اپنے آبائی ضلع گورداسپور سے شیخوپورہ میں منتقل ہوگئے۔ میرے دادا مسمی حمند سے مل بھی پختہ اعتقاد عیسائی تھے اور تبلیغی خدمات انجام دیتے تھے۔

میرے والد صاحب مجھے بھی ایک کامیاب مبلغ اور پادری بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے میری تعلیم اور تربیت مذہبی نہج پر ہوئی پرائمری تعلیم میں نے ایس ڈی اے مشن اسکول چوہڑکانہ منڈی میں حاصل کی۔ یہاں شروع ہی سے کوشش کی جاتی تھی کہ ہر بچہ بڑا ہوکر ایک اچھا مبلغ عیسائیت بن سکے۔ میں اپنی پڑھائی میں بڑا تیز تھا اسکول کے مذہبی کاموں کے علاوہ تبلیغی لٹریچر تقسیم کرنے والی پارٹیوں میں بھی شامل ہوتا۔ مجھے بچپن ہی سے تقریریں کرنے اور تبلیغی خدمات انجام دینے کا بہت شوق تھا اور میرے اس شوق کو سارے اساتذہ اور پادری حضرات اور شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

پرائمری کے بعد میں ایس ڈی اے مشن اسکول رڑکی چلا گیا۔ وہاں بھی میری تعلیمی و تبلیغی کارکردگی نمایاں رہی۔ یہاں میں نے عیسائیت کے بنیادی اصولوں مثلاً تثلیث، مسئلہ کفارہ، مسئلہ الوہیت مسیح اور الہیات کے بعض دیگر مسائل کی تربیت حاصل کی۔ اس اسکول میں بھی عام اساتذہ خصوصاً پرنسپل جناب ایچ سی الیگزینڈر میرے معاملے میں بہت خوش اور مطمئن تھے۔ انھیں بجا طور پر میری صورت میں مستقبل کا ایک کامیاب مبلغ اور پادری نظر آرہا تھا۔ اسی اثنا میں میرے والد کا تبادلہ راولپنڈی ہوگیا اور ساتھ ہی وہ حادثہ رونما ہوا جس نے میری دنیا

تاریک بنا دی یعنی ۱۹۴۴ء میں میری والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ میرے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ تاہم ہماری نئی والدہ نے سارے بچوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ جاری رکھا اور آخر تک اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ ۱۹۴۷ء میں میرا تعلیمی اور تبلیغی کورس ختم ہوگیا اور میں نے اسی سال مسیحی کلیسا کے خادم کی حیثیت سے لاہور میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ میں رومن کیتھولک مشن کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔

۱۹۴۷ء کے اواخر میں میری شادی شرق پور کے ایک پروٹسٹنٹ پادری گھرانے میں ہوئی۔ میری بیوی ایک راسخ العقیدہ عیسائی خاتون تھی۔ تبلیغی میدان میں میرا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ جہاں میں عیسائیت کو دین حق کے طور پر پیش کرتا تھا۔ وہاں اسلام سے اس کا مقابلہ بھی کرتا اور زور و شور کے ساتھ اسلام پر عیسائیت کی برتری ثابت کرتا۔ اس ضمن میں متعدد مسلمان علماء سے میری بحثیں ہوئیں۔ تاہم یہ بات عجیب ہے کہ دوران گفتگو میرے منہ سے عموماً اسلامی تراکیب و اصطلاحات نکل جاتیں جس پر میرے ساتھی مجھے ٹوکتے اور خود میں شرمندہ ہو جاتا۔ مثلاً الہامی کتب کا ذکر آجاتا تو میں بے ساختہ کہہ جاتا کہ میں الہامی کتابیں چار ہیں۔ توراۃ، زبور، انجیل، قرآن۔ خدا کے بجائے عموماً اللہ کا اور حضرت مسیح کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ بول جاتا۔ عبادت کو نماز کہہ جانا، وغیرہ۔ میری کلیسائی خدمت کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مشنری حضرات کہ جن کے ساتھ میں کام کرتا تھا۔ اپنے وطن بلجیم چلے گئے۔ میں نے ترقیِ دیہات کے سرکاری محکمہ میں شمولیت اختیار کر لی اور شیخوپورہ چلا گیا۔ خان انور طہماسپ خان پی۔ سی۔ ایس ضلع شیخوپورہ کے ڈویلپمنٹ آفیسر تھے۔ انھوں نے خاص شفقت کا برتاؤ کیا اور دفتر ہی میں خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ چونکہ میرا نام مسلمان سمجھتے مگر جب انھیں پتہ چلا کہ میں عیسائی ہوں تب بھی ان کے سلوک میں کوئی فرق نہ آتا اور ان کا برتاؤ مہر و مروت میں گندھا ہوا ہوتا۔

خصوصاً خان انور طہماسپ صاحب، میاں غلام سرور نواز ردمانی صاحب اور چودھری صفدر علی خاں صاحب کا لطف و کرم مثالی نوعیت کا تھا۔ ان حضرات کی وجہ سے میرے دل میں اسلام کے لیئے نرم گوشہ پیدا ہوتا گیا۔ اسلام کے بارے میں میرے شکوک و شبہات دور ہونے لگے اور میرے دل کی دنیا ایک صالح انقلاب کی طرف مائل ہونے لگی۔ اسی دوران میں بلجیم والے مشنری واپس آگئے

اور مجھے دوبارہ تبلیغی خدمات انجام دینے کی دعوت دی مگر میں نے ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کردیا۔ اس ضمن میں میری بیوی باپ اور سسر نے بھی بہت زور دیا بلکہ خفگی اور برہمی کا مظاہرہ کیا مگر میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ مسلمانوں کے اتنے قریب رہنے کے بعد اب مشنری خدمات انجام دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

لیکن ۱۹۵۹ء میں ترقی دیہات یا ویلج ایڈ کا محکمہ ختم ہو گیا تو تبلیغی خدمات انجام دینے کے لئے مجھ پر دوبارہ زور ڈالا گیا اور اس مرتبہ میں زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کرسکا۔ تاہم یہ ارادہ ضرور کرلیا کہ اب عیسائیت کی تبلیغ کرتے ہوئے اسلام پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا بلکہ خدا نے موقع دیا تو اسلام کے خلاف ان تمام اعتراضات کو حقیقت و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔

میری تبلیغی مہمات کا مرکز شیخوپورہ تھا مگر ہفتے میں دو مرتبہ مسیحی بشارت کے لئے ضلع لاہور میں بھی مدعو کیا جاتا۔ مجھے تبلیغی جوہر ورثے میں ملے تھے جنھیں محنت اور طباعی نے جلا عطا کی تھی، چنانچہ میں ہر قسم کی تقاریر خود ہی تیار کرتا۔ انجیل کے مختلف حصوں کو نظم کی صورت دیتا اور نہایت خوبصورت موثر آواز میں خود ہی پیش کرتا ایک خوش الحان پادری کی حیثیت سے میں عوام کو گھنٹوں متوجہ رکھتا تھا۔ میری مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بیشتر مقامی پادری میری نظمیں اور گیت الاپتے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسلامی ماحول نے مجھ پر کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ میں نے مسلمانوں میں اپنے حلقۂ احباب کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسے وسعت بھی دی میری بیوی اس پر سخت برافروختہ ہوتی اور اپنے اور میرے والدین کو آگاہ کرتی رہتی۔ کبھی جوش میں آکر گھر میں اسلام کی کوئی خوبی بیان کردیتا تو گویا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور کئی روز تک فضا میں تلخی رہتی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اسلام کے بارے میں میرا تجسس آگے بڑھتا رہا۔

۱۹۶۴ء میں ایک مرتبہ میں اپنے والدین کو ملنے لاہور گیا۔ والد صاحب کے پاس کرسچین کونسل لٹریچر بورڈ کے سکریٹری مسٹر پی جے ایکنین بیٹھے ہوئے تھے انھیں معلوم ہوا کہ میں سابق ویلج ایڈ رہبر اور فیلڈ کے تجربہ کے علاوہ لکھنے بولنے اور گانے میں بھی ماہر ہوں تو انھوں نے میری خدمات حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک چٹھی دے کر گوجرانوالہ میں مسٹر پال ای ہوسٹیٹلر پاکستان میں مسیحی تعلیم

بالغان کے پروگرام کے ڈائریکٹر تھے۔ اس پروگرام کے چلانے کے لئے انہیں ایک موٹی ویٹر کی ضرورت تھی۔ مسٹر ہوسینسٹر ماہر نفسیات ولسانیات تھے۔ انھوں نے بخوشی میرا تقرر کر دیا اور میں گوجرانوالہ منتقل ہو گیا۔ میرے بیوی بچے بھی یہیں مشن کمپاونڈ کھوکھر کی گوجرانوالہ آ گئے۔

تعلیم بالغان کا یہ پراجیکٹ جو ویسٹ پاکستان کرسچن کونسل کی طرف سے شروع کیا گیا تھا اس کی تمام مالی امداد نیو یارک سے آتی تھی اس کی حسب ذیل چار شعبے تھے۔

۱۔ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن (تحقیق و اشاعت)
۲۔ علمی تربیتی کورس برائے اساتذہ و سپروائزر وغیرہ۔
۳۔ مسیحی علمی لٹریچر کی تقسیم فروخت۔
۴ تبلیغ و ترغیب، پبلسٹی وغیرہ۔

ان چاروں شعبوں کا بیشتر بوجھ کندھوں پر ڈالا گیا اور میں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کام میں جٹ گیا۔ میں نے فرائض کی ادائیگی میں دن دیکھا نہ رات۔

چنانچہ اس علاقہ کا ہر عیسائی اس کی گواہی دے گا کہ میں نے علمی، تعلیمی اور تبلیغی خدمات کس تندہی سے انجام دیں۔ ان فرائض کے سلسلے میں مجھے پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں جانا پڑتا ہے میری یہ خدمات اتنی وقیع تھیں کہ مسٹر پال ای ہوسینسٹر نے مجھے ہر طرح کی سہولیات فراہم کر رکھی تھیں۔ سفر میں مجھے سکینڈ کلاس کی سہولت حاصل تھی۔ اگر گھر سے باہر کہیں رات بسر کرنی پڑتی تو قیام کا الاؤنس دس روپے فی رات ملتا تھا۔ دیگر اخراجات سفر بھی ادارہ کے ذمہ ہوتے۔ تنخواہ تقریباً چھ سو روپے ماہوار تھی اور رہائش اس کے علاوہ تھا۔ بچوں کے تعلیمی وظائف ایک اسپیشل فنڈ سے ادا ہوتے۔ میڈیکل الاؤنس بھی اس میں تھا۔ ہر کرسمس پر ڈیڑھ سو روپے الگ ملتے، گرمیوں کی تعطیلات میں ایک ماہ کی زائد تنخواہ ملتی۔ گندم خریدنے کے لئے آسان قسطوں پر پانچ سو روپے کا قرض ملتا۔

میری کتاب پر تین سو روپے تک رائلٹی ملتی۔ یہاں تک کہ بیس ہزار روپے میں میرا اجادثاتی بیمہ بھی کرا دیا گیا تھا تاکہ میری ناگہانی موت کے بعد میرے بیوی بچے بے سہارا نہ رہیں۔

یہ ساری سہولتیں میسر تھیں مگر قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو لاکھوں

میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ میں لوگوں کو بزعم خویش حق کی تعلیم دیتا تھا حالانکہ خود جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں تھا اور عوام کو روشنی کی طرف بلاتا تھا بلکہ خود نور کی ایک کرن کے لئے ترس رہا تھا۔ تبلیغی و علمی خدمات کے دوران میں یہ احساس مجھے متواتر تنگ کرتا رہتا۔ میں اپنے عہد کے مطابق اسلام پر اعتراض تو ہرگز کوئی نہ کرتا تھا مگر یہ خیال ذہن میں مجھے لگاتار رہتا کہ میں عیسائیت کی تبلیغ کر کے اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا دے رہا ہوں خصوصاً دو سوال تو روح کی پھانس بن گئے اور میں ان کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا۔

ا۔ اگر عیسائیت ایک سچا مذہب ہے اور اسی کی تقلید پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے تو مذہب زوال کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ حالانکہ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد محبت و اخلاق پر ہے۔

۲۔ اس کے برعکس اسلام کو ہر عیسائی جھوٹا خیال کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ظلم و تشدد اور تلوار پر قائم ہے۔ پھر یہ اس قدر ترقی کیوں کر گیا؟ جبکہ ظلم و تشدد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

انھیں دو بنیادی مسائل کا تقابل مجھے راہ تجسس پر دور تک کھینچتا چلا گیا اور میں ذہنی و قلبی اضطراب کو لئے ہوئے تلاشِ حق کے لئے ادھر ادھر سرگرداں رہا۔ علماء کرام سے اعتراضات کی صورت میں گفتگو کا ایک ہی مقصد ہوتا اور علمی و تحقیقی طلب و جستجو کا بھی اب ایک ہی مدعا تھا۔ یعنی دل کی اس خلش کا علاج جو متذکرہ بالا مسائل نے پیدا کر دی تھی۔ تجسس کی یہ مدت دس سال کے عرصے پر محیط ہو گئی۔ الحمدللہ کہ اندھیرے کے تمام پردے ایک ایک کر کے نگاہوں سے ہٹتے چلے گئے۔ ذہن کے سارے شکوک دور ہو گئے۔ اسلام ایک روشن جگمگاتا ہوا سورج بن کر میرے سامنے آگیا اور اب اس سے انکار کرنا ممکن ہی نہ رہا چنانچہ ۲۳ جون ۱۹۶۸ء کا مبارک دن تھا جبکہ میں اپنے دس افراد خانہ کے ساتھ گوجرانوالہ کی مکی مسجد میں گیا اور مولانا محمد اسمٰعیل کاشمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ الحمد للہ تعالیٰ

یہاں ایک دردناک حادثے کا ذکر بہت ضروری ہے۔ میں روحانی سکون کی تلاش کے آخری مراحل طے کر رہا تھا کہ میری دیرینہ رفیقۂ حیات ایک طویل بیماری کے بعد فوت ہو گئی۔ میں نے دوسری شادی کر لی اور اس خدا کی بندی سے

جوں ہی میں نے اسلام کی بات کی اُس نے اس کی تائید کی اور تلاشِ حق کے سلسلے میں میری سرگرم خوید و مونس بن گئی۔ اللہ سے جزائے خیر عطا کرے۔

آخر میں نہایت اختصار کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کے ان عقائد کا تجزیہ پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے ایک عرصے تک مجھے تحقیق و تجسس کے میدان میں مو سفر رکھا۔

سب سے پہلے مجھ کو تثلیث کے مسئلے نے پریشان کیا۔ عیسائی عقیدے کے مطابق ایک خدا میں تین اقانیم ہیں یعنی باپ، بیٹا اور روح پاک، جیسے وہ انسان کے جسم میں تین چیزوں، میری سمجھ، میری یاد اور میری مرضی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں وہ تثلیث کو بہت بڑا بھید بھی کہتے ہیں جو انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ عیسائی لوگ پہلے ایک خدا کہہ کر توحید کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر پھر اس خدا میں تین شخص کہہ کر توحید کا ستیاناس کر دیتے ہیں دوسرے لفظوں میں اقرار تو توحید کا کرتے ہیں مگر مانتے تثلیث کو ہیں کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔

پھر یہ بات بھی خاص پریشان کن تھی کہ تثلیث کا بھید انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ظاہر ہے جو چیز شعور کے احاطے میں نہ آسکے۔ اس پر عقل کی عمارت کیسے کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس زمین و آسمان کائنات اور مخلوقات کا سارا نظام پکار پکار کر گواہی دیتا ہے کہ خالق حقیقی وحدہٗ لاشریک ہے۔ یعنی توحید کا تصور عام فہم اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ تمام الہامی کتابیں بھی اس کی شہادت دیتی ہیں مثال کے طور پر:

توراۃ خروج آیت ۲۲/۲۰ جو کوئی واحد خداوند کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے گا وہ نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

سلاطین آیت ۱۸/۶:۔ خداوند ہی خدا ہے۔ اس کی مانند اور کوئی خدا نہیں

زبور۔ آیت ۸۶/۱۰:۔ تو ہی بزرگ ہے تو ہی واحد خدا ہے۔

انجیل۔ متی آیت ۱۹/۱۷:۔ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے۔ کیونکہ نیک تو ایک ہی ہے۔

قرآن تو ظاہر ہے توحید کی دعوت اور مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ میں تثلیث کے غیر عقلی عقیدے سے منحرف ہو گیا اور توحید پر ایمان لے آیا۔

عیسائیت میں قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ قرآن محمد اصل

توریت، زبور اور انجیل کی نقل ہے، چنانچہ توحید کے مجھے ایسے دلائل مطلوب تھے جو قرآن پاک کو آسمانی کتاب ثابت کر دیں۔ شکر ہے کہ تحقیق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں مسیحی فرقوں کی بائبلوں میں زبردست تضاد ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی کتاب کو غلط کہتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے الہامی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومن کیتھولک کی بائبل میں عہد عتیق (پرانے عہد نامے) کے صحیفوں کی تعداد ۴۶ ہے۔ اور عہد جدید یا نئے عہد نامے کی تعداد ۲۸ ہے یعنی کل ۷۴ ہے۔ جبکہ پروٹسٹنٹ فرقے میں عہد عتیق اور عہد جدید کے صحیفوں کی بالترتیب تعداد ۳۹ اور ۲۷ ہے۔ جو ۶۶ بنتی ہے بائبلوں میں تضاد ہونے کے علاوہ ان کی آیات میں بھی تضاد ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

پیدائش ۱۸۔۹ آیت میں ہے کہ خدا غائب کا علم نہیں رکھتا۔

متی ۲۴۔۳۶ میں مرقوم ہے کہ "خدا کو غائب کا علم ہے اور اس کے سوا کوئی غائب کا علم نہیں رکھتا"۔ مجھے تحقیق کے باوجود آج تک کوئی عیسائی بائبل کا حافظ نہیں ملا، چنانچہ اگر دنیا بھر سے بائبل کے نسخے نابود ہو جائیں تو بائبل کا وجود ختم ہو جائے گا۔

جبکہ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ قرآن نہ صرف ہر نوع کے تضاد یا تحریف سے پاک ہے بلکہ لاکھوں حفاظ کے سینوں میں محفوظ بھی ہے اور صدیاں گزر جانیکے باوجود اس کے زیر زبر میں بھی فرق نہیں پڑا۔ بائبل کا متن پکار پکار کر کہتا ہے کہ یہ تغیر و تبدل کے بہت سے مراحل سے گذرا ہے۔ مگر قرآن کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔ محکم اور اٹل دلائل نے میرا ایمان قرآن پر بھی راسخ کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ فی الواقع خدائے تعالیٰ کا کلام پاک ہے۔

بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ اسلام ظلم و تشدد کا علم بردار ہے اور یہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ جبکہ عیسائیت محبت و اخلاق سے پھیلی ہے۔ اس میں کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کی جاتی۔

مگر پیدائشی مسیحی ہوتے ہوئے بھی یہ بات میرے مشاہدے میں آتی رہی کہ برصغیر میں انگریزوں کے آنے کے بعد لوگ پیار محبت سے عیسائی نہیں ہوئے بلکہ [illegible] لالچ دے کر عیسائی بنایا گیا اور روحانی سکون کی طرف کھینچنے کی بجائے [illegible] عیش و آرام کی طرف اکسایا جاتا تھا چنانچہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں

کہ پاک و ہند میں جتنے لوگ بھی عیسائی ہوئے وہ کسی نہ کسی دنیاوی مفاد اور شادی لالچ میں گرفتار ہوئے۔ پھر یہ بات بھی میرے تجربے میں آئی کہ غیر ملکی مشنری امریکہ اور یورپ سے بھاری رقمیں منگاتے تو مقامی عیسائیوں سے کوئی محبت نہیں ہوتی، وہ اس کو کاروبار سمجھتے ہیں۔ اور تبلیغ کے نام پر دراصل خود گلچھرے اڑاتے ہیں بلکہ یورپ کی طاقتوں نے خصوصاً اسلام کو ختم کرنے کے لئے بڑے سے بڑے ظلم اور دھونس اور دھاندلی سے بھی گریز نہیں کیا۔

اس کے برخلاف مجھے یاد نہیں کہ پاکستان میں کبھی کسی غیر مسلم کو مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا ہو۔ یہی عالم دوسری اسلامی دنیا کا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں تک مسلمان حکمراں رہے۔ مگر ہندو آخر تک اکثریت میں رہے اور آزادی سے اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے رہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں کبھی اسلامی فوجیں گئی ہی نہیں تھیں اکثریتی ممالک ہیں۔ تلوار یا دفاع کے لئے ہے۔ یا ظالم انسان دشمن قوتوں کے لئے۔ ورنہ نبی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے لے کر ساری اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام رحم و کرم محبت و شفقت اور انسانی ہمدردی کا بے نظیر مرقع ہے۔ اور اس پر تشدد کا الزام جھوٹ اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں کو عیسائی خوب اچھالتے ہیں، چنانچہ میں بھی برسوں تک ایک پادری کی حیثیت سے اس امر کو اعتراض کی صورت دے کر پھیلاتا رہا مگر تحقیق کی اور خدا نے میری آنکھیں کھول دیں تو معلوم ہوا حضورؐ کی ہر بات میں حکمت پوشیدہ تھی۔ انھوں نے جتنی بھی شادیاں کیں ان سب کے پس پردہ کسی نہ کسی جاہلی رسم کی تردید یا اسلامی تعلیم کی اشاعت کا مقصد ہوتا تھا۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ کئی نبیوں نے بیک وقت بہت سی شادیاں کیں، خود حضرت عیسیٰ بھی عورتوں سے متنفر نہ تھے اور کسی پیغمبر کو شادی کرنے سے نہیں روکا گیا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ میں نے غور کیا کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو اپنے نبی کے طریقے پر عمل کرتے ہیں مگر عیسائی ایک شادی کر کے بھی اپنے نبی کی سنت کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ حضرت سرے سے شادی کی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک شادی کرنا اور بیک وقت بہت عورتوں کے ساتھ ناجائز مراسم استوار کرنا آخر کہاں کی دیانت اور شرافت ہے

غفران احمد

مولانا ابوالکلام آزاد

جادو بیان مقرر

خداداد ذہانت اور گوناگوں قدرتی اوصاف نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک بے مثل اور نادرِ روزگار شخصیت بنا دیا تھا۔ یک طرف وہ مایہ ناز صحافی، بے نظیر ادیب اور عظیم سیاستداں تھے تو دوسری طرف ایک سحر انگیز خطیب بھی تھے۔ ان کی شخصیت کو واقعی طور پر جامع کمالات کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تقریباً نصف صدی تک ہماری قومی زندگی کے مختلف شعبوں پر چھائے رہے۔ مولانا آزاد کی وفات کے پروفیسر ہمایوں کبیر نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

" قدرت اکثر و بیشتر اپنی خوبیاں مختلف شخصیتوں کو مختلف انداز سے عطا کرتی ہے کچھ کو یہ جسمانی طاقت سے نوازتی ہے۔ جب کہ کچھ کو ذہانت اور طباعی سے۔ کچھ کو یہ فراوانی اور دولت مندی سے بہرہ ور کرتی ہے۔ اور کچھ کو شہرت و قبول عام سے۔ ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ ساری خوبیاں ایک ہی فرد میں جمع کر دی گئی ہوں۔ مولانا آزاد ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک تھے جنہیں قدرت نے وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جن کی انسان خواہش کرتے ہیں۔"

یہ سب اوصاف مل کر ہی، ایک عظیم شخصیت " مولانا ابوالکلام آزاد" کی تکمیل کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کے تجزیہ کے لئے ان تمام اوصاف کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے لیکن کسی ایک بڑی خوبی سے بھی ان کی شخصیت کا اندازہ بالکل اسی طرح لگایا جا سکتا ہے، جس طرح خوبصورت ہیرے کا ہر تابدار اور روشن پہلو اس ہیرے کی مجموعی قدر و قیمت ہماری نگاہ میں ٹھہراتا ہے۔

مولانا آزاد کی سحر آفریں خطابت کا تعلق ان کی اس انقلابی شخصیت، جوش

اور ولولہ سے ہے جو پچھلی صدی کی آخری چوتھائی اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں مشرقی اقوام پر یوروپی سامراج کے تسلط اور برطانوی استعمار کے خلاف مزاحمتی تحریک کے نتیجہ میں ابھرا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت 1888ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی۔ ان کی والدہ عرب خاتون تھیں اور والد ایک جید ہندوستانی عالم مولانا خیرالدین تھے۔ ان کا تعلق ہندوستان کے ایک مشہور علمی خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں بے شمار علماء اور محدثین نے جنم لیا۔ مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی۔ بعد میں گھریلو تعلیم اور اپنے والد ماجد سے مروجہ عربی و فارسی علوم میں کمال حاصل کیا۔ ان قدرتی صلاحیتوں اور خداداد ذہانت نے جلد ہی ہندوستان کی علمی، ادبی اور صحافتی دنیا میں ایک ممتاز مقام پر پہنچا دیا۔

عہد شباب میں ایک انسان کو جو آسائشیں مطلوب ہوتی ہیں اور جس چکا چوند کا وہ شیدائی ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ماحول میں وہ سب کچھ حاصل تھا۔ جیسا کہ خود مولانا نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "تذکرہ" میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن مولانا نے کبھی اس سرو سامانِ کار کی طرف التفات نہ کیا اور نہ اسے اپنی منزل سمجھا۔ ایک معاملہ جو ہمہ وقت مولانا آزاد کو اندر سے بے چین رکھتا تھا وہ تھا قوم کا مستقبل۔ انہوں نے عنفوان شباب میں ہی یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ برطانوی استعمار کے خلاف کس طرح عوام کو جدوجہد کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے دیکھا 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی ناکام ہو چکی تھی اس کے بعد 1890ء تک کہیں بھی مزاحمت کا نام و نشان نہیں تھا۔ غیر ملکی آقا آرام سے حکومت کر رہے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کی اکثریت اس صورت حال سے خاموش سمجھوتہ کر چکی ہے۔

وہ اس صورت حال کو دیکھ کر کڑھتے تھے۔ ہر لمحہ اس سے گلوخلاصی کا راستہ سوچتے تھے۔ ایک وقت تھا جب انہوں نے بنگال کے انقلاب پسندوں سے رابطہ پیدا کیا۔ اسی زد روں نے انہیں اپنی جماعت حزب اللہ (خدا کی جماعت) کی تشکیل پر آمادہ کیا۔ ادھر بیسویں صدی کے پہلے دہے میں، سرکردہ عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن کی خفیہ "ریشمی رومال تحریک" سے رابطہ قائم کیا۔ بیسویں صدی کے پہلے دہے کے اختتام تک مولانا ابوالکلام آزاد جو ابھی بمشکل 22 سال کے تھے، اپنی سیاسی منزل

"اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ اگر ہمیں نہ آزادی ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد قائم نہ رہ سکا تو عالم انسانیت کا نقصان ہوگا" اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے کتنے بڑے علم بردار تھے اور وہ اس کو آزادی سے بھی مقدم سمجھتے تھے۔

آخر میں مولانا آزاد کی اس معرکتہ الآرا تقریر کا حوالہ دینا ضروری ہے جو تقسیم ملک کے بعد جامع مسجد میں انہوں نے خاص طور سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔

"عزیزان گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانہ میں بھی جب کہ اس پر لیل ونہار بہت سی گردشیں بیت چکی تھیں تمہیں خطاب کیا تھا۔ جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دئے میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوسیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں ہر خطرہ کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے صرف اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔ سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے ہیں یا میرے آشیانہ کے لیے جگہ نہیں رہی بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل

کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کونسی راہ اختیار کی کہاں پہونچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں ہے؟ اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا؟ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی اور یہ نا سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔ پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اور نہ کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا منطقی نتیجہ ہے یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے موجب حیرت ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے ہی دن سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا ـــــ یہ فراری زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو گے کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دلی تمہارے خون کی سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارے جوش و خروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے ـــ ہوائیں گذر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گذرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

مولانا آزاد اس دل گداز رنگین شاہکار تقریر کا نسبتاً یہ طویل تر اقتباس، اس کا

ایس سی بھٹ

نیتا جی۔ قوم کے معمار

"میرے ساتھ آپ لوگ سب تین بار جے ہند کہیے" جواہر لال نہرو اپنے سامعین سے لال قلعہ پر یوم آزادی کے موقع پر کہا کرتے تھے۔ اس روایت کو ان کے بعد آنے والے پانچوں وزراء اعظم نے برقرار رکھا۔ بھارتی فوج کا ایک چاق و چوبند جوان جب بھی اپنے کسی ساتھی یا افسر سے ملتا ہے تو "جے ہند" ہی کہتا ہے۔ مذکورہ دو لفظ ہماری قومی زندگی کا ایسا لازمی حصّہ بن گئے ہیں کہ ہم مشکل سے ہی یہ غور پاتے ہیں کہ یہ جادو بھرا فقرہ کس نے ایجاد کیا تھا۔

اس کا جواب ہے نیتا جی سبھاش چندر بوس۔ وہ اس ہندوستانی سرزمین پر نہیں بلکہ جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا میں تھے جب کہ انھوں نے برطانوی فوج کے جنگی قیدیوں کو جنھیں جاپانی افواج سے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہاں کے بھارتی باشندوں کو ساتھ ملا کر ایک جنگی مشین یعنی انڈین نیشنل آرمی جیسے وہ بھارت کی آزادی کی فوج کے نام سے بھی پکارا کرتے تھے۔ اور آزاد بھارت کی عبوری سرکار جس کے وہ قائد تھے، کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔

اکثر جب نیتا جی کا ذکر ہوتا ہے تو ہم ان کی خوبیوں اور کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے تعلق بھارت کی جد و جہد آزادی، جسمانی اور اخلاقی حوصلے، پرجوش اور ولولہ انگیز حب الوطنی اور بھارت سے نکلنے کے بعد غیر ملکی سرزمین میں ان کے کارناموں سے ہے ان کی دیگر خوبیوں کے بارے میں کچھ زیادہ ذکر ہمیں نہیں ملتا نظم کے اندر ان کی صلاحیت تھی۔ وہ ایسے نئے نئے نعرے اور منصوبے تلاش کرتے تھے۔ جن سے ہندوستانی اپنے آپسی جھگڑے بھول کر ایک ہو کر سوچنے اور کام کرنے میں لگ جاتے تھے۔ اتحاد کے لیے ان کی طرف سے برابر زور دیا جاتا بھارت کی عزّت نفس اور

وقار کے بارے میں ان کے خیالات اتنے اٹل تھے کہ اس کے لیے وہ کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔

اگر انھیں از راہ التفات۔ نیتاجی یعنی قائد کے لقب سے بلایا جاتا تھا جو کہ انھیں ۱۹۱۵ء میں بھارت چھوڑنے کے بعد ملا تھا تو یہ کوئی غلط بات نہیں تھی۔ کیونکہ ہندوستانی خواتین اور مرد ایک قائد کی تلاش میں سے جو انھیں اندھیرے سے روشنی کی طرف اور غلامی سے آزادی کی طرف لے جا سکے لوگ جوق در جوق ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ انھوں نے اپنی فوج کو جنوبی ایشیا میں رہتے ہوئے دہلی کو اپنا نصب بنانے کا حکم دیا انھوں نے انہیں بتایا کہ کس طرح جاپانی سپاہیوں کی زبان پر جب وہ ٹوکیو سے ایشیا میں یورپ کے نوآبادیاتی علاقے فتح کرنے نکلے تھے تو صرف سنگاپور سنگاپور کا ہی نعرہ تھا۔ اسی طرح انھوں نے اپنے جنگ آزادی کے سپاہیوں کو اپنے لبوں پر صرف "دہلی چلو" کا نعرہ رکھنے کی ہی تلقین کی تھی۔

دہلی کے لال قلعہ کو آزاد اور متحد ہندوستان علامت بنایا جاتا ان ہی کی ذہنی کاوش کا نتیجہ تھا۔ یہ دوسری بار تھی جب کہ عوام نے ان کے خیال کو عملی جامہ پہنایا اور لال قلعہ ہندوستان میں بہت سی ترقی پذیر کوششوں کا مرکز بن گیا۔ تاریخی لال قلعہ پر ہمارے قومی پرچم ترنگے کے لہرائے جانے کا نیتاجی کا خواب اس وقت شرمندہ ہوا جب آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو لال قلعہ کی فصیل پر رسمی طور پر ہمارا قومی پرچم نصب کیا یہ ملک کی آزادی کا دوسرا دن تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں گجرات میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے سبھاش چندر بوس نے ملک کی سماج اور اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کے واحد طریقے کے طور پر منصوبہ بند ترقی کے بارے میں سوچا انہوں نے قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے چیئرمین جواہر لال نہرو اور کنوینر شری ڈی وی گری نے جو بعد میں بھارت کا صدر جمہوریہ بھی ہوئے اور بائیں بازو کے ممتاز ماہر اقتصادیات پروفیسر کے ٹی شاہ کو اس کمیٹی کا سکریٹری بنایا گیا۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نیتاجی نے کہا تھا۔

"مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے اہم قومی مسائل غریبی اور ناخواندگی کا خاتمہ میں اور ساتھ ہی پیدا اوار بیت میں سائنٹفک انداز بھی سبھی اختیار کیا جا سکتا ہے جب کہ ہم ان مسائل کو سماجی طریقوں سے ہی حل کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری قومی مستقبل کی حکومت کو سب سے پہلے جو کام کرنا ہوگا وہ ہوگا ملک کی تعمیر نو کی غرض سے ایک جامع منصوبہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیشن کا قیام" ۱۹۳۸ء کی ان کی یہ خواہش پایہ تکمیل کو اس وقت پہنچی جب کہ آزادی کے بعد چند برسوں کے اندر ہی منصوبہ بندی کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔

تاہم وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ بادل ناخواستہ آزادی سے دستبردار ہونے والی تاریخ کی عظیم ترین برطانوی حکومت کے ہاتھوں سے آزادی کے حصول کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔ آزادی اور بھارت کے اتحاد کو انھوں نے اس وقت بھی زبردست ترجیح دی جب کہ وہ مستقبل کے بھارت کا خاکہ تیار کرنے میں مصروف تھے کہ وہ کس طرح کا بھارت چاہتے ہیں اور اس کے مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا جائے گا۔ زمانہ جنگ میں کلکتہ سے افغانستان ہوتے ہوئے جرمنی اور پھر روس سے ان کے سفر کا واقعہ بہت مشہور ہے تاہم وہ بات جسے اچھی طرح یاد نہیں رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے جرمن اور پھر جاپانیوں کے دوش بدوش کام کرتے ہوئے انھوں نے بھارت کی آن بان اور شان پر کبھی بھی آنچ نہیں آنے دی۔ انھوں نے نازی ازم خصوصاً ان کی نسلی امتیاز کی پالیسی کی جنگ شروع ہونے سے قبل ہی مخالفت کی تھی۔ تاہم جرمنی کی سرزمین پر حکومت کے مہمان حیثیت سے انہوں نے کہا "میں تین طاقتوں (جرمنی، اٹلی اور جاپان) کا معذرت خواہ نہیں ہوں، میری ساری تشویش بھارت کے لیے ہے اور اگر میں اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا چاہوں گا تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ صرف بھارت کے لیے"۔

جیسے ہی انہوں نے جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا میں رہنے والے بھارتی باشندوں سے مناسب فنڈ اکھٹا کر لیا۔ انھوں نے حکومت جرمنی کی وہ رقم جو اس نے ان پر اور ان کی سرگرمیوں پر خرچ کی تھی۔ ادا کر دی۔ انھوں نے اس وقت کے وزیر عظیم جنرل توجو کی زیر قیادت حکومت جاپان کو بتایا کہ انہیں آزاد ہند حکومت

کو دی گئی امداد کو ایک قرض سمجھنا چاہیئے۔ ایک ایسا قرض جو کسی دوست ملک نے دیا ہو جسے آزاد حکومت ہند احترام کی نظر سے دیکھے گی اور ادا کرے گی انہیں کی وجہ سے جنرل توجو نے جاپانیوں کو ہدایت کی تھی کہ ایشیا کے جن حصّوں میں وہ قابض ہیں وہاں نیتاجی کے آئی این اے کو منظم کرنے کا کام سے تعرض نہ کریں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آزاد ہند فوج بھارت کو برطانوی غلامی سے آزاد نہ کرا سکی تاہم وہ پھر بھی ناامید نہ ہوئے۔ جیسے ہی جنگ کا نقشہ بدلا اور جاپانیوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ اور آزاد ہند فوج کو جو کہ برما کے راستے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی روک دیا گیا۔ ۱۷ اگست ۱۹۴۵ کو اپنے آخری پیغام میں انہوں نے کہا "ہماری عارضی شکست سے بد دل نا ہونا۔ کچھ بھی ہو بھارت کی قسمت پر اعتقاد رکھنا۔۔۔۔۔ بھارت بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔ جے ہند۔

فوج کے وہ جوان اور افسر جنہیں تنہا قید کر رکھا تھا اور جو بھارت کی جنگ آزادی سے تقریباً الگ رکھے گئے تھے اپنے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ محسوس کر رہے تھے اور وہ جذبہ تھا کہ انہیں نوآبادیاتی اقتدار سے کسی بھی طرح آزاد کرانا ہے۔ برطانوی سرکار نے ان جوانوں اور افسروں پر مقدمہ چلا کر اور وہ بھی لال قلعہ میں چلا کر اس جذبہ کو اور بھی ہوا دی۔ میجر جنرل شاہ نواز خان، کرنل ڈھلوں اور کرنل پریم سہگل پر مقدمہ کی کاروائی جدوجہد آزادی کی ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ جب کہ ممتاز وکیل بھولا بھائی ڈیسائی اور ممتاز مجاہد آزادی نے نظریہ پیش کیا اور غلامی کے جوئے کے تلے دبے لوگوں کو آزادی حاصل کرنے کے لیے جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

کورٹ مارشل عدالت کو اس بحث کو ہر صورت نظر انداز کرنا تھا اور تینوں افسروں کو سزا دینی ہی تھی تاہم عوام کی رائے انڈین نیشنل آرمی اور اس کے باقی نیتاجی سبھاش چندر بوس کی موافقت میں اس حد تک تھی کہ وائسرائے مذکورہ افسروں کو "معاف" کرنا پڑا۔ برطانیہ نے خالص فرقہ پرستی والے اپنے نظریے کے تحت مذکورہ مقدمے کے لیے ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک سکھ کو منتخب کیا تھا تاہم یہ انکو نہیں معلوم تھا کہ ان کی اس مذموم چال سے بھارتی قومیت کی بنیاد کو مزید استحکام ملے گا۔

اس واقعہ کے دو سال سے بھی کم مدّت میں بھارت آزاد ہو گیا۔ افسوس کہ جنگ آزادی کے عظیم کمانڈر اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے سبھاش چندر بوس جنہوں نے

جنگ آزادی کے دوران یہ بھی سوچ لیا تھا کہ بھارت کی آزادی کے بعد ان کی کیا شکل ہونی چاہیئے۔ ہمارے درمیان نہ رہے۔ تاہم بھارت کے دلوں میں ان کا مقام بہت مستحکم ہو چکا تھا۔ گوکہ وہ برسوں سے ہندوستان میں موجود نہیں تھے۔ تاریخ میں ان کا مقام مسلم ہے۔

"اے بابائے قوم، بھارت کی اس مقدس جنگ آزادی میں ہم آپ کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے آرزومند ہیں۔ یہ نیتاجی کے ۶ جولائی ۱۹۴۴ء میں سنگاپور سے آزاد ہند ریڈیو پر نشر پیغام کے الفاظ ہیں۔

ایک بار پھر مقولے تیار کرنے کے اس ماہر نے اپنے اس پیغام کے ذریعہ ہمیں وہ پرکشش الفاظ دیئے جن کا استعمال ان کی موت کے بعد گاندھی جی کے لیے کیا گیا۔ ۲ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو مہاتما گاندھی کی ۷۵ ویں سالگرہ پر بنکاک سے نشر ان کا پیغام ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے جو گاندھی اور سبھاش کے باہمی رشتے کو ہمیشہ دو مخالفوں کا رشتہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بنکاک نشریے میں گاندھی جی کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نیتاجی نے کہا آج کے دن پوری دنیا میں بھارتی باشندے اپنے عظیم ترین رہنما کی 75 ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔

انہوں نے بھارت کی جنگ آزادی میں مہاتما گاندھی کی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی خدمات کو "انوکھی اور بے نظیر" خدمات قرار دیا اور کہا "۱۹۲۰ء سے جب سے گاندھی جی نے جنگ آزادی کی قیادت اختیار کی تھی۔ بھارت کے عوام نے گاندھی جی سے دو چیزیں سیکھیں تھیں ...... اپنے ملک کا احترام اور خود اعتمادی جس کے نتیجے میں آج ان کے دلوں میں انقلابی جذبہ موجزن ہے دوسری چیز گاندھی جی نے ہمیں دی وہ ہماری جد وجہد آزادی کا ملک کے کونے کونے یہاں تک کہ دور دراز گاؤں میں پھیلا دیا جو شائد ان کے بغیر ممکن نہ ہو پاتا۔ اس بات سے نیتاجی کی مراد انڈین نیشنل کانگریس تھی جسے گاندھی جی نے منظم بنیاد عطا کی تھی اس طرح بہت سے دیگر معاملات میں بھی وہ کسی اور رہنما کے مقابلہ میں تو گاندھی جی کی طرح تھے۔ وہ بہترین خوبیوں کے مالک اور ناظم تھے، جس طرح انہوں نے بھارت میں اپنا فارورڈ بلاک قائم کیا۔ ۱۹۴۱ء میں برطانیہ کے خفیہ محکمے کی آنکھوں

میں دھول جھونک کر کلکتہ سے فرار ہوئے اور ماسکو سے ہو کر برلن پہونچے اور اس کے بعد مشرقی ایشیا جانے کے لیے آبدوز کے ذریعے ایک خطرناک بحری سفر کیا اور آخر کار ایک جنگی طاقت جس کا نام انڈین نیشنل آرمی تھا تشکیل دی اور ایک مکمل طور پر آزاد حکومت قائم کی۔

مہاتما گاندھی نے بھارتی عوام کو متحد کرنے میں نیتاجی کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح سے خراج عقیدت پیش کی تھی۔ "نیتاجی کی زندگی سے سب سے بڑا سبق جو ہم حاصل کر سکتے ہیں وہ ان کا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ انہوں نے لوگوں میں اتحاد کے جذبے کو فروغ دیا تاکہ وہ ہر قسم کی مذہبی اور علاقائی رکاوٹوں سے بالاتر ہو کر ایک مقصد کے لیے اپنا خون بہا سکیں۔

نیتاجی کا عظیم ترین اور لافانی کام یہ تھا کہ انہوں نے ذات اور طبقے کے تمام امتیازات کو مٹا ڈالا۔ وہ بھارتی تھے۔ اور بھارتی رہے۔ مزید برآں انہوں نے اپنے تحت تمام افراد میں بھی وہی جوش و خروش بھر دیا جو ان کے اپنے پاس تھا تاکہ وہ تمام امتیازات کو فراموش کر کے ان کے ساتھ ایک ہو کر کام کر سکیں۔ ▲▲

اور درآمدات کو کم کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ادائیگیوں کے توازن کے لیے مالی وسائل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دانشمندانہ حدود کے اندر تجارتی قرضہ جات حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

جائزہ کے آخر میں شہر کاری، آبادی اور تعلیم جیسے طویل المدتی مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری آبادی کی وجہ سے کچھ ایسے نئے چیلنج سامنے آئے ہیں جن پر فیصلہ کن کارروائی ضروری ہے جائزہ میں آبادی میں تیز اضافے پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور اس پر روک لگانے کے لیے مقتدر اقدامات کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تعلیم نسواں خواتین کی عام حیثیت میں بہتری اور صحت سے متعلق سہولتوں میں اضافے کا خصوصی ذکر ہے

ملک کی مسلسل منصفانہ اقتصادی ترقی کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جائزہ میں کہا گیا ہے کہ غریبی کے چکر میں پھنسے ہوئے لوگوں کا علاج تعلیم ہے جائزہ میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ کم لاگت کی اعلیٰ قسم کی سماجی سروس، اقدامات، آج غریبوں کے معیار زندگی کو اوپر اٹھاتے اور طویل المدتی ترقی کے لیے درکار بہتر انسان تیار کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ●●

حمایت علی شاعر

اختر الزماں ناصر

(قسط اول)

بعض شخصیتیں اتنی قناعت پسند ہوتی ہیں کہ ساری عمر ایک مخصوص دائرے میں سمٹی رہتی ہیں۔ ان کی مثال میٹھے پانی کے اس چشمے سی ہوتی ہے۔ جو دوسروں کے لئے تو اپنا دامن پھیلائے رکھتا ہے مگر خود کسی وسعت کا آرزومند نہیں ہوتا۔

اختر الزماں ناصر۔ اورنگ آباد کے ایک ایسے ہی چشمے کا نام ہے۔ جو گزشتہ نصف صدی سے بقدرِ ظرف تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجا رہا ہے۔ اور بقدرِ امکان ان زمینوں کو سیراب کر رہا ہے جن کی مٹی اس شہر کی ادبی زرخیزی کی ضمانت ہے۔ یہ اور بات کہ کچھ کھیتیاں دو چار فصلوں کے بعد ہی موسموں کے سرد و گرم کا شکار ہو گئیں اور کچھ آج بھی سرسبز ہیں۔

۱۹۴۵ء کے بعد جو نسل ایلورا اور اجنتا کی اس وادی میں شعر و ادب کے حوالے سے نمودار ہوئی، ان میں میرے علاوہ عباس اخگر (عباس انجم) ممتاز اختر (ممتاز احمد خاں) شفیع الدین فرقت (قاضی شفیع مرحوم) عبدالرؤف عروج، اولاد حبیب زیدی (فرحاد زیدی) انور معظم، وحید اختر، بشر نواز، عبدالمقتدر نجم، جے پی سعید، بہاری لال شیدا اور چند دوسرے نوجوان تھے جو مختلف برسوں میں اختر الزماں ناصر کے گرد جمع ہوتے رہے۔ اور ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔

میں تو ۱۹۴۵ء ہی میں حیدرآباد دکن چلا گیا اور ۱۹۵۱ء میں پاکستان آ گیا اور عروج، شفیع، ممتاز اور فرحاد زیدی بھی ترکِ وطن کر گئے اور انور معظم اور وحید اختر نے بھی حیدرآباد اور علی گڑھ کو بسا لیا لیکن اختر الزماں ناصر وہیں رہے۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۶۲ء تک میں تقریباً ۳۰ سال P.C.M (دہلی) کے متاثر

میں شرکت کے لئے ہندوستان جاتا رہا مگر ان سات برسوں میں صرف دو مرتبہ اورنگ آباد جا سکا اور وہ بھی چند روز کے لئے۔ پھر تقریباً ۲۲ سال بعد یعنی ۱۹۸۸ء میں مجھے اپنے آبائی شہر کا دیدار نصیب ہوا۔ اس عرصے میں ہر چیز بدل چکی تھی، شہر وسیع تر ہو گیا تھا اور وہ اونگھتی ہوئی فضا جس میں ہم نے آنکھ کھولی تھی، مشینوں کے شور کے سبب بیدار ہو چکی تھی۔ آبادی کے سیلِ رواں نے زندگی کی رفتار تیز کر دی تھی مگر اختر الزماں ناصر وہی تھے۔

اختر صاحب کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی احباب کا جمگھٹا، قہقہے، رات کے آٹھ بجے شاہ گنج کے ایک ہوٹل میں بیٹھنا، صرف ڈیڑھ پیالی چائے پینا، شاعری اور ادب کے ساتھ دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو اور پھر اپنے مخصوص وقت پر گھر چلے جانا۔ وقت کے وہ ہمیشہ پابند رہے۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں جب میں دہلی، انبالہ اور بمبئی کے مشاعروں میں شرکت کے بعد سراج اورنگ آبادی کے[1] تین سو سالہ جشن کے سلسلے میں اورنگ آباد پہنچا تو ان دنوں بھی اختر صاحب کو وقت کا اتنا ہی پابند پایا جتنا ۱۹۴۶ء میں انجمن نوجوانانِ اورنگ آباد کے "یوم اقبال" کے دوران میں دیکھتا تھا۔

اگلے ہی مہینے یعنی اپریل ۱۹۸۶ء میں حیدرآباد دکن میں "عالمی اقبال سیمینار" کی تقریبات تھیں جو تین دن جاری رہیں۔ اس دوران میں بھی اختر صاحب کی پابندیٔ وقت کا عالم دیدنی تھا۔ میرا چھوٹا بھائی میر مجاہد علی طبعاً بہت شوق و شریر رہے، ایک دن اختر صاحب کو جلسہ گاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر بے ساختہ ایک شعر پڑھنے لگا: ؎

مرنے والے مر تو جاتے ہیں، فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

---

[1] قاضی سلیم، اختر الزماں ناصر اور عبدالمقتدر نجم کی کوششوں سے اورنگ آباد کی تاریخ میں پہلی بار سراج اورنگ آبادی کا تین سو سالہ جشن ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ مارچ ۸۶ء کو آزاد کالج میں منایا گیا تھا۔ اس جشن کی تیاریوں میں اورنگ آباد کے تقریباً سبھی ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا تھا۔ بیرونی شخصیتوں میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر رفیق زکریا، رشید حسن خاں، یوسف ناظم، عزیز قیسی، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر انور معظم، مجتبیٰ حسین، بلراج کومل، فضیل جعفری اور سید عارف (مدیر "جواز" مالیگاؤں) کے علاوہ کئی اہلِ قلم شریک تھے۔

"یہ کون سا موقع ہے شعر پڑھنے کا اور پھر یہ شعر" میں نے اُسے ٹوکا اس نے ہنس کر جواب دیا "ڈپٹی نذیر احمد یاد آگئے۔ لوگ انھیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کر لیتے تھے۔ کون کہتا ہے وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ اب وہ اختر صاحب کے روپ میں ہمارے ساتھ ہیں" میں ہنس پڑا۔

حقیقت بھی یہی ہے۔ کوئی محفل ہو کوئی عالم ہو اختر صاحب اپنے نظام الاوقات کے مطابق کام کرتے ہیں۔

اس سال (۱۹۸۷ء) جب میں ہندوستان گیا تو اورنگ آباد میرا آخری مستقر تھا۔ چنانچہ قیام کا زیادہ موقع ملا۔ اختر صاحب سے روز ہی ملاقات ہوتی اور میں محسوس کرتا جیسے وقت ان کی ذات میں ٹھہر گیا ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کے باوجود اب تک نوجوان ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ زندہ دلی اور استادانہ سنجیدگی میں بڑے قرینے سے توازن قائم کر رکھا ہے۔

ادبی دنیا میں بھی نئے اور پرانے سبھی اہلِ قلم ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔ اُن کی محفل میں جہاں قاضی سلیم، ڈاکٹر معین شاکر، ڈاکٹر عصمت جاوید، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، مظہر محی الدین، میر ہاشم اور فاروق محمد خاں نظر آتے ہیں وہیں نئی نسل کے لکھنے والوں میں رفعت نواز، قمر اقبال، یوسف عثمانی، میر مجاہد علی، نور الحسنین، ڈاکٹر ارتکاز افضل اور علی رضوان بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے قدیم ترین دوست بلند اقبال، عباس انجم، یوسف اور حفیظ اللہ بھی روزِ اول کی طرح آج بھی ان کے ساتھ ہیں۔

جب میں ان محفلوں میں شریک ہوا تو یوں لگا جیسے پھر اُسی دور میں واپس آگیا ہوں جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا۔

اختر الزماں ناصر شعر و ادب ہی میں میرے اولین رہنما نہیں، میرے باضابطہ استاد بھی رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے استاد تھے جو اسکول اور کالج کی چار دیواری کے باہر اپنے طلبہ کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ اردو اور انگریزی ادبیات کے بارے میں جو علم ان کی مخصوص کلاسوں سے اورنگ آباد کے طلبہ نے حاصل کیا شاید اعلیٰ درس گاہوں میں بھی حاصل نہ کیا ہوگا۔

میں ان دنوں ہائی اسکول کا طالبِ علم تھا اور اس کالج میں پڑھتا تھا جس کی

۱ے اس وقت میں دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا (شاہد)

جامعیت میں میٹرک کے ساتھ انٹرمیڈیٹ (آرٹس) کی بھی تعلیم دی جاتی تھی یہ کالج اورنگ آباد کا واحد کالج تھا جو بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کوششوں سے ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا تھا اور بعد میں عثمانیہ کالج کے نام سے موسوم رہا۔ اس کالج سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا "نورس" جس میں میری پہلی نثری تحریر "حکایت تراب" کے نام سے شائع ہوئی۔ "فلسفہ اور حقیقت" یہ ایک افسانہ تھا جس پر اختر صاحب ہی نے نظر ثانی کی تھی۔ اس شمارے پر تاریخ آذر تا اسفندار ۱۳۵۵ف مطابق ۱۹۴۶ء درج ہے (یہ رسالہ مسلم ضیائی مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا جو انہوں نے ازراہِ محبت مجھے عنایت کر دیا تھا اور اب بطور یادگار میرے پاس محفوظ ہے)

یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ آباد سے ضابطہ کوئی رسالہ نکلتا تھا نہ اخبار۔ عبدالحلیم شرر کے "دلگداز" اور مولوی عبدالحق کے "اردو" کے بعد عرصۂ دراز تک طباعت کی دنیا میں ایک سناٹا طاری رہا۔ ہم نوجوان اپنی تسکین کے لئے قلمی رسالے نکالتے تھے جو ہماری ادبی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ شہر کے چوک میں ایک بوسیدہ عمارت تھی جس میں ایک قدیم لائبریری تھی "دبستان" ہم نے اسی کو اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ سرِ شام جمع ہوتے، اپنی تحریریں ایک دوسرے کو سناتے، آپس میں بحث کرتے اور اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ہماری ہر کاوش اختر الزماں ناصر ہی کی مرہونِ منت تھی۔ پھر یوں ہوا کہ شہر میں ایک دن تین نوجوان نمودار ہوئے جن کے بارے میں سنا تھا کہ وہ حکومت کے باغی ہیں۔ کامریڈ اختیار، کامریڈ حبیب اور کامریڈ نسیم (نسیم الحسن موہانی جو حسرت موہانی کے عزیز تھے) یہ تینوں جلاوطنی کی مدت ختم کر کے واپس آئے تھے۔ اجنتا ہوٹل میں ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ اختر صاحب نے فرداً فرداً سب کا تعارف کرایا۔ کچھ دیر پُر تکلف گفتگو رہی اور پھر چند ہی دنوں میں ہم سب بے تکلف دوست بن گئے۔ (اسی دوران معلوم ہوا کہ یہ حضرات بھی ایک قلمی رسالہ "رزم" کے نام سے نکالتے تھے) کچھ عرصے بعد کامریڈ اختیار نے چوک کے قریب جوبا بازار میں پیپلز بک ہاؤس کی بنیاد ڈالی جہاں اردو، ہندی اور انگریزی کی دیگر کتب کے ساتھ اشتراکی لٹریچر بھی برائے فروخت رکھا جانے لگا۔ اس بک ہاؤس میں ہم نے پہلی بار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ترجمان (ہفتہ وار رسالے) "قومی جنگ" اور "کراس روڈز" بھی دیکھے اور غائبانہ سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، انصاری اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے تعارف حاصل ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب ہماری انجمن نوجوانانِ اورنگ آباد نے "یوم اقبال" منایا تو بمبئی سے کیفی اعظمی، سردار جعفری اور قدوس صہبائی (ایڈیٹر "نظام" ویکلی) اور حیدرآباد

دکن سے مسلم ضیائی، نظر حیدرآبادی، سلیمان اریب اور لطیف ساجد وغیرہ کو بطور خاص شرکت کی دعوت دی اور ہم ذاتی طور پر سب سے متعارف ہوئے۔ مخدوم محی الدین اس زمانے میں روپوش تھے۔

ریاست میں ان دنوں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی اور پارٹی کے رسائل کا داخلہ ممنوع تھا۔ "قومی جنگ" اور "کراس روڈز" خدا جانے کس طرح پیپلز بک ہاؤس پہنچ جاتے لیکن ان کی تقسیم کا مسئلہ دشوار ہوتا۔ اختر صاحب کے ساتھیوں میں کامریڈ افتخار نے مجھے اپنا رازدار بنا رکھا تھا۔ چنانچہ چوری چھپے میں ان کا ہاتھ بٹاتا اور آدھی رات کے بعد سارے متعلقہ لوگوں تک پہنچ جاتے۔ مجھ میں کتابیں خریدنے کی سکت تو نہ تھی اس لئے اکثر اسی بک ہاؤس میں بیٹھ کر مطالعہ کرتا اور اپنا زیادہ وقت وہیں گزارتا۔ اختر صاحب کو میری یہ روش پسند نہ تھی۔ انھوں نے مجھے کئی بار ٹوکا اور یہ بھی احساس دلایا کہ میں ایک پولس افسر کا بیٹا ہوں، مبادا میری سرگرمیوں کی کسی کو خبر ہو جائے تو سارے گھر پر آفت آجائے گا۔ اختر صاحب کو یہ بھی اندیشہ درست نکلا، میں میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ والد بھی ناراض ہوئے اور سارا الزام اختر صاحب کی دوستی کے سر آیا۔ اختر صاحب جو حقیقتاً میرے استاد تھے۔

اختر صاحب کو میرے فیل ہونے کا بہت ملال رہا لیکن مجھے کوئی غم نہ تھا میں اپنے تئیں کوئی بہت اہم کام کر رہا تھا۔ میں اختر صاحب کی نصیحت کو ان کی بزدلی سے تعبیر کرتا اور اپنی باغیانہ روش پر کاربند رہتا۔ میری ذہنی تربیت کے اب دو مرکز بن چکے تھے۔ ایک اختر صاحب کی محفلیں اور دوسرا پیپلز بک ہاؤس، چنانچہ ذہن کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ سیاست، مذہب، تاریخ اور ادب ـــ سبھی موضوعات پر دماغ سوچنے لگا اور کئی بند کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ گفتار میں جرأت بھی آتی گئی اور تحریر میں صداقت بھی، خواب اور حقیقت کے درمیان جو فاصلے تھے، کم ہوتے گئے۔ جذبات میں ہیجان رہنے لگا اور عمر کے مطابق جوش و خروش بڑھنے لگا۔ میں نے شاعری شروع کر دی۔ مخدوم محی الدین کی آواز پہلے ہی ریاست میں گونج رہی تھی، میں بھی مخدوم کا ہمنوا ہو گیا اور جوشیلی نظمیں کہنے لگا۔

اختر الزماں ناصر نے انھیں دنوں ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے بھی کر لیا تھا۔ میرے ساتھی بھی تعلیم میں مجھ سے آگے نکل گئے تھے اور میں جہاں تھا وہیں اپنے آپ کو سب سے آگے محسوس کرتا رہ گیا۔ کالج سے بے پروا، نصابی کتب سے بے نیاز، ادب و سیاست میں سرشار ـــ ظاہر ہے کہ میں پھر فیل ہو گیا۔ اور مکتبی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خاندان بھر

میری رَوِش آوارگی سے تعبیر کی جانے لگی۔ والد خفا اور اختر صاحب میرے مستقبل سے مایوس۔ پھر یوں ہوا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں ریاست نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ افتخار گرفتار کر لیے گئے۔ حبیب اور نسیم روپوش ہو گئے۔ میں نے افتخار کی گرفتاری پر ایک افسانہ لکھا۔ "تاج کے زیر سایہ"۔ "نو نظام" (بمبئی) میں شائع ہو گیا۔ پولس نے جامع مسجد بورڈنگ پر چھاپہ مارا (والد صاحب ان دنوں عنبر پر تعینات تھے) کتابیں اور رسالے ضبط کیے گئے۔ والد کے پولس میں ہونے کے سبب میں گرفتار ہونے سے بچ گیا۔ اور عنبر بلا لیا گیا وہیں سری نواس لاہوتی اور وہاب حیدر سے ملاقات ہوئی۔ اور میں کچھ عرصے عنبر میں رہ کر حیدرآباد دکن چلا گیا۔

حیدرآباد دکن میں میں نے تین سال گزارے۔ پہلے روزنامہ "جناح" سے وابستہ رہا مگر اخبار کے ایڈیٹر سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب جلد ہی چھوڑ بیٹھا۔ پھر مرزا ظفر الحسن نے مجھے ریڈیو پر بلا لیا۔ اسی دوران یعنی ۱۹۴۸ء میں پولس ایکشن ہوا اور ریاست پر ہندوستان نے قبضہ کر لیا۔ ریڈیو کے بیشتر ساتھی پاکستان آ گئے۔ عبدالماجد، وراثت مرزا، جہاں آرا حیدری (جہاں آرا سعید) اور خود مرزا ظفر الحسن ادیبوں اور شاعروں میں ابراہیم جلیس، نظر حیدرآبادی، تحسین سروری اور خواجہ معین الدین وغیرہ سبھی پاکستان چلے آئے۔ میں وہیں رہا اور اسی دوران شادی بھی کر لی (۱۴ فروری ۱۹۴۹ء) لیکن در پردہ سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ریڈیو سے نکال دیا گیا۔ بیوی ایک اسکول میں پڑھاتی تھی، اس کی بھی سروس ختم کر دی گئی اور ہم پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے۔ آخر اورنگ آباد واپس آ گیا۔ والد بھی پنشن پر علاحدہ ہو گئے تھے۔ سارا گھر شدید معاشی مسائل کا شکار تھا۔ کچھ ماہ بمبئی کی خاک چھانی، جب کچھ نہ بن پایا تو پھر وہی اورنگ آباد تھا اور اس کے گلی کوچے۔ حیدرآباد کے دوران قیام، میں نے بحیثیت شاعر تھوڑی بہت شہرت تو حاصل کر لی تھی مگر ہاتھ میں کوئی ڈگری تھی اور نہ کوئی ہنر۔ کبھی کبھی متین سروش ریڈیو کا کوئی اسکرپٹ لکھوا لیتے اور پندرہ بیس روپے مل جاتے۔ والد بھی مایوس ہو چکے تھے مگر اختر الزماں ناصر نے پھر مجھے طالب علم بنا دیا۔ انھوں نے مجھے میٹرک کا امتحان دینے پر اکسایا اور برسوں کی بھولی ہوئی نصابی کتب اس انداز میں پڑھائیں کہ دو ہی مہینوں کی محنت میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے

میرے بار بار فیل ہونے کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں پڑھنے سے جی چراتا تھا، دراصل ابتدائی کتب میری نظروں میں جچتی ہی نہیں تھیں اور بالخصوص ریاضی تو ان دنوں مجھے ایک

ایک فضول سبجکٹ محسوس ہوتا تھا۔ دوسرا سبب سیاست اور ادب کا نیا نیا چسکا تھا میرے ساتھی امتحان کی تیاری کرتے اور میں شعر کہتا یا افسانہ لکھتا اور اپنے ساتھیوں کی حماقت پر ہنستا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جس دن میرا ریاضی کا پرچہ تھا میں کالج جانے کی بجائے چپکے سے جالنہ چلا گیا تھا جہاں کسی سیاسی جلسے میں مجھے ایک نظم پڑھنی تھی۔

اختر صاحب میری کامیابی پر خوش تو بہت ہوئے مگر انھیں ایک مستقل افسوس تھا کہ ان کے طالب علموں میں میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ پاکستان آکر ہزار مسائل اور مشکلات باوجود (عرصۂ دراز کے بعد سہی) میں نے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے بچوں کو بھی اعلا تعلیم دلائی وہ ایک طرح سے اپنے والد اور اختر صاحب ہی کی آرزو کی تکمیل تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ ۱۹۶۰ء تک دو تین بار ہندوستان جانے کے باوجود میں جو اورنگ آباد نہیں گیا تو کہیں اس کے لاشعوری محرکات میں یہی احساس تو کارفرما نہیں تھا کہ اس وقت تک میری تعلیم ادھوری تھی۔ ممکن ہے میرے اندر کا آدمی مجھ سے کہتا ہو۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب

(۱۹۶۰ء کے بعد ۱۹۶۲ء میں جب میں اورنگ آباد گیا تو ایم اے (فائنل) کا طالب علم تھا)

اختر صاحب سے میں دور رہا ہوں یا قریب — ان کی رہنمائی مجھے حاصل رہی۔ یہ اور بات کہ نہ میں ان کا ہم خیال ہو سکا۔ ان کے زیر تربیت رہ کر میں اقبال کا پرستار تو بن گیا مگر وہ مردِ مومن نہ بن سکا جو علامہ اقبال کے تصور میں آباد تھا۔ میرے خیال میں وہ مردِ مومن دنیا میں کہیں ہے بھی نہیں — اختر صاحب البتہ ابھی تک اس کی تلاش میں ہیں۔

وہ اشتراکیت کے بھی طرف دار ہیں مگر اسی حد تک جو علامہ اقبال نے قائم کی تھی۔ کارل مارکس کے بارے میں ان کا خیال بھی وہی ہے جو علامہ اقبال کا تھا:

آں کلیمِ بے تجلی، آں مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

یعنی

قلبِ او مومن، دماغش کافر است

اگرچہ یہ بات علامہ اقبال نے نطشے کے بارے میں کہی تھی مگر (جدلی مادیت کے فلسفے کی بنا پر) کارل مارکس پر بھی صادق آتی ہے۔ کارل مارکس نے مذہب کو افیون قرار دیا تھا اور علامہ اقبال اسے ایک حرکی قوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اختر صاحب مذہبی آدمی نہیں

باقی صہ ۷۴

پروفیسر
جگن ناتھ آزاد

بہار کا پہلا پھول

(ماخوذ از اقبال)

افسانۂ بہار کا عنواں مری نمود نزہت فزائے چمنِ گلستاں مری نمود
یوں تو ہے رنگ و کیف کا ساماں مری نمود تنہائی میں مگر ہے پریشاں مری نمود

دل میں دبی ہے جو بھی مرے دل کی بات ہے
ہمدم کوئی نہیں یہ عجب کائنات ہے

اے آبجوئے دلکش و رعنا کہاں ہے تو اے جلوہ زارِ آئینہ سیما کہاں ہے تو
اے اضطرابِ شدتِ دنیا کہاں ہے تو اے آرزوئے دیدۂ بینا کہاں ہے تو

میں تجھ میں آج اپنا سراپا ہی دیکھ لوں
جھک کر کسی کا روئے دلآرا ہی دیکھ لوں

حاملِ پیام کا مرا ہر برگِ تازہ تر شبنم کی تہہ میں دیکھ درخشندہ ہیں گہر
اہلِ چمن! ہوئی ہے جو مجھ کو عطا نظر ہے کہنہ دور سے بھی نئے سے بھی باخبر

تنہائی سے اگرچہ پریشاں ہوں آج میں
پھر بھی نقیبِ دورِ بہاراں ہوں آج میں

مانا کہ خاک سے ہے ملوث مرا وجود مانا کہ خاک ہی سے ہوئی ہے مری نمود
مانا ہے جزوِ خاکِ چمن میری ہست و بود لیکن مرا فروغِ دروں اس کا ہے شہود

باطن میں ہوں قافلۂ کہکشاں کے ساتھ
شمس و قمر کے ساتھ ہوں برقِ تپاں کے ساتھ

٭ شعبۂ اردو ۔ جموں یونیورسٹی ۔ جموں (کشمیر)

فارسی — اردو ترجمہ

غزل

حافظ شیرازی — قاضی سجاد حسین

رونقِ عہدِ شباب ست دگر بستاں را
باغ کے لئے یہ جوانی کے زمانہ کی رونق ہے
میرسد مژدۂ گُل بلبلِ خوش الحاں را
پھول کی خوشخبری خوش الحان بلبل کو پہونچتی ہے

اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی
اے صبا چمن کے جوانوں کے پاس سے تیرا گر گزر ہو
خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را
تو سرو اور گلاب اور ریحان کو ہمارا اسلام پہونچا دے

اے کہ بر مہ کشی از عنبرِ سارا چوگاں
اے وہ جو خالص عنبر کا بلّا چاند پر تانے ہے
مضطرب حال مگرداں منِ سرگرداں را
مجھ حیران کو پریشان حال نہ لوٹا

ترسم آں قوم کہ بر دُرد کشاں می خندند
مجھے ڈر ہے جو لوگ تلچھٹ پینے والوں پر ہنستے ہیں
در سرِ کارِ خرابات کنند ایماں را
خرابات کے کام میں ایمان کو نہ لگا بیٹھیں

یارِ مردانِ خدا باش کہ در کشتیِ نوح
مردانِ خدا کا یار بن، اس لئے کہ نوح کی کشتی میں
ہست خاکے کہ بآبے نخرد طوفاں را
ایسی خاک بھی ہے جو طوفان کو ذرا سا پانی نہیں سمجھتی

برو از خانۂ گردوں بدر و ناں مطلب
آسماں کے گھر سے باہر نکل جا اور روٹی نہ مانگ
کیں سیہ کاسہ در آخر بکشد مہماں را
اس لئے کہ یہ بخیل آخر میں مہمان کو مار ڈالتا ہے

گر چنیں جلوہ کند مغبچۂ بادہ فروش
اگر مے فروش کا مغبچہ اسی طرح جلوہ دکھائے گا
خاکروبِ درِ میخانہ کنم مژگاں را
تو میں پلکوں کو شراب خانہ کے دروازہ کا خاکروب بنا دوں گا

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرارِ وجود
وجود کے رازوں کے ایک نکتہ سے بھی تو واقف نہ ہو سکے گا
گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ امکاں را
اگر تو امکان کے دائرہ میں گھومتا رہے گا

ہر کرا خوابگہ آخر بدو مشتے خاک ست
جس شخص کی خوابگاہ انجام کار دو مٹھی خاک ہے
گو چہ حاجت کہ بر افلاک کشی ایواں را
اس کو کہہ دو کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ تو سر بفلک محل بنائے

ماہِ کنعانیِ من مسندِ مصر آنِ تو شد
اے میرے ماہِ کنعان مصر کی مسند تیری ملکیت ہو گئی ہے
وقت آنست کہ بدرود کنی زنداں را
اب وہ وقت ہے کہ تو قید خانہ کو خیرباد کہہ دے

در سرِ زلف ندانم کہ چہ سودا داری
زلف کے معاملہ میں نہ معلوم تو کیا دیوانگی رکھتا ہے
کہ بہم برزدۂ گیسوئے مشک افشاں را
کہ تو نے بکھیر دیا ہے مشک فشاں زلف کو پریشان کر رکھا ہے

نامہ شاداب حیدرآباد — اپریل ۱۹۸۸

محمد احتشام الدین حقی دہلوی

رو نق عہدِ شباب ست دگر بستاں را

منظوم ترجمہ غزلِ حافظ

پھر ہے دور پہ شباب از سرِ بستاں کا
گل کی آمد پہ طرب بلبل خوش الحاں کا

گر جوانانِ چمن میں ہو گزر پوچھ مزاج
میری جانب سے صبا سرو و گل و ریحاں کا

زلفِ مشکیں سے کہ مہ رخ پہ تمہارے چوگاں
مضطرب حال نہ کر دیں کسی سرگرداں کا

ہائے وہ لوگ جو ہیں دُرد کشوں پر خنداں
صرف کرتے ہیں خرابات پہ کیوں ایماں کا

ساتھ مردانِ خدا کا بھی نہ سمجھ کشتی نوح
جس میں ذرّے کو ڈر ایک قطرہ نہیں طوفاں کا

بھاگ جا تو ان تواضع سے فلک کے آخر
یہ سیہ کاسہ اڑا دیتا ہے سر مہماں کا

میفروشی کریں گر مغبچے اس ٹھاٹھ کے ساتھ
شغل جاروبی میخانہ کروں مژگاں کا

رازِ ہستی کے تہ ایک نقطہ پہ آ کا ہی ہو
چھان لیں دَور بھی گر دائرۂ امکاں کا

جا کے سونا ہے بالآخر جو تہِ بستر خاک
کھینچیے تا بہ فلک کنگرہ کیوں ایواں کا

مصر کا تخت ہے لائق ترے ماہ کنعاں
چھوڑ شایاں نہیں رہنا تجھے اس زنداں کا

زلفِ جاناں کے ہی کیا سر میں سمایا سودا
حال بکھرا ہے جو یوں گیسوئے مشک افشاں کا

ملکِ آزادگی اور کنجِ قناعت ہے وہ گنج
جس پہ قبضہ نہیں چلتا ہے کسی سلطاں کا

مئے بھی پی، رند بھی رہ چین منا پر حافظ
دھوکے سازی کو بنا جال نہ تو قرآں کا

ملک ... ست که بشمشیر میسر نشود سلطان را
آزادگی کا ملک اور قناعت کا گوشہ ایسا خزانہ ہے جو بادشاہ کو تلوار کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
اے حافظ شراب پی اور رندی کر اور خوش رہ لیکن
دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآں را
دوسروں کی طرح قرآن کو مکاری کا جال بنا

محمد عثمان خان عرفان

رہو کہیں بھی مگر دل سے رابطہ رکھو — دلوں کے بیچ ذرا بھی نہ فاصلہ رکھو
دلوں کا رشتہ کہیں سرحدوں سے ٹوٹا ہے — زمیں سے ربط نہیں، دل سے واسطہ رکھو
تمھاری سوچ سے آگے نکل گیا ہوں میں — تم اپنی سوچ کو اپنے ہی تک بچا رکھو
کہیں تمھارا ہی چہرہ نہ دے فریب تمھیں — اب اپنے ساتھ ہمیشہ اک آئینہ رکھو
جلائے ہم نے کئی بار آندھیوں میں چراغ — اب آزمانے کا ہم کو نہ حوصلہ رکھو
کبھی نہ ہوگا گذر روشنی کا اے عرفاں
دریچے گھر کا اسی آس پر کھلا رکھو

صوفی گلی، پربھنی ۴۳۱۴۰۱ مہاراشٹر

نادر اسلوبی

جنگل کو ہے ثبات، نہ گھر پائیدار ہے — اک میں ہی کیا ہوں وقت کی دنیا شکار ہے
جو بات ہم چھپانے کی خاطر جدا ہوئے — اب کیا کریں زمانے پہ وہ آشکار ہے
تم واہ واہ کہہ کے بڑھاتے ہو دل کی آگ — کہتے ہیں جس کو شعر وہ دل کی پکار ہے
چلمن کی اس لئے بھی ضرورت نہیں رہی — دیوانے کی ردائے نظر تار تار ہے
دل میں تمھارا تیر ترازو سا ہو گیا — اب اضطراب کو بھی مکمل قرار ہے
وہ اپنی فردِ جرم کا قائل کہاں ہے آج — فہرست میں اگرچہ اسی کا شمار ہے
دے کر لہو میں دل کا نہ فن کار بن سکا
نادر غزل کا نوکِ پلک تک ادھار ہے

6-8-1341، ہنمکنڈہ چوراہا، ضلع ورنگل

حیدرآباد

ج : ۵ — ۱۹۸۸ء

ماہنامہ شاداب

ش : ۵ — مئی

قیمت فی پرچہ 5 روپئے

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

زرِ تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپئے	150 روپئے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپئے
دو سال	90 "	270 "	65 "	36 "	225 "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 11-5-147، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر شاداب 11-5-147، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004، آندھرا پردیش سے شائع کیا۔ ٹیلیفون 229161

فہرست

حرفِ اوّل

اردو ہندوستان کی اپنی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی پلی، بڑھی اور پروان چڑھی اور قومی یک جہتی کی ایک بے مثال دین ہے مگر اردو کا المیہ یہ ہے کہ اسے سیاست کی نذر کر دیا گیا ہے۔ کسی نے اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر مخالفت کی تو کسی نے اس کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کی رائے دے کر ختم کرنا چاہا ہماری آزادی سے پہلے اور فوری بعد ہمارے ملک میں اردو کے استعمال اور ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ جب قومی زبان کے تعین کا مسئلہ پیش آیا تو دستور ساز اسمبلی میں ہندی اور اردو کے لیے مساوی رائیں آئیں اور صدر اسمبلی کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندی کو قومی زبان قرار دینا پڑا اردو کو دستور کے آٹھویں فہرست بند میں مندرجہ (۱۵) زبانوں میں شریک کر دیا گیا۔ تاکہ ایسی زبانوں کے لیے دستور کے حصہ ۱۷ بابت سرکاری زبان کی دفعات ۳۴۳ تا ۱۵۳ میں بیان کردہ حقوق سے استفادہ کیا جائے۔

اردو والوں نے ان حقوق کو تسلیم کرانے اور ان پر عمل آوری کرنے کے لیے دستخطی مہم چلائی اور لاکھوں دستخط حاصل کر کے جناب ذاکر حسین نے صدر جمہوریہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، اس محضر پر کسی کارروائی کے بجائے اسے سرد خانہ میں ڈال دیا گیا۔ حتیٰ کہ جب محضر کے پیش کنندہ جناب ذاکر حسین صاحب خود صدر جمہوریہ بنے تو وہ بھی اس بارے میں کچھ کرنے سے قاصر رہے۔

ریاست آندھرا پردیش ملک کی پہلی لسانی ریاست ہے جو سابقہ حیدرآباد کے علاقہ تلنگانہ اور سابق مدراس کے علاقہ آندھرا کے انضمام سے وجود میں آئی۔ ریاست کی تشکیل سے قبل ایک شریفانہ معاہدہ طے پایا جس میں اردو کے خصوصی موقف کی برقراری بھی شامل تھی۔ چنانچہ آندھرا پردیش ریاست کے پہلے چیف منسٹر ڈاکٹر سنجیوا ریڈی نے نظام کالج گراؤنڈ پر منعقدہ اردو فیسٹیول میں اردو کو دوسری علاقائی سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا اور گزٹ میں اعلامیہ بھی شائع کیا گیا۔

لیکن یہ فضا باقی نہ رہی اور صحیح جذبے کے ساتھ اس پر عمل آوری نہیں ہوئی۔ بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ تعلیم کو اردو کے بجائے انگریزی کر دیا گیا اور سرکاری نظم ونسق سے بھی اردو ختم کر کے انگریزی رائج کر دی گئی۔ اور انگریزی سے ناواقفیت کے بہانے لاکھوں اردو داں سرکاری ملازمین واساتذہ کی خدمات ختم کر دی گئیں۔ عالمی سطح پر لسانی رواداری کے اعلانات ہوتے رہے لیکن ریاستی عہدہ دار اردو کو نقصان پہنچانے تک برابر کارگذار رہے۔ اسی دوران ریاست کی سرکاری زبان کی حیثیت سے تلگو کو رائج کرنے کا مطالبہ بڑھتا رہا۔ جو قانون سرکاری زبان ۱۹۶۶ء کی صورت میں نافذ ہوا۔ اردو والوں کو تلگو کے سرکاری زبان بنائے جانے سے اختلاف نہیں ہے البتہ اردو کے حقوق کی جدوجہد قانون کی دفعہ ۷ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اردو والوں کو اس قانون کی دفعہ ۷ پر عمل آوری کے لیے بھی مسلسل جدوجہد کرنی پڑی جو بالآخر (۱۱) سال کے بعد جی او ۲۰۸ مورخہ ۱۹۷۷ء کی صورت میں اختتام کو پہنچی۔ اس جی او کے ذریعہ اردو کو ریاست کی علاقائی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اس جی او کا بھی وہی انجام ہوا۔ جو دوسرے سابقہ اعلانات کا ہوا۔ یہ جی او بھی قانون سرکاری زبان ۱۹۶۶ء کے تحت (۱۱) سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۷۷ء میں جاری ہوا۔ دوسرے گیارہ سال یعنی ۱۹۸۸ء تک حکومتی کارپردازوں کی عدم توجہ کا شکار رہا۔ اب ہمارے چیف منسٹر نے یہ اعلان کیا کہ یکم اپریل سے سرکاری زبان تلگو پوری طرح سے استعمال کی جائیگی۔ تلگو کے علاوہ کسی زبان میں حکومت کو مراسلہ وصول ہو تو واپس کر دیا جائے گا اور عدم تصفیہ کارروائی کا ذمہ دار متعلقہ محکمہ ہوگا اردو والے تلگو کی ترویج وترقی کے خلاف نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی ان کا مطالبہ ہے کہ تعلیم اور سرکاری نظم ونسق میں اردو کا موقف برقرار رکھا جائے۔ تشکیل ریاست کے وقت شریفانہ معاہدہ پر عمل کیا جائے اور جی او ۲۰۸ کو پورا عمل کیا جائے حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اس جی او پر عمل کیا جائے گا ضرورت ہے کہ اردو والے بھی چوکس رہیں اور دیکھیں کہ اس جی او کے ساتھ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک جو سلوک ہوتا رہا۔ وہ موقوف ہو اور حکومت کی جانب سے حقیقی معنوں میں اس پر عمل ہو۔

مولانا ابو العرفان خاں ندوی

مطالعہ کیا اور کیسے؟

قسط دوم

اجزاء مکملہ یا اجزاء مقومہ کی بصیرت جب آپ کو پیدا ہو جائے گی تو آپ کی قوت مطالعہ بلکہ قوت مشاہدہ بہت بڑھ جائیگی آپ اگر اپنے کو پابند کئے ہوئے ہیں یاد کرنے کا کہ کتاب میں کیا ہے تو یہ بھی ایک درجہ ہے۔ لیکن وہ درجہ آپ کو آگے نہیں بڑھا سکتا ہے جب تک کہ آپ خود نہ بڑھیں اور یاد رکھیئے۔ جب آپ خود سوچیں گے تو وہ چیز قطعاً آپ کی ہو جائے گی۔ آپ کی تفکیر کا جزء آپ کی ثقافت کا جزء آپ کے چہرہ سے معلوم ہوگا کہ آپ اس فن کو جانتے ہیں۔ ذرا سی گفتگو سے پتہ چل جائے گا کہ ہاں اس موضوع پر آپ نے کتابیں پڑھی ہیں لیکن اگر آپ نے اپنے اس علم سے واقفیت کتابوں تک محدود کر دی اور اس پر آپ نے غور نہیں کیا کہ ہمیں خود سوچنا چاہیے کہ کیا ہونا چاہیے تو آپ کو مہارت اور اس فن میں استادیت کا درجہ نہیں مل سکتا ہے لیکن ساری بنیاد اصل میں یہ ہے کہ آپ کا عمل کتنا ہوتا ہے یہی سب کچھ ہے۔

سوچنے والی بات اور بہت سوچنے والی بات یہ ہے کہ جو ہمارے اسلاف اور علماء محققین گذرے ہیں ان کے پاس تو ہر فن پر اتنی کتابیں نہیں تھیں جتنی کتابیں اس زمانہ میں ہیں اور بعض مرتبہ سرے سے کتاب ہی نہیں ہوتی تھیں اس کے باوجود کیا بات ہے کہ وہ بہت ماہر اور درجۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔ اور وہ اس درجہ پر پہونچے کہ ان کی کتابیں مستند ہو گئیں۔ آج جو سہولتیں موجود ہیں کسی فن پر کتابوں کا جو انبار ہے۔ اور ہر زبان میں، اردو میں، فارسی میں، عربی میں بھی ان سب کے ہوتے ہوئے کیا بات ہے کہ ہمیں نہیں آتا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی ایک فاصل زمانہ میں مقرر فرمایا تھا کہ اس زمانہ تک جب لوگ پڑھیں گے۔ تو سب آ دے گا اس کے بعد نہیں آ دیگا یا اب غبی لوگ پیدا

صدر مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

ہوتے ہیں۔ پہلے بہت ناز کیا پیدا ہوتے تھے۔ ہم اس کو نہیں مانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی
نعمت اور اس کا احسان اور اس کا فضل ہر عہد میں یکساں رہا ہے اس لئے بات
یہ کہ وہ لوگ سوچتے زیادہ تھے ان کی تفکیر زیادہ تھی۔ اور یہ تفکیر اس موضوع کو اس
بحث کو اور اس فن کو ان کا بنا دیتی تھی۔ وہ ان کا ہو جاتا اور اس پر ان کو قدرت ہو جاتی
وہ اب کتاب کے محتاج نہیں رہتے تھے بلکہ وہ اس منزل میں آجاتے تھے کہ کتابیں ان
ہاتھ سے لکھی جائیں اور وہ سند بنیں وہ خود سند بن جاتے تھے۔ یہاں تک کہ علوم ایجاد کر
تھے۔ یہ سارے علوم، اصول فقہ ہے، اصول حدیث ہے، علم اسماء الرجال ہے، علم
بلاغت ہے، علم نحو ہے، یہ سب کیا ہیں۔ یہ سب ان لوگوں نے ایجاد کر دیا کیوں
انہوں نے اس پر تفکیر کی انہوں نے اپنا وقت لگایا۔ اور دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ
غذائیں ہوتی ہیں۔ ایک مادی غذا جو پیٹ میں جاتی ہیں۔ پیٹ میں جانے کے بعد وہ
عمل کرتی ہے آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ نافع غذا کھائیں اور صحیح طور پر کھائیں اور صحیح و
پر کھائیں۔ اور معدہ کو تیار رکھیں۔ تو وہ عمل ہوتا ہے۔ اور غذا جز بنتی ہے ٹھیک یہ
معاملہ آپ کے علوم اور افکار اور کتابوں کا ہے۔ آپ اس کو جب تک کہ اپنے تفکیر ی
سے اپنی ثقافت کا، اپنے ذہن کا اپنی فکر کا جز نہیں بنائیں گے اس وقت تک آپ اس
میں مہارت نہیں پیدا کر سکتے تو یہ چیزیں ضروری ہیں۔ مطالعہ اسباق کا توجہ سے سن
پھر بعد میں مذاکرہ، چاہے مذاکرہ کیجیے یا خود دیکھئے لیکن اس کے بعد کا عمل جہاں آپ
کتابوں کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں وہیں اپنے ذاتی مطالعہ سے علم کی مقدار بڑھا
جاتی ہے۔ لوگ ہم سے بہت پوچھتے ہیں کہ صاحب پڑھتے ہیں تو یاد نہیں رہتا او
اس میں تھوڑی سی غلط فہمی ہے۔ اس کو سمجھ لیجیئے پانچ سو صفحے کی کتاب اگر آپ پڑھیں
گے تو آپ بالکل یہ توقع نہ رکھئے کہ اس کتاب کے آپ کو پورے پانچ سو صفحے یاد ہو جائیں۔ ا
اس کا ایک ایک جزو آپ کی ثقافت کا جزو بن جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک ہی مر
پڑھنے سے آپ کی ثقافت کا جزو بن جائیگا۔ ایں خیال است و محال است جنوں، اگر ا یسے
ہی ہو تو نفس مرور آپ کو کامیاب بنا دیتا۔ تو اس زمانہ میں کتابوں کی کثرت کی وجہ سے
مطالعہ کرتے جایئے قابل ہوتے جایئے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ کتنے لوگوں کو میں نے دیکھ
ہے کہ مطالعہ میں ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ اور جب ان سے اس فن کی چیز پوچھئے تو خاموش
کیوں؟ انہوں نے حروف پڑھ لئے، امین آباد میں ٹہل لئے اور ہر چیز دیکھ لیا۔ اور بہت

خوش ہوئیے کہ فلاں دکان پر فلاں چیز اچھی ہے لیکن کسی چیز کو اپنا یا نہیں۔ اپنا بیئے۔ دس ہزار روپیئے لے جایئے اور خرید لیجیئے تب چیز آپ کی ہوگی۔ یہ تو مادی چیزوں میں ہے۔ لیکن علم میں آپ اس پر فکر لگایئے، اور اپنی محنت لگایئے۔ اسی کا نام محنت ہے۔ مادّی محنت نہیں۔۔ فکری محنت دیکھیئے وہ چیز آپ کی کیوں نہیں ہوگی۔ قاعدہ بھی ہے۔

دوسری بات اور بھی ہے یہ تو وہ شخص کہتا ہے جو سب کتاب سمجھ لیتا ہے اور اصل معاملہ تو یہ آگے پڑتا ہے کہ آپ پانچ سو صفحے کا اگر مطالعہ کریں تو ضروری نہیں ہے کہ آپ کو ہر سطر اور ہر صفحہ سمجھ میں بھی آجائے۔ بعض مرتبہ یہ خیال بھی بہت حائل ہوتا ہے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے۔ کتاب کیا پڑھیں درسی کتاب کے پڑھنے میں تو ضروری ہے کہ آپ اچھے سمجھیں، لیکن مطالعہ کے لئے ضروری نہیں ہے جو حصہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے اس کو ذرا سا توجہ دیکر سمجھنے کی کوشش کیجیئے، اور اگر جب بھی نہ آوے تو گذر جایئے، اس کو صرف پڑھ کر گذر جایئے۔ یہ نہ کیجیئے کہ وہ صفحہ پلٹ۔ دیجئیے پڑھیئے ضرور پڑھ کر گذر جایئے۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ دیکھیئے میں آپ کو ایک قصہ بوعلی سینا کا سناتا ہوں۔ بوعلی سینا کہتا تھا کہ جب میں نے فلسفہ کی الٰہیات پڑھنا شروع کیا تو : کتابیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ میں تو کچھ جان ہی نہیں سکتا ہوں لیکن پڑھا تھا۔ اسی لئے الفاظ یاد تھے۔ سب جملے یاد تھے بہت ذہین آدمی تھا۔ ضروری نہیں ہوتا کہ سب کو یاد ہو۔ لیکن چھ سات کتابیں اسی موضوع پر پڑھی ہوں گی۔ تو الفاظ یاد رہے۔ جملے یاد رہے۔ لیکن کتاب کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ کہنے لگا ایک مرتبہ میں جا رہا تھا۔ تو ایک شخص کتابیں بیچ رہا تھا۔ فارابی کی کتاب پر نظر پڑی میں نے دیکھا تو اس نے کہا لے لو بڑی عمدہ کتاب ہے۔ میں نہیں لے رہا تھا لیکن تردد کے ساتھ میں نے لیا۔ جب میں نے وہ کتاب پڑھی تو وہ جتنے جملے میرے لئے معمّہ تھے، ذہن میں محفوظ معمّہ بنے ہوئے تھے سب یک لخت حل ہوگئے، تو دیکھیئے اس کو چھوڑ دیئے نہیں۔ ہو سکتا ہے دوسری کتاب کوئی ایسی آپ کو ملے اس میں آپ کی استعداد اور ذہن کی قبولیت کا کوئی ایسا وقت ہو آپ اس سے وہ بات سمجھ جائیں۔ جو آپ کتاب میں چھوڑ چکے، اور مطالعہ کرنے والے کو ایسا ہوتا ہے وہ دوسری جگہ بھی سمجھ لیتا ہے۔ دوسری کتاب میں اس انداز سے وہ بات آئی اس سیاق و سباق کے ساتھ آئی کہ وہ سمجھ لیتا ہے وہاں جو لکھا ہوا تھا جیسی سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ یہ ہے، ایک تو بات یہ ہے کہ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ غیر درسی پوری کتاب پڑھ لیتے ہیں تو آپ کتاب بند کردیتے ہیں کہ پڑھ لیا، لیکن میں آپ سے بتاتا ہوں کہ میں یہ نہیں کرتا، کبھی نہیں کرتا،

اب اس کے بعد میرا دوسرا عمل شروع ہوتا ہے۔ میں اپنا ذاتی عمل بتاتا ہوں۔ یہ سوچتا ہوں کہ کتاب میں کیا لکھا تھا؟ اس عمل سے فائدہ بہت پہنچتا ہے، مصنف نے اس بات پر کیا لکھا ہے۔ اور اگر آپ کا مطالعہ کچھ اور ہے تو پھر وہ چیزیں آپ کو اور زیادہ محفوظ رہیں گی۔ اور اس طرح کتاب سے یکسو ہو کر پڑھتے ہوئے پر نظر ثانی کیجئے۔ کہ ہم نے اس کتاب میں کیا پڑھا ہے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ عمل آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ نہیں کرتے ہیں یا بہت کم کرتے ہیں۔ یہ عمل کر کے دیکھئے آپ کو آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا۔ ایک تو کسی جگہ نہ سمجھنے سے مایوس نہ ہوئیے، اطمینان رکھئے کہ جب آپ اس موضوع پر کوئی اور کتاب پڑھیں گے تو انشاء اللہ رہنمائی مل جائے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ آپ نے سمجھا ہے اس کو ذہن میں رکھیئے کتاب سے الگ ہو کر سوچیئے کہ کیا کیا لکھا ہے۔

اس منزل کے بعد ایک دوسری منزل ہے کہ کیا بات صحیح لکھی ہے۔ اور کیا بات غلط لکھی تھی۔ اس کے بعد آپ نہ طالب علمی کے زمانہ میں ایک کاپی رکھی، نہ کوئی چیز نوٹ کیا جو کچھ رہا دماغ میں رہا کتاب غور سے پڑھ کر چھوڑ دیجئے رکھ دیجئے یا جمع کر دیجئے اسکے بعد ذہن سے سوچ کر کہ اس کتاب کے مباحث کیا کیا تھے وہ آپ نوٹ کر لیجئے، یہ آپ کے لئے مفید ہے۔ پھر دیکھئے کہ وہ چیز کتنی بار آپ کے ذہن میں آجائے گی۔ جب آپ دماغ پر بوجھ ڈالیں گے تو آپ کے ذہن کی غذا بنے گی، آپ کے فکر کی غذا بنے گی۔ یہ عمل آپ لوگ کرتے نہیں، آپ لوگوں کا... معاملہ یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھیں تو پانچ سو صفحہ پورے میرے ذہن میں بیٹھ جائیں۔ ارے ایسا کہیں ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسا کہیں ہوا ہے! ارے بھائی آپ بیس جوڑے کپڑے بنواتے ہیں لیکن پہنتے ایک ہی جوڑا ہیں۔ سب تھوڑا ہی پہنتے ہیں، مگر سارا مسئلہ یہ ہے محنت و تفکیر کا، چاہے محنت مادی کیجئے۔ کتاب لے کر بیٹھیے پڑھئے جیسا کہ درسی تعلیم ہے یا اس پر تفکیر کریں اگر آپ کی یہ محنت نہیں لگی تو وہ چیز آپ کی نہیں ہو سکتی ہے، زندگی بھر نہیں ہو سکتی ہے۔ چاہے آپ ایک موضوع کی ۲۵ کتاب پڑھ کر لے جائیے آپ ابتدائی کتاب پڑھیں اور توجہ سے پڑھیں اور بعد میں اس پر [illegible] غور کریں۔ اپنا فکری عمل کتاب سے لے تیار ہو کر اس پر کریں وہ اس طرح کے مصنف نے یہ بات صحیح لکھی ہے یا غلط لیکن یہ اس وقت ہوگا۔ جب کہ کسی موضوع پر آپ کا مطالعہ کچھ قابل ذکر مقدار میں ہو۔ جب آپ کا مطالعہ معتد بہ مقدار میں ہو جائیگا۔ تب آپ اس پر عمل کریں اور اس وقت آپ کو خود احساس ہو جائیگا کہ مصنف نے یہ کیا غلط بات لکھ

لکھدی ہے۔ لیکن شروع میں اگر آپ خود یہ عمل کیجئے گا تو غلطیاں ہونگی۔ ایسی صورت میں اگر آپ اصلاح کے لئے بیٹھ جائیں تو فاش غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے، ابھی آپ حکم لگانے والے کی پوزیشن میں نہ بیٹھئے بلکہ اخذ والی پوزیشن اختیار کریں، لیکن اس کو خوب اچھی طرح یاد رکھیئے جو ہم نے بنیادی بات کہی ہے بغیر محنت اور تفکیر لگائے آپ چاہے پچاس کتاب پڑھ لیں، وہ آپ کی ثقافت کا جزو نہیں بن سکتیں۔ غذا سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ کہ آپ کے جسم کا جز و بنتی ہے۔ لیکن جس وقت وہ غذا آپ کے جسم کا جزو بنتی رہتی ہے۔ اس وقت تک تو نہیں پتہ چلتا ہے آپ تو یہ نہیں دیکھتے کہ بن رہی ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے وہ آپ کے لاشعور میں بنتی رہتی ہے لیکن آپ اچھی غذائیں مناسب غذائیں صحیح وقت پر صحیح مقدار میں کھائیں گے تو دو مہینے کے بعد معلوم ہوگا بہت تندرست ہوگئے ہیں۔ لیکن جس وقت معدہ میں یہ عمل ہوتا رہتا ہے۔ اس وقت تو آپ کو احساس نہیں ہوتا کہ کیا عمل ہو رہا ہے، یہی حال معلومات کا ہے۔ معلومات کو صحیح طریقہ سے جب آپ اپنے ذہن میں ڈالیں گے اور اس کو اپنا بنائیں گے تو جس وقت یہ عمل ہو رہا ہوگا کہ وہ آپکی ثقافت کا جزو بن رہے ہیں۔ اس وقت آپ کو نہیں احساس ہوگا۔ لیکن برابر دو مہینے یہی عمل ہوتا رہے تو لوگ کہیں گے ارے بھائی! تم نے کون کون کتابیں پڑھی ہیں تو اس وقت بات نمایاں ہو جائیگی۔ زبان سے نہیں چہرہ سے نمایاں ہو جائیگی۔ چہرہ سے انسان کی صحت و تندرستی اور طاقت وقوت کا اندازہ ہوتا ہے، چہرہ بتائیگا کہ یہ آدمی پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر دو ایک جملہ بول دیں، عام بات بولدیں کسی اور چیز سے متعلق، تو کہیں گے یہ تو پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا ہے فوراً معلوم ہو جائے گا، آپ تسلسل کیساتھ پڑھتے رہیئے۔ آپ تسلسل کے ساتھ نافع غذائیں کھاتے رہیئے تو دو تین مہینے میں معلوم ہوگا کہ کیا فائدہ ہوا۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ بہت لوگ پوچھتے ہیں کہ صاحب کتاب پڑھتے ہیں یاد نہیں رہتی آپ پانچ سو صفحے کی کتاب پڑھیں اور یہ سمجھیں کہ پانچ سو صفحے یاد رہے دیکھیئے ایک لفظ جس کو اصطلاح میں آہٹ کہتے ہیں روزمرہ کی مثالوں سے میں آپ کو سمجھا دوں، کسی فن کی جتنی کتابیں اس فن پر لکھی گئی ہیں، سب پڑھنا بہت مشکل ہے۔ خاص طور سے اس زمانہ میں جبکہ علوم وفنون پر کتابیں لکھنے میں ہر شخص ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے، کہاں تک سب پڑھا جائیگا۔ اس میں آدمی مر جائے گا،

ختم ہو جائیگا ایک فن کیلیے فرصت نہیں ملے گی، لیکن ایک چیز آہٹ ہوتی ہے۔ آپ کی آنکھ بند کر کے لکھنؤ کے کسی حصہ میں ڈال دیا جائے بشرطیکہ آپ لکھنؤ میں دس پندرہ سال رہ چکے ہوں، تو آپ کو آہٹ مل جائیگی جا ہے وہ محلہ آپ نہیں جانتے ہوں کہ شمال ادھر ہے۔ اور نہ وہ ادھر ہوگا۔ لکھنؤ میں رہتے رہتے آپ کو ایک آہٹ مل چکی ہے۔ کسی فن سے وابستگی کیونکہ سے وہ چار سال اور وابستگی وہی ذہنی اور فکری وابستگی سے پہلے اس پر سوچتے رہیں گے، کتابیں پڑھتے رہیں گے، اپنی فکر بھی لگاتے رہیں گے، تو آپ کو ایسی آہٹ مل جائیگی کہ ادھر کوئی نئی بات اس فن سے متعلق سامنے آئی ہے۔ تو آپ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ بڑی علمی بات ہے۔ اور بڑے پتہ کی بات ہے یا نئی بات لکھی، اور یہ کہ اس سے دلیل دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ سارا احساس آپ لوگوں میں خود بخود پیدا ہوگا۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ معلومات کو فکر کا جز بنا لیجئے۔ اس کو ہضم کیجیئے، جس طرح معدہ غذا کو ہضم کرتا ہے۔

کسی موضوع پر اس کی ابتدائی مستند کتاب جو مختصر بھی ہو پہلے پڑھ لیں اس سے فن کا ابتدائی ڈھانچہ ذہن میں آتا ہے۔ دیکھئے بغیر ڈھانچہ بنے کچھ بنتا نہیں۔ ڈھانچہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز چار طرف سے گھیر لی جائے۔ یہ ڈھانچہ بن گیا تو مبادی باتیں جو اس علم کے مسائل ہیں اور اس کے جو بنیادی قواعد ہیں اور کتابوں میں جس ترتیب سے لکھا رہتا ہے، یہ ترتیب یونہی نہیں ہے، وہ ترتیب حقیقت میں بتاتی ہے کہ اس مسئلہ کی وضع صحیح یہ ہے اور اس مسئلہ کا مقام یہ ہے تو وہ ڈھانچہ جب مرتب ہو جائے گا تو پھر آپ مسائل کو الگ الگ جگہ اس ڈھانچہ میں فٹ کر سکتے ہیں، لیکن ڈھانچہ اگر آپ کے ذہن میں نہیں ہے۔ اور اس کے قواعد و مسائل اور ابتدائی چیزیں ذہن میں نہیں ہیں تو آپ لاکھ کتاب پڑھ لے جائیے نہیں ہوگی، فصول اکبری تک پڑھ جائیے، اور صرف کی کتابیں پڑھ لے جائیے، آپ کے پلے کچھ نہیں پڑیگا۔

ایک چیز اور ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کیسے کیا جائے کہ تاریخ کا کوئی ایسا ڈھانچہ نہیں ہے تاریخ کا بھی ایک ڈھانچہ ہوتا ہے۔ پہلے آپ مسلم تاریخ پوری پڑھ لیجیئے ہر عہد کی تاریخ آپ کو پڑھ لے جائیے تاریخ میں اصل تین چار چیزیں ہیں، اس کو سمجھنا ہے، سیاسی تاریخ، علمی تاریخ دینی تاریخ، تمدنی تاریخ، اور ایک بات اور بتا دیں آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ تاریخ دیکھنے کے لئے وہ کتابیں دیکھنی چاہیئے۔ جو تاریخ پر لکھی گئی ہیں، ایسا نہیں ہے، آپ صوفیائے کرام کے ملفوظات پڑھیئے، آپ سفرنامہ پڑھیئے، ابن بطوطہ کا سفرنامہ پڑھیئے، اسی طرح تاریخ

سمجھنے کے لئے جغرافیہ کا جاننا بھی ضروری ہے، چاہے تاریخ سیاسی ہو، چاہے تاریخ علمی ہو اس کے لئے اس کا جاننا ضروری ہے کہ علاقوں کا جغرافیہ کیا ہے اور تاریخ جاننے کے لئے مثلاً "معجم البلدان" ہے، تاریخ العباد والبلاد" ہے۔ جو شہروں پر تاریخ لکھی گئی ہے۔ تاریخ بغداد ہے، خطیب بغدادی کی، اسمیں بہت سے مواد ملیں گے۔ دوسرے یہ کہ تاریخ صرف سیاسی نہیں ہوتی ہے۔ علمی بھی، مذہبی بھی اور تمدنی و معاشرتی بھی ہوتی ہے۔ ان سب کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے۔ اور ان سب کے لئے الگ الگ کتابیں ہیں طبقات و تراجم کی کتابیں طبقات و تراجم کی کتابوں میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان اور سبکی کی "طبقات الشافعیہ الکبریٰ" ہے، اور علامہ عبدالحئی حسنی کی "نزہتہ الخواطر" ہے۔ نزہتہ الخواطر ہندوستان کی حد تک ہے لیکن آپ کو اس میں سبھی مل جائیں گے، رجال و اشخاص علمی بھی، سیاسی بھی، دینی بھی سب رجال اور یہی حال تاریخ ابن خلکان کا ہے۔ علوم و فنون کی تاریخ میں جو بنیادی کتابیں ہیں ایک تو شہرزوری کی "تاریخ الحکماء" ہے بیہقی کی "تاریخ الحکماء" ہے۔ اور اس سے بڑھ کر فہرست ابن ندیم ہے اور حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" ہے قفطی کی تاریخ الحکماء ہے اور ابن ابی اصیبعہ کی تاریخ الاطباء" ہے الثقافتہ الاسلامی فی الہند ہے۔ یہ علوم و فنون کی تاریخ جاننے میں آپ کے لئے معاون ہونگی۔ اور ایسی کتابیں تو بیشمار ہیں۔ میں آپ لوگوں سے تفصیل سے کہاں تک بیان کروں۔

عام ثقافت پیدا کرنے والی کتاب علوم دینیہ میں امام غزالی کی "احیاء العلوم" ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مجموعۂ فتاویٰ اور بہت سی دوسری کتابیں ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی "منہاج السنہ" ہے جو ردّ شیعیت میں ہے۔ لیکن ردّ شیعیت مناظرانہ انداز میں نہیں علمی انداز میں ہے۔ اس لئے اس میں بہت علوم ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی فارسی زبان میں "ازالتہ الخفاء" ہے یہ عام دینی اور عام ثقافتی ثقافت پیدا کرنے والی ہے۔ یہ امام رازی کی کتاب تفسیر کبیر ہے جس کا نام انہوں نے "مفاتیح الغیب" رکھا ہے وہ تو آپ لوگوں کے لئے بتا ہنا مشکل ہوگا اس لئے کہ اسمیں انہوں نے کوئی علم نہیں چھوڑا۔ نہ علم نحو، نہ علم صرف، نہ علم بلاغت، نہ علم معانی، نہ علم کلام، نہ علم فقہ کوئی علم نہیں چھوڑا سب اسمیں ہیں۔ اگر کوئی شخص محنت سے اس کو پڑھ لے تو بڑا بھاری آدمی بن جائیگا۔ امام ابوالحسن اشعری کی کچھ کتابیں ہیں وہ پڑھ لینا چاہیئے۔ کتاب الابانہ، ہے یہ کتاب بہت آسان انداز میں لکھی گئی ہے۔ وہ بہت مفید ہے آپ کے عام ثقافت پیدا کرنے کے

لیئے بھی بہت سی کتابیں ہیں- مثلاً جاحظ کی کتابیں، ابن قتیبہ دینوری کی کتابیں- اسی طرح صبح الاعشی" ہے اور "الامالی" ہے- یہ کتابیں بہت مفید اور علمی سطح کو بلند کرنے والی ہیں- اور اس سے آپ کے علم میں استحکام پیدا ہوگا- لیکن سب سے بنیادی شرط جو ہے وہ یہ ہے کہ آپ کچھ خرچ کرنے کے لیئے تیار نہیں- آپ درجہ میں بیٹھتے ہیں تو آپ کا دماغ اور ذہن دوسری طرف ہے-

میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ تین مرتبہ اور چار مرتبہ ذہن لگا ییئے آپ ایک مرتبہ بھی لگانے کے لیئے تیار نہیں، تو آدیکھا کیا- آپ اپنے کو دھوکا دیجیئے گا" آپ رجسٹر میں فاضل ہوجائینگا بیشک آپ رجسٹر میں فاضل لکھے جائیں گے- یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ امتحان میں پاس ہو جائیں، چونکہ امتحان خود ایک ٹکنک ہے، جس کا تعلق علم وفن سے نہیں رہا- کسی زمانہ میں رہا ہوگا، اور جتنے ہی اوپر کا درجہ ہے اتنا ہی زیادہ ٹکنک ہے یاد رکھیئے، جس طرح اب الکشن میں جیتنا یہ معیار نہیں ہے کہ عوام اس کے موئید ہیں- اور ووٹرس اکثریت اس کو مانتی ہے- وہ معیار نہیں رہ گیا ہے- بس یہ ہے کہ اس ذبہ میں سے ہمارا نام زیادہ نکل آوے، پرچی ہمارے نام کی زیادہ نکلنے اور کیسے پرچی زیادہ بنائی جائے- اس کا تعلق اس سے نہیں ہے کہ ووٹر زیادہ ہوں، کچھ نہیں، ایک آدمی پانچ پانچ سو آدمیوں کے ووٹ گراد یتا ہے، تو یہی حال ہے جب آپ لوگ امتحان سالانہ میں پڑھتے ہیں-

آپ لوگوں کو دو روٹیاں مطبخ سے ملتی ہے- دو روٹیاں صبح اور روٹیاں شام اور ایک مہینہ میں آپ نے ایک سو بیس [120] روٹیاں کھائیں لیکن آپ نے بتدریج کھائیں وقفہ کے ساتھ کھائیں- امتحان سالانہ کی تیاری کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری وہ ایک سو بیس روٹیاں ایک ساتھ کھالیں- یہ ہے اس کا خلاصہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جو روٹیاں آپ ایک مہینہ میں کھاتے ہیں، وہ ہضم بھی ہوتی ہیں- اور آپ کا جزو بدن بھی بنتی ہیں- اسی طریقہ سے جب تک کہ وہ علم و معلومات آپ کی ثقافت کا جزو نہ بنے- آپ کی فکر کا جزو نہ بنے، آپ کے مستوی علمی کو بلند نہ کرے گی بس یہ ہے کہ امتحان کے زمانہ میں کچھ لادلیا اور کسی نہ کسی طریقہ سے امتحان ہال میں پھینک دیا تو آپ قابل ہو جائیں گے- آپ کی ثقافت کا جزو تو نہیں بنی، آپ کا مستوی علمی تو بلند نہیں ہوا، یہ بھی ایک دھوکہ ہے، امتحان کا مسئلہ بڑا سنگین ہو چکا ہے- جو طریقہ امتحان کا مقرر کیا گیا تھا قطع نظر اس کے کہ وہ نافع تھا یا نہیں لیکن جس درجہ میں بھی کسی زمانہ میں نافع تھا- اب اس کی نافعیت یکسر ختم

جناب محمد عبدالستار ایل ایل ایم

طلاق اور دادرسی

پارلیمنٹ نے قانون مسلم مطلقہ خواتین سنہ ۱۹۸۲ء کو منظور کیا جو ہر لحاظ سے مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کی پذیرائی کرتا ہے۔ یہ قانون تحفظ مسلم مطلقہ خواتین سنہ ۱۹۸۶ء THE MUSLIM WOMEN (PROTECTION OF RIGHTS ON DIVORCE) ACT 1986, کے نام سے موسوم ہے اور یہ قانون بڑی حد تک شریعت سے مطابقت رکھتا ہے اور مطلقہ عورت کے حقوق کا نہ صرف تحفظ کرتا ہے۔ بلکہ کم سے کم خرچہ سے عاجلانہ انفصال میں بھی لیے مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ قانون اپنی نوعیت میں دیوانی بھی اور فوجداری بھی ہے۔ اس قانون میں اس امر کی گنجایش رکھی گئی ہے کہ مطلقہ عورت اپنے سابقہ شوہر سے نہ صرف عدت کی مدت کی حد تک نان نفقہ پانے کی مستحق ہے۔ بلکہ زر مہر اور اشیاء جہیز اور تحائف جو بوقت نکاح دیئے گئے واپس پانے کا حق رکھتی ہے۔ اس قانون کی رو سے مطلقہ عورت صرف عدت کی مدت کی حد تک اپنے سابقہ شوہر سے نان نفقہ پانے کی مستحق ہے عدت کی مدت کے بعد کے نفقہ کی ادائی سے سابقہ شوہر بری الذمہ قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے۔ کہ وہ کون اشخاص ہوں گے جو مطلقہ عورت کو عدت کی مدت کے بعد نفقہ ادا کرنے کے پابند اور ذمہ دار ہیں۔

سنہ ۱۹۷۲ء میں قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کی گئی۔ مسلم مطلقہ قانون جو اس قانون کی رو سے اب تک مستثنیٰ تھی۔ اس قانون کے دائرے میں شامل کی گئی اسی ترمیم رو سے زوجہ کی تعریف میں ایسی عورت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس کے شوہر نے اس کو طلاق دی ہو اور وہ عورت جس نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کی ہو اور دوسری شادی نہ کی ہو یعنی طلاق کے بعد نکاح ثانی نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ زوجہ کی سطور بالا میں تعریف

ریٹائرڈ سیشن جج آغاپورہ حیدرآباد

کی گئی ہے۔ وہ نہ صرف غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے بلکہ مسلم پرسنل لا میں راست مداخلت کے مترادف ہے اس کے خلاف مسلمانوں کی احتجاج کی بناء اور احتجاج کے نتیجہ کے طور پر سنہ ۱۹۹۲ء پر دفعہ ۱۲۷ کے ذریعہ ترمیم کی گئی اس ترمیم کی رو سے مطلقہ عورت کی عدت کی مدت گزرنے کے بعد بھی نفقہ پا سکتی ہے اور پاتی رہے گی جب تک کہ طلاق یا انفساخ نکاح سے پیدا شدہ وجوب کی سابقہ شوہر تکمیل نہ کرے۔

یہ ترمیم خود بھی قانون شریعت کے منافی تھی اس لئے طلاق قطعی یا بائین ہو جانے کے بعد مطلقہ کے حقوق میں اس کا سابقہ شوہر ایک شخص اجنبی بن جاتا ہے۔ کسی اجنبی سے مسلم عورت کا نان و نفقہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ قانون تحفظ مسلم مطلقہ خواتین سنہ ۱۹۸۶ء سے ایسے تمام قانون شریعت کے منافی امور کا سد باب ہوتا ہے۔

اس جدید قانون کی دفعہ (۳) ضمن (۱) کی رو سے مطلقہ عورت نہ صرف اپنے سابقہ شوہر سے مناسب اور معقول نفقہ عدت کی مدت پانے کی مستحق ہوگی جو اس کے زیر پرورش ہوں اور سابقہ شوہر کے صلبی ہوں مطلقہ زر مہر، اشیا جہیز اور وہ تمام تحائف جو اس کو سسرالی یا ماں باپ کے رشتہ داروں اور دوستوں کی جانب سے بوقت نکاح کے بعد دیئے ہوں پانے کا حق رکھتی ہے۔

اگر سابقہ شوہر باوجود معقول ذرائع آمدنی رکھنے کے مطلقہ کی عدت کی مدت کا نفقہ یا بچوں کا نفقہ ادا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ یا تو خود مطلقہ یا اس کی جانب سے کوئی مجاز کردہ شخص مجسٹریٹ کے پاس ادائی کے لئے درخواست پیش کر سکے گا۔

مجسٹریٹ بعد اطمینان وہ تمام مطالبات جن کا دفعہ (۳) ضمن (۱) میں کر دیا گیا ہے۔ ایک ماہ کے اندر مطلقہ کو نفقہ اس کے سابقہ شوہر کو ادا کرنے کا حکم صادر کرے گا۔ اگر سابقہ شوہر باوجود کافی ذرائع آمدنی رکھنے کے بلا کسی وجہ معقول کے ادائی سے قاصر رہا ہے یا غفلت برتی ہے تو صرف ایک حکمنامہ جاری کرے گا۔ جس کی رو سے بقیہ رقم اور زر مہر کو جو طریقہ کار ضابطہ فوجداری کی رو سے جرمانہ وصول کرنے کا رکھا گیا ہے۔ اس طرح اصول کرنے کا حکم صادر کرے گا۔ مجسٹریٹ سزا کے لئے قید بھی دے سکتا ہے جس کی معیاد ایک سال تک ہو سکے گی۔

اس قانون کی دفعہ (۴) ضمن (۱) کی رو سے اگر مجسٹریٹ مطمئن ہو جائے تو مطلقہ عورت کا کوئی ایسا ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ اور وہ اپنے آپ پرورش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ اور اس نے طلاق کے بعد عقد ثانی نہیں کیا ہے تو اس کے ایسے رشتہ دار جس کی شرعاً مطلقہ وارث ہو سکتی ہے۔ نان و نفقہ کی ادائی کا حکم صادر کرے گی۔

اس دفعہ کی ضمن (۲) کی رو سے اگر مطلقہ کا کوئی رشتہ دار اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو یا ایسے مالی موقف میں نہ ہو کہ نفقہ ادا کر سکے تو ایسی صورت میں مطلقہ عورت کے نفقہ کی ادائی کی ذمہ داری اسٹیٹ وقف بورڈ پر عائد کی گئی ہے۔

اس جدید قانون میں اس کی بھی گنجایش رکھی گئی ہے کہ اگر مطلقہ عورت اور اس کا سابقہ شوہر اس قانون کے بجائے ضابطہ فوجداری کے دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت اپنا فیصلہ کروانا چاہیں تو ان کو اس کا حق و اختیار حاصل رہے گا۔ بشرطیکہ وہ مشترکہ یا انفرادی طور پر حلفنامہ داخل کریں جس کی صراحت دفعہ ۵ قانون جدید میں کی گئی ہے اس جدید قانون کی چند خصوصیات اور سودمند پہلو مختصراً درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱)۔ درخواست یا مقدمہ کا فیصلہ کم سے کم مدت یعنی معمولاً ایک ماہ کے اندر ہو سکتا ہے۔ خاص وجوہ کی بنا پر ایک ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ میں فیصلہ یا مطالبہ کی یکسوئی کر سکتا ہے۔

(۲) برائے نام اخراجات یعنی درخاست پر دو روپیہ کے اسٹامپ چسپاں کر کے وہ تمام مطالبات یعنی نان نفقہ زرمہر اور سامان جہیز وغیرہ کی واپسی کی دادرسی حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۳)۔ مطلقہ عورت اصالتاً یا مختار کے ذریعہ مجسٹریٹ کے سامنے درخواست پیش کر سکتی ہے۔ لیکن دفعہ ۱۲۵ ضابطہ فوجداری کے تحت اس کو اصالتاً حاضر ہو کر درخواست پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔۔۔

(۴)۔ نفقہ واجب الادا۔ زرمہر کو جرمانہ کی طرح وصول کیا جا سکتا ہے۔ بلاوجہ معقول عدم ادائی کی صورت میں سابقہ شوہر کو قید کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ جس کی میعاد ایک سال تک ہو سکے گی

(۵)۔ نفقہ کی مقدار دفعہ ۱۲۵ ضابطہ میں فوجداری زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپیہ رکھی گئی ہے۔ جدید قانون کی رو سے نفقہ کی مقدار بلحاظ سابقہ شوہر کی مالی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر مناسب اور معقول نفقہ کا تعین کیا جا سکے گا۔ جس کی مقدار دو ہزار یا اس سے زیادہ بھی ہو سکے گی۔

(۶)۔ مطلقہ کو انفساخ نکاح کے بعد زرمہر اور واپسی اشیاء جہیز کے لئے عدالت دیوانی میں رجوع ہونا پڑتا تھا لیکن اس جدید قانون میں ایسے تمام مطالبات تکمیل کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ مطلقہ کو اب عدالت دیوانی میں رجوع ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایک درخواست پر یہ دادرسی مل سکتی ہے۔

(۷) ۔ مطلقہ عورت کو اولاد (بچے) جو اس کے زیر پرورش ہوں اور جو سابقہ شوہر کے صلبی ہوں شوہر کی مالیت کے اعتبار سے مناسب اور معقول معاوضہ نفقہ ان بچوں کا بھی پانے کی مستحق ہوگی ۔

(۸) ۔ مطلقہ اپنے سابقہ شوہر ادائی نفقہ کی تکمیل کی ذمہ داری سے سبکدوشی کے بعد بے سہارا نہیں رہے گی بلکہ وہ کن کن اشخاص سے نفقہ پا سکے گی اس قانون میں گنجائش فراہم کی گئی ہے ۔

(۹) ۔ مطلقہ عورت کو فوجداری چارہ کار کے ساتھ دیوانی دادرسی کی بھی اس قانون میں گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ عاجلانہ طور پر اس کے مطالبات کی یکسوئی ہو سکے ۔

(۱۰) ۔ یہ قانون شریعت سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کی پزیرائی بھی کرتا ہے ۔

اس سلسلہ میں فہیمہ سردار کا مقدمہ تو اسی نوعیت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا فہیمہ سردار ایک مسلم مطلقہ خاتون ہے ۔ لکھنؤ کی ایک منصف خاتون نے اس جدید قانون کی دفعہ ۳ کے تحت محض ایک درخواست کی بنیاد پر اس خاتون کے سابقہ شوہر شفاعت خان سے نہ صرف عدت کی مدت کا نفقہ ۲۰۰۰ روپے اور بوقت نکاح مقرر کردہ مہر مبلغ (۵۲۰۰۰) روپیہ دلوایا ۔ خاتون کے مقدمہ میں جس کو نفقہ اور زرمہر دلوایا گیا تھا اس طرح کی ادائی کا حکم عین اس جدید قانون کی اسپرٹ کے مطابق ہے ۔ اور شریعت کے اعتبار سے بھی قابل عمل اور بے حد سود مند ہے ۔

اس فیصلہ کی اشاعت کے بعد چند خواتین روزنامہ سیاست آئیں ۔ ادارہ نے اس مسئلہ کو دارالقضاۃ سے رجوع کرنے کہا چند مطلقہ خواتین محض یہ دریافت کرنے کے لئے آئیں کہ لکھنؤ کی عدالت کی طرح یہاں کی عدالتیں بھی کیا ایسا حکم دے سکتی ہیں میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ مرکزی قانون ہے اس قانون کو ملک کی پارلیمنٹ نے بنایا ہے ۔ اور یہ قانون ہندوستان بھر میں نافذ ہے اور انھیں یہ بھی بتلایا گیا کہ اس تعلق سے ایسی ہی دادرسی کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کر سکتی ہیں ۔ اور کیا کرنا چاہیئے ۔

کوئی دو ہفتہ قبل ایک خاتون اپنی مطلقہ بیٹی کے ساتھ دفتر مرکزی دارالقضاۃ ادارہ تشریف لائیں وہ صورت سے بہت پریشان حال نظر آتی تھیں آتے ہی آب دیدہ ہو کر کہنے لگیں کہ یہ کیا ظلم ہے ۔ صاحب میں سنی ہوں اخبار میں یہ کیفیت آئی ہے کہ طلاق کی ہوئی ایک عورت کو گزارے کی رقم مہر وغیرہ سب کچھ ایک مہینے کے اندر مل گیا اور ہم ایک عجیب ہیں کہ چار سال سے عدالتوں کی چکریں لگا رہے ہیں ہم تو غیر معمولی زیر بار ہو چکے

ہیں مگر اب تک ہمیں ایک پیسہ بھی نہیں ملا یہ درد بھری داستان سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا اور تکلیف بھی میں نے ان کے ساتھ لائے ہوئے کاغذات دیکھے مقدمہ کا تصفیہ چار سال بعد ہوا ہے اور مجسٹریٹ نے نفقہ کی ادائی کا حکم تو دے دیا ہے۔ لیکن طرف ثانی یعنی سابقہ شوہر نے ایک حکم التوا کے ذریعہ ادا شدنی رقم کو روک دیا ہے جن نے جو واقعات ان خواتین سے سنے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ان کی غلط قانونی رہبری اور کچھ شوہر کی بدنیتی اس طوالت کی ذمہ دار ہیں اور اس مظلوم عورت کی پریشانیوں کا موجب بنتے رہے ہیں میں نے ان خواتین کو مشورہ دیا ہے کہ فوری حصول رقم منظورہ کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئیے اور وکیل صاحب سے کس طرح کام لیا جاسکتا ہے۔

اس قانون کی رو سے رشتہ داروں میں وہ کون اشخاص ہوں گے جن پر مطلقہ کی پرورش کی ذمہ داری عاید ہوگی ترجیح یا اولیت کے اعتبار سے جن رشتہ داروں کی درجہ بندی کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

۱) مطلقہ کی اولاد
۲) والدین
۳) ایسے رشتہ دار جس کی مطلقہ شرعاً وارث ہو سکتی ہے مثلاً بھائی بھتیجہ وغیرہ۔

سب سے پہلے مجسٹریٹ نفقہ کی ادائی کا حکم اولاد کو دے گا۔ اگر اولاد ادائی کے قابل نہ ہو تو ماں باپ کو ادائی کیلئے پابند کرے گا اور ماں باپ میں بھی نفقہ کی ادائی کی اہلیت نہ ہو تو بھائی یا بھتیجہ یا اور کوئی رشتہ دار جس کی وہ وارث ہو سکتی ہے۔ مطلقہ کی پرورش کی ذمہ داری عاید کرے گا۔ دوسرے رشتہ داروں میں سے کوئی ادائی کا مالی موقف نہ رکھتا ہو تو آخری صورت میں وقف بورڈ پر ذمہ داری ادائی نفقہ کی عائد کی گئی ہے۔

دوسری وضاحت اس قانون کی نوعیت فوجداری بھی ہے۔ اور دیوانی بھی ہونے کے متعلق ہے۔ مجسٹریٹ عدت کی مدت کا نفقہ زر مہر اور جہیز کا سامان اور تحائف وغیرہ کی ادائی یا واپسی کے لئے جرمانہ کی وصولی کے طریقہ کو استعمال کرے گا اور عدم ادائی کی صورت میں سابقہ شوہر کو سزائے قید بھی دے گا۔ اس قانون کے نفاذ سے پہلے طلاق کے بعد ان مطالبات کی تکمیل کے لئے مطلقہ کو عدالت دیوانی میں رجوع ہو کر ڈگری حاصل کرنی پڑتی تھی۔ بلدیہ قانون کی رو سے مجسٹریٹ کا حکم خود ڈگری بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجسٹریٹ سابقہ شوہر کی حیثیت اور فریقین کے معیار زندگی پیش نظر رکھتے ہوئے معقول اور مناسب

نفقہ کی ادائی کا حکم صادر کرے گا جس کی مقدار ہزار یا اس سے زائد ہو سکے گی۔ یہ صورت دیوانی کی ہے۔ ایک اور امر جس کی وضاحت ضروری ہے کہ فریقین باہمی رضامندی سے دفعہ ۵ قانون جدید کی رو سے اس قانون کے بجائے قانون ضابطہ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ تا ۱۲۸ کے تحت ایسا تصفیہ مجسٹریٹ سے کروا سکتے ہیں جس کی رو سے سابقہ شوہر اپنے آپ کو پابند کرے تاکہ وہ عدت کی مدت کے بعد بھی اگر مطلقہ نے دوسری شادی نہ کی ہو تو نفقہ ادا کرتا رہے گا۔ طلاق کے بعد عطیات واجب یعنی زر مہر جہیز وغیرہ کی ادائی و تکمیل کے بعد بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے گا۔ دفعہ ۵ کا چارہ کار خود مسلم پرسنل لا کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو امر شرعاً جائز نہ ہو فریقین کی باہمی رضامندی جواز کا موجب نہیں بن سکتی۔ قطع نظر اس کے ایسا کون شوہر ہوگا جو عدت کی مدت کے بعد بھی مطلقہ بیوی کی ادائی نفقہ کی ذمہ داری اپنے آپ پر عاید کرلے۔ یہ دفعہ خود غیر ضروری معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ شاید ہی اس پر عمل ہو سکے۔ اکثر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ باوجود اس اس جدید قانون کو نافذ ہو کر ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا ہے مگر مطلقہ عورتوں کو اپنے حقوق کے حصول اور مطالبات کی داد رسی میں غیر معمولی طوالت ہو رہی ہے اس کی بڑی وجہ عوام اس نئے قانون سے ناواقف یا جدید قانون سے استفادہ کرنے کی صحیح معنوں میں کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ حالانکہ دفعہ ۷ قانون جدید کی رو سے وہ تمام درخواستیں جو دفعات ۱۲۵ یا ۱۲۷ ضابطہ فوجداری کے تحت بوقت نفاذ جدید قانون زیر دوران ہوں ان درخواستوں کا فیصلہ جدید قانون کی رو سے کیا جائے گا بلاشبہ یہ قانون مطلقہ کے ان تمام مطالبات کی عاجلانہ یکسوئی میں غیر معمولی مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کوئی قانون اپنی نوعیت اور اثر میں کتنا ہی بہترین اور جامع کیوں نہ اس کی کامیابی کا انحصار بیت کچھ اس قانون کو نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور اس کے نفاذ میں مدد کرنیوالی ایجنسیوں یعنی عدالتوں اور وکلاء پر ہے اگر عدالتیں اس قانون پر سختی سے عمل آوری کی کوشش کریں اور وکلاء بھی نیک نیتی سے عدالتوں سے تعاون اور اشتراک عمل کریں تو یہ قانون نہ صرف بہترین نتائج کا حامل ہوگا بلکہ بڑی حد تک بے سہارا اور مظلوم مطلقہ عورتوں کے مشکلات اور پریشانیوں کا ازالہ اور انسداد کا ضامن بھی ہو سکے گا۔ ★ ★ ★

اطالوی نومسلم صلاح الدین

عیسائیت میں تضاد۔
اسلام میں سکون و سلامتی

اٹلی کی راجدھانی اور کیتھولک عیسائی دنیا کے مرکزی شہر روم کے رہنے والے تیس سالہ اطالو نوجوان انٹونیو کاریوواٹو، جو مشرف بہ اسلام ہوکر "صلاح الدین" بن چکے ہیں۔ ایک پختہ قصبہ کے عیـ اطالوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والدین اور بھائی بہن اتوار کو چرچ میں حاضری د کے علاوہ دیگر عیسائی رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں صلاح الدین فلسفہ کے طالب علم رہے ہیں در اس میں انھوں نے خصوصی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کی شادی زمانے طالب علمی کی ایک سا اطالوی لڑکی سے ہوئی ہے جس نے خود بھی شادی سے چھ ماہ قبل اسلام قبول کرلیا۔ ذیلی سطور میں ا اطالوی نوجوان سے لئے گئے ایک انٹرویو کے کچھ اہم حصے دیئے جارہے ہیں۔

س: کیا مذہب کا انتخاب اور اس سے وابستہ ہونے کے سلسلے میں آپ کے غور و فکر پر فلسفہ کا اثر انداز ہوا ہے؟

ج: فلسفہ مذہب سے بالکل مختلف شئے ہے کیونکہ فلسفی افراد غور و فکر میں ایک تسلسل قائم کرتے ہیں جو تجربہ، استنباط اور واقعات و مشاہدات کے توڑ موڑ کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن ساری چیزیں محدود ہو ہیں کیونکہ وہ انسانی فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں یا (بالفاظ دیگر) ان افکار کا جو انسانی صلاحیتوں کے حد کی پابند ہیں اور انسان خواہ کتنا ہی دانا، زیرک اور چالاک ہو، اس کی دانائی اور زیرکی محدود ہو ہے لیکن مذہب ایک سچائی ہے کیونکہ وہ اللہ کی رضا اور اس کی رحمت ہے اور اللہ خود ایک مط صداقت ہے جس کا کوئی موازنہ ممکن نہیں۔ میں اور میری بیوی دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہب اور فلسفہ کے درمیان کوئی تقابل اور موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ فلاسفر جو اپنے فلسفی، محدود دماغ سے مطالعہ اور استنباط کرتے ہیں۔ اپنے غور و فکر میں محدود ہوتے ہیں جبکہ مذہب حقیقت مطل کے اظہار کا نام ہے۔ جس کی ذات بے نہایت ہے اور جو ہر چیز کا خالق ہے اس کی مخلوقات ہیں سے

ایک انسانی دماغ بھی ہے اور اس دماغ کی صلاحیتیں خواہ کچھ بھی ہوں لیکن وہ تمام حقائق اور امور کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ حقیقی علم، جامعیت اور کمال تو سب اللہ کی ہی صفات ہیں۔

س : پھر آپ اسلام کے مطالعہ اور اس پر یقین تک کس طرح پہنچے۔ بالخصوص موجودہ پیچیدہ سماجی و نظریاتی ماحول میں جو یورپ میں موجود ہے ؟

ج : میرا کنبہ قدرے قدامت پسند ہے میں بھی پابندی سے اور بالخصوص ہر ہفتہ اتوار کے دن چرچ جایا کرتا تھا مجھے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی یکتائی پر ہمیشہ یقین رہا اور اسی بناء پر چرچ میں حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ دوسرے اطالوی باشندوں کی طرح میں شراب پیتا تھا اور پورک (سور کا گوشت) بھی کھالیتا تھا۔ اور عمومی برتاؤ بھی دوسرے اطالوی نوجوانوں کی طرح ہی تھا لیکن پورک مجھے کبھی مرغوب نہیں رہا اور شراب پینے کے بعد سخت کراہت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گرد وپیش کی صورت حال دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لوگ جب چرچ کے اندر ہوتے تو ان کا انداز مختلف ہوتا اور چرچ سے نکل کر وہ بالکل بدل جاتے تھے۔ میرا کنبہ اس سے کچھ مستثنیٰ نہ تھا۔ میں اس تضاد کو کبھی نہیں سمجھ پایا اور اسے نفاق کے علاوہ کسی اور لفظ سے تعبیر نہ کر سکا۔ اس احساس کے تحت میں نے عیسائیت کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ شروع کیا لیکن مطالعہ کی مدت مختصر ہی رہی کیونکہ مجھے مختلف تضاد اور غلطیاں نظر آئیں۔ یہ تضادات بنیادی مسائل میں ہی موجود تھے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی حیثیت اور ان کی زندگی کے بارے میں مختلف تشریحات ہیں میرے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کس طرح بیک وقت ان کی الوہی حیثیت بھی تھی اور انھیں صلیب پر بھی چڑھا دیا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بیک وقت (تثلیث کے اصول کے مطابق) خدا بھی ہوں اور سولی پر بھی چڑھ جائیں۔ بنیادی اصولوں میں بڑا اختلاف ہے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں۔ جبکہ دوسروں کے مطابق خدا نے روح القدس کو مریم (علیہا السلام) کے پاس بھیجا جس کے نتیجہ میں ان سے حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اس نظریہ کے حامی یہ خیال رکھتے ہیں کہ مریم خدا کی بیوی ہیں لیکن روح القدس کے توسط سے۔ ایک اور نظریہ کے مطابق عیسیٰ (علیہ السلام) زمین کے خدا ہیں اور ایک دوسرا خدا آسمانوں کا ہے اور حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریمؑ بھی ایک خدا ہیں لیکن عقلی اصول ان میں سے کسی بھی تشریح کو تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ میں نے اس مسئلہ کا جواب اسلام میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے قرآن کو پڑھا۔ الحمدللہ میں نے اس کا شافی جواب پایا۔ یہ اسلام کی طرف میرا پہلا قدم تھا۔

س : کیا ہم یہ سمجھیں کہ آپ کے قبول اسلام کا سبب حضرت عیسیٰ کی حیثیت اور ان کے پیغام اور ان کی والدہ مریم عذرا کے بارے میں اسلام کی پیش کردہ تشریح تھی۔

ج : میں نے بتایا کہ یہ بھی ایک سبب تھا۔ اس کے بعد بھی میں چرچ جاتا رہا لیکن کھلی آنکھوں کے ساتھ ۔ میں ایک اور صورت حال سے جو بالکل بعید از فہم تھی حیران تھا۔ لوگ چرچ کے اندر پادری کے ساتھ بالکل الگ رنگ میں ہوتے اور چرچ کے باہر قطعی دوسرے رنگ میں۔ پادری کو بھی یہ بات بخوبی معلوم تھی۔ اور یہ مکروہ قسم کی ریاکاری کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ چونکہ بلا استثنا سبھی کا یہی حال تھا۔ لہٰذا میں نے تین مذہبی بنیادوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا میں نے عیسائیت کے اصولوں کا مطالعہ کیا اور پھر اسلام کے اصولوں کو پرکھا۔ اور بالآخر قرآن کریم میں اور اسلامی کتابوں میں ہی مجھے وہ بات ملی۔ جس نے میری روح کو مطمئن اور پریشانی سے آزاد کر دیا اور میں نے مسلمان ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے ادائیگی نماز کا طریقہ سیکھا اور کلمہ شہادت ادا کیا میرا چرچ جانے کا سلسلہ بند ہو گیا اور میرے اہل خاندان کو بھی میرے اندر ہونے والی تبدیلی کا علم ہو گیا

س : اس پر آپ کے گھر کے لوگوں کا بالخصوص اس حوالہ سے کہ آپ نے انہیں کٹر عیسائی بتایا ہے کیا ردعمل ہوا ؟

ج : شروع میں میرے گھر کے لوگ پریشان ہوئے والد اور بھائیوں نے غصہ اور مخالفت کا اظہار کیا لیکن میں اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔ میں نے شراب ترک کر دی اور شراب پینے والوں سے بھی دور رہنے لگا۔ گھر کے باہر کی شام کی تفریحی محفلوں میں شرکت، سگریٹ نوشی اور ناجائز اخراجات سے اجتناب کرنے لگا۔ جوئے سے پرہیز گرل فرینڈس سے احتراز، غرض ان تمام طریقوں سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ جو میرے بھائیوں اور بہنوں سمیت میرے گرد و پیش کے افراد کے یہاں عام تھے ان لوگوں نے مجھے پانچ مرتبہ وضو کرتے اور نماز ادا کرتے ہوئے بھی دیکھا جب وہ پوچھتے تو میں بتاتا کہ یہ دینی فریضہ (نماز) شیطان کے وسوسوں سے بچاتا اور مجھے گناہوں کے ارتکاب سے روکتا ہے یہ انسان کا خدائے مطلق کے ساتھ سیدھا رابطہ قائم کرتا ہے . . اہم بات یہ ہے کہ میرے گھر والوں نے میرے طور طریقہ اور ان کے ساتھ میرے برتاؤ میں تبدیلیوں کو محسوس اور ان کا مشاہدہ کیا جس سے انہیں خوشی ہونے لگی۔ گو کہ ان لوگوں نے کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا لیکن ان کی خاموشی اور ان کے رویہ سے مجھے اس کا احساس ہو گیا۔ بتدریج اعتراض اور مخالفت کا زور کم ہوتا چلا گیا اور پھر میری طرف توجہ نہیں رہی ۔

س : کیا آپ نے اس کے بعد دوسرا فطری اقدام بھی کیا۔ یعنی یہ کہ انہیں اسلامی اصولوں اور اعلیٰ اخلاقیات کی دعوت دی ؟

ج : میں نے براہ راست اسلام کی دعوت نہیں دی، اپنے تجربہ کی بناء پر میرا خیال تھا کہ میں انہیں اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے دوں، میرا برتاؤ میرے طریقے اور ان کے ساتھ میرے معاملات بالآخر انہیں اس تبدیلی کا راز معلوم کرنے پر مجبور کرے گی اور اس وقت میں انہیں اسلام کی طرف بلاؤں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے کنبہ کے سبھی افراد مجھ پر اعتماد اور بھروسہ کرنے لگے اور اسلام ایسے وافر اصول اور اخلاقیات رکھتا ہے جو رشتہ داروں کے درمیان تعلق اور خاندان کے وجود و استحکام کو تقویت دیتے ہیں یہ اسلامی برتاؤ میرے والدین اور بھائیوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے اور مجھے ان کی عزت اور تحسین دلانے میں بھی بیحد معاون ہوا جب وہ مجھ سے ان تبدیلیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں اور جواب میں اسلام بطور سبب ان کے سامنے آتا ہے تو وہ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اور یہ خاموشی رضامندی کی اولین علامت ہے اس علامت کو محسوس کرتے ہوئے میں اپنی والدہ سے کھل کر، لیکن اپنے بھائیوں سے قدرے احتیاط کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع کیا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے گھر کے جملہ افراد کو اسلام کی طرف لانے میں میری مدد فرمائے گا اور میری دعا ہے کہ جلد ایسا ہو، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

س : آپ اور آپ کی اہلیہ دونوں اپنے اپنے طور پر قبول اسلام کے مرحلے تک پہنچے یا قبول اسلام سے پہلے کے آپ کے تعلقات ان کے فیصلہ کا باعث بنے؟

ج : میری بیگم عائشہ میری ساتھی تھیں اور پہلے سے ہی ان سے میری دوستی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے تعلقات قبول اسلام سے پہلے بھی کبھی خدا کے ناپسندیدہ طریقے پر نہیں رہے۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ انھیں اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات، اپنے نئے احساسات اور اپنی تحقیق سے قدم بہ قدم حاصل ہونے والے نتائج سے آگاہ کیا کرتا تھا ان کا رویہ انتہائی حوصلہ افزا تھا کیونکہ خود ان کے ذہن میں بھی کتنے ہی سوالات تھے جن کے جوابات کی تلاش میں وہ سرگرداں رہیں۔ وہ مطالعہ کرنے اور پھر دوطرفہ مطالعہ کے ماحصل کا تقابل اور موازنہ کرنے میں بہت مستعد اور پرجوش واقع ہوئی تھیں۔ اور یہ ہماری اور ان کی خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی اسی نتیجے تک پہنچایا، جہاں تک میں پہنچا تھا اور انھوں نے ہماری اسلامی طریقہ پر شادی سے ٹھیک چھ ماہ قبل اسلام قبول کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق بالکل آزادانہ اور رضاکارانہ طریقہ پر اپنی تمام عادات اور اطوار بدل ڈالے۔ اسلامی اعتبار سے ناشائستہ لباس اُتار ڈالے، سگریٹ نوشی ترک کردی۔ گھر سے باہر کے لئے دوبارہ بھی میک اپ نہیں کیا بلکہ سادگی اختیار کی۔ گھر میں آنے والے مرد ملاقاتیوں اور مہمانوں کے ساتھ بیٹھنا چھوڑ دیا اور وہ طور طریق جو عورت کے وقار کے منافی ہیں۔

قبول اسلام کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے ترک کر دیئے۔

س: اس سیاق میں یہ سوال غالباً اہم ہوگا کہ مغربی مادہ پرست تہذیب کی روایات سے وابستہ رہنے کے بعد ایک مسلم جوڑے کی حیثیت سے آپ دونوں کے باہمی تعلقات کیسے ہیں؟

ج: اللہ کا شکر ہے کہ دوسرے نوجوان جوڑوں کے مقابلہ میں بلکہ ان لوگوں کے مقابلے میں بھی جو شادی سے پہلے "لوافیئر" رکھتے ہیں کہیں زیادہ محبت اور آپسی مفاہمت ہمارے درمیان پائی جاتی ہے دوسرے جوڑوں کے یہاں شراب جوا اور راتیں گھر سے باہر گزارنے کی روش آپسی جھگڑوں کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ان خرابیوں کی عدم موجودگی باہمی قرب اور انس میں اضافہ بنتی ہے اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ کہ عام طور پر مغربی معاشرہ میں مذہب کی ہدایات اور خدا کے مقرر کردہ ضوابط کے برخلاف آزادی کا نہایت غلط مفہوم اور اس کے برتنے کا غلط انداز اختیار کیا گیا ہے لیکن میری بیوی اسلامی تعلیمات کے تحت، یہ جانتی ہے کہ خدا کی فرمابرداری شوہر کی فرمانبرداری اور اس سے وفاداری سے وابستہ ہے اسی طرح میں بھی بخوبی جانتا ہوں کہ میں اپنی بیوی سے بے وفائی کر کے خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوں گا چنانچہ یہ علم اور اس پر عمل ہمارے درمیان کسی پیچیدگی کو روکنے کا ایک بنیادی سبب ہے کسی بھی شوہر یا بیوی کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ اس کے ساتھی کے کسی دوسرے سے غیر قانونی اور ناجائز تعلقات ہوں مگر افسوس کہ یورپی معاشروں میں یہ ایک عام صورت حال ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں برادر صلاح الدین نے بتایا کہ قبول اسلام سے پہلے قرآن و حدیث کے مطالب کو سمجھنے اور قبول اسلام کے بعد نماز کا طریقہ سیکھنے، قرآنی سورتیں پڑھنے اور یاد کرنے میں ایک اور نومسلم جناب عبدالصمد نے ان کی اور ان کی اہلیہ کی بہت مدد کی۔ جناب عبدالصمد ان ہی کی طرح پہلے اسلام لائے تھے اور جامعۃ الازہر میں پانچ سالہ اسلامی کورس مکمل کرنے کے بعد روم لوٹے تھے برادر صلاح الدین سے اگلا سوال یہ تھا کہ اسلام کے مطالعہ اور اس کے اصول وضوابط پر عمل کے حالیہ تجربہ کے دوران اسلام کی کس تعلیم یا ضابطے نے انھیں زیادہ متاثر کیا؟

ج: میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اسلام میں آکر اپنے آپ کو پایا ہے، اپنے آپ کو پہچانا ہے، مسلمان ہونے کے بعد مجھے امن اور سلامتی کا احساس ہوا، میری روح کو سکون اور طمانیت کی نعمت ملی اور یہی وہ شے ہے جو ہمارے جدید یورپی معاشروں میں ناپید ہے جدید مادہ پرست تہذیب نے انسان کو ——— سکون و سلامتی سے محروم کر دیا ہے وہ پریشان اور خوفزدہ ہے اور مشین کی طرح پوری زندگی میں مادی چیزوں کے تعاقب میں لگا دیتا ہے لیکن

اللہ تعالیٰ پر یقین اس سرزمین کو حقیقی انسانیت اور امن و سکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے ۔ یہی احساسات میری بیوی کے بھی ہیں ۔ اس کے علاوہ پنجوقتہ نمازوں سے میں نے وقت کی پابندی سیکھی ہے اور ہر نماز مجھے روحانی طمانیت عطا کرتی ہے ۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے اسلام ہی نے مجھے دوسروں سے عفو و درگذر سے کام لینا، خودغرضی سے احتراز کرنا سکھایا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر ہر روز اس دین برحق کی نئی نئی خوبیوں کا انکشاف ہوتا ہے ۔

س: آپ سے آخری سوال یہ ہے کہ آپ کے دوسرے اطالوی ساتھی اسلام کو جاننے اور سمجھنے کے لئے کہاں تک تیار ہیں؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اطالوی نوجوان طبقہ ان دنوں جس زبردست خسارے سے دوچار ہے اور جس کی علامات اور اثرات سڑکوں پر، کلبوں اور باغات میں، عمومی انحطاط اور انتشار، اسکولوں سے فرار، صحیح اخلاقی اقدار سے لاتعلقی، بہوئے شراب اور نشہ آور دواؤں کی لت، جرائم کے بھیانک پھیلاؤ اور خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی صورت میں پوری طرح نمایاں ہیں ۔ یہ تمام حالات ہمیں سبیل نجات کی تلاش پر مجبور کرتے ہیں ۔ نوجوان طبقہ اپنی صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لئے آمادۂ بغاوت ہے ۔ اور مسائل کا واحد مکمل حل جو ہمیں مل سکتا ہے ۔ افسوس کہ تعصب اور جنونی تعصب اس حل کے حصول کی راہ میں حائل ہے ۔ وہ حل صرف اسلام ہے ۔ کیونکہ اسلام انسانیت کو اس کا حقیقی اور فطری کردار عطا کرتا ہے ۔ اور دنیا میں امن اور نیکی کو قائم کرتا ہے ۔ اسلام پریشانی و ہراسانی اور کشمکش کی کیفیت سے بھی نجات دلاتا ہے ۔ اور اپنی تعلیمات و ہدایات کے ذریعہ وہ حقیقی اور مثبت احساسات کو جذبات کا حامل انسان تیار کرتا ہے ۔ جو اس روئے زمین پر کمال مسرت اور سکون کی زندگی گذارتا ہے اس سلسلہ میں قرآن کریم کی اس برحق یقین دہانی کا حوالہ ہی کافی ہو گا کہ:

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (جان لو کہ اللہ کا ذکر ہی دلوں کو طمانیت عطا کرتا ہے)

اللہ کے ذکر کے ساتھ اسلام کی تعلیمات و ہدایات، اس کے اصول و ضوابط نوع نسلِ انسانی کے لئے اس دنیا میں بھی اور اس دنیا کے بعد آخرت میں بھی کامل مسرت کی ضمانت ہیں

امین مالوف/قاضی جلیل احمد

مسلسل

(قسط ۱۷)

صلیب کے سائے میں

۱۴/ اکتوبر ۱۰۹۲ء کو حسن بن صباح کے ایک پیروکار نے نظام الملک طوسی کو روز روشن میں قتل کر دیا۔ ابن الاثیر رقمطراز ہے کہ نظام الملک کی موت سے سلجوقی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور سلجوقی اقتدار اپنی وحدت کو پھر کبھی پا نہ سکا۔ اور سلجوقی تاریخ بیرونی فتوحات کے بجائے اندرونی خانہ جنگیوں اور خلفشار کی داستان بن کر رہ گئی۔ اس کارنامے کے بعد حسن بن صباح مصر میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع بھیج سکتا تھا کہ میدان صاف ہے فوج لیکر آگے بڑھیں اور اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس حاصل کر لیں۔ لیکن خود مصر ہی میں اس احیائے خلافت فاطمی کی تحریک کو روز بد کا منہ دیکھنا پڑا۔ الافضل نے جو بدر الجمال کے بعد ۱۰۹۴ء میں مصر کا وزیر بنا تھا اس تحریک کو بڑی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا ولیعہد نزار کو زنجیر میں زندہ دفن کر دیا۔

یہ نئی صورتِ حال حسن کے لئے قطعی غیر متوقع نہ تھی۔ اور وہ زندگی بھر شیعہ خلافت کے اقتدار کی بحالی کے مقصد سے دستبردار نہیں ہوا۔ لیکن اس نے سمجھ لیا کہ فی الحال حالات اُس کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ اس لئے اس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کی۔ اب اس نے اپنے اقتدار کی مضبوطی اور بحالی کیلئے جد و جہد شروع کر دی تاکہ مناسب وقت کے آنے پر وہ یا اس کے پیروکار شیعی خلافت کی بحالی کا کارنامہ انجام دے سکیں۔ اس کام کے لئے ملک شام سے بہتر اور کوئی سرزمین موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کا چپہ چپہ آزاد اور خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ حسن خود اپنے لیئے ایک محفوظ ٹھکانا بنالیتا۔ اسکے بعد ایک شہر کو دوسرے شہر سے اور ایک ریاست کو دوسری ریاست سے لڑا کر سلجوقی طاقت

کو پارہ پارہ کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس اُمید پر کہ شاید کبھی فاطمی خلافت اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو تو اس کے بحالی اقتدار کے لئے زمین ہموار ملے۔

حسن نے ایک ایرانی مبلغ کو ملک شام میں رضوان کی ریاست الیپو میں روانہ کیا۔ جس نے آہستہ آہستہ رضوان کا اعتماد حاصل کرلیا۔ اب اس فرقے کے پیرو کاروں نے شہر آلیپو میں جمع ہونا شروع کردیا۔ یہاں انہوں نے صرف اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی بلکہ اپنی خفیہ تنظیم کی شاخیں بھی قائم کرلیں۔ رضوان کو خوش کرنے اور اسکا اعتماد بحال رکھنے کیلئے وہ اس کے لیئے چھوٹی موٹی خدمات بھی انجام دے لیا کرتے تھے مثلاً اُس کے سیاسی مخالفین کا قتل وغیرہ۔ جب اس ایرانی مبلغ کا ۱۱۰۲ء میں انتقال ہوا تو حسن نے اس کی جگہ ایک نئے داعی کو الیپو روانہ کیا جس کا نام ابو طاہر زرگر تھا۔ رضوان پر اس کا اثر اور اعتماد پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا یہاں تک کے کمال الدین کے کہنے کے مطابق آلیپو کا کوئی شخص ابو طاہر کی سفارش کے بغیر رضوان سے کسی نوازش واکرام کی امید نہیں کرسکتا تھا۔ اور نہ اس فرقے کی مرضی کے خلاف کسی انتظامی امر میں کوئی حکم صادر کرسکتا تھا۔

لیکن فدائیوں کا یہی اقتدار اُن کے لئے عوامی نفرت کا موجب بن گیا تھا خصوصاً الخشب دن رات انہیں اقتدار سے ہٹانے کا مطالبہ کرتا رہتا تھا۔ فدائیوں کے ساتھ الخشب کی دشمنی کی وجہ محض یہی نہ تھی کہ اقتدار کیلئے ہر ذریعہ کا استعمال جائز سمجھتے تھے بلکہ اسکی بڑی وجہ ان کی فرنگیوں کیساتھ دوستی بھی تھی۔ جب فرنگی نئے نئے ایشیا میں وارد ہوئے اس وقت حسن بن صباح کے یہ پیرو ملک شام میں باطنی کے نام پکارے جاتے تھے۔ یعنی ایسا فرقہ جس کے اندرونی عقاید اُس کے ظاہری اعمال و افکار سے مختلف تھے۔ اسکا مطلب یہہ تھا کہ یہ لوگ دراصل غیر مسلم ہیں اور اپنے چہروں پر اسلام کی نقاب چڑھاتے رہتے ہیں۔ قاضی الخشب کی طرح عام اہل تشیع کو بھی اس جماعت سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ انہوں نے مصر کی فاطمی خلافت سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ اور جسکو دنیا ے عرب کے شیعہ اپنا محافظ سمجھتے تھے۔

اس دوہری مخالفت نے حسن بن صباح کے پیرو کاروں کو شیعہ اور سنی دونوں فرقوں سے بیزار کردیا۔ لہذا جب فرنگی اس ملک میں وارد ہوئے

تو انہوں نے اس نئی طاقت سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی خصوصاً اس لیئے کہ یہ نئی طاقت ایک طرف سلجوقی اقتدار کا شیرازہ بکھیرنے لگی تو دوسری طرف الافضل کی طاقت کو کچلنے کا موجب بھی بن رہی تھی۔ اور اس طرح دشمنوں کے دشمن کی حیثیت سے فرنگی خود بخود حسن کے دوست بن گئے تھے۔ چنانچہ رضوان کے فرنگیوں سے اچھے تعلقات کے پس پردہ انہی باطنیوں کا ہاتھ تھا۔

جہاں تک ابن الخشب کا تعلق تھا وہ فرنگیوں سے کسی بھی راہ و رسم کو اسلام سے غداری کے مترادف سمجھتا تھا۔ اور اسی وجہہ سے باطنی لوگ اسکی نظروں میں بدترین غلامی کے مرتکب تھے۔ ۱۱۱۳ء میں رضوان کے مرنے کے بعد الیپو میں قتل اور خون ریزی کا جو طوفان اٹھا اس میں لوگوں نے باطنیوں کو چن چن کر ہلاک کیا۔ جن میں ابو طاہر زرگر بھی شامل تھا۔ ابن قلانسی لکھتا ہے۔ کہ بہت سے باطنی بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے بھاگ کر فرنگی علاقوں میں پناہ حاصل کی یا مضافات سلطنت میں پھیل گئے۔

اور گو الخشب شہر الیپو سے باطنیوں کے مستقر کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کی وجہہ سے ان کی تنظیم پر کوئی اثر نہیں پڑا اور ان کی طاقت مسلسل بڑھتی ہی رہی۔ اس تباہی سے سبق حاصل کر کے انہوں نے اپنی حکمت عملی میں مزید تبدیلی پیدا کی۔ شام میں حسن کے نئے داعی بہرام نے اپنے پیرو کاروں کو اپنی تنظیم اور خفیہ تبلیغ پر متوجہ کیا اور ان کی ساری خون آشامیاں فی الحال روک دی گئیں تاکہ وہ عوامی غیض و غضب کا شکار ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔ کمال الدین لکھتا ہے کہ

"بہرام انتہائی پوشیدہ اور تنہا زندگی بسر کرتا تھا۔ اور بھیس بدلنے میں اُسے ایسی مہارت تھی کہ وہ بہ آسانی ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک قریے سے دوسرے قریے تک پہنچ جاتا اور کسی کو پتہ نہ چلتا۔"

چند ہی مہینوں میں اس نے اپنی خفیہ تنظیم کو اسقدر منظم اور طاقتور بنالیا کہ اب اُسے تنظیم کو خفیہ رکھنے کی حاجت باقی نہ رہی۔ رضوان کے جانشین کی صورت میں دوبارہ اُسے ایک بہترین محافظ مل گیا۔ ابن قلانسی لکھتا ہے۔

"ایک دن بہرام دمشق پہنچا۔ اتابک تغتگین نے اسکا مناسب خیر مقدم کیا۔ کیونکہ وہ بھی بہرام کے گروہ کی خون آشامیوں سے خائف تھا۔ اس نے بہرام کی تعظیم و توقیر میں کوئی کمی نہیں کی اور اُسے یقین دلا دیا کہ اسکی حفاظت کا خاص خیال

رکھا جائیگا۔ اسی طرح اسکے وزیر طاہر المزدغانی نے بھی بہرام کے ساتھ خفیہ سمجھوتا کرلیا اور بہرام کی خفیہ کاروائیوں میں اُسکی مدد کرنے لگا"۔

اور اسطرح ۱۱۲۴ء میں حسن بن صباح کی موت کے باوجود اس جماعت علی حالہ برقرار رہی بلکہ اُس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ ابن الخشب کا قتل بھی کوئی تنہا واقعہ نہیں بلکہ مختلف حادثات کی ایک کڑی تھی۔ اگلے سال ایک اور عمامہ پوش کا قتل اسی طرح عمل میں آیا جو فرنگیوں کے خلاف جہاد کر رہا تھا۔ یہ تھا بغداد کا قاضی القضاۃ ابوسعد الہراوی جو ۱۰۹۹ء سے آج تک برابر مسلمانوں کو فرنگیوں کے خلاف جہاد کے لئے اکسا رہا تھا بہران کی مسجد میں باطنیوں نے اس پر حملہ کرکے اُسے شہید کر دیا۔ وہ اُسے ہلاک کرکے فرار ہوگئے اور اپنے پیچھے انہوں نے اپنا کوئی نشان نہ چھوڑا۔ عوام پر باطنیوں کا خوف اتنا طاری ہوگیا تھا کہ کسی نے ان کا پیچھا کرنے کی جرات نہ کی۔ اس جرم کے خلاف دمشق میں شدید ردِّ عمل ہوا کیونکہ الہراوی کئی سال دمشق میں رہ چکا تھا۔ باطنیوں کی کاروائیوں سے اُن کے خلاف عوامی غیض و غضب کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ خصوصاً مذہبی حلقوں میں ان کے خلاف طوفان برپا ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اس کا اظہار بھی دبے دبے انداز میں ہو رہا تھا۔ کیونکہ باطنی خنجر سے ہر کوئی خائف تھا۔ ابھی تک برسرِعام کوئی ان کے خلاف کچھ کہنے کی جرات اپنے میں نہ پاتا تھا خواہ وہ امیر ہو یا وزیر۔

" یہ خوف و دہشت قابل فہم تھی۔ کیونکہ الپو اور موصل کا حاکم ال بورسکی بھی اُن کے ڈر سے ہمیشہ ایسا لباس پہنے رہتا تھا جس پر کسی ہتھیار کا وار کارگر نہ ہو اسکے اطراف ہمیشہ مسلح گارڈ تعینات ہوا کرتے تھے۔ لیکن تقدیر کے آگے بس کو چارہ ہے ـــ ابن قلانسی لکھتا ہے کہ ال بورسکی موصل کی مسجد نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے گیا۔ سازشی مسجد میں پہلے ہی سے صوفیوں کے لباس میں موجود اور نماز میں معروف تھے۔ ال بورسکی جوں ہی پاس سے گزرا وہ صوفی نماز توڑ کر اس پر حملہ آور ہوئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کے ہتھیار اس کے لباس پر کارگر نہیں ہو رہے ہیں تو انہوں نے اس کے حلقوم کو اپنے خنجروں کا نشانہ بنا کر اسکا خاتمہ کر دیا۔ ال بورسکی ایک شہید کی موت مرا جب کہ اسکے قاتلوں کو جہنم رسید کر دیا گیا"

باطنیوں کے خطرے نے پہلے اتنی شدید اور ہمہ گیر صورت کبھی اختیار نہیں کی

تھی۔ وہ اب محض زہریلے کیڑے نہیں رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے وبائی جراثیم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ال بورسکی کے قتل کے چند ماہ بعد اسکا لڑکا بھی جو اسکا جانشین ہوا تھا اسی طرح قتل کر دیا گیا۔ اور آلیپو کے اقتدار کے لیئے چار ترک امیروں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اب الیپو میں قاضی الخشب بھی زندہ نہ تھا کہ حالات راہ پر لانے کی سعی کرتا۔ اسی افراتفری کے دور میں فرنگی فوجیں ایک بار پھر آلیپو کے دروازے پر پہنچ گیں۔ اُن کا سردار انطاکیہ کے حکمران بوہیمنڈ کا لڑکا تھا جس کا خود بھی بوہیمنڈ نام تھا۔ الیپو والوں نے فوراً ہی اُسے خراج دینا منظور کر لیا۔

دمشق کی حالت بھی اس سے کچھ بہتر نہ تھی۔ بوڑھے اتابک تغتگین کا باطنیوں پر کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔

باطنیوں کی اپنی مسلح طاقت تھی اور شہر کا نظم و نسق انہی کے ہاتھوں میں تھا وزیر ال مزدغانی پوری طرح باطنیوں کے اثر و اقتدار میں تھا اور اسنے یروشلم کے فرنگی حکمران سے اپنے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ ادھر یروشلم کا حکمران بالڈون ثانی دمشق پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باطنی بوڑھے تغتگین کی موت کے منتظر ہیں کہ اسکے ساتھ ہی دمشق بالڈون کے حوالے کر دیں۔ بالآخر ۱۲/ فبروری ۱۱۲۸ء کو تغتگین اپنے بیٹے بورسی کو اپنا جانشین نامزد کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ اہل دمشق کو یقین ہو گیا کہ کوئی دم میں دمشق پر قبضہ ہونے ہی والا ہے۔

اہل دمشق پر نازل شدہ اس نازک وقت پر گفتگو کرتے ہوئے ابن الاثیر لکھتا ہے ؎

"تغتگین کی موت کے بعد دمشق میں ایسا کوئی شخص باقی نہ رہا تھا جو شہر کو فرنگیوں سے بچا سکتا بلکہ فرنگی اب اس پوزیشن میں تھے کہ وہ پورے ملک شام پر قبضہ کر سکتے تھے۔ لیکن خدا نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو بچا لیا۔"

ہو چکی ہے۔ کہ امتحان میں جو پاس ہونے کی بنیاد اصلاً یہ تھی کہ اسی معیار کی علمی ثقافت ہو اب امتحان اس کو جیس بتاتا، وہ جو درجۂ حرارت معلوم کرنے کا آلہ ہوتا ہے وہ آج اپنا کام ختم کر چکا ہے، خراب ہو چکا ہے۔ اب خواہ مخواہ اسمیں پلڑہ ڈال کر زبردستی درجۂ حرارت معلوم نہیں کیجئے۔ ایسی صورت میں آپ پاس بھی ہو جائیں گے پوزیشن بھی مل جائیے۔ لیکن آپ نے اگر اس پر محنت نہیں کی، آپ نے اس پر فکر نہیں لگائی تو آپ کی ثقافت کا جزء نہیں بن سکتا۔ ★ ★ ★

کماری پرتو بھاردواج

صدیوں کے راستے روپئے کا سفر

روزانہ اور خصوصاً مارچ کے مہینے میں جب بجٹ پیش کیا جاتا ہے، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ "روپیے" کی قیمت کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں تو اعداد و شمار، حساب و کتاب اور اس کی قیمت کی ایک بے رنگ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔
تاہم تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے اور وہ ہے روپیئے کی طویل اور شطرنجی تاریخ کا۔ "روپیے" کی تاریخ جیسے کہ برصغیر کی مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے اتنی ہی پر ہیجان، مسحور کن اور دلچسپ ہے جتنی کہ خود برصغیر کی اپنی تاریخ۔ دراصل روپیئے نے تو سمندر بھی عبور کر ڈالے اور مختلف ممالک کے سکے کی حیثیت اختیار کر لی۔ روپیئے کی موجودہ شکل، سائز، وزن اور قیمت کے پیچھے بہت سے سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی عناصر کارفرما رہے ہیں۔ بھارت کے عظیم افغان حکمراں شیر شاہ سوری نے جو کہ اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کے لیے مشہور ہیں شاید کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ان کا شروع کیا ہوا "روپیہ" بعد ازاں ڈرامائی تبدیلیوں کا شکار ہو جائے گا۔

ابتدا

جب شیر شاہ نے روپیہ چلایا تو یہ 11-5 گرام وزن کا چپٹی سطح کا چاندی کا ایک سکہ تھا۔ سکہ کی ایک جانب مرکزی حصہ میں کلمہ اور اس کے کناروں پر چاروں خلفاء کا نام لکھا ہوتا تھا۔ سکہ کی دوسری جانب سکہ ڈھلنے کی تاریخ "خدا بادشاہ کی سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے" اور سلطان کا نام ہندی میں نقش ہوا کرتا تھا۔ روپیے کے حاشیے پر ان بیس ٹکسالوں میں سے ایک کا نام ہوا کرتا تھا، جہاں یہ ڈھالا گیا ہو۔ سکے کے مرکزی نقش پر چار یا پانچ پھل پھول، سواستک یا دو باہم پیوستہ مثلث ہوتے تھے۔ عام طور پر یہ سکے گولائی میں ہوا کرتے تھے تاہم کبھی کبھی کسی خاص موقع پر انھیں چوکور شکل میں بھی ڈھالا جاتا تھا۔

کوئی بھی شخص کسی بھی وقت ضرورت چاندی اور ٹکسال فیس کے اخراجات جمع کر کے چاندی کے روپیے حاصل کر سکتا تھا۔ سکّے کی قیمت چاندی کی قیمت پر منحصر ہوتی تھی۔

عہدِ مغلیہ

مغل عہد میں بھی روپیے کی روایتی خصوصیات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ اس دور میں ۱۷۲.۵ گرین کا چاندی کا روپیہ تقریباً موجودہ سکوں سے مشابہ تھا، یقیناً خریداری کی قوت کے لحاظ سے نہیں۔

اس وقت کے چاندی کے روپیے کی قیمت اس میں مستعمل چاندی کی قیمت کے مساوی ہوا کرتی تھی۔ کچھ تانبے کے سکے بھی چلتے تھے ان میں سے ایک خاص سکہ "دم" تھا۔ تانبے کے چالیس "دم" ایک روپیے کے برابر ہوتے تھے۔ اگرچہ سونے کے سکے بھی تھے جنہیں مہر کہا جاتا تھا۔ تاہم وہ عوام الناس کو دستیاب کم ہی ہو پاتے تھے۔

اکبر کے عہد میں سکّے کی شکل میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ شہنشاہ کے توصیفی لقب نقش کئے گئے۔ مذکورہ نقش مختلف ہندسیہ مرجنوں میں ہوتے تھے ان میں اسلامی کیلنڈر کے حساب سے تاریخیں بھی ہوتی تھیں۔ ۱۵۸۲ء میں اکبر نے دین الٰہی یا اکبر اعظم کا اپنا دور شروع کیا بادشاہ کے لقب "اللہ اکبر" اور "اللہ اکبر جلّ جلالہ" بھی سکّے پر نقش کئے گئے۔

جہانگیر کا طرزِ عمل

جہانگیر کے عہد میں ملکہ کا لقب بھی سکّے پر نقش ہونے لگا اس نے بھی ویسے ہی سکّے ڈھلوائے۔ بعد میں روایتی آیات والے اور منطق البروج کے سکّے بھی اس کے عہد میں ڈھالے گئے۔ ان سکّوں پر اس برج کے مہینے کی جس میں وہ سکہ ڈھالا گیا ہے علامت بھی درج ہوتی تھی۔ گول اور چوکور سکّے بھی تبدیلی کے طور پر ڈھالے گئے۔ پورے عہد مغلیہ میں کلمہ والا چاندی کا سکّہ شہنشاہ یا ملکہ کے لقب اور آیات کے ساتھ ڈھالا جاتا تھا۔

مغلوں کے بتدریج زوال کے ساتھ روپیہ نتیجتاً اس وقت تک زوال پذیر ہوتا رہا۔ جب تک کہ ملک برطانوی تسلط کے نیچے نہیں آگیا۔ لین دین کے ایک خاص سکّے کی حیثیت سے، روپیے کے سکّے کو اپنی پوزیشن خطرے میں پڑتی نظر آئی۔ تاہم چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں تب بھی روپیے کی اہمیت اسی طرح باقی رہی۔

اس زمانے میں بھارت میں پرتگالی اور فرانسیسی نوآبادیاتی علاقوں میں سکّہ سازی پر یوروپی رجحان حاوی رہا۔ مثال کے طور پر گوا کے چاندی کے سکّے پر بادشاہ کی شبیہ اور

بنگال کے ہتیار نقش ہوتے تھے۔

برطانوی سکہ

جس زمانے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلوں سے سکہ سازی کے حقوق حاصل کئے اس وقت چاندی اور سونے کے تقریباً ۹۹۴ اقسام کے سکے چل رہے تھے۔ کمپنی کے ذریعہ عنان حکومت سنبھالنے کے بعد مدراس میں ارکاٹ روپئے اور بنگال اور سورت میں سکہ روپئے اور بمبئی میں روپیہ چلتا تھا۔ چاندی کے مذکورہ سکے اپنی دھاتوں کے آمیزش اور وزن کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے تھے مدراس کے ارکاٹ سکے ترشول جیسے کمل یا بھگوان شیو کے ترشول کی شبیہہ کے حامل ہوا کرتے تھے۔ ممبئی کے سکوں پر نشان چھوٹے تاج اور کلکتہ کے سکوں پر امتیازی نشان کے طور پر ایک گلاب کا نشان بنا ہوتا تھا دیگر پہلوؤں کے اعتبار سے مذکورہ سکے ایک ہی جیسے تھے۔ انہیں مشینوں پر ڈھالا جاتا تھا ڈھانچہ یوروپی اور کنارے گول ہوتے تھے۔

۱۸۳۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے روپئے کو پورے ہندوستان کی واحد کرنسی کے طور پر جاری کیا۔ اس کے بعد ولیم پنجم کی شبیہہ اور القاب کے حامل متعدد سکے چلائے گئے ۱۸۴۰ء میں ڈھالے گئے روپئے پر ملکہ وکٹوریہ کا نام نقش تھا۔

جب حکومت برطانیہ نے ملک کا انتظام سنبھالا تو روپئے میں قابل ذکر تبدیلی ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں جاری کئے جانے والے سکوں پر شہنشاہ کی شبیہہ تھی۔ سکے پر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام بھی حذف ہوگیا۔ ۱۸۷۷ء کے بعد "ملکہ" کا خطاب استعمال کیا گیا۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے ۱۹۴۶ء میں اور ۱۹۴۷ء میں جاری کئے گئے آخری دو قسم کے سکوں میں ایک نیا طرز اختیار کیا گیا تھا جس میں سکے کے ایک رخ پر شیر کی تصویر تھی۔ چاندی کے روپئے کے علاوہ نسبتاً کم قیمت کے تانبے کے سکے بھی جاری کئے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں کنگ جارج پنجم کی شبیہہ کے حامل ایک روپیہ کی نوٹ بھی جاری کئے گئے۔

چاندی کے روپیہ کی قیمت میں بھی اس کے نقش کی طرح زبردست تبدیلی آئی ہے جب ۱۸۳۵ء میں روپئے کو قانونی ٹنڈر کا درجہ دینے کا اعلان کیا گیا تو اس کی اصل قیمت اس کی چاندی کے مساوی ہوا کرتی تھی آج روپیہ نکل سے بنتا ہے اور اس پر نقش کی گئی قیمت اس کے لیے استعمال کی گئی دھات کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

خودمختار کرنسی

تجارت میں آسانی اور روپئے کا ذرمبادلہ وضع کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے روپئے کی قیمت اسٹرلنگ میں مقرر کی جو ایک

پونڈ کے لیے ۱۵ روپے تھی۔ اور جس کے ذریعہ اعلان کیا گیا تناسب عمل میں آیا۔ اسٹرلنگ کے ساتھ روپیے کا تعلق ۱۹۴۵ میں بھارت کے بین الاقوامی مالی فنڈ میں شامل ہونے کے بعد ختم ہو گیا۔ اس اقدام نے روپیے کو بین الاقوامی پیمانے پر تسلیم شدہ نظام سے منسلک کر دیا۔ اس طرح روپیے نے ایک علیحدہ اور نئی کرنسی کی شکل اختیار کر لی جس کی سونے کے تناسب کے اعتبار سے اپنی ایک قیمت مقرر ہوئی جو کہ پہلی بار ٠.268601 گرام سونے کے برابر مقرر کی گئی۔

۱۹۴۴ میں عشری اور چاندی کے سکوں کے بدلے میں خالص نکل کے سکوں کو حکومت نے کرنسی کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۴۶ میں اس وقت جاری کردہ تازہ ترین روپیوں کے بدلے میں نئے طرز کے نکل کے روپیے جاری کیے گئے۔

عشری کرنسی ۱۹۵۷ میں وجود میں آئی۔ اس سے قبل روپیے میں ۱۶ آنے اور ایک آنے میں بارہ پائیاں ہوتی تھیں۔ اب ایک روپیے کے سکے اور نوٹ سیدھے وزارت خزانہ سے جاری ہوتے ہیں اور ریزرو بینک آف انڈیا انکی نگرانی کرتا ہے۔

آج روپیہ محض بھارت تک ہی محدود نہیں ہے مختلف ایشیائی ممالک مثلاً پاکستان نیپال، بھوٹان، اور سری لنکا نے روپیے کو اپنی کرنسی کے طور پر اختیار کیا ہے۔ تاہم، یہ تمام کرنسیاں خود مختار کرنسیوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مختلف بھارتی زبانوں میں بھی اسے مختلف ناموں مثلاً، ٹوکا، ٹکا، دو پیکا، روپا۔ وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہندی میں روپا کا مطلب چاندی ہوتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ لفظ ”روپا“ اسی لفظ سے اخذ کیا گیا ہوگا۔ ◄◄

.... کی غزل میں چند مصرعے خارج از بحر ہیں۔ اس سے رسالے کے معیار پر حرف آتا ہے۔ شائع کرنے سے پہلے توجہ دیں تو مناسب ہے۔ یہ میری رائے ہے۔ ویسے آپ کی مرضی۔

برائے اشاعت غزل روانہ کی ہے۔ شاداب میں مناسب جگہ ملے گی ایسی توقع رکھتا ہوں۔

خیر طلب
مخلص معصوری

حمایت علی شاعر

اختر الزماں ناصر

(قسط دوم)

اقبال ایک بڑا ڈرامہ نگار بھی تھے۔ اور ڈرامہ نگار کی شخصیت میں اس کے کردار بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ بہت بلیغ بات تھی جو رفتہ رفتہ میرے ذہن میں اقبال شناسی کے نئے زاویے متعین کرتی گئی۔ وہ یہ تو بتا ہی چکے تھے کہ اقبال جن شعرا سے متاثر ہوئے۔ یعنی رومی سے لے کر دانتے تک۔ سبھی کا پیرایۂ اظہار حکایتی اور تمثیلی تھا۔ لہٰذا اقبال کے اسلوب کی تشکیل میں انھیں کے اثرات کارفرما ہے۔ پھر جب اقبال پر میرا مطالعہ بڑھا اور ان کی زندگی کے دوسرے پہلو سامنے آئے تو یہ نکتہ بھی سمجھ میں آیا کہ انسان کی شخصیت کے عناصرِ ترکیبی میں اُس کے اجداد کشمیری برہمن تھے اور اقبال کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر ناز بھی تھا:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رازآشنائے روم و تبریز است

اور جب ایک برہمن مسلمان ہوگا اند تو اس خدا پرستی کتنی شدید ہوگی۔ اس کا اندازہ علامہ اقبال کی خدا پرستی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن کر خدا کے حضور میں پیش کرنے کا لاشعوری محرک بھی یہی جذبۂ ایمانی تھا۔

علامہ اقبال کی "ابلیس نوازی" کا راز بھی اسی استقامتِ ایماں میں پوشیدہ ہے۔ روزِ ازل ابلیس کا انحراف بھی اُس کے "عشق" کا ثبوت تھا کہ عشقِ وحدت

پسند ہوتا ہے۔ دوئی اس کو تقسیم کر دیتی ہے:

نوری ناداں نیم، سجدہ با آدم برم

اور بہ نہاد است خاک من نژادم برم

یہاں یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ دونوں کے احساسِ فخر میں کیا قدرِ مشترک ہے۔ برہمن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ برہما کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ مسلمان بھی خود کو افضل ترین سمجھتا ہے۔ چنانچہ برہمن کے مسلمان ہو جانے سے برتری کا نسخہ ہو جاتا ہے۔ اقبال کی "ابلیس پسندی" میں ابلیس کے عشقِ بے پناہ" کے علاوہ اس کے آتش نژاد ہونے کا فخر بھی شامل ہے اسی فخر نے اس کے لہجے کو توانائی عطا کی۔ اقبال کے اندر بھی یہ توانائی اپنے اجداد کی قوتِ انکار سے آئی تھی کہ انھوں نے اپنا صدیوں کا مذہب بدل دیا اور مسلمان ہو گئے ـــ ان مخصوص نظموں میں ابلیس کی نفسیات سے ہم آہنگی کا جواز اسی قوتِ انکار و اقرار میں پوشیدہ ہے۔

یہ مضمون لکھتے ہوئے معاً مجھے خیال آیا کہ ۱۹۴۹-۵۰ء میں میں نے ممتاز اختر کے اخبار "ہمدرد" اور رسالہ "پرواز" (حیدرآباد دکن) میں ایک قلمی نام "ابلیس فردوسی" بھی اختیار کیا تھا ـــ اب سوچتا ہوں کہ یہ عجیب نام میں نے کیوں اپنایا تھا؟ ابلیس کو فردوسی قرار دینے کی جرأت آخر مجھ میں کہاں سے آگئی تھی! اس کے علاوہ میں نے دو قلمی نام اور بھی اختیار کیے تھے، "نزدوش" (شاہد ویکلی 'بمبئی) اور ابنِ مریم" (فکار 'کراچی اور لیل و نہار' لاہور)۔ میری اکثر نظمیں انِ ناموں سے شایع ہوئیں، جن میں سے کچھ "آگ میں پھول" کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۰ء) میں بھی شامل کر دی گئی ہیں ـــ سوچ رہا ہوں کہ ابلیس کا نزدوش" اور "ابنِ مریم" کی معنویت سے پسِ پردہ کیا تعلق قائم ہو سکتا ہے اور ان ناموں سے ابلیس کے فردوسی ہونے کی کون سی دلیل فراہم ہوتی ہے؟ کہیں میرے لاشعوری محرکات میں اختر صاحب کے اقبال اور ابلیس کے بارے میں دیے ہوئے لکچرز کے اثرات تو پوشیدہ نہیں تھے؟

اختر صاحب کی رفاقت میں اقبال شناسی کے جو نئے زاویے ملے، انھوں نے میری شاعری کو بہت فائدہ پہنچایا میری جستجو کو زیادہ جرأت ملی۔ میرے حرفِ اظہار میں جو بھی توانائی پیدا ہوئی ـــ میرے خیال میں یہ بھی مباحث کا نتیجہ ہے جو پبلک ہاوس اور ادبستان کی نشستوں میں زور و شور سے جاری رہتے اور کبھی کبھی اختلاف کی انتہا تک

پہنچ جاتے۔ اقبال کے ڈرامائی پہلو سے یاد آیا کہ اختر صاحب نے اس صنفِ ادب کو بنایا ہے۔ ان کی تازہ ترین تحریریں تو میرے سامنے نہیں البتہ ان کی ایک بہت پرانی تمثیل "نیا سوز" میرے پیشِ نظر ہے جو "نورس" (آذر نا اسفندار ۱۳۵۵ف ۔ ۱۹۲۵ء) میں شایع ہوئی تھی۔ اس تمثیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے کتنے متاثر تھے۔ اس تمثیل کے کردار علامتی ہیں اور اس کی زبان شاعرانہ اور فکر انگیز ۔ اکثر لفظیات بھی اقبال کے اشعار سے ماخوذ ہیں، لیکن اسی رسالے میں ان کی جو غزل شایع ہوئی ہے، وہ اقبال کے اثر سے بالکل پاک ہے :

چلے منہ موڑ کر یوں بے رخی سے
کہ میں بھی روٹھ جاؤں زندگی سے

سہلِ ممتنع میں یہ غزل داغ کے لہجے کی نمائندہ ہے۔ اگر اسے بھی میں اقبال ہی کی پیروی کا نتیجہ قرار دوں تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ اقبال نے داغ کے علاوہ اکبر الہ آبادی کا رنگ بھی اختیار کیا تھا۔ اختر صاحب نے بھی اس رنگ میں تھوڑی سی کوشش کی، اور اقبال ہی کے ترانے کی پیروڈی لکھ ڈالی ۔

کفیا نہیں میسر، ہندوستاں ہمارا
ہم گھاس کے نہ گھر کے سارا جہاں ہمارا
فاقوں کے سایے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
ڈھانچہ ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں ڈوبی اذاں ہماری
تنکے سے رک رہا ہے سیلِ رواں ہمارا
اقبال کا ترانہ بلے وقت کی اذاں ہے
ٹوٹے بھی تو غلط ہے خوابِ گراں ہمارا

لیکن جس طرح اقبال کی سنجیدہ مزاجی زیادہ دیر تک اکبر کا ساتھ نہ دے سکی اختر صاحب نے بھی غالباً اس پیروڈی کے بعد کچھ نہیں لکھا۔ وہ زیادہ تر غزل ہی لکھتے رہے۔ کبھی کبھی کوئی نظم لکھی تو اقبال کا لہجہ در آیا۔

دکن میں غزل گوئی کا مخصوص انداز داغ کے ترکے میں عام ہوا تھا۔ داغ نظامِ دکن میر محبوب علی خاں آصف کے استاد تھے۔ پھر جلیل مانک پوری اس منصب پر فائز ہوئے

اور یہ سلسلہ میر عثمان علی خاں تک جاری رہا۔ جلیل کا اسلوب بھی داغؔ سے مختلف نہیں تھا۔ استادِ شاہ ہونے کے سبب نہ صرف ایک مخصوص طبقے میں غزل کا یہ رنگ مقبول رہا بلکہ ہر طبقے کی پسند خاطر بن گیا تھا۔

دوسرا رویہ جوشؔ ملیح آبادی کے زیرِ اثر عام ہوا جسے ترقی پسند شعراء نے اپنا رکھا تھا۔ یہ رویہ نظیرؔ انیسؔ اور اقبالؔ سے ہوتا ہوا جوشؔ تک پہنچا تھا اور دکن کے انقلابی شاعر مخدومؔ کی آواز میں گونج رہا تھا۔ اس لئے اکثر غزل گو شعراء اس سے دور ہی رہتے تھے۔ رہی فانیؔ کی بات تو وہ مشکل پسند ہی نہیں، زندگی سے مایوس آدمی بھی تھے، نوجوان اس آواز سے اپنی آواز کیسے ملا سکتے تھے۔ داغؔ کے زیرِ اثر البتہ جو غزل ورثے میں ملی تھی اس میں موضوع کا چٹخارہ بھی تھا اور اندازِ بیان کی شوخی بھی۔ لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک کے تقاضے کچھ اور تھے۔ چنانچہ وہ غزل وجود میں آئی جسے فیضؔ اور مجروحؔ نے رواج دیا پھر حسن و عشق کی وہ شاعری جو حسرتؔ اور جگرؔ سے عبارت ہے۔

اخترؔ صاحب کی غزل بھی انہیں مدارج سے گزری۔ پہلے میرا خیال تھا کہ علامہ اقبال کی طرح اخترؔ صاحب بھی داغؔ کے اثر سے جلد ہی نکل آئیں گے مگر ایسا نہیں ہوا داغؔ بہت دور تک اخترؔ صاحب پر اپنا سایہ ڈالے رہے۔ علامہ اقبال سے وابستگی کا فیضان انہیں صرف اس حد تک پہنچا کہ کبھی کبھی ان کے موضوعات بدلتے رہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک چونکہ اپنے عروج پر تھی، اس لئے ترقی پسندی کی لہریں اگر ان کی غزل نے بھی زندگی کے عام مظاہر کی طرف دیکھا مگر ایسے محبوب کی طرح جو راستہ چلتے ہوئے کبھی نقاب الٹ کر ادھر ادھر دیکھ لے اور پھر پردہ کر لے۔ یہ حجاب عرصے تک ان کی غزل پر طاری رہا۔

دراصل غزل جس تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھی اس کی جڑیں معاشرے میں بہت گہری ہیں اور پھر حیدرآباد دکن تو اس تہذیب کا آخری گہوارہ تھا جو مخصوص سیاسی اسباب کی بنا پر دیر تک ہوا میں جھولتا رہا۔ یہ اور بات کہ اس کے جھولنے کے عمل سے یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ اس جھولے کی ڈوریاں بھی خستگی کے آخری مراحل میں ہیں۔

اورنگ آباد سے سکندر علی وجد کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد جن شعراء کے دم سے محفلِ شعر و سخن گرم تھی، ان میں درد کاکوروی، یعقوب عثمانی، آغا صادق سروش اور طپش فردوسی زندہ نمایاں تھے پھر منیر سروش بھی آگئے اور کچھ عرصے کے لئے صدق جائسی بھی۔ مگر یہ سب شعر اروایت پسند تھے۔ ان کی شاعری ایک سخن بدلا اور رنگ

نسل انھیں قریب تر محسوس کرنے لگی

اختر صاحب نے ابتداء میں درد کاکوروی سے اصلاح لی لیکن اپنی خداداد صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ کے نتیجے میں اتنا اچھا شعر کہنے لگے کہ استاد کی ضرورت باقی نہیں رہا۔ ہم لوگوں نے جب لکھنا شروع کیا تو اختر صاحب شہر کے اچھے اور مقبول شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے اور محفل پر چھا جاتے۔

اختر صاحب کی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے دو ایک باتیں اور کہنا چاہتا ہوں پہلی بات تو یہ کہ انھیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اُن کی غزل پڑھ کر پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی "اہلِ زبان" میں سے ہیں۔ گفتگو بھی ایسی شستہ اور نستعلیق انداز میں کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے دبستانِ لکھنو سے تعلق ہے۔ دوسری بات یہ کہ غیر معمولی مستقل مزاج ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ انھیں نہ ترقی پسندانہ روش نے فوری متاثر کیا اور نہ جدیدیت نے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو تجربات سے بھی بچایا ہے۔ آج کل تو شعری تجربہ فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہر شخص اس دُھن میں نظر آتا ہے کہ کوئی ایسا دھماکا کر دے کہ سب پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

اختر صاحب شاعری کو تماشا بنانے کی طرف پہلے راغب تھے نہ اب ہیں۔ وہ زندگی میں جتنے دوست دار اور محفل پسند ہیں، شاعری میں اتنے ہی خلوت پسند ہیں۔ شاعری ان کی نظر میں ایک سنجیدہ تخلیقی عمل ہے۔ جو باطنی حرکات کے تابع ہے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے جب تک درونِ ذات کوئی لہر نہ اُٹھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خارجی دنیا سے بے تعلق یا بے نیاز رہتے ہیں۔ وہ اسی ہم رشتگی کو سمجھتے ہیں۔ جو داخلیت اور خارجیت کے عمل اور ردِ عمل میں پنہاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل روایت کی شدید گرفت میں رہنے کے باوجود ان مسائل سے بے پروا نظر نہیں آتی جو زندگی کے حقیقی مسائل ہیں۔ حسن و عشق کے معاملات ہوں کہ ہجر و وصال کی کیفیات، سیاسی اور سماجی عوامل ہوں کہ انسانی نفسیات — ہر مسئلہ ان کی غزل میں اظہار کا پیرایہ تلاش لیتا ہے اور قرینے سے نمایاں ہوتا ہے۔ کہ نہ روایت کا دامن چاک ہوتا ہے نہ شعریت کا۔ یہ اور بات کہ اُن کی مخصوص لفظیات ہی بار بار استعمال کے سبب شعر کی دلکشی پر اثر انداز ہو جائیں۔

میرے سامنے اتفاق سے ان کا بہت مختصر کلام ہے۔ اس لئے ان کی شاعری

کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ چند غزلوں پر دی ہوئی تاریخوں کی روشنی میں البتہ ایک تدریجی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے ۱۹۴۲ء کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے (یہ غزل نورس میں شایع ہوئی تھی)۔

چلے منہ موڑ کر یوں بے رخی سے
کہ میں بھی روٹھ جاؤں زندگی سے

خدا سمجھے ہماری بے خودی سے
ابھی گزرا ہے کوئی پاس ہی سے

تمھیں اپنا کہا تھا عفو کر دو
خطا ہوتی نہیں کیا آدمی سے

خدارا کہے نکھرتے جا رہے ہو
مگر قاتل نہ بن جانا ابھی سے

چھپاتے تو ہو دل کا راز ناصر
اگر وہ تاڑ جائیں شاعری سے

غزل روایتی ضرور ہے مگر سادگی کے ساتھ ایک دل کش لہجہ بھی رکھتی ہے۔ کچھ اشعار سے داغ کا اثر بھی نمایاں ہے اس اثر کو سمجھنے کے لیے دونوں کے اشعار کا ایک ساتھ مطالعہ ضروری ہے ملاحظہ ہو:

بھنویں تنی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں۔
(داغ)

لبوں پہ مہر، جبیں پر شکن، نظر تلوار
جواب سوچ رہے ہیں مرے سوالوں سے
(اختر الزماں ناصر)

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
(داغ)

حسنِ عریاں اور یہ کافر شباب
لو سوا نیزے پہ آیا آفتاب
(ناصر)

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے
(داغ)

آنے پہ ہوئے آپ آمادہ، بیمار کو کچھ تسکین ہوئی
اب آپ بھلا کیا آئیں گے، بیمار کچھ اب اچھا بھی ہے
(ناصر)

اُردو غزل کا محبوب داغ تک آتے آتے کچھ بے حجاب ہو گیا تھا، وہ جس طبقے کا نمائندہ تھا، اس میں یہ بے حجابی ضروری بھی تھی لیکن اختر صاحب کی غزل میں محبوب کا سراغ ملتا ہے وہ متوسط طبقے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں حیا و شرم کے ساتھ ایک خاص ادائے دلنوازی ہے :-

چھیڑا ہے تمھیں نام مرا لے کے کسی نے
یوں ہی تو دہکتے نہیں رخسار کے لالے

○

اک میں ہی خوش نہیں تھا اظہارِ آرزو پر
چہرے پہ آپ کے بھی اک رنگ آ گیا تھا

○

یوں آپ نے محفل میں مجھ کو نہیں پہچانا
کیوں پھر بھی دہک اُٹھے عارض کے گلاب آخر

ظاہر ہے کہ یہ تہذیبی اقدار کا فرق ہے۔ حسرت موہانی کی غزل بھی انھیں اقدار کا آئینہ دکھاتی ہے۔ ان کا محبوب بھی داغ کے محبوب سے مختلف ہے۔ نتیجتاً اُن کا عشق بھی ایسے خاص آداب کا پابند ہے:-

دیکھنا بھی تو اسے دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

حسرت کی شاعری میں لذتِ دیدار تو اختر صاحب کی شاعری میں حسرتِ دید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ہجر کا کرب بھی محسوس ہوتا ہے:

دور تک جاتا ہوں اُن کو دیکھنے
اور کیا دوں دل کی دھڑکن کا جواب

اُتر رہی ہے بلندی سے چاندنی شاید
کہ تیرے چہرے سے آنچل ترا سرک گیا

○

جل رہے ہیں چراغ یادوں کے
رات بھر آج روشنی ہوگی

○

اب اُجالا ہے تو تم ہو روپوش
کتنا روشن تھا اندھیرا پہلے

○

مہر و ماہ و انجم کو یہ سمجھ کے تکتا ہوں
یہ نشان بھی شاید آپ کے قدم کے ہیں

اردو شاعری میں جو عشق میرؔ نے کیا ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ یہ عشق اپنی جگہ میں ایک تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے جسے تہذیبِ عشق کہہ سکتے ہیں۔ اس عشق کی بیتابی بھی دیدنی ہے اور اس کا تحمّل بھی :

وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ۔

اور

دور بیٹھا غبار میرؔ اُس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اختر صاحب کے عشق کا خمیر اسی تہذیب سے اٹھا ہے۔ لیکن بے تابی کا وہ عالم نہیں جو میرؔ میں تھا البتہ نشاطِ غم کی کیفیت ضرور ہے :

ترے غم سے محبت ہو گئی ہے
کہ اب جینے کی صورت ہو گئی ہے

○

ہمیں لحاظِ خاطر حفظِ ناموسِ محبت ہے
خوشی کی لوریوں میں [illegible]

چراغِ اشک طاقِ چشم میں کیوں کر کروں روشن
لہو کا قطرہ قطرہ آپ کے غم کی امانت ہے

اس اعتبار سے اختر صاحب میر کے قبیلے کے شاعر محسوس ہوتے ہیں مگر میر کی شاعری میں جو اداسی، جو کھویا کھویا پن ہے وہ اختر صاحب کی شاعری پر اس لئے محیط نہ ہو سکا کہ غالب ایسا ہوش مند شاعر بھی اختر صاحب پر اثر انداز ہے۔ وہ غالب کا لہجہ تو اختیار نہیں کرتے مگر اپنے انداز میں اُس کے تیکھے اور لطیف طنز کو اپنا لیتے ہیں:

تمہاری فکرِ مرہم کون کہتا ہے دکھاوا تھی
مرے زخمِ جگر کو بے سبب ہنسنے کی عادت ہے

اور کبھی وہ تیور بدل کر اپنے محبوب سے اس انداز میں بھی مخاطب ہو جاتے ہیں:

ہنس دو ترے کرم پہ لبِ زخمِ دل ابھی
ایسی ہنسی اب بھی مجھے اختیار ہے

غالب نے کہا تھا:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

اختر صاحب کا لہجہ اتنا تلخ تو نہیں ہوتا مگر ایک دکھ کے ساتھ وہ بھی کچھ بے نیاز سے ہو جاتے ہیں۔ لہجے میں انکار ہے مگر در پردہ جو کیفیت ہے اسے ہر احساس دل محسوس کر سکتا ہے:

کچھ ایسی ہی طبیعت ہو گئی ہے۔
محبت سے بھی نفرت ہو گئی ہے
خوشی تو کب کی رخصت ہو گئی ہے
مجھے جینے کی عادت ہو گئی ہے
کچھ ایسے ہو گئے خاموش ناکم
غموں سے جیسے فرصت ہو گئی ہے

عشق میں سکتے کا یہ عالم دراصل ایک شدید اضطراب کی طرف اشارہ کرتا اور جب عشق دو طرفہ ہو اور وصال کی کوئی امید نہ رہے تو ایک منزل وہ آجاتی ہے جہاں محرومی کا مقدر سمجھ لیا جاتا ہے ؎

اچھا ہے حسن و عشق کے قصے تمام ہوں
مجھ کو قرار ہے نہ تمھیں قرار ہے۔

لیکن اس جھنجھلاہٹ سے عشق کا قصہ تمام نہیں ہوتا۔ وہ بہ عنوانِ دگر جاری رہتا ہے اور غمِ زندگی بن جاتا ہے۔ اختر صاحب نے بھی اپنے عشق سے یہی کام لیا ہے۔ وہ فانی کی طرح قنوطی نہیں ہوگئے بلکہ میر کی طرح غم سے نشاط ہوا حاصل کرنے لگے اور پھر غالب کی طرح بے نیاز ہوکر انھوں نے اپنے عشق کو ایک قوت میں تبدیل کرلیا۔

شاید اس میں اقبال کا بھی فیضان شامل ہو:

جامِ غم سے پی شرابِ زندگی میری طرح
مات کے چہرے پہ مل جسے روشنی میری طرح
تجھ کو بھی حاصل ہو لطفِ زندگی میری طرح
غم بھی کھا میری طرح آنسو بھی پی میری طرح

○

موت تو ہر حال میں آئے گی ہی میری طرح
وار پر بھی پڑھ ترانۂ زندگی عیسیٰ کی طرح

ظاہر ہے کہ اب غمِ ذات 'غمِ دوراں' میں ڈھل چکا ہے۔ وہ ایک سماجی انسان کی طرح سوچنے لگے ہیں۔ ان کی نگاہ حالات پر بھی ہے اور اپنی قوم اور وطن پر بھی۔ اب ان کا مخاطب صرف محبوب نہیں بلکہ اپنا جیسا دوسرا آدمی بھی ہے۔ اب انھیں عرفانِ ذات حاصل ہو چکا ہے جو اُن کے سماجی شعور کی عطا ہے:

محسنِ چمن کا میں بھی تو نامور ہوں پاسباں
میری فغاں بھی چبھتی ہوئی نوکِ خار ہے۔

○

یہ سچ ہے شکستہ، زار و زبوں ہے آج سفینہ ناصر کا طوفاں سے ٹکرا الجھا بھی تو ہے،
موجوں سے بہت کھیلا بھی تو ہے

علامہ اقبال ہی کی انگلی پکڑ کر اختر صاحب شعر و ادب کے راستے پر آئے تھے اور انھیں کے تتبع میں داغ کے انداز میں غزل کہنا شروع کی تھی۔ داغ کے اثر سے نکل تو گئے مگر رہتے عشق کے ہاتھوں کبھی میر کے کلبۂ احزاں میں چلے گئے تو کبھی حسرت کے گلستاں میں آگئے مگر ہر جگہ اُن کی آواز اپنے لہجے کی پابند رہی جس میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ اقبال کی رجائیت ایک زیریں لہر کی طرح رواں دواں ہے:

محبوب ہو تجھی کو اندھیرا تو کیا علاج
سورج کی ہر کرن ترا انتظار ہے

o

ترے چمن کے گل و لالہ کیوں نہ پھیکے ہوں
کہ تیرے خونِ جگر کا ہی رنگ مدھم ہے

o

جرأتوں پہ ہیں میری دم بخود فلک والے
فاصلے ستاروں کے ایک دو قدم کے ہیں

اقبال کی زمین میں بھی دو شعر ملاحظہ کیجئے :

دل ہی گیا رندوں کو توبہ کا ثواب آخر
لیجے وہ ہوا اسکی وہ چھائے سحاب آخر
پندارِ خودی تا کہ لوٹا نہ گیا ہوں کا
خود پھونک دیے بڑھ کر طوفوں نے حجاب آخر

اقبال کے سائے میں نہ صرف ان کا اسلوب بدلا بلکہ الفاظ بھی لیکن اختر صاحب چونکہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اپنے طرزِ ادا کو بالکلیہ علامہ اقبال کے تابع نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اسلوب کی تبدیلی کے باوجود غزل کی روایت کا پاس رکھا ہے۔

سراج اورنگ آبادی کے تین سو سالہ جشن کے مشاعرے میں انھوں نے جو غزل سنائی وہ حسرت کو چھوکر گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے :

پھول مہکے ترے آنے سے میرے آنگن میں
قید تھیں نکہتیں شاید ترے پیراہن میں
آمدِ فصلِ بہاری ہے کہ تم آئے ہو
لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے ہوا گلشن میں
اور کیا ہوگی پذیرائی جنوں کی تا حکم
ایک بھی تار سلامت نہ رہا دامن میں

اس غزل میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو اپنے عہد کی جدید ترین شاعرانہ روش

پر تنقید کے مترادف ہے:

جدتِ طبع کو اس طرح نہ بدنام کرو
فرق رہنے دو ذرا سا تو فریب دفن میں

یہ تنقید جس حد تک جدید تر شاعری پر صادق آتی ہے اتنا ہی قدیم پر بھی کیونکہ "فریب، دفن" میں جو فرق ہے وہ کبھی کبھی "فریب" "فن" کے ہم معنی بھی ہو جاتا ہے۔ قدیم اساتذہ نے لفظی ہنرکاری کے شوق میں شاعری کو الفاظ کا گورکھ دھندا بھی بنا رکھ دیا تھا۔ غیر فصیح محاورہ بندی، دور از کار تشبیہات، غیر مانوس تراکیب اور ایک ہی قسم کے الفاظ کی تکرار — یہ سب طریقے شاعری جیسے لطیف انداز پر بوجھ ڈالنے کے مترادف ہیں۔ اردو شاعری کا بیشتر حصہ اسی غیر فطری عمل سے متاثر ہوا ہے۔ شعر گوئی لاشعوری تخلیقی محرکات کی پابند سہی لیکن اس میں الفاظ کا انتخاب شعوری اور اختیاری ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے احساس یا خیال کی نزاکت کے مطابق لفظی پیراہن تیار کرنا چاہیے۔

اختر صاحب الفاظ کے استعمال میں احتیاط سے ضرور کام لیتے ہیں مگر ان کی کلاسیکیت پسندی اور لسانی صنعت کاری کبھی کبھی ان کے اشعار کو بوجھل بھی بنا دیتی ہے بالخصوص شاذ الفاظ کے استعمال سے بعض اوقات ان کا اچھا شعر بھی مصنوعی محسوس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً

نسیمِ صبح قدم پھونک پھونک کر رکھنا
کلیجہ منہ کو نہ آجائے نونہالوں کا

○

آسماں سے صحن میں اتری تو کوٹھوں پر چڑھی
ڈھونڈتی پھرتی ہے تم کو چاندنی میری طرح

اسی طرح بعض تراکیب اور چند مخصوص الفاظ کی تکرار ان کی شاعری کو بار بار اسی فضا میں پہنچا دیتی ہے جس سے وہ بڑی حد تک باہر نکل آئے ہیں۔ غالباً اختر صاحب کو خود بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان کی شاعری وقت کے تقاضوں کی ہم رکاب نہیں رہی۔ کہتے ہیں:

میری غزل فسانۂ عہدِ بہار ہے
پچھلے پہر کی پی ہوئی مے کا خمار ہے

اور اسی لئے وہ بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں:

انداز اب غزل کے سمجھتے نہیں ہیں لوگ
کیا خاک میں ملی ہیں مری دُر فشانیاں

مجھے اس بات سے اتفاق نہیں کہ ان کی درفشانیاں خاک میں مل گئیں۔ ان کے قدر داں اب بھی ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کی غزل کو نوکلاسیکیت کے حوالے سے اپنے عہد کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ان کی شہرت کے محدود ہونے کا تعلق ہے، اس میں سبب ان کی اپنی وہ بے نیازی ہے جو انھوں نے ساری عمر اختیار کر رکھی۔ ان کا کلام بہت کم شائع ہوا اور مشاعروں میں بھی وہ اورنگ آباد کے قرب و جوار سے آگے نہیں گئے۔

میں تو خیر بہت دور ہوں لیکن جو احباب صبح و شام ان کی رفاقت سے فیض پا رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ان کے کلام کو محفوظ کر دیں۔ اب سنا ہے کہ اورنگ آباد میں اختر کا جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور ان کا کلام بھی مرتب کر لیا گیا ہے۔

خدا کرے وہ دن جلد آئے اور مجھے بھی اس میں شرکت کی سعادت نصیب ہو۔

میرؔ نے کہا تھا:

تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

چنانچہ غالبؔ آیا، پھر اس نے بھی بڑی حسرت سے ایک خواہش کا اظہار کیا:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

اب اختر الزماں ناصرؔ نے ایک مژدہ سنایا:

پی خون کے چھینٹے دے دے کر کانٹوں پہ کھلائے لالہ و گل
مژدہ ہو تجھے اے دشتِ جنوں اک آبلہ پا ایسا بھی تو ہے

میں نہیں کہہ سکتا کہ اختر صاحب کا اشارہ کس طرف ہے۔ اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ وغیرہ یا اپنے "زمان و مکاں" کے حدود میں انھوں نے خود اپنی شخصیت کا احساس دلایا ہے:

گل کے رخ پہ پسینہ مرا چمکتا ہے
ہر ایک پھول سے میرا لہو ٹپکتا ہے

اور یہ دعویٰ غلط بھی نہیں۔ میں اختر الزماں ناصرؔ کو اورنگ آباد کی ادبی تاریخ میں نوکلاسیکیت کا آخری اور اس کے دورِ جدید کا حرفِ آغاز سمجھتا ہوں اور اپنے اہلِ وطن سے کہتا ہوں۔ ؎

ناصرؔ سے کچھ نہ کچھ تو تعلق ہے آپ کو
انعام غیر کو سہی، اس کو سزا تو دیں۔

★ ★

جی او ایم ایس نمبر ۱۴۳ مورخہ ۴/جولائی ۱۹۷۷ء

قانون سرکاری زبان بابتہ ۱۹۶۶ء آندھراپردیش کی دفعہ ۷ کے مطابق محصلہ اختیارات کے تحت گورنر آندھراپردیش حکم دیتے ہیں کہ مندرجہ ذیل اغراض کے لئے اُردو کو تلگو کے علاوہ بھی استعمال کیا جائے۔

۱۔ بعض خدمات مثلاً سکریٹریٹ منسٹریل اور جوڈیشیل منسٹریل خدمات پر راست تقرر کے لئے اردو کو علاقائی زبان کی طرح استعمال کیا جائے۔

۲۔ گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ خدمات کے دوسرے لسانی زبان کے امتحان میں اردو کا امتحان دوسری زبان کے طور پر لیا جائے۔

۳۔ تلنگانہ کے تمام نو ۹ اضلاع اور اضلاع گنٹور، کرنول اور کڑپہ میں منسٹریل اور جوڈیشیل منسٹریل سروسس میں بھرتی کے لئے اُردو سے واقفیت کو بھی علاقائی زبان سے واقفیت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

۴۔ کسی عہدہ پر ترقی کے لئے تلگو ٹسٹ میں کامیابی زائد قابلیت کے طور پر ضروری ہوگی۔ ایسی جائیدادوں پر ایسے اُردو داں ملازمین کی ترقی پر غور کیا جاسکتا ہے جنھوں نے تلگو ٹسٹ کامیاب نہیں کیا لیکن ایک مقررہ مدت کے اندر وہ تلگو ٹسٹ کامیاب کرنے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

۵۔ اُردو درخواستوں کا جواب اُردو میں دیا جائے۔

۶۔ ایسے اضلاع یا علاقوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی آبادی ۱۰ فیصد ہو۔ اہم قوانین، قواعد اور ضابطے اور اعلانات اُردو زبان میں جاری کیئے جائیں۔

۷۔ ایسے مقامات پر جہاں اُردو پڑھنے اور اُردو بولنے والوں کی بڑی تعداد ہو وہاں سائن بورڈز اُردو میں لکھے جائیں۔

۸۔ ابتدائی اور تحتانوی مدارس میں جہاں ایک جماعت میں کم از کم دس طلباء یا ایک مدرسہ میں ۴۰ اُردو طلباء ہوں وہاں اُردو میں تعلیم دی جائے اور فوقانوی مدارس میں جہاں کم از کم ۶۰ اُردو طلباء ہوں وہاں چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک یا ساتویں جماعت سے نویں جماعت تک اُردو ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۹۔ تحت کی عدالتوں سے لیکر آندھراپردیش ہائی کورٹ کے دیوانی اور فوجداری مقدمات میں اُردو ہی استعمال کی جائے۔ مندرجہ ذیل اضلاع کی عدالتوں میں دیوانی اور فوجداری مقدمات میں اُردو بھی استعمال ہو۔ اننت پور۔ کریم نگر۔ کھمم۔ محبوب نگر۔ کڑپہ۔ کرنول۔ عادل آباد۔ حیدرآباد۔ میدک۔ نلگنڈہ۔ نظام آباد۔ اور ورنگل۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تعلیمی پروگرام

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں میں ناخواندگی کے خاتمہ اور مسلم طلباء میں مختلف شعبوں میں تکنیکی تعلیم کے فروغ کے لئے ایک زبردست پروگرام مرتب کیا ہے۔ اکیڈیمک کونسل کی جانب سے منظورہ ۷ نکاتی پروگرام میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ "ریزیز" قومیائے بنکوں عوامی شعبوں اور دیگر اداروں کی جانب سے مستحقہ مسلم امیدواروں کو روزگار کی فراہمی کی غرض سے بھرتی کے مراکز کے قیام کے لئے یونیورسٹی کو مرکز سے ربط پیدا کرنا چاہیے۔ وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے ۱۵ نکاتی پروگرام میں ہدایت دی گئی ہے کہ عوامی شعبہ کے محکمہ جات میں مسلمانوں کو کافی نمائندگی دی جائے۔ حکومت نے سرکردہ شخصیتوں کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے تاکہ وہ مسلمانوں کی ترقی اور ان میں تعلیم کے فروغ کی تجاویز پیش کر سکے، پروفیسر محمد شفیع کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کا اصل مقصد اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کل ہند کردار کو کس طرح بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس امر کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ ملک بھر سے مسلم طلباء کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تاکہ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا تحفظ کیا جا سکے ممتاز... شخصیتوں پر مشتمل اس کمیٹی نے جس میں پروفیسر علی محمد خسرو، پروفیسر رئیس احمد صابق نائب صدر نشین یو جی سی بھی شامل ہیں۔ اس بات پر زور دیا ہے کہ یونیورسٹی امیدواروں کے روزگار کے امکانات میں بہتری کے لئے روزگار پر مبنی مختصر مدتی کورسس کا آغاز کرے۔ "علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس ویلفیر فنڈ" کے قیام کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ہر ضرورت مند ذہین طالب علم کو مالی امداد کی جا سکے۔ یونیورسٹی نے ایک سنٹر کے قیام کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ملک میں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور تہذیبی پسماندگی کے اسباب کا پتہ چلانے اور اس پر قابو پانے کے لئے سروے کیا جا سکے۔ مرکز اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے وقفہ وقفہ سے اقلیتوں کی بھلائی کے لئے کئے گئے پالیسی پروگراموں کی عمل آوری میں نقائص کے علاقوں کی نشاندہی میں مددگار ثابت ہوگا۔ یونیورسٹی دینی مدرسہ سے گریجویٹس کے لئے مراسلاتی کورس شروع کرے گی تاکہ یہ لوگ مزید عصری مضامین کی تعلیم حاصل کر سکیں اور روزگار کی صلاحیت میں اضافہ کی حامل ڈگریاں حاصل کر سکیں۔

ابتدائی اور بالغوں کی تعلیم کے لئے نئی مہم

یکم مئی ۱۹۸۸ء کو وزیر اعظم کے ہاتھوں افتتاح

ہمارے ملک میں تعلیم کی عام شرح خواندگی سنہ ۱۹۵۱ء میں ۱۶.۶۷ فیصد اور ناخواندہ لوگوں کی کل تعداد تیس کروڑ تھی۔ سنہ ۱۹۸۱ء شرح خواندگی بہتر ہو کر ۳۶.۲۳ ہوئی لیکن ناخواندہ لوگوں کی تعداد بھی بڑھ کر ۴۳(۴۳) کروڑ [illegible] لاکھ ہوگئی۔ اس کی وجہ ملک کی آبادی میں کثیر اضافہ ہے۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے تعلیم کو عام کرنے کی کوششوں میں تیز تر کرنا ضروری ہے۔ اسی غرض سے پرائمری تعلیم کو مزید فروغ دینے کے علاوہ بالغوں کے لئے ایک خصوصی قومی خواندگی مشن شروع کیا جارہا ہے۔ جس کا منشا اس صدی کے اختتام تک آٹھ کروڑ بالغوں کو خواندہ بنانا ہے۔ [illegible] یکم مئی کو وگیان بھون دہلی کی ایک خصوصی تقریب میں وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی خوا[illegible] کا علامتی چراغ روشن کرکے اس مشن کا افتتاح کرینگے۔ اس کے ساتھ کام چلاؤ خواندگی کا [illegible] اجتماعی پروگرام بھی شروع کیا جائیگا۔ اس سارے پروگرام میں تقریباً پانچ لاکھ رضاکار طلبا [illegible] کے علاوہ نیشنل کیڈٹ کورس (NCC)، نیشنل سروس اسکیم (NSS)، نیشنل یوتھ کیندر (NYK) اور بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائیڈز کے ارکان شامل ہونے کی امید ہے۔

ملک میں ایک ہزار جن شکشا نیلائم قائم کئے جائینگے جہاں ریڈنگ روم، لائبریری، طلباتی مرکز وغیرہ کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ یہ ادارے بالغوں کے معیار خواندگی کی اصطلاح [illegible] لئے شبانہ کلاسوں کے علاوہ ایسی تبادلہ خیال کے لئے چرچہ منڈل بھی شروع کرینگے اور کھیل کود، تفریحات اور ثقافتی سرگرمیوں کی بھی حوصلہ افزائی کرینگے۔ ایک نیلائم کے حلقۂ عمل میں چار پانچ ہمسایہ دیہات کی تقریباً پانچ ہزار کی آبادی ہوگی۔ نیلائم کے ادارے کا ایک خاص مقصد ایسے بالغوں کے لئے کشش اور دلچسپی کا سامان مہیا کرنا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ مرکزی محکمہ تعلیم کے سیکریٹری [illegible] نے بتایا کہ ۳۱ [illegible] کی تکنیکی ضرورتیں خاطر خواہ انداز [illegible] پوری کی جائینگی، بلاک بورڈ اور [illegible] اصلاح شدہ ہونگے۔ سلیبس نئے سامان [illegible] بنی ہونگی، تعلیم اغراض کے لئے استعمال ہونیوالا سامان اچھی قسم کا ہوگا۔ جہاں بجلی کا انتظام نہ ہوگا، وہاں شمسی توانائی سے روشنی پیدا کرنے والے

مہیا کئے جائینگے۔ اندازہ ہے کہ مشن کے مختلف پروگراموں کے لئے ۱۹۹۰ء تک کل ساڑھے پانچ کروڑ روپیئے صرف کئے جائینگے۔ جن میں سے تین کروڑ چالیس لاکھ روپیے مرکز اور دو کروڑ دس لاکھ روپیے ریاستیں خرچ کرینگی۔ ابتداء میں ملک کے چالیس اضلاع کا انتخاب کیا گیا ہے، ان تجربوں سے استفادہ کے بعد دوسرے حصوں میں توسیع دی جائیگی۔

خواندگی کے اعتبار سے ملک کی مختلف ریاستوں کے معیار میں بہت فرق ہے۔ جہاں کیرالا میں ملک کی اعلیٰ ترین شرح خواندگی (۷۰) فیصد ہے، وہیں آندھرا پردیش میں یہ شرح صرف آٹھ فیصد ہے۔ یقین ہے کہ چالیس اضلاع کے ابتدائی انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہوگا۔

ایک نہایت اہم بات جو طے کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہر علاقہ میں ۱۵ تا ۳۵ سال کے ناخواندہ لوگوں کو تعلیم اس زبان میں دی جائیگی جو وہ بولتے ہیں اردو والوں کے لئے ایک بہتر موقع ہے کہ وہ اس لئے قومی خواندگی مشن سے بھرپور استفادہ کی کوشش کریں اور اپنی تعلیمی پستی کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

اسلام ہی:۔ ریاست کے ایک ہندو مسٹر (شیو بھانو سولنکی) نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ جن کا مجھ کو ذاتی تجربہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام سے خود میرے گھر کو ایک فائدہ ہوا۔ میرے ایک لڑکے نے انڈسٹری لگانا چاہا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی وہ میں نے ان کو دے دی۔ مگر یہ رقم کم تھی۔ مزید سرمایہ فراہم کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے کہا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں سود لینا حرام ہے۔ اس لیے میں رقم تو دوں گا، مگر سود نہیں لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ہم کو بلاسودی قرض دے دیا۔ اگر میرا لڑکا بینک سے قرض لیتا تو اس کو کافی سود دینا پڑتا، مگر مسلمان کے ذریعہ اس کو سود کے بغیر قرض مل گیا۔ اس طرح خود میرے گھرانے اسلام کے ایک فائدہ کا تجربہ کیا۔

اسی طرح انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھ کو یہ بہت اچھی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہترین یوگا ہے۔ اس سے آدمی کی عبادت بھی ہوتی ہے اور اس کا آسن بھی پورا ہو جاتا ہے۔ نماز سے وہ بھی ملتا ہے جو روح کو ملنا چاہیے اور وہ بھی ملتا ہے جو سریر کو ملنا چاہیے۔

الرسالہ سے ماخوذ

دے کر پانا

ڈاکٹر تارا چند کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "ہندوستانی کلچر پر اسلام کے اثرات" سوا تین سو صفحہ کی یہ کتاب ایک مفید اور منصفانہ کتاب ہے اور ہر شخص کو اسے پڑھنا چاہیے اس کتاب کے ایک حصہ میں فاضل مصنف نے دکھایا ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان تاجر جنوبی ہند کے ساحل پر اترے تو یہاں ان کو زبردست اہمیت (Great Importance) حاصل ہو گئی مقامی لوگوں نے ان کو "ماپلا" کا خطاب دیا جس کے معنی عظیم فرزند کے ہوتے ہیں. تقریبات کے موقع پر مسلمان نمبوتری برہمن کے ساتھ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا۔ جو اس وقت نائر لوگوں کو بھی حاصل نہ تھا۔ (۳۵) وغیرہ وغیرہ۔

کالی کٹ کے راجہ زمورین نے ان عرب مسلمانوں کی غیر معمولی قدر و منزلت کی حتیٰ کہ اس نے واضح طور قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ اسے اپنے ان جہازوں کے لئے کارکن مل سکیں جن پر اس کی عظمت و ترقی کا انحصار تھا۔ اس نے یہ حکم دے دیا کہ اس کی مملکت میں ماہی گیروں کے ہر گھرانے میں سے ایک یا دو مرد افراد کی تربیت مسلمان کی حیثیت سے کی جائے۔

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ عرب مسلمان جہازرانی میں ساری دنیا پر فوقیت رکھتے تھے۔ اپنی اس امتیازی خصوصیت کے ساتھ جب وہ ہندوستان کے ساحل پر اترے تو یہاں کے ذمہ داروں کو محسوس ہوا کہ وہ ہماری بحری ضرورت ہیں۔ ان کے ذریعہ ہم اپنی ترقی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ ابتدائی مسلمان اہل ہند کے لیے قیمتی سرمایہ بن گیے۔ انھوں نے دوسروں کو دیا۔ اس لئے دوسروں نے بھی انھیں دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف دوسروں سے مانگ رہے ہیں۔ اس لئے وہ ابتک پانے والے بھی نہیں بنے۔ موجودہ دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے نہ کہ مانگنے والے کو۔

الرسالہ سے ماخوذ

ماہنامہ شاداب حیدرآباد — مئی ۱۹۸۸ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی کی جانب سے سالِ رواں کے لیے انعامات کا اعلان

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی کی جانب سے سالِ رواں کے لیے مندرجہ ذیل شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، خوشنویسوں کو انعامات سے نوازا گیا ہے، جس میں اس سال کا آل انڈیا قومی اردو انعام جناب اندر ناتھ اشک، گیارہ ہزار روپے اور آل مہاراشٹر خصوصی انعام محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ، پانچ ہزار روپے دیا گیا باقی انعام یوں ہیں۔

شاعری

اول انعام - دشتِ بے تمنا - قیصر الجعفری (بمبئی) 4000/-
دوم انعام - ترکیہ - نسیم شہزاد (مالیگاؤں) 3000/-
سوم انعام - (الف) سطحِ حیات - احسن رضوی (مرحوم) 2000/-
(ب) صحرا کی دھوپ - ساحر شیوی (رتنگری) 2000/-

افسانوی ادب

اول انعام - معبّر - سلام بن رزاق (بمبئی) 4000/-
دوم انعام - میرا کھویا ہوا ہاتھ - سلطان سبحانی (مالیگاؤں) 3000/-

بچوں کا ادب

اول انعام - کسی کو نہیں،
دوم انعام - جنگل کی امانت - وکیل نجیب (کامٹی) 2000/-

عام ادبیات

اول انعام - کسی کو نہیں،
دوم انعام - نقشِ جمیل - مولانا محمد حنیف ملی (مالیگاؤں) 3000/-
سوم انعام - دشتِ شعا - ڈاکٹر مرزا انور بیگ (ممبئی) 2000/-
سوم انعام - تاریخِ ہند کا المیہ - محمد ضیاء الحق خان (بلاپور) 2000/-

تنقیدی / علمی

اول انعام - اردو ڈرامہ میں کے لسانی اثرات - عصمت جاوید (اورنگ آباد) 4000/-
دوم انعام - ڈاکٹر منظر حسین - دو لفظ شخصیت و کار نامے - محبوب راہی (اکولہ) 3000/-
سوم انعام - دور بہ میں شاعری - ڈاکٹر ایم آئی ساجد (ودربھ کاؤں) 2000/-

اردو صحافت (۱) حسن کمال (بلٹز، بمبئی) 3000/-

باقی برصفحہ ۵۵

علم و ادب کی دنیا میں گراں قدر اضافہ

ایڈوانسڈ ٹوینٹیتھ سنچری (انگریزی سے انگریزی اور اردو ترجمہ)

یہ لغت انگریزی زبان کے ۳۵۰۰۰ ہزار متداول الفاظ اور ۲۵۰۰ محاوروں کی وضاحت پر مبنی ہے۔ اس میں معانی کے ہر پہلو کی بہت آسان لفظوں میں تشریح اور بے شمار مترادفات کا فر[illegible] مہیا کیا گیا ہے۔ صفحات ۸۰۸ سائز ٢٠×٣٠/٨ قیمت ۱۵/- روپے ڈیلکس ۱۶/- روپے۔

اسٹینڈرڈ ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (اردو سے انگریزی)

تقریباً ۵۰۰۰۰ ہزار اردو الفاظ و محاورات کی آسان تشریح اور موزوں ترین انگریزی مترادف مہیا کرنے والی یہ مستند لغت عہد حاضر کا گراں قدر تحفہ ہے۔

صفحات ۶۹۶ سائز ٢٠×٣٠ قیمت ۱۵/- روپے ڈیلکس ۱۶ روپے۔

اسٹوڈنٹس ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (انگریزی سے انگریزی اور اردو ترجمہ)

انگریزی الفاظ اور اردو مترادفات کا یہ انمول [illegible] اسکول اور کالج کے اساتذہ طلبا کے لیے یکساں مفید ہے۔

صفحات ۵۷۸ سائز ٢٠×٣٠/١٦ قیمت ۲۵۰/- روپے

کنسائز ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (اردو سے انگریزی)

اس بے حد مفید لغت میں دس ہزار سے زائد اردو الفاظ کے انگریزی مترادفات درج ہیں اسکول اور کالج اساتذہ اور طلبا کے علاوہ عام شائقین کے لیے بھی مفید ہے۔

صفحات ۲۰۷ سائز ٢٠×٣٠/١٦ قیمت ۳۰/- روپے

نیم پاکٹ ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (انگریزی سے انگریزی اور اردو ترجمہ)

جیبی سائز کی یہ جدید ترین لغت اسکول، کالج، دفتر اور گھر میں روزمرہ استعمال ہونے والے ۱۶ ہزار انگریزی الفاظ کے انگریزی معنی پر مشتمل ہے۔

صفحات ۴۸۰ سائز ٢٠×٣٠/٣٢ قیمت ۱۲ روپے

نیم پاکٹ ٹوینٹیتھ سنچری ڈکشنری (اردو سے انگریزی)

اسکول کالج دفتر اور گھر میں استعمال ہونے والے اردو کے تقریباً ۱۶ ہزار الفاظ

اور بنیادی الفاظ کے انگریزی معنی کا یہ خزینہ ہر وقت آپ کی جیب میں رہ سکتا ہے صفحات ۸۰۴
سائز ۲۰×۳۰/۳۲ قیمت ۱۲/ روپے

ڈکشنری ہندوستانی اینڈ انگلش (اردو، ہندی، انٹو انگلش)

یہ بہت سی لغت کا مجموعہ ہے اس میں عربی فارسی کے علاوہ سندی اور سنسکرت کے الفاظ کا ذخیرہ اردو فارسی و ہندی کی متداول کتابوں سے تلاش کرکے جمع کیا گیا ہے۔

صفحات ۸۱۶ سائز ۲۰×۳۰ قیمت ۲۲۵/ روپے۔

جامع فیروز اللغات اردو ۸ (نیا ایڈیشن)

جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ

اردو کا جامع اور مستند لغت۔ ایک لاکھ چالیس ہزار سے زیادہ قدیم و جدید الفاظ و محاورات ضرب الامثال، علمی، ادبی، فنی و سائنسی اصطلاحات کے تفصیلی معانی مع صحیح تلفظ، محاورے، ضرب الامثال اور اصطلاح کے تشریح کی گئی ہے صفحات ۱۴۸۰ سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۵۰۰/ روپے

جدید عصری لغت (اردو باتصویر)

پچاس ہزار سے زائد الفاظ و محاورات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی اس لغت میں الفاظ کے مختلف معانی، محل استعمال تذکیر و تانیث اور معیاری تلفظ درج کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور تصاویر کے ذریعہ بھی اسماء کی جابجا وضاحت کی گئی ہے اسی باعث یہ لغت تہذیب و تاریخ کی اہم ترین علامتوں کا البم بھی بن گئی ہے۔

صفحات ۸۴۸ سائز ۱۷×۲۷ قیمت ۲۵۰/ روپے

مستند تعلیمی عربی اردو، اردو عربی لغت

یہ لغت عربی زبان کی معتبر ترین قدیم و جدید لغات سے کشید کیا ہوا ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جس کی مہک سے عربی کے طلبا اور علما دونوں ہی فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لغت کے نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی الفاظ کے اردو معانی اور اردو الفاظ کے عربی معانی دونوں شامل ہیں۔

صفحات ۸۰۴ سائز ۱۸×۱۶/۱۶ قیمت ۱۸۰/ روپے

جلبی تعلیم اللغات (اردو)

اردو کے بیس ہزار سے زیادہ الفاظ کے معانی پر مشتمل یہ لغت اردو پڑھنے

اور پڑھانے والوں کی بہترین دوست ہے۔ اس کے تمام الفاظ پر اعراب لگائے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ کیا جاسکے۔ ہر اسم کی تذکیر و تانیث بھی درج کی گئی ہے۔

صفحات ۷۹۸ سائز ۳۰×۲۰/۳۲ قیمت ۱۲/- روپے

فیروز اللغات جدید اُردو (نیا اڈیشن)

اس لغت میں پچھتر ہزار سے زیادہ متداول الفاظ کے معنی اور تلفظ اصطلاحات مرکبات، محاورات، ضرب الامثال نہایت واضح اور جامع طریقے سے درج کئے گئے ہیں۔ سائنسی، فنی، تکنیکی اور دفتری اصطلاحات بھی اس میں شامل ہیں

صفحات ۱۳۴۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۳۵/- روپے

نوٹ: اس کے علاوہ ہر قسم کی ادبی، اصلاحی اور مذہبی معیاری کتابوں کے حصول کا مرکز مکتبہ شاداب 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ -

	(2) خلیل زاہد۔ (اخبار عالم، بمبئی) -/3000
خوشنویسی،	شمس بابادی ۔ (اردو ٹائمز) -/2000
	فتحیاب عالم ۔ (انقلاب) -/2000
	ایوب انصاری ۔ (ناگپور) -/2000
طنز نگاری	(1) سعید انصاری ۔ (انقلاب) -/2000
	(2) عتیق انصاری ۔ (بمبئی) -/2000
مالی اعانت،	(1) احسن یوسف زئی (مرحوم) بیڑ -/3000
	(2) نزاکت فیضی (ملکاپور) -/3000
اردو مراٹھی ادبی خدمات،	م، خ، شاذلی (ناندیڑ) -/4000

بی. ایم خان

انڈر سیکریٹری اردو اکاڈمی

قاضی سجاد حسین نثری ترجمہ

غزل

حافظ

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
اے صبا! نرمی سے اس ہرن سے کہہ دے
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
تو نے ہی ہم کو کوہ و بیاباں کے حوالہ کر دیا ہے

بشکر آنکہ تو ئی بادشاہِ کشورِ حسن
اس بات کے شکریہ میں کہ تو ہی مملکتِ حسن کا بادشاہ ہے
بیاد آر غریبانِ دشت و صحرا را
دشت و صحرا کے پردیسیوں کو یاد رکھ

شکر فروش کہ عمرش دراز باد چرا
شکر فروش (خدا کرے اس کی عمر دراز ہو) کیوں
تفقدے نکند طوطیٔ شکر خا را
شکر خور طوطی پر مہربانی نہیں کرتا ہے؟

غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل
اے پھول! شاید حسن کے غرور نے اجازت نہیں دی
کہ پرسشے نکنی عندلیبِ شیدا را
جو تو عاشق بلبل کی پرسش نہیں کرتا ہے

بحسنِ خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر
اہلِ نظر کو حسنِ اخلاق کے ذریعہ شکار کیا جا سکتا ہے
بدام و دانہ نگیرند مرغِ دانا را
سمجھدار پرندوں کو جال اور دانے کے ذریعہ نہیں پکڑتے ہیں

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
جب تو دوست کے ساتھ بیٹھے اور شراب نوشی کرے
بیاد آر حریفانِ بادپیما را
تو آوارہ دوستوں کو بھی یاد کر لیا کر

ندانم از چہ سبب رنگِ آشنائی نیست
نہ معلوم دوستی کا رنگ کیوں نہیں ہے
سہی قدانِ سیہ چشم و ماہ سیما را
سیدھے قد والوں، کالی آنکھ والوں، چاند جیسے چہرے والوں میں

جز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب
تیرے حسن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں بتایا جا سکتا ہے
کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را
کہ حسین چہرے میں مہر و وفا کا تل ہی نہیں ہے

در آسماں چہ عجب گر ز گفتۂ حافظ
کوئی تعجب نہیں اگر حافظ کے کلام کو آسمان میں
سماعِ زہرہ برقص آورد مسیحا را
زہرہ ستارہ کا مسیحا کو وجد میں لے آئے

محمد احتشام الدین حقی دہلوی

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را

منظوم ترجمہ غزل حافظ

صبا! یہ کہنا ذرا اُس غزال رعنا سے
کہ خوب ٹھوکریں کھلوائیں کوہ و صحرا سے

جیے الٰہی اگرچہ دریغ رکھتا ہے
شکر فروش شکر طوطی شکر خا سے

غرورِ حُسن نے روکا مگر تجھے اے گُل
کہ بات کرتا کوئی عندلیبِ شیدا سے

ہے صید اہل نظر حُسن خلق سے ممکن
چھپاتے دام ہیں صیاد مرغِ دانا سے

جو بیٹھو یارے و معشوق تو سمجھ لینا
ہمیں بھی اپنے حریفانِ بادہ پیما سے

الٰہی چھوٹ گیا رنگ آشنائی کیا
سہی قدان سیہ چشم ماہ سیما سے

کمی ہے حُسن میں کوئی تو یہ کہ حالِ وفا
گرا ہو چھُٹ کے کہیں اُس کے روئے زیبا سے

عجب نہیں جو فلک پر غزل یہ حافظ کی
سُنائے زہرہ، بپا رقص ہو مسیحا سے

غزل

پروفیسر ڈاکٹر منصور

لاکھ چاہا کہ بچا لیں ذرا دامن اپنا
زندگی خار تمرے اس سے الجھتے ہی رہے

شیشۂ دل پہ مرے، جنسِ لطافت پہ مرے
دم بدم سنگ ترے یونہی برستے ہی رہے

میری تخئیل کے شاداب صنم خانہ میں
کتنے اصنام پرستش کو ترستے ہی رہے

نہ وہ چلمن ہے، نہ اُنکی پسِ پردہ آہٹ
اُنکے نظارے ہیں کہ چلمن پہ مچلتے ہی رہے

اُنکی معدوم وفاؤں کا ہو شکوہ کیوں کر
ہم تو ہر وقت جفاؤں کو ترستے ہی رہے

نغمۂ روح مرا، میرے شکستہ نالے
جنبشِ لب کی اداؤں کو ترستے ہی رہے

کیسی دزدیدہ نگاہی ہے کہ غمازی ہے
دل کے آفاق پہ تارے دو چمکتے ہی رہے

ہیں جو غمخوار مرے دوست، میرے ہمدم
ساتھ غیروں کے مرے حال پہ ہنستے ہی رہے

زندگی کیف ہے، اک درد ہے، راحت ہے
آئینے جسکی حقیقت کو چھپاتے ہی رہے

کب تلک کھائیں گے منصور فریبِ ہستی
ہم سدا اُسکی حقیقت کو سمجھتے ہی رہے

پوسٹ گریجویٹ کالج ۔ جسونت واڑہ (ام ۔ پی)

غزل

پروفیسر عنوان چشتی

ضمیر بیچنے والے ضمیر بیچتے ہیں
اگرچہ شہر میں دل کی دکاں نہیں ہے کوئی

یہ زندگی ہے اسے لوٹ کر نہ کیوں چاہوں
کہ اس کے بعد بہار و خزاں نہیں ہے کوئی

خود اپنی ذات پہ اس کے وجود کی صورت
یقین ہو نہ ہو، لیکن گماں نہیں ہے کوئی

دلوں کے بیچ ہے دیوارِ گریہ مانتا ہوں
محبتوں کے مگر درمیاں نہیں ہے کوئی

بیان ہوتے ہیں آنکھوں سے دل کے افسانے
یہ اور بات کہ دل کی زباں نہیں ہے کوئی

دل و نگاہ یہ اک دوسرے سے پوچھتے ہیں
نہاں نہیں ہے کوئی یا عیاں نہیں ہے کوئی

لٹا سکو تو لٹاؤ خلوص کے گوہر
یہ کام وہ ہے کہ اس میں زیاں نہیں ہے کوئی

دلوں کا قحط ہے عنوان آج دنیا میں
مکیں ہزار ہیں لیکن مکاں نہیں ہے کوئی

ی ۱۱۷، جامعہ نگر ـ نئی دلی ۲۵

غزل

عزیز ناگپوری

کیوں تڑپتے ہو چارہ گر کے لئے
غم تو نعمت ہے دل جگر کے لئے

بس رہا ہے یاد ان کی عمر بھر کے لئے
ہم سفر چاہیے سفر کے لئے

پیرہن جیسے ہے بشر کے لئے
ویسے عزت ہے معتبر کے لئے

پہلے اپنے مقام کو سمجھے
لازمی ہے یہ ہر بشر کے لئے

اشک بے تاب ہے نکلنے کو
دل نے روکا ہے چشم تر کے لئے

دھوپ میں غم کی جو سہارا دے
دل ترستا ہے اس شجر کے لئے

صرف ہوگا دعا سے کیا حاصل
آدمی چاہیے اثر کے لئے

تیرا جلوہ عزیز دیکھ سکے
تابِ دیدار دے نظر کے لئے

مکان 5-7-124 نامپلی روبرو درگاہ یوسفین ـ حیدرآباد

غزل

بانو طاہرہ سعید

باقی نہ کوئی غم رہا، غم اس قدر ملے
اب ہے یہی دعا نہ کوئی چارہ گر ملے

اُن کی نگاہِ ناز سے جب سے نظر ملی
ایمان و دین کے مسئلے زیر و زبر ملے

مدت سے تھی تلاش کسی خضرِ راہ کی
جو بھی ملے، ہماری طرح بے خبر ملے

اکثر ادیب و شاعر و فنکار دہر میں
شوریدہ سر، طپیدہ جگر، دریدہ ملے

حصہ نہیں یہ ہر کس و ناکس کا طاہرہ
یہ ہے خدا کی دین جو ذوقِ نظر ملے

گرین ویو۔ شانتی نگر۔ حیدرآباد 500028

غزل

الفت شرفی

کیوں آرزوے دل کو مٹانے نہیں دیتے
شیشے کا محل ہم کو بنانے نہیں دیتے

وہ رہزنوں کو سر بھی اٹھانے نہیں دیتے
ناحق کسی پہ ظلم بھی ڈھانے نہیں دیتے

دنیا کو وہ تو آگ لگاتے ہیں شوق سے
دامن پہ اپنے آنچ وہ آنے نہیں دیتے

لب کا ہلانا ہم کو تو دشوار تھا مگر
حالات اب قلم بھی اٹھانے نہیں دیتے

ہیں مرحلے جہاں کے میرے ساتھ اسقدر
زلفوں میں ان کی شام بتانے نہیں دیتے

یہ بھی تو رند آپ کا ہے ساقیا مگر
الفت کو میکدے میں کیوں آنے نہیں دیتے

ہمراہ غم بھی اس قدر میرے عزیز ہیں
الفت کے پھول دل میں کھلانے نہیں دیتے

الفت شرفی۔ مکان نمبر 565-6-5۔ درگاہ شاہ خاموش۔ ناملی حیدرآباد۔ اے۔پی

ثریا صولت حسین

"سزا دو مجھے"

گنہ ہے یہ میرا کہ نادان ہوں
زمانے کی چھل بل سے انجان ہوں
میں اس جادو نگری سے بیزار ہوں
سزا دو مجھے میں گنہگار ہوں

مجھے جاں ستانی سے رغبت نہیں
جرائم کے جرگوں سے نسبت نہیں
محبت کی سب سے طلبگار ہوں
سزا دو مجھے میں گنہگار ہوں

مرا جذبۂ دل جنونی نہیں
مرے دست و بازو تو خونی نہیں
حمیت کی لیکن میں تلوار ہوں
سزا دو مجھے میں گنہگار ہوں

مرا در، درِ عیش و عشرت نہیں
یہاں بادہ خانوں سی وحشت نہیں
کہ دارالاماں کی میں دیوار ہوں
سزا دو مجھے میں گنہگار ہوں

ہزاروں دیئے راستے میں جلیں
چلوں تو ثریا بھی ہمرہ چلیں
میں انساں کی عظمت کا شہکار ہوں
سزا دو مجھے میں گنہگار ہوں

ثریا صولت حسین ۔ ۳۳ نزد ہائی کورٹ ۔ سول لائنس ناگپور ۱ ...۴۴۰

مخلص منوّری سلّم نوروی

غزل

احسان تمہارا اے حسنِ ازل واللہ میرا کے نام نہیں
وہ فیض دیا ہے تو نے ہمیں جو فیض جہاں میں عام نہیں

جس روز تمہارا ذکر نہیں جس روز لبوں پر نام نہیں
وہ صبح ہماری صبح نہیں وہ شام ہماری شام نہیں

ہم صاحبِ دل ہم اہلِ نظر جلوؤں ہی سے کھیلا کرتے ہیں
یہ کھیل ہمارا ہے جس کا آغاز تو ہے انجام نہیں

اشکوں کی تجلی بالآخر کچھ آبرو رکھتی ہے ورنہ
اس گھر پہ اندھیرے ہنستے ہیں جس گھر میں چراغِ شام نہیں

اے طائرِ گلشن اڑتا جا ہر وقت سنبھل کر گلشن میں
ہر ایک شجر کی شاخوں پر پھیلائے ہوئے کیا دام نہیں

پھولوں میں بسیرا ہے لیکن کیوں اشک بہاتی ہے شبنم
آرام کہاں پھر ملتا ہے گلشن میں اگر آرام نہیں

منزل کی طرف جانا ہے اگر آرام و سکوں سے تو بہ کر
پھر کیسے کٹے گا تیرا سفر دو گام چلا دو گام نہیں

اے ساقیِ میخانہ یہ بتا میخانے کا عالم کیا ہوگا
گردش میں رہے گا ہر میکش گردش میں اگر اب جام نہیں

ہم شمعِ وفا کے پروانے کب جان کی پروا کرتے ہیں
ہم آگ میں اپنی جلتے ہیں اور کسی کا کام نہیں

انمول محبت ہے کہ نہیں بازارِ جہاں میں دیکھ اے دل
پھر اس کو خریدے کیا کوئی وہ جس کی گرہ میں دام نہیں

خلوص و محبت کا عالم کردار سے پیدا کرتے ہیں
یہ کام ہمارا ہے مخلص یہ اور کسی کا کام نہیں

پوسد ۴۴۵۲۰۴ ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں ندیم

غزل

کیا نہیں بتائیں ہم عاشقی کا پہلا زخم
کتنا لطف دیتا ہے دل لگی کا پہلا زخم

صرف آنکھ والے ہی اس کو کرتے ہیں محسوس
تیرگی بداماں ہے روشنی کا پہلا زخم

ہم نے سینۂ گل پر فصلِ نوبہاراں میں
غرقِ خون دیکھا ہے تازگی کا پہلا زخم

خلد سے نکلنے کا حادثہ تو ہوگا یاد
بس وہی ہے اے یارو آدمی کا پہلا زخم

دوستوں سے اے بھائی کچھ نہ مانگنا ہرگز
ورنہ خوں رلائے گا دوستی کا پہلا زخم

زخم تو جوانی میں خوب کھائے ہیں لیکن
آپ کی عنایت ہے بے رخی کا پہلا زخم

شعر میں سموئے جب تیری یاد کے نشتر
دل پہ آ لگا اس دم شاعری کا پہلا زخم

چوٹ دل پہ لگتی ہے ندیم کے یارو
یاد آ ہی جاتا ہے زندگی کا پہلا زخم

صدر - ناگپور - مہاراشٹرا

غزل

منیر حیدرآبادی

دل کی دھڑکن ہے امانت آپ کی
زندگی بخشی عنایت آپ کی

ہر کلی میں ہے تبسم آپ کا
گل نے پائی ہے نزاکت آپ کی

آپ کرتے ہیں شکایت غیر سے
ہم نہیں کرتے شکایت آپ کی

اک نظر میں جان لے لی وہ نظر
ہر نظر ہے اک قیامت آپ کی

ہنستے ہنستے دل لیا تم نے منیر
خوبصورت ہے شرارت آپ کی

محمد منیر (منیر حیدرآبادی) 16-9-827 قدیم ملک پیٹھ حیدرآباد دکن

حرفِ آخر

مکرمی

سلام و رحمت ۔ "شاداب" مسلسل موصول ہو رہا ہے اس میں شک نہیں کہ اس رسالہ کا اپنا مزاج ہے ۔ سنجیدگی کے ساتھ دلکشی موجود ہے ۔ اس دور میں جب کہ مخرب اخلاق چیزیں یا ادب کے نام پر "چیستانی تحریریں" رسائل کی زینت بن رہی ہیں، آپ سماجی، اصلاحی اور اجتماعی موضوعات پر مضامین شائع کر رہے ہیں' یہ نیک فال ہے ۔ لیکن میرے مکرم ' رسالہ کی ظاہری شکل و صورت پر بھی توجہ فرمائیے ۔ اس کی کتابت و طباعت دلکش ہونی چاہیے ۔ کاش 'شاداب' "آف سیٹ" پر شائع ہو ۔ یہ میری دلی تمنا ہے ۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا ۔

مخلص

(پروفیسر) عنوان چشتی

محترم ..... ! آداب' نیا سال مبارک

'شاداب' برابر مل رہا ہے ۔ اس کے لیے شکریہ ۔ آپ نے اس کی بلند معیاری کو برقرار رکھا ہے ۔ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کیجیے۔ خطوط کے جواب کے بجائے 'سوال و جواب' کا سلسلہ شروع کیجیے اور قسط وار ناول کا سلسلہ بھی شروع کیجیے ۔ تاکہ قاری کی دلچسپی بڑھے اور وہ اگلے ماہ کے رسالے کا شدت سے انتظار کرے ۔

اک کہانی 'ٹوٹی طناب' ارسال کر رہی ہوں ۔ رسید سے مطلع کریے گا ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ خدا حافظ

مخلص

بلقیس شبیہہ

تسلیم و نیاز ۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے ۔ سابقہ مضمون کی اشاعت کے بارے میں ہنوز تشنگی ہے ۔ شاداب کے تازہ شمارہ میں ڈاکٹر حبیبی کے مضمون سے متاثر ہوکر قلم کو تحریک پیدا ہوئی اور چند بے ترتیب کلمات کو یکجا کر کے مضمون کی شکل دیدی اور آپ کی خدمت میں پیش ہے ۔ پتہ نہیں آپ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں کہ جواب سے نوازنے کا فخر اپنے سر لینا نہیں چاہتے ۔ کبیر صاحب نے کافی معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے ۔
مناسب سمجھیں تو شاداب میرے نام جاری فرما دیں ورنہ کوئی مضایقہ نہیں مطالعہ کا موقعہ تو ملتا ہی رہتا ہے ۔

مضمون "قرآن کی رُو سے کائنات میں انسان کا موقف" درحقیقت انسان سے متعلق قرآنِ حکیم میں استعمال شدہ چند الفاظ کی وضاحت اور اس کے پس پردہ محرکات کی وضاحت کے لیے لکھا گیا ہے اور مجھے یقین کہ آپ بھی ضرور پسند فرمائیں گے ۔ مضمون کے بارے میں آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا ۔ توقع ہے کہ قریبی اشاعتوں میں جگہ دی جائے گی ۔ کتابت اور طباعت پر توجہ فرمائیں ۔ اس قدر معیاری رسالے کی کتابت بھی معیاری ہی ہونی چاہیے احباب کی خدمت میں سلام علیک ۔ اور یاد فرماؤں کو قدمبوسی ۔ جواب کا انتظار رہے گا

فقط
خلوص کیش
مجید بیدار

مکرمی و محترمی مدیرِ اعلیٰ
سلام مسنون

ماہنامہ شاداب بذریعہ شاہد صاحب اردو ہائی اسکول پوسد نظر نواز ہوا ۔۔۔ شمارے میں مضامین اچھے ہیں ۔ خاص طور پر محمد لطیف صاحب کا مضمون بہت پسند آیا ۔ بہترین کاوش ہے ۔ اور بھی چند مضامین بہت عمدہ ہیں تمام مضامین نگاروں کے اسمائے گرامی رقم کرنے سے قاصر ہوں ۔ مختصر یہ کہ تمام قلم کاروں کو دلی مبارکباد ۔ باقی بر ص ۴۳

ایڈیٹر

محمد قمر الدین صابر

مینیجنگ ایڈیٹر

محمد کلیم الدین احمد

لس مشاورت:

رمہ عائشہ بیگم رباب، یوسف ناظم

ر محمد یوسف الدین، پروفیسر رضی الدین احمد

ر احمد صدیقی، محمد منظور احمد منظور

ے۔ جی۔ فاروقی، ڈاکٹر مشتاق الرحمن خاں منشا

پروفیسر میر تراب علی

جلد ۵ شمارہ ۶ جون ۱۹۸۸ قیمت ۵ رو

ماہنامہ

شاداب

حیدرآباد

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستا
دو سال	90 "	270 "	65 ڈالر	36 "	225 "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 ڈالر	300 "	2000 "

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب، 147-5-11، ریڈہلز، حیدرآباد 4

یڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر شاداب سے

فہرست

حرفِ اول

حکومت آندھراپردیش نے ۱۹/ مارچ ۸۸ء کو جاری کردہ سرکاری احکام میں ۱۸/ مارچ ۸۸ء سے شروع ہونے والے تلگو "ودھاوا" کو سرکاری زبان کا سال قرار دیا اور تلگو کے مکمل استعمال پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا اعلان کیا، اردو والوں کو اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اردو والے چاہتے ہیں کہ اردو کو دیئے گئے تحفظات پر بھی سختی سے عمل کیا جائے اور یہ صورتِ حال ختم کی جائے کہ اردو کے استعمال کا اعلان تو ہوتا ہے مگر عمل آوری نہیں ہوتی۔ چنانچہ گذشتہ ایک ماہ سے پورے زوروں سے یہ مہم چلائی گئی۔ شہر میں بھوک ہڑتال کیمپ منعقد ہوئے اور کانگریس کمیونسٹ پارٹی جنتا پارٹی اور تمام دانشوروں کی مکمل تائید اسے حاصل رہی ہمارے چیف منسٹر اور تلگو دیشم پارٹی کے دوسرے قائدین نے بھی کہا کہ حکومت اردو کے لیے کام کر رہی ہے اور کام کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ چیف منسٹر نے اقبال مینار کے افتتاح کے موقع پر ایک بڑے اور نمائندہ مجمع کے سامنے اپنی لکھی ہوئی تقریر سے ہٹ کر یہ اعلان کیا کہ جس علاقے میں ۱۰ فیصد اردو آبادی ہو وہاں بھی اردو کا استعمال ہوگا۔ اور جہاں ۳۰ فیصد اردو آبادی ہو وہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہوگی۔ ادارہ اردو والوں کے احتجاج کے پیشِ نظر ایک نیا جی او ۲۷۳ ۵ مئی ۱۹۸۸ء جاری کیا جس کے ذریعہ تمام ضلع کلکٹرز کو [illegible] زبان کے استعمال کے لیے ذمہ داری سونپی گئی۔ کلکٹرز سے کہا گیا ہے کہ سرکاری زبان کی ضلعی جائزہ کمیٹی میں اردو کے ایک نمائندہ کو بھی شامل کیا جائے۔ نیز سابق جی او ز ۲۷۳/ ۷۷ء ۱۹۷۷ اور ۳۵۸/ ۸۶ء کے مطابق جہاں اردو اور دوسری اقلیتی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد

۱۵ فیصد ہوگی وہاں اردو بھی استعمال کی جائے۔

اردو والوں کو اس نئے جی او کی اجرائی پر مایوسی ہوئی۔ کہ اقبال مینار کے افتتاح کے موقع پر خود چیف منسٹر کے اعلان کا اس جی او میں کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا اور ۱۰ فیصد اردو آبادی والے علاقہ میں اردو کے استعمال اور ۳۰ فیصد اردو آبادی والے علاقہ میں اردو دوسری سرکاری زبان ہونے کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ نیز ضلع کمیٹیوں میں اردو نمائندے کے شریک کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ جب کہ ان ضلع کمیٹیوں [illegible] کا کام صرف تلگو سرکاری زبان پر عمل آوری کا جائزہ لینا ہے۔ ’اردو بچاؤ تحریک‘ نے سرکاری زبان کمیشن میں نائب صدر نشین کی حیثیت سے اردو کے ماہر نمائندے کی شمولیت پر زور دیا تھا۔ صرف کمیشن ہی ایسی صورت میں اردو کے استعمال کا جائزہ لے سکتا ہے اور ان کو اس پر پابند کر سکتا ہے نیز جی او ۳۴۷ فقرہ ۳ پر عمل آوری کی بھی کوئی صراحت نہیں کی گئی۔

ضرورت ہے کہ اردو دانوں کا تقرر کیا جائے اور انہیں پابند کیا جائے کہ فرہ مدت کے اندر تلگو دانی کا ٹسٹ پاس کریں نیز تلگو داں عہدہ داروں اور عملہ کو بھی اس کا پابند کرنا ضروری ہے کہ وہ اردو دانی ٹسٹ کامیاب کریں۔ اردو مدرسوں کی جائدادوں پر تقرر ہوں، ہر دفتر میں اردو داں عملہ بھی ہو تا کہ وہ نہ صرف اردو درخواستوں [illegible] وغیرہ کو قبول کرے بلکہ انہیں اسی زبان میں جواب بھی دے سکے۔

نیز یہ حکم بھی ضروری ہے کہ جہاں جہاں اردو استعمال ہو رہی تھی اسے پھر سے استعمال کیا جائے اور عہدہ داروں کو پابند کیا جائے۔ کہ وہ اردو کے استعمال پر سختی سے عمل پیرا ہوں صدر نشین نے خود بیان کیا کہ انہوں نے کلکٹرز کو اردو کے استعمال کرنے اور مختلف بورڈز پر اردو لکھوانے کا انتظام کرنے کہا تو کلکٹر صاحب نے جواب دیا کہ اردو میں لکھنے والے دستیاب نہیں ہیں۔ صدر نشین نے اس پر انہیں بتایا کہ وہ اردو مدرسین سے یہ خدمت لے سکتے ہیں۔ بہرحال اردو کے لیے نیا جی او ۲۴۳ مورخہ ۴ مئی ۱۹۸۸ء کافی نہیں ہے اگر حکومت کی خواہش ہے کہ اردو کو اس کا حق دیا جائے اور اسے حسب اعلان استعمال کیا جائے تو ایک ایسی مشنری تیار کرنی ہوگی جو یہ دیکھے کہ اردو کا حسب تعلیمہ استعمال ہو رہا ہے یا نہیں اور حکومت کے عہدہ داروں کو عمل آوری پر پابند کر سکے اور اس عمل کی ابتداء اردو کے ایک ماہر کو سرکاری زبان کمیشن میں بحیثیت نائب صدر نشین شریک کرنے سے ہو سکتی ہے۔

شمس پیرزادہ

قسط اول

موضوع اور ضعیف حدیثیں

موضوع اور ضعیف حدیثوں کے چلن نے حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ کتنی بدعتیں ہیں جو اسی راہ سے دین میں داخل ہوئی ہیں، کتنے فرقے ہیں جنہوں نے ایسی ہی حدیثوں کا سہارا لیا ہے اور کتنا بڑا تعطل ہے جو ان روایتوں کی وجہ سے ملت کے اندر پیدا ہو گیا ہے ؎

یہ امت روایات میں کھو گئی

اہل علم روایتوں کو بیان کرنے میں نہ واعظوں کو تامل ہوتا ہے اور نہ ان لوگوں کو جن پر علم دین کو پھیلانے کی ذمہ داری تھی۔ بہت کم لوگ ہیں جو حدیث کے معاملہ میں محتاط رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ عام حال یہی ہے کہ حدیث کے نام سے مختلف کتابوں میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کو وہ ارشادات رسول ہی سمجھتے ہیں خواہ کوئی حدیث اسناد کے لحاظ سے کتنی ہی کمزور یا گھڑی ہوئی ہی کیوں نہ ہو۔

اگر حدیث کے معاملہ میں یہ سہل انگاری گوارا کی جا سکتی ہے تو پھر محدثین نے حدیث کی تحقیق میں جو محنت شاقہ برداشت کی اور فن حدیث کی تشکیل کر کے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ سب غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اگر ضعیف حدیثیں بھی حجت ہیں تو پھر صحیح اور ضعیف کی بحث کا حاصل کیا اور دونوں میں کس لیے فرق کیا جائے؟

حدیث رسول کا تعلق دین اور اس کی تعلیمات سے ہے اس لیے جو بات بھی حدیث کے نام سے پیش کی جائے گی وہ دین کا ایک جزء قرار پائے گی بالفاظ دیگر اس کے ذریعہ اس بات کا تعین ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ

یہ واضح فرمادیا ہے کہ اسے یہ بات پسند ہے اور یہ ناپسند یا فلاں کام پر وہ یہ [illegible]
یہ اجر اور فلاں حرکت پر وہ یہ اور یہ سزا دینے والا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ اگر واقعی اس حدیث کی نسبت جو بیان کی جائے صحیح ہے تو وہ دین کی تعلیمات میں شامل سمجھی جائے گی جس کے بعد کسی مسلمان کے لیے چوں و چرا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس پر واجب ہے کہ رسولؐ کے ہر قول کو قبول کرے اور اس کی سنت کی پیروی کرے۔ حدیث کی اسی اہمیت کے پیش نظر سلف صالحین حدیث قبول کرنے کے معاملہ میں محتاط رہتے تھے اور غیر معتبر روایتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مشہور تابعی ابن سیرین فرماتے ہیں:

"حدیث دین ہے لہٰذا دیکھو کہ تم کس سے دین حاصل کر رہے ہو۔"
(الکفایۃ فی علم الروایۃ۔ خطیب بغدادی ص ۱۶۲)

اللہ اور رسولؐ کے نام سے جھوٹی باتیں پیش کرنا لیکن اگر کوئی حدیث فی الواقع رسولؐ کا قول یا عمل نہیں ہے تو وہ ایک جھوٹ ہے جو رسولؐ کی طرف اور درحقیقت اللہ کی طرف منسوب کرکے دین میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ اللہ پر افترا پردازی ہے جس پر قرآن میں سخت وعید سنائی گئی ہے۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا لِيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ (الانعام ۱۴۴)
اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی طرف جھوٹ بات منسوب کرے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کو گمراہ کرے۔

قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ ۖ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ۝ (یونس ۵۹)
"کہو اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہو"

وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ (یونس ۶۰)
"جو لوگ اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں انہوں نے قیامت کے دن کے بارے میں کیا سمجھ رکھا ہے"

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے جو آپ کی طرف جھوٹ منسوب کریں۔

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا
جس نے میری طرف جان بوجھ کر جھوٹ

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (بخاری)

منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔"

مَنْ حَدَّثَ عَنِّي حَدِيثًا وَهُوَ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ (مسلم)

"جس نے میری طرف سے کوئی حدیث بیان کی اور وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک ہے۔"

حدیثیں کون لوگ گھڑتے رہے

اس وعید اور تنبیہ کے باوجود بہ کثرت حدیثیں گھڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی گئیں۔ ایسی حدیثوں کو "موضوع" یعنی گھڑی ہوئی کہا جاتا ہے ان کو گھڑنے والے بدنیت لوگ بھی رہے ہیں اور "نیک نیت" لوگ بھی چنانچہ دین کے دشمنوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر امت کے اندر فتنہ پیدا کرنے کے لیے حدیثیں گھڑیں، سلاطین کو خوش کرنے کے لئے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولا جاتا رہا اور ترغیب و ترہیب یعنی اچھے کاموں کی رغبت دلانے اور گناہوں سے ڈرانے کے لئے بھی حدیثیں وضع کی گئیں نیک نیتی کے ساتھ حدیثیں گھڑنے کا یہ کام بعض زاہدوں اور صوفیوں کے ذریعہ بھی انجام پایا۔

بعض فتنہ پردازوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ انھوں نے حدیثیں گھڑی ہیں مثال کے پر مہدی عباسی کے عہد خلافت میں عبدالکریم بن ابی العوجا کو قتل کے لیے لایا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں گھڑی ہیں ایک شخص ابو عصمہ نوح بن ابی مریم تھا جس نے قرآن کی ہر سورہ کی فضیلت میں حدیثیں گھڑیں اور بعد میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کی دلچسپی ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کی مغازی سے بڑھ گئی ہے اور قرآن کی طرف سے توجہ ہٹتی جارہی ہے تو میں نے کار ثواب سمجھ کر یہ حدیثیں گھڑ لیں (کتاب الموضوعات۔ ابن جوزی ص ۴۱)

وہب بن منبہ جو یہودی تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے تھے فضائل اعمال کے بارے میں حدیثیں وضع کیا کرتے تھے (مقدمہ از عبدالرحمن بن عثمان

"الموضوعات" ص ۸)

ابوداؤد نخعی نہایت عبادت گزار تھے۔ رات میں طویل قیام کرتے اور دن میں اکثر روزہ رکھتے ساتھ ہی حدیثیں گھڑنے کا کام بھی کرتے۔

(کتاب الموضوعات ص ۴۱)

غلام خلیل سے جب ان حدیثوں کے بارے میں پوچھا گیا جو رقائق کے باب میں وہ بیان کرتے ہیں تو کہنے لگے ہم نے یہ حدیثیں اس لئے گھڑلی ہیں تاکہ عوام کے دلوں میں رقت پیدا کریں۔ (ایضاً ص ۴۰)

قصہ گو حضرات لوگوں کو رلانے اور اپنی مجلسوں کی رونق بڑھانے کے لئے جھوٹے قصے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے تھے عراق میں تو گویا ٹکسال تھی جہاں حدیث کے کھوٹے سکے ڈھالے جاتے تھے شیعہ اس معاملے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی فرماتے ہیں:

"واضعین نے سب سے پہلے شخصیتوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑنا شروع کیں انہوں نے اپنے اماموں اور اپنے فرقوں کے سربراہوں کی برتری کو ثابت کرنے کے لئے بہ کثرت حدیثیں وضع کیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے شیعوں کے مختلف گروہوں نے انجام دیا چنانچہ ابن ابی حدید شرح البلاغہ میں فرماتے ہیں "معلوم ہونا چاہیے کہ فضائل" کی حدیثیں میں اصل جھوٹ شیعوں ہی کی طرف سے آیا۔ اور اس کے مقابلہ میں اہل سنت کے جاہلوں نے بھی حدیثیں گھڑلیں۔"

(السنتہ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۷۵)

رافضیوں نے حضرت علی اور اہل بیت کے فضائل میں ہزاروں حدیثیں گھڑیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے ہوا پرستوں میں رافضیوں سے زیادہ جھوٹی گواہی دینے والا کوئی گروہ نہیں دیکھا۔

یہاں ہم موضوع حدیث کی صرف ایک مثال پیش کر تے ہیں۔

اِخْتِلَافُ اُمَّتِی رَحْمَۃٌ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔

علامہ البانی کہتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ حدیث اپنے معنیٰ کے لحاظ سے محقق علماء کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ ابن حزم نے اسے نہایت فاسد

باقی بر صفحہ (۶۴)

پردے کی حکمت

پولش نومسلم عطاء اللہ کوپانسکی

لوگدٹن کوپانسکی پولینڈ کے مسلم رہنما ہیں۔
انھوں نے ۱۹۷۴ء میں قبولِ اسلام کیا تھا۔ روس
کے زیرِ اثر اشتراکی ریاست ہونے کی وجہ سے پولینڈ
کی سرزمین روز بروز ان کے لئے تنگ ہوتی گئی چنانچہ
وہ پولینڈ سے امریکہ ہجرت کر گئے۔ ایک مکتوب میں
کوپانسکی لکھتے ہیں۔ میں اب امریکہ کا شہری ہوں لیکن
میں اپنے آپ کو مہاجر کہتا ہوں۔ قبولِ اسلام کے بعد
میں نے شام کے شریعہ کالج سے تعلیم حاصل کی اور "حکمتِ حجاب"
پر ایک کتاب بھی لکھی۔ میں اگرچہ اصلاً پول ہوں تاہم
میری بیوی عرب ہے۔ ہم دونوں اسلامی لباس
پہنتے ہیں جیسا کہ پاکستان، انڈیا اور افغانستان
میں مروج ہے ہماری دیکھا دیکھی امریکہ میں بھی ساتر
لباس کا رواج ہو گیا ہے اور بعض خواتین شوق
سے برقعے پہننے لگی ہیں۔ لیکن ہم اسلامی لباس
اس لئے پہنتے ہیں کہ ہمارا اسلامی تشخص برقرار
رہے۔ میں رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا
ہوا تھا لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی رحمت سے میں
نعمتِ اسلام سے سرفراز ہوا ہوں۔ میں نے قبولِ
اسلام ترکی میں کیا، اور میں ایسے ہزاروں یورپی

افراد کو جانتا ہوں جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور
خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دینِ حق
کی جانب رہنمائی کی ۔

لباس اور ثقافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ کوئی اجنبی یا غیر ملکی کسی سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے تو اس کو ممیّز کرنے والی پہلی علامت اس کا لباس ہوتا ہے ہر شخص اپنا تعارف اپنے لباس سے کراتا ہے ۔ لباس کی وضع قطع ہمیں بتاتی ہے کہ وہ کہاں کا رہنے والا اور کس تہذیب سے اس کا تعلق ہے ۔

سچی بات ہیکہ لباس ہمارا پہلا گھر ہے اور جلد دوسرا گھر ۔ جس طرح لباس ہماری شناخت کراتا ہے اسی طرح ہماری جلد کی رنگت بھی پتہ دیتی ہیکہ ہمارا تعلق کس نسل سے ہے ۔ ہمارے لباس فی الحقیقت میں ہماری ثقافتوں کے لبادے ہیں ۔

ایک عورت کی شان نہ تو اس کے ملک پر منحصر ہے نہ اس کے طرزِ تہذیب پر اور نہ اسکے اطوار پر ۔ عورت کی شان اس کی اپنی ذات پر منحصر ہے ۔ عورت انسانی حسن کا بنیادی سرچشمہ ہے ۔

لباس عورت کی شان و وقار کی ایک علامت ہے ، اور ہر تہذیب میں لباس اس کے مخصوص تصوّرِ انسانیت کا ترجمان ہوتا ہے جس تہذیب میں عریانیت پسند کی جاتی ہے وہ قدیم تہذیب کہلاتی ہے لیکن عریانی کو پسند کرنے والی کبھی بھی ارفع و بلند نہیں سمجھی گئی ۔

مغربی معاشرے پر سرسری نگاہ بھی یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ اب اس کا رُخ عہدِ قدیم کی جانب ہے ۔ یعنی جس طرح عہدِ قدیم میں عریانی کو پسند کیا جاتا تھا اسی طرح مغربی معاشرہ بھی لباس کو بوجھ سمجھنے لگا ہے ۔ ان کے سوپر جنس اور جنسی نجاست مواد ہیں ۔ مغربی عورت کے ذہن میں بچپن ہی سے یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ صرف حسین ، مشہور اور جنسی طور پر پرکشش لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں ۔ یہ مغربی خبطِ زندگی کو غیر معتدل بنا دیتا ہے اور آدمی کے اندر بتدریج مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگتی ہے ۔

اسلامی تہذیب مغربی تہذیب سے بالکل دوسری انتہا پر ہے ۔ وہ گویا مغربی تہذیب و ثقافت کی نفی ہے ، اسلامی تہذیب کے مقاصد مختلف ہیں ، طریقے

اور اصول جدا ہیں، نیکی اور خیر کا تصور الگ ہے۔ زندگی کے بارے میں پورا نظریہ مغربی اقدار سے متضاد ہے۔ مغرب کی تہذیب یہودی اور عیسائی مزاج سے بنی ہے جب کہ اس کے مشرق میں واقع روس کا کیمپ کمیونسٹ ہے۔ دونوں معاشی نظاموں کے بارے میں دو انتہاؤں پر ہیں پھر بھی اسلامی تہذیب کے مقابلے میں دونوں متحد ہیں اور گویا مل کر اسلامی تہذیب پر اپنا ثقافتی سامراج قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں ۔

جب آزاد مغرب اور جبری کمیونزم میں کشمکش بپا ہوئی تو اسلام نے نکتۂ اعتدال کی جانب رہنمائی کی۔ ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی نے ٹھیک ہی کہا ہے " اسلام ایک شجر پاکیزہ ہے جس کا تعلق نہ تو مشرق سے ہے نہ مغرب سے۔ اس کی جڑیں افلاک میں ہیں اور اس کی شاخیں زمین پر سایہ فگن ہیں۔

بلاشبہ اسلام دینِ حق ہے اور برطانوی ادیب رڈیارڈ کپلنگ کے الفاظ میں ۔ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق ہے، دونوں کے درمیان کوئی نکتۂ اتصال نہیں ہے۔"

عورت کے جسم کو ڈھانپ کر رکھنا یہ اسلامی طریقہ ہے جو خدا نے مومن عورت پر عائد کیا ہے اور اسی حجاب میں مسلمان عورت کی شان و وقار ہے آپ کسی معاشرہ میں چلے جائیے اگر کسی عورت کو آپ نے باپردہ پایا تو آپ فوراً سمجھ لینگے کہ یہ مسلمان ہے، یہ مسلمان عورت کی شناخت ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

" اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔" (احزاب)

قرآن کریم کا مطالعہ کریں تو اس میں نقاب "جلباب" اور "خمر" کے الفاظ ملتے ہیں۔ ان سب کو ملانے سے "حجاب" بنتا ہے۔

حدیث میں حضرت عائشہؓ سے روایت ملتی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ کی خدمت میں درخواست پیش کی تو اپنے حجاب میں سے ہاتھ بڑھا کر پیش کی۔ اسی نوع کی متعدد احادیث ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لئے حجاب ضروری ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی بیویوں کو ایک اندھے (حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ) سے بھی پردہ کرنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ نے کہا۔ لیکن وہ تو اندھا ہے اس سے پردہ کیوں ضروری ہے؟ اس پر حضورؐ نے ارشاد کیا۔ لیکن کیا تم بھی اندھی ہو؟ کیا

تم اسے نہیں دیکھ سکتیں؟

حضرت فاطمہؓ سے پوچھا گیا۔ ایک مسلمان عورت کے لئے کیا چیز بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا مسلمان عورت کے لئے بہتر چیز یہ ہے کہ وہ نہ مرد کو دیکھے نہ مرد اسے دیکھے۔

وفات سے قبل حضرت فاطمہؓ نے تاکید کہ ان کا جنازہ اس طرح ڈھانپا جائے کہ ان کا قدو قامت اور جسم بھی معلوم نہ ہو سکیں۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا۔ بہت سی عورتیں ایسی ہوں گی جو بظاہر لباس پہنے ہوئے ہوں گی لیکن حقیقت میں عریاں ہوں گی۔ ان کی خواہش ہو گی کہ دوسرے ان کی طرف کھینچیں اور یہ ان کی طرف ایسی عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکیں گی۔

ایسی عورتیں حقیقت میں اسلامی تہذیب سے بےگانہ ہوتی ہیں۔ امریکی نو مسلم خاتون کریمہ عمر نے بجا لکھا ہے کہ۔

حجاب بھی فی الحقیقت خاموش دعوتِ دین ہے۔

یعنی یہ پیغام اسلام کی ایک غیر ملفوظ علامت ہے۔ مسلمان عورت پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ پردہ کرے۔ اسلامی لباس ساتر ہوتا ہے۔ وہ عورت کے پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے۔ لوگ جب کسی عورت کو نقاب میں دیکھتے ہیں تو ان کی توجہ پردے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے آگے بڑھ کر اس کے جسم کو نہیں دیکھ سکتی۔

یہ پردہ مسلمانوں کا ایک قدیمی رواج نہیں بلکہ ایک مسلمان عورت کا مذہبی فریضہ ہے۔

معاشی حیثیت میں فرق کے باوجود پردہ تمام مسلم خواتین کو یکساں حیثیت دے دیتا ہے۔ عورت غریب ہو یا معمولی شکل و صورت کی پردہ عورت کو ایکساں وقار بخشتا ہے۔ پردے سے عورت کو خودداری کی آزادی ملتی ہے۔ ایک نہیں ایسی بیسیوں مسلم خواتین موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شہرت اور کامیابی عطا کی ہے لیکن انھوں نے پردہ ترک کرنا گوارا نہیں کیا اور تعلیم میں مغربی یونیورسٹیوں اور نام نہاد اسلامک ریسرچ سنٹر کے فارغ التحصیل لوگوں سے بھی کہیں زیادہ آگے ہیں یہ وہ خواتین ہیں جن میں سے کوئی عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی اور کوئی یہودی گھرانے میں لیکن انھوں نے جب کھلے دل سے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ ایمان لائے بغیر نہ رہ سکیں۔ اور پھر انھوں نے اپنی ساری لیاقت و قابلیت اسلام کے لئے وقف کردی۔ مثال کے طور پر محترمہ مریم جمیلہ جو متعدد و بلند پایہ کتابوں کی

مصنفہ ہیں۔ ان کا سابق نام مارگریٹ مارکس تھا۔

• فاطمہ ہیرن

• عالیہ لیمو

• خدیجہ فیروزالدین (سابق وزیر مغربی پاکستان)

یہ تمام خواتین انتہائی تعلیم یافتہ اور لائق ہونے کے باوجود پردہ کرتی ہیں۔

اسلام نے عورت مرد کے جو علیحدہ علیحدہ دائرے مقرر کئے ہیں تو یہ جنوبی افریقہ والی نسلی امتیاز کی پالیسی نہیں ہے۔ عورت پردے کے ساتھ بھی سماجی زندگی میں بھرپور حصہ لے سکتی ہے۔ ایک باپردہ مسلمان عورت مغربی یا اشتراکی سوسائٹی کو کیوں کھٹکتی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ سوسائٹیاں فرد کی پرائیویٹ اور عائلی زندگی کو تسلیم نہیں کرتیں۔ ان کے نزدیک نہ مرد کی زندگی میں کوئی پرائیویٹ حصہ ہے نہ عورت کی زندگی میں۔

دنیا کو تقسیم کرنے والے ان ٹھیکیداروں کی خواہش ہے کہ کوئی چیز ان سے چھپائی نہ جائے جو کچھ ہوا انہیں معلوم ہوتا رہے۔ وہ دنیا کو اپنا اجارہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کا استحصال کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ ان عالمی ٹھیکیداروں کی رائے میں پردہ افراد معاشرے کی نصف قوت کو مفلوج کرکے رکھ دیتا ہے اسلئے انہوں نے اس نصف قوت کو باہر لانے کے لئے پروگرام بنایا لیکن باہر لانے کے اس عمل میں اس کا لباس بتدریج اترتا چلا گیا اور ایک محنت کش عورت مرد کی جنسی ہوس کا کھلونا بن کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیداوار میں اضافہ ہونے کی بجائے الٹی کمی آنے لگی۔ کیا مرد اس ماحول میں زیادہ کام یا مطالعہ کرسکتا ہے، جہاں عورتیں بنی سنوری بیٹھی ہوں؟ مغرب کی فیکٹریوں اور کارخانوں میں آپ کو یہی منظر دکھائی دے گا۔ عورت کے جسم کے حصے جھلکیاں دکھاتے ہیں اور مرد کی توجہ بار بار کھینچتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں مرد ایسی حالت میں یکسوئی کے ساتھ کام کرسکتا ہے؟

لباس اور جنس کا گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ساتر لباس پر زور دیتا ہے عورت کو اپنا جسم چھپا کر رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

مغربی اور اشتراکی دنیا کا تصورِ اخلاق اسلام کے تصورِ اخلاق سے بالکل متضاد ہے۔ مغربی دنیا کے نزدیک اب شادی بھی غیر ضروری ہوگئی ہے۔ حرام کاری اور حرام خوری ان کے نزدیک کوئی معائقہ نہیں۔ عورت مرد جتنا مخلوط ہو کر رہیں ان کی نگاہ میں وہ اتنے ہی قابلِ تحسین ہیں۔ آدمی پر ازدواجی ذمہ داری بوجھ خیال کیا جانے لگا ہے اور

اور تولید نسل حماقت“ اسی قبیل کے تصوّرات میں ساتر اور حیادار لباس آتا ہے۔ وہ ایسے لباس کو زنجیر سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کا پردہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں سب سے نمایاں ہوتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مسلمان ملک میں جائے گا اسے سب سے پہلے پردہ ہی دکھائی دے گا۔ غیر ملکی سیاح خود کی طور پر نہیں دیکھ سکتے کہ مسلمان کیا نہیں کھاتے اور کیا نہیں پیتے؟ وہ کسی مسلم معاشرے میں ایک مدت تک رہیں تب انھیں رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتے، شراب نہیں پیتے لیکن پردہ کرنے والی عورت انھیں پہلی نگاہ میں دکھائی دیتی ہے اور وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ پردہ ہی ہے جو مسلم سوسائٹی کو ممیز کرتا ہے۔ باپردہ عورت حقیقت میں اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب کے درمیان سرحد کی طرح ہے۔

مسلمان عورت پاکستان اور انڈیا میں برقعہ پہنتی ہے۔ افغانستان میں اسے چادری اور ایران میں کہا جاتا ہے۔ ترکی میں چار چاف، عربی میں عبایہ، شام میں منڈیل اور شمالی افریقہ میں اسے ہیک، سفے سیری، لیوچ، اجر، لحافہ اور جلابہ وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ فرانز فینسن تیسری دنیا کا ایک انقلابی فلسفی اور ماہر نفسیات ہے وہ اسلام سے تو زیادہ واقف نہیں لیکن اس نے مغرب کی اسلام دشمن نفسیات کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ وہ مغرب کی اس نفسیات کو نوآبادیاتی نفسیات کہتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ”الجیریا کا نقاب نوچ دیا گیا“ ہے، بڑی تفصیل سے بتاتا ہے کہ فرانسیسی سامراج نے پچاس کے عشرے میں الجیریا کے مسلمانوں کی تہذیب ختم کرنے کے لئے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔

مسلمانوں کی ثقافت کے خلاف جنگ عظیم میں پردہ اصل ہدف تھا۔ الجیریا پر قابض طاقت نے اپنے تمام ذرائع و وسائل اس کے خلاف صرف کر دیئے لیکن الجیریا کے مسلمانوں نے عجیب جمود کا مظاہرہ کیا فرانس کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اور یہ صرف فرانس ہی نہیں ہر سامراجی طاقت کا ہدف ہے کہ مسلمانوں کا پردہ ختم کیا جائے۔ وہ سب ایک ہی طریقے سے ایک ہی فلسفے کے ساتھ پردے پر حملہ کرتے ہیں۔

پردہ مسلمانوں کے عقائد کا آئینہ دار ہے اسلئے وہ اس پر پیہم ضرب لگاتے ہیں

ان کے نزدیک پردہ ختم ہو جائے تو مسلمانوں کے عقائد میں بھی نرمی آجائے گی۔ جس طرح فرانس نے اپنے تمام ماہرین عمرانیات، ماہرین نسلیات، اور مقامی امور کے ماہرین کی متحدہ سعی کے ساتھ پردے پر حملہ کیا تھا اسی طرح ہر سامراجی طاقت نے اسے جہاں بھی مسلمانوں پر مسلط ہونے کا موقع ملا یہی کیا۔ ان کے حملے کا آغاز اس سلوگن کے ساتھ ہوتا ہے۔ آیئے عورت کو قابو میں لائیں اپنے، وہ مغلوب ہو گئی تو باقی سب از خود ہو جائے گا۔

فرانس کے لئے الجیریا میں اسی طریق کار سے سیاسی راستہ بنا۔ فرانس اچھی طرح سمجھ لیا کہ

اگر ہمیں الجیریا پر قابو پانا اور اس کی قوت مزاحمت کو توڑنا ہے تو پھر ضروری ہے کہ مسلم عورت کو فتح کیا جائے اسکے لئے ہمیں اس کے حجاب کے اندر داخل ہونا ہو گا۔ جہاں وہ چھپی بیٹھی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی خاندانی زندگی توڑنے کیلئے بھی غیر ملکی سامراج نے طرح طرح کے ہتھکنڈے کئے۔ خاندانی زندگی کے بارے میں لطیفے چھوڑے گئے۔ اسے قید خانے سے تشبیہ دی گئی تاکہ خاندانی زندگی مسلمانوں کے نزدیک بھی جرم بن جائے۔ عورتوں کی ترقی کے لئے انجمنیں قائم کی گئیں اور مظلوم عورت سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔

مغربی دنیا ابھی اس جہالت میں مگن ابھی تک اسی کو صراط مستقیم سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک پردہ ایک پتھر ہے جس کے نیچے عورت دبی پڑی ہے چنانچہ اسکو جب بھی موقع ملتا ہے وہ پردے کے خلاف نفرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتی اہل مغرب کے پروپگنڈے کی تمام تر بنیاد پردے کے بارے میں منفی اور مخالفانہ خیالات ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے عورت کو غلام بنالیا گیا کبھی کہا جاتا ہے اسے انسانی سطح سے نیچے گرادیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسلام پر بھی فقرے چست کئے جاتے ہیں۔ یہ کہ اسلام عہد قدیم کا لے جایا جانا چاہئے۔ وہ ترقی پسند مذہب نہیں۔ وہ وحشی اور غیر مہذب ہے یہ مغرب کے حقیقی خیالات ہیں۔ اسلام پردے اور مسلم عورت کے بارے میں، چاہے وہ انھیں چھپانے کی کوشش کریں۔ ان خیالات نے صرف مغرب کی عمومی رائے عامہ ہی کو جانب دار اور متعصب نہیں بنایا ہے بلکہ متعدد مسلمان دانشور بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے مغرب کی اسلام پر تنقید سنی تو اپنے آپ کو ترقی پسند اور روشن خیال ظاہر کرنے

کے لئے عذر خواہانہ رویہ اختیار کیا اور پردے کو اسلام کا لازمی حصہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

سامراج کی ثقافتی یلغار اور اسلام پر مسلسل حملے رنگ لائے بغیر نہ رہ سکے اور پردے کے بارے میں یہ تصور متاثر ہونے لگا کہ پردہ اسلام کا ضروری جزو ہے۔ مسلم ممالک میں مغربی تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین پردے کو، دیکھا دیکھی خیرباد کہنے لگیں۔ مغربی لوگ جب کسی مسلمان عورت کو بے پردہ دیکھتے ہیں تو ان کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ مسلمان عورتوں میں بے پردگی درحقیقت مغربی تہذیب کی فتح ہے اور بے پردہ عورت گویا مغرب کا مال غنیمت ہے۔ اہل مغرب سربر آوردہ مسلم خواتین کی بے پردگی کو بھی اپنی تہذیب کے حق میں ایک قیمتی ثبوت سمجھتے اور اسے پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جہاں سادات (مصر کے سابق صدر سادات کی بیوی) فرح دیبا (سابق شاہ ایران کی بیوی) وغیرہ وغیرہ۔

ثقافتی نوآبادکاری کا ایک ردعمل ضرور ہوا اور وہ ثقافتی مزاحمت ہے، اگر ایک جانب کچھ مسلم خواتین مغربی تہذیب کے دباؤ یا کشش یا حکومتی جبر سے پردہ ترک کر رہی ہے تو دوسری جانب کچھ خواتین میں جذبۂ مزاحمت ابھر آیا ہے اور وہ پردے کی طرف لوٹ رہی ہے عالم اسلام کے مختلف مقامات پر تحریک اسلامی امید کی کرن بن کر چمک رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب انسانیت کو حجاب کے اندر اپنی فلاح دکھائی دینے لگے گی۔

ے شاگرد رشید ہیں اور اس بڑے دارالعلوم کے علاوہ تقریباً ستر مکتب چلا رہے ہیں کئی ,, بچوں کے گھر،، جن کا اوپر ذکر ہوا، چلا رہے ہیں۔

ان سطور کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قارئین اس نمونہ سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے علاقوں میں ہمت و حوصلہ کے ساتھ مکاتب کا نظام چلانے کی فکر کریں اور اسکولوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کے لیے شبینہ اسکول چلائیں یا جو بھی اس کی مناسب شکل ہو اپنائیں خدا کی مدد و نصرت صرف اونچے خیالات اور منصوبوں پر نہیں آتی بلکہ اپنی طاقت و قوت بھر حرکت شروع کرنے کے بعد آتی ہے لہٰذا ہمیں خدا کے نام سے اس کام کو جہاں نہیں ہو رہا ہے شروع کر دینا چاہیے، یہی صورت ہے اپنی نوع نسل کے دین و ایمان کی حفاظت کی اور امت مسلمہ کو اس کا کھویا ہوا مقام یاد دلانے اور عالم انسانیت کو پیام امن سنانے کی۔

(ادارہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ ۸۸ء) ++

میجر عبدالرحمٰن عیسی۔ انگلستان

اسلام کی جانب سفر

۱۹۱۹ء کو بیساکھی کا تہوار تھا۔ امرتسر (بھارت) میں یہ تہوار ہندو مسلم ۱۳ اپریل کو سب مل کر منایا کرتے تھے۔ کیونکہ پنجاب میں یکم بیساکھ سے گندم کی کٹائی شروع ہوتی تھی۔ پنجاب کے اکثر اضلاع میں یہ میلے منعقد ہوا کرتے تھے اور سب سے بڑا میلہ امرتسر میں ہوتا تھا۔ سیاسی لیڈروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ اس روز پنجاب بھر سے لوگ امرتسر بیساکھی کا میلہ دیکھنے آتے تھے لہٰذا جلیانوالہ باغ میں ایک سیاسی جلسہ منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا۔ شہر میں بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے۔ ڈونڈی پٹوائی گئی۔ اخبارات میں اعلانات شائع کرائے گئے۔ ان دنوں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بڑے زوروں پر تھا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس اور تحریک خلافت کا یہ مشترکہ جلسہ تھا۔ ہندوستان کی دونوں قومیں برطانوی راج کے خلاف تھیں۔ گورنمنٹ ہند نے رولٹ ایکٹ پاس کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر ہندوستانی باشندے کے دل میں حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ ادھر مسلمانانِ عالم خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کی برطانوی سازش سے بڑے برافروختہ تھے۔ اس جلسہ میں ہندو مسلم مل کر ایک ہی پلیٹ فارم سے حکومت برطانیہ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اور متفقہ ریزولیوشن پاس کر کے حکومت سے ہر طرح کا بائیکاٹ مقصود تھا۔ دوسرے لفظوں میں کھلی "بغاوت" کا اعلان کرنا تھا۔ جب اس جلسہ کے متعلق حکومت کو رپورٹ پہنچی تو گورنر پنجاب سرمائیکل اوڈوائر نے لاہور ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل ڈائر سے مدد طلب کی اور کہا کہ یہ جلسہ کسی صورت بھی منعقد نہیں ہونا چاہیئے اور اگر لوگ بضد ہوں تو طاقت کا زیادہ استعمال کیا جائے خواہ کتنی تعداد میں آدمی گولی کا نشانہ بنیں تاکہ ہندوستانی آئندہ اس قسم کی جرات نہ کر سکیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں امرتسر چھاؤنی میں مقیم برٹش یونٹ کی ایک مشین گن کمپنی کا تعین کیا

گیا جس کا کمانڈر میجر البرٹ ریمزے میلسی مقرر ہوا' اور اسے مکمل ہدایات جاری کی گئیں جب کیمپ جلیانوالا باغ پہنچی تو ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف بڑے بینر لگے تھے گاندھی جی اور مولانا جوہر کی قد آدم تصاویر آویزاں تھیں۔ حکومت کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کنگ جارج پنجم کا پتلا جلایا جا رہا تھا۔ لوگ بڑے مشتعل تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر باغ کے گرد و نواح میں رہائشی مکانوں کی چھتوں پر فوجیوں نے پوزیشن سنبھال لی اسکیم یہ تھی کہ حکم ملتے ہی ہر سمت اطراف سے مشتبہ لوگوں کا کراس فائر کھول دیا جائے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی اور لوگ جوق در جوق آ رہے تھے' جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میجر میلسی نے جائزہ لیا اور اچانک کسی غیبی طاقت نے میجر میلسی کو ان نہتے عوام پر ظلم کرنے سے روک دیا۔ مشہور ہے کہ وہ انتہائی رحمدل انسان تھا۔ اس نے تھوڑی دیر سوچا' پھر اچانک کیمپ کی کمان اپنے نائب کو سونپی اور اس کو سمجھایا کہ جب تک کوئی سینئر افسر نہ پہنچے' خواہ پوزیشن کتنی ہی خطرناک کیوں نہ ہو جائے فائر کا حکم نہ دیا جائے اور بہت جلد کوئی دوسرا میجر وہاں پہنچ جائے گا میجر میلسی فوراً واپس ہیڈکوارٹر پہنچا اور کمانڈنگ آفیسر کو بتایا کہ وہ اس حکم کو بجا لانے سے قاصر ہے۔ لہذا کسی دوسرے سینئر آفیسر کو موقع پر بھیجا جائے۔ فوراً ایک دوسرے برٹش میجر کو جلیانوالہ باغ بھیجا گیا تاکہ وہ حکم کی تعمیل کرے۔ اور میجر میلسی کو حکم عدولی کی بنا پر حراست میں لے لیا گیا۔ جب دوسرا میجر وہاں پہنچا تو جلسہ شروع ہو چکا تھا اور حکومت کے خلاف بغاوت کا ریزولیوشن پاس ہونے والا تھا کہ میجر نے ہر سمت پوسٹوں کو فائر کرنے کا اشارہ کیا۔ آن کی آن میں سیکڑوں بے گناہوں کے سینے گولیوں سے چھلنی ہو گئے ان کی لاشیں میدان میں بکھر گئیں۔ مرنے والوں کی تعداد کئی ہزار تھی۔ اور زخمیوں کی تعداد کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ ساٹھ ستر ہزار کے مجمع میں سے شاید پانچ چھ ہزار آدمی جان بچا سکے۔ برطانوی راج کے دوران جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سب سے بدترین حادثہ تھا۔ اس المیے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح برصغیر میں پھیل گئی۔ ملک میں فوری ردعمل یہ ہوا کہ جہاں کہیں بھی کوئی انگریز نظر آیا اس کو بڑی بے دردی سے مار دیا گیا۔ مردوں کے علاوہ انگریز عورتوں اور بچوں کو بھی سربازار قتل کر دیا گیا۔ سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی' ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دی گئیں۔ گوجرانوالا کا ریلوے اسٹیشن مکمل طور پر جلا دیا گیا۔ حکومت کو کسی ہندوستانی پر اعتبار نہ رہا۔ انڈین آرمی کے کئی یونٹوں سے ہتھیار لے لئے گئے۔ دوسرے اور ضلع امرتسر کے علاوہ لاہور اور گوجرانوالہ میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ تشدد

کی ایسی تباہی کی خبر جب انگلینڈ پہنچی تو برطانوی پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ ہوا اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ذمہ دار آفیسروں کو واپس بلایا جائے اور ان پر مقدمات چلائے جائیں۔ گورنر پنجاب سر مائیکل اوڈوائر اور جنرل ڈائر ملازمت سے سبکدوش کردیئے گئے ان پر مقدمات تو کیا چلتے، محض ہندوستانیوں کو ٹھنڈا کرنے کے خاطر ان کو برائے نام سزائیں دی گئیں۔ یہ میری اس کہانی کا پس منظر تھا۔ اب میں اپنے مطلب پر آتا ہوں میجر میلسی کا کورٹ مارشل ہوا اور حکم عدولی کی تنزلی کرکے لیفٹیننٹ بنادیا گیا اور ہندوستان سے انگلینڈ بھیج کر اس کی تعیناتی دوسرے یونٹ میں کردی گئی۔ آٹھ نو سال کے بعد وہ پھر میجر کے رینک پر پہنچا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے دوبارہ اس کے موجودہ یونٹ کو تین سال کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ برٹش یونٹ اٹک کے قلعہ میں تعینات کیا گیا۔ شاید یہ قلعہ مغل شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ جس سے انگریزوں کا قبضہ اس ملک پر ہوا تھا۔ اس قلعہ میں ہمیشہ ایک برٹش یونٹ اور کچھ انڈین آرمی کی یونٹیں رکھی جاتی تھیں۔ جون کا مہینہ تھا اور شدید گرمی کا موسم خصوصاً خشک پہاڑیوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے قلعہ اٹک کا درجہ حرارت ان ایام میں ۱۲۰ ڈگری پہنچ جاتا تھا۔ اس موسم میں ایک روز کا واقعہ ہے کہ میجر میلسی پریڈ سے واپس آکر اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اس نے کوئی خاص رپورٹ تیار کرنا تھی۔ اس لئے کھانے پر نہیں گیا تھا دو بجے کا وقت ہوگا اس نے دیکھا کہ سامنے والی پریڈ گراؤنڈ میں ایک ہندوستانی سپاہی کو سزا کے طور پر گراؤنڈ کے گرد دوڑایا جا رہا ہے۔ اس کی پیٹھ پر اینٹوں سے بھرا پٹھو بندھا ہے۔ اس تپتی دھوپ میں کولہو کے بیل کی طرح اسے دوڑایا جا رہا ہے، اگر اس کی رفتار میں تھوڑی سستی آتی ہے تو پیچھے سے سکھ سنتری اسے کوڑا مارتا ہے تاکہ وہ پوری رفتار سے دوڑے، یہ سلسلہ پورے گھنٹے تک جاری رہا۔ میجر میلسی اس ہندوستانی سپاہی کی ہمت پر حیران ہو رہا تھا۔ جب گھڑی نے ۲½ بجائے تو سکھ سنتری نے اُسے ٹھہر جانے کو کہا۔ اور اس کو ½ گھنٹہ آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ میجر میلسی یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ جونہی اس نے سزا یافتہ کو چھٹی دی وہ بڑی تیزی سے پانی کے نل پر پہنچا۔ دونوں ہاتھ دھوئے پھر تین دفعہ منہ میں پانی ڈال کر کلی کرکے پانی باہر پھینک دیا۔ لیکن ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہ اترنے دیا۔ اس کے بعد چہرے کو اور کہنیوں کو دھویا۔ آخر میں پاؤں دھوئے اور آگ کی طرح جلتی زمین پر قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہاتھ باندھ کر عبادت (نماز) میں مصروف ہوگیا ابھی اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے تھے کہ سکھ سنتری پھر موت کے فرشتہ کی طرح اس کے سر پر آنازل ہوا اور پہلے کی طرح اس کو دوڑانا شروع کردیا۔ دفتر کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر

میجر میلسی کی حیرت کی انتہا نہ رہی اپنے دفتر سے اُٹھ اندین یونٹ کے دفتر پہنچا۔ وہاں اپنے ہم عہدہ میجر سے دریافت کیا کہ سامنے والے گراؤنڈ میں اس کی یونٹ کے ایک سپاہی کو سزا دی جا رہی ہے۔ کیا اس نے کوئی بڑا جرم کیا ہے۔ اس کی بلند ہمتی قابلِ صد آفریں ہے کہ اس شدید گرمی میں بھی ایک گھونٹ پانی نہیں پیا۔ یہ تو کوئی سپر انسان ہے۔ میجر میلسی نے اس سے سفارش کی کہ اب اس کی سزا معاف کر دی جائے اور اس کو یہاں دفتر میں بلوایا جائے کیونکہ میجر میلسی اس سے کچھ باتیں دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اس کو بلوایا گیا۔ سب سے پہلے تو میجر میلسی نے اس سے دریافت کیا کہ اس نے کونسا قصور کیا ہے۔ جس کی بنا پر اس کو اتنی سخت سزا دی گئی ہے۔ سپاہی نے بتایا کہ وہ صبح کی پریڈ میں چند منٹ دیر سے پہنچا تھا، اس قصور پر اس کے سکھ کیملی آفیسر نے یہ سزا سنائی تھی۔

اس کے بعد دوسرا سوال

میجر میلسی نے اس سے یہ کیا کہ کیا اس قیامت خیز گرمی میں اسے پیاس محسوس نہ ہوئی کہ اتنی زبردست ورزش کے بعد اس نے منہ میں پانی ڈال کر کلی کر دی۔ سپاہی نے جواب دیا کہ جناب وہ بھی انسان ہے اور پیاس سے اس کا برا حال ہو رہا ہے لیکن اس نے پیاس کی یہ شدت محض اس لئے برداشت کی کہ وہ مسلمان ہے اور اسلام کا تیسرا بڑا رکن ماہ رمضان کے روزے ہیں۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ ہر مسلمان بالغ تندرست پر روزہ فرض ہے۔ صبح سے شام تک کھانا پینا منع ہے۔ اس نے تفصیل سے روزہ کے فلسفہ پر روشنی ڈالی۔ میجر میلسی نے اس سے پوچھا کہ اس قدر پیاس کی شدت تھی۔ اگر ایک دو گھونٹ پانی پی لیتا تو اس وقت کون دیکھ رہا تھا۔ سپاہی نے جواب دیا، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کے حکم کے خلاف وہ کیسے کر سکتا تھا، مسلمان کے لئے جان دینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن خدائے وحدہٗ لاشریک کی حکم عدولی کرنا اس کے لئے درست نہیں۔ تیسری بات میجر میلسی نے اس سے یہ کہی کہ جبکہ تم کو صرف چند منٹ کا وقفہ آرام کرنے کو ملا تو تھوڑی دیر کے لئے کسی سائے میں سستا لیتے اور تازہ دم ہو جاتے، سپاہی نے جواب دیا کہ مسلمان کے لئے سب سے بڑا رکن نماز ہے۔ ہر نماز کو وقت پر ادا کرنا فرض ہے۔ وقت اتنا کم تھا کہ اگر وہ سستانے کے لئے بیٹھ جاتا تو نماز کا وقت گزر جاتا اور اس کی نماز قضا ہو جاتی جس سے اس کا خدا ناراض ہو جاتا۔ اس نے سستانے کے بجائے فرض کی ادائیگی کو مقدم سمجھا۔

سپاہی کی باتیں سن کر میجر میلسی پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی وہ واپس بنگلہ

اور گھنٹوں گہرے خیالوں میں گم رہتے۔ وہ اسلام کے فلسفہ پر سوچتا رہا اور اس کے ادنیٰ پیروکا
کی مذہب سے وابستگی دیکھ کر بڑا متاثر ہوا۔ شام کو کلب جانا چھوڑ دیا۔ اپنی فوجی ڈیوٹی میں دا
چسپی لینی بھی چھوڑ دی۔ بالکل خاموش رہتا اور سب سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس کے ساتھی آف
حیران تھے کہ میجر عیسیٰ کو کیا ہوگیا ہے۔ گہرے خیالوں میں مستغرق رہتا ہے۔ ہفتہ کے بعد اس
نے چار روز کی رخصت لی، راولپنڈی پہنچا اور وہاں تمام کتب فروشوں کی دکانیں چھان ما
اور جہاں جہاں اسے اسلام پر کوئی کتاب انگریزی میں نظر آئی خریدلی۔ درجنوں کتابیں، قرآ
پاک کے چند پارے جو انگریزی میں ترجمہ ہوچکے تھے لے کر واپس قلعہ اٹک پہنچا۔ اب تو صبح
شام انہی کتابوں میں مصروف رہتا۔ چند دنوں کے بعد اسلام کی بابت کافی معلومات حاصل کرلیں
اب اس نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلدی ہوسکے حلقۂ اسلام میں داخل ہوکر رمدگی کو سئے ڈھنگ پر
ڈھالے اور گزشتہ گناہوں کی تلافی کرے اور جلد سے جلد باقاعدہ اسلام قبول کرکے باقی زندگ
اسلام کی تبلیغ و تعلیم میں گزارے۔ ایک روز جمعہ کے دن جب قلعہ کی مسجد میں اذان ہوئی تو م
عیسیٰ نہادھوکر مسجد میں جا پہنچا۔ امام صاحب نے ابھی خطبہ شروع نہیں کیا تھا۔ نمازی مسجد میں ج
ہورہے تھے۔ وہ سیدھا پہلی صف میں جا پہنچا اور امام صاحب سے بڑے مؤدبانہ اور نیا
مندانہ لہجہ میں التجا کی کہ آپ مجھے حلقہ اسلام میں داخل کرلیں اور کہا کہ مجھے یقین ہوچکا ہے
اسلام ہی ایک سچا دین ہے اور قرآن مجید واحد الہامی کتاب ہے جس میں چودہ صدیاں گزر
جانے کے بعد بھی ایک زیر یا زبر کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسلام واقعی مکمل ضابطۂ حیا
ہے۔ امام صاحب اور باقی سب حاضرین برٹش یونٹ کے ایک برٹش میجر کی زبان سے یہ الفا
سن کر دنگ رہ گئے۔ شاید امام صاحب ایسے خیالات میں مستغرق تھے کہ ایسا کرنے سے ا
کا انجام کیا ہوگیا ہوگا۔ غرضیکہ کچھ دیر کھڑے کھڑے میجر عیسیٰ کی صورت تکتے رہے۔ اتنے میں
حاضرین نے زبردست مطالبہ کیا کہ امام صاحب جلدی کریں، نماز کا وقت ہورہا ہے۔ خطبہ
پہلے یہ کار خیر سرانجام دے دیں۔ میجر صاحب کو کلمہ طیبہ پڑھائیں اور مشرف بہ اسلام کردی
لہٰذا امام صاحب نے میجر عیسیٰ کو کلمہ پڑھایا اور اسلام کے رکن سمجھائے۔ اس
طرح اس کو دائرہ اسلام میں داخل کیا گیا اور اس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا۔ اس پر مسجد سے
نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔ خوشی سے سب نے میجر عیسیٰ کے ہاتھ چومے، باری باری ہر ایک نے گلے
لگایا اور ہدیہ تبریک پیش کیا۔ یہ خبر قلعہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ کوئی معمولی
نہ تھا۔ جب یہ خبر برٹش کیمپ میں پہنچی تو یونٹ کمانڈر نے فوراً یونٹ لنگر کو حکم دیا کہ آف

کال مچائے برٹش یونٹ کے علاوہ سارا قلعہ فالن ہوگیا، میجر ملیسی کو سب کے سامنے کھڑا کیا گیا اس کی پیٹی (بیلٹ) اور بیجز تک رینک اتار دیئے گئے اور کرنل کے حکم سے حراست میں لے کر اپنے بنگلہ میں نظر بند کر دیا گیا اور ایک دوسرا سینیئر میجر اس پر تعینات کر دیا گیا۔ اور فوراً رپورٹ آرمی ہیڈکوارٹرز دہلی کو بھیجی گئی۔ دوسرے ہی روز دہلی سے ایک بریگیڈیر اور ایک کرنل وہاں پہنچے اور میجر میلسی کا کورٹ مارشل ہوا جس کے نتیجہ میں اس کو "بارہ پتھر" کی سزا دی گئی یعنی میجر ملیسی کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کا تمام سامان بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ بنک بیلنس منجمد کر دیا گیا اور گارڈ کی سپردگی میں اسے راولپنڈی سے لاہور کا ٹکٹ دے کر روانہ کر دیا گیا اتفاقاً اس کی جیب میں تین چار سو روپیے تھے۔ اور تن پر تین کپڑے اور بس کسمپرسی کی حالت میں لاہور پہنچا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا کچھ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جائے یہاں اس کا کوئی شناسا نہ تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک برگنزا ہوٹل پہنچا اور چھوٹا سا کمرہ بک کرایا۔ کئی روز تک تو کمرے کے اندر ہی رہا۔ کھانا بھی کمرہ میں کھاتا تھا۔ جب علیحدگی میں گھبرا گیا تو کھانے کے وقت ڈائیننگ ہال میں جاتا اور دور ایک کونے کی میز پر اکیلا بیٹھ کر کھانا کھا کر واپس کمرہ میں آجاتا۔ اس کو اگر کسی بات کا افسوس تھا تو صرف یہ کہ اس کی تمام کتابیں بھی ضبط کر لی گئی تھیں۔ اخبار پڑھنے کے سوا اور کوئی شغل نہ تھا۔

ایک روز ڈائننگ ہال میں تقریب تھی اور بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے خوب رونق تھی لیکن میجر ملیسی خاموش ایک کونے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خیالات میں گم تھا۔ جب تقریب ختم ہوئی تو ایک شریف آدمی اس کے پاس پہنچا اور معذرت کر کے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں کس ملک سے آپ کا تعلق ہے اور کھوئے کھوئے کیوں رہتے ہیں؟ کیا وہ اس کی کوئی خدمت کر سکتا ہے۔ میجر ملیسی نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کو اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ اس کی اتنی مدد کریں کہ کسی اسلامی ادارے سے اس کا تعارف کرا دیں تاکہ وہ اسلام سے متعلق پوری معلومات حاصل کر سکے۔ اس شخص نے وعدہ کیا کہ دوسرے روز وہ اس کو ساتھ لے جا کر لاہور میں ایک اسلامی ادارہ سے روشناس کرائے گا۔ دوسرے روز وقت مقررہ پر وہ شریف آدمی میجر ملیسی کو انجمن اشاعت اسلام لے گیا۔ یہ جماعت احمدیہ کی لاہوری پارٹی کا دفتر تھا وہاں جماعت کے سربراہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لئے کسی معقول تنخواہ والی ملازمت کا انتظام کر دے گا میجر ہر روز ان کے دفتر جاتا اور لائبریری میں کتب کا مطالعہ کرتا۔ وہ بڑا خوش تھا کہ اللہ نے اسے ایک تبلیغی ادارے سے منسلک کر دیا ہے۔ ایک روز لائبریری میں بیٹھ

باقی بر صفحہ (۵۹)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نشان راہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء سے خطاب

میں آپ سے چار باتیں عرض کروں گا جو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوں گی۔ اور چار باتیں آپ کی ذات سے متعلق عرض کرونگا۔ حالات حاضرہ سے متعلق چار باتوں میں سے پہلی بات جو اگرچہ بہت بڑی ہے۔ اور میری حقیقت و حیثیت سے بلند ہے مگر اس کے ذکر میں برکت اور حلاوت ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضؓ چند چیدہ اور برگزیدہ صحابہ کرام کی مخصوص جماعت میں تشریف فرما تھے۔ حضرت عمرؓ کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے لئے دعا کا وقت ہے۔ اور ان کی طبیعت میں بھی تقاضا پیدا ہوا، جو عارفین میں پیدا ہوا کرتا ہے اور وہ تو سب عارفین سے بڑھ کر عارف تھے۔ انہوں نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ سب آزاد ہیں اپنے لئے بے تکلف دعا کریں اور منہ مانگی مراد مانگیں تو کسی نے کہا کہ اے اللہ اپنے راستہ میں نکلنے کی توفیق دے کہ یہ دولت تیری راہ میں لٹادوں اور تیرے بندے کی خدمت کروں، کسی نے کہا کہ اے اللہ اپنے راستہ میں نکلنے کی توفیق دے تاکہ میں جہاد کر کے اپنا سر کٹاؤں اور تیرے راستہ میں خون بہاؤں اسی طرح تمام صحابہ کرام کی دعائیں منقول ہیں۔ جب حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا کہ میری دعا ہے کہ میرے پاس ابو عبیدہ، سعد بن ابی وقاص طلحہ اور خالد رضی اللہ عنہم اجمعین ہوں اس کے علاوہ اور کئی نام لئے۔ بہرحال یہ سب وہ لوگ تھے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی فتوحات مقدر کی تھیں اور بڑے بڑے کارنامے تقدیر میں لکھے تھے۔ تو کہا کہ انہیں سے کسی کو کسی محاذ پہ بھیجوں اور کسی کو کسی محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں ان کے ذریعہ اسلام کا پرچم لہرادوں اور پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں ہو۔

آج سے پہلے اسلام کے مستقبل کے فیصلہ کن محاذ اتنے متعین اور واضح نہیں تھے۔

ابر گہر تھا، کچھ ایسی تاریکیاں تھیں کہ اس وقت متعین کر کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ چار محاذ ہیں جن کے ذریعہ اسلام اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور اپنے عقیدہ، اپنے پیغام اور اپنے تشخص کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں، تو میرا مطالعہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے اور خاص طور پر ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ محاذ متعین اور واضح نہیں تھے۔ لیکن اس میں سیاسی تبدیلیوں انقلاب سلطنت اور اسلام کے خلاف موجودہ مہم اور علمی تجربوں نے اس کو بالکل ایک حقیقت بنا دیا ہے۔ انہیں چار محاذ کا ذکر آپ سے کروں گا جن کے لئے بلند عزائم سپاہیوں اور دینی درسگاہوں کے فضلاء اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ علماء اور.... مخلصین کی ضرورت ہے۔ اور ان کے لئے اس سے بڑی سعادت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان محاذ جنگ میں اپنی صلاحیتوں اپنی توانائیوں اور سرگرمیوں کا اظہار کریں۔

۱۔ ان میں سب سے بڑا محاذ یہ ہے کہ ہماری ملت اسلامیہ کی آئندہ نسل مسلمان رہ جائے اور وہ صرف ذہنی فکری، تہذیبی، اور ثقافتی اعتبار سے نہیں بلکہ اعتقادی ارتداد سے بچ سکے، اس وقت سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے مدارس سے فارغ ہوں وہ اس محاذ کو سنبھالیں۔ اس محاذ کا چارج لیں، اور اپنے کو اس محاذ کے لئے وقف کر دیں اور یہ کوشش کریں کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل جو ابھی آٹھ دس برس کے بچے یا بارہ پندرہ برس کے نوجوان کی شکل میں ہے۔ اسلام کی اصولی فقہی اور کلامی تعریف پر صادق ہوں اس کے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ قصبے قصبے شہر شہر اور گاؤں گاؤں مدارس و مکاتب اور مساجد کی بنیاد ڈالیں جن میں دینی تعلیم دی جائے اور جہاں ایسا ممکن نہ ہو وہاں صباحی و مسائی درجات کھولیں اور جو لوگ جدید تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے لئے مجبور ہیں ان کو غذا پہنچائیں۔ اگر ان کو ابھی سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو ڈر ہے۔ کہ اس میں نوخیز نسل کو آگے چل کر کلامی اور فقہی اعتبار سے مسلمان کہنا صحیح ہوگا یا نہیں۔ وہ توحید و شرک اور کفر و ایمان کا فرق کر سکے گی یا نہیں، رسالت، منصب رسالت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزماں اور آپؐ کی شفاعت کو مانے گی یا نہیں۔ اِنَّ الدین عِندَ اللّٰہِ الاِسْلامُ۔ آپ ابھی سے نیت کیجیئے ہم اس خطرناک اور نازک محاذ کے لئے سینہ سپر رہیں گے، پھر اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور اسباب مہیا کرے گا اور آئندہ نسل جو ہماری اور آپ کی اولاد ہوگی اس کو مسلمان رکھنے کے لئے جو بھی کوشش کی جا سکے کی جائے، جو ہاتھ پیر مارے جا سکیں۔

مارے جائیں اور آب دیدہ وخون جگر بہایا جائے۔ یہ سب سے بڑا محاذ ہے،

۲۔ دوسرا محاذ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ باقی رہے۔ یعنی یہ اپنے عائلی قانون، قرآن مجید کے نصوص قطعیہ اور احکام، ترکہ وتعلقات کے احکام پر عمل کر سکے۔ اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو بعض وقت وہ ناجائز اور حرام ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا۔ فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جہنم بہت سخت الفاظ ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ وقت آگیا کہ مسلمان یہاں نماز تو پڑھ سکے ہوں پڑھ سکے، قرآن شریف کی تلاوت کر سکے لیکن وہ قرآن مجید کے عائلی احکام پر عمل نہ کر سکے پھر اس وقت علماء کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ ہجرت کا فتویٰ دیں۔ خدا کرے کہ وہ وقت نہ آئے ہم اس زمین پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہاں کے اہل بصیرت عارفین ملہم من اللہ اور اپنے عہد کے مخلص ترین بندوں نے اسبات کا اظہار کیا ہے۔ کہ اس ملک سے اسلام مٹنے والا نہیں ہے۔ اور اس ملک کی قسمت میں اسلام لکھ دیا گیا ہے اور اس ملک کے لیئے اسلام الاٹ ہو گیا ہے۔ اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہے کہ اسلام اس ملک میں رہے۔ اسلام اس کی قیادت بھی کر سکتا ہے اور بچا بھی سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے پھر دوبارہ اس کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اس لیئے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر ہمیں واقعات وحقائق کو دیکھ کر اپنی کوششوں کا رُخ متعین کرنا چاہیئے کیونکہ مسلمانوں کا ملی تشخص روز بروز خطرے میں پڑتا جا رہا ہے اس کی بے حد ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے شاہ بانو کیس سے گویا ایک غیبی مدد فرمائی ہے۔ جس نے سارے مسلمانوں میں اس خطرے کے احساس کو پیدا کر دیا۔ جس کے لیئے ایک مہم چلائی گئی اور وہ ایک مرحلہ پر کامیاب ہوئی اس سے : یہ بھی معلوم ہوا کہ جمہوری اور اجتماعی طریقہ پر اتحاد و اتفاق کے ساتھ اور خلوص کے ساتھ جو مہم چلائی جائے وہ ضرور کامیاب ہو گی۔ حالانکہ فیصلہ سے پہلے یہ پیشن گوئی کرنا بہت مشکل تھا کہ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوگا یا نہیں اور ان کا مطالبہ پورا ہوگا یا نہیں، لیکن اللہ کے چند مخلص بندوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی سے قرآن مجید کی روشنی اور تاریخ کے تجربہ میں صحیح طریقہ اختیار کیا تو انہیں کامیابی ہوئی۔

۳۔ تیسرا محاذ پیام انسانیت کا ہے۔ ہم اس ملک میں اس طرح رہیں کہ اپنے دین کو

باقی رکھنے کے لئے بھی، اپنے دین پر عمل کرنے کے لئے بھی، اپنے اداروں اور مرکزوں کو محفوظ رکھنے کے لیئے بھی دعوت کا کام کرنے کے لئے بھی، تعلیم وتالیف کا کام انجام دینے کے لیے بھی بامقصد اور باعزت زندگی گذارنے کے لئے اپنے مخصوص عقائد کے ساتھ اپنے پیغام ومقام کے ساتھ اس ملک میں زندگی گذار سکیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ فضا معتدل ہو، مشتعل اور آتشگیر نہ ہو۔ ورنہ کسی وقت بھی ساری کوششوں پر پانی پھر سکتا ہے۔ بہت کم لوگ اس کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ چند آدمی کے ذہنوں کی اپج ہے یا ان کا ذاتی رجحان ہے جو کسی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔ آپ یقین مانئے کہ حالات کے حقیقت پسندانہ اور عملی مطالعہ نے میری رہنمائی کی ہے۔ ہم جیسے اور رفقاء کو اسی مطالعہ نے مجبور کیا کہ وہ کوشش کریں یا کوشش واقعات کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ اگرچہ یہ وہ مجمع نہیں ہے جس کے سامنے کہنے سے یہ سمجھوں کہ بات تحریک کی شکل اختیار کرے گی لیکن کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ کام لے لے، لہذا آپ اس کو بھی یاد رکھئے اور باہمی اعتماد ایک دوسرے کا احترام ہمارے اندر پیدا ہونا چاہیے۔ اسپین کا المیہ جو پیش آیا اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اس میں ایک بات بہت نازک یہ ہے کہ وہاں علوم دینیہ کی بھی خدمت کی گئی اور وہاں خدا تک پہونچنے کے لئے ایسے ایسے مجاہدے ہوئے جن سے چوٹی کے اولیاء پیدا ہوئے بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مشرق اگر انبیاء کی سرزمین ہے تو مغرب اولیاء کی سرزمین ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی جیسے جلیل القدر مشائخ پیدا ہوئے اسی طریقہ سے فنون لطیفہ کو بھی وہاں بہت ترقی ہوئی اندلس کا ایک مستقل ادبی دبستان ہے۔ اس کو المدرستہ الاندلسیہ کہتے ہیں۔ اسی طرح چوٹی کے مصنفین پیدا ہوئے موافقات کے مصنف علامہ شاطبی پیدا ہوئے۔ ابن عبدالبر پیدا ہوئے۔ ایسے ہی بہت۔۔ سی کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے۔ اور موطا کی بسیط شرحیں لکھی گئیں، لیکن ایک چیز سے اغماض برتا گیا وہ یہ کہ وہاں کی اصل آبادی کو جو آٹے میں نمک کے برابر تھی اپنی پوری سلطنت واقتدار کے باوجود سنجیدگی کے ساتھ اسلام سے مانوس کرنے اور اسلام کے دائرے میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اس لیئے کہ اقتدار میں اکثر یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے کہ ہمارے نام اس زمین کا پٹہ لکھ دیا گیا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے فرامین میں یہ لفظ ملتا ہے کہ "دولت ابد قرار" یعنی ہم براہ راست حضرت اسرافیلؑ کو

اس ملک کا چارج دیں گے۔ اور اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ اس کا غلط خیال تھا اس پھیلی ہوئی آبادی کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور اس کے جذبات کو غلط تعلیم کے ذریعہ غلط تاریخ کے ذریعہ اپنی اخلاقی کمزوریوں کے ذریعہ اس سے بڑھ کر مقابل سیاسی تحریکوں کے ذریعہ نشوونما پانے کا موقعہ دینا بہت خطرناک ہے۔

ہندوستان میں تو یہ عنصر زیادہ واضح طور پر ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر آٹھ سو سال تک علی الرغم حکومت کی ہے۔ اور جب اخیر میں تصادم اور متضاد سیاسی تحریکیں چلی ہیں۔ اور انہوں نے غیر مسلموں کے دلوں میں بڑے بڑے ناسور پیدا کر دیئے ہیں، اب اس کو پیام انسانیت کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کو میں نے بہت اختصار سے بیان کیا ہے۔ اس پر پورا لٹریچر تیار ہو گیا ہے۔ آپ اس کا مطالعہ کریں،

۴۔ چوتھا اور آخری محاذ علوم دینیہ کے بقا کی کوشش کرنا اور زمانہ کے ساتھ ان کو تطبیق دینا۔ اس طرح نہیں کہ زمانہ کے تابع ہیں۔ بلکہ زمانہ کے جائز اور واجب تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اور اس کی زبان و ادب کی رعایت کے ساتھ علوم دینیہ کو زندہ رہنے اور اپنا کام کرنے اور زمانے کا نہ صرف ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے کے قابل بنائیں، اس کے لئے عربی مدارس تو ریڑھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو ترقی دیں اور ان کے لئے ... اساتذہ تیار ہوں، ندوۃ العلماء کے ملحق مدارس کو اپنی پچاس ساٹھ سے متجاوز تعداد ہونے کے باوجود اساتذہ نہیں ملے تو آپ اس کے لئے بھی تیار ہوں، نئے مدارس قائم کریں، علوم دینیہ میں نئی زندگی اور تازگی پیدا کریں صرف یہ نہیں کہ آپ فرسودہ چیزوں کو فرسودہ اور بوسیدہ چیزیں سمجھ کر پڑھائیں۔ بلکہ ان میں نئی روح و نئی توانائی پیدا کریں، تصنیفات نئی ہوں، نئی تشریحات ہوں، نئی ترجمانی ہو، نئی تدریس ہو، نیا ذوق تعلیم ہو اور نئی ذہنی صلاحیت اور اس کے ساتھ ذکاوت، حافظہ اور مطالعہ کی وسعت ہو، یہ چار چیزیں جو میں نے بہت ہی اختصار سے بیان کی ہیں۔ ان کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ ★★★

آخر میں وزیر موصوف نے اپنی اس قوی امید کا اظہار کیا کہ۔

اس کانفرنس میں شامل اردو کے دانشور مختلف سطحوں پر اردو کی ترقی کے لئے کی جانے والی کوششوں، کامیابیوں نیز درپیش مسائل کا تفصیل سے جائزہ لیں گے اور اس کی ترقی کے لئے راہ کو مزید ہموار کریں گے۔

شری ایچ کے ایل بھگت

مرکز اور اردو

اطلاعات ونشریات کے وزیر شری ایچ کے ایل بھگت نے ۲۵ مارچ ۱۹۸۸ء کو دہلی میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ کل ہند اردو کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ زبان قوم کی اُمنگوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہ بات اُردو کے بارے میں خاص طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ ابتداءً دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جانے والی یہ زبان آج دلوں کی زبان بن چکی ہے۔ اس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں مسلمان ہی نہیں، ہندو، سکھ اور دوسرے مذہبوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ گنگا جمنی تہذیب کے ہاتھوں پروان چڑھی اس زبان کا اور اس کے ادب کا مزاج ابتدا سے کشادہ اور سیکولر رہا ہے۔ اس کے اسی مزاج نے اسے سر آنکھوں پر دلوں میں جگہ دلائی ہے۔ اردو کو کسی خاص مذہب کے ساتھ جوڑنا اور اردو کی غیر مسلم مشہور ہستیوں کے ناموں کے الگ سے گنوانا بھی اس کے سیکولر مزاج کے خلاف ہوگا۔

شری بھگت نے کہا کہ آزادی کے بعد شروع کے برسوں میں اس زبان کا سامنا بعض غیر یقینی حالات سے رہا لیکن سرکار اور عوام اور انجمن ترقی اردو (ہند) جیسے اردو اداروں کی کوششوں سے اب ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ یہ زبان تمام سطحوں اور شعبوں میں لائق توجہ ترقی کر رہی ہے۔

وزیر موصوف نے مزید کہا کہ اردو کے لئے کی جانے والی کوششوں کے ضمن میں دیش کی سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اندرا جی نے فروغِ اردو کمیٹی قائم کی تھی۔ یہ کمیٹی گجرال کمیٹی کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس کمیٹی کی

زیادہ تر بنیادی سفارشوں پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ترقی اردو بورڈ بھی اندرا جی کی کوششوں سے قائم ہوا تھا سنہ ۱۹۶۹ء کے بعد سے اب تک ترقی اردو بیورو تقریباً چھ سو کتابیں شائع کر چکا ہے۔ اس کا سالانہ بجٹ ۵۰ لاکھ روپیے ہے۔

انہوں نے کہا کہ آزادی کے بعد اس زبان نے اُن ریاستوں میں بھی ترقی کی ہے، جہاں کی یہ مادری زبان نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ سرکاری زبان ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے کا نہیں۔ تاہم بعض باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً کیرالہ جیسی ریاست، جہاں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ کیرالہ میں، حالیہ برسوں میں جہاں ہندی کی مقبولیت بڑھی ہے۔ وہاں اردو نے تعلیمی سطح پر لائق توجہ ترقی پائی ہے۔ کیرالہ کا شمار اردو کے نئے مرکزوں میں ہونا چاہیے۔ میں سرسری ذکر پنجاب کا بھی کرنا چاہوں گا۔ ماضی قریب تک پنجاب اردو کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ لیکن آج بھی یہ شرف پنجاب کو حاصل ہے کہ اردو کا سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار "ہند سماچار" جالندھر، پنجاب سے شائع ہوتا ہے۔ پنجاب کا شمار آج بھی ملک کے اہم اردو مرکزوں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے مزید کہا کہ آپ خود محسوس فرمائیں گے کہ ادھر سرکاری سطح پر اردو کے استعمال کو بڑھاوا ملا ہے۔ میری وزارت اطلاعات و نشریات ہی کو لیجئے ریڈیو اور دوردرشن سے اردو پروگرام برابر نشر ہو رہے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو ملک بھر کے چھوٹے بڑے اردو اخبارات کو خبریں، مراسلے، معلوماتی ترقیاتی مضامین اشاعت کے لیے بھیجتا ہے۔ اخبارات کے پریس رجسٹرار کا دفتر کاغذ کا کوٹہ۔ اور ایڈورٹائزنگ اور وژول پبلسٹی کا محکمہ اردو اخبارات کو اشتہار فراہم کرتا ہے۔ پبلی کیشنز ڈویژن اردو میں کتابیں اور آج کل یوجنا جیسے اردو رسالے شائع کرتا ہے۔

شری بھگت نے کہا کہ اسی طرح وزارت تعلیم اردو کی ترقی کے لیے بڑا کام کر رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو اعلیٰ سطح کی تعلیمی کتابیں، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ اسکولوں کے نصاب کی اردو کتابیں، نیشنل بک ٹرسٹ اور ساہتیہ اکادمی ادبی، تہذیبی نیز معلوماتی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ مختلف مرکزی وزارتیں دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کے لیئے بھی انعامی مقابلوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہ انعامی مقابلے بھی اردو کی تخلیقی سرگرمی کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ لگ بھگ یہی صورت حال مختلف ریاستوں میں ہے۔ اردو جموں و کشمیر۔ کی سرکاری زبان ہے۔ اسے بہار کے بعض ضلعوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ

حاصل ہے۔ اردو نے آندھرا پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک، اترپردیش جیسی ریاستوں میں ہر سطح پر ترقی پائی ہے۔ اردو کے فروغ کے لئے ریاستوں کی کارگزاری کا اندازہ ایک اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت تقریباً ۱۲ ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہوچکی ہیں۔ ان میں اترپردیش، جموں و کشمیر، مہاراشٹر، کرناٹک، بہار، ہریانہ اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیاں خاص طور پر ذکر کے مقابل ہیں۔ مجھے خود دہلی اردو اکاڈمی کا بانی ممبر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس اکادمی کو قائم ہوئے گو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ لیکن اس نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ یہ اکادمیاں طالب علموں کو وظیفے دیتی ہیں۔ کتابیں اور ... رسالے شائع کرتی ہیں، شاعروں اور مصنفوں کو کتابوں کی اشاعت کے لئے عطیے دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفوں کی حوصلہ افزائی یوں کرتی ہیں کہ اُن کی اچھی کتابوں پر.. انعامات دیتی ہیں۔ یہ بزرگ شاعروں ادیبوں اور صحافیوں کو پنشن دیتی ہیں۔ بیماری میں اُن کی مدد کرتی ہیں۔ ان اکادمیوں کا سالانہ بجٹ پانچ لاکھ روپیے سے چالیس لاکھ روپیے تک ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ اردو کی ترقی کا کچھ اندازہ آپ اس امر سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ کہ آج ملک بھر میں اردو کے تیرہ سو سے زیادہ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں نہ صرف اخبارات و رسائل کی تعداد بڑھی ہے، بلکہ ان کی تعداد اشاعت یعنی سرکولیشن میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہر برس شائع ہونے والی اردو کتابوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم کو لیں۔ اس وقت ہندوستان بھر کی باون (۵۲) یونیورسیٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کم و بیش ایسی ہی ترقی دوسرے شعبوں میں بھی ہوئی ہے۔

انہوں نے کہا کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کوئی بھی زبان صرف سرکاری سرپرستی اور امداد سے ترقی نہیں کرسکتی۔ اس کی ترقی اس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں پر بھی منحصر ہے۔ یہ بات اپنی جگہ خوشی کا باعث ہے کہ خود اُردو والے اس کام میں پیش پیش ہیں۔ اُردو ادارے اور تنظیمیں بھی اپنے طور اچھا کام کررہی ہیں۔ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ہی کو لیجئے۔ یہ انجمن سنہ ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آج ملک بھر میں اس کی چھ سو شاخیں ہیں جو مختلف طریقوں سے اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔ ایسے کئی سلسلے ادارے ملک کی مختلف ریاستوں میں اچھا کام کررہے ہیں۔ ان سب کے باوجود ممکن ہے۔ بعض ریاستوں میں اردو کی ترقی کی رفتار سست ہے یا خواہ مخواہ رکاوٹیں ہوں تاہم اس سلسلے میں کوششیں کی جارہی ہیں۔ ہم امید کرسکتے ہیں کہ جلد دور ہوجائیں گی۔

باقی برصفحہ (۲۷)

ڈاکٹر کے بھکتا وتسل ریڈی

اعلیٰ تعلیم میں اساتذہ سے استفادہ

اعلیٰ تعلیم ہر ملک میں نمایاں تبدیلی لاتی ہے انسانی قدروں کی پرکھ اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ ہو پاتی ہے خواہ وہ کالج کی سطح پر ہو یا جامعہ کی سطح پر۔ ہندوستان میں حصول آزادی کے دن صرف چوبیس جامعات اور ملک بھر میں چھ سو کالجس میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام تھا۔ چالیس سال آزادی کے ہو گئے ہیں۔ آج ایک سو پچاس جامعات ہیں اور پانچ ہزار سے زیادہ کالجس ہیں۔ پہلے پنچسالہ پلان میں پندرہ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کی گئی۔ چھٹے پلان میں (۸۶۸) کروڑ روپیے کی رقم خرچ ہوئی۔ طلبا کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی ساتھ ہی ساتھ مد۔ وسائل میں وسعت نہ ہو سکی۔ کئی کمیشنوں کی رپورٹوں میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لیے سفارشات کیے گئے مثلاً رادھا کرشنن ، کوٹھاری کمیشن اعلیٰ تعلیم کے انحاط کی خامیوں کا خصوصاً ذکر ہوا ان رپورٹوں میں مثلاً اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں شور و شر، اساتذہ میں عدم دلچسپی تدریسی وسائل (خصوصاً علاقائی زبانوں میں) کی عدم سربراہی ، تدریس کے خطہ میں معیار (ملیا) یعنی جانچ پرکھ میں ترمیمات کا تیزی سے عمل میں نہ لانا کمزور طبقات کے لیے سہولتوں کی فراہمی میں کمی بیروزگاری کا مسئلہ حل نہ ہو پانا وغیرہ۔

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ (۱۹۶۴-۶۶) ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کے فروغ کے لیے جامع دستاویز ہے اس کمیشن کے ہدایت میں اہم سفارشات مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(۱) ۱۰ + ۲ + ۳ نظام تعلیم کی عمل آوری

(۲) داخلوں پر ایک طرح کی پابندی۔
(۳) تعلیمی نصاب میں ہماری تہذیب و تمدن کا ذکر
(۴) کمزور طبقات کو مساوی حقوق کی فراہمی
(۵) تعلیم کے نظم و نسق میں نمایاں تبدیلیاں

قومی سطح پر کچھ حد تک ان سفارشات پر عمل کیا گیا تقریباً بیشتر ریاستوں میں (۱۰+۲+۳) نظام کو اپنایا گیا۔ کمزور طبقات کو کافی مواقع فراہم کئے گئے البتہ داخلوں پر پابندی نہ ہونے کی وجہ سے اور نتیجتاً سرعت کے ساتھ کالجس کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے نظم و نسق میں بہتری پیدا نہ ہو سکی۔ اب ہمارے ملک میں (۲۳-۱۷) سال کی عمر کے طلبا میں صرف ۴ء۸ فیصد طلبا ہی اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں داخلہ لے پاتے ہیں پھر بھی بعد کی بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے روس میں، جاپان میں، ہم سے تین چار گنا فیصدی اعلیٰ تعلیم کے احاطہ میں زیر تعلیم ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں مرتب کی گئی ہے گذشتہ خامیوں کو دور کرنے کے لیے اقدامات کئے گئے ہیں اساتذہ کی تربیت کے لیے، کمزور طبقات کی امداد کے لیے اقلیتوں کے لیے تعلیمی مواقع وسائل کے بھرپور استعمال کے لیے منصوبے بنائے گئے ہیں)، ٹاسک کمیٹی کی رپورٹ بھی اگسٹ ۱۹۸۸ء میں آگئی ہے قومی سطح پر تمام ریاستوں کے لیے ایک ہی طرح کا نصاب ضروری سمجھا گیا ہے بارویں جماعت کی سطح پر گریڈز سسٹم کو رائج کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے احاطہ میں بنیادی تبدیلیاں، اصلاحات، ترمیمات لانے میں کئی اہم مسائل درپیش ہیں مثلاً انسانی قابلیت کی منصوبہ بندی، وسائل کا بھرپور استعمال انتخاب کا طور طریق اساتذہ کی پرکھ و تربیت و ہمت افزائی تعلیمی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنا۔

خود مختاری چند کالجس کو دینے کی تجویز ہے تقریباً پانچ کالجس کو خود مختار دینے کا پلان ہے جو یو۔جی۔سی کے زیر غور ہے توقع ہے کہ اس پلان سے معیاری ٹیچنگ اور نفیس ترین تربیت شدہ اور کامل اہل افراد صحت مند ماحول میں اپنی زندگی گذار سکتے اور ذمہ دار شہری کہلائے جا سکتے ہیں۔

آج اساتذہ کو کالی تختی کے استعمال سے ہی فرصت نہیں ہوتا ہے بلکہ ٹی۔وی،

ریڈیو، آڈیو وڈیو ٹیپس، فلالین بورڈ، ڈیلے چارٹس، خاکے، ترسیمات، گراف ڈسکس، پیٹو گرامس سے فلاں عنوانات کی تشریح کرنا ہے۔ اساتذہ، وقت کی رفتار کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتا ہوگا ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے

اگر تعمیر نو کی حسرت ہے تو اے لوگو
رواج و رسم کیا ہے فکر کا انداز بدلو

ہر ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے ایک کونسل مقرر کرنے کی تجویز بھی نئی تعلیمی پالیسی میں ہے اساتذہ کے لیے یافت میں اضافہ اور رہائش کے لیے کوارٹرز کی تجاویز بھی کی گئی ہیں آندھرا پردیش میں نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں اعلیٰ تعلیمی کونسل کے قیام کے لیے حال ہی میں اسمبلی میں ایکٹ بھی پاس کیا گیا ہے۔

بیرون ممالک میں اساتذہ کی جوابدہی کا تعلیمی اداروں میں انتظام ہے اور ایسا نظام رویہ جو بھی مقررہ مدت کے لیے اساتذہ، ماہرین لیے جاتے ہیں اور دوسرے اداروں میں عمدہ مواقع ملنے پر چلے جاتے ہیں۔ تکمیل چاہتے ہیں تو واجبی رقم بھی ادا کر دیتے ہیں۔ روزگاری کے مواقع بھی بیرونی ممالک میں زیادہ فراہم ہیں۔ وہاں پر خودمختار اداروں کی کمی نہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیمی ادارے حکومت چلاتی ہے خانگی اداروں کے تحت بھی ہیں اور بعض ٹرسٹ بھی چلاتے ہیں مثلاً برلا انسٹیٹیوٹ وغیرہ۔ کالجس و جامعات میں نصاب کی تکمیل پروفیسر، ریڈر، لکچرار کراتے رہتے ہیں۔ کیا وقت پر نصاب ختم ہو رہا ہے؟ کیا مقررہ مدت میں تحقیق کے نتائج کی اشاعت ہو رہی ہے تنظیمی امور کس طرح ہیں اس کی پرکھ معقول پیمانہ پر ہو رہی ہے یا نہیں یہی تو جوابدہی کا مفہوم ہے۔

اساتذہ کی پرکھ کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جمہوری نظام میں عوام کا حق ہے کہ سرمایہ کا صحیح استعمال ہو رہا ہے یا نہیں دیکھ پائیں۔ منتخب شدہ افراد یا کمان یا اسمبلی کے اراکین کئی کمیٹیوں کی شکل میں تعلیم یا دوسرے امور کے فروغ کے لیے مل کر کام کرتے ہیں سنات منتخبہ کمیٹی کے اراکین کی شکل میں کام کرتے ہیں سہولتوں کی شکل میں بھی تعلیمی اداروں میں طلبا کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اساتذہ باہمی بات چیت سے صلاح مشورہ سے تدریس کے پہلوؤں پر مزید روشنی ڈال سکتے ہیں بیرونی ماہرین بھی اگر اساتذہ کو پرکھ سکتے ہیں۔

تعلیمی نقاط نظر سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ طلبا بھی اساتذہ کو سمجھ سکتے ہیں صلاحیتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ تعلیم کا معیار کیا ہے۔ تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی ہے یا نہیں۔ نصاب وقت پر ختم ہو رہا ہے کیا؟ تحقیق کا رجحان ہے کیا؟ کسی عنوان پر اچھی تقریر کر سکتے ہیں کیا؟ طلبا کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ معاشی پستی دور کرنے کے لیے ان کا حل کیا ہے؟ کالجس کے ٹائم ٹیبل کے علاوہ بھی کچھ طلبا کو مشورہ دیتے ہیں کیا؟ ایسے امور پر طلبا بے خوف جواب دے سکتے ہیں اور ایک نظام کے تحت جوابات کا تجزیہ کیا جائے تو اساتذہ کی پرکھ ہو پاتی ہے اور ان کی جوابدہی منظر عام پر آجاتی ہے۔ ہندوستان میں کیا طلبا کا جانچ کرنے کا معیار ہے یا نہیں؟ اکثر لوگوں میں شک و شبہ ہے۔ عام طور پر اپنے گھروں میں کے بچی کی چھپیاں بھی ہماری ٹیچر خوش اخلاق ہیں اچھی طرح پڑھاتی ہیں کہتی ہیں ٹیچر اگر سخت ہے تو کہہ دیتی ہیں پڑھاتی نہیں صرف مارتی ہیں۔ اگر چھوٹے بچوں کا یہ حال ہے تو بالغ طلبا کو برابر اپنا فیصلہ آواز ن کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ صرف رہنمائی درکار ہے۔

غرض باہمی پرکھ بیرونی پرکھ (External Evaluation) و طلبا کی پرکھ (Student Evaluation) سے اساتذہ کی جوابدہی کا انتظام ہو سکتا ہے۔

تدریس کا بجا انتظام مناسب ماحول، وقت پر وسائل کی فراہمی ٹھیک نظام العمل پر امتحان کا انعقاد اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے لیے مزید ہو جائے تو اساتذہ کی جوابدہی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اساتذہ کی جوابدہی کے لیے سماج میں شعور کی ضرورت ہے ساتھ ہی ساتھ عوامی نمائندے، سرپرست، شہر کے معزز افراد، پرستار تعلیم، اعلیٰ تعلیمی اداروں کے امور میں دلچسپی لیں اور مفید اقدامات کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کریں۔

ہندوستانی تہذیب میں استاد کا خاص مقام ہے، طلبا کی کردار سازی میں استاد کا خاص حصہ ہے۔ اگر ہمیں اپنی قومی خواندگی بڑھانا ہے اور اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کر کے ترقی کی طرف گامزن ہونا ہے تو اساتذہ سے پورا پورا استفادہ کرنا ہوگا۔ استاد چاہے ثانوی استاد ہو یا جامعہ کا پروفیسر اس خصوصی مقام کو قائم رکھنا ہوگا تاکہ وہ نئے تعلیمی ڈھانچہ میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر سکے نئی

باقی صفحہ (۳۰)

پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا

نوجوانوں کی قوت

کیا سماجی خدمات صرف پیشہ ورانہ سماجی کارکنان کی ہی خصوصی ذمہ داری ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ملک کے ترقیاتی کاموں میں ہم اپنے نوجوانوں کی ذمیہ قوت کا استعمال کر سکیں۔؟
نوجوان ایک ایسی قوت ہے کہ اگر اس کا صحیح استعمال نہ ہو تو یہ تخریبی کاموں میں لگ جاتی ہے۔ جب کبھی تشدد پھوٹتا ہے تو یہی آواز سنائی دیتی ہے کہ "نوجوانوں کو قابو میں کیا جائے"۔ ایک عام خیال یہ کہ ہے کہ سماج مخالف اور علیحدگی پسند سرگرمیوں میں حصّہ لینے والے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہے۔

یہ بھی ایک سماجیاتی حقیقت ہے کہ جب کبھی نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے تو جرائم بھی بڑھ جاتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ صرف بے روزگار نوجوان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس نے ہماری یونیورسٹیوں کو بھی پراگندہ کر دیا ہے۔ گھیراؤ، ہڑتالیں، عوامی حمل و نقل کی خدمات کی توڑ پھوڑ کی کارروائیاں عموماً ایسے ہی نوجوان کرتے ہیں۔ جو تعلیمی ڈھانچے سے مطمئن نہیں ہوتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کو جب اپنی صلاحیتوں کے استعمال کے لئے تعمیری ذرائع دستیاب نہیں ہوتے وہ لوگ گلی کوچوں میں کھل تخریبی کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

کوٹھاری کمیشن نے 'تعلیمی کمیشن (۶۶ - ۱۹۶۴) میں غالباً اسی خیال کے تحت سفارش کی تھی کہ ہر سطح پر طلبا کو ان کی تعلیم کے ایک حصّہ کے طور پر سماجی خدمات میں شریک کیا جانا چاہیے۔

حکومت ہند نے نہ صرف یہ کہ اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا اور ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی میں اسے شامل کیا بلکہ مہاتما گاندھی کی صد سالہ سالگرہ کے دوران قومی خدمات سے متعلق اسکیم (NSS) کو بھی ۲۴ ستمبر ۱۹۶۹ء کو شروع کیا۔

مذکورہ اسکیم ایک پائلٹ پراجیکٹ کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ جس نے ۴۰۰۰۰ طلباء کے اندراج سے ۳۷ یونیورسٹیوں کا احاطہ کیا تھا۔ آج اس کے تحت ۱۲۰ یونیورسٹیوں اور ۵۰۰۰ سے زیادہ کالجوں میں ۶٫۷۵ لاکھ (۸۷-۱۹۸۶) طلبا کا اندراج ہے۔

انسانی وسائل کے فروغ سے متعلق مرکزی وزارت اس اسکیم NSS کے لئے پالیسی وضع کرتی ہے اور نوجوانوں کے امور اور کھیل کود سے متعلق محکمہ اس پروگرام کی نگرانی کرتا ہے۔ قومی خدمات کی اسکیم سے متعلق ریاست کی مشاورتی کمیٹی، ریاست کی سطح پر وائس چانسلر کی سربراہی میں کام کرنے والی ریاستی کمیٹیوں سے تال میل کرتی ہے جو کہ پروگرام پر عمل درآمد کے لئے کالج کی سطح پر آفیسر کے ساتھ مل جل کر کام کرتی ہے۔ ریاست یونیورسٹی اور محکمے کی سطح پر مناسب رابطے کو موثر بنانے کی غرض سے قومی خدمات کی اسکیم کے پروگراموں کی نگرانی، جائزے نیز مناسب رہنما خطوط وضع کرنے اور صلاح ومشورے کے لئے ۱۵ علاقائی مراکز اور پروگرام سے متعلق مشاورتی محکمے قائم کئے گئے ہیں۔

چہار جہتی نصب العین

قومی خدمات کی اسکیم کا چہار جہتی نصب العین ہے طلباء کے تشخص کو فروغ دینا، انمیں لیڈر شپ کی صلاحیت پیدا کرنا، ان کے اندر قومی نظریئے کو فروغ دینا اور شہری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا۔ اسکیم کی دو سال کی مدت کے دوران کوئی بھی طالب علم کم سے کم ۱۲۰ گھنٹے سالانہ سماجی خدمات کرتا ہے۔

مذکورہ اسکیم کے تحت دو طرح کے پروگرام ہوں با قاعدہ پروگرام اور کیمپ لگانے کے خصوصی پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مسلسل پروگرام، ہفتہ کے آخر میں چھٹیوں یا کالج کے اوقات کے بعد رکھا جاتا ہے۔ یہ سرگرمیاں دیہی اور شہری دونوں طرح کے باشندوں کے درمیان، اداروں میں، یا خود اسکولوں کے احاطے میں ہی عمل میں آتی ہیں۔ مذکورہ اسکیم کے مسلسل پروگرام کے تحت شجر کاری کے ذریعہ درختوں کے فروغ کا شعور درختوں کا تحفظ، گوبر گیس پلانٹ کی تعمیر اور اس کی عوام میں مقبولیت، گاؤں کے تالاب کی صفائی۔ عوام کو بیماری کے ٹیکے لگوانے اور غذائی پروگراموں میں کام کرنا، دیہی عورتوں کی خاندانی بہبود سے متعلق تعلیم، شہر کے گندے علاقوں میں صفائی ستھرائی اور سماجی برائیوں کے خلاف تحریک وغیرہ چند سرگرمیاں شامل ہیں۔ طلباء پیداوار سے متعلق

پروگرام مثلاً طریقوں اور مشینوں کے ذریعہ زراعت کی ترغیب، کترنے والے جانوروں اور نقصان پہونچانے والے کیڑوں کی روک تھام اور زمین کو بہتر بنانا وغیرہ جیسے پروگراموں میں بھی حصّہ لیتے ہیں۔

ان کے علاوہ ہنگامی حالات وغیرہ مثلاً جنگ یا عام ہڑتال کے دوران ضروری اشیاء کی تقسیم میں متعلقہ حکام کے تعاون کے لیئے ان طلباء کو ضروری تربیت بھی دی جاتی ہے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ طبی ہنگامی صورت حال کے دوران ٹیکہ لگانے، بیماریوں سے بچاؤ کی تدبیر کرنے اور ادویات کی فراہمی وغیرہ میں صحت سے متعلق حکام کو مدد کریں گے۔ سماجی کاموں کے لیئے مختلف پس منظر سے رضاکاران جب جمع ہوتے ہیں اور کیمپ لگانے کا خصوصی پروگرام منعقد ہوتا ہے تو توقع کی جاتی ہے کہ نوجوانوں کے چیلنجوں سے نپٹنے اور ان کی ہنرمندی کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوگا۔ کیمپ کے تجربات سے ان نوجوانوں کے رویئے، ہنرمندی، انداز فکر اور تعداد میں کافی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

گزشتہ اٹھارہ برسوں میں قومی خدمات کی اسکیم نے طلباء کو اس لائق کر دیا ہے کہ وہ سماجی خدمات اور قومی ترقی و فروغ کے مختلف پروگراموں میں اپنے ڈگری کورسوں کے درمیان شرکت کر سکیں۔ اس نے ہمارے طلباء کو ہمارے سماجی ماحول حالات اور مسائل کو سمجھنے کا موقع دیا ہے، منصوبہ بندی کمیشن کے ایک جائزے کے مطابق قومی خدمات کی اسکیم۔ شہری اور دیہی نوجوانوں خصوصی طور طلباء میں، ہمارے قومی مقاصد سے متعلق بیداری پیدا کرنے نیز اپنی انہیں ان کی تکمیل کی ترغیب دینے کی غرض سے ان کی زیادہ سے زیادہ شرکت کو یقینی بنانے کے سلسلے میں کافی کارگر ثابت ہوئی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی میں طلبا کے مستقبل کو سدھارنے میں اساتذہ سے قوی توقعات کا اظہار کیا گیا ہے ضرورت ہے اساتذہ کی پرکھ کا انتظام کرکے ان کی صلاحیتوں سے کما حقہ استفادہ کیا جائے تاکہ نئی قومی تعلیمی پالیسی کے مقاصد بہتر طریقہ سے جلد حاصل ہوں۔ ++

(سلسلہ ص ۹۶)

بڑی مہم جو سردار نہیں بلکہ ایک خاندان شاہی کا بانی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اقدامات کا عرب دنیا پر فوری کوئی خاص اثر نہیں ہوا امراء کے مرنے کے بعد وراثت کے جھگڑے اور خانہ جنگیاں ہنوز بدستور جاری رہیں۔

اچھی مثال

اگر ہمیں قوم کی تعمیر کرنی ہے اس کی کمزوریوں کو دور کرنا ہے تو ہر شہرت ناموری سے بالاتر ہو کر اپنی جدید نسل کے تعلیمی اور تربیتی پہلو کی طرف توجہ دینی ہوگی، اس کے دینی شعور اور احساس ذمہ داری کو بیدار کرنے کے لئے خاموش اور بے لاگ خدمت کرنی ہوگی۔ اگر ہم تھوڑی سی ہمت سے کام لیں اور ایثار و قربانی کے ساتھ اس کام میں لگ جائیں تو بتاشید[?] خداوندی قوم کو پستی سے اٹھانے کا کام آسان ہو جائے گا۔

الحمد للہ کہ یہ کام انفرادی و جزوی طور پر کہیں کہیں ہو رہا ہے جو دوسروں کے لئے نمونہ اور باعث تقویت ہے اور اس سے بڑا سبق لیا جا سکتا ہے اگر تھوڑی سی ہمت اور حوصلہ ہو۔

گجرات کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کا مزدور طبقہ دور دراز گاؤں میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ رہتا ہے غربت و جہالت اور اکثریت کے ساتھ خلا ملا کے سبب اس میں اس کا شعور کم ہے کہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا نظم کرے اور اگر کچھ شعور بھی ہو تو غربت مانع ہوتی ہے۔ مارچ ۸۸ء کو مولانا غلام محمد نور گت صاحب کی دعوت پہ گجرات ترکیسر کا ایک بہت مختصر سفر ہوا۔ مولانا نورگت صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہمت و حوصلہ عطا فرمایا ہے کہ وہ ایک طویل عرصے سے ایسے علاقوں میں مکتب قائم کر رہے اور ان مکاتب کی دوست و احباب کے تعاون سے کفالت کرتے ہیں جہاں کے مسلمان پسماندہ و غربت زدہ ہیں، لیکن بعض گاؤں ایسے ہیں جہاں کے مسلمانوں کے ایک ہی دو گھر ہیں جہاں مستقل مکتب قائم کرنا تو مشکل ہے اور اکثریت کے ساتھ رہتے رہتے ان مسلمانوں کا دینی شعور بھی مردہ ہو چکا ہے ایسے بچوں کے لئے مولانا موصوف نے

"دو بچوں کا گھر" کے نام سے الگ مکتب چلانے کا اہتمام کیا ہے اس طرح کے اس مکـ
میں بورڈنگ ہاؤس بھی ہے اس میں ایسے مسلمانوں کے بچے جو غریب اور مزدور پیشہ ہیں:
خوشامد کر کے لائے جاتے ہیں اور ان کے کھانے کپڑے کا بار اٹھا کر ان کو تعلیم دی جا:
حسب ضرورت بعض خاص حالات میں ان کے والدین کا بھی مالی تعاون کر دیا جا:
سرکاری تعلیم چونکہ لازمی ہے اس لئے اسی مدرسہ میں اسکول کے وقت سرکاری اسات
ان کو عصری تعلیم دیتے ہیں۔ باقی اوقات میں قرآن مجید اردو اور دینیات کی تعلیم دی جا:
مدرسہ میں ایک مسجد بھی ہوتی ہے جس میں باقاعدہ نماز اور دینیات کی پوری تربیـ
دی جاتی ہے بچوں کے اس گھر میں صرف بچے ہی نہیں بلکہ چھوٹی عمر کی بچیاں بھی ہوتی ہیں
ـے رہنے کھانے اور دیگر ضروریات کا نظم الگ ہوتا ہے ایک معمر خاتون
بچیوں کی اتالیق ہوتی ہیں، اس طرح سے ان دور دراز گاؤں کے بچوں اور بچیوں کی تا
تربیت کے حوصلہ مندانہ کام کرنے کا اللہ تعالیٰ نے مولانا نورگت صاحب کو ذوق وجذ
دیا ہے اس طرح کے دو بچوں کے گھر دیکھنے کا موقعہ ملا اور نہایت خوشی و مسرت ہو
مولانا نورگت صاحب جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن شوریٰ بھی ہیں ایک عرصہ ـ
خواہشمند تھے کہ ان دونوں مدرسوں کے کسی سالانہ جلسہ میں حضرت مولانا سید ابو
علی ندوی مدظلہ کو بلاتے اور اس طرح جوار کے لوگوں کو بھی استفادہ کا موقعہ ملتا او
حضرت مولانا کی دعائیں بھی ملتیں لیکن مولانا مدظلہ کی مصروفیات اور عوارض نـ ا
کا موقع نہ دیا تو مولانا نورگت صاحب نے مجبوراً حضرت مولانا مدظلہ کے بعض تیا
ہی کی آمد و شرکت کو غنیمت جانا۔ چنانچہ مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب نائب مہتمـ
دارالعلوم ندوۃ العلماء جن سے مولانا کے برسوں سے تعلقات ہیں کی سرکردگی میـ
راقم سطور شمس الحق ندوی اور عزیز و ہونہار نوجوان داعی مولوی سلمان حسینی:
سلمہ ان جلسوں میں شریک ہوئے اور مدرسہ کے نظم و ضبط اور لوگوں کا ان ـ
تعلق دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی جلسوں میں قرب و جوار کے علماء بھی شریکـ
ہوئے اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

اسی طرح ترکیسر سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر "اکل کوا" نامی ایکـ
گاؤں میں قائم مدرسہ اشاعت العلوم جس کے مہتمم نوجوان و حوصلہ مند عالم غلام
صاحب وستانوی ہیں، میں جانے اور دیکھنے کا اتفاق ہوا یہ نوجوان عالم مولانا نورگـ

باقی ص ــــ

خبرنامہ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ

آل انڈیا اردو ریسرچ کانگریس ۱۹۸۹

قاضی عبدالودود کے بنا کردہ ادارہ تحقیقات اردو (اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) نے سالانہ اردو ریسرچ کانگریس کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کے تحت دو کانگریسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ ۱۹۸۷ کی پہلی کانگریس میں جامعات میں ہونے والی ریسرچ کا جائزہ لیا گیا ۱۹۸۸ کی کانگریس میں ایک حصہ پچھلے سال کی مانند تھیسسوں کے جائزے کے سلسلے میں تھا اور دوسرا حصہ کسی اردو بجل تحقیقی نکتے کی بازیافت کے سلسلے میں۔

ادارہ تحقیقات اردو (اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی مجلس عاملہ کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر محمد محسن پروفیسر سید حسن، پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، جناب احمد یوسف، مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے شرکت کی۔ اجلاس میں دونوں کانگریسوں کے نتائج کا جائزہ لیا گیا۔ مجلس عاملہ نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ تھیسسوں کے جائزے سے اچھا اثر پڑا ہے اور قاضی عبدالودود کی روایت کو استحکام پہنچا ہے یعنی جامعات میں ریسرچ کرنیوالے اور کرانیوالے چوکنا ہو گئے ہیں اور زیادہ محنت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ دو سالہ تجربے کی بنا پر اندازہ ہوا کہ (ا) تھیسس کا جائزہ اور (ب) کسی تحقیقی نکتہ پر مشتمل مقالات اردو ریسرچ کانگریس کے لیے کافی نہیں ہیں اس لیے ادارہ تحقیقات اردو کی مجلس عاملہ نے طے کیا کہ جنوری ۱۹۸۹ میں منعقد ہونے والی کانگریس کے تیسرے اجلاس سے کانگریس کا تصیم اس طرح بدل دیا جائے کہ اس کا کینوس وسیع ہو جائے۔ اس طے ہوا کہ اگلی کانگریس سے جائزے کا عنوان " اردو میں علم و ادب کی رفتار "، جس میں صحافت اور دانشوری کے جائزے بھی شامل رہیں گے۔

علی گڑھ، کشمیر، حیدرآباد، دہلی اور لکھنو وغیرہ کے نمائندوں نے اپنے

کانگریس کے انعقاد کی جو پیشکش کی تھی اسے سامنے رکھتے ہوئے مجلس عاملہ نے یہ بھی طے کیا کہ ۱۹۸۹ء کا اجلاس فروری نہیں کہ پٹنہ ہی میں ہو۔ اگر کسی اور جگہ سے باقاعدہ دعوت موصول ہوتی ہے اور وہاں اجلاس ہونے کے امکانات روشن نظر آتے ہیں تو اس دعوت کو قبول کرنے پر غور کیا جائے گا۔

ریسرچ کانگریس کے اجلاس میں سائنس کانگریس اور ہسٹری کانگریس کی طرح اردو علوم وادبیات سے دلچسپی رکھنے والے شرکا اپنے اپنے خرچ پر شریک ہوں گے تاکہ اس سالانہ جائزے میں اپنا حصہ بٹا سکیں، کچھ سکھا سکیں، کچھ سیکھ سکیں۔

۱۹۸۹ء کی کانگریس کے ایک دن کے سیشن کو "دانشوری پچھلے سال میں" کے لیے بھی وقف کیا جائے گا۔

خدا بخش لائبریری میں قائم ادارہ تحقیقات اردو کے سکریٹریٹ نے مندرجہ بالا امور جاری کرتے ہوئے جامعات میں اردو کے اداروں، لائبریریوں، اردو اکادمیوں، اردو کے مقتدر صحافیوں اور آزاد قلمکاروں (ایسے جو کسی ادارے سے وابستہ نہیں ہیں) کی توجہ اس طرف مبذول کی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اس کانگریس کو زیادہ سے زیادہ دانشوروں کا تعاون ملے گا۔

پچھلی دو کانگریسوں کے سلسلہ میں یاد دہانی کے طور سے چند سطور کا اضافہ یہاں کر دینا مناسب ہوگا۔

ادارہ تحقیقات اردو اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے، جسے عظیم محقق قاضی عبدالودود نے قائم کیا تھا قاضی صاحب کی وفات کے بعد ادارہ پچھلے دو برسوں سے جنوری کے آخری ہفتے میں چند دن اپنے بانی کی یاد مناتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زبان و ادب کے معیار کو اونچا اٹھانے کے لیے اور خاص کر اردو تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کے لیے "آل انڈیا اردو ریسرچ کانگریس" عنوان کے تحت ادب کی عمومی رفتار کا بے لاگ جائزہ لیا جاتا ہے — یہ سلسلہ خود قاضی عبدالودود نے چھیڑا تھا اور "دانشگاہوں میں تحقیقی کام" کے عنوان سے کئی تیسوں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔

کانگریس کے دوران اردو ادب کی سمت و رفتار پر ممتاز ترین اردو ناقد واں خطبات کے لیے بھی مدعو کیا جاتا ہے اور دو دو میموریل خطبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

آل انڈیا اردو ریسرچ کانگریس پچھلے دو برسوں سے خدابخش لائبریری اور ادارہ تحقیقات اردو (اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کے مشترک اہتمام سے منعقد ہو رہی ہے اور اسے اہل علم کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔

پہلی کانگریس یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ اور پی ایچ ڈی کے جائزے کے لیے وقف تھی، جو ۱۹۸۷ء میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے تقریباً پینتیس تھیسسوں کا جائزہ لیا گیا تھا ان سب مقالہ نگاروں کو ان کی تھیسس پر جائزے کی نقل بھی بھیج دی گئی تھی تاکہ اگر غلط فہمی یا غلطی سے جائزہ نگار کے مضمون میں کچھ امور پر انھیں کچھ کہنا ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔ ان میں سے اکثر کے جوابات بھی موصول ہو چکے۔ یہ جائزے اور جوابات کتابی شکل میں آرہے ہیں۔

کانگریس کے موقع پر وردو میموریل خطبات کا بھی ایک سلسلہ ہے جس میں اردو کے یونیورسٹی پروفیسروں کو خطبات کے لیے مدعو کیا جاتا ہے اس سلسلہ کا پہلا خطبہ ڈاکٹر محمد حسن (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے دیا تھا جس کا عنوان تھا "اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ کا خاکہ"۔

۱۹۸۸ء کی جنوری میں اردو ریسرچ کانگریس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جسے پچھلے تجربہ کی روشنی میں دو حصے کر دیے گئے۔ ایک پچھلے سال کی جامعات کے تھیسس کا جائزہ اور دوسرا کسی اوریجنل تحقیقی نکتے پر مشتمل مقالہ۔ اس بار تیرہ مقالے تھیسس کے جائزے اور بائیس مقالے اوریجنل تحقیقی نکتوں پر پڑھے گئے۔

کانگریس کے دوران گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی ہر شام کو وردو میموریل خطبات کا سلسلہ جاری رہا اور اس بار چار پروفیسروں کے خطبات ہوئے۔ ڈاکٹر محمد عقیل (الہ آباد یونیورسٹی) نے "اردو ادب کدھر"، پروفیسر قاضی عبدالستار (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اردو ادب کدھر جناب شمس الرحمن فاروقی نے "اردو داستان" اور ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی یونیورسٹی) نے "اردو دانشوری آزادی کے بعد" اور اردو ادب پر مغربی ادب کے اثرات" کے موضوعات پر وردو میموریل خطبات پیش کیے۔

۱۹۸۸ء کانگریس کا ایک خصوصی سیشن اردو ہندی، ہندستانی مسئلہ کے لیے بھی مختص کیا گیا جس میں اس پر بھرپور بحث ہوئی کہ اردو اور ہندی کو کب تک ایک دوسرے کا حریف سمجھا جاتا رہے گا اور یہ کہ کیا ہندستانی گاندھی جی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ ٭٭

شیخ سلیم

غالب اور غم

غم' در حقیقت ایک ازلی حیثیت رکھتا ہے جو انسان کو اسکی اپنی فطرت کی شکل میں ودیعت ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان دنیا میں جنم لیتا ہے تو روتا ہوا آتا ہے کسی دانشور کا قول ہے کہ غم بندے کو رب سے ملا دیتا ہے۔ اسی طرح کئی ایک نظریات غم سے متعلق ملتے ہیں۔

بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے ساتھ لفظ "غم" کا استعمال کریں، کیونکہ وہ تو "حیوانِ ظریف" مشہور تھے۔ یادگارِ غالب" میں حالی نے مرزا اسداللہ خاں غالب کو "حیوانِ ظریف" ہی کہا ہے۔ خوش طبعی، زندہ دلی، رنگین مزاجی اور شگفتگی انکے مزاج کا لازمی جزو بن کر رہ گئے تھے۔ ہمیں غالب کی بیشتر فارسی شاعری میں شادمانی اور حسرت کا جذبہ بدرجہ اتم ملتا ہے۔ باوجود اسکے غالب جیسا حقیقت نگار شاعر بھی زندگی کے اس لذت انگیز جذبہ کو یعنی "غم" کو بھلا کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ اس طرح غالب کی شاعری کی قوت، غم میں ہے۔ اور یہ غم آنسو بہانے والا غم نہیں بلکہ مردانہ غم ہے۔ حالی نے "یادگارِ غالب" میں غالب کی غزلوں میں غم انگیز کیفیتوں کا جواز کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

> "لیکن در اصل یہ (غزلیں جن میں غم کی کیفیت کا ذکر ہے)
> ان کی شاعری اور انشاپردازی کے میدان میں ایک میدان تھا
> جسکی زمین ان کے دل کو بھا گئی تھی۔۔۔۔ چونکہ مرزا صاحب خاص
> کر رنج و غم کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لئے یہ مضمون
> اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا۔"

گویا حالی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غم ان کا خاص میدان نہ تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ طربیہ قلمکار

ریسرچ اسکالر حیدرآباد یونیورسٹی حیدرآباد۔

..لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یادگار النظر میں تو غالب کی انشاپردازی اور بعد کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کہاں شگفتہ مزاج، خوش فکر، رنگین طبع غالب اور کہاں غم ا سن تیوا ں کو نالذیشون سے کیا لگاؤ۔ اب تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غالب کی عظمت کا مرکز یہی کہ اس نے غم اور قنوطیت کو ایک نیا رنگ ایک نیا مزاج اور ایک نیا کلچر دیا۔ اس غم کو رچایا اور سنوارا نکھارا۔ اس طرح اس کی شاعری میں سنور اور نکھر آئی۔ غم اور غالب مشہور افسانوی کردار یاد آجاتا ہے۔ جو ایک شخص ماہر نفسیات کے پاس گیا تھا اور اس اس سے کہا تھا کہ وہ ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتا ہے۔ اس نے ماہر نفسیات سے کہ وہ اس کے لئے کچھ مشورہ تجویز کرے۔ ماہر نفسیات نے جواب دیا کہ آج کل شہر میں سرکس لگا ہوا ہے اس میں ایک مسخرہ ہے۔ اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے لوگوں کو ہنساتا ہے۔ اکثر سرکس میں جایا کریں۔ اس مریض نے مسکراتے ہوئے کہا "جناب! میں ہی تو وہ جوکر (JOKE) ہوں جو سرکس میں آنے والے لوگوں کے پیٹ میں ہنسی سے بل ڈال دیتا ۔ غالب کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ غالب کی ساری زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم کہ ان کی زندگی المیوں سے بھری پڑی ہے۔ غالب اس وقت پیدا ہوئے جب مسلمانوں رشید اقتدار شفق رنگ ہو چکا تھا۔ وہ انیسوی صدی کی پیداوار تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب عہد دم توڑ رہا تھا اور ایک نیا تمدن ابھر رہا تھا۔ بقول آرنلڈ کے ایک تہذیب مر رہی دوسری بطن گیتی سے ظہور پذیر ہونے والی تھی۔

مغلیہ عہد کے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ ایک غیر ملکی سرمایہ انہ معاشرے کا عفریت سر اٹھائے ہندوستان کے دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے معاشرہ انتشار کا شکار تھا۔ اسلام کی دی ہوئی قوت اتحاد خود غرضیوں اور محلات کی سازشوں ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی۔ سارا ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک رے سے دست گریباں تھیں اور یورپی استعمار ان کا دوست بن کر اپنی بغل میں چھری کھڑا تھا۔ مرزا نے آنکھ کھولی تو "بادہ شبانہ کی سرمستیاں ختم ہو چکی تھیں" رنگا رنگ بزم آرائیوں کا یادیں "نقش و نگار طاق نسیاں" ہو چکی تھیں۔ مرزا صاحب اس دم توڑتی ہوئی معاشرت کو ان اشعار میں پڑھتے ہیں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں۔
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی۔

غالب کے یہ اشعار بھی اس دور کی نہایت عمدہ عکاسی کرتے ہیں ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان وکفِ گل فروش تھا۔

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش وخروش تھا۔

غالب ابھی عالمِ طفلی میں تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ چچا نے پرورش کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ ابھی بچپن کا عہد ختم بھی نہ ہو پایا تھا کہ چچا کا انتقال ہوگیا۔ تیرہ سال کی عمر میں غالب کی شادی کردی گئی۔ غالب جیسے مردِ آزاد کے لئے یہ ابتدائی عمر میں شادی کے معنی کچھ عجیب تھا۔ لاشعور میں بیٹھا ہوا احتجاج شاید اس خوبصورت شعر میں ڈھل گیا

تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

غالب کے سسرال والے متمول لوگ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالب خراج ہو گئے آنا اڑاتے جاتے کھاتے اور کھلاتے۔ یہ عادت عمر بھر نہ گئی۔ رؤسائے دلی پر زوال آیا۔ لک بھی اس کی زد میں آئے لیکن اپنی عادتوں سے باز نہ آئے۔ قرض لیتے رہے اور پیتے رہے اور قرض لینے کے بعد عزتِ نفس کو جو رسوائی ہوئی غالب خود دار انسان کو اس کی چبھن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی ہوگی۔ لیکن ہائے عادت۔ اسکے ہاتھوں مجبور تھے۔ عادت کسی نے خوب کہا ہے کہ فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ ساری کی ساری غیرت و حمیت دھری کی دھری رہ گئی یہاں تک کہ پچاس سال کی عمر میں ایک بار قمار بازی تک کے الزام میں دھرے گئے اور داخلِ زنداں ہوئے۔ غم روزگار نے کیا کیا دن دکھائے۔ جب تیس سال کے تھے تو غالب کے سگے بھائی پاگل ہوگئے اس حادثے کا مرزا غالب کے دل ودماغ پر کم اثر نہیں تھا غالب نے حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کو اپنے اشعار میں سمویا ہے۔ لب ولہجہ میں سوز وگداز نہ سہی لیکن اس میں گہری اداسی اور غمگینی جھلکتی ہے۔ جو انکی دلی کیفیت کی غماز ہے۔ اسکے باوجود غالب اس غم اور رنج کے آگے اپنی سپر نہیں ڈالتے بلکہ وہ اسطرح گویا ہوتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔

غالب نے غم میں فکر کی آمیزش کی اور فکر پر غم کی چھاپ لگائی۔ غم آمیز اور فکر انگیز غم صرف غالب ہی کے کلام کی خصوصیات ہیں جو اور کسی شاعر کے ہاں نہیں ملتیں۔

کہتے ہیں ؏ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

؏ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

پھر غم تو زندگی کی ایسی حقیقت ہے۔ نہ جو سب حقائق سے زیادہ حشر خیز اور اثر انگیز ہوتا ہے۔ غالب بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ غم جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس سے فرار بھی تو ممکن نہیں ہے۔ اسی بات کو غالب نے بہت ہی حسین پیرایہ میں بیان کیا ہے ؎

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے۔
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا۔

یہ تو تھا غمِ روزگار کا ذکر۔ اب ذرا غمِ عشق کا بھی قصہ سنتے چلئے۔ ایک خاتون اد. کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ غالب کی شاعری اور ان کی شخصیت سے انہیں خاص لگاؤ تھا غالب نے بھی لگاوٹ کا جواب لگاوٹ ہی سے دیا۔ کم عمری میں ان سے پہلے ہی گرفتار ہونے کے احساس نے آتشِ عشق کو کچھ اور بھی ہوا دی۔ لیکن شومیٔ تقدیر دیکھئے کہ وہ مروِش دلربا عین عنفوانِ شباب میں مالک حقیقی سے جا ملیں۔ غالب کو ناقابل فراموش صدمہ پہنچا "ہائے ہائے" والی پوری غزل انہیں محترمہ کا مرثیہ ہے۔ دیکھئے انکی موت پر کس کس قسم کے خیالات غالب کے ذہن میں آتے ہیں کہتے ہیں ؎

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اس سانحہ کے کچھ دنوں بعد عارف کے اٹھ جانے کا غم برداشت کرنا پڑا۔ ان کی موت پر کس غضب کا نوحہ کہا ہے۔ اور اس شعر میں تو حد کر دی ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یہ تو ان کے ذاتی المیے تھے۔ اسے آپ غمِ جاناں کہہ لیجئے۔ مرزا غالب کو غم دوراں کا بھی صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مغلیہ عہد ختم ہوگیا سات سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگی ہندوستان کے فرمانروا بن بیٹھے۔ ہندوستانیوں نے بغاوت کر دی۔ بہادر شاہ ظفر نے قیادت سنبھالی لیکن یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ سخت خون خرابہ ہوا۔ لاکھوں افراد مارے گئے۔ عجیب تباہی مچی۔ دلّی ایسی لٹی گویا عروس البلاد کا سہاگ لٹ گیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا غالب نے اپنے ایک خط میں بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

یہ وہ ذاتی معاشرتی اور سماجی حالات تھے جس میں غالب کو ذہنی بالیدگی

حاصل ہوئی اور ان کی شاعری ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی بام عروج کی طرف بڑھتی رہی۔
سی نے خوب کہا ہے کہ فنکار کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے
جس میں اس کا ذہن پروان چڑھ رہا ہو۔ ایک ایسے شخص سے جو خارجی اور داخلی دونوں
الجھنوں کا شکار ہو نشاط انگیز اور طربیہ شاعری کی توقع کرنا فضول ہے۔

شوپن ہار نے کہا ہے "زندگی غم سے عبارت ہے اور خوشی ایک سلبی کیفیت
ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ خوشی کو غم کے عارضی فقدان کا نام دیجئے۔ شاید شوپن ہار یہ
کہنا چاہتا ہے کہ بچہ عالم فانی میں گریاں داخل ہوتا ہے اس لئے گریہ وزاری سے بچے
کی زندگی بھر تو لی دامن کا ساتھ رہتا ہے۔ زندگی غم کا دوسرا نام ہے۔ اور خوشی انسان
کو اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب غم کچھ دیر کے لئے زندگی سے مفقود ہو جائے۔
کسی شاعر نے اس خیال کو بڑے موثر انداز میں کچھ یوں بیان کیا ہے ؎

شادی و غم ہیں جہاں کے ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے اک دن ہنسیئے دس دن محرم روئیے

شاعر ہمیشہ نہایت حساس طبع ہوتا ہے جو جتنا اچھا شاعر ہو گا اس کی طبیعت
اتنی ہی حساس ہوگی۔ مسلسل غم کی یورش نے غالب کو غم زدہ ضرور بنا دیا تھا۔ لیکن شوپن ہار
اور گوتم بدھ کی طرح انہوں نے غم کا علاج فرار میں نہیں ڈھونڈا تھا بلکہ وہ تو ایک باعزم انسا
ن تھے۔ غالب مصائب کی مہیب فوجوں سے ٹکرانے کا عزم رکھتے ہیں ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

غالب کی بیشتر غزلوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان غزلوں میں غم
آگیں اور غم خود فکر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ غالب کی شاعری کے محرکات
میں حسرت اور غم کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ غالب کی زندگی دائمی آرزومندی
میں گذری ہے۔ وہ ہمیشہ آسودگی کے خواہاں رہے۔ اور محرومیوں و نا امیدی
کے باعث اپنا دل مسوس کر رہ جاتے تھے۔ غالب میر کی طرح یاس و حسرت کا
شکار نہیں ہیں اور نہ ہی فانی کی طرح غم حیات کو قیام حیات سمجھنے کے قائل۔
غالب کا لہجہ حزنیہ بھی نہیں جو میر اور فانی کا ہے۔ میر تقی میر کے غم میں خلوص
ہے۔ لیکن فکری عنصر موجود نہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر غم میں فکر کی

آمیزش ہو جائے تو غم میں اخلاص مشتبہ ہو جائیگا۔ دراصل اس سے غالب کے اخلاص کی کمی کا نہیں بلکہ ان کے جذبہ و شعور کی وسعت اور پیچیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔

غم و اندوہ نے ہمیشہ شاعری کو جلادی ہے۔ شاعری کی جان ہی اس کے المیہ عناصر ہوتے ہیں شیلے کا شہرہ آفاق مصرعہ ہے۔

"OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF OUR SADDEST THOUGHTS.

غالب اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے کہا ہے

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی۔

جیساکہ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ غم زندگی کا ایک بنیادی جزو ہے لیکن ہر فرد کا درد اور غم الگ الگ ہوتا ہے غم غم میں فرق ہوتا ہے۔ میرؔ کے ہاں نشاطِ غم ہے۔ وہ غم میں ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں کچلی ہوئی حسرتوں کا تصور اور ذکر میرؔ کو ایک خاص مزہ دیتا ہے۔ سوز و تپش کو وہ زندگی کا سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ فانیؔ کا غم شوپن ہار کے فلسفہ سے ملتا جلتا ہے۔ مجنوں نے بہت صحیح کہا ہے کہ فانی قنوطی سے زیادہ "فراری" ہیں۔ دراصل قنوطیت تو فطرت کا ایک تقاضہ ہے لیکن زندگی سے فرار کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے فانیؔ کی شاعری مردم بیزار شاعری ہے غم کا تصور اقبال کے یہاں بھی ہے لیکن وہ آفاقیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ انہیں "غمِ زمانہ" کھائے جا رہا ہے ورنہ وہ مردِ قلندر تو بنیادی طور پر رجائی تھا۔ انہیں سیاہی شب کے سیماب پا ہونے کا یقین کامل ہے۔ وہ کہتے ہیں

غم زندگی رم زندگی سم زندگی دم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

غالبؔ غم کو زندگی کی بنیادی حقیقت مانتے ہیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

غالبؔ کی زندگی ناکامیوں اور حسرتوں کا مزار تھی۔ ایک اتنا عظیم شاعر اور انسان کی زندگی کے طویل عرصہ تک کوئی خاص مقام حاصل نہ ہو سکا۔ کس حسرت سے غالب ایک جگہ کہتے ہیں۔

"شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم وزر میں تولا گیا تھا مگر میں
اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ
کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے"

کیسا کرب چھپا ہوا ہے اس ایک جملے میں کتنی تلخی ہے اس میں۔ شکسپیر نے کہا ہے کہ
"غم اکیلا نہیں آتا اس کے ساتھ غموں کی ایک بٹالین (BATTALION)
حملہ آور ہوتی ہے۔"

غالب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وطن سے جدائی غریب الوطنی کا غم اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا جتنا اہل وطن کی بے مہری کا غم دردناک ہوتا ہے۔ غالب کو یہ غم بھی دیکھنا پڑا

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں۔

الغرض غالب پر اتنی مشکلیں پڑیں کہ غم کو انہوں نے خضرِ راہ بنالیا ؎

غم خضرِ راہ سخن بودہ است

شاید غم کی یہ یورش نہ ہوتی تو غالب میں یہ گل افشانیٔ گفتار بھی نہ ہوتی۔ زندگی کے اندوہناک تجربات، غم انگیز مشاہدات، ناسازگار حالات اور المناک حادثات سے گھبرا کر کبھی کبھی راہ فرار اختیار کرنے کی بھی سوچتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار — اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب اس بات کو مانتے تھے کہ زندگی اساسی حقیقت، غم ہے ان کے تخریب اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جن سے مسرت جھانکتی ہے۔ غالب کی خوش طبعی، زندہ دلی غم و اندوہ میں بھی شوخی و ظرافت کے پہلو نکال لیتی تھی لیکن ان کے ہر ہر شعر سے عجیب یاس، حسرت، ناامیدی، بیزاری اور درد کا احساس ٹپکتا ہے۔ غالب زندگی کی ہر راہگذر سے اور ہر کوچے سے گذرے، قدم قدم پر انہیں آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ احباب کی بے التفاتی، محبت سے محرومی، اپنوں کی ستم آرائیاں، زمانے کے ظلم و ستم، رقیبانہ چشمکیں، اقتصادی بدحالی اور معاشی بحران، ان کا دل تھا پتھر نہ تھا۔ وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

کبھی کبھی غالب ناقابل برداشت مصائب سے گھبرا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مصائب کے بے پناہ تھپیڑوں کے باوجود غالب کے یہاں ایک عزم ہے ۔ ان کی یاسیت میں میر اور فانی کی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ۔ ان کی شاعری "غم گھٹن کی شاعری" نہیں ہے ۔ غالب کے یہاں یاسیت کی باد سموم نہیں چلتی بلکہ عزم کے فرحت بخش اور حیات افروز جھونکے ملتے ہیں ۔ ارسطو نے کہا تھا ۔

" جس انسان میں سوز و محبت نہ ہو تو وہ لازمۂ انسان سے خارج ہے ۔"

سوز و محبت ' غم کی پیداوار ہے ۔ لیکن جب ارسطو کے بقول غم کا روگ لگ جاتا ہے ۔ تو وہ زندگی کو نکھار جاتا ہے ' سیرت و کردار کی تربیت ہی غم سے ہوتی ہے ۔ غالب کی المیہ شاعری کا موازانہ اگر کسی سے کیا جاسکتا ہے تو وہ انگریزی کا شہرۂ آفاق شاعر شیلے ہے ۔ شیلے ۔ ۔ اپنی مشہور نظم "ODE TO THE WEST WIND" میں ایک جگہ کہتا ہے ۔

"OH, LIFT WE AS A WAVE AS A LEAF AS A CLOUD
I FALL UPON THE THORNS OF LIFE! I BLEED!"

شیلے کی طرح غالب کی زندگی بھی کانٹوں کی سیج ثابت ہوئی ۔ لیکن اس کے برعکس غالب غم کا مذاق یوں اڑاتے ہیں ۔

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غالب تو شیلے کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں ' انہوں نے غم کا مذاق اڑایا ہے ۔ ذرا ان کی اولالعزمی کو دیکھئے اسکا اندازہ ذیل کے شعر سے ہو جائے گا ۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم ۔

(باقی بر صفحہ ۶۴)

قاضی جلیل احمد/امین مالوف

(قسط ۸)

صلیب کے سائے میں

جوابی حملہ

میں نماز شروع کرنے ہی والا تھا کہ ایک فرنگی مجھ پر ان پڑا اور کھینچ کر میرا رخ مشرق کی طرف موڑتے ہوئے کہنے لگا تمہارا قبلہ ادھر ہے مغرب میں نہیں

عثمان بن منقدہ مورخ
۱۰۹۵ء تا ۱۱۸۸ء

دمشق میں سازشیں

آبن قلانسی لکھتا ہے ـــــ وزیر ال مزدغانی معمول کے مطابق باغ گلاب کو روانہ ہوا جو قلعہ دمشق کے محل میں واقع تھا۔ سلطنت کے سارے امرا اور عمائدین وہاں جمع تھے۔ یاری نے جو تخت نشین ہوا اور امورِ مملکت کے تعلق سے اُن سب سے گفتگو کی مشورے لئے اور نئے احکامات جاری کیئے اور اسکے بعد تمام امرا اور سرداران لشکر بادشاہ سے رخصت ہوئے۔ ال مزدغانی جیساکہ اس کا معمول تھا ان سب کے چلے جانے کے انتظار میں وہاں ٹھیرا رہا۔ جب تمام اُمرا رخصت ہوچکے تب وہ بھی رخصت ہونے کیلئے اُٹھا۔ اتنے میں یاری نے اپنے ایک مصاحب کو کچھ اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ مصاحب تلوار لیکر ال مزدغانی پر ٹوٹ پڑا اور تلوار کے پے بہ پے وار کرکے اُسے ہلاک کردیا۔ اُس کا سر تن سے جدا کرکے لاش کے دو ٹکڑے کردیئے گئے اور اُن ٹکڑوں کو دمشق کے آہنی دروازے پر آویزاں کردیا گیا تاکہ خلق خدا دیکھے اور عبرت

حاصل کرے کہ دھوکہ بازوں کا کیا انجام ہوتا ہے ۔"

پل بھر میں باطنیوں کے محافظ کے قتل کی خبر سارے دمشق کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی ایک مجمع عظیم تلواروں اور بھالوں سے مسلح شہر کی شاہراہوں پر جمع ہو گئے ۔ سارے باطنی ان کے عزیز رشتہ داروں کے دوست احباب سب ہی کو چن چن کر گھروں سے باہر نکال کر تہ تیغ کیا گیا۔ ان کے سردار ان کی لاشوں کو شہر پناہ کی فصیل پر لٹکا یا گیا۔ ابن قلانسی کے رشتہ دار ان نے بھی اس قتل عام میں حصہ لیا ۔ ممکن ہے خود قلانسی نے اس واقعہ میں حصہ نہ لیا ہو لیکن اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اسکا لہجہ صاف بتاتا ہے کہ اس وقت اہل دمشق کی ذہنی حالت کیا تھی ۔

" صبح ہونے تک دمشق کے سارے چوک باطنیوں کے خون سے لال ہو گئے ۔ بھونکنے والے کتے ان کی لاشوں کے گوشت کیلئے ایک دوسرے پر غرانے اور لاشوں پر جھپٹنے لگے ۔"

اہل شہر حشیشین کی زیادتیوں اور ال مزدغانی کی انکے ساتھ ملی بھگت سے بے انتہا پیچ و تاب کھا رہے تھے ۔ یہی حال تفتگین کے وارث باری کا تھا جو کسی طرح وزیر المزدغانی کے ہاتھ میں کٹ پتلی بننے کے لئے تیار نہ تھا ۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ المزدغانی فرنگیوں سے ساز باز کر رہا تھا ۔ اور دمشق کے بدلے اس نے ٹائر کا سودا پکا کر لیا ہے ۔ تاکہ وہاں سے باطنی مبلغین اور قاتلین کو بہ آسانی مصر روانہ کیا جا سکے جو حسن بن صباح کے ماننے والوں کیلئے بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا ۔

ان واقعات کے تسلسل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبدیل شہر کے منصوبے میں اصلیت ضرور تھی ۔ اس قتل عام کے بعد جو باطنی زندہ بچے وہ فلسطین میں آباد ہو گئے جہاں انہیں بالڈون ثانی کی سرپرستی حاصل رہی ۔ اس احسان کے بدلے انہوں نے بانیاس کا قلعہ بالڈون کے حوالے کیا جو جبل الشیخ (ماونٹ ہرمن) کے تلے دمشق سے یروشلم کو جانے والی شاہراہ پر واقع تھا کچھ عرصہ بعد فرنگیوں کی ایک بڑی فوج قلعہ دمشق کی فصیلوں کے نیچے پہنچ گئی جس میں تقریباً دس ہزار نائٹ اور پیادے شامل تھے ۔ یہ فوج نہ صرف فلسطین بلکہ انطاکیہ، الڈیسہ اور تریپولی سے بھی آئی تھی ۔ ان کے علاوہ ملک فرنگ سے تازہ وارد کئی سو سورما تھی اس فوج میں شامل تھے جو دمشق پر قبضہ کرنے کے لیئے بے تاب تھے ۔

تاریخ کے پاس چونکہ اتنی فوج نہ تھی کہ وہ اس فرنگی ٹڈی دل کا تنہا مقابلہ کر سکتا اس لیئے اس نے بہت سارے ترک اور عرب بدوی قبائل سے مدد مانگی اور وعدہ کیا کہ فتح کی صورت میں مال غنیمت میں سے بڑا حصہ انہیں دیا جائے گا ۔ لیکن فرزند نفط

یہ بھی جانتا تھا کہ ان قبائل کی مدد دیر پا نہیں ہوگی اور دیر تک اپنی لوٹ مار کی عادت کو دبانے پر قادر نہ ہوں گے ۔ اس لیئے وہ چاہتا تھا کہ جنگ جلد از جلد شروع ہو جائے ۔ ایک دن نومبر کے مہینے میں اُس کے جاسوسوں نے اُسے اطلاع دی کہ کئی ہزار فرنگی رسد کو حصول کے سلسلے میں غوطہ کے میدانی علاقوں میں پھیل گئے ہیں ۔ بارگی نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر اُن کا پیچھا کرنے کا حکم دیا ۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ رسد جمع کرنے کیلئے نکلی فوج اُن کے نرغے میں آگئی اور بھاری اسلحہ سے لدے نائٹوں کو اپنے مرکبوں پر سوار ہونے تک کا موقع نہ مل سکا ابن قلانسی لکھتا ہے ۔

"ترک اور عرب قبایل رات دیر گیئے دمشق کو واپس ہوئے مال غنیمت سے لدے پھندے شاداں و فرحاں اہل شہر کی خوشی کا بھی ٹھکانا نہ تھا ۔ ہمتیں بلند اور ارادے مضبوط ہوگیئے اور اب فوج نے فی الفور فرنگی لشکر پر تاخت کی ٹھان لی ۔ دوسرے دن صبح سویرے گھوڑ سوار رسالہ قلعہ سے باہر نکلا اور گھوڑوں کو فرنگی لشکر کی جانب ایڑ بتائی ۔ لیکن جوں جوں وہ فرنگی کیمپ کے قریب پہنچے گئے ان کا جوش حیرت میں بدلتا گیا ۔ کیمپ سے دشمنوں کے دل بادل بلند ہو رہے تھے ۔ اور کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ جب اور قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ اپنے کیمپ کو آگ لگانے کے بعد فرنگی فوج وہاں سے رخصت ہو چکی ہے ۔ اس تخلیہ کی وجہ رسد کی قلت تھی"

اس ہزیمت اور ناکامی کے باوجود بالڈون اپنی کوشش سے دستبردار نہیں ہوا اور دمشق پر مکرر حملہ کرنے کے لیئے اس نے پھر ایک لشکر تیار کر لیا ۔ لیکن ابتدائے ماہ ستمبر سے ہی اُس علاقے میں ایسی بارش ہوئی کہ بالڈون کا سارا لشکر اس آفت ناگہانی کی گرداب میں پھنس کر تتر بتر ہوگیا اور بالڈون کو بادل ناخواستہ یروشلم کو واپس مراجعت کا حکم صادر کرنا پڑا ۔

باری جو اپنی تخت نشینی کے وقت ایک مہمل اور بزدل نوجوان سمجھا جاتا تھا ۔ اس نے دونوں ہی خطروں سے دمشق کو بچالیا ایک خطرہ تو باطنیوں کا تھا اور دوسرا فرنگیوں کا دونوں کے پس پردہ اصل طاقت فرنگیوں ہی کی تھی ۔ گو بالڈون نے اب کبھی دمشق لینے کی ٹھان لی تھی پھر بھی باری کے مخالفین کا پوری طرح قلع قمع نہیں ہوا تھا ۔

ن د. ماجنی ترکی لباس میں شہر دمشق میں داخل ہوئے۔ باری نے انہیں اپنے محافظ میں شامل کرلیا۔ مئی ۱۱۳۱ء کی ایک صبح جبکہ امیر باری حمام سے واپس لوٹ رہا تھا کہ محافظ دستے کے یہی دو سپاہی راستے میں اُس پر ٹوٹ پڑے اور اسکے پیٹ میں بھونک کر اُسے زخمی کردیا۔ قصاص سے پہلے انہوں نے اقبال کرلیا کہ اُن کا تعلق باطنی فرقے سے ہے۔ اور یہہ کہ انہیں قلعہ الدیوط سے دمشق سے مقتول باطنیوں کے خون کا بدلہ لینے کیلیے روانہ کیا گیا تھا۔

سلطان کے علاج کیلئے جراحوں کو طلب کیا گیا جو اپنے فن کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ موصل دمشق میں قابل ترین جراح موجود تھے۔ ایک دواخانہ نور دکاک نے مرستان کے سے قایم کیا تھا اور ایک ۱۱۵۴ء میں قایم ہونے والا تھا۔ مشہور اہپینی سیاح ابن جبیر جو عرصہ دراز کے بعد شہر دمشق سے گزرا تھا ان ہسپتالوں کے متعلق یوں رقمطراز ہے۔

" ہر ہسپتال کا ایک عامل ہوتا ہے جو اسکے اخراجات کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ دواخانہ کے طبیب ہر صبح مریضوں کا معائنہ کرنے آتے ہیں کیفیت دیکھ کر نسخے تجویز کرتے ہیں اور پرہیز بتاتے ہیں۔ جو ہر مرض کی مطابقت سے ہوتے ہیں۔"

ان جراحوں کی مرہم پٹی کے بعد باری اپنے مرکب پر سوار ہو کر محل کی طرف روانہ ہوا معمول کے مطابق اپنے مصاحبین اور ملنے والوں سے ملاقات کرسکے اور ان کے ساتھ خورد و نوش میں شریک ہو۔ لیکن یہہ سفر باری کو بہت مہنگا پڑا۔ اسکا زخم جو ہنوز کچا تھا کبھی بھرنے نہ پایا اور اسی کے اثر سے جون ۱۱۳۲ء میں تیرہ مہینے زخم کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد اسکا انتقال ہوگیا۔ اکبار پھر باطنیوں نے اپنا انتقام لے لیا۔

فرنگی یلغار کے خلاف یورش مسلمانوں کی پہلی جوابی کاروائی کا مظہر تھا۔ افسوس کہ اسکے کارناموں کے شایان شان جگہ اُسے تاریخ کے صفحات پر نہ مل سکی کیوں اُسکی جگہ جس شخصیت نے لی وہ اپنی اپنی جگہ منفرد تھی۔ اسکا نام تھا اتابک عماد الدین زنگی۔ جو موصل اور الیپو کا نیا والی بنا تھا۔ اور عرب مورخ ابن الاثیر کے الفاظ میں قدرت کی طرف سے مسلمانوں کو ایک عطیہ تھا۔

پہلی نظر میں تو یہہ چھدری داڑھی اور سانولا رنگ والا شخص عام ترک سرداروں سے کسی طرح مختلف نہیں دکھائی دیتا تھا جو اس سے پہلے فرنگیوں کے خلاف مختلف محاربات

میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اکثر نشے میں دھت اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کسی بھی بیرحمی اور بے ایمانی سے دریغ نہ کرنے والا۔ ۱۸/ جون ۱۱۲۸ء کو جب وہ الیپو میں داخل ہوا تو اسکی آمد کو کسی نے بھی خوش آیند نہ سمجھا۔ اس کی پہلی شہرت اس مہم سے ہوئی تھی جو اس نے خود خلیفہ بغداد کے خلاف لڑی تھی اور سلجوقی سلطان کے خلاف خلیفہ کی بغاوت بزور شمشیر کچل دیا تھا۔ ۱۱۱۸ء میں رنگیلے خلیفہ مستظہر کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ مسترشد باللہ نے لی۔ وہ ایک پچیس سالہ سرخ بالوں نیلی آنکھوں اور تمازت آفتاب سے تمتمائے چہرے والا نوجوان خلیفہ ہارون اور مامون کے وقتوں کی خلافت کا احیا چاہتا تھا موقعہ بھی مناسب تھا۔ سلطان محمد کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور اسکی جانشینی کیلئے حسب معمول سلجوقی خاندانوں میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ نوجوان خلیفہ نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر فوج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ گذشتہ دو سو سال سے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے زور خطابت سے اس نے اہل بغداد کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

ادھر سلطان محمد کے بعد کے بعد سلطنت ایک چودہ سالہ نوجوان سلجوقی شہزادے کے حصہ میں آئی جسے امور مملکت کی بہ نسبت لہو لعب اور لعبان حرم سے زیادہ رغبت تھی اور خود مسترشد کی نظروں میں محض ایک طفل مکتب تھا۔ اس نوجوان شہزادے کا نام محمود تھا۔ یہہ ترک اقتدار کے خلاف عرب کی بغاوت تھی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاکر سلطان محمود نے عمادالدین زنگی سے مدد طلب کی جو اُس زمانے میں بصرہ کا والی تھا۔ زنگی کے مقابلے میں خلیفہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور بغداد کی فوجوں نے ہتیار ڈال دئے اور خلیفہ پھر سے اپنی محلسرا میں محصور ہوگیا ان خدمات کے عوض سلطان محمود نے زنگی کو موصل اور الیپو کی ولایت عطا کی۔

جنگی مہمات سے قطع نظر جو چیز اتابک عمادالدین زنگی کو سابق مہم جو ترک سرداران سے ممیتز کرتی ہے وہ یہہ ہے۔ کہ سابقہ ترک سرداران اسلام صرف رسمی طور پر جہاد کا نام لیتے تھے جبکہ ان کی اصل غرض وغایت ذاتی منفعت ہوتی تھی۔ اور اسی طرح اُن کی فوجوں کو بھی مال غنیمت کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ تمام کارروائیوں کی نوعیت عارضی ہوا کرتی۔ آج کے بھرتی کیئے گئیے سپاہی سال بھر بعد برخواست کردئے جاتے اور پھر جب ضرورت پڑتی نئی بھرتی کا اعلان ہوتا۔ زنگی کی آمد سے یہہ ساری چیزیں بدل گیں۔ چودہ برس تک اُسکے جرار سپاہی گھوڑوں کی پیٹھوں پر شام و عراق

کے طول و عرض میں سفر کرتے، رات میں چٹائیاں اُن کا بستر ہوتیں۔ وہ کسی سے جنگ کرتا اور کسی کو صلح صفائی سے رام کرتا، ضرورت پڑنے پر وہ کسی کے بھی خلاف سازش سے نہ چوکتا۔ کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی اپنی مملکت میں بکھرے شاندار محلات میں قیام کرکے ستانے کا خیال اسکے ذہن میں نہیں آیا۔

اسکے حواری ناچنے والی رنڈیاں یا خوشامدی اور چاپلوس مصاحبین نہ ہوتے بلکہ وہ تجربہ کار اور جہاندیدہ لوگ تھے جنکی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی، اور وہ اُن کے مشوروں کی قدر کرنا بھی جانتا تھا۔ اسکے مخبروں کا جال اصفہان دمشق انطاکیہ، یروشلم بغداد، الیپو اور موصل تک وسیع تھا۔ فوج میں مکمل نظم اور ضبط تھا۔ فوجی دستوں کی کمان بے لگام اور سرپھرے سرداران کے ہاتھ میں نہ تھی احکام کی تعمیل سے انحراف کرنے والوں کو سخت سزا دیجاتی تھی۔ ابن الاثیر لکھتا ہے کہ اتابک زنگی ایک چھوٹے سے علاقے کی ولایت ایکبار اپنے ایک ماتحت سردار کے حوالے کی۔ اس سردار نے اپنی رہائش کے لیئے ایک متمول یہودی تاجر کا مکان پسند کرکے اسے تخلیہ مکان کا حکم دیا یہودی نے اتابک سے ذاتی طور پر مل کر گورنر کی شکایت کی۔ زنگی نے بچشم قہر اُس والی کی جانب دیکھا، اور وہ والی شہر کان دبائے اُس مکان سے ہٹ آیا۔ خود اس نے بھی کبھی اپنے قیام کیلئے کسی کو بے گھر نہیں کیا اور ہمیشہ اپنا قیام شہر سے باہر اپنے عارضی پڑاؤ میں رکھا۔

ابن الاثیر لکھتا ہے کہ زنگی کو عورتوں کی عزت و حرمت کا بھی ہمیشہ خاص خیال رہتا تھا خصوصاً اپنے لشکریوں کی بیویوں کا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر اُن کا خاص خیال نہ رکھا جائے تو اُن کے آوارہ ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کے شوہر ان معرکوں میں طویل عرصے تک ان سے جدا رہنے پر مجبور ہیں۔

اس میں سخت گیری، شفقت اور انہماک، اور امور مملکت سے دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اور اسے کسی عمل کے جائز اور ناجائز ہونے کا بھی ہر وقت خیال رہتا تھا۔ الیپو میں وارد ہونے کے بعد اُس نے تین کام کئے۔ ایک تو رضوان کی لڑکی سے عقد، جو ہر نئے والی الیپو نے اپنا وطیرہ بنالیا تھا، اور وہ الغازی اور بلق کی بیوہ رہ چکی تھی۔ دوسرے اپنے باپ کا تابوت اُس نے الیپو کو منتقل کروادیا تھا۔ تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اب اس نے الیپو کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا ہے۔ تیسرے اُس نے سلطان سے سارے ملک شام وغیرہ کی حکومت کا باضابطہ پروانہ حاصل کیا۔ اسطرح اس نے لوگوں پر اچھی طرح واضح کردیا

علامتی سرزمین

شارلی مان (۷۴۲ - ۸۱۴ء) عباسی خلیفہ ہارون رشید کا ہم عصر تھا۔ مغربی یورپ کے بڑے حصہ پر اس کی حکومت قائم تھی۔ ہارون رشید کے زمانہ حکومت ......
(۷۸۶-۸۰۹ء) میں ایسا ہوا کہ خلیفہ اور فرینک شہنشاہ شارلی مان کے درمیان بعض سفارتی تبادلے ہوئے۔ اس میں بظاہر شارلی مان کا مقصد یہ تھا کہ لاتینی اہل ... کلیسا کے لئے یروشلم میں کچھ مراعات حاصل کی جائیں۔

It was in Harun's reign that certain diplomatic exchanges took place between the caliph and the Frankish emperor Charlemagne.

پروفیسر ہٹی نے بعض مسیحی ماخذ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خلیفہ بغداد کی طرف سے اس وقت شارلیمان کے لئے جو قیمتی تحفے بھیجے گئے، ان میں ایک پیچیدہ گھڑی (Intricate clock) بھی شامل تھی۔ (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۲۹۸)

۱۲ سو سال پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ یورپ کے بادشاہ کو وقت کا وہ اعلیٰ تحفہ بھیج سکتے تھے۔ جو خود یورپ میں ناقابل حصول تھا اور یورپ کا مسیحی بادشاہ فلسطین میں اپنے ہم مذہبوں کے حق میں معمولی مراعات حاصل کرنے کے لیے مسلم خلیفہ سے رجوع کرتا ہے، آج یہ حال ہے کہ اسی فلسطین میں مسلمانوں کی خود اپنی جان و مال بھی محفوظ نہیں۔

فلسطین کے قدیم وارثوں (یہود) کے لیے یہ قانون تھا کہ اگر وہ خدا کے دین پر قائم رہیں تو انھیں فلسطین میں باعزت زندگی حاصل ہو۔ اور اگر وہ خدا کے دین سے ہٹ جائیں تو خدا کافر قوموں کے ذریعہ انھیں فلسطین میں ذلیل کر دے (بنی اسرائیل ۸) فلسطین اپنے قدیم وارثوں کے لیے خدا کے رحمت اور غضب دونوں کی علامت تھا۔ اسی طرح فلسطین اپنے نئے وارثوں (مسلمانوں) کے لیے بھی خدا کے رحمت اور غضب کی علامت ہے۔ مسلمان اگر خدا کے دین پر قائم ہوں تو وہ فلسطین میں عزت پائیں گے۔ اور اگر وہ خدا کے دین پر قائم نہ رہیں تو اندیشہ ہے کہ فلسطین میں ان کا وہی انجام ہو جو اس کے سابق وارثوں کا اس بابرکت زمین میں ہوا۔

الرسالہ سے ماخوذ۔

تشخیص کا مسئلہ

مسلمان موجودہ زمانہ میں احساس محرومی کا شکار ہوئے۔ وہ ایسے حالات سے دو چار ہوئے جس نے انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کوئی چیز ان سے کھو گئی ہے۔ اس موقع پر اصل سوال یہ تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ جو مسلمانوں سے کھو گئی ہے۔ کیوں کہ آدمی جس چیز کے بارے میں احساسِ محرومی سے دو چار ہو اسی کو وہ پانے کی کوشش کرے گا۔ اسی کے بارے میں وہ اپنا سارا زور لگا دے گا۔

اس موقع پر ایک سنگین حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے انھیں یہ احساس دلایا کہ ان سے جو چیز کھو گئی ہے وہ حکومت ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جو شاعر اور خطیب اور انشاء پرداز پیدا ہوئے، اور جو نام نہاد مفکرین ان کے درمیان اُٹھے ان سب نے اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ تم حکومت سے محروم ہو گئے ہو اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے تم کو موجودہ زمانہ میں حقیر اور کمزور کر دیا ہے۔

اس تشخیص کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ تمام مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں حکومت واقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے دوڑ پڑے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء ملت اور تجدید اسلام کے نام سے جو کوششیں کی ہیں وہ تقریباً سب کی سب اسی ایک خانہ میں جاتی ہیں۔ مگر ان کوششوں کی صد فی صد ناکامی بتاتی ہے کہ وہ تشخیص صد فی صد غلط تھی جس کی بنیاد پر یہ تحریکیں اٹھائی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے جو چیز کھوئی ہے وہ تعلق باللہ ہے۔ اللہ پر زندہ عقیدہ، اللہ کی سچی پرستش، اللہ کے آگے مسئولیت کی تڑپ، اللہ کے لئے جینے اور مرنے کا احساس، یہ ہے وہ اصل چیز جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے کھوئی گئی ہے۔ یہ محرومی اتنی عام ہے کہ اصاغر اور اکابر، حتیٰ کہ بے ریش اور باریش دونوں قسم کے مسلمان اس سے خالی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے..... مسلمانوں کی یہی اصل کمی ہے جس نے ان کے اندر دوسری تمام کمیاں پیدا

کی ہیں۔ جب تک ان کی یہ کمی دور نہ ہو وہ اپنی اسی موجودہ حالت میں پڑے رہیں گے۔ کسی بھی دوسری چیز کا حصول ان کے مرض کا علاج نہیں بن سکتا۔

الرسالہ سے ماخوذ

★ ★ ★

حال کے امکان :- ایک مرتبہ میں نے ایک صاحب کا "سفر نامہ بھوپال" پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر دو بلند میناروں پر پڑتی ہے۔ جو اس شہر کی عظمت اور وقار کے اکلوتے گواہ ہیں۔ انھیں دیکھ کر ذہن میں اسلامی بھوپال کی تاریخ رقص کرنے لگتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاج المساجد کے دو مینارے شہر کے سب سے بلند عمارتی نمونے ہیں۔ اپنی بلندی کے اعتبار سے وہ پورے شہر کی فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ مینارے بھوپال کے "اسلامی دور" میں نہیں بنے۔ وہ آزادی کے بعد 'اس کے سیکولر دور میں' یا زیادہ سخت الفاظ میں 'اس کے "ہندو دور" میں بنائے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان بلند میناروں کا اصل پہلو یہ نہیں ہے کہ وہ یہ یاد دلاتے ہیں کہ بھوپال کیا تھا، بلکہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ بھوپال کیا ہے۔ یہ مینارے ماضی کی یادگار کے طور پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ مسلمانوں کو علامتی طور پر بتاتے ہیں کہ آج بھی اس ملک میں ان کے لیے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ وہ اپنی عظمت کا مینار بے روک ٹوک تعمیر کر سکیں۔ وہ حال کے امکان کو بتاتے ہیں نہ کہ صرف گزرے ہوئے ماضی کو۔

الرسالہ سے ماخوذ

ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا ذکر تھا اور مرزا کی پیشین گوئیوں پر بحث کی گئی تھی۔ میجر عیسیٰ کو اس عبارت کو پڑھنے سے بڑی حیرانی ہوئی کہ جو کچھ اب تک اس نے اسلامی کتابوں میں پڑھا تھا اور جو کچھ اس کو بتایا گیا تھا وہ حضور سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات تھی کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ آپ آخری نبی ہیں اور قرآن مجید آخری الہامی کتاب ہے لیکن غلام احمد اس بات کی صاف نفی کرتا ہے۔

میجر نے بار بار اس تحریر کو پڑھا۔ یہ بات میجر عیسیٰ کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ وہ وہی رسالہ لے کر لائبریری کے انچارج کے پاس پہنچا اور اس سے وضاحت چاہی۔ مگر وہ اس کو مطمئن نہ کر سکا۔

فارسی
حافظ شیرازی

غزل

اردو ترجمہ
قاضی سجاد حسین

ساقیا برخیز و درده جام را خاک برسر کن غم ایام را
(اے ساقی اٹھ اور جام دے زمانہ کے غم کے سرپر، خاک ڈال)
ساغرِ مے در کفم نہ تا ز سر برکشم ایں دلقِ ازرق فام را
(میرے ہاتھ میں شراب کا پیالہ دیدے تاکہ میں اس نیل گوں گدڑی کو نکال دوں)
اگرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را
(گرچہ یہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے، خواہاں نہیں ہیں)
بادہ درده چند ازیں بادِ غرور خاک برسر نفسِ نافرجام را
(شراب دے، یہ غرور کی پھونک کب تک بد بخت نفس کے سرپر خاک ہو)
دودِ آہِ سینۂ سوزانِ من سوخت ایں افسردگانِ خام را
(میرے جلتے سینے کے دھوئیں نے ان کچے ٹھٹھرے ہوؤں کو جلا ڈالا)
محرمِ رازِ دلِ شیدائے من کس نمی بینم ز خاص و عام را
(اپنے شیدائی دل کا محرمِ راز خاص اور عام میں سے میں کسی نہیں دیکھتا ہوں)
با دل آرامے مرا خاطر خوش ست کز دلم یکبارہ برد آرام را
(اس محبوب سے میری طبیعت خوش ہے جو ایکبارگی میرے دل سے آرام کو نکال گیا)
ننگرد دیگر بسرو اندر چمن ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را
(وہ چمن میں، پھر سرو کو نہ دیکھے گا جس نے اس چاندی جیسے جسم والے سرو کو دیکھ لیا)
از سرِ دنیا گذشتی غم مخور خوش بخور ہم خوش بدار ایام را
(تو دنیا کی فکر سے گذر گیا غم نہ کر اچھی طرح کھا، پی اور زمانہ کو خوش رکھ)

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
(اے حافظ، دن رات کی سختی پر صبر کر)
عاقبت روزے بیابی کام را
(انجام کار تو کسی دن مقصد حاصل کرلے گا)

محمد احتشام الدین حقی دہلوی

ساقیا برخیز و در دہ جام را

منظوم ترجمہ غزل حافظ

ساقیا اٹھ بیٹھ بھر دے جام کو
ڈال دے چولھے میں غم ایام کو

بھر کے دے ساغر کہ آخر کب تلک
کبر و نخوت نفس نا فرجام کو

ساغر مے دے کہ میں پھینکوں اتار
جسم سے اس دلق ازرق فام کو

ہو جو بدنامی ہے نزد عاقلاں
کیا کروں گا لے کے ننگ و نام کو

دود آہ سینۂ سوزاں مرے
پھونک دے ان پختگان خام کو

محرم راز دل شیدا نہیں
خوب دیکھا بھر کے خاص و عام کو

لگ گیا دل ایک دل آرام سے
لے گیا یک مشت جو آرام کو

سرو پر ڈالیں چمن میں کیا نظر
دیکھ کر اس سرو سیم اندام کو

بھر گیا دنیا سے دل گو صبر کر
کھا خوشی سے غم ہی کاٹ ایام کو

مشکلیں حافظ جو ہوں برداشت کر
سہل ہوں گی مشکلیں انجام کو

مرکزِ ادب کے ماہانہ طرحی مشاعرہ کی چند غزلیں

مصرعہ طرح "کہاں وہ لطف جو اک شامِ انتظار میں تھا"

عزیز بھارتی

تمام عمر جو سازش کے کاروبار میں تھا
وہ شخص بھی میرے، احباب کی قطار میں تھا

یہ واقعہ ہے کہ کانٹوں سے بھر گیا دامن
اگرچہ دوستو میں دامنِ بہار میں تھا

ذرا سا ہاتھ بڑھاتا تو چھو ہی لیتا مگر
یہ فاصلہ بھی کہاں میرے اختیار میں تھا

جو تو نے ہم پہ نظر کی نہیں تو کیا حیرت
نظر جھکانا بھی کیسے، تو اقتدار میں تھا

ہمیں تو روح کی گہرائیوں سے تھا مطلب
تمہارا لطف تو، جسموں کے ریگزار میں تھا

نہ کھل سکا مری ہستی کا راز خود مجھ پر
اک آپ ہی نہیں، خود میں بھی انتظار میں تھا

عزیز وقت نے بخشی ہے عظمتیں تجھ کو
وگرنہ آج سے پہلے تو کس شمار میں تھا

موسیٰ خان شوق

شکستِ شام کا منظر بھری بہار میں تھا
میں اپنے گھر میں بھی رہ کر کسی حصار میں تھا

میں اک غریب، وہ لاکھوں کے کاروبار میں تھا
میرا وجود مگر پھر بھی اختیار میں تھا

کیا ہے اپنے ہی لوگوں نے پائمال مجھے
گلہ ہو کس سے کہ میں خود ہی اعتبار میں تھا

بہار کی جگہ، کیسے خزاں چلی آئی
نمو کا حوصلہ جب شاخِ برگ و بار میں تھا

وہ ہولناک نظارہ، کہوں میں کیا اے دوست
تمام صحنِ چمن شعلہ و شرار میں تھا

جو اپنی ذات میں اک انجمن رہا اے شوق
بکھر گیا تو وہ یادوں کے رہگزار میں تھا

طرحی غزلیں

محمود شریف محمود

غمِ فراق تھا، یادوں کے میں حصار میں تھا
تڑپ رہا تھا وہ نغمہ جو دل کے تار میں تھا

ملے جو تم تو تمنا نکل گئی دل سے
گیا وہ لطف تمہارے جو انتظار میں تھا

وہ گلِ عذار جو صحنِ چمن کو چھوڑ گیا
خزاں کے دور کا عالم بھری بہار میں تھا

دلِ حزیں میں جو طوفانِ درد و غم اٹھا
بلا کا زور ان آنکھوں کے آبشار میں تھا

اگرچہ ایک ہی گلشن کے پھول تھے لیکن
کوئی مزار پہ کوئی گلے کے ہار میں تھا

جو مقبرہ کسی شاہِ جہاں کا دیکھا
شہنشہی کا خزانہ بھی اس مزار میں تھا

اسے تو وقت نے برباد کر دیا محمود
وہی جو وقت بدلنے کے انتظار میں تھا

منان منظور

بھلا کے خود کو ہی میں تو خیالِ یار میں تھا
صبح کی آس لئے شامِ انتظار میں تھا

نگاہِ برق نے پھونکا ہے سارے گلشن کو
بچاتا کس طرح خود کو میں کس شمار میں تھا

اگرچہ وقت نے روندا وفا کے پھولوں کو
خزاں کے ساتھ الجھ کر بھی میں بہار میں تھا

ملے ہیں زخم کچھ ایسے کہ اٹھ گیا ہے یقیں
ہمارا دل بھی کبھی حسنِ اعتبار میں تھا

چھپا لیا ہے غمِ دل غمِ زمانہ میں
سکونِ دل تو فقط شرطِ روزگار میں تھا

مجھے تو وقت نے غم آشنا کیا ہے مگر
کسی نے درد نہ بانٹا میں انتظار میں تھا

ہم اپنے درد کا منظور کیا بیاں کریں
ہمیں تو جو بھی ملا درد کے حصار میں تھا

قول قرار دیا ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ ج ۱ ص ۷۶)

قرآن میں اختلاف کرنے سے منع کیا گیا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ (الانفال: ۴۶)

"اور آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

اور ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹)

"اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔"

معلوم ہوا کہ شریعت نے اختلاف کو مذموم قرار دیا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ امت کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے اس نے ملت کو زبردست نقصان پہنچایا پھر اس کو رحمت سے کس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ حدیث حدیث ہی نہیں۔

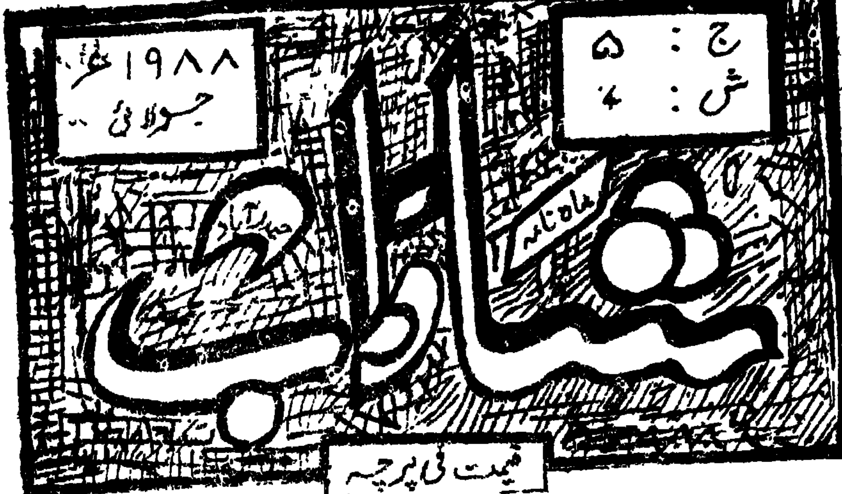
سلسلہ صفحہ (۵۰)

موت مصائب کی انتہا اور غم کا انجام ہے لیکن غالب موت میں بھی حسن تلاش کرتے ہیں انہیں موت زندگی کو لطیف بناتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ زندگی یکسانیت سے تنگ ہیں۔ موت زندگی کے زنگ خانہ میں رنگ بھرتی ہے۔ غالب نے کیا بات کہی ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا۔

زندگی کی ساری تلخیوں، ناکامیوں، اور ناامیدیوں، اور محرومیوں کے باوجود غالب کے مزاج کی شگفتگی اور زندہ دلی اس افسانوی کردار کی طرح رہی جو خود تو غم کے الاؤ میں جلتا ہے لیکن دوسروں کو مسرت بخشتا رہتا ہے غالب کے اس شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

یہ نعش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ★★



قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر
محمد کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

★ محترمہ عائشہ بیگم رآب ★ یوسف ناظم ★ ڈاکٹر محمد یوسف الدین
★ پروفیسر رضی الدین احمد ★ منیر احمد صدیقی ★ محمد منظور احمد [illegible]
★ اے جی فاروقی ★ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن خاں مشتاق ★ پروفیسر میر تراب علی

زرتعاون

سالانہ	50	روپیے	150	روپیے	35	ڈالر	20	پونڈ	125	پاکستانی روپیے
دوسالہ	90	"	270	"	65	,	36	,	225	" "
تاحیات	1000	"	2500		450		300		2000	"

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب 11-5-147 [illegible] حیدرآباد 500004

پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] پریس [illegible] میں چھپوا کر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا۔

فہرست

غزلیات

حرفِ اوّل

اردو کا المیہ یہی ہے کہ یہ خالص ہندوستانی زبان آزادی کے بعد سیاست کا شکار ہو گئی۔ آزادی کے فوری بعد قومی زبان بنانے کے لئے جب دستور ساز اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو اراکین اردو اور ہندی کے حق میں [illegible] اور صدر نشین کے زائد ووٹ کے ذریعہ ہندی کو قومی زبان بنا دیا گیا۔ اس صورت حال سے کم از کم یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی کے وقت اردو کتنی مقبول تھی اور اگر سیاسی تنگ نظری کام نہ کرتی تو اردو ہی ملک کی قومی زبان ہوتی۔

اس تصفیہ کے بعد اردو والوں نے اردو کو کبھی مد مقابل ہندی کا نہیں بنایا۔ لیکن ہندی والوں نے اردو کے راستے میں طرح طرح کی دشواریاں پیدا کیں۔ چنانچہ [illegible] ملوریم الکشن کے وقت اردو کو اس کا مقام دیئے جانے کا ذکر کیا جاتا مگر الکشن کے بعد سرد مہری اور انجماد کی صورت برقرار رہتی ہے۔

آندھرا پردیش میں بھی لسانی ریاست کے قیام کے وقت دوسرے علاقائی تحفظات کے ساتھ اردو کو بھی دوسری سرکاری زبان بنانے کا شریفانہ معاہدہ کیا گیا مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ قانون سرکاری زبان پاس ہونے کے بعد اس کے تحت بھی اردو کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اردو والوں کی برسوں کی جدوجہد کے بعد ۱۹۷۷ء میں ایک جی۔ او۔ جاری کیا گیا لیکن حسب معمول اس پر عمل آوری بھی معرض التوا میں رہی۔

یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ تلگو دیشم حکومت نے اردو کے لئے متعدد اقدامات کئے۔ اور ان اقدامات کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن جب حکومت نے ۱۸ مارچ ۱۹۸۸ء سے شروع ہونے والے "تلگو وجیاما" کو سرکاری زبان کا سال قرار دیا اور [illegible] مکمل

استعمال ہو سختی سے عمل کرنے کا اعلان کیا تو اردو والوں نے واضح کیا کہ انہیں تلگو کے بطور سرکاری زبان استحکام اور ترقی سے کوئی اختلاف نہیں ہے وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی طور پر اس کا مستحقہ مقام دیا جائے اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کے لئے بھی عملی اقدامات کئے جائیں ۔ حکومت کو بھی شریفانہ معاہدہ اور سرکاری زبان قانون کی روشنی میں اردو کو اس کا مستحقہ مقام دینے سے اختلاف نہیں ہے ۔ چنانچہ ہمارے چیف منسٹر جناب این.ٹی. راماراؤ نے شاہین اقبال مینار کے افتتاح کے موقع پر واضح طور پر اعلان کیا ۱۰ فیصد اردو والے علاقوں میں اردو تعلیم کی تمام سہولتیں دی جائینگی اور ۳۰ فیصد آبادی والے علاقوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا جائے گا ۔

اردو والوں نے اعلان کیا کہ وہ تلگو سرکاری زبان کے استحکام و ترقی کے خواہشمند ہیں لیکن ساتھ ساتھ دوسری سرکاری زبان اردو کو بھی اس کا مستحقہ مقام دینے کے لئے حکومت ٹھوس قدم اٹھائے تمام دانشوروں نے بلا لحاظ پارٹی و مذہب اردو بچاؤ تحریک کا ساتھ دیا اور حکومت نے جی او ۲۵۳ م ۵/۵/۸۸ء بھی جاری کیا لیکن یہ جی او. اردو والوں کی توقعات اور حکومت کے اعلانات کے مطابق نہیں ہے ۔ اس لئے اردو والوں کو احتجاجی اقدامات کا سہارا لینا پڑا اور بھوک ہڑتال بھی کرنی پڑی ۔

خوشی کی بات ہے کہ سرکاری زبان کمیشن کے صدر نشین ڈی رام کرشنا اچاریہ نے اردو بچاؤ تحریک کے کنوینر ایس کے ۔ افضل الدین کو خط لکھا اور تحریک کے صدر نشین مسٹر کے ۔ پربھاکر ریڈی سے بھی بات چیت کی خواہش ظاہر کی ۔ نیز انجمن ترقی اردو کے نائب صدر اور متحدہ اردو مجلس عمل کے لیڈر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو بات چیت کی دعوت دی ۔ نیز اردو بچاؤ تحریک کے لیڈروں کو حکومت کے چیف سکریٹری نے بھی مکتوب روانہ کیا ۔ جب سرکاری زبان کمیشن اور حکومت خود یہ چاہتے ہیں کہ اردو کا مسئلہ بات چیت سے حل کیا جائے تو اردو والوں کو چاہیئے کہ احتجاجی راستے ترک کر دیں اور بات چیت کے ذریعہ سے اردو مسائل کو حل کرنے کا راستہ اپنائیں ۔ اردو والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ چیف منسٹر کے اعلان کا مطابق جہاں ۱۰ فیصد اردو آبادی ہو وہاں جملہ تعلیمی سہولتیں دی جائیں جہاں ۳۰ فیصد اردو آبادی ہو وہاں اردو بطور دوسری سرکاری زبان استعمال ہو ۔ سرکاری زبان کمیشن میں ایک اردو رکن نامزد کیا جائے جو ان سہولتوں پر عمل آوری کے انتظام اور نگرانی کا اختیار

رکھتا ہوں۔

اردو کے لئے حکومت کی جانب سے واضح احکامات کی اجرائی کے ساتھ ساتھ اردو والوں پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آج یہ صورت حال ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم اتنا پست ہے کہ خود اردو والے اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں نہیں پڑھاتے، نیز اپنے مسائل کے تصفیہ کے لئے خود اردو والے اپنی درخواستیں اردو زبان میں پیش نہیں کرتے۔ انہیں تجربہ ہے کہ اردو داں عملہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اردو درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں ہوتی۔ چنانچہ چند دن پہلے راقم الحروف نے خود جب ایک یادداشت جناب نصر بیگ صاحب صدر نشین اقلیتی کمیشن کے ملاحظہ میں پیش کی تو وہ انگریزی میں تھی۔ موصوف نے بجا طور پر گرفت کی کہ اردو والے خود اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے نہیں پڑھاتے اور اپنی درخواستیں اردو میں نہیں دیتے تو کس طرح حکومت اردو کی بہتری کے لئے موثر اقدامات کر سکتی ہے۔ موصوف نے یقین دلایا کہ اردو والے اردو میں درخواستیں دیں۔ ان کا اسی عجلت سے تصفیہ کیا جائے گا۔ جہاں اردو داں عملہ نہیں ہے۔ حکومت اس کے لئے کوشاں ہے کہ وہاں ایسے تقرر کئے جاکر کارروائیوں کی تکمیل کی جائے۔ نیز حکومت ہر [illegible] پرائمری اسکول اور متعدد اقامتی ریزیڈینشیل اسکول قائم کر رہی ہے۔ اردو والوں کا کام ہے کہ ان سہولتوں سے استفادہ کریں اور احتجاجی راستے چھوڑ کر تعمیری رویہ اپنائیں، جبکہ ہر مسلک و خیال کے لوگ جماعتی حدود سے بالاتر ہو کر اردو کے لئے متحدہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ اردو والوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ احتجاج اور ہڑتال کا راستہ چھوڑ کر بات چیت کو ترجیح دیں۔ حکومت سے واضح احکام جاری کروائیں اور ان پر عمل آوری کا تیقن حاصل کریں۔ اعلیٰ معیار کے بہتر اردو میڈیم تعلیمی اداروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوائیں کہ وہ اپنی تعلیمی پستی کو دور کر کے اپنے آپ کو ایک بہتر ہندوستانی شہری ثابت کریں اور اپنے ملک و قوم کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کریں۔

مولانا شمس پیرزادہ

موضوع اور ضعیف حدیثیں

قسط دوم

ضعیف حدیث:- فنِ حدیث کے علماء نے حدیث ضعیف کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ: "ہر وہ حدیث ضعیف ہے جس میں نہ حدیث صحیح کی صفات پائی جاتی ہوں اور نہ حدیث حسن کی" (مقدمہ ابن الصلاح ص ٢٠)

راوی کی طرف سے حفظ و ضبط میں کمی، اس کا ثقہ راویوں کی حدیث کے خلاف روایت کرنا، اس کے عادل ہونے میں اشتباہ اور سلسلہ روایت میں انقطاع وغیرہ وہ اسباب ہیں۔ جن کی بنا پر حدیث کو ضعیف کہا جاتا ہے۔ ضعیف حدیث کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ایک حدیث مرسل ہے اور حدیث مرسل وہ ہے جس کو کسی تابعی نے صحابی کے واسطے کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہو اس کے بارے میں امام مسلم نے صحیح مسلم کی تمہید میں لکھا ہے کہ "مرسل ہمارے اور علمائے حدیث کے نزدیک حجت نہیں ہے۔"

اصل میں ضعیف حدیث وہ ہے جس کی صحت مشکوک ہو۔ ایسی حدیث سے نہ کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہے اور نہ وہ دین میں حجت ہے۔ مگر علماء کا ایک گروہ فضیلت کے باب میں ضعیف حدیثیں نقل کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک ایسی حدیثیں ترغیب کے لئے مفید ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قبولِ حدیث کے معاملہ میں اس بے احتیاطی نے دین اور ملت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

اسلام کی تعلیم کیا ہے اس کو جاننے کا نہایت محکم ذریعہ قرآن ہے پھر سنتِ ثابتہ یا احادیث صحیحہ۔ رہ گئیں وہ روایتیں جن کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مشکوک ہے۔ اسناد کے اعتبار سے یا متن (نفسِ [redacted] کے اعتبار سے ان سے دسنت ثابت ہوتی اور نہ حجت قائم ہوتی ہے اور نہ ہی دین میں ان کا کوئی مقام ہے۔ پھر

بنا لیں۔ حدیثوں کو عوام کے سامنے پیش کرکے یہ تاثر دینا کہ یہ ارشاداتِ رسول ہیں دین کے لئے کمزور دیواریں تلاش کرنے اور لوگوں کی نظروں میں دین کو مشتبہ بنا دینے کا باعث ہے۔ اس سے بدعات کے لئے راستے کھلتے ہیں اور ملت کے اندر فرقہ بندی اور طرح طرح کے فتنوں کا سامان ہوتا ہے۔

فضائل اعمال کا بھی دین میں ایک مقام ہے اس لئے ضروری ہے کہ دین میں جس چیز کا جو مقام ہے اس کو اسی مقام پر رکھا جائے۔ اگر کسی چیز کو گھٹایا یا بڑھایا گیا تو توازن بگڑ جائے گا اور دین کے مختلف اجزاء کے درمیان وہ ربط اور وہ ہم آہنگی باقی نہ رہے گی جو شارع کے پیش نظر رہی ہے۔ جہاں شرعی احکام کے سلسلہ میں ضعیف حدیثوں کو ماخذ بنانا صحیح نہیں ہے تو فضائل اعمال کے لئے مصدر و ماخذ قرار نہیں دی جا سکتیں۔ اس لئے کہ حدیث ضعیف کی اساس ظن پر رکھی گئی ہے اور ظن کسی صورت میں بھی حق کی جگہ نہیں لے سکتا۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فضائل شرعی احکام کی طرح دین کے بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کسی طرح جائز نہیں کہ دین کی اساس و بنیاد ایسے ستونوں پر رکھی گئی ہو جو بالکل کمزور اور قوت و استحکام سے یکسر عاری ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیثوں کو معمول بہا بنا سکتے ہیں۔ اگر وہ شرائط ان میں موجود بھی ہوں۔ جن کو آسانی ڈھونڈنے والوں نے اس ضمن میں ضروری ٹھہرایا ہے ہمارے پاس احادیث حسن و صحیح کا احکام شرعیہ اور فضائل میں اس قدر کثرت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے حدیث ضعیف کو تسلیم کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔ عدم تسلیم کی وجہ یہ بھی ہے کہ حدیث ضعیف کا ثبوت ہمارے قلب و ضمیر میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا اور ہمیں کبھی بھی اطمینان قلب حاصل نہ ہو سکے گا۔ اور اسی شک و شبہ کی وجہ سے ہم اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ حالانکہ دینی امور میں یقین و اذعان کی ضرورت ہوتی ہے" (علوم الحدیث اردو ترجمہ غلام احمد حریری ص [illegible])

لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس معاملہ میں عام طور [illegible] برتی گئی اور بڑی فراخی سے ضعیف حدیثوں کو قبول کیا گیا [illegible] صورتِ حال یہ ہے کہ صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں ضعیف حدیثوں کو عوام کے سامنے پیش کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے احادیث صحیحہ میں جن باتوں پر وعید و عذاب کی جو شکل

سنائی گئی ہے ان کو اصلاحی اور تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھا جاتا جتنا ضروری کہ فضائل والی حدیثوں کو سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ حدیثیں باعتبار اسناد اور باعتبار مضمون کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔

حدیث کی جن کتابوں کا شمار تیسرے یا چوتھے طبقہ میں ہوتا ہے یعنی جن میں اہل علم ہر قسم کی روایتیں جمع کی گئی ہیں وہ صوفی اور واعظ حضرات کا اصل ماخذ اور مرجع ہیں مثلاً طبرانی، بیہقی، ابن مردویہ، ابو نعیم، دیلمی اور ابن عساکر وغیرہ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ملاحظہ ہو۔
حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۳۵ اور مقدمہ تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۵۹ ۔ ۶۰

حقیقت یہ ہے کہ ضعیف اور موضوع اور گھڑی ہوئی روایتوں کے چلن نے دین کا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے قرآن نے جتنا زور عمل صالح پر دیا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرنے کی جس قدر تاکید کی ہے۔ اس کے برعکس فضائل اعمال کی غلو آمیز اور غیر مستند روایتیں ایک معمولی نیکی [illegible] کا درجہ دیتی ہیں۔ یہاں ہم ضعیف حدیث کی صرف ایک مثال [illegible] ہیں

عن عائشۃ قالت: فقدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فخرجت فاذا ھو بالبقیع فقال اکنت تخافین ان یحیف اللہ علیک و رسولہ؟ قلت یا رسول اللہ ظننت انک اتیت بعض نسائک، فقال: ان اللہ تبارک و تعالیٰ ینزل لیلۃ النصف من شعبان الی السماء الدنیا فیغفر لاکثر من عدد شعر غنم کلب۔

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں ایک رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود نہیں پایا اس لئے میں باہر نکل گئی۔ دیکھا کہ آپ بقیع (قبرستان) میں ہیں آپ نے مجھے پوچھا کیا تم کو یہ اندیشہ محسوس کیا کہ اللہ اور اس کا رسول تمہاری حق تلفی کریں گے؟ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں نے خیال کیا کہ آپ اپنی بعض ازواج کے یہاں تشریف لے گئے ہوں گے۔ فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ نصف شعبان کی شب کو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے، اور قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں کی تعداد سے بھی زیادہ تعداد میں مغفرت فرماتا ہے۔"
یہ حدیث ترمذی نے جس سلسلہ اسناد کے ساتھ بیان کی ہے وہ یہ ہے:

ہم سے احمد بن منیع نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہمیں یزید بن ہارون نے خبر دی وہ کہتے ہیں۔ ہمیں حجاج بن ارطاۃ نے خبر دی وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کرتے ہیں وہ عروہ سے اور وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں۔" اس حدیث کو نقل کر کے ترمذی نے لکھا ہے کہ:

"حضرت عائشہ کی اس حدیث کو ہم اسی اسناد سے جانتے ہیں جس کے راوی حجاج ہیں اور میں نے محمد (یعنی بخاری) کو سنا وہ اس حدیث کو ضعیف قرار دے رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں یحییٰ بن ابی کثیر نے عروہ سے نہیں سنا ہے نیز بخاری کہتے ہیں حجاج نے یحییٰ بن ابی کثیر سے نہیں سنا ہے۔

(ترمذی ابواب الصوم)

یعنی یہ حدیث اپنی اسناد کے لحاظ سے دو جگہ منقطع ہے ایک حجاج اور یحییٰ کے درمیان اور دوسرے یحییٰ کے درمیان اور عروہ کے درمیان اس لئے اس سے یہ واقعہ اور ارشاد رسول ثابت نہیں ہوتا۔ ترمذی نے اس کو نقل تو کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے ضعیف ہونے کی صراحت بھی کی ہے۔

اس روایت میں جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کی صحت مشتبہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت عائشہ کا تنہا رات دیکھنے قبرستان جانا قرین مصلحت نہیں اور آپ کا حضرت عائشہ سے یہ سوال کرنا کہ کیا تمہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ اللہ اور رسول تمہاری حق تلفی کریں گے ایک ایسا سوال ہے جس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ حضرت عائشہ یہ تو خیال کر سکتی تھیں کہ آپ کسی ضرورت سے اپنی دوسری ازواج کے ہاں تشریف لے گئے ہوں گے لیکن اس میں اللہ کی طرف سے حق تلفی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے جو حضرت عائشہ اس بدگمانی میں مبتلا ہوتیں؟ پھر اگر پندرہویں شعبان کی شب ایسی فضیلت والی ہوتی کہ اس میں لاتعداد مردوں کی بخشش ہو جاتی تو آپ پہلے ہی لوگوں کو بتا دیتے تاکہ وہ اس شب میں عبادت وغیرہ کا اہتمام کرتے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ اس فضیلت والی شب سے اپنے اصحاب کو باخبر نہ کریں یہاں تک کہ حضرت عائشہ کو بھی اس کی خبر نہ ہو اور اتفاق سے جب وہ قبرستان جائیں تو انہیں اس کا پتہ چلے؟ اس قسم کی جتنی ضعیف حدیثیں

ہی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ سنت رسول ہمیشہ روشن ہوتی ہے اور دلوں میں یقین پیدا کرتی ہے۔

شعبان کی پندرھویں شب کی فضیلت میں کتب احادیث میں متعدد حدیثیں بیان ہوئی ہیں مگر سب ضعیف ہیں۔ کوئی حدیث بھی صحیح نہیں اسی لئے ایسی حدیثیں بخاری اور مسلم میں جگہ نہ پا سکیں۔ جب ضعیف حدیث حجت ہی نہیں ہے تو یہ فضیلت ثابت کہاں سے ہوئی۔ اگر یہ شب فضیلت کی شب ہوتی صحابہ کرام میں اس کا چرچا ہوتا اور مشہور اور ثقہ راوی اسے روایت کرتے اتنی اہم بات جس کا عام چرچا ہونا چاہئے صرف ضعیف راویوں کو کیسے معلوم ہو گئی اور اب تو مسلمانوں نے ان ضعیف روایتوں کا سہارا لیکر شب برات کو باقاعدہ تہوار کی شکل دیدی ہے! ضعیف حدیثوں کے معاملہ میں نرمی برتنے سے کیسی کیسی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں!!!۔

واضح رہے کہ پندرھویں شعبان سے متعلق یہ حدیث بھی ضعیف ہے کہ یہ شب عبادت میں گزارو اور دن کو روزہ رکھو ملاحظہ ہو (تذکرۃ الموضوعات ص ۴۵ اور تحفۃ الاحوذی ج ۳ ص ۴۴۴)

موضوع اور ضعیف حدیثوں پر کتابیں

عربی میں موضوع اور ضعیف حدیثوں پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی چند مشہور کتابوں کے نام درج ذیل ہیں

(۱) کتاب الموضوعات ــــ ابن جوزی (م ۵۹۷ھ)

(۲) المقاصد الحسنۃ ــــ سخاوی (م ۹۰۲ھ)

(۳) اللآلی المصنوعۃ ــــ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)

(۴) تذکرۃ الموضوعات ــــ محمد طاہر ہندی (م ۹۸۶ھ)

(۵) تمییز الطیب من الخبیث ــــ شیبانی

(۶) موضوعات کبیر ــــ ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ)

(۷) کشف الخفاء ــــ العجلونی (م ۱۱۶۲ھ)

(۸) الفوائد المجموعۃ ــــ شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)

موجودہ زمانہ کے مشہور محدث محمد ناصرالدین البانی (دمشق) نے سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ شائع کر کے بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس کی دو جلدیں ابتک ہماری نظر سے گذری ہیں جو المکتب الاسلامی بیروت سے شائع ہوئی ہیں اور ان میں موضوع اور ضعیف حدیثوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے ضعیف الجامع الصغیر میں ضعیف حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے اس موضوع پر غالباً کوئی کتاب لکھی نہیں گئی اور یہ اردو لٹریچر میں بہت بڑی کمی ہے البتہ حال ہی میں مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے "فتنۂ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان" کے نام سے مولانا محمد مسعود عالم قاسمی کی کتاب شائع ہوئی ہے جو قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

امت مسلمہ کی ذمہ داری

امتِ مسلمہ کی تشکیل دینِ حق پر ہوئی ہے اور اس کا مقصدِ وجود شہادتِ حق ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ۔ ۱۴۳)

"اسی طرح ہم نے تم کو اعتدال والی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو؛ اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

اور حق وہ ہے جس کو کتاب و سنت نے پیش کیا ہے اس لیے کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور دعوت و تبلیغ اور اصلاح و ارشاد کے کاموں میں ان کو پیش کرنے، ان کے معنی و مفہوم کو واضح کرنے اور ان سے لگاؤ اور مناسبت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا، امت مسلمہ کی اہم ترین ذمہ داری ہے اور دین کو بے کم و کاست اسی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ موضوع اور ضعیف حدیثوں، بے سرو پا روایتوں، بزرگوں کی طرف غلط طور سے منسوب کی گئی کرامتوں اور خوابوں سے اس کو محفوظ رکھا جائے۔

محدثین نے حدیث کی تدوین کے پیش نظر صحیح، حسن اور ضعیف حدیثوں کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا تھا تاکہ تحقیق کرنے والوں کے لیے مواد اکٹھا ہو۔ انھوں نے

ہر حدیث کی اسناد بھی بیان کردی ہیں۔ اور ترمذی وغیرہ نے تو حدیث کے صحیح، حسن یا ضعیف ہونے کی بھی صراحت کی ہے۔ انھوں نے یہ ضعیف حدیثیں اپنی کتابوں میں اس لئے شامل کی تھیں تاکہ تحقیق کرنے والے مزید تحقیق کریں۔ ہوسکتا ہے ایک ضعیف حدیث دوسرے راویوں کے ذریعہ صحیح ثابت ہوجائے۔ اب جو لوگ امت کے بگاڑ کے پیش نظر اصلاح اور دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کا کام یہ نہیں ہے کہ چن چن کر ضعیف حدیثیں جمع کریں اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہیں۔ یا نہیں عوام کے سامنے پیش کریں یہاں تک کہ موضوع حدیثیں پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

خطیب بغدادی نے جن کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے۔ حدیث کے معاملہ میں سہل انگاری برتنے والوں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ دعوت فکر دیتا ہے۔ "الکفایۃ فی علم الروایۃ" ان کی مشہور کتاب ہے جس کا شمار فن حدیث کی اہم ترین کتابوں میں ہوتا ہے وہ کہتے ہیں: "اس زمانے میں اکثر طالبین حدیث کا یہ حال ہے کہ حدیث کی مشہور کتابوں کے بجائے غیر معروف کتابوں کا ان کے ذہن پر غلبہ ہوگیا ہے۔ معروف حدیثوں کو چھوڑ منکر حدیثوں کو سنتے ہیں، مجروح اور ضعیف راویوں کی روایتوں میں جن میں سہو اور غلطیاں پائی جاتی ہیں مشغول رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر کے نزدیک صحیح چیز قابل اجتناب بن گئی ہے اور جو ثابت ہے وہ دوری کا باعث یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ راویوں کے حالات سے واقف نہیں ہیں ان میں اس صلاحیت کا بھی کمی ہے جو تمیز کرنے کے لئے ضروری ہے اور وہ اس علم کو حاصل کرنے سے بھی بے نیاز ہیں۔ ان کا یہ طریقہ اس طریقہ کے بالکل خلاف ہے جو ہمارے اسلاف میں ممتاز شخصیتوں اور ائمہ محدثین کا رہا ہے (الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۸۸)

کی سربلندی میں ان کے بزرگوں نے عملی حصہ لیا۔ اور اپنا خون سینچکر حصہ لیا۔ یہاں یہ بات لائق غور ہے کہ اہل نائطہ کا مان، آنحضرتؐ کی قرابت قریشیہ کی بنا پر ہی شاندار نہ تھا۔ بلکہ اسلام سے وابستگی سے بھی شاندار تھا۔

اگر ہم اس نسلی تفاخر سے کام لیتا اور یہ رسم سلطان بود کی ذہنیت کا مظاہرہ کریں تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف تاریخ کی روشنی میں خاندانی روایات کے پیش نظر اسلام سے وابستگی کو اپنا شعار بنائیں، تو یہ بات معنویت کی حامل ہوگی۔

-٭٭٭-

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نشانِ راہ (قسط دوم)

(دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبا سے خطاب)

اور اب وہ چار چیزیں بیان کرتا ہوں جو آپ کی ذات سے متعلق ہیں۔ انہیں آپ سرسری نہ سمجھئے گا یہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہے اگرچہ خود ستائی ہے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے محض اپنی بات میں اہمیت پیدا کرنے کے لئے کہتا ہوں کہ بہت کم لوگوں کو علمائے سلف اور علمائے معاصرین اور درمیانی دور کے علماء خاص طور پر ہندوستان کے علماء کے تراجم پڑھنے کا موقعہ ملا ہوگا جتنا مجھے ملا اور اس کے خاص اسباب تھے کیونکہ میں ایک تاریخی ماحول اور مؤرخین کے گھرانے میں پیدا ہوا اور گھر میں سارا خزانہ موجود تھا "نزہتہ الخواطر" جس میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علمائے ہند کے تراجم ہیں اس کو میں نے کئی بار پڑھا مسودہ کے مرحلہ سے لیکر طباعت کے بعد تک ہر مرحلہ میں کئی بار پڑھتا رہا۔ اسی طرح وفیات الاعیان اور طبقات کی جو کتابیں ہیں پڑھیں علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقعہ بھی عنایت فرمایا۔

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست ہو۔ کسی درجہ میں تقویٰ، دیانت داری اور تعلق مع اللہ ہو یا اس کی فکر ہو، یہ ایسی بنیادی بات ہے جس کے بغیر نہ کسی کام میں برکت ہوتی ہے نہ حرکت اور ایسا حقیقی نفع اسی وقت ہوگا جب خدا اور رسول کے ساتھ معاملہ درست ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کے سب شب بیدار بن جائیں، صوفی اور عارف باللہ ہو جائیں یہ ہر شخص کے لئے ضروری نہیں لیکن جو ضروری حصہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک حد تک تقویٰ، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو اور اس کی فکر ہو۔

ں نمازوں کی فکر ہو دعا کا ذوق ہو اور انابت الی اللہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور
. یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے اسے کبھی بھولنا نہیں چاہیئے . اور اس
ے حصول کے بہت سے ذرائع ہیں . ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ کتاب و سنت
ر فقہ کا مطالعہ کریں اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش
ریں . اس کے علاوہ سب سے موثر چیز یہ ہے کہ بزرگان دین کے حالات پڑھیں
ر اگر اللہ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں ، میں بے تکلف کہتا
ں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حضرت حکیم الامت مولینا اشرف علی
انوی کی کتابیں خاص طور سے ان کے ملفوظات و مواعظ ایک اچھا اثر رکھتے
ہیں ، میں نے الحمد اللہ ساری ندویت ، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی
وق کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں اس
سے آپ کو اپنی جاہ طلبی ، حب مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہو گا . اور خاص
طور پر اخلاق کی اصلاح اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور
یا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان سے خاص طور پر یہ کام لیا ہے . آپ اس کی طرف
ضرور توجہ دیں ، آپ کے اندر اس کی کوئی نہ کوئی مقدار ضرور ہونی چاہیئے .
(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں خاص طور پر اس کی دعوت
و عزیمت کی تاریخ اور اس کی اصلاحی تحریکوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ عہد نبوی
سے لے کر آج تک علم اور نفع خلائق کا ، اصلاح و انقلاب حال کا اور
جہد و ایثار کا ساتھ رہا ہے یہ دونوں بالکل ہم سفر ہیں آپ اسلام کی پوری تاریخ
کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں کا کہیں ساتھ نہیں چھوٹا ہے .
اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے ذریعہ امت کو نفع پہنچایا اور کسی بڑے فتنے سے
محفوظ فرمایا ان میں سب سے بڑا فتنہ [illegible] فتنہ تھا . اور دوسرا فتنہ خلق
قرآن کا تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے .

نصر اللہ ھذہ الأمة . یا اعان اللہ ھذہ الامة بابی بکر
الصدیق یوم الردة و باحمد بن حنبل یوم المحنة . اور اس کے بعد جو فلسفے
کے حملے تھے جن کے مقابلہ کے لئے جو لوگ آئے ، امام غزالی ہوں یا امام
ابوالحسن اشعری ہوں پھر اس کے بعد جو فتنے تھے ان کے مقابلہ کے لئے

امام ابن تیمیہ وغیرہ آئے، پھر ہندوستان میں صوفیائے کرام جنہوں نے مادیت و غفلت اور سلطنت کے اثر سے جو جاہ پرستی، طاقت پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی پیدا ہو رہی تھی اس کو روکا پھر اس کے بعد غیر مسلموں کے اثر سے اسلامی معاشرے میں جو بدعات، مشرکانہ عقائد داخل ہو گئے تھے اور وحدۃ الوجود کا جو اثر فلاسفہ اور صوفیوں سے لے کر ادباء اور شعراء تک کے دماغوں میں سرایت کر گیا تھا۔ اس کے مقابلہ کے لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ آئے پھر اس کے بعد قرآن مجید کے براہ راست مطالعہ اور حدیث سے اشتغال ہونے کی وجہ سے جو ایک جاہلیت ہندیہ اور مقامی اثرات تھے اور اتباع سنت کا ذوق جو کم ہو گیا تھا اور عقیدہ میں رخنہ پڑ گیا تھا اس کے سد باب کے لئے شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف و خلفاء کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ غرض کہ پوری تاریخ بتلاتی ہے کہ اصلاح کا کام، عزیمت کا کام اور سطح سے بلند ہو کر امت کے نفع کا کام اور زہد و ایثار دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فطری اور طبعی رشتہ قائم کر دیا ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں ٹوٹتے نہیں پایا۔ اس لئے میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس کے لئے بھی آپ اپنے کو تیار کریں کیونکہ دوسری قوموں میں بھی کوئی کام زہد و ایثار کے بغیر نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ ان کا مزاج الگ، ان کے نتائج مختلف اور ان کے احکام بھی دوسرے ہیں اس لئے آپ اپنے کو ارزاں فروشی سے بچائیں صرف دولت دنیا کو اور عہدوں کو اپنا مطلع نظر نہ بنائیں، جہاں سے کام آجائے مانگ آجائے اور امید ہو جائے بس آپ آنکھ بند کر کے چلے جائیں، اور زہد و ایثار سے کام لیں اسی زہد و ایثار کے وعدے سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے اس وقت میں نہ استیعاب کر سکتا ہوں اور نہ آپ کو ضرورت ہے۔

پوری تاریخ شاہد ہے کہ زہد و ایثار سے جو حقیقی آسودگی اور صحیح عزت حاصل ہوتی ہے اور کہیں نہیں حاصل ہوتی ہے اور یہی اصل مقصد ہے جو لاکھوں کروڑوں روپے کے مالک کو بھی حاصل نہیں ہے وہ ایک لقمہ کو حلق سے اتارنے کے لئے بعض اوقات ترستے ہیں ہنری فورڈ کہتا تھا کہ میری ساری دولت لے لو اور میرا ہاضمہ درست کر دو، اور اس قابل بنا دو کہ میں کچھ کھا پی سکوں حقیقی ضرورت کا سہولتوں اور عزت کے ساتھ پیدا ہونا۔

للہ تعالیٰ کے ذمہ ہوتا ہے اگر غیر مناسب بات نہ ہوتی تو میں بتاتا کہ میں اور میرے بعض رفقا کو بعض بزرگوں اور اپنے مربیوں کے فیض سے اور جو کتابوں میں پڑھا تھا اس کے اثر سے اللہ نے بچا لیا تو آج ہم اس قابل ہیں۔ ورنہ علوم نہیں کسی یونیورسٹی یا کسی کالج سے ریٹائر ہو چکے ہوتے اور تھوڑی بہت پنشن وغیرہ جو ملتی ہے ملتی ہوتی اور اپنے قصبہ میں بیٹھے دن گذار رہے ہوتے، لیکن ہمیشہ ایسے موقعوں پر بزرگوں کے واقعات سامنے ہوتے ہیں ان میں سے میں مولینا عبدالرحیم صاحب کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کی نظیر شائد مشکل سے ملے گی۔

والد صاحب مرحوم نے "نزہۃ الخواطر" کی آخری جلد میں مولینا نجم الغنی

صاحب

صاحب رامپوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولینا عبدالرحیم صاحب معقولات کے اور ریاضیات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ قدیم درس پڑھاتے تھے اور انہیں ریاست رامپور سے پندرہ یا بیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ان کی اپنے فن میں قابلیت کی شہرت بہت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، جب بریلی میں پہلی مرتبہ کالج قائم ہوا ہے تو اس کے پرنسپل مسٹر ہاکنس نے ان کو آفر (پیش کش) کی کہ آپ بریلی کالج میں آ جائیے اور آپ کی تنخواہ دو سو روپے ہوگی تو انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ میرے پندرہ روپے بند ہو جائیں گے۔ مسٹر ہاکنس نے کہا کہ آپ ریاضیات کے اتنے بڑے ماہر ہیں لیکن پندرہ اور دو سو روپے میں فرق نہیں سمجھتے، پھر انہوں نے جواب دیا کہ جن لڑکوں کو میں پڑھاتا ہوں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ وہ سب لڑکے یہاں آ جائیں گے اور سبھوں کو اسکالرشپ مقرر کر دیا جائے گا انہوں نے جواب دیا کہ ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ میرے گھر کے سامنے بیری کا ایک درخت ہے جس کے تازہ پھل سے صبح صبح ناشتہ کرتا ہوں، وہاں جانے کے بعد اس کا پھل نہیں ملے گا جس کی وجہ سے صحت پر اثر پڑ سکتا ہے۔ پھر اس انگریز نے کہا ہے کہ وہ پھل بھی صبح صبح ڈاک کی گاڑی سے آپ کو مل جائے گا، تو پھر انہوں نے جواب دیا کہ :

سب ٹھیک ہے لیکن آپ یہ بتلائیے کہ کل قیامت میں جب خدا یہ سوال کرے گا کہ تم میسور چھوڑ کر بریلی اس لیئے گئے تھے کہ یہاں پندرہ روپے ملتے تھے اور وہاں دو سو روپے ملیں گے تو میں اس کا جواب کیا دوں گا؟

انگریز بہرحال انگریز تھا اس نے کہا کہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

میرے عزیزو! میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ ایسی مثالیں پھر زندہ ہونی چاہئیں۔ اللہ کا فیصلہ ہے اور اس کی سنت ہے، سارے آسمانی صحیفے بتاتے ہیں۔
انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے اور مصلحین کی تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو عزت، سکونِ قلب اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے اور اس کے ساتھ جو برکت ہوتی ہے وہ سب زہد و ایثار پر موقوف ہے۔ اور اب پھر وہ دور آیا ہے خاص طور سے ہمارے مسلمانوں کے حالات ... زہد و ایثار کے طالب ہیں۔
یہ بہت بری روایت شروع ہو گئی ہے کہ جہاں زیادہ پیسے ملیں، جہاں زیادہ آسودگی حاصل ہو۔ اور جہاں اپنے خاندان کی آسانی سے پرورش کر سکیں وہیں جانا چاہیئے، یہ بہت بڑی آزمائش ہے اس سے بچنے کی دعا مانگنی چاہیئے۔

(۳) تیسری بات جو بہت تجربہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں اسلام کے مذاہب اربعہ اور ان سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے، شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو ان تمام مطالعے کے نچوڑ میں ایک بڑی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹیئے گا اس کو اکڑ سمجھنا چاہیے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیلیں پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹیئے، اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد و قرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے، ورنہ یہودی مذہب کیا باقی ہے، عیسائیت کیا باقی ہے، عیسائیت کے بارے میں قرآن نے ولا الضالین کہا ہے، معجزہ ہی ہے یعنی وہ پٹری سے بالکل ہٹ چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ اس دین اسلام کے بارے میں فرما دیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ اور اس کے ساتھ جو تائید

جو قوی دلائل ہیں جو مسلک امت فکر [illegible] علماء [illegible] قلب [illegible] اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور و فکر کے نتائج ہیں ان [illegible] کا جو اختلاف ہے اور ذہن موزوں ہے وہ کسی فکر [illegible] کو حاصل نہیں ہے۔ [illegible] اپنے کو غلام ذہنی منڈی میں پیش نہ کیجئے۔

جس کو ہمارے اور آپ کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی [illegible] شاگردوں سے ہیں۔ جیسا مولانا ادریس صاحب نقل کرتے تھے اور [illegible] ہے ان کے استاذ مولانا شبلی نے کہا تھا۔ بعض لوگ [illegible] دھوکہ کھا جاتے ہیں وہ زمین [illegible] [illegible] ماتی قلبیہ " اور شہیدوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہیں [illegible] کہیں مظہر ان کے تیر کا نشانہ بنتے ہیں، لہٰذا [illegible] اپنے کو [illegible] رکھئے اس کا بڑا فائدہ ہوگا۔ اللہ کی خاص عنایت ہوگی، [illegible] برکت ہوگی اور حسن خاتمہ بھی ہوگا۔ اور [illegible] علم سے اپنا اشتغال رکھئے اپنے کو کبھی فارغ التحصیل نہ سمجھئے [illegible] کتابوں کا مطالعہ اور پرانی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیئے تو [illegible] قرآن [illegible] تفسیریں حدیث شریف کی شرحیں تاریخ کی کتابیں اور جو کتابیں علم کلام پر [illegible] صحیح عقائد کو پیش کرنے کے لئے صحیح طریقہ پر لکھی گئی ہیں ان [illegible] آپ کا ربط رہے اور ان کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہیں۔ اور اپنے [illegible] تعلق قائم رکھیے۔ [illegible]

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ ❀ ❀ ❀

---

۲۴ جون ۱۹۲۴ء میں کرنل عیسیٰ چند روز بیمار رہ کر [illegible] اللہ کو پیارے ہوگئے ان کو پورے فوجی اعزاز اور اسلامی طریقے پر دفنایا گیا۔ ان کی قبر [illegible] صاحب سے احمد پور اور بہاولپور جانے والی سڑک [illegible] کے کنارے پر واقع ہے۔ جب تک نواب صاحب [illegible] وہ یہاں گزرتے ہوئے ہمیشہ کار سے اتر کر فاتحہ پڑھا کرتے [illegible] اور [illegible] میں عساکر بہاولپور کے لئے یہ حکم تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے [illegible]

[illegible] خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را [illegible]

شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی کا قیام حیدرآباد دکن

[illegible]

[illegible]

مجالس قائم کیں اصلاحات جاری کر کے قومی مقامات کی بنیاد ڈالی۔ کاشت کاروں اور غریبوں [illegible] میں اپنے حقوق حاصل کرنے کا احساس پیدا کیا۔ برطانوی اقتدار کو رد کرنے اور ختم کرنے کے لیے زبردست تحریک چلائی اور خدیوی مطلق العنان حکومت کو دستوری و جمہوری حکومت میں بدل دینے کے لیے شدید جدوجہد کی۔ مصر میں افغانی کے شاگردوں اور معتقدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں محمد عبدہ، اور رشید رضا جیسے ممتاز عالم، اسحاق ادیب، عبداللہ ندیم اور مصطفیٰ کامل جیسے بلند پایہ صحافی مقرر اور ادیب اور سعد زاغلول اور احمد اعرابی جیسے نامور سیاسی رہنما بھی شامل تھے۔ خدیو اسماعیل کا ولی عہد توفیق قومی تحریک کی حمایت کر رہا تھا اور اس نے بڑھ چڑھ کر علامہ افغانی اور ان کے ہم خیال محبانِ وطن کی حمایت حاصل کی تھی لیکن خدیو بن جانے کے بعد وہ تمام وعدوں سے منحرف ہو گیا۔ اسے یہ خوف تھا کہ اگر اس نے محبانِ وطن کے مطالبات تسلیم کر لیے تو وہ محض نام کا حکمران رہ جائے گا اور حریت پسند رہنما برطانیہ سے متصادم ہو کر اس کی حکومت تک کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ دوسری طرف برطانوی حکمران اور مدبر علامہ افغانی کی ہمہ گیر جدوجہد سے سیاسی خطرہ محسوس کرنے لگے اور ان کو یقین ہو گیا کہ اگر افغانی کی تحریک کچھ عرصہ جاری رہی تو انگریزوں کو بہت جلد مصر سے نکلنا پڑے گا۔ چنانچہ خدیو اور انگریز دونوں علامہ افغانی کے خلاف متحد ہو گئے اور یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کو فوری مصر سے نکال دیا جانا چاہیے۔

[illegible] شریف پاشا علامہ افغانی کے حامی تھے اور سوڈان کے مسئلہ پر انہوں نے انگریزوں [illegible] سے اختلاف کیا۔ یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ شریف پاشا کو استعفیٰ دینا پڑا [illegible] ریاض پاشا کو مقرر کیا گیا۔ جو مصر میں موجود نہ تھے۔ چونکہ ریاض پاشا [illegible] حامی تھے اور توفیق کو ان سے بڑا خطرہ تھا اس لیے اس نے انتظار [illegible] ۲۴ اگست ۱۸۷۹ء کو علامہ افغانی کو مصر سے نکال [illegible] دو بجے رات کو ایک فوجی دستے نے افغانی کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا [illegible] کے سربراہ عثمان غالب پاشاہ نے جو علامہ افغانی کا ہم [illegible] ان کو گرفتار کر کے راتوں رات سویز پہنچا دیا۔ افغانی چاہتے تھے [illegible] ہندوستان جانے دیا جائے مگر ان کو سویز سے بمبئی بھیج دیا

ستمبر ۱۹۷۹ء میں علامہ افغانی بمبئی پہنچے اور شہر کے ایک [illegible] محمد علی روگے کے مہمان ہوئے۔ بمبئی میں مختصر قیام کے بعد علامہ افغانی کو حیدرآباد دکن جانے کی اجازت مل گئی۔ افغانی نے حیدرآباد جانے کا فیصلہ [illegible] ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست تھی اور [illegible] براہ راست حکومت نہ تھی۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم سالار جنگ [illegible] اور آمد و ترقی پسندگی کا شہرہ تھا اس لیے ممکن ہے کہ افغانی کا یہ خیال [illegible] ان کو ہندوستانی مسلمانوں کی بہتری اور ترقی و اصلاح کے لیے کام [illegible] ملے گا اور وہ ہند میں مسلمانوں کے عروج و اقتدار کی اس یاد [illegible] قوت بنا سکیں گے جو مسلمانان ہند کے تحفظ اور ملی استحکام [illegible] لیکن حیدرآباد آنے کے بعد انہوں نے جو حالات دیکھے وہ انتہائی [illegible] یہاں بھی وہ انگریزوں کے پنجے سے محفوظ نہ تھے۔ نظام کی خود مختاری ختم [illegible] انگریزوں کا عمل دخل روز افزوں تھا اور سالار جنگ برطانیہ کی خوشنودی [illegible] حاصل کر لینا ہی اپنی سیاسی کامیابی اور حیدرآباد کی بقا کی ضمانت [illegible] تھے۔ علامہ افغانی اپریل ۱۸۸ میں حیدرآباد پہنچے اور یہاں [illegible] کا قیام [illegible] رہا۔ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے یہ ایام خاموشی [illegible] اور سیاست میں کوئی حصہ نہ لیا۔

حیدرآباد میں ان کی حالت نظر بند جیسی تھی اور ان کی نگرانی [illegible] چنانچہ لوگ ان سے ملتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ افغانی کی نظر میں ہندوستان [illegible] بڑی اہمیت تھی اور وہ پورے مشرق کی نجات کے لیے ہندوستان کی [illegible] تصور کرتے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں جب وہ ہندوستان آئے تھے [illegible] ۱۸۵۷ [illegible] کے لیے لاوا پک رہا تھا اور ایک زبردست سیاسی ہیجان [illegible] ٹھنڈی ہو گئی تھی [illegible] علیہ [illegible] پیدا کر دی تھی [illegible] حالات میں افغانی نے خاموشی [illegible] [illegible]

اہم بات یہ ہے کہ اس دوران میں علامہ اعجاز نے فکر انگیز مضامین لکھے ۔ بہت موثر انداز میں کئی اور دینی ، علمی ، عمرانی اور قومی مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے اس مسئلے کی اہمیت کا احساس پیدا کیا۔

علامہ اعجاز حیدرآباد میں [illegible] اردو شعر و ادب کے [illegible] رسول یار خان (نواب رسول یار جنگ) [illegible] ان کا قیام کا [illegible] علمی مباحثے ہوا کرتے تھے جن میں پیشتر علمی اور علمی مذاق رکھنے والے دیگر افراد [illegible] شریک ہوتے تھے نواب رسول یار جنگ کے [illegible] مسیح الزماں ، مولوی عبدالصمد ، مولوی ابو رحیم ، مولوی اکبر علی اور مولوی محمد [illegible] ان میں [illegible] شریک رہتے ۔ [illegible] کرتے تھے حیدرآباد کے علمی [illegible] ان کو [illegible] اعتراف [illegible]

[illegible] علم و فضل [illegible] حیدرآباد میں [illegible] معاملہ جنگ اول [illegible] مولوی مسیح الزماں خان [illegible] علامہ [illegible] سالار جنگ سے ملاقات کی ۔ سالار جنگ [illegible] مسیح الزماں اور دیگر اکابر کے ذریعہ [illegible] سلسلۂ [illegible] اقامت [illegible] سالار جنگ [illegible] کے باوجود یہ پیشکش [illegible] سالار جنگ [illegible] علامہ اعجاز کے علم و فضل اور ان کی تعلیم [illegible] بہت [illegible] لیکن ان کی [illegible] کی وجہ [illegible] کہ اگر علامہ اعجاز [illegible] حالات [illegible] اور [illegible] ہو گئے ۔ اس لیے ان کی کوشش یہ تھی [illegible] ملازمت قبول کرنے پر [illegible] علامہ اعجاز نے کوئی [illegible] ان کی [illegible] علم [illegible]

[illegible] ولادت [illegible]

علامہ نعمانی کے ایک [illegible] مولوی محمد [illegible] تھے۔ وہ روشن خیال، اصلاح پسند اور [illegible] قسموں سے خالی تھے [illegible] سرسید کے مذہبی خیالات سے [illegible] اختلاف تھا۔ وہ [illegible] "معلم شفیق" کے ایڈیٹر تھے جو دسمبر ۱۸۸۰ء میں حیدرآباد سے جاری کیا گیا تھا [illegible] علامہ نعمانی کے مضامین پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں رسالہ "معلم [illegible]" [illegible] مضامین لکھا کرتے تھے۔ "معلم شفیق" میں علامہ کے [illegible] شمارہ [illegible]

[illegible] تعلیم [illegible]

[illegible] اولیت [illegible]

[illegible]

علامہ نعمانی کا قیام [illegible] اہم ہے [illegible] انہوں نے تمام اہم فارسی [illegible] میں لکھے تھے۔ [illegible] فارسی مقالات کا پہلا مجموعہ عبدالغفور شہباز نے [illegible] ۱۸۸۳ء میں کلکتہ میں شائع ہوا۔ اس [illegible] اور مقالہ [illegible] اور ایک [illegible] "تعلیم و تدریس" [illegible] فارسی مقالات کا ترجمہ اردو [illegible] میں شائع

[illegible]

[illegible] ۱۸۸۱ء [illegible]

[illegible] کارے واحد

[illegible] اہم ہے [illegible]

[illegible] مقالہ نعمانی کے

[illegible] ۱۸۸۵ء میں

[illegible] جو ان

۱۹۴۶ [illegible]

[illegible]

[illegible] بیان اور انگریزی

انتشار پیدا کر دیا تھا اور لوگ نیچری تحریک کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک مدرسہ کے استاد محمد واصل نے محرم ۱۲۹۸ھ میں علامہ افغانی کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ نیچری کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مذہب کب نکلا اس کا مقصد اصلاح معاشرہ ہے یا نہیں اور یہ دین کے منافی اور اس کا مخالف ہے یا نہیں۔ (۳۱) کے آثار اور دین مطلق کے آثار میں کیا نسبت ہے؟

اس کے جواب میں علامہ افغانی نے ایک بہت ہی معلومات افزا اور فکر انگیز مقالہ قلم بند کیا جس میں مادہ پرستی کی تاریخ مختلف قوموں میں اس کی متعدد شکلوں اور گوناگوں جھتوں، اس کے سربرآوردہ مفکروں کے مقاصد و نظریات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان تحریکوں کے مفر اثرات اور تمرہ کن عقائد بر بحث کی اور دہریت کی تباہ کاری سے افراد و اقوام اور معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان اصول و عقائد کی اہمیت و افادیت واضح کی ہے جو فلاح و شرف انسانی کے ضامن اور انسان کی روحانی، مادی، انفرادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کے ضامن ہیں۔

علامہ افغانی کا یہ مقالہ اس اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے ان کے انداز فکر، اصول و عقائد اور دین سے ذہنی و قلبی وابستگی کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

سرسید احمد خاں کچھ تو حالات و مصالح سے مجبور تھے اور کچھ انگریزوں سے ان کی محبت اور وفاداری نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے مقاومت و مصالحت کریں [illegible] ان کی خوشنودی و سرپرستی حاصل کرنا مسلمانوں کی بہتری اور بقا و ترقی کے لیے ضروری خیال [illegible] تھے۔ اس لیے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر وہ انتہائی حدود تک چلے گئے۔ سید جمال الدین افغانی جیسا عظیم حریت پسند برطانوی سامراج کا دشمن، اصول و عقائد کا شیدائی، اسلام کا فدائی اور بے باک مجاہد ایسی مصلحتوں کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چونکہ وہ قرآن تک کو گوارہ کر [illegible] اس لیے انھوں نے سرسید کی شدید مخالفت کی اور دہریت [illegible] تھا میں بھی لکھے جس میں سرسید [illegible] اور ایک عربی [illegible] فارسی مضمون [illegible] لکھا تھا [illegible]

میجر عبدالرحمٰن عیسیٰ - انگلستان

اسلام کی جانب سفر

قسط دوم

دوسرے روز جمعہ تھا۔ میجر عیسیٰ ان کی مسجد میں گیا اور نماز کے بعد اس نے امام مسجد سے اس مسئلہ کی وضاحت چاہی مگر امام مسجد کی باتوں سے مطمئن ہونے کی بجائے اس کے دل میں مزید شکوک پیدا ہوئے قادیانی علماء اس کو غلام احمد کی نبوت کا قائل نہ کر سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسرے علماء سے اس بارے میں گفتگو کرے۔ لیکن وہ کسی کو نہ جانتا تھا کیونکہ ان چند دنوں میں اس کو صرف قادیانیوں ہی سے واسطہ پڑا تھا۔

اتفاق سے لاہور سے نکلنے والے ایک اخبار "ایسٹرن ٹائمز" میں اس نے علامہ عبداللہ یوسف علی کا ایک مضمون پڑھا جو ان دنوں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور کے پرنسپل تھے۔ میجر عیسیٰ نے علامہ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن کے چند پارے پڑھے تھے اور ان کے نام سے واقف تھا لہٰذا اسی دن سیدھا اسلامیہ کالج پہنچا اور علامہ سے انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ علامہ نے فوراً اسے اندر بلا لیا۔ میجر عیسیٰ نے اپنی پوری داستان سنائی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق دریافت کیا۔ علامہ نے اس کو ساری بات سمجھا دی تسلی دی اور کہا کہ تمہاری پریشانی واقعی بجا ہے۔ علامہ اسی روز چند دنوں کے لئے [illegible] جا رہے تھے انہوں نے وعدہ کیا کہ واپسی پر اس کی تشفی کرا دیں گے۔ فی الحال اس کا [illegible] علماء سے کرا دیا تاکہ اس کو اسلام کی صحیح تعلیم دیں۔ کچھ دنوں بعد علامہ واپس لاہور پہنچے اور میجر عیسیٰ سے دریافت کیا کہ آیا علماء نے ان کی تسلی کرا دی ہے اور معلوم ہو گیا کہ قادیانی فرقہ [illegible] اسلام میں [illegible] آگیا ہے۔ علامہ صاحب جو خود بھی عربی زبان پر عبور رکھتے تھے [illegible] قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر لکھ چکے تھے، میجر عیسیٰ کو راہ راست پر لانے [illegible] میجر عیسیٰ [illegible] ان کی [illegible] جتنا [illegible] وقت لگ سکتا [illegible] گیا علامہ نے

[illegible] عالم شرف میں ان کو
[illegible] رہے تھے وہ
[illegible] کر سے آگے رہ
[illegible] متعلق بتایا
[illegible] کہ وہ چاہتا ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] اور
[illegible]
[illegible]
[illegible] کا آغاز
[illegible]
[illegible] کہ وہ [illegible]
[illegible] کوئی [illegible]
[illegible]

[illegible] جس میں تمام [illegible]
[illegible]
[illegible] پہلو [illegible]
اور [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible] جس میں [illegible]
[illegible] کیا گیا تھا [illegible]
[illegible]

سب سے آخر میں [illegible] ملایا [illegible] تپاک سے
ہاتھ ملایا اور [illegible] غنیمت جانا اور لوٹ
[illegible] نام [illegible] تو بڑی خوشی
کی بات ہوئی [illegible] معاشرے میں رہ کر اسلام
[illegible] اور ساتھ ہی [illegible] اور خودداری [illegible]
[illegible] کو فائل
[illegible] میں
[illegible]
[illegible] اور
[illegible]
[illegible]
[illegible] لئے
اور [illegible] وہ جا چکے [illegible]
[illegible]
[illegible] خوش ہوئے
[illegible] ہو
[illegible] کولنسل [illegible]
[illegible] صاحب نے مسکرا کر جواب
[illegible] اس بات کا وہ خود
[illegible] ہوگا۔
[illegible] سکریٹری
[illegible]
[illegible] احکام
[illegible] عبدالقادر کی
معرفت [illegible] وہ محض
[illegible] وغیرہ

نواب صاحب جہاں بہاولپور اسٹیٹ فورسز کا ہیڈ کوارٹر تھا پہنچ کر عہدہ کا چارج سنبھال لیں۔ مجر میسی دوسرے ہی روز لاہور سے روانہ ہوکر ڈیرہ نواب صاحب (یہ جگہ بہاولپور سے ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے) پہنچا۔ اسٹیشن پر نواب صاحب کا اے ڈی سی استقبال کے لئے موجود تھا۔ وہ اس کو ہمراہ لے کر سیدھا شاہی مہمان خانہ پہنچا اور تھوڑی دیر کے بعد آرمی منسٹر اور جنرل آفیسر کمانڈنگ کے ہیڈ کوارٹر جاکر حاضری کی رپورٹ دی۔

ابتداء میں اسے شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا اس کے بعد ایک بنگلہ میں جو پوری طرح آراستہ تھا منتقل کیا گیا۔ چارج سنبھالنے سے پہلے آرمی منسٹر میجر میسی کو اپنے ہمراہ شاہی محل صادق گڑھ پیلس لے گیا۔ نواب صاحب کے حکم کے مطابق نواب صاحب سے ہر ملاقاتی کے لئے ضروری تھا کہ محل کے مین گیٹ پر سر پر ترکی ٹوپی پہنے۔ وہاں درجنوں ترکی ٹوپیاں مختلف سائز کی موجود تھیں۔ نواب صاحب کی ملاقات کے لئے اس لباس کا ہونا ضروری تھا۔ ماسوائے والیان ریاست، وائسرائے ہند، گورنر اور کمانڈر انچیف، باقی کوئی ترکی ٹوپی پہنے بغیر گیٹ سے اندر نہیں جاسکتا تھا انگریز ہو یا ہندو، ان کو ملاقات کے وقت سرخ ترکی ٹوپی پہننی ضروری تھی۔ میجر میسی نے ترکی ٹوپی پہنی جب شیشہ دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پہلے وہ باطنی طور پر مسلمان تھا لیکن اسلامی لباس پہنے سے اب ظاہری طور پر بھی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میجر میسی کو ملاقات کا طریقہ بھی سمجھا دیا گیا تھا کہ ہر ملاقاتی اپنے منصب اور عہدہ کے مطابق نواب صاحب کو نذرانہ پیش کرتا ہے چنانچہ اس نے سونے کی گنیاں اور اشرفیاں نچھاور کیں۔ نواب صاحب نے گلے لگایا اور اس کے بعد اس کے کندھے پر ایک اور اسٹار لگا کر اسے لیفٹننٹ کرنل بنا دیا اور ایک سنہری دستے کی تلوار عنایت کی۔

ایک سال کے قلیل عرصے میں کرنل میسی نے یونٹ کی تربیت اور نظم و نسق کا معیار انڈین آرمی تک پہنچا دیا۔ دوسرے سال جب جنرل ہیڈ کوارٹر دہلی سے انڈین اسٹیٹ [illegible] اینڈ وائز [illegible] چیف سالانہ معائنہ کے لئے آیا تو اس نے نواب صاحب [illegible] دی اور کہا آپ کی فورسز کا معیار ہندوستان کی تمام [illegible] سے کسی طرح کم نہیں۔ [illegible] کرنل میسی کی تنخواہ [illegible]

باقی پر صفحہ ۱۸

ڈاکٹر محمد انورالدین

ابن نشاطی اور پھول بن

ابن نشاطی، سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے۔ "پھول بن" اس کا لازوال کارنامہ ہے جو قدیم اردو کی ایک بسیط ادبی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کو جتنی شہرت ملی اس کے برعکس ابن نشاطی کے حالات زندگی اسی قدر تاریکی میں رہے۔ یہاں تک کہ اس کا سنہ پیدائش یا سنہ وفات کا بھی اب تک پتہ نہ چل سکا۔ جدید تحقیقات سے اس قدر پتہ چلا ہے کہ ابن نشاطی کا اصل نام شیخ محمد مظہرالدین ابن شیخ فخرالدین تھا اور وہ گولکنڈہ کا باشندہ تھا۔ اس کے حالات زندگی پر خارجی ذریعوں سے بہت کم روشنی پڑتی ہے اس کے حالات زندگی کا سب سے بڑا اور واحد ماخذ اس کی مثنوی "پھول بن" ہی ہے۔

پھول بن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن نشاطی کا ابتدائی زمانہ بڑی عسرت میں گذرا۔ پھول بن کی تصنیف تک اسے شاہی دربار میں رسائی بھی نہیں تھی اس مایوسی کی حالت میں اسے خیال ہوا کہ اس طرح جینا اور مرنا دونوں برابر ہیں کیوں نہ کوئی کام کر جاؤں جو دنیا میں یادگار رہ جائے۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے پھول بن کو نظم کرنا شروع کیا۔

پھول بن کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابن نشاطی نہایت منکسرالمزاج واقع ہوا تھا وہ اپنے ہم عصر یا پیشرو اساتذہ سخن کی طرح شیخی یا تعلی نہیں کرتا تھا۔ اور نہ ہی اپنے حریفوں پر اس نے کوئی چوٹ کی۔ جیسا کہ اس زمانہ کا [عام] طریقہ تھا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو اردو کے بہت کم شعرا میں پائی

* لکچرار سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

جاتی ہیں۔ [illegible] سے کام لیتا ہے اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اگر اس کے [illegible] شعر [illegible] اور ملا خیالی [illegible] خیالات کا اظہار [illegible]

تمام دن کیا کر [illegible]
[illegible]
نہیں اس وقت [illegible]
حسن شوقی [illegible]
اچھے تو دیکھتا [illegible]

اس [illegible] تعمیر و تعمیر [illegible] کا دعویٰ [illegible]

تجھ سے [illegible]
تجھے معلوم [illegible]

نگارستان و تماشہ [illegible] شیعہ مذہب کا پیرو تھا تاہم اس کے اس بیان کی تصدیق ہم کو اس کے کلام کے مطالعہ سے ہوتی ہے ابن نشاطی ایک مذہبی انسان تھا [illegible] امام حسین علیہ السلام سے [illegible] عقیدت تھی ذیل کے اشعار سے [illegible]

دکن [illegible] جلوں تا ملے [illegible]
جو [illegible] مبارک [illegible]
اول [illegible]
فرات اپنے دو [illegible] کر دکھاؤں

پھول بن کے اختتام پر ابن نشاطی نے [illegible] سے متعلق [illegible] باتیں بتائی ہیں۔ [illegible] بھی تھا شاعر [illegible] میلان شعر گوئی کی طرف نہیں تھا۔ مگر اس نے فن شعر گوئی [illegible]

دکھاتا ہے۔ [illegible] اور [illegible] میں انشاء [illegible] کو استعمال کیجئے چنانچہ وہ کہتا ہے [illegible] کو ایک خاص لطف اور اسلوب [illegible] ہے۔

ایسے استاد کو میرا سلام [illegible]

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ [illegible] دستیاب [illegible] کا تعلق [illegible] لیکن [illegible] شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی [illegible]

[illegible]

پھر [illegible]

[illegible] آپ [illegible] جاتا تو میں شعر کے فن میں مسیحائی کر دکھاتا [illegible] اور میرا [illegible] مرتبہ مجھے حاصل ہو جانے دیا۔

ابن [illegible] ایک صاحب [illegible] جس نے شاعری اور [illegible] کے آنے [illegible] درباری اور [illegible] قدر [illegible] کی [illegible]

پھول بن کا ماخذ

چارلس [illegible]

[illegible] ... the [illegible]

Library of the late Tippoo Sultan of Mysore

میں پھول بن کو ملا احمد زبیری کی "بساطین" کا ترجمہ قرار دیا ہے جو عہد سلطان محمد تغلق (۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۱ء) کا مصنف ہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو (جلد اول) میں اسے احمد حسن دبیر میدروسی کی "بساتین الانس" کا منظوم ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ اس بساتین کا کوئی نسخہ ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانہ میں نہیں ہے۔ پھول بن کو محض ترجمہ یا تلخیص نہیں کہا جا سکتا۔ یہ قصہ ابتدائی انداز کا ہے مگر اس میں جگہ جگہ ابن نشاطی نے مقامی ماحول کی عکاسی کی ہے۔ مناظر نگاری اور مرقع کشی کے رنگ تو تمام تر ہندوستانی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اس لئے گمان ہوتا ہے کہ ابن نشاطی نے اصل قصے میں اضافے کئے ہیں۔ جس سے یہ قصہ صحیح معنی میں ہند ایرانی بن گیا ہے۔

پھول بن کی تالیف کا سبب اور سنہ تصنیف

پھول بن کی تالیف کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں گولکنڈہ کے ادبی معاشرہ میں ملتا ہے۔ اس دور میں شعراء کہہ لیتے تھے ابن نشاطی جو دراصل انشاء پرداز تھا۔ وہ ایسے شاعرانہ ماحول میں کیسے اپنے آپ کو بچائے رکھتا۔ چنانچہ جب اس کو شاعری کی اس قدر و منزلت کا احساس ہوا تو اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ بھی اپنی جودت طبع کا اظہار نثر کے بجائے شعر میں کرے۔ اس لئے اس نے شاعری میں بھی اپنا کمال دکھانے کے لئے یہ مثنوی لکھی جو دراصل اس ادبی معاشرے کی تحریک کا نتیجہ ہے جس میں ابن نشاطی کے ادبی ذوق کی نشوونما ہوئی تھی۔

پھول بن کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یورپی مصنف اسٹوارٹ نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ م ۱۶۴۹ء بیان کیا ہے ہندوستانی و پاکستانی محققین میں ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے بالاتفاق اس کی تاریخ تصنیف ۱۰۶۶ھ م ۱۶۵۵ء قرار دی ہے لیکن اب پھول بن کا صحیح تر نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ جس کی مدد سے ۱۹۵۵ء میں شیخ چاند ابن حسین

نے اس کو ترتیب دیا۔ حیدرآباد کے گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری میں بھی اس کا ایک عمدہ مکمل نسخہ موجود ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۷۶ھ م ۱۶۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

عشاداں اس کی دیکھ ہر ایک چمن میں دکھیا ہوں ناؤں اس کا پھول بن میں لگا تاریخ لایا تو یہ گلزار سے۔ اگیارہ سو کوں کم تھے بیس پر چلا گیا دہ سو میں سے بیس پر چار یعنی چوبیس کم کرنے سے ۱۰۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں چونکہ بعض نسخوں میں آخری مصرع کے بیس کو تیس پڑھا جاسکتا تھا۔ اس لیے التباس ہو رہا تھا لیکن اب گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری حیدرآباد اور انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان کے نسخوں سے التباس باقی نہیں رہا۔ ۱۰۷۶ھ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، شیخ چاند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی یہی سال صحیح مانا ہے۔ اس لیے پھول بن کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ م ۱۶۶۵ء قرار پاتا ہے۔

پھول بن تین ماہ کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے ابن نشاطی نے اسے ماہ رجب میں لکھنا شروع کیا اور عید رمضان کے دن اسے مکمل کیا

کیا سو ابتدا ایک ماہ رجب کیا نیت کوں اپڑیا عید کوں سب
یو "پھول بن" تین مہینے لگ لگایا ہنم کا چاند ہو پورا اتو آیا

ابن نشاطی نے "پھول بن" کے اشعار کی تعداد ۱۰۴۴ بتلائی ہے۔

سو گنتی میں انے سو بک اور بیتاں ہے ستر او ہو [illegible] چالیس بیتاں

لیکن پھول بن کے متعدد نسخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اضافے اور اصلاحیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔

پھول بن کا موضوع اور ابن نشاطی کی قصہ گوئی

پھول بن کا موضوع عشق ہے جو عموماً اردو اور فارسی کی داستانوں کا ہوتا ہے ابن نشاطی نے تفصیلات و جزئیات کے ساتھ دوسری داستانوں کی طرح اس میں بھی شہزادے اور شہزادیوں کی عشق کی داستان بیان کی ہے پر اس بات کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ عشق کی روایتی داستان کو ابن نشاطی نے اپنے طور پر قلمبند کیا ہے بقول نشاطی "سراسر عشق کے یہ اوراق [illegible] عشق مجازی عشق اور [illegible]

پھول بن میں قصّوں کو بیان کرنے کے لئے قصّہ در قصّہ یا کہانی در کہانی کی روایتی تکنک استعمال کی گئی ہے اس طرح کی تکنک بیتال پچیسی کی کہانیوں اور الف لیلہ کے قصوں کے لئے استعمال کی گئی ہے۔

پھول بن کے قصے میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو اس دور کے دوسرے قصوں قصوں میں پائے جاتے ہیں جیسے "گلشن عشق" اور "قطب مشتری" وغیرہ میں ان قصوں میں بھی بہت سی مماثلتیں ہیں۔ "پھول بن" میں کنچن پٹن کا بادشاہ خواب میں ایک درویش کو دیکھتا ہے جب کہ قطب مشتری میں شہزادہ اپنے خواب میں ایک پری کو دیکھتا ہے۔ یہاں قصوں میں پائی جانے والی مماثلتوں کو دوہرانا مقصود نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ دکن کی تقریباً تمام مثنویوں کے قصے فارسی قصوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پھول بن "قطب مشتری" اور "گلشن عشق" اور دوسرے دکنی قصوں میں جزئیات کا فرق پایا جاتا ہے لیکن داستانوں کی جزئیات اور ترکیبی عناصر کے بیرونی ڈھانچے میں بہت کم فرق ہے۔

پھول بن میں تین قصے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قصہ ختن کے سوداگر کے بیٹے اور گجرات کے ایک زاہد پارسا کی لڑکی کی داستان عشق ہے

دوسرا قصہ خالص ہندستانی ہے راجا کی جوگیوں سے عقیدت، روح کی نقل، مکانی اور پرندوں کا انسانوں کی طرح باتیں کرنا جو شک سپ ستی، بیتال پچیسی اور پنج تنتر وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

تیسرا قصہ ایرانی انداز کا ہے اس کے ہیرو اور ہیروئن دونوں اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں یہ "پھول بن" کا اہم ترین قصہ ہے

"پھول بن" میں اسلامی داستانوں کے ساتھ ساتھ ہندی لوک کتھاؤں کے عناصر بھی بکثرت ملتے ہیں اس کے علاوہ اس میں سنسکرت اور عربی قصوں کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

ابن نشاطی نے پہلے قصے میں ختن کے سوداگر کے بیٹے اور گجرات کے ایک زاہد پارسا کی لڑکی کی عشق کی داستان قلمبند کیا ہے یہ گل و بلبل کی عجیب داستان ہے

پھول بن کے دوسرے قصے میں ابن نشاطی نے ستونتی کی وفاداری و محبت کی داستان بیان کی ہے جو اسے اپنے بادشاہ شوہر سے تھی یہ قصہ بھی بڑی حد تک عشقیہ ہی ہے پھول بن کے آخری قصے میں ابن نشاطی نے ملک عجم کے بادشاہ کی لڑکی حسن بانو

شہرستانی کے شہزادے کے عشق کو موضوع سخن بنایا ہے اور ان تمام قصوں کو دلچسپ بنانے کے لئے ابن نشاطی نے بڑی فنکاری سے کام لیا ہے یہ سب قصے عشق کے گرد گھومتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ ان تمام داستانوں کا مرکزی جذبہ "عشق" ہے

اب سوال یہ ہے کہ ابن نشاطی نے "پھول بن" میں قصہ گوئی کس درجہ کی کی ہے کیا وہ قصہ گوئی کے فن میں کامیاب ہے؟ ادب میں کسی بھی قصہ کی پیش کشی اہم چیز ہوتی ہے اگر اچھے موضوع کی پیش کشی اچھی طرح نہ کی جائے تو اپنی اہمیت کھو دیتا ہے اور بعض دفعہ گھٹیا موضوع بھی اچھی پیش کش کے باعث اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ابن نشاطی کی قصہ گوئی کے تعلق سے عبدالقادر سروری "پھول بن" کے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں۔ اس کا قصہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھا اور خاصا دلچسپ ہے اس وقت بھی جبکہ اس کی زبان قدیم سمجھی جاتی ہے۔ اس کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ اسے ہم اردو کے شہ کاروں میں شمار کر سکتے ہیں۔ جو شخص بھی اس کے مطالعہ میں تھوڑی سی بھی زحمت برداشت کرے اس کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا ہے یہ مثنوی کا سادہ پن اور بے تکلف اسلوب بیان کی خوبی، قدیم طریقہ تحریر کی خامی اور [illegible] سے بڑھ کر ایک پر کیف قصے کی دلکشی ہے ...... پھول بن ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جس کا حقیقی [illegible] مسرت ناک ہے اور یہ چیز شعر اور قصے دونوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ...

اس میں جگہ جگہ جزئیات کے ایسے نقشے ملتے ہیں کہ پڑھنے والے کی نظر کے سامنے [illegible] جاتے ہیں کہ اس سے نظم اور قصے کے لطف میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

ابن نشاطی نہ صرف فن داستان گوئی میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ اس کو لفظوں کے ذریعے ذہن اور دل کے احساسات کو زبان عطا کرنے کا ہنر بھی آتا ہے

پھول بن کی داستان طبع زاد نہ ہونے کے باوجود دلچسپ اور پر لطف ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسری کئی داستانوں کی طرح طویل اور زیادہ پیچیدہ نہیں ہے جیسے نصرتی کی مشہور مثنوی "گلشن عشق" کی طوالت اکثر قاری کو کھٹکتی ہے اور پڑھنے والا [illegible] اختصار ہی خوب داستان گوئی کا حسن ہے۔ [illegible] ابن نشاطی نے قصوں میں روانی اور تسلسل کو برقرار رکھا ہے اور [illegible]

انفرادی وجود کو بھی قائم رکھا ہے۔

پھول بن کے قصہ گوئی میں دو چیزوں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس داستان میں الجھاؤ (Conflict) نہیں ہے اور دوسرے اس میں ڈرامائی کیفیت کی بھی کمی پائی جاتی ہے جبکہ پھول بن کے بر خلاف مقیمی کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" کی داستان میں الجھاؤ اور ڈرامائی عنصر شامل ہیں۔ پھول بن میں الجھاؤ اور ڈرامائی عنصر کی کمی کی وجہ قصہ کا سادہ پن اور سادگی ہے چنانچہ پھول بن کے تمام قصے ایک ہی قسم کے نشیب و فراز سے گزرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کوئی الجھاؤ اور ڈرامائی تاثر چھوڑنے سے قاصر ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس داستان میں قصوں کی تراش خراش اعلیٰ سطح پر کی گئی ہے اور اُسے غیر ضروری پیچیدگی، گنجلک پن اور طوالت سے بچایا گیا ہے۔

پھول بن میں کردار نگاری:- ابن نشاطی نے واقعہ نگاری بھی خوب کی ہے اس مثنوی میں سب کردار اپنے تمام تر انفرادی وجود کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور چند کردار تو یقیناً ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جاتے اور ہمارے یاد[داشت] کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جیسے تمہیدی قصے میں بادشاہ خواب میں ایک درویش کو دیکھتا ہے ابن نشاطی نے اس درویش کی تصویر اس خوبی سے پیش کی ہے کہ یہ کردار مختصر عرصہ کے لئے ہمارے سامنے آنے کے باوجود ذہن پر ایک دیرپا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

روزہ "معلم شفیق" میں شائع ہوا تھا عربی مضمون پیرس میں لکھا تھا جو کہ علامہ کے جریدے "العروۃ الوثقیٰ" میں شائع ہوا۔

حیدرآباد میں علامہ افغانی کا پہلا مضمون "فوائدِ جریدہ" کے عنوان سے ماہنامہ معلم شفیق" کے پہلے شمارے بابت دسمبر ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ افغانی اپنے عہد کے بہت بڑے صحافی بھی تھے اور مصر میں قومی صحافت کے بانی رہے تھے۔ [ا]س مضمون میں علامہ نے جرائد کے اہم مقاصد اور ایسے اٹھارہ فوائد صراحت سے [بیا]ن کیا ہیں جو معاشرہ کی اجتماعی و انفرادی فلاح و ترقی کے لیے اہم و ضروری ہیں [ا]ن فوائد و مقاصد کو انھوں نے اپنے جریدے "العروۃ الوثقیٰ" کے اغراض و [مق]اصد میں بھی پیشِ نظر رکھا۔

تبصرہ

ڈاکٹر حسن الدین احمد

"تاریخ قبیلہ ناغڑ" پر ایک نظر

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف قبائل میں تقسیم کیا کہ انسان ایک دوسرے کو پہچانیں۔ اگر قبائل کی تقسیم فخر کی بنیاد پر ہو۔ ایک دوسرے پر فوقیت جتلانے کے لیئے ہو۔ انسان اور انسان کے درمیان تفرقے پیدا کرنے کے لیئے ہو تو یہ غلط مطلب ہے۔ عربوں میں کفو کا تصور تھا۔ کفو کے لغوی معنی ہیں۔ ہم پلہ۔ ہم سر۔ برابر یعنی ایام جاہلیت میں کہا جاتا تھا کہ فلاں قبیلہ ہمارے کفو کا نہیں ہے کفو میں یعنی برابری کے خاندان میں شادی کا رواج تھا یہ ایک طرح کا ذات پات کا نظام تھا۔ بعض قبیلے خود کو اللہ ؑ کی برادری والا سمجھتے تھے۔ تو اللہ نے سورہ اخلاص میں اعلان کیا اللہ کا ایک بھی ہم کفو نہیں۔

ہر خاندان اور قبیلہ کی کچھ نسلی خصوصیات ہوتی ہیں۔ کچھ اچھی خصلتیں ہوتی ہیں اور کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ خاندانی واقعات اور قبیلوں کے حالات پر جو کتابیں ہوں اگر ان کا مقصد خودستائی ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے نہ تو اس خاندان یا قبیلہ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ کسی اور کے لیئے ایسی خودستائی کارآمد ہو سکتی ہے۔ اہلِ خاندان اور اہل قبیلہ تو اس خودستائی پر نازاں ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

اگر ان خاندانی حالات میں خاندان کی برتری اور امتیاز کو خودستائی کے لیے نہیں بلکہ بطور حقیقت دوسروں کے لیے نمونہ بنانے کے مقصد سے ظاہر کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تاکہ خود اہلِ خاندان ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو پیش نظر رکھ کر احتیاط برتیں۔

جس طرح تاریخ کا مطالعہ کسی قوم میں نئے ولولے پیدا کرتا ہے اور پچھلے تجربات کی روشنی میں آئندہ کا لائحہ عمل بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی خاندان یا قبیلہ کے تاریخی واقعات اور

ہوں قبیلہ کے ممتاز افراد کی خدمات کا تذکرہ قلمبند کیا جاتا ہے تو اس کے [redacted] سے اس خاندان کے افراد میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو ایک قوم ایک نسل یا کسی خاص رنگ کے انسانوں پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ متعدد اقوام اور رنگا رنگ تہذیبوں پر اثر انداز ہے۔

مسلمانوں کی وفاداری قومی سطح پر ملک کے ساتھ اور بین الاقوامی سطح پر اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسلام قومی سطح پر وفاداری اور ملک سے محبت کی مخالفت نہیں کرتا البتہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ یہ وفاداری حدود اور قیود کی پابند ہو۔

ہندوستانی مسلمانوں پر یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ دستور ہند کی کوئی دفعہ اسلامی اصولوں کی نقیض نہیں ہے۔ بلکہ دستور ہند نے مسلمانان ہند کو اسلامی اصولوں پر عمل پیرائی کی آزادی دے رکھی ہے۔

اسی طرح اس دین میں ہزاروں ممتاز خاندان اور خانوادے شامل ہیں اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی اپنی صلاحیتوں کے موجب اس دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جس طرح قومی سطح پر ملک سے وابستگی اپنے حدود اور دائرہ میں رہے تو قابل اعتراض نہیں اسی طرح خاندانی انفرادیت بھی چند باتوں کی پابند رہنا چاہیئے

جس طرح ایک پُرشکوہ جلوس میں Pageant Tableau یا جھانکیاں مختلف علاقوں یا اجزاء کی نمائندگی کرتے ہیں اسی طرح اسلام کے شاندار تاریخی امتیاز میں اسلامی قبیلے یا خانوادے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر ہم سب پہلے مرحلہ میں اپنے ملک سے اور پھر اسلام سے وابستہ رہیں تو ہم کو حق ہے کہ اپنے اپنے قبیلے سے وابستگی رکھیں۔ یہ وابستگی غیر قبیلہ والوں کی مخالفت نہ سکھائے۔ اسلام ہم کو محدود انداز میں عصبیت کی اجازت دیتا ہے۔ تعصب کی نہیں۔ اپنے قبیلہ والے کی پشت پناہی کرنا عصبیت ہے مگر اپنے قبیلہ کی تائید میں دوسروں سے دشمنی کرنا اور ناانصافی کرنا تعصب ہے۔

تاریخ قبیلہ قائم خانی میجر محمد یسین خان قائم خانی ساکن جھنجھنوں راجستھان کی تصنیف ہے۔ میجر صاحب کو اس کتاب کو لکھنے کا خیال ۱۹۲۲ء سے تھا اور جدوجہد برس بعد ۱۹۷۷ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ اور جناب افضل خان قائم خانی نے محمد یسین خان قائم خانی سے کئے ہوئے وعدہ کی تکمیل کرتے ہوئے اس کتاب کو خلوص اور توجہ سے شائع کیا

نیا میں بہت کم خواب شرمندہ تعبیر ہوا کرتے ہیں۔ افضل خاں صاحب مبارکباد کے مستحق
یں کہ ان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

اسی طرح آج جس کتاب کی رسم اجرا انجام دی جا رہی ہے۔ وہ میجر محمد یسین خاں کی
وش اور جناب افضل خاں ناغڑ کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ
س کی قدر کی جائے۔ اس کتاب میں جس محنت سے مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس کی داد دینی چاہیے
ند ابواب یہ ہیں۔ علم تاریخ کا بیان۔ قوم افغان یا پٹھان۔ افغانوں کا اصل اور ان کا نسب
فانوں کا مشرف بہ اسلام ہونا۔ قبیلہ ناغڑ۔ قبیلہ ناغڑ کی ہندوستان میں آمد۔ زوال قبیلہ ناغڑ
یلہ ناغڑ حیدرآباد میں تقسیم ملک اور قبیلہ ناغڑ غدر ۱۸۵۷ء میں ناغڑ پٹھانوں کی خدمات انگریزی
ومت کی طرف سے۔ ان ابواب کے تحت کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ کتاب میں خاندانی شجرے اور
ب نامے شریک ہیں۔ البتہ چند ابواب پر مختصر تبصرہ کیا جائیگا۔

علم تاریخ کا بیان دلچسپ ہے۔ اور اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ قوم افغان یا
ان اور ان کے نسب سے متعلق ابواب میں محققین اور مورخین کے حوالوں سے ایسی معلومات
گئی ہیں۔ جو عام طور پر کم دستیاب ہوتی ہیں۔

افغانوں کا مشرف بہ اسلام ہونا۔ یہ تاریخ اسلام کا اہم باب ہے۔ اسلام قبول کرنے
قبل افغانوں کا مذہب کیا تھا۔ اور کیا عقائد تھے۔ ان پر سیر حاصل بحث نہیں کی گئی۔
وستان سے بدھ مذہب کا دیس نکالا مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ جس طرح
وستان کے تمام پڑوسی ممالک سری لنکا۔ برما۔ تھائی لینڈ۔ جاپان۔ چین اور تبت میں
مذہب قبول کر لیا گیا اسی طرح افغانوں نے بھی بدھ مذہب قبول کر لیا۔ محققین نے اس
والے دیئے ہیں۔

لیکن ایک بات جس پر کم مورخین نے توجہ دی ہے۔ افغانستان اور [illegible]
مذہب کا پہلا داخلہ ہے۔ اشوک اعظم کے عہد میں جو گندھارا [illegible] پایا گیا [illegible] رہا ہے
بدھ مذہب کے مبلغین مشرق وسطیٰ کو بھیجے گئے تھے اور ان کے اثر کے تحت بدھ مذہب
ممالک میں کافی پرچار ہوا۔ اسلام کی آمد [illegible] تو اس وقت [illegible]۔ بدھ مت ماننے والی
ں مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک میں [illegible] تھیں۔ جو اسلام کے عظیم فکری سیلاب
ب نہ کر سکیں۔ پھر بھی اپنی بستیوں اور بدھ مذہب نے اثرات کے جو [illegible] کئی سو
ی تاریخ میں ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر علامت ابجد [illegible] خاندان نوبہار

گئے میرا مکہ کا تھا۔ جو دراصل بدھ مذہب کے وہار کے پر مکھ تھے۔ افغانستان میں بدھ مذہب کے اثرات کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اسلام ہندوستان میں افغانستان کے راستہ سے داخل ہوا اور بدھ مذہب کے اثرات کو لیکر داخل ہوا۔ اس عنوان پر گہرے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

افغانوں کے قبول اسلام سے متعلقہ باب میں ان باتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا اور یہ کمی محسوس ہوتی ہے۔

قبیلہ نائط سے متعلق ابواب میں دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور ان کو جمع کرنے میں بڑی محنت کی گئی ہے۔

غدر یا جنگ آزادی میں قبیلہ نائط کی خدمات، یہ عنوان آج کے ماحول میں سبق آموز ہے یوں تو یہاں کہا گیا ہے کہ قبیلہ نائط نے فوجی صلاحیتوں کے بپیش نظر دونوں جانب سے خدمات انجام دیں لیکن تفصیلات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ خدمات اور نمایاں خدمات انگریزوں کی جانب سے انجام دی گئیں، یہ حکمران قوم کی خوبی تھی کہ انہوں نے ہر میدان میں اہل ہند کی بہترین صلاحیتوں کو ملک کے خلاف استعمال کیا۔ اور پسماندگی کے دور میں ہم نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس معاملہ میں قبیلہ نائط کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اہل قلم نے بھی یہی کیا۔ حضرت علما حق کی ایک مختصر جماعت نے اور اس کی سرکردگی میں کچھ سر پھروں نے علم بغاوت کو بلند کیا اور جنگ آزادی کی پہل کی۔ اس کے بعد لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

اس نوبت پر قوم اور قبیلہ سے وابستگی اس کی واجبیت اور عدم واجبیت سے متعلق غور کرنا ضروری ہے۔

خود میرا خانہ ان اہل نائط سے ہے۔

خانہ ان اہل نائط کے مورث اعلیٰ حضرت جعفر طیارؓ نے نہ صرف دین کی بلندی کی خاطر حبشہ حبشہ کو ہجرت کی اور نجاشی کے سامنے اسلام کے پہلے سفیر کی حیثیت سے کامیاب نمائندگی کی بلکہ ہجرت کے آٹھویں سال جنگ موتہ میں وہ زید بن حارثؓ کی شہادت کے بعد امیر لشکر ہوئے۔ اور علم اسلام کو بلند فرمایا اور قابل فخر شہادت حاصل کی یہ ایثار کا ایسا عملی نمونہ تھا۔ جس کی بنا پر آج اہل نائط فخر سے سربلند کر سکتے ہیں۔ اور یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ ان کے اجداد کی تاریخ اسلام کی تاریخ ہے۔ ابجلہ

حاشیہ ۱۲ ہے

ویدپال دیپ مدیر ٹائمز (جموں)

ترجمہ تاراچند رستوگی

جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام

جموں یونیورسٹی شعبہ اردو کے سبکدوش اعزازی پروفیسر Emeritus Professor
(Iqbal) جناب جگن ناتھ آزاد سے اگر وہ عالم فراغ میں ہوں گفتگو کرنا ضیافت سے کم خوشگو
نہیں ہوتا۔ صرف اسی لیئے نہیں کہ موصوف شائستگی اور دل نوازی کے پیکر ہیں بلکہ اس لیے
بھی کہ وہ اردو ادبیات کے جملہ متعلقات پر بے تکان روشنی ڈال سکتے ہیں اور ان کا
سمر علمی بغایت وسیع ہے۔ اردو شاعری کے دیو پیکر بڑے شاعروں سے ان کے
گہرے روابط رہے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے سالہا سال رفیق کار رہے۔
فراق گورکھپوری اور جگر مرادآبادی ایسے نامور شاعروں سے ان کو قربت رہی۔
فراق اور جگر ایسے دو وہ ان حیات ہی میں داستانی شہرت کے حامل شاعر تصور کئے
جانے لگے تھے۔ اور وہ اردو نفسیات کو اپنی دھن پر محو رقص کر سکتے تھے۔
فراق کے یہاں وہ طنزیہ چقماق پایا جاتا تھا جو سخت ترین چٹانوں میں شگاف لگا سکتا تھا۔
جگر نے معصومیت کو رفیع و وقیع پیکر عطا کیا آزاد صاحب کی یاد و صحبت آگیں جذبات
کو دیکھا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں جب یونیورسٹی جاکر میں نے ان سے ملاقات کی تو وہ اپنے
کمرے میں مصروف کار تھے۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بھری ہوئی تھیں اور دنیا کے
مختلف حصوں سے آنے والے جرائد رکھے ہوئے تھے۔ سب کے سب علامہ اقبال سے متعلق
تھے اور یہ مناسب ہی ہے کیونکہ بطور اعزازی پروفیسر ان کو یہ پراجکٹ دیا گیا ہے۔
کہ وہ اقبال کی سوانح حیات قلمبند فرمائیں۔

درحصل میں ان سے وقت لے چکا تھا۔ میری ان سے ملاقات کو ایک طرح سے
سوال و جواب کا سیشن ہی سمجھنا چاہیئے۔ مگر یہ ملاقات ایک اعتبار سے خود کلامی۔

(Monologue) ثابت ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد صاحب باطنی و ذہنی طور سے میرے ماغ میں ابھرنے والے سوالات سے واقف ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ خود ہی سب ے جو وہ میرے استفسارات پر کہتے ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا۔
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

ات :۔ اردو ادبیات پر آزاد نے اتنا زیادہ نیز پر معتبر کام کیا ہے جس سے وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کو کسی پیمانے پر سمجھنا ت نہیں رہی ہے اور ابتدا ان کی شہرت و عظمت جو نعت اسی لئے نہیں ہے کہ ان والد بزرگوار سورگیہ تلوک چند محروم اردو فارسی کے مشہور اور بڑے شاعر تھے۔ تاحال صاحب پچاس کے قریب معیاری اور ریجنل کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں ۱۶ سے زیادہ ان عری مجموعے شامل ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی کئی کتابیں انہوں نے سپرد قلم کی ہیں ان کے ری نیز لعایت سود مند تصانیف پر اعزازات پر اعزازات ملے ہیں۔ اتنے اعزازات جو ہی سے شمار کیے جا سکتے ہیں۔ موٹے طور پر تیس چالیس اعزازات تو ہیں ہی۔ اعزازات عداد ہی جاذب توجہ نہیں ہے بلکہ یہ پہلو بھی اندرون ملک نیز بیرون ہند متعدد اداروں سے ان کی ِ رائی کی عزت حاصل کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں لاہور، سیالکوٹ، پشاور، رنگون، لکھنؤ، لندن، لو، واشنگٹن، نیویارک، وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادبیات میں ان کی شہرت و مت ہی ان کے ہم پلہ مشاہیر ادبیات کے لیے جموں یونیورسٹی میں جب آزاد صاحب وہاں ر شعبہ اردو تھے۔ تشریف آوری کی موجب ہوا کرتی تھی۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ یاتی مسائل بھی متوجہات میں شامل ہیں۔ باطنی اور ظاہری تمام تر خصوصیات میں آہنگی کی بہترین ہم آہنگی آزاد صاحب کی ذات ستودہ صفات میں نظر آتی ہیں۔ اچھے محبرہ مالعہ میں معروف کار آزاد اسی دوران باہری دنیا سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ہی ادبیات اردو میں سب سے زیادہ جہاں گرد شخص ہیں۔

قبالیات :۔ آزاد بہ سہ جہات ادیب ہیں۔ لیکن ان کو بین الاقوامی شہرت شاعر و فلسفی قبال پر کام سے ملی۔ [illegible] اقبالیات کی اصطلاح کی اتنی وسعت دی ہے فلسفیانہ [illegible] حیات [illegible] وغیرہ سب کو محیط ہو گئی۔ بلکہ کچھ اور بھی جیسے شعری مواد کی تشریح، علمیات و مصطلحات جو ظاہر میں مذہبی جوش نیز فرقہ وارانہ

متاثرات ابھارتے ہیں ان کے پس پردہ مفاہیم کی تلاش و جستجو وغیرہ

اقبال کی سوانح حیات پر آزاد صاحب ابھی تک تین جلدیں لکھ چکے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ ابھی مزید دو جلدوں کی ضرورت ہے چونکہ کام طویل و وسیع بھی ہے اور دقیق بھی۔ اگر مجھے صحیح یاد رہا ہے تو اس سوانح حیات کو متعدد ادوار میں منقسم کرتے ہوئے ہر دور پر ایک جلد کی ضرورت پیش آئے گی۔ مصنف نے ابھی تک موجودہ صدی کے پہلے عشرے تک کام پورا کیا ہے۔ اقبال کی وفات تک یعنی ۱۹۲۸ تک ابھی کام تشنۂ تکمیل ہے۔

شاعر مشرق کی سرگزشت حیات بڑے بڑے مشہور ادیبوں نے لکھی ہے۔ کیا آزاد صاحب کا کام ان سب پر سبقت لے جائے گا یا اس سے نئے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے گی؟ اس استفسار کا آزاد صاحب نے منکسرانہ جواب دیتے ہوئے کہا۔ کہ ان کی رسائی ایسے مواد یا اطلاعات تک ہو گئی ہے جو پہلے دستیاب نہیں تھے۔ ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ کاوش کر لینے کے بعد انہوں نے کئی بار پاکستان جا کر اپنی تلاش و جستجو کو جاری رکھا۔ اس بات کی وضاحت کرنے کے لئے انہوں نے زیر تصنیف مسودے کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔

حافظ اقبال: عنفوان شباب ہی سے آزاد صاحب کو اقبال کی شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث وہ "حافظ اقبال" کے لقب سے موسوم کئے جانے لگے یعنی ایسے شخص جنہیں اقبال کی پوری شاعری حفظ ہے اور وہ کہیں سے بھی اشعار سنا سکتے ہیں اس وقت ان کو شاید یہ معلوم بھی نہ رہا ہو کہ اقبال اور شعر اقبال سے ان کی والہانہ محبت ان کو اقبالیات کے حامیان میں ایک مخصوص مقام اور ایک معروف ماہر اقبال کے مرتبہ کے حامل بنا دے گی۔

اقبال کو پاکستان میں قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے اور ان کے مقام و مرتبہ کو اگر زیادہ نہیں تو بانی پاکستان محمد علی جناح کے ہم پلہ تو ضرور ہی سمجھا جاتا ہے متعدد پاکستانی دانشوروں کی اس رائے سے کہ اقبال کی پرداخت و پرورش بنیاد پرست خیالات کے ماحول میں ہوئی جسکو پاکستانی حکمراں ہوا دیتے آئے ہیں اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد صاحب کا موقف یہ ہے اور جس سے ماضی و حال کے نشستہ ماہرین اقبال اتفاق بھی کرتے ہیں کہ اقبال کے دل و دماغ پر مشرقی افکار کے ساتھ ہی ساتھ مغربی خیالات کے اثرات بھی مرتب ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ [illegible] مذہبی خیالات کو بھی جدید فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

امہ شاداب حیدر آباد

اس وسیع تناظر میں دیکھنے سے کلام اقبال پاکستان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا مطالب پاک و ہند و برصغیر سے ہوجاتا ہے۔ دراصل حقیقت بھی یہی ہے اس سلسلے میں بقول آزاد اقبال خود کہتے ہیں ۔ من بہ طبع عصر خود گفتم دو حرف کردہ ام بحرین را از دو حرف

حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار تا کنم عقل و دل مردان شکار

کلام اقبال نیز مکاتیب نیز دوسری نگارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے روداد اقبال (سوانح حیات) میں آزاد نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اقبال قدیم ہندوستانی ثقافت و رسوم کا احترام کرتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ اقبال نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے ان کے اجداد سپوپیاں میں واقع سپرگاؤں سے ہجرت کر کے سیالکوٹ لئے تھے۔ اسلام سے بھی اور مستحکم عقیدت اور بین اسلام ازم (یعنی دنیا بھر کے مسلمان ایک ہیں) سے وابستگی ہونے کے باوجود ان کا کلام اور ان کی سائیکی (PSYCHE) میں کہیں کہیں کبھی کبھی ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی آئینہ داری نظر آنے لگتی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ اقبالیات پر کام کرنے کی وجہ سے پاکستان میں آزاد کی عزت و پذیرائی ہوتی ہے اس پر شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے۔ مگر مجھے آزاد صاحب سے یہ سن کر خاصا تعجب ہوا کہ پاکستانی ادبی حلقوں میں ان کے بعض افکار کی بنا پر اعتراضات بھی کئے گئے آزاد صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے بعض ادیب میرے اس موقف پر معترض ہیں کہ اقبال کے ان اشعار میں اقبال کا اشارہ نہرو خاندان بالخصوص پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کی طرف ہے ۔

ان برہمن زادگان زندہ دل لالۂ احمر ز روئے شان خجل

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش از نگاہ شان فرنگ اندر خروش

لیکن بعض پاکستانی اہل قلم میرے اس موقف سے متفق بھی ہیں۔

اسی طرح میری کتاب اقبال اور کشمیر پر جب پاکستان کے اخباروں میں تبصرہ ہوا تو اس میں اکثر خیالوں سے تبصرہ نگاروں نے اختلاف کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس ضمن میں آزاد کی تحریریں ہمیں دعوت فکر بھی دیتی ہیں ۔

تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ صحیح ہے کہ پاکستان نے علامہ اقبال پر میرے چھوٹے موٹے کام کی بہت پذیرائی کی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اقبال کے فکر کے ہر پہلو پر پاکستانی دانشور میرے ساتھ متفق ہوں، اور میری بھی کبھی یہ کوشش نہیں

نہیں کہ چونکہ پاکستان کا فلاں نقاد یا دانشور علامہ اقبال کے کسی نظریہ سے متعلق فلاں بات کہہ رہا ہے۔ تو میں بھی یہی بات کہوں۔ میرا موقف اس ضمن میں یہی رہا ہے کہ۔

ع - کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق مجھے پاکستان کے اہل قلم کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ میری تحریروں پر کھلے دل سے بات کرتے ہیں۔ وہ میرے خیالات سے اختلاف رائے کا اظہار بھی کھلے دل سے کرتے ہیں۔

اقبال پر میری انگریزی کتاب Iqbal Mind and Art پاکستان ہی میں چھپی ہے۔ نیشنل بک ہاؤس لاہور اس کے ناشر ہیں' یہ میرے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو میں نے ہندوستان کے ماہر کی یونیورسٹیوں میں دئیے یہ کتاب پاکستان کے نوجوان اور نامور فلسفی ڈاکٹر محمد معروف نے مرتب کی ہے۔ انہوں نے دیباچے میں میرے ان لکچروں کے اکثر مندرجات سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کہیں بھی میری نیت پر شک نہیں کیا اور یہی بات مجھے بہت پسند ہے۔ اس کتاب کی رسم رونمائی بھی لاہور میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے کی اس موقع پر ڈاکٹر ملک حسن اختر' ڈاکٹر محمد معروف' ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے مقالات پڑھے۔ ان میں سے بعض میں اتفاق رائے اور اختلاف رائے کے پہلو موجود تھے۔

شاعرانہ حیثیت :- میرے اس استفسار پر کہ کیا اقبالیات سے محویت آپ کے شاعرانہ مقام و مرتبہ پر اثر انداز ہوئی ہے۔ کیا آپ کی شاعری کو اس سے گزند نہیں پہنچا ہے؟ آزاد صاحب نے اس کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ میری شاعری تو جاری ہے۔ حال ہی میں ان کی متعدد غزلیات اور نظمیں ہندوستان اور پاکستان کے موقر رسالوں میں شائع ہوئی ہیں یہ سوال پہلے بھی ان سے کیا گیا ہے کہ کوئی شخص دو کشتیوں میں کیونکر سوار رہ سکتا ہے لیکن آزاد صاحب ہیں کہ شاعری کے میدان میں بھی اپنی جولانیاں قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۱ء لیکر ۱۹۶۲ء تک کے کلام پر مشتمل دو مجموعے ایک دہلی دوسرا کراچی سے شائع ہونے والے ہیں۔ یقین محکم اور عمل پیہم نے تخلیق توانائی میں اور اضافہ کیا ہے آزاد صاحب نے ہمیشہ ہی اس پر تکیہ کیا ہے۔ جس نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو مزید مستحکم بنا دیا ہے۔ ▲

محمد نسیم الدین نسیم

جلیل اور اُن کا فن

جلیل ۱۸۶۵ء میں مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور بیس سال کی عمر میں علوم متداولہ میں دستگاہ پیدا کی۔ انھوں نے دس یا گیارہ سال کی عمر سے ہی شعر گوئی کا آغاز کیا اور امیر مینائی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ امیر کے ساتھ عرصہ دراز تک رامپور میں رہے جب استاد نے دربار آصفی سے تعلق استوار کیا تو اُن کے دامن سے منسلک ہو کر جلیل بھی حیدرآباد چلے آئے۔ اُس زمانے میں یہاں آصفجاہ سادس میر محبوب علی خاں غفران مکان کی حکومت تھی۔ داغ استاد شاہ تھے۔ داغ کے انتقال کے بعد یہ اعزاز جلیل کے حصے میں آیا۔

جلیل کو عربی و فارسی زبانوں پر دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے علم عروض و قوافی اور بلاغت و علم معانی میں بھی مشق و مزاولت اور پیہم ریاض کے ذریعہ کمال پیدا کیا۔ جلیل کے علم و فضل کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف میر محبوب علی خاں غفران مکان کے کلام کی اصلاح کی اور ان سے "جلیل القدر استاد جلیل" کا خطاب پایا بلکہ ان کے جانشین سلطان العلوم میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع کے بھی استاد رہے اور ان سے "فصاحت جنگ" کا خطاب حاصل کیا۔ شاہی دربار سے وابستگی اور استاد شاہ کے منصب کی وجہ سے جلیل کی شاعرانہ صلاحیتیں اور رنگ سخن خوب نکھر آیا۔ بادشاہ نے کلام میں اصلاح

---

* اس مضمون کو "فصاحت جنگ جلیل" ادبی مقابلہ مضمون نویسی میں انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

ریسرچ اسکالر۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد

دیتی ہو یا اس کی فرمائش پر برموقع برجستہ شعر کہنا ہو۔ گرہ لگانی ہو یا طرح میں غزل کہنی ہو۔ مادۂ تاریخ نکالنا ہو یا تہنیتی نظم لکھنی ہو ایسے تمام موقعوں پر جلیل نے زبان و بیان پر اپنی مہارت۔ فن سخن سے فطری مناسبت اور اظہار کی قدرت کا ثبوت دیا

جلیل بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اگرچہ انھوں نے قصیدے مثنویاں نعت۔ سلام اور منقبتیں بھی لکھی ہیں مگر ان کا اصل میدان غزل ہے جہاں ان کا شہسب قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جلیل کا تعلق صحافت سے بھی تھا۔ حیدرآباد سے رسالہ "دبدبۂ آصفی" مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ اس کے مدیر پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔ پھر ان کی علیحدگی کے بعد اس کی ادارت کی ذمہ داری جلیل کو تفویض کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ۲۴ اگست ۱۸۹۵ء میں "یادگار سالگرہ میر محبوب علی خاں آصف سادس" ایک گلدستہ "محبوب الکلام" کا اجراء عمل میں آیا۔ اس گلدستے کے مدیر جلیل تھے فن لغت سے بھی جلیل کو کافی علاقہ رہا ہے۔ وہ عرصہ دراز تک بلکہ اپنے استاد امیر مینائی کے آخری زمانے تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے۔

آئیے اب جلیل کے فن شعر کا مطالعہ کریں۔ جلیل کی شاعری جس ادبی ماحول کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ اس کی تشکیل اسیر۔ امیر اور داغ جیسے اساتذہ و اسالیب غزل کے رنگ سخن کی مرہون منت ہے۔ جلیل امیر کے شاگرد تھے اور داغ دہلوی کے صحبت یافتہ اس طرح ان کے کلام کو امیر اور داغ کی شاعری کا تتمہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں زبان کی صفائی اور روانی اور بندش کی چستی و بے ساختگی داغ کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن داغ کی سی شوخی اور چٹکی لینے والا انداز نہیں ہے البتہ اپنے استاد امیر مینائی کی "متین شوخی" سادگی اور دل فریبی کو انھوں نے خوب نکھارا۔ جلیل استاد شاہ تھے اور حیدرآباد کے سیاسی عروج کے عہد کی یادگار اور شاید اسی لیے ان کی غزل میں تاریخ و تہذیب یاس اور حرمان نصیبی قنوطیت و بد اضمحلال کی کیفیت نہیں ملے گی۔ ان کی شاعری نشاطیہ شاعری ہے۔ جو اس دور کے حیدرآبادی معاشرے کی مرفع الحالی

اور خوش حالی کی دین ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کی وہ اعلیٰ روایات بھی ملتی ہیں جو تغزل کی جان ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اخلاقی اور ناصحانہ مضامین کو بھی غزل میں جگہ دی ہے۔ اکثر و بیشتر صوفیانہ رنگ بھی بہار دکھاتا ہے۔ لیکن ان کا خاص مذاق جذبات عشق اور اظہار اُلفت کی ترجمانی ہے۔

جلیل کی شاعری میں میرؔ کا جذبہ اور غالب کی فکر نہیں ہے لیکن زبان کی صفائی سلاست اور سادگی۔ محاورات اور روزمرہ کا استعمال اور لطف زبان چٹخارہ دے جاتا ہے۔ مثلاً عام فہم الفاظ میں اشعار کی روانی دیکھئے۔

زمانہ ہے کہ گذرا جا رہا ہے　　یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے
زمانہ پر ہنسے کوئی کہ روئے　　جو ہوتا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جلیل کے کلام میں صرف عشق و محبت کی سطحی واردات ہیں، مسائل حیات کا عکس نہیں۔ درج ذیل اشعار اس خیال کی تردید کرتے ہیں ان اشعار میں غم جاناں کے پردے میں غم دوراں اور سرِ دلبراں کے پردے میں حدیث دیگراں کی جھلک ملتی ہے۔

نازبھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی　　سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی
جب ترے عشق کا پھندا مری گردن میں تھا　　پھر بُرا کیا ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں!　　کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں

جلیل کے کلام سے یہ چند مثالیں بطور مشتے از خروارے دی گئی ہیں ورنہ ایک اچھا شاعر فکر بلند۔ دل دردمند اور طبع ارجمند کا مالک ہوتا ہے وہ زمانے کے احوال سے یکسر بے تعلقی نہیں برت سکتا۔ یہ درست ہے کہ جلیل کے کلام میں پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے اثرات۔ سیاسی انقلابات۔ مختلف سیاسی سماجی اور ادبی تحریکوں اور نظریات کی آویزش نظر نہیں آتی لیکن جلیل جیسے شاعر سے جن کی شاعری کی اٹھان اور نشوونما ایک ایسے ماحول میں ہوئی جو خاص تہذیبی اقدار اور کلاسیکی ادبی روایات کا امین تھا ترقی پسند خیالات کی نعرہ بازی اور جدیدیت کا تقاضا کرنا ظلم ہے

شبلی کہتے ہیں شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اس اصول کی روشنی میں جلیل کی شاعری کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان کے ہاں انسانی جذبات

...لطیف کی تھرتھراہٹ اور احساس جمال کی رنگینیاں توجہ کو اپنی طرف منعطف کرتی ہیں مثلاً

موت بھی روٹھ کے بیٹھی ہے [illegible] کی طرح
کس سے پوچھوں کہ علاجِ شبِ فرقت کیا ہے

آتے آتے آئے گا میرا خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

بات دل سے مرے اس درد کی نالے نکلے
گھر سے اپنے وہ کلیجہ کو سنبھالے نکلے

اردو غزل کا ایک رنگ خمریاتی شاعری بھی ہے۔ اور جیسا کہ سب جانتے ہیں امیر کے شاگرد ریاض کی خمریات مشہور ہیں۔ لیکن اس رنگ میں بھی جلیل کی خمریات ریاض سے پہلو مارتی ہیں۔

فتویٰ دیا ہے مفتیٔ ابر و بہار نے
توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے

شرم عصیاں سے تلافی ہوئی مے نوشی کی
غرق ہونے سے بھی دامن نہ ہوا تر اپنا

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل
بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

شاعری کے سماجی منصب کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ لیکن یہ بات متفق علیہ ہے کہ اچھی شاعری کے ذریعہ زبان کا تحفظ اس کا نشو نما بالیدگی اور ارتقا ہوتا ہے۔ اس کلیے کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جلیل نے اپنے فن شعر سے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو ادب کی کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ذریعہ جلیل کی شاعری نے ایک خاص تہذیب کی روح کو اپنے میں سمو لیا ہے۔ جلیل کی شاعری میں ہمیں لکھنؤ کا مبتذل پہلو نہیں ملتا۔ جس کے سرے سراپا نگاری اور جنسی شاعری سے جا ملتے ہیں۔ بلکہ جلیل کا تغزل بڑا سلجھا ہوا۔ رچا ہوا اور نکھرا ہوا ہے۔ جس میں ہماری تہذیبی اقدار۔ معاشرتی آداب اور شائستگی اور متانت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جلیل نے دلی اور لکھنو کے دبستانوں سے الگ "دبستانِ حیدرآباد" کی تشکیل و آبیاری کی۔

محمد یعقوب الرحمٰن٭

شیخ کرامت علی "پردۂ غفلت" کا ایک اہم کردار

اُردو ڈرامہ کی عمر کچھ زیادہ طویل نہیں پھر بھی اِس کم عمری کے باوجود اُردو کے ڈرامائی ادب میں ایسے شاہکار ڈرامے مل جاتے ہیں جن کی بدولت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو ادب کا دامن اصلاحی ڈراموں سے خالی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کا ڈرامہ "پردۂ غفلت" قدیم و جدید نسل کے درمیان ذہنی و فکری کشمکش کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں کردار ایک اہم عنصر ہے۔ کردار کی اہمیت کی وضاحت ڈاکٹر خلیق انجم و قمر رئیس کے ان جملوں سے ہوتی ہے۔ اگر ڈرامہ زندگی کی عکاسی کا نام ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ڈرامہ میں جیتے جاگتے کردار پیش کئے جائیں۔ اُن کی گفتگو، افعال اور جذباتی حالت میں حقیقت کا رنگ ہو۔

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈرامہ کی کامیابی اس کے جاندار کرداروں پر منحصر ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے ڈرامے "پردۂ غفلت" میں شیخ کرامت علی کا ایک کردار انہی صفات کا حامل ہے ویسے تو اس ڈرامے میں چھوٹے بڑے بارہ کردار ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم اور موثر کردار شیخ کرامت علی کا ہے اس سے قبل کہ ان کی ہشت پہلو شخصیت کا جائزہ لیں یہ ضروری ہے کہ ڈرامہ کے پلاٹ پر طائرانہ نظر ڈال لیں تاکہ شیخ کرامت علی کے افکار سمجھنے میں آسانی ہو۔

میر الطاف حسین رسول آباد کے زمیندار ہیں۔ ان کے برادر بزرگ شجاعت حسین کے انتقال کی وجہ سے ان کی جائیداد اور ان کے بچے بھی اسی خاندان میں پل رہے ہیں۔ میر الطاف حسین کی حیثیت ایک مشترکہ خاندان کے ناظم علی کی ہے۔

٭ محبوب بلاکس شینڈرسے نگر ایوسٹ محل 5001 44 ۔

لیکن وہ اللہ والے ہیں انہیں دن رات عبادت سے فرصت نہیں۔ اس لیے انہوں نے دنیاداری کے سارے فرائض انجام دینے کے لیے جس شخصیت کا انتخاب کیا وہ ہیں احمد حسین یعنی ان کے برادر نسبتی۔

احمد حسین مفاد پرست اور خوشامدی ذہن کے مالک ہیں۔ رقیہ بیگم (بیگم میر الطاف حسین) پرانے خیالات کی خاتون ہیں۔ وہ اپنے مرحوم بیٹے شجاعت حسین کی بیٹی کی منگنی مقامی اردو اسکول کے مدرس محمد جواد سے کر چکی ہیں۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد یہ ہے کہ جائیداد تقسیم ہونے کی نوبت نہ آسکے۔ خاندان ٹوٹنے نہ پائے۔ میر شجاعت حسین مرحوم کا لڑکا منظور حسین اور لڑکی سعیدہ روشن خیال ہیں۔ منظور حسین انگریزی تعلیم کا حامی اور پردۂ نسواں کا مخالف ہے۔ سعیدہ بھی محمد جواد سے شادی کے خلاف ہے۔

احمد حسین اور سیتارام کا پلان ہے کہ منظور حسین اپنی جائیداد کا حصہ لے کر علیحدہ ہو جائے تاکہ ان کی زندگی عیش و عشرت میں گزرے۔ لیکن ان کے ارادوں کے بیچ شیخ کرامت علی کی شخصیت حائل ہوتی ہے۔ آخر منظور حسین اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور میر الطاف حسین کی جائیداد بھاری قرضوں کی وجہ سے نیلام ہو جاتی ہے۔

شیخ کرامت علی کو اس ڈرامہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کردار کے پس پردہ ڈاکٹر عابد حسین مرحوم اپنی قوم کے بزرگوں اور نوجوانوں سے مخاطب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آزاد ملک میں تعلیم حاصل کی۔ جب غلام ملک لوٹے تو حکمراں قوم کی ایسی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ اسی تڑپ نے ناصح وقت ڈاکٹر عابد حسین مرحوم سے "پردۂ غفلت" لکھوا کر شیخ کرامت علی جیسا کردار ہمارے سامنے پیش کیا۔

شیخ کرامت علی انگریزی اس زمانے میں پڑھ چکے ہیں جب آتش جوان تھا۔ اسی زمانے میں جب ان کے بزرگوں نے ان کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کرنی چاہی تو وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ گھاٹ گھاٹ کی سیر کی۔ لوٹے اور شجاعت حسین کے اتالیق مقرر ہوئے۔ شیخ جی ترقی پسند ہیں نئے والے زمانہ کے ساتھ چلنے میں انہیں قباحت محسوس نہیں ہوتی۔

فرسودہ رسومات کے وہ مخالف ہیں۔ وہ حق گو ہیں انہیں اس کی فکر نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟
یہاں تک کہ رقیہ بیگم کے سامنے ان کے شوہر (میر الطاف حسین) کے طرزِ زندگی پر چوٹ
کرنے سے باز نہیں آتے + ان کی زبانی سنئے۔

"موسیدانی یا جاہلی اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی سچ مچ ہاتھ پیر نہ ہلائے۔ جو شخص
اپنی سمجھ سے کام لینا نہیں چاہتا اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے سے جی چراتا ہے
وہ سب سے بڑھ کر کاہل ہے۔ محض اللہ اللہ کرنے سے کوئی شخص اللہ کا نیک
بندہ نہیں بن جاتا اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنا فرض جانے اور
ادا کرے۔ اللہ کے اور بندوں کے لئے مصیبت کا نہیں بلکہ راحت کا باعث ہو۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ کرامت علی نے رہبانیت کے خلاف آواز بلند کی
اور زندگی کے فلسفہ کو کس خوبصورتی سے سامعین کے سامنے رکھ دیا۔

کرامت علی شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکا لڑکی کی مرضی جاننا ضروری سمجھتے ہیں
اور یہی صحیح بھی ہے۔ اسلام میں بھی اس کی اجازت ہے۔

شیخ جی ظریفانہ مزاج رکھتے ہیں۔ بات سے بات نکالنا اور محمد جواد جیسے
کرداروں سے ان کی گفتگو اس پہلو کا مظہر ہے کہ وہ زاہد خشک نہیں۔ رقیہ بیگم کے
سامنے ان کے بھائی احمد حسین کو نالائق کہنا اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ
وہ منافق نہیں۔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کے اظہار میں تکلف نہیں
کرتے۔

سعیدہ سے منسوب محمد جواد کو جاہل مطلق کہنا اور سعیدہ کی حمایت میں
آواز بلند کرنا اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ ان کا زندگی کا مشاہدہ کس قدر
گہرا ہے۔ سعیدہ جیسی روشن خیال کا نباہ محمد جواد جیسے لکیر کے فقیر سے
نہ صرف ناممکن بلکہ سماج میں مزید پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ شیخ جی کے
نزدیک لڑکا لڑکی کے مزاج میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ شیخ کرامت علی
ابن الوقت نہیں ورنہ وہ اپنی زندگی کے بقایا دن کاٹنے کے لئے صرف احمد حسین
کو دوست بنا لیتے تو کافی تھا۔ بلکہ اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے وہ میر الطاف حسین
کے خاندان پر راج کر سکتے تھے۔ لیکن وہ تو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے
والوں میں سے ہیں۔ اسی لئے سعیدہ اور منظور حسین کی حمایت میں آگے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے لئے وہ مسیحا سے کم نہیں۔

ڈرامہ نگار نے ان کے کردار کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے وہ انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں ورنہ اس زمانہ میں انگریزی دشمنی اور انگریزی تعلیم سے دوری قابلِ فخر ہی نہیں بلکہ اسلام دوستی کا مظہر سمجھی جاتی تھی۔

پردۂ غفلت کے پلاٹ میں روایتی میلوں ٹھیلوں عرس اور تہواروں کا تذکرہ ہے اور نہ ہی چٹخارے دار زبان، لیکن شیخ کرامت کی صورت میں ایک ایسی باغ و بہار شخصیت موجود ہے جس کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا خود کو وقت کے دھارے کے خلاف لے جانے کے مترادف ہے۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے نوجوانوں کو کیا کرنا چاہئے دیکھئے اس کی طرف خوبصورتی سے اشارہ کرتے ہیں "میرے خیال میں تم نوجوانوں میں دو بڑے نقائص ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگوں میں جوش، عزم سے زیادہ ہے، دوسرے تم لوگ نکتہ چینی کو ضرورت سے زیادہ سمجھتے ہو۔"

سعیدہ اور منظور حسین سے اتنا کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ راہ بھی دکھلاتے ہیں "اپنے دوست محمد علی کو دیکھو اگرچہ اسے قدرت نے تمہارے جیسی ذہانت اور جودت نہیں عطا کی ہے لیکن اس کی تلافی قدرت نے قوتِ عمل سے کر دی۔ بحث مباحثے جھگڑے بکھیڑے سے اسے کوئی مطلب نہیں خاموشی سے اپنا کام کئے جاتا ہے گویا ایک بھاری بھرکم جہاز ہے جس پر طوفان کا کوئی اثر نہیں جو موجوں سے لڑنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں چیر کر اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں میں نوجوانوں کو اپنی منزل نظر آتی ہے اسی لئے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ "پردۂ غفلت" کا سب سے اہم کردار شیخ کرامت علی کا ہے۔ ★ ★ ★

فرسودہ رسومات کے وہ مخالف ہیں۔ وہ حق گو ہیں انہیں اس کی فکر نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ یہاں تک کہ رقیہ بیگم کے سامنے ان کے شوہر (میر الطاف حسین) کے طرز زندگی پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتے + ان کی زبانی سنئے۔

"مسیدانی جاہلی اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی بیچ بیچ ہاتھ پیر نہ ملائے۔ جو شخص اپنی سمجھ سے کام لینا نہیں چاہتا اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے سے جی چراتا ہے وہ سب سے بڑھ کر جاہل ہے۔ محض اللہ اللہ کرنے سے کوئی شخص اللہ کا نیک بندہ نہیں بن جاتا اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان دنیا میں اپنا فرض جانے اور ادا کرے۔ اللہ کے اور بندوں کے لئے مصیبت کا نہیں بلکہ راحت کا باعث ہو۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ کرامت علی نے رہبانیت کے خلاف آواز بلند کی اور زندگی کے فلسفہ کو کس خوبصورتی سے سامعین کے سامنے رکھ دیا۔

کرامت علی شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکا لڑکی کی مرضی جاننا ضروری سمجھتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔ اسلام میں بھی اس کی اجازت ہے۔

شیخ جی ظریفانہ مزاج رکھتے ہیں۔ بات سے بات نکالنا اور محمد جواد جیسے کرداروں سے ان کی گفتگو اس پہلو کا مظہر ہے کہ وہ زاہد خشک نہیں۔ رقیہ بیگم کے سامنے ان کے بھائی احمد حسین کو نالائق کہنا اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ منافق نہیں۔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کے اظہار میں تکلف نہیں کرتے۔

سعیدہ سے منسوب محمد جواد کو جاہل مطلق کہنا اور سعیدہ کی حمایت میں آواز بلند کرنا اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ ان کا زندگی کا مشاہدہ کس قدر گہرا ہے۔ سعیدہ جیسی روشن خیال کا نباہ محمد جواد جیسے لکیر کے فقیر سے نہ صرف ناممکن بلکہ سماج میں مزید پیچیدگیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ شیخ جی کے نزدیک لڑکا لڑکی کے مزاج میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ شیخ کرامت علی ابن الوقت نہیں ورنہ وہ اپنی زندگی کے بقایا دن کاٹنے کے لئے صرف احمد حسین کو دوست بنا لیتے تو کافی تھا۔ بلکہ اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے وہ میر الطاف حسین کے خاندان پر راج کر سکتے تھے۔ لیکن وہ تو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں سے ہیں۔ اسی لئے سعیدہ اور منظور حسین کی حمایت میں آگے آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے لئے وہ مسیحا سے کم نہیں۔

ڈرامہ نگار نے ان کے کردار کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے وہ انگریزی تعلیم کے حق میں ہیں ورنہ اس زمانہ میں انگریزی دشمنی اور انگریزی تعلیم سے دوری قابلِ فخر ہی نہیں بلکہ اسلام دوستی کا مظہر سمجھی جاتی تھی۔

پردۂ غفلت کے پلاٹ میں روایتی میلوں ٹھیلوں، عرس اور تہواروں کا تذکرہ ہے اور نہ ہی چٹخارے دار زبان، لیکن شیخ کرامت کی صورت میں ایک ایسی باغ و بہار شخصیت موجود ہے جس کی عظمت کا اعتراف نہ کرنا خود کو وقت کے دھارے کے خلاف لے جانے کے مترادف ہے۔

زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے نوجوانوں کو کیا کرنا چاہئے دیکھئے اس کی طرف خوبصورتی سے اشارہ کرتے ہیں "میرے خیال میں تم نوجوانوں میں دو بڑے نقائص ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگوں میں جوش، عزم سے زیادہ ہے، دوسرے تم لوگ نکتہ چینی کو ضرورت سے زیادہ سمجھتے ہو۔"

سعیدہ اور منظور حسین سے اتنا کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ راہ بھی دکھلاتے ہیں "اپنے دوست محمد علی کو دیکھو اگرچہ اسے قدرت نے تمہارے جیسی ذہانت اور جودت نہیں عطا کی ہے لیکن اس کی تلافی قدرت نے قوتِ عمل سے کر دی۔ بحث مباحثے جھگڑے بکھیڑے سے اُسے کوئی مطلب نہیں خوشی سے اپنا کام کئے جاتا ہے گویا ایک بھاری بھرکم جہاز ہے جس پر طوفان کا کوئی اثر نہیں جو موجوں سے لڑنے کے لئے نہیں بلکہ انہیں چیر کر اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں میں نوجوانوں کو اپنی منزل نظر آتی ہے اسی لئے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ "پردۂ غفلت" کا سب سے اہم کردار شیخ کرامت علی کا ہے۔ ★★

شعراء حضرات سے گذارش :- خادم مقتول وزیر اعظم اندرا گاندھی سے متعلق منظومات ترتیب دے رہا ہے لہذا شعراء کرام سے مودبانہ گذارش ہے کہ اپنی منظوم تخلیقات مع مختصر تعارف کے درج ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کتاب شائع ہوتے ہی ہر شاعر کو ایک ایک کاپی حضور کی جائے گی۔

انشاءاللہ! خادم ک۔ ض۔ سندولکر

K.Z-SINDOLKAR

PLOT.NO 22/Q-5 SHIVAJINAGAR-GOVANDI BOMBAY 400043

پی آئی بی

تعلیم بالغان

دیہی سطح پر تعلیم بالغان کی جاریہ کوششیں اب ہمارے قومی ترقیاتی پروگرام کا لازمی جزو بن گئی ہیں کسی دیہات میں بالغوں کے تعلیم کے مرکز کا تصور یوں اُبھرتا ہے۔ جیسے سن رسیدہ افراد جن کی جوانی بیت چکی ہے اپنے کارخانوں یا کھلیانوں سے دھول میں اٹے ہوئے مرکز پر جمع ہوتے ہیں۔ اور انہیں حروف تہجی یا گنتی سکھائی جاتی ہے۔ اس پروگرام کے افادیت بخش ہونے کے باوجود اس کے بارے میں تنقید تبصرے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ شاید کامیاب یعنی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوں۔

دراصل تعلیم بالغان کے پروگرام کے بارے میں اس قسم کے سوالات اور تنقید یں پروگرام سے متعلق شدید غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں جو بھی لوگ اس پروگرام کی در پردہ حکمت اور فلسفہ کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔ پروگرام کا مقصد یہ نہیں کہ حکومت ایسے بالغ افراد کو جنھوں نے اسکول میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، انہیں بے حد تاخیر کے باوجود ابتدائی تعلیم دے کر اعلیٰ سطح یعنی یونیورسٹی کی تعلیم دلانا چاہتی ہے۔ حکومت ان متوسط درجہ کے کسانوں، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس حد تک تعلیم دلانا نہیں چاہتی کہ یہ اپنے آبائی پیشے ترک کر دیں اور دفتروں میں "بابو" کی اسامیوں کے خواہشمند ہو جائیں۔

رسمی تعلیم کیا ہوتی ہے:- اگر دیہی سطح پر مروج سرکار کے رسمی تعلیم کے پروگرام کا مذاہب انداز میں جائزہ لیا جائے تو ہر بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ اس تعلیم کا مقصد ناخواندہ بالغ افراد کو لکھنا، پڑھنا اور حساب کرنا سکھانا ہے۔ اس سے ایک طرف تو ان میں کچھ عرصہ تک بعد خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اور وہ اپنے کام کے بارے میں ضروری..

بقیہ

اطلاعات پڑھ سکیں گے تو دوسری طرف بہتر معلومات کے ساتھ اہم امور پر حکومت کے نمائندوں یا لیڈروں سے گفت وشنید کر سکیں گے۔

اس طرح سے یہ لوگ مختلف قسم کے استحصال سے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔ یہ بڑی عام بات ہے کہ دیہاتوں میں غیر پڑھے لکھے افراد اپنی سخت ضرورت کے موقع پر معمولی سی رقم کے لئے سادہ کاغذات اور دستاویزات پر انگوٹھے کا نشان لگاتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ عموماً ایسے پس ماندہ علاقوں ہی میں بندھوا مزدور کے سسٹم کو رواج دیا گیا۔ جہاں محنت کش طبقات ناخواندہ ہیں، پڑھنے لکھنے اور حساب دانی کی معمولی سی مہارت کے ساتھ مزدور کسان اور صناع زیادہ بہتر انداز میں کام کر سکتے ہیں۔ اور اپنے آجر کا شتکار سے یا تجارتی ادارہ میں فائدہ بخش موقف اختیار کر سکتے ہیں۔

بے شک پروگرام میں اس بات کی گنجائش ہے کہ ایسے ناخواندہ بالغ جن کی عمر ۱۵ تا ۳۵ برس کے درمیان ہو انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے میں دوسروں سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور وہ رسمی، غیر رسمی، اوپن اسکول یا اوپن یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہو جائیں گے۔

دیہی کسانوں کی خواندگی کا پروگرام ۶۸-۱۹۶۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ ابتداء میں اس کو فارمرس فنکشنل لٹریسی پروگرام (کسانوں کو رسمی تعلیم کا پروگرام) کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ پروگرام بے حد مفید ثابت ہوا اور پانچ برس کے قلیل عرصہ میں یہ صرف ۱۳ اضلاع سے پھیل ۱۰۶ اضلاع تک پہنچ گیا۔ ان پراجکٹس کو چلانے کے لئے ساری رقم امداد مرکزی حکومت دیتی ہے۔ اس وقت ایسے ۵۱۳ پراجکٹس کام کر رہے ہیں۔

اسکولس سے طلبہ کیوں نکل جاتے ہیں: اس پروگرام پر عمل آوری کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ حسب معمول چلنے والے تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں ابتدائی مراحل میں ایسے رسمی پراجکٹس کی کلاسوں میں حصول تعلیم کے خواہاں بالغوں میں زیادہ جوش و خروش پایا جاتا ہے اور وہ زیادہ تعداد میں کلاس میں حاضر رہتے ہیں۔ تاہم چند ایسے مسائل ہیں جس سے اول الذکر زمرہ دوچار ہے۔ اکثر کسانوں کو یا زمین مزدوروں کو فصلوں کے کاٹنے کے دور میں اس کام پر زیادہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ اور ان کا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے یہ بڑی عام بات ہے کہ زرعی مزدوروں اور متوسط کسانوں کے خاندانوں میں تمام مرد

اور عورتوں کو کھیت پر جانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے گھریلو کام کاج اور شیر خوار بچوں کی نگہداشت ایک سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ اور حکومت نے مسئلہ کے اس پہلو پر خاص غور و خوض کیا ہے۔ اور مستقبل میں مرتب کئے جانے والے تعلیمی پروگراموں میں کام کرنے والی خواتین کی مدد کی جائے گی تاکہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر تعلیم جاری کر سکیں۔

صنعتی مزدوروں کی ہمہ پہلو تعلیم کے مراکز بھی اس رسمی تعلیم کے ان پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ ان مراکز کو "شرمک ودیا پیٹھ" کہا جاتا ہے۔ جہاں ورکرس کو اپنی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا پہلا مرکز بمبئی میں ۱۹۶۷ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت ملک کے بڑے شہروں میں ایسے ۴۰ مراکز کام کر رہے ہیں۔ لکھنے پڑھنے اور حساب داني کے مضامین کے علاوہ رسمی تعلیمی مراکز میں دوسرے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ مزدوروں کے لئے آبپاشی، زرعی تکنیک، حکومتی اور مالیاتی اداروں سے ربط، آلات، اوزار کی مرمت سکھائی جاتی ہے۔ اور عورتوں کو بچوں کی نگہداشت، ان کی صحت، غذا، ابتدائی تعلیمی امداد، اصول حفظان صحت اور ماحولیات کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی پر مبنی تعلیم بالغان کے پروگرام میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پروگرام میں شریک کرنے اور مقامی سماجی تنظیموں، یونیورسٹیوں سے رابطہ قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایسے ۲۰۰ کالجوں اور ۹۰ یونیورسٹیوں کی مدد کرتا ہے ۱۹۸۶ء سے حکومت ایک پروگرام پر عمل کر رہی ہے۔ جس کے تحت بالغوں کے لئے رسمی تعلیم کے مقصد کے حصول کی خاطر طلبہ کی خدمات بھی حاصل کی جارہی ہیں۔

شام ظرافت، سمینار، مشاعرہ، ورکشاپ، غزل (گلبرگہ و بنگلور) شامل ہیں، ریاست کے مختلف شہروں میں ان کا انعقاد عمل میں آیا، ان پر صرف کی گئی رقم ۳۵/ ۳۹۵، ۵، ۱۰، ۱- ملت کل اکیڈمی کی ایما پر سلور جوبلی تقریبات کے سلسلہ میں کرناٹک اردو اکیڈمی نے غزل کا پروگرام پیش کیا، ۱۴ مارچ کو شام غزل کے موقع پر اوّل الذکر اکیڈمی کی جانب سے صدر کرناٹک اردو اکیڈمی کی خدمت میں ایک نقروی Momento پیش کیا گیا۔ ریاست کی مختلف انجمنوں کی جانب سے منعقد کئے گئے۔ تحریری و تقریری مقابلوں پر انعامات پر خرچ کی گئی رقم ۵۰/۶۱، ۱۰، ۱ روپے ہے۔

صدر اکیڈمی اور دیگر اراکین کے مطالبہ پر حکومت کرناٹک نے ۸۹-۱۹۸۸ء کی گرانٹ میں دو لاکھ روپے کا اضافہ کیا ہے۔ ★★★

اعلیٰ ملازمتوں میں مسلم

آئی. اے. ایس (I.A.S) اور دیگر متوازی ملازمتوں کے لئے یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) کی جانب سے ہر سال مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔

نومبر ۱۹۸۷ء میں منعقدہ اس امتحان کے نتائج اسٹیٹسمین میں شائع ہوئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۸۱۷) مخلوعہ جائدادوں کو پر کرنے کے لئے (۸۱۷) امیدواروں کے ناموں کی سفارش کی گئی ہے۔ خالی جائدادوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

	جنرل جائدادیں	مختص برائے S.C	مختص برائے S.T	جملہ
۱۔ انڈین اڈمنسٹریٹو سروس (I.A.S)	۸۹	۱۷	۸	۱۱۴
۲۔ انڈین فارین سرویس (I.F.S)	۸	۱	۱	۱۰
۳۔ انڈین پولیس سروس (I.P.S)	۸۱	۱۷	۷	۱۰۵
۴۔ سنٹرل سروسز گروپ "اے"	۳۶۵	۷۸	۳۷	۴۸۰
۵۔ " " " "بی"	۸۲	۱۷	۹	۱۰۸
	۶۲۵	۱۳۰	۶۲	۸۱۷

ان ۸۱۷ امیدواروں میں (۱۴) مسلم امیدوار منتخب ہوئے ہیں۔ جبکہ درج فہرست طبقات (S.C) کے لئے (۱۳۰) اور درج فہرست قبائل (S.T) کے لئے (۶۲) جائدادیں مختص کی گئیں اور متعلقہ امیدواروں کو منتخب قرار دیا گیا ہے۔ مسلم امیدواروں کی یہ کم تعداد ظاہر کرتی ہے کہ مسلم تعلیمی میدان میں کتنے پچھڑ گئے ہیں۔ ان کے پست معیار تعلیم کے پیش نظر ضرورت ہے کہ مسلم امیدواروں کیلئے بھی مخلوعہ جائدادوں کی مناسب

تعداد مختص کی جائے۔ اور مسلم امیدواروں کی خصوصی کوچنگ کی جائے کہ انہیں امتحان مقابلہ میں کامیابی کے قابل بنایا جا سکے۔

(۱۴) منتخبہ امیدواروں کی گنتی کے دوران ایک مزید بات سامنے آئی کہ منتخب امیدواروں میں "مینا" امیدوار سب سے زیادہ ہیں۔ ان کی تعداد بھی منتخبہ مسلم امیدواروں کی تعداد کے مساوی یعنی (۱۴) ہی ہے۔ خبر نہیں یہ امیدوار ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی بڑے طبقے یا قبیلے سے۔ ایک ہی مقام کے رہنے والے ہیں یا پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ پہلے بھی اس امتحان میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ یا اسی سال ان کی تعداد سامنے آئی ہے۔ کیا یہ کامیابی انہوں نے انفرادی کوششوں سے حاصل کی ہے یا اجتماعی جدوجہد کا نتیجہ ہے؟

نتیجہ سے ظاہر ہے۔ کہ پرشانت سب میں اول اور راجن شکلا دوم نمبر پر آئے ہیں۔ لڑکیوں میں سب سے زیادہ نمبرات "رینو بھگت" نے حاصل کئے ہیں۔ جو مشترکہ فہرست میں دسویں نمبر پر ہیں۔ مسلم امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبرات علی رضا رضوی نے حاصل کئے ہیں جو مشترکہ فہرست کے چودھویں نمبر پر ہیں۔

منتخبہ (۱۴) مسلم امیدواروں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) علی رضا رضوی (۲) ممنون حسن خاں (۳) ذوالفقار حسن (۴) علی اکبر طاہر علی (۵) عالم محمد محسن (۶) سید نشاط علی (۷) محمد شکیل اختر (۸) ایم۔ ڈی۔ نسیم الدین (۹) وسیم ارشد (۱۰) سعید احمد (۱۱) حسین احمد صدیقی (۱۲) ناصر کمال (۱۳) عظیم الحق (۱۴) انور سلیم۔

(۱۴) مینا امیدواروں کے نام بھی ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

(۱) ٹیکا رام مینا، (۲) ساگر لال مینا (۳) اوم پرکاش مینا (۴) اوم پرکاش مینا، (۵) رام سنگھ مینا (۶) بنواری لال مینا (۷) شنکر لال مینا (۸) لکشمی نارائن مینا (۹) موہن لال مینا (۱۰) گلاب چند مینا (۱۱) رمیش چند مینا (۱۲) ساہی رام مینا (۱۳) موہن لال مینا (۱۴) گنگا سہائے مینا۔ (اوم پرکاش اور موہن لال نام کے دو دو امیدوار شریک فہرست ہیں)۔

پوسٹ گریجویٹ تعلیم میں طالبات اور مسلم

عثمانیہ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ امتحانات ۸۶-۱۹۸۵ء میں (۷۰) گولڈ میڈلس کے منجملہ ایک گولڈ میڈل کا اعلان نہیں کیا گیا۔ اور سنسکرت میں پی ایچ ڈی سے متعلق گولڈ میڈل پانچ امیدواروں کو عطا کیا گیا۔ اس (۶۹) گولڈ میڈل (۴۷) امیدواروں کو عطا کیے گئے۔ ان میں (۳۴) خاتون امیدوار ہیں۔ گویا (۵۰) فیصد سے زیادہ خاتون امیدواروں کو گولڈ میڈلس حاصل ہوئے۔ کے سالیا سونیا دفتر کے والسن نے ایم اے انگلش لٹریچر میں تین گولڈ میڈل حاصل کیے۔ کنڑی پادھیر رنجن لال نے ایم اے ہندی میں تین گولڈ میڈل حاصل کیے، کے پر سونا دفتر کے آر راؤ نے بھی ایم اے سنسکرت میں تین گولڈ میڈل حاصل کیے۔ جن میں سے ایک ساری فیکلٹی آف آرٹس میں سب سے زیادہ نشانات کے لیے دیا گیا ہے۔ ڈی ایم برہما رامبیکا نے بھی دو گولڈ میڈل ایم۔اے تیلگو میں بحیثیت خاتون امیدوار اول آنے پر حاصل کیے ہیں۔ ان میں مسلم طالبات صرف تین ہیں۔ جنہوں نے فارسی، اسلامک اسٹڈیز اور ہسٹری میں گولڈ میڈل حاصل کیے ہیں۔

تین مسلم طالبات کے ساتھ چار مسلم طلباء نے بھی گولڈ میڈل حاصل کیے۔ ان سات مسلم امیدواروں کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ سلمان عابد ۔ ایم۔اے اردو میں اوّل آنے پر جانکی پرشاد میموریل میڈل
۲۔ بتول ایچ ماجد : ایم۔اے فارسی میں اوّل آنے پر مولانا رومی میڈل
۳۔ سلمان عابد : ایم اے اردو میں اوّل آنے پر گولڈن جوبلی یوپی پرائز
۴۔ علیم خان : ایم اے ہندی میں غیر ہندی داں طلباء میں اوّل آنے پر ہندی پرچار سبھا میڈل
۵۔ عائشہ پہلدین : ایم اے اسلامک اسٹڈیز میں اوّل آنے پر ایچ ای ایچ دی نظامس میڈل
۶۔ ساجدہ رحمٰن : ایم اے ہسٹری میں اوّل آنے پر۔ پروفیسر لاما نیم نرسمہا راؤ میڈل
۷۔ محمد ضیاء الدین : ایم اے سیول اسٹرکچرل انجینئرنگ میں اوّل آنے پر راما کرشنا راجو میموریل میڈل

واضح رہے کہ (۷) کے منجملہ صرف (۲) امیدوار ایسے تھے جنہیں عام امیدواروں سے مقابلہ درپیش تھا۔ یہ ہیں ہسٹری اور انجینئرنگ۔ ان میں بھی صرف ایک مضمون انجینئرنگ سائنس ٹکنالوجی سے متعلق ہے۔ جس سے ظاہر کہ مسلم امیدوار سائنس ٹکنالوجی کی طرف کم مائل ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ اس جانب توجہ دیں تاکہ ملک کی سائنسی ترقی کی دوڑ میں اپنا حصہ ادا کریں۔

گریجویشن میں طالبات اور مسلم

امتحانات ۸۶-۱۹۸۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل پر (۸۵) گولڈ میڈل (۸۶) امیدواروں کو دیئے گئے۔ ان میں ۵۸ طالبات کو اور صرف ۲۸ طلباء کو حاصل ہوئے ہیں گویا دو حصے لڑکیوں کو اور ایک حصہ میڈل لڑکوں کو ملے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی محنت اور توجہ اپنی تعلیم کی طرف زیادہ ہے۔

فیکلٹی آف آرٹس کے ۱۸ میڈل (۱۹) امیدواروں کو دیئے گئے جن میں صرف دو لڑکوں نے اور باقی ۱۷ لڑکیوں نے حاصل کیے۔ وی شیلاجا دیوی نے بی اے میں سب میں اول آنے پر سر اکبر حیدری میڈل اور خاتون امیدواروں میں اوّل آنے پر خان بہادر احمد علاء الدین میڈل حاصل کیے۔ مسرت النساء بیگم نے بی اے اسلامک ہسٹری میں اوّل آنے پر مولوی محمد مرتضیٰ میڈل حاصل کیا۔ عتیقہ صدیقہ نے عربی مضمون اختیاری بی اے میں اوّل آنے پر نیز اردو مضمون اختیاری میں اوّل آنے پر دونوں ایچ ای ایچ دی نظامس میڈل حاصل کیے۔ ین سی فاطمہ راجہ نے جملہ گریجویشن امیدواروں میں زبان دوم (ٹامل) میں اوّل آنے پر ٹامل اکاڈمی کیش میڈل حاصل کیا۔ کسی مسلم طالب علم نے آرٹس فیکلٹی میں کوئی گولڈ میڈل حاصل نہیں کیا۔

فیکلٹی آف میڈیسن میں میں حسنہ اقبال نے اناٹومی میں لفٹننٹ کرنل فرحت علی میڈل، زہرہ جمیل ناہید نے مڈوائفری میں مس زربانو پاریکھ میڈل، سیدہ تہنیت حبیبی نے فزیالوجی میں مسز منگلا شنکر راؤ پوتدار میڈل اور فاطمہ بیگم نے فارماکولوجی میں ڈاکٹر مانک راؤ کے کاتیکر میموریل میڈل حاصل کیے۔ واضح رہے کہ یہ چار مسلم طالبات ان (۳۰) طالبات میں شامل ہیں جنہوں نے میڈیسن کے میڈلس حاصل کیے۔ ان کے مقابلے میں صرف ۷ طلباء نے میڈل حاصل کیے۔ جملہ امیدواروں میں ایک بھی مسلم طالب علم شامل نہیں ہے۔

فیکلٹی آف انجینیرنگ، ٹکنالوجی، سائنس، کامرس، لاء، سوشیل سائنس، اور ایجوکیشن میں کسی مسلم امیدوار نے کوئی میڈل حاصل نہیں کیا۔ یہ صورت حال نہایت تشویشناک ہے۔ اور بطور خاص توجہ کی محتاج۔ ان امتحانات میں امتیازی کامیابی پانے والی لڑکیاں خاص مبارکباد کی مستحق ہیں۔ انہیں اپنی محنت اور توجہ کا صلہ ملا۔ لڑکے بھی اسی طرح پڑھائی میں محنت کریں تو امتیاز کے حصول میں لڑکیوں سے بہتر مقابلہ کرسکتے ہیں۔ صحت بخش مقابلہ شرط ہے۔

کرناٹک اردو اکیڈمی

کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور کے پریس نوٹ کے بموجب اکیڈمی نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اکتوبر ۸۷ء تا مارچ ۸۸ء کی مدت کے لئے ریاست میں اردو زبان و ادب کی ترقی کے جامع پروگرام پر عمل کیا اور حسب روایت کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو کتابوں و رسالوں کی فراہمی، تعلیمی وظائف کا اجراء انعامات و اشاعتی امداد کے علاوہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے انعامات و وظائف کے تعلق سے اضافے بھی کئے۔ انعامات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

انعامات:- سال گذشتہ رجسٹرار کرناٹک اردو اکیڈمی نے ۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران طبع شدہ کتابیں انعام کے لئے طلب کی تھیں، لیکن ماہرین کے فیصلوں کے موصول ہونے تک مالی سال ختم ہوچکا تھا، چنانچہ موجودہ اکیڈمی نے سابقہ اعلان کے مطابق گذشتہ سال کی کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا۔

پہلا انعام:- (۱) چھلنی چھلنی سائیاں، تنہا تماپوری (شاعری) ۲۰۰۰ روپیے (۲) کالی داس شخصیت اور فن، شابانہ شبنم (تحقیق) ۲۰۰۰ روپیے (۳) اندھے رشتے۔ انل ٹھکر (ڈرامہ) ۲۰۰۰ روپے

دوسرا انعام:- (۱) شبنم شبنم، حسنی سرور (شاعری) ۱۵۰۰ روپے (۲) آرزدہ ستارے ...... ملا عبدالمغنی (افسانے) ۱۵۰۰ روپے سال رواں کی صرف (۵) کتابوں پر انعام دیا گیا (۱) کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار، مہ نور زمانی بیگم (تحقیق و تنقید) ۱۵۰۰ روپے (۲) چراغ وطن۔ ثناء اللہ چراغ ۱۰۰۰ روپے۔

ریاستی سطح پر ۵ ہزار کے دو خصوصی انعام:- مجموعی خدمات کے اعتراف میں صرف ایک شاعر اور ادیب کو یہ پیشکش موجودہ اکیڈمی کی ہے۔ اس سے قبل ایسا کوئی انعام نہیں دیا گیا؛ (۱) مولانا شہاب الدین ندوی (ادیب) ۵۰۰۰ روپے ۲۔ مولانا عبدالقادر فیاض تلکوری (شاعر) ۵۰۰۰ روپے،

ثانوی مدارس کے طلباء کی حوصلہ افزائی:- موجودہ سال ایسے طالب علموں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ جنہوں نے ذریعہ تعلیم اردو یا بحیثیت ثانوی زبان اردو کے ضلع سطح پر امتحان اعلیٰ ثانوی میں امتیازی نشانات حاصل کئے ہوں۔ انعام جس کی مالیت ۱۰۰ روپیے

ہے۔ بشکل کتب دیا گیا۔ اور ساتھ ہی توصیفی سند بھی دی گئی۔ (۱) امجد حسین گلبرگہ (۲) شائستہ بانو کارواڑ (۳) قمر النساء دھارواڑ (۴) ام حفصہ بلاری (۵) نواب پاشاہ مکور۔

تعلیمی وظائف:۔ پی یو سی تا پوسٹ گریجویشن کے طالب علموں کو دیے گیے وظائف کی جملہ رقم ۴۸۹۰۰ روپے ہے۔

مسودات کی اشاعت پہ جزوی مالی اعانت:۔ مصنفین کو بطور اشاعتی امداد دی گئی رقم ۶۹۵۰۰ روپے ہے۔ ادبا و شعرا کی تخلیقات درج ذیل ہیں۔ ۱۔ الہام و یقین۔ رشید احمد رشید ۵۰۰۰ روپے ۲۔ پیمانہ خستہ یادیاں۔ خمار قریشی ۵۰۰۰ روپے ۳۔ ضیائے علوی۔ محمد علوی ۴۰۰۰ روپے ۴۔ احاطہ۔ جبار جمیل ۴۰۰۰ روپے ۵۔ داستان میور۔ آنرام کاوش ۵۰۰۰ روپے ۶۔ لفظ لفظ کی کہانی۔ افروز فاطمہ ۴۰۰۰ روپے ۷۔ سنگ میل۔ سردار ایاغ ۵۰۰۰ روپے۔ ۸۔ نقش ہائے رنگ رنگ۔ فضل المحسن شعلہ ۴۰۰۰ روپے ۹۔ نقطۂ نظر۔ حنیف سیف ہاشمی ۴۰۰۰ روپے ۱۰۔ دھوپ کے دستخط۔ فیاض کوثری ۵۰۰۰ روپے ۱۱۔ کانٹوں کا سفر۔ شاہد فریدی ۳۰۰۰ روپے۔ ۱۲۔ لاٹھی چارج۔ سلطان جمہور ۳۰۰۰ روپے۔ ۱۳۔ آواز کا سایہ۔ عبدالقادر ادیب ۳۵۰۰ روپے۔ ۱۴۔ لمحوں کا سفر۔ ش، [illegible] ۴۰۰۰ روپے ۱۵۔ کھڑی دھوپ کا سفر۔ وحید انجم ۳۰۰۰ روپے۔ ۱۶۔ اعجاز سخن۔ اسعد اعجاز ۳۰۰۰ روپے۔ ۱۷۔ فکر کے تقاضے۔ فرحت کمال ۳۰۰۰ روپے ... ۱۸۔ نشان منزل۔ عظیم بسمل ۳۰۰۰ روپے ہیں۔

کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو کتابوں و رسایل کی فراہمی:۔ ریاست کے جملہ ۲۶ کتب خانوں بشمول دارالمطالعوں کو کتابیں و رسایل فراہم کیے گیے۔ اس سال بطور خاص ادب اطفال سے متعلق کتابیں اور رسایل بھی روانہ کیے گیے ہیں۔ اس مد پر ۲۳۰۰۵/۵۳ روپے صرف ہوئے۔

ریاست کے مصنفین سے زیادہ تعداد میں کتب کی خریدی:۔ ۴۲ مصنفین سے فی کس ۳۰ نسخے بلا تخصیص قدیم و جدید خریدے گئے۔ جملہ ۱۲۱۳۵ روپے کی کتابیں خریدی گئیں۔

اکیڈمی کے ترجمان فصیل میں شائع شدہ تخلیقات کا معاوضہ فصیل میں شائع کی گئیں تخلیقات کا معاوضہ فی کس ۵۰ روپے دیا گیا۔ اس کی اشاعت پر ۱۱۸۶۱/۵۰ روپے خرچ ہوئے۔

تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں:۔ اکیڈمی کی جانب سے پیش کردہ پروگراموں میں

باقی بر صفحہ

غزلیں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں

ہمیں تسلیم ہے کہ خانقاہوں میں بھی ہوتے ہیں
فقیرانہ روش کے لوگ شاہوں میں بھی ہوتے ہیں

فقط جاہل مریدوں ہی پہ کیوں الزام دھرتے ہو
گناہ تو مرشدوں کی بارگاہوں میں بھی ہوتے ہیں

جو فتنہ کاریوں میں رہزنوں کو مات کرتے ہیں
وہ چنگیز و ہلاکو سربراہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ مانا لطف تو آتا ہے آغوش حسیناں میں
مزے کچھ اور طوفانوں کی باہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ زخموں پہ ہمیشہ تبصرہ کرتے ہیں ہنس ہنس کر
کرم فرما کچھ ایسے خیرخواہوں میں بھی ہوتے ہیں

سفر ہے شرط ہر اک گام ساماں ہیں اجالوں کے
چراغ نقش پا ویران راہوں میں بھی ہوتے ہیں

یہ قتل دوستوں کا منظر دیکھ کر خاموش رہتے ہیں
بالفاظ دگر قاتل گواہوں میں بھی ہوتے ہیں

ضرورت کے تحت ہر آدمی مجبور ہوتا ہے
طلب گار پناہ عالم پناہوں میں بھی ہوتے ہیں

فقط لفظ و معانی پر نہیں موقوف اے منشا
حسین نکتے ادب کی اصطلاحوں میں بھی ہوتے ہیں

باسط خاں باسط

فرصت کا وقت غنیمت آ اپنے غم کی بات کریں
حالات کا بھی کچھ ذکر چلے ارباب کرم کی بات کریں

گنبد میں صدائیں دینے سے آواز تو واپس آئے گی
پگھلا ہی نہیں جو برسوں سے ایسے صنم کی بات کریں

جب آ ہی گئے میخانے میں مہتاب پگھلا جاتے ہیں
جام و مینا ٹکرانے میں کیوں رنج و الم کی بات کریں

جو بچھڑ گئے سو بچھڑ گئے جو روٹھ گئے سو روٹھ گئے
کیا اُن کے کرم کی بات کریں اب ان کے ستم کی بات کریں

جس نقش قدم سے اے باسط ہر ریگستاں گلزار رہا
ہاتھوں میں قلم ہے جب اپنے بس اس کے کرم کی بات کریں

غزل

ثریا صولت حسین

کون آیا نگار خانے میں — شہرۂ فن ہوا زمانے میں
روح فرسا تھی کتنی شامِ فراق — عمر گزری اسے بھلانے میں
شاخ در شاخ خوں فشاں ہوکر — کس نے رنگ بھر دیا فسانے میں
جلوہ آرا جو تو ہو دل کے قریب — روشنی ہو سیاہ خانے میں
حسن معصوم آبدیدہ ہے — جانے کیا پڑھ لیا فسانے میں
چاند سا کت ثریا حیراں ہے — رشکِ جنت ہے کچھ تو نے میں

ثریا صولت حسین ۳-۳-۳۳ نزد ہائی کورٹ، سول لائنس، ناگپور

[illegible] ناگپوری

غزل

دے نہ پیغامِ سکوں گردشِ ایام ابھی — زندگی سے مجھے لینا ہے بہت کام ابھی
مجھکو بیٹھنے دیں یونہی اے دل ناکام ابھی — تیری مالوں گا تو ہو جاؤ گا بدنام ابھی
کس کو کہتے ہیں رہائی ہمیں معلوم نہیں — دام سے چھوٹ کے بھی ہم ہیں تہِ دام ابھی
دو گھڑی کے لئے ہونٹوں پہ تبسم لے لے — تاکہ میں بھول سکوں کچھ تو آلام ابھی
زخم پر زخم لگاتے ہیں زمانے والے — غیر ممکن ہے ملے درد میں آرام ابھی
کوئی خیال مرے دل میں آئے بھی کیسے — دلِ حزیں میں مرے ہے تیرا قیام ابھی
سرکشی ٹھیک نہیں اہلِ سخن سے یارو — تم نے دیکھا نہیں آغاز کا انجام ابھی

میں تو ہر دور میں مشہورِ زمانہ ہوں عزیز
یہ نہ سمجھو کہ جہاں میں ہوں میں گمنام ابھی

۷-۲-۱۲۴، نامپلی روڈ، درگاہ یوسفین، حیدرآباد

ج ۵
ش ۸

اگست ۱۹۸۸ء

ماہنامہ شاداب حیدرآباد

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر : نعیم جاوید
مینیجنگ ایڈیٹر : کلیم الحسن

مجلس مشاورت
★ محترمہ عائشہ بیگم رباب ★ یوسف ناظم ★ ڈاکٹر محمد یوسف الدین
★ پروفیسر رضی الدین احمد ★ منیر احمد صدیقی ★ محمد منظور احمد منظور
★ اے جی فاروقی ★ ڈاکٹر منشاء الرحمن خاں منشاء ★ پروفیسر میر تراب علی

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپیے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
دوسال	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
تاحیات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب ' 147 - 5 - 11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004
ٹیلیفون : 229161

ایڈیٹر ' پرنٹر ' پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان میں چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز ' حیدرآباد 500004 ' آندھرا پردیش سے شائع کیا۔

فہرست

حرفِ اوّل

ملک کا لسانی حل اور سہ لسانی فارمولے کا نفاذ :-

اردو تحریکات کی روحِ رواں، اردو کے استحکام و ترقی کے علمبردار اور روزنامہ سیاست کے ایڈیٹر جناب عابد علی خاں نے اُردو کے مسئلہ کا جمہوری حل ملک و قوم کے سامنے رکھا ہے۔ ملک میں سیکولرزم کو آگے بڑھانے اور اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موصوف کی اس تجویز پر غور کیا جائے۔ جناب عابد علی خاں نے تجویز پیش کی کہ ملک میں جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے چاہے اُسے آپ ہندی کہیں یا اُردو وہی ملک کی عوامی زبان ہے۔ گاندھی جی اسی کو ملکی زبان بنانا چاہتے تھے اور ہندی یا ہندوستانی کے نام کے ساتھ چاہتے تھے کہ یہ زبان ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔ آج بھی زبان کے مسئلہ کے حل کا سہل طریقہ یہی ہے کہ دستور میں جہاں قومی زبان کا ذکر ہے وہاں ناگری رسم الخط کے ساتھ اُردو رسم الخط کا اضافہ کیا جائے تو دونوں رسم الخط کے ساتھ ایک ایسی زبان رائج ہوگی جسے ہر ایک بول اور پڑھ سکے گا۔ اور یہ زبان قومی اتحاد اور ہم آہنگی کا باعث ہوگی۔

آج ملک کی فضا اس عمل کے لئے سازگار ہے۔ شمالی ہندی ریاستوں میں اُردو سے اختلاف کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ اور ہندی والوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندی کو قومی زبان کا درجہ دینے اردو کو راستے سے ہٹانا ضروری نہیں ہے بلکہ اُردو ہندی کے ساتھ ملکر اُسے قومی زبان بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ جنوب والے ناگری رسم الخط میں ہندی کے مخالف ہیں۔ مگر ناگری اور اُردو رسم الخط میں قومی زبان پورے ملک کیلئے قابلِ قبول ہوگی۔

اس اقدام کے بعد سہ لسانی فارمولے پر عمل نہایت آسانی اور انصاف کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ ہندی ریاستوں میں سہ لسانی فارمولے کی صورت یہ ہوگی کہ ناگری اور اردو رسم الخط کی قومی زبان ذریعہ تعلیم ہوگی تو زبان اول انگریزی اور زبان دوم ملک کی کوئی غیر ہندی جدید زبان جیسے تلگو، مراٹھی یا بنگالی وغیرہ۔ اور غیر ہندی ریاستوں میں ریاستی زبان یعنی تلگو، ٹامل، کنڑی، وغیرہ ذریعہ تعلیم ہونگی تو قومی زبان اور انگریزی دوسری دو زبانیں ہونگی۔ اس طرح پورے ملک میں سہ لسانی فارمولہ نہایت آسانی اور کامیابی سے اس طرح نافذ ہوگا کہ ناگری اور رسم الخط کے ساتھ قومی زبان انگریزی اور لسانی ریاست کی مقامی زبان تینوں زبانوں کی تعلیم دی جاسکے گی اور نہ صرف غیر ہندی ریاستوں میں ہندی اور اردو خوشی سے سیکھی اور پڑھی جائینگی بلکہ ہندی ریاستوں میں کوئی غیر ہندی جدید زبان تلگو ٹامل بنگالی یا مراٹھی پڑھی جائیگی اور اس طرح لسانی ہم آہنگی کے ساتھ پورے ملک میں اتحاد اور اتفاق پیدا ہوگا۔

ملک کے تمام ہی خواہوں سے ہماری اپیل ہے کہ لسانی مسئلہ کے جمہوری حل کو اپنایا جائے۔ اور مختلف زبانوں کے سہارے ملک میں لسانی یکسوئی کے ذریعہ سیکولرزم کو مضبوط بنایا جائے۔

اُردو کے لئے احکام پر عمل آوری

اردو ہمارے ملک کی عوامی زبان ہے۔ پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ترویج و ترقی کے لئے حکومت کے احکام بھی جاری کئے جاتے ہیں، مگر اردو کا المیہ یہ ہے کہ حکومتی کارپرداز ان احکام پر عمل نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ حال ہی میں احکام جاری کئے گئے کہ حکومتی اور عوامی بورڈوں پر اردو میں بھی لکھا جائے، لیکن ان احکام کی تعمیل نہ ہوئی۔ وزیر متعلقہ نے کلکٹر ضلع سے دریافت کہ بورڈوں پر اردو کیوں نہیں ہے۔ جواب ملا کہ اردو تحریر لکھنے والے نہیں ملے۔ وزیر نے مشورہ دیا کہ اردو مدرسین کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ اُردو بچاؤ تحریک کے قبل ہی سے یہ احکام تھے کہ اُردو کو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے طلباء کی تعداد ثانوی جماعتوں میں (۱۰) یا زائد ہو تو اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن نے احکام جاری کردیئے کہ اردو پڑھنے کے خواہش مند طلباء کی تعداد (۱۰) کی بجائے (۲۵) ہونی چاہیئے۔ اگر تعداد (۲۵) سے کم ہو تو اُردو کلاسوں کو مسدود کردیا جائے۔ یہ احکام ایسے وقت پر

کئے گئے جبکہ ہمارے چیف منسٹر نے اردو کی تائید میں کوئی اعلان کئے اور احکام جاری کروائے۔ ڈائرکٹر ہائر ایجوکیشن کے ان احکام کا نتیجہ یہ ہوتا کہ چند برسوں میں اردو کی تمام جماعتیں بند ہوجاتے چونکہ یہ نہایت مضرت رساں احکام تھے ریاستی اقلیتی کمیشن کے صدر نشین جناب انفر بیگ اور ڈپٹی ایم پی جناب خلیل الرحمن نے چیف منسٹر سے موثر نمائندگی کی اور ان احکام کو منسوخ کروادیا۔

ان احکام کی اجرائی کے بعد بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ حکومتی احکامات کی تعمیل ہوتی ہے۔ تبھی اردو کے ساتھ انصاف ہوگا یہی وجہ ہے کہ جناب انفر بیگ نے بھی نمائندگی کی ہے۔ کہ اسپیشل افسر اردو مقرر کیا جائے تاکہ وہ احکام کی تعمیل کی نگرانی کرے۔ ضرورت ہے کہ اسپیشل افسر برائے اردو فوری مقرر کیا جائے۔ تاکہ حکومتی احکام پر عمل پیرائی ہو اور عدم تعمیل کی صورت میں اس افسر کو اختیار ہو کہ وہ ان احکام پر عمل کروا سکے۔

اردو سیمنار۔ دہلی :۔ عالمی اردو کانفرنس کے زیر اہتمام آندھرا پردیش کے سابق چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی صدارت میں ایک قومی سیمنار اردو کے دستوری حقوق کے بارے میں بتاریخ ۲۶ جون ۱۹۸۹ء غالب اکیڈیمی میں منعقد کیا گیا۔ جناب سید مظفر حسین برنی صدر مرکزی اقلیتی کمیشن نے سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک عالمگیر ہندوستانی زبان ہے جسے صرف مسلمانوں سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ موصوف نے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تجویز کو خوش آمدید کیا جہاں مختلف طبقات کی جانب سے اردو کے تحفظ ترقی کی آواز اٹھائی جائے۔ اقلیتی کمیشن اس سمت میں اپنی مساعی سے دریغ نہیں کرے گا۔ آپ نے واضح لفظوں میں کہا کہ سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کی جگہ اردو کو دی جائے تو اردو زبان کی بقا ہو سکتی ہے۔

جناب سید شہاب الدین ایم پی (جنتا) نے ایسے قومی سیمنار کی تجویز پیش کی جہاں تمام سیاسی جماعتیں اردو کے بارے میں اپنے موقف کا اظہار کریں۔ یوپی جہاں اردو ایک عوامی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ نہ صرف حکومتی طور پر دوسری سرکاری زبان تسلیم کئے جانے سے محروم ہے بلکہ ہندی اور انگریزی کے ساتھ سنسکرت کو حکومتی زبان کی طور تسلیم کیا گیا ہے۔ یہاں مسلم آبادی سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں اس لئے اردو

کو صرف مسلمانوں سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ۔ بلکہ ضرورت ہے کہ اُردو میڈیم یونیورسٹی قائم کی جائے ۔

شاہد صدیقی ایڈیٹر "نئی دنیا" نے کہا کہ سیاستدانوں کو اس کی اجازت نہیں دی جاتی چاہیئے کہ وہ اُردو کا سیاسی استعمال کریں ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غیر سرکاری اعداد و شمار بتلاتے ہوئے کہا کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد ۴۰ فیصد سے زیادہ ہے اور اُردو ہندی کے بعد ملک کی سب سے بڑی زبان ہے ۔ یو این آئی کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر کے پی کے کٹی نے بتایا کہ یو این آئی جلد ہی اُردو نیوز سروس شروع کرنے والی ہے ۔

یقین ہے کہ اُردو والے سمینار کے مباحث کی روشنی میں اپنے مساعی کی صحیح سمت کا تعین کریں گے اور حکومت اور برادرانِ وطن بھی اردو کو اپنا مقام دلانے میں اپنا دستِ تعاون دراز کریں گے ۔

سلسلہ صہ ۸ :-

اور ہڑتالی اقدامات خود بخود ختم ہو جائیں گے ۔

اردو والوں کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ سرکاری زبان کمیشن میں اردو کا ایک نمائندہ نامزد کیا جائے جسے اُردو کے بارے میں حکومتی ہدایات کی تعمیل کروانے کے اختیارات بھی ہوں ۔ صدر نشین سرکاری زبان کمیشن نے بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ایسے نمائندے کی نامزدگی کے لئے حکومت میں تحریک کریں گے اگر اردو والوں کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے تو اردو بچاؤ تحریک کے سربراہوں کو چاہیئے کہ وہ احتجاجی اور ہڑتالی اقدامات ختم کر دیں اور حکومت سے تعاون کرتے ہوئے اردو کی ترقی اور استحکام کا باعث بنیں ۔

اُردو مسائل اور صدر نشین ریاستی اقلیتی کمیشن

ا ین یس کے مطابق صدر نشین ریاستی اقلیتی کمیشن جناب مرزا اللہ بیگ نے ۱۶ر جون ۱۹۸۹ء کو سکریٹریٹ میں واقع ان کے دفتر پر سکریٹری محکمۂ تعلیمات مسٹر وی دیہ ماتھو ایر کو طلب کیا اور اُردو مدارس وکالجس کے علاوہ کئی ایک دیگر مسائل پر حکومت کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات سے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ سکریٹری تعلیمات نے صدر نشین ریاستی اقلیتی کمیشن کو بتایا کہ حکومت نے حالیہ تعلیمی سال کے دوران اضلاع نظام آباد گنٹور اور کرنول میں اُردو اقامتی مدارس کے سلسلہ میں احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ مسٹر بیگ نے سکریٹری سے کہا کہ حیدرآباد میں اُردو اقامتی مدرسہ میں طلباء کو میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دیا جائے کیونکہ سال گذشتہ انٹرنس ٹسٹ کے طریقہ کار کو اپنانے کی وجہ سے چند نشستیں مخلوعہ رہ گئی تھیں چونکہ درج فہرست طبقات و قبائل کے طلباء کو حکومت نے انٹرنس ٹسٹ کے لزوم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اسلئے یہی مراعات اُردو داں طلباء کو بھی دی جائیں جس سے سکریٹری نے اتفاق کر لیا ہے۔ مسٹر بیگ نے سکریٹری سے کہا کہ روسٹر سسٹم کے تحت درج فہرست طبقات و قبائل کے لئے اُردو کالجوں اور مدارس میں جو جائیدادیں محفوظ کی گئی ہیں اور جو مخلوعہ ہیں انھیں اُردو زبان کے اہل امیدواروں سے پر کیا جائے۔ تاکہ اُردو داں طلباء کو نقصان نہ ہو۔ سکریٹری تعلیمات نے اس کو واجبی مطالبہ قرار دیتے ہوئے اس پر ہمدردانہ غور کرنے کا تیقن دیا۔ صدر نشین کمیشن نے محکمہ جات اعلیٰ تعلیم و اسکول ایجوکیشن کے رویہ پر بھی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ بیشتر اُردو مدارس میں ان محکمۂ جات کی جانب سے غیر اُردو داں اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو داں طلباء کی تعلیم پر مضر اثرات رونما ہو رہے

ہیں اسلئے اس کی فوری اصلاح کی جائے اور متعلقہ محکمہ جات کو احکامات جاری کئے جائیں کہ وہ ایسی غلطی نہ کریں۔ مسٹر وید یہ ناتھ ایر نے صدرنشین کو یقین دلایا کہ وہ اس سلسلہ میں فوری طور پر ضروری احکامات جاری کر دیں گے۔ صدرنشین نے سکریٹری کو یہ بھی بتایا کہ اردو عربی اور فارسی کے ۱۷ ہزار مخطوطات ہیں۔ جس پر صرف ایک کلرک کو تعینات کیا گیا ہے جبکہ تلگو اور سنسکرت کے ۵ ہزار مخطوطات کیلئے کافی عملہ اور بجٹ فراہم کیا گیا ہے۔ صدرنشین نے اس بے ضابطگی کو دور کرنے اور تناسب عملہ اور بجٹ کی فراہمی کی تجویز پیش کرتے ہوئے سکریٹری تعلیمات سے خواہش کی کہ وہ ڈائرکٹر اورینٹل ریوا- ئیلیکیشنس کو اس سلسلہ میں توجہ دلائیں اور اس خامی کو دور کریں مسٹر ناصر بیگ نے سکریٹری سے کہا کہ دائرۃ المعارف ایک قدیم ترین ادارہ ہے۔ اور اس ادارہ کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہے جس کے صدرنشین چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ ہیں۔ لیکن گذشتہ (۳) برسوں سے محکمہ تعلیمات کی جانب سے گرانٹ اس ادارہ کو اجراء نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے چیف منسٹر کی بدنامی ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں فوری مناسب اقدامات کئے جائیں۔ سکریٹری نے مسٹر بیگ کو تیقن دیا کہ وہ اس ضمن میں فوری توجہ کریں گے اور گرانٹ کی منظوری دی جائیگی مسٹر بیگ نے اس موقع پر یہ تجویز بھی رکھی کہ ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن کے تحت ایسا کوئی عہدیدار نہیں ہے اس لئے موجودہ ڈپٹی ڈائرکٹر کے علاوہ عہدیدار پر کسی اردو داں عہدیدار کا تقرر عمل میں لایا جائے تاکہ ریاست میں واقع کالجس وغیرہ کی مناسب و موثر نگرانی کرسکے۔ سکریٹری نے صدرنشین سے کہا کہ اگر محکمہ میں اس عہدہ کا حامل کوئی اردو داں عہدیدار موجود ہے تو وہ اس کی خدمات سے استفادہ کریں گے۔ مسٹر بیگ نے مسٹر وید یہ ناتھ ایر سے یہ خواہش کی کی کہ وہ ریجنل انسپکٹر آف اردو اسکولس کا عہدہ بھی علاقہ تلنگانہ میں قائم کریں۔ جس طرح کہ یہ عہدہ ساحلی آندھرا اور رائلسیما میں موجود ہے۔ سکریٹری تعلیمات نے اس مسئلہ کو حکومت سے رجوع کرنے کا تیقن دیا۔

یہ خوشی کی بات ہے۔ کہ جناب مرزا ناصر بیگ نے صدرنشین اقلیتی کمیشن کی حیثیت سے محکمہ تعلیمات کو ہدایات دیں۔ اگر اردو کے بارے میں ان ہدایات پر عمل آوری ہوتی ہے اور اس طرح حکومتی ہدایات کی دوسرے محکمہ جات بھی تعمیل کرتے ہیں تو اردو والوں کو شکایت کا موقعہ ہی باقی نہ رہیگا۔ اور احتجاج

باقی برصفحہ ۶

نومسلم لارڈ ہیڈلی فاروق

اسلام پر ایمان برسوں مطالعہ کا نتیجہ

لارڈ ہیڈلی فاروق کا اصل نام رائٹ آنریبل سر رولانڈ جارج الائن ہے۔ آپ ۱۸۵۵ء میں
ا ہوئے۔ کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ فوج میں کیپٹن اور لیفٹننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز رہے ہیں
یشہ کے اعتبار سے انجینیر ہونے کے باوجود سیاست اور ادب میں نمایاں شہرت حاصل
ں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہوئے جن میں سب سے مشہور "اسلام کے تعلق سے مغرب
ں بیداری" ہے۔ آپ کا شمار برطانیہ کی اہم شخصیات میں ہوتا تھا۔ آپ نے ۱۶ نومبر ۱۹۱۳ء
یں اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا اور آپ کا نام رحمت اللہ فاروق رکھا گیا۔ آپ نے دنیا کے مختلف
لکوں کا دورہ کیا۔ اور ۱۹۲۸ء میں ہندوستان بھی تشریف لائے تھے۔

لارڈ فاروق نے اپنے قبولِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ممکن ہے کہ میرے بعض
دوست یہ سمجھیں کہ میں نے مسلمانوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ لیکن ایسا
یں ہے۔ اسلام پر میرا ایمان برسوں تک جاری مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں
سے تو میری گفت و شنید چند ہفتہ پہلے شروع ہوئی۔ اور مجھے یہ جان کر نہایت خوشی
ہوئی کہ میرے نظریات اسلامی تعلیمات کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہیں۔

جیسا کہ خود قرآن نے فرمایا ہے: کسی انسان کو یہ مذہب خود اپنے ذاتی یقین اور
یمان کی بنا پر اختیار کرنا چاہیئے۔ کسی جبر اور زبردستی سے ہرگز نہیں۔ خود حضرت
مسیحؑ نے بھی اپنے حواریوں سے اسی طرح کی بات کہی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ پر جوش
پروٹسٹنٹ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہے کہ رومن کیتھولک علاقوں میں جا کر وہاں
پے مسلک وعقیدہ کی تبلیغ کریں۔ اس نامناسب رویہ سے بسا اوقات نفرت
اور کینہ پیدا ہوا اور ایسے جھگڑے کھڑے ہوئے جن سے خود دین پر حرف آیا ہے۔ ۔ سا

میں یہ دیکھتا ہوں کہ بہت سے مسیحی تبلیغی مشن اپنے مسلمان بھائیوں سے۔ ساتھ بھی اسی طرح کا رویہ اپناتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ ایسی قوم میں جا کر تبلیغ کریں جو حقیقی مسیحی تعلیمات سے خود ان کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہیں۔ نیکی، رواداری اور ذہنی وسعت جو اسلامی عقیدہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ موجودہ مختلف مسیحی مذاہب میں رائج، نو ایجاد کردہ اور تنگ نظری پر مبنی عقائد کے مقابلہ میں حضرت مسیحؑ کی دعوت سے زیادہ قریب ہے۔ مثال کے طور پر تثلیث کا عقیدہ مسیحی مذاہب میں نہایت بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کیتھولک عقیدہ کی نمائندگی کرتے ہوئے۔ یہ واضح طور پر کہا جاتا کہ اگر ہم اس پر ایمان نہیں لاتے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہلاکت کے غار میں گر جائیں گے اگر نجات کی خواہش ہے۔ تو تثلیث پر عقیدہ کے بغیر چارہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایسے رب پر ایمان لے آئیں جو رحیم اور عظیم ہے ساتھ ہی اس کے ساتھ ظلم اور جبر کی ایسی صفت لگا دیں جو انسانوں میں ظالم ترین لوگوں کی صفت ہے۔ حاشا اللہ کہ خدا کی صفات کو تثلیث کے اصول کو ماننے والے کسی کمزور بندہ کے تصور و خیال تک محدود کر دیا جائے۔

دوسری مثال نیکی اور محبت کے تعلق سے مسیحیت کی کم مائیگی ہے۔ ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ اگر میں مسیحؑ کی الوہیت پر ایمان نہیں لاتا تو میری نجات ناممکن ہے۔ جبکہ میرے نزدیک اس سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ کیا حضرت مسیحؑ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نوع انسانی کو پہنچا دیا یا نہیں۔ خدا کے فضل سے مجھے اس میں کبھی شک نہیں ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی تعلیمات کے سلسلے میں میرا یقین کسی بھی مسلمان یا مسیحی کی طرح ٹھوس رہے جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں۔ میرا یہ یقین ہے کہ اسلام اور وہ مسیحیت جس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے خود دی۔ دونوں بھائی بھائی ہیں۔ دونوں کے درمیان صرف چند اصطلاحات کا فرق ہے۔ جن کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے زمانہ میں لوگ تنگ نظری پر مبنی مذاہب کے مقابلہ میں خود اللہ تعالیٰ پر ایمان ہی سے برگشتہ ہو رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسے مذہب کی تڑپ بڑھتی جا رہی ہے۔ جو عقل کو مخاطب کرے اور انسانی جذبات سے ہم آہنگ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کوئی مسلمان ایمان کے مقابلے میں الحاد کی طرف مائل ہوا ہو۔

باقی بر صفحہ ۳۲

شاہد حسین رزاقی

سید جمال الدین افغانی
:کا:
قیام حیدرآباد دکن

—قسط دوم:—

علامہ افغانی نے اپنے ایک اور اہم اور فکر انگیز مقالے میں تعلیم و تربیت کے متعلق اپنے
ت کا اظہار کیا تھا۔ تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں وہ دینی تعلیم کے ڈھنگ میں اصلاح
ہائی ضروری خیال کرتے تھے اور اس بارے میں اپنے خیالات کو بغیر کسی جھجک
اف صاف ظاہر کر دیتے تھے چنانچہ اس مقالے میں جو ۱۸۸۱ء میں "معلم" حیدرآباد میں
ہوا تھا انھوں نے مروجہ تعلیم کی خرابیوں اور خامیوں اور علمائے دین کی بے علمی و بے خبری
بیان کرتے ہوئے بہت واضح طور پر لکھا کہ ------ "فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا
شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے مثلاً عربی کو لیجیے عربی کی تعلیم کا مفہوم علم نحو کو حاصل
سمجھا جاتا ہے۔ علم نحو کو حاصل کرنے کا اصل منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان
ننا اور لکھنا پڑھنا آجائے اور بس۔ لیکن مسلمان طبقہ کا تمام وقت اس کی
ی بحثوں میں اور فلسفیانہ موشگافیوں میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی
نے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے
ی ایں کہ دو سطریں صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

لم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان ادیب، خطیب اور
ہو سکتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ تمام عمر پڑھنے کے بعد روزمرہ کی گفتگو پر بھی
یے علم قادر نہیں ہوتا۔"

علم منطق جو میزان افکار کہا جاتا ہے اور انسان کو حق و باطل اور صحیح و فاسد
میاز کرنے پر قادر کرتا ہے۔ اس کا اثر مسلمان منطقیوں پر یہ ہوا کہ ان کے دماغ ممکنہ
ات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں اور ان کے اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

"علم حکمت (یعنی سائنس) جس کا تعلق موجودات خارجیہ کے اصول سے بحث سے ہے اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ "صدرا" اور "شمس بازغہ" پڑھ لیا اور خود کو حکیم سمجھنے لگے۔ حالانکہ دائیں بائیں کا فرق بھی نہ معلوم ہوا اور اتنی صلاحیت بھی پیدا ہوئی ہے کہ یہ معلوم کریں کہ وہ خود کیا ہیں کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیئے وہ کبھی بھول سے نہیں پوچھتے کہ یہ تار برقی کیا ہے۔ یہ دخانی کشتی کیا چیز ہے ریل کیسے بنتی ہے اور کیسے چلتی ہے میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لیے شام سے صبح تک "شمس بازغہ" کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ چراغ کی چمنی نکال دی جائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہے اور چمنی لگا دی جائے تو کیوں دھواں موقوف ہو جاتا ہے۔ تف ہے ایسے عقل پر اور تف ہے ایسی حکمت پر حکیم وہ ہے جو حوادث اجزائے عالم پر غور کرے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزل مقصود سجھائی ہی نہیں دیتی۔

"مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہے تمام حقوق بلدیہ و دولیہ پر یعنی چاہیئے تو یہ کہ ہر ایک فقیہ صدر اعظم یا سفیر ہو سکے لیکن ہم اپنے فقہا کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے بھی قاصر ہیں اور اپنی اس نااہلی کو قابل فخر سمجھتے ہیں"۔

"علم شریعت در حقیقت حکمت قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے عملی منفعت و مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے مشائخین و علما قوانین مدنیت سمجھنے سے بالکل عاری ہیں ہمارے علما کی حالت ایک باریک فتیلہ کی سی ہے جس پر ایک کم زور شعلہ ٹمٹا رہا ہے جو نہ تو اپنے اطراف روشنی پھیلا سکتا ہے اور نہ دوسروں تک اس کی روشنی پہنچ سکتی ہے عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی سی ہو سکتی ہے جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلتی ہے وہ اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو کم از کم اپنے گھر یا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو تو روشن کر سکتا ہے یہ علما کیسے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرا کی مثال پر صادق آتے ہیں"

"افسوس اور تعجب تو یہ ہے کہ ہمارے علما نے علم کی دو قسمیں قرار دیں

رکھی ہیں ایک کو علم مسلمانان اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ اور اتنا نہیں سمجھتے کہ علم تو شریف شے ہے جو کسی طبقے سے مخصوص نہیں۔۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمان ان علوم کو جو ارسطو اور افلاطون سے منسوب ہیں بڑی رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں۔ لیکن اگر گلیلو اور دوسرے علماء کے علوم کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اس کو کفر سمجھتے ہیں۔ حق وہ ہے جو دلیل اور برہان رکھے۔ جو علماء نئے علوم اور معارف کے حاصل کرنے سے روکتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارفِ مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں۔ مسلمانوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہمارے علمائے دین خود اپنی اصلاح نہ کریں اور مختلف علوم و معارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام خرابی و تباہی پہلے ہمارے علمائے دین میں واقع ہوئی اور ان کی وجہ سے یہ عام امت میں سرایت کرتی گئی۔"

حیدرآباد میں قیام کے دوران میں علامہ افغانی نے اپنے مضامین اور تقاریر میں باشندگانِ ہند کو سیاسی اتحاد قائم کرنے پر شدت سے متوجہ کیا۔ برطانوی سامراج کی گرفت سے اقوام مشرق کو جن میں اکثر و بیشتر مسلمان ہیں۔ نجات دلانا درحقیقت افغانی کی سیاسی جد و جہد کا مرکز و محور تھا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ چنانچہ ان کی کوشش یہ تھی کہ ہر ملک میں خواہ وہ مصر ہو یا ہندوستان، مسلم ہو یا غیر مسلم سب قومیں متحد ہو کر برطانوی استعمار کا مقابلہ کریں اور اپنے ملک کو برطانوی [illegible] آزاد کرا لیں۔ اس اتحاد کی خاطر وہ ادیان کو اسلامی عہد کی عظمت و شوکت کے ساتھ عہدِ قدیم کی شاندار روایات بھی یاد دلاتے تھے اور ہندوستان میں بھی انھوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان عہد کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے عہدِ قدیم کا بھی ذکر کیا اور دونوں قوموں کو اپنی عظمتِ رفتہ کا احترام کرتے ہوئے آزادی کی خاطر متحد ہو جانے کی دعوت دی۔

افغانی کی نظر میں ہندوستان کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزوں نے جبرالٹر، سائپرس، عدن اور سنگاپور میں زبردست بحری و فوجی مستقل مقامات ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے قائم کئے ہیں اور

ان کی وجہ سے مسلم ممالک کی آزادی کو زبردست خطرات لاحق ہیں۔ چنانچہ وہ برطانوی سامراج سے مشرق کی نجات کے لیے ہندوستان کی نجات کو لازمی تصور کرتے تھے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے یہ لازمی تھا کہ اس ملک میں بسنے والی دونوں قومیں متحد ہو کر جد و جہد کریں۔

اس دعوتِ اتحاد سے علامہ افغانی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ برطانیہ جیسی ایک طاقتور حکمراں قوم کی غلامی سے نجات پانے کے لیے ہندوستان کی دو بڑی قومیں مسلمان اور ہندو سیاسی اتحاد کرلیں اس طرح اپنی قوت بڑھا کر سامراجی حکومت کا مقابلہ کریں ورنہ متحدہ قومیت کے تصور یعنی ہندوستان میں بسنے والے تمام باشندوں کو صرف ایک قوم بنا دینے کے وہ قائل نہ تھے مسلمانانِ ہند کو وہ ملتِ اسلامیہ کا ایک حصہ اور ہندوؤں سے بالکل مختلف جداگانہ قوم تصور کرتے تھے وطنی قومیت کے وہ سخت مخالف تھے اور اسلامی ممالک میں اس نظریے کی اشاعت کو سامراجی اقوام کا سیاسی حربہ سمجھتے تھے جس کا مقصد مسلمانانِ عالم کے ملی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا چنانچہ علامہ نے ایک مقالہ "جنسیت اور اسلام" میں لکھا ہے کہ "فرنگی یہ بات خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان محکم ترین رابطہ دین کا رابطہ ہے اور انہوں نے یہ بھانپ لیا ہے کہ مسلمانوں کی ساری طاقت ان کی دینی عصبیت پر مبنی ہے اس لئے انہوں نے اپنی ساری توجہ دشمن اسلام کے حامی نشاروں میں پست خیالات کی اشاعت کرنے پر مبذول کردی اور دینی اتحاد کے مقدس رشتے کو توڑنے کے لیے وطنی قومیت کے تصور کو ان کے سامنے آراستہ کر کے پیش کیا تاکہ اس کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کی مستحکم عمارت کو ڈھا دیں اور اس ملت کو قوموں اور فرقوں میں تقسیم کر دیں۔ بعض ملکوں میں ان فتنہ پردازوں کو کچھ کامیابی بھی ہوئی اور بعض غافل مسلمانوں نے اپنے جہل اور اندھی تقلید کی وجہ سے اس تصور کو قبول کر لیا۔"

علامہ افغانی صرف تصورِ امت کے قائل تھے اور اتحاد و اخوتِ اسلامی کو اسلامی نظام کا ایک بنیادی رکن اور ایمان کا ایک اہم ترین جزو قرار دیتے تھے اپنے مقالے "وحدتِ اسلامی" میں اس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اے امتِ مرحومہ! یہ تمہاری زندگی ہے۔ اس کو بچاؤ۔ یہ تمہارا خون ہے اسے ہرگز نہ بہاؤ۔ یہ تمہاری روح ہے، اسے زبوں مت کرو۔ یہ تمہاری سعادت ہے، اسے کسی قیمت پر مت بیچو۔ وسوسوں سے فریب نہ کھاؤ۔ توہمات سے بہک نہ جاؤ۔ باطل کی سیاوٹوں سے مرعوب نہ ہو۔ عقل کی آنکھ پر سے وہم کا پردہ ہٹاؤ اور اپنے دینی رابطے کا دامن تھام لو یہ سب سے مضبوط رشتہ ہے جس میں ترک، عرب کے ساتھ، ایرانی، ہندوستان کے ساتھ، اور مصری، مغربی کے ساتھ اکٹھا ہو جاتا ہے یہ عظیم ترین رشتہ ہے جو اللہ نے تم میں قائم کیا ہے۔ اسی میں تمہاری عزت ہے، تمہارا دبدبہ ہے، تمہارا اقتدار ہے اور تمہاری سیادت ہے۔ اس رشتہ کو کمزور نہ ہونے دو۔ "

علامہ افغانی نے اپنے اس تصور کو جو بین الاسلامی اتحاد یا Pan-Islamism کے نام سے مشہور ہوا اپنی تحریک کی بنیاد اور اپنی جدوجہد کا مرکز و محور قرار دیا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری چند سال تو صرف اسی مقصد کے لیے وقف کر دیے تھے۔

ہندوستان کی آزادی اور فلاح و ترقی کے لیے علامہ افغانی نے ہندوستانی قوموں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے کے علاوہ لسانی اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے اپنے ایک مقالے میں جو " وحدتِ جنسیت و اتحادِ لغت " کے عنوان سے " معلم " حیدرآباد دکن میں شائع ہوا تھا اور اپنی تقریروں میں جو انھوں نے حیدرآباد اور کلکتے میں کی تھیں اجتماعی زندگی کے بعض اہم مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لسانی اتحاد کی اہمیت کو واضح کیا۔ حیدرآباد میں اساتذہ، طلبہ، علما، امرا اور دوسرے سربرآوردہ لوگوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قوم کی تعمیر و ترقی اور قومی اتحاد کے لیے قومی زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جن قوموں کی قومی زبان نہیں ہوتی وہ ایک قومی زبان بنا کے اپنے قومی وجود کو مستحکم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی کوئی قومی زبان نہیں ہے لیکن خوش قسمتی سے اردو ایک ایسی زبان موجود ہے جو کم و بیش ہندوستان کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور کوشش کرنے سے پورے ملک کی مشترک قومی زبان بن سکتی ہے۔

اپنے اس مضمون میں علامہ افغانی نے جدید علوم کی تعلیم وطنی زبان میں دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اہلِ ہند میں سے وہ لوگ

جو تو دِ بصیرت رکھتے ہیں ، اتحاد کے معنی سمجھنے لگے ہیں اس کے فائدہ سے واقف ہوگا
ہیں مستقبل پر نظر رکھتے ہیں اور تدبّر کی خوردبین سے قوموں کے حالات کا اندا
دیکھ سکتے ہیں۔ کیوں اس مسئلے پر غور نہیں کرتے اور کیوں اس ضروری کام کو
انجام نہیں دیتے کیا وہ نہیں جانتے کہ قوم کی بقا و ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ مدا
میں تعلیم وطنی زبان میں ہو۔ علوم جدیدہ نے سارے عالم پر قبضہ کر لیا ہے اور
فنون کرۂ ارض کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن مقام تعجب ہے کہ ان میں سے کہ
اچھی چیز کا ہند کی زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کیا اہل ہند اس نکتے سے بے خبر ہیں
کہ اگر ان کی قومی زبان میں علوم نافعہ منتقل نہ ہوں گے تو ان کی قومیت کی
تکمیل حاصل نہ ہوگی۔ عقلا کا پہلا فرض یہ ہے کہ وطن کی زبان کی توسیع کریں کیا
کیوں علوم جدیدہ کو قومی زبان میں بالخصوص اردو میں جو بمنزلۂ عام ملکی زب
کے ہے ترجمہ نہیں کرتے۔ اس زبان کی ترقی کے لئے دوسری زبانوں سے فائدہ کیوں
نہیں اٹھاتے اور اپنی زبان کی کمی پوری کرنے کے لئے انگریزی زبان سے مدد
کیوں نہیں لیتے۔

انگریز قوم علوم جدیدہ اور فنون مفیدہ کی استاد ہے اور بہت زمانے سے
ہندوستان پر حکومت کر رہی ہے۔ دانشمندانِ ہند اس سے فائدہ کیوں
نہیں اٹھاتے اور یہ علوم و فنون کیوں حاصل نہیں کرتے۔ اہل ہند اپنے وطن کے لئے
جدید علوم کا خزانہ اس وقت تک جمع نہیں کر سکتے جب تک کہ ان علوم کو
زبانِ وطن میں منتقل نہ کرلیں۔ یہ علوم اس وقت تک ملک میں عام نہیں ہو
سکتے جب تک کہ ملک کی زبان میں رائج نہ ہوں کوئی شخص اس پر فخر نہیں
کر سکتا کہ اس کے کتب خانہ میں غیر زبان کی ہزارہا کتابیں ہیں لیکن ملکی زبا
میں قوم کے فائدہ کی ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ اگر کوئی کج فہم یہ کہے کہ جدید
علوم کا مقصد ایک ہی ہے خواہ وہ وطنی زبان میں ہو یا غیر زبان میں۔ مفید علو
سب انگریزی زبان میں موجود ہیں اور انگریز ہندوستان پر حکمراں ہیں لہٰ
اس لیے ہم ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ قومیت کی قید کو اٹھا دیں اور اپنی ہستی
کو حاکم قوم کے وجود میں فنا کرکے حاکم قوم کی زبان میں علوم حاصل کریں اور
ان کی زبان کو ترجیح دے کر وطنی زبان کے بجائے استعمال کریں تو اس کا

ستا بلاشبہ خوشامد اور تملق کے سوا کچھ نہیں۔ قومی زبان کے بارے میں تم نے جو کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان انگریزی کی تعلیم کو بالکل بند کرا دیا جائے۔ اس زبان کا حاصل کرنا تو چند وجوہ سے ہندوستانیوں پر لازم ہے مقالے کے آخر میں علامہ افغانی نے لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کو سکون اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ ہندیوں کے قلوب میں جگہ پیدا کریں اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی عام زبان اردو کو حکومت کی زبان قرار دیں گے۔

قومی زبان کے فروغ اور تعلیمی ترقی کے لیے علامہ افغانی نے ایک اور انقلابی تجویز پیش کی جس پر حکومتِ حیدرآباد اس وقت عمل نہ کر سکی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ حیدرآباد میں مسلمانوں کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں پوری تعلیم ان کی مادری زبان اردو میں دی جائے۔ اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پر جب چالیس سال بعد عمل کیا گیا اور حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی تو اہلِ فکر و نظر نے اس کو ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہوئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو بھی ایسی یونیورسٹیاں قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن افغانی کی دوراندیشی و دوربینی نے اس اہم قومی تقاضے کو نصف صدی قبل محسوس کر کے اس کی ضرورت و اہمیت پوری شدت سے واضح کی اور اس منصوبے کو عملی شکل دینے کی کوشش جاری رکھی۔

علامہ افغانی ہندوستان سے جانے کے بعد جب پیرس میں قیام پذیر ہوئے تو ان کے مخلص دوست بلنٹ ہندوستان آتے ہوئے ان سے ملنے گئے تو انھوں نے بلنٹ سے یہ خواہش کی کہ وہ مجوزہ اردو یونیورسٹی کے قیام پر وائسرائے ہند لارڈ رپن کو بھی متوجہ کریں۔ بلنٹ نے ہندوستان آنے کے بعد یہ تجویز رپن کو پیش کی۔ اور جب نظام دکن و امرائے سے ملنے گئے تو بلنٹ نے سالار جنگ اور دوسرے امراء سے افغانی کی مجوزہ اردو یونیورسٹی کے بارے میں گفتگو کی۔ ان لوگوں نے افغانی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ یہ تجویز نظام کے سامنے باقاعدہ طور پر پیش کی جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۸۴ء میں بلنٹ نے نظام کے نام ایک خط

کے ساتھ یہ تجویز سالار جنگ کے پاس بھیج دی۔ اس کے جواب میں سالار جنگ نے ۱۴ فروری ۱۸۸۳ء کو بلنٹ کے نام ایک خط میں لکھا کہ "ہز ہائنس نظام نے لارڈ رپن سے جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تھے اس تجویز کے متعلق گفتگو کی تھی۔ ہز ایکسلنسی نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہز ہائنس اس تجویز کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اور ان کی خوشی ہوگی اگر دوسرے مقامات کے مقابلے میں حیدرآباد کو اس یونیورسٹی کا مرکز بنا دیا جائے۔ ہز ہائنس کو مسرت ہے کہ ہز ایکسی لنسی وائسرائے نے بھی ان سے اس کام میں امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔"

اس خط میں سالار جنگ نے نظام کی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ بلنٹ اس تجویز کو مکمل کرنے کے لیے کچھ عرصہ اور اس ملک میں ٹھہر جائیں اور حیدرآباد کے اس کام میں نظام کی امداد کریں لیکن بلنٹ کی مصروفیات نے اس کی اجازت نہ دی اور وہ جلد ہی ہندوستان سے چلے گئے۔ بلنٹ کے جانے کے بعد یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی اور اس اہم اور مفید تجویز کو بھی جو افغانی کے زرخیز ذہن کی قابل قدر پیداوار تھی عملی شکل اختیار کرنے کے لیے چالیس برس انتظار کرنا پڑا۔

حیدرآباد میں علامہ افغانی کے قیام سے انگریز اور سالار جنگ بہت فکرمند تھے اور خود افغانی نے بھی ریاض پاشا وزیر اعظم کو لکھا تھا کہ انگریزی حکومت ان کو احمد اعرابی کا نمائندہ خیال کرتی ہے اور ان کی شدید نگرانی کی جا رہی ہے کہ کہیں وہ ہندوستان میں بغاوت نہ کرا دیں۔ مصر میں اعرابی کی قومی بغاوت نے جب بہت زور پکڑا اور انگریزوں کے لیے شدید خطرات پیدا ہو گئے تو علامہ افغانی کو حیدرآباد سے کلکتہ منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ نومبر ۱۸۸۱ء کے اواخر میں وہ حیدرآباد سے رخصت ہوئے اور بھوپال میں مختصر قیام کے بعد ان کو کلکتہ لے جایا گیا۔ مصر میں اعرابی کی تحریک روز افزوں شدت اختیار کر رہی تھی قصر عابدین کے سامنے ایک زبردست مظاہرہ ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے اعرابی نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو ہندوستان میں بھی بغاوت کرا سکتے ہیں ان کے اس دعوے سے انگریز بہت پریشان ہوئے اور یہ خیال کرنے لگے کہ اعرابی کا اشارہ جمال الدین افغانی کی طرف ہے چنانچہ ان کو نظربند کر کے بڑی سختی سے ان کی جانچ کی گئی

ماڈرن ریویو ۳۹

عابد علی خاں

اردو کے مسئلہ کا جمہوری حل

کچھ عرصہ سے اردو والوں میں اپنی زبان کی حفاظت اور اس کے جائز حقوق اور ملک میں اس کا صحیح مقام حاصل کرنے کے سلسلہ میں ایک تحریک اتر پردیش، دہلی اور آندھرا پردیش میں شروع ہوئی ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو کے نئے صدر کے انتخاب کے بعد سے نجی اور رسمی محفلوں اور سمیناروں و کانفرنسوں میں اردو کے مطالبات پر بحث کے ایک اہم سلسلہ کا آغاز ہوا ہے۔ ماہرین زبان اپنے مضامین کے ذریعہ اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں۔ جس سے یہ بات وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ اردو کی تحریک میں ایک اہم موڑ آرہا ہے۔ گو مسائل کے حل کے طریقوں اور ذرائع میں اختلاف رائے ہے۔ اس لئے ہمیں ایک متحد اور ایک آواز ہونے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ یہ نہیں چاہتے کہ اردو کو اس کا جائز مقام ملے وہ اس امر سے مطمئن ہیں کہ اردو والوں میں اختلاف رائے کے باعث اردو کا مسئلہ فوری حل نہیں ہوگا۔ اردو کے مخالفین کے اس تاثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو والوں میں نہ تو اتحاد رائے ہے اور نہ ہی مقصد و منزل متعین ہے۔ اس لئے اب ہمیں غیر مبہم اور واضح طور پر اپنے مقصد اور منزل کا تعین کرنا ہوگا۔ منزل کے تعین میں متعدد دشواریاں ہیں۔ ایک گوشہ سے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ تو کچھ گوشے آئینی اور دستوری حق پر عمل آوری چاہتے ہیں۔ مخالف گوشوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے کیا اردو والے لسانی ریاستوں کی موجودہ حیثیت کو بدل کر دو لسانی ریاستیں بنانا چاہتے ہیں۔ چند حامیان اردو دستور دفعہ (۳۴۷) سے فائدہ اٹھا کر راشٹرپتی سے یہ اعلان کی

ایڈیٹر روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد - اے پی

خواہش رکھتے ہیں کہ ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہے وہاں اردو کو بھی نظم و نسق تعلیم اور دوسرے حکومتی شعبوں میں سہولتیں دی جائیں۔ بعض احباب اس بات کو بھی تسلیم کرنے کے حق میں ہیں کہ اردو کو "مسلمانوں" سے جوڑ دیا جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ آبادی کے تناسب کے بموجب اردو کی سہولتوں کا تعین کیا جائے جو افراد کم فہمی یا دانستہ طور پر اردو کو مذہب سے جوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ مشورہ کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہوسکتا۔ اردو کو مسلمانوں سے جوڑ دینا ملک کی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ ثبوت کے طور پر ہندوستان کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں اور اردو مادری زبان والوں کے اعداد دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ علاوہ ازیں ہر ریاست کے اعداد دیکھنے سے بھی یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ریاست کشمیر میں اردو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل اعداد جو ۱۹۸۱ء کی مردم شماری پر مبنی ہیں سے ظاہر ہوگا کہ ساٹھ لاکھ کی آبادی کی اس ریاست میں جہاں مسلمانوں کی تعداد چالیس لاکھ ہے وہاں اردو مادری زبان والوں کی تعداد صرف سات ہزار ہے۔ یہاں کی اکثریت نے کشمیری۔ لداخی اور ہندی وغیرہ کو اپنی مادری زبان لکھوایا ہے اسی طرح دوسری ریاستوں کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آئیگی کہ ہر ریاست میں مسلمانوں کے مقابلہ میں اردو مادری زبان لکھوانے والوں کی تعداد کم ہی ہے۔ ان حقائق سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی زبان کے مقام کا تعین کیا صرف اعداد سے کیا جائے گا۔ جو مادری زبان ہی کے اساس پر مرتب ہوتے یا ان اعداد سے جو عوام بولتے اور سمجھتے ہیں اور مروج و مقبول ہے۔ اردو زبان کشمیر سے راس کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسے ملک میں بولی جانے والی چھٹی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں بھی اردو کو مقبولیت حاصل ہے اس لحاظ سے دنیا کی چند مقبول زبانوں میں اردو کا نہ صرف شمار ہوتا ہے بلکہ ایسی زبانوں کی فہرست میں اردو کا مقام کافی اونچا ہی پایا جاتا ہے۔ اردو کو اس کا جائز مقام دلانے میں حال میں ایک خوش آئیند اور امید افزا پہل ہوئی ہے۔ اترپردیش کے بعد اب مدھیہ پردیش سے ہندی کے چند ادیبوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہونے سے ہندی کی ترقی میں کوئی

رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ دونوں زبانوں میں تال میل یا تعاون سے ان کی صحت مند انداز میں ترقی ہوگی۔ اس لیے ہندی کے بعض ادیبوں نے کھلے طور پر اردو کی حمایت و تائید کا اعلان کیا ہے۔ ہندی ادیبوں کا یہ ایک اہم درست اور مثبت فیصلہ ہے جس سے ہندی ریاستوں اور مرکزی حکومت کو اردو کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے بھی اس نئی تبدیلی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں ہم ہندی ادیبوں کے اس کھلے ذہن کی ستائش کرتے ہیں۔ وہیں ہمیں اردو ہندی اتحاد کے لیے چند اقدامات کرنے ہوں گے جو زبان آسان ہوگی وہ ہر ایک کی سمجھ میں آئیگی اور وہی مقبول اور ملک کی عام زبان ہوگی۔ ہندوستان میں عمومی طور پر جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اسے آپ ہندی کہہ لیجئے یا اردو حقیقت تو یہ ہے کہ یہی ملک کی عوامی زبان ہے فرق صرف رسم الخط کا ہے۔ بالفاظ دیگر اردو کا اصل مسئلہ رسم الخط کا ہے زبان کا نہیں زبان تو سبھی بولتے ہیں صرف لکھنے پڑھنے کا سوال ہے اگر رسم الخط کا مطالبہ ہم متحدہ طور پر پیش کریں اور قبول کروانے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اردو کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے اس مطالبے سے ہندی اور اردو میں ہم آہنگی اور ایک مشترکہ زبان کا فروغ بھی ممکن ہے۔ گاندھی جی ہندوستانی زبان کے حامی تھے۔ جواہر لعل شدھ ہندی کے خلاف تھے آج اتحاد و قومی یکجہتی اور لسانی عصبیت کے خاتمہ کے لیے جس آسان زبان کی ضرورت ہے اس تجویز سے اس کی تکمیل کا راستہ نکل آئے گا۔ ۱۲ اپریل کو وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے اردو صحیفہ نگاروں کی ایک جماعت کو اردو کے صحافتی مسائل پر گفتگو کی دعوت دی تھی۔ اس ملاقات میں زبان کا مسئلہ ساری گفتگو کی بنیاد تھا اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کے حوالے سے ان کی خدمت میں یہی تجویز رکھی تھی اس تجویز پر وزیر اعظم نے دریافت کیا تھا کہ اس کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ طریقہ سہل ہے لیکن اس پر عمل کرنے میں آپ کو دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ سہل طریقہ یہ ہے کہ دستور میں جہاں قومی زبان کا ذکر ہے وہاں ناگری رسم الخط کے ساتھ اردو رسم الخط کا اضافہ کیا جائے۔ گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے کہ دونوں

رسم الخط کا رواج ہو۔ اس طرح ملک میں ایک ایسی زبان مروج ہوگی جس کو ہر ایک بول اور پڑھ سکے گا۔ اور یہ بھی ملک کے قومی اتحاد اور ہم آہنگی کا باعث ہوگی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ممکن ہے کہ یہ تجویز سارے ملک میں فی الفور نافذ کرنے میں دشواری ہو اس لیے ایک آسان راستہ یہ ہوگا کہ شمال میں جہاں کانگریس کی حکومتیں ہیں اولاً ان ریاستوں کی سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم کرتے ہوئے اردو رسم الخط کو ناگری رسم الخط کے ساتھ شامل کیا جائے اردو کا مسئلہ درحقیقت ہندی ریاستوں کا مسئلہ ہے یہاں رائج ہو جائے تو سارے ملک میں اس کے رواج میں دشواری نہ ہوگی

گجرال کمیٹی نے بھی یہ بات دوسرے انداز میں پیش کی ہے۔ کمیٹی کی سفارش تھی کہ سارے ہندی منطقے میں نظم و نسق اور سرکاری کاروبار میں ایسے عہدہ دار مامور کیے جائیں جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں سے واقف ہوں متعلقہ سفارشات نقل کی جا رہی ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔

32. "In the Hindi Speaking States, Knowledge of URDU should be made Compulsory for Those who have to administer at various levels"

33 "Administrators Should be acquainted with the local minority language Incentive Should be given to learn atleast one minority language of the State In Hindi Speaking states, in particular, officers Should acquire Knowledge of Urdu also, and officials Knowing both Hindi and Urdu should be Suitably rewarded"

(S 100, S 101, S. 111)

اس تجویز کے مندرجہ سطور کو پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں رسم الخط کے ایک ساتھ چلنے ہی سے نہ صرف اردو زبان خطرات سے محفوظ بلکہ اس سے قومی اتحاد و ذہنی یگانگت اور قومی یکجہتی یقینی ہو جائے گی جس کی آ

آج ملک کو سخت ضرورت ہے۔ ہندی ادیبوں و شاعروں کا ایک دہے قبل اردو کے تعلق سے جو مخالفانہ رویہ تھا۔ اب اس میں تبدیلی آرہی ہے۔ نئے ہندی ادیب اور شاعر اب آسان زبان لکھ رہے ہیں۔ مشاعروں میں آسان زبان میں شاعری کی وجہ سے ہندی شاعر بے حد مقبول ہو رہے ہیں۔ فلم کے بعد اب ٹی۔ وی کی "آسان زبان" ادق ہندی کی جگہ لے رہی ہے فلموں کے بعد کوی سمیلن اور ٹی۔ وی ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی آسان زبان کا راستہ بنا رہے ہیں اس لیئے دونوں زبانوں کا باہمی تعاون آج ضروری ہوگیا ہے کیونکہ جنوب میں بالخصوص آندھرا پردیش اور کرناٹک میں علاقائی زبانوں کے فروغ اور علاقائی پارٹیوں کی تنگ نظری کے باعث ہندی سے مخالفانہ برتاؤ شروع ہوگیا ہے ان ریاستوں میں اردو اور ہندی کا تعاون ہندی ریاستوں اور ہندی کے قائدین اور حامیوں کے لیئے ایک لمحہ فکر ہے ملک میں عام فہم قومی زبان کی تشکیل کے لیئے اردو سے قرب اور تعاون نئے حالات کا تقاضہ بن گیا ہے۔ چونکہ علاقائی زبانیں ہندی کے خلاف ایک نئی قوت بن رہی ہیں۔ اس رجحان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندی اور اردو تنظیموں اور دانشوروں کو چاہیئے کہ وہ مل بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیں اور ایک مشترکہ حکمت عملی کے تحت آگے بڑھیں۔

یہ امر بھی باعث تشویش ہے کہ آج اردو کی لڑائی میں کچھ ایسے عناصر بھی سامنے آگئے ہیں جنہیں اردو تحریک سے کوئی زیادہ واسطہ نہ تھا اور نہ ہی وہ اردو تحریک کی نزاکت سے واقف ہیں۔ حال ہی میں ایک افسوسناک بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ بعض سیاسی جماعتیں اس مسئلہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اردو کے شاعر ادیب، دانشور اساتذہ مخلص و ہمدرد کارکن پیامات تقریروں اور نجی گفتگو میں جن خیالات کا اظہار کر رہے ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ مسئلہ کے حل کے لئے عمل سے زیادہ نظریاتی انداز فکر کا اظہار ہوتا ہے۔ جس دن یہ تضاد اور اختلافات ختم ہو جائیں گے اردو کا مسئلہ نئی عوامی قوت حاصل کر لے گا۔

آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو نے ملک بھر میں اردو کے مسائل کے حل کے لئے اہم کام انجام دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اتر پردیش میں اردو کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیئے ۲۲ لاکھ افراد کی دستخط پر مشتمل یادداشت صدر جمہوریہ کو پیش کی۔ سابق ریاست حیدرآباد میں اردو سرکاری زبان تھی ریاست کے انضمام کے بعد انجمن ترقی اردو نے

ملازمین کی علیحدگی اور دفاتر اور مدارس میں اُردو کے استعمال کے لیے عہد ساز کام انجام دیا۔ آندھرا پردیش کی تشکیل کے وقت بھی انجمن ترقی اردو نے مفادات کا تحفظ کیا۔ سرکاری زبان قانون کی منظوری سے لے کر ۱۹۷۷ء کے جامع جی او ۲۷۴ کی اجرائی تک انجمن کی خدمات نمایندہ اور موثر رہی ہیں اسی لیے اس دوران سیاسی جماعت کو یہ فریضہ انجام دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنی خدمات کا تسلسل جاری رکھے تاکہ اردو تحریک میں مرکزیت رہے اور اتفاق رائے مستحکم ہو سکے۔

اتر پردیش میں بھی انجمن ترقی اردو کی بے عملی کے باعث اردو رابطہ کمیٹی کو گذشتہ ہفتہ اپنا علیحدہ کنونشن منعقد کرنا پڑا۔ مگر اتفاق رائے اور مرکزیت [illegible] نمایندگی کا کوئی اظہار نہیں ہو سکا۔

گجرال کمیٹی کے ایک رکن اور آندھرا پردیش میں اردو تحریکات سے وابستگی کے باعث میرا یہ ایقان ہے کہ جس اتفاق رائے پر میں نے زور دیا ہے اور جس تجویز کو میں نے اس مضمون میں پیش کیا ہے موجودہ حالات میں ہندی اُردو تعاون جس کی جناب حامد صاحب نے دوسرے طریقہ سے کی اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔
ان کا تین نکاتی فارمولہ (۱) دوسری زبان سے تعاون کا حصول (۲) اُردو کے حقوق کو حاصل کرنا اور (۳) اُردو کی ترقی کے لیے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اب ان مسائل پر غور اور عمل کرنے کی شدید ضرورت ہے ——

گجرال کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن یہ رپورٹ آج بھی اُردو کے مسئلہ سائنٹیفک اور فوری حل تلاش کرنے میں بنیاد کا کام دے سکتی ہے گجرال کمیٹی کے ارکان جانتے تھے کہ اردو کے مسئلہ کو حل کرنے میں کیا مشکلات ہیں۔ اس لئے انھوں نے اردو کو درپیش دشواریوں، مخالفت اور رکاوٹوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی سفارشات مرتب کی تھیں یہ سفارشات میری نظر میں لسانی اقلیت کے مسائل کی سائنٹیفک بنیاد اور منشور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جسے اب مزید نظر انداز کرنا ملک میں اردو سے ناانصافی ہوگی اور ملک میں ایک عام اور مقبول زبان کی ترویج و فروغ میں بھی مجرمانہ تاخیر ہوگی۔

ہندوستان میں اردو بولنے والے افراد کی ریاست وار آبادی

مطابق مردم شماری سنہ ۱۹۸۱ء

ریاست کا نام	جملہ آبادی	مسلمان	اردو بولنے والوں کی تعداد
۱:- اندھراپردیش	۵۳، ۵۴ ۶۷۳	۴۵، ۳۳، ۷۰۰	۴۱، ۶۹، ۱۷۹
۲:- بہار	۶۹، ۹۱۴، ۷۳۴	۹۸۷۴، ۹۹۳	۶۹، ۵۵، ۸۳۸
۳:- گجرات	۳، ۴۰، ۸۵، ۷۹۹	۲، ۹۰۷، ۷۴۴	۶، ۰۹، ۰۵۶
۴:- ہریانہ	۱۲، ۹۲۲، ۶۱۸	۵، ۲۳، ۵۳۶	۲، ۲۷، ۲۶۰
۵:- جموں و کشمیر	۵۹۸۷، ۳۸۹	۳۸، ۴۳، ۴۵۱	۶، ۸۶۷
۶:- کرناٹک	۳۷، ۱۳۵، ۷۱۴	۴، ۱۰۴، ۶۱۶	۳۵، ۱۲، ۸۳۱
۷:- کیرالا	۲۵، ۴۵۳، ۶۸۰	۵، ۴۰۹، ۶۸۷	۱۲، ۲۲۸
۸:- مدھیہ پردیش	۵۲، ۱۷۸، ۸۴۴	۲، ۵۰۱، ۹۱۹	۱۱، ۳۱، ۲۸۸
۹:- مہاراشٹرا	۶۲، ۷۸۴، ۱۷۱	۵، ۸۰۵، ۷۸۵	۴۳، ۱۹، ۰۶۷
۱۰:- اڑیسہ	۲۶، ۳۷۰، ۹۳۰	۲۰، ۲۶۹	۳، ۸۱، ۷۰۶
۱۱:- پنجاب	۱۶، ۷۸۸، ۹۱۵	۱۶۸، ۰۹۴	۳۴، ۵۷۵
۱۲:- راجستھان	۳۴، ۲۶۱، ۸۶۲	۲، ۴۹۲، ۱۴۵	۷، ۲۵، ۴۰۲
۱۳:- ٹاملناڈو	۴۸، ۴۰۸، ۰۷۷	۲، ۵۱۹، ۹۴۷	۸، ۶۴، ۸۱۱
۱۴:- اترپردیش	۱۱۰، ۸۶۲، ۰۱۳	۱۷۶۵۷، ۷۳۵	۱، ۰۷، ۹۷، ۱۷۵
۱۵:- مغربی بنگال	۵۴، ۵۸۰، ۶۴۷	۱۱، ۷۴۳، ۲۵۹	۱۲، ۰۰، ۲۱۶
۱۶:- دہلی	۶، ۲۲۰، ۴۰۶	۴۸۱، ۸۰۲	۳، ۶۲، ۹۳۵
۱۷:- دمن اور دیو	۱، ۰۸۶، ۷۳۰	۴۸۱، ۸۰۲	دستیاب نہیں
۱۸:- لکشدیپ	۴۰، ۲۴۹	۳۸، ۱۷۳	۲۶
۱۹:- پانڈیچیری	۶۰۴، ۲۴۹	۳۰، ۶۴۳	۴، ۱۷۶
۲۰:- ہندوستان کی مجموعی آبادی			۶۶۵، ۲۸۷، ۸۴۹
مسلم آبادی			۷۵، ۵۱۲، ۴۳۹

محمد اسحاق[1]

رزیڈنشیل اسکولوں کی اہمیت وافادیت

آندھرا پردیش ملک میں واحد ریاست ہے، جہاں پہلے ۱۹۷۱ء میں نگلو میڈ
اسکول ضلع نلگنڈہ کے ایک موضع "سرویل" میں قایم کیا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ
کے وہ ذہین طلبار جو معاشی نکبت کی وجہ سے بہتر تعلیم حاصل نہیں کرسکتے، انھیں ا
کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک کا یہ زرخیر سرمایہ یوں ہی ضایع ہونے نہ پا
دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ ذہین طلباء کی تلاش میٹرک کے بعد نہیں بلکہ ابتدائی عمر ہی میں
شریک کرلیا جائے تاکہ ان کی تعلیم ابتدائی جماعتوں ہی سے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔
پبلک نظام تعلیم میں یہ تبدیلی ایک انقلاب سے کم نہیں، حکومت کا کام اب تک یہ
یہ تھا کہ دیہاتوں اور شہروں میں اسکول کھول دیے جائیں، جو طلباء چاہیں شریک ہو
آزادی کے بعد اسکولوں اور طلبار کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ کمیت میں ا
کے ساتھ معیار تعلیم کا بہتر ہونا ضروری ہے کیونکہ حکومت کے وسائل محدود ہو
شہری علاقوں میں صاحب ثروت لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار کے انگ
میڈیم اسکولوں میں پڑھاتے ہیں، دوسرے الفاظ میں وہ تعلیم کو خریدتے ہیں اس
کوئی شک نہیں کہ تعلیم جتنی مہنگی ہوگی، اتنی ہی بہتر ہوگی، سستی تعلیم اتنی ہی غیر
ہوگی۔ آج کل تعلیم خود ایک انڈسٹری میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ "سرویل" کا تجربہ
رہا، اس کی اہمیت وافادیت کو رفتہ رفتہ تسلیم کرلیا گیا۔ ملک کا وہ غریب ا
بدقسمت طبقہ جن کے بچے نہایت ذہین اور ملک کے لئے اثاثہ ثابت ہو
وہ بن کھلے مرجھا نہ جائیں۔ وہ محض اچھی اور سچی تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے پس

---

[1] ریٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدر آباد - اے پی

بڑھ کر شہر جاتے ہیں ۔ ورنہ تجربے سے یہ ثابت ہے کہ شہری علاقے کے طلباء کی طرح انھیں مساوی مواقع دیے جائیں تو وہ بہترین معیاری اور مقابلے پر آسکتے ہیں۔ آج رہائشی اسکولوں کی جڑیں اس ریاست کی سرزمین میں بہت گہری اور دور تک پھیل چکی ہیں۔ اس وقت مختلف اضلاع میں ۹۰ میٹرک کی سطح کے ۴ انٹرمیڈیٹ کی سطح کے اور ایک ڈگری کالج کے معیار کے تلگو میڈیم اقامتی اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ اس اسکیم کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر جدید تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں مرکزی حکومت سارے ملک کے ۴۰۰ اضلاع میں اپنے اخراجات سے اس نوعیت کے اقامتی اسکول کھولے گی جنھیں نوودیا ودیالہ کا نام دیا گیا ہے۔ اب تک سارے ملک سے قطع نظر مرکز کی جانب سے آندھراپردیش میں ۱۹ اسکول قائم ہو چکے ہیں

۱ داخلہ کا طریقہ کار :

ان اقامتی اسکولوں میں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے میٹرک کی سطح کی رہائشی اسکولوں میں سمتی کی سطح پر ابتدائی ٹسٹ لے کر ہر سمتی سے ۱۰ طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے پھر ان سب کا دوسرا ٹسٹ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ضلع کی سطح پر ٹسٹ لیتے ہیں ۔ داخلہ امتحان کے تین پرچے ہوتے ہیں۔ عام معلومات، تلگو اور حساب ہر پرچے کے ۵۰ نشانات ہوتے ہیں "کامیابی کے لیئے کم از کم ۱۵ فی صد یا ½۷ نمبر لینا ضروری ہے اس طرح ۱۵۰ میں جملہ نشانات ½۲۲ ضروری ہیں۔ یہ ٹسٹ پانچویں جماعت میں شرکت کے لیئے جوتھی جماعت کا کورس اور آٹھویں جماعت میں شرکت کے لیئے چھٹی اور ساتویں جماعت کا کورس پیش نظر ہوتا ہے ۔ پرچے ان ہی جماعتوں کے نصابی معیار کے ہوتے ہیں۔ جو طلباء ضلع کی سطح پر امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں میرٹ کے لحاظ سے پہلے ۴۶ امیدوار جماعت پنجم اور ۳۶ طلباء جماعت ہشتم میں شریک کر لیئے جاتے ہیں ان طلباء کے والدین کی سالانہ آمدنی ۱۲ ہزار تک ہونی چاہیے اگر اسی احاطہ آمدنی میں طلباء کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔

۲ طلباء کی صبح و شام :

تمام طلباء، اسٹاف، مدرسہ، پرنسپل کی کالج کے احاطہ ہی میں رہائشی ضروری ہے ٹیچرس ہی " ہاوز ماسٹرس" ہوتے ہیں۔ ان کا پروگرام صبح کے ۵ بجے سے شروع ہوتا ہے اور رات کے ½۹ بجے ختم ہوتا ہے ۔ صبح ½۷ بجے سے جماعتوں

میں تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ اور ۱۱ بجے ختم ۔ پھر ۲ ½ بجے سے شام پانچ بجے تک کی زیر نگرانی اسٹڈی کروائی جاتی ہے۔ کوچنگ ٹیوٹوریل لائبریری کلب مصروفیات میں کھیل کود اسکوٹنگ اور کلچرل پروگرام وغیرہ۔ اس طرح صبح سے شام تک منصوبہ کا پروگرام نہایت مصروف رہتا ہے۔

۳ اخراجات :

گورنمنٹ فی طالب علم سالانہ کوئی ۱۲ سو روپے صرف کھانے کے پر صرف کرتی ہے اور جونیر اور ڈگری رہائشی کالجوں میں سالانہ فی طالب علم ۱۸ سو منظور ہیں۔ مرکزی حکومت کے نو ودیا ودیالہ میں فی طالب علم ۲۴۰۰ روپے صرف جاتے ہیں۔

۴ نتائج کا شاندار ریکارڈ :

سال ۱۹۸۷ء میں میٹرک کے پبلک امتحان میں ریاست آندھرا پردیش ۴۷ رہائشی اسکولوں سے جملہ ۱۴۸۰ طلبا نے شرکت کی ان میں ۱۴۲۲ طلبا درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ صرف ۱۴ اسکولوں کے نتائج ۱۰۰ فیصد قدر کم رہے۔ ناگرجنا ساگر کے رہائشی انٹرمیڈیٹ کالج کے سرسری اعداد سے اندازہ ہوا کہ یہاں کامیاب ہونے والے سب طلبا کو ایم۔ جی۔ بی۔ انجینئرنگ کالجس، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، زرعی کالج ایم بی اے ایم۔ ایس۔ سی میں ہر سال داخلہ مل جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ نے ہوا کہ رزیڈنشیل اسکول سے آئے ہوئے طلبا کا معیار کافی اونچا ہے اور وہ اس امتیاز کو ان اعلیٰ کورسس میں بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ وہ اعلیٰ وارانہ کورسس ہیں جن میں اسکولوں سے آنے والے طلبا کو بہ مشکل ایک کو داخلہ مل سکتا ہے۔

اردو میڈیم رہائشی اسکول، حیدرآباد :

حکومت آندھرا پردیش نے گزشتہ سال شہر حیدرآباد سکندرآباد کے لئے اردو میڈیم رہائشی اسکول کے قیام کی منظوری دی جو اس وقت معروف ترین بازار "لاڑ بازار" میں واقع ہے۔ شہر کی مسلم آبادی کوئی کے قریب ہوگی اور اردو میڈیم سے پڑھنے والے طلبا کی تعداد

لیکن افسوس ہے کہ پہلے سال داخلہ امتحان میں شرکت کے وقت آخری تاریخ تک
۲ درخواستیں ہی وصول ہوئیں۔ اس سال بھی ٹیسٹ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد حوصلہ شکن
وہ تو محض علم دوستوں کی کوششوں سے ان دو برسوں میں پانچویں اور آٹھویں جماعت
۲۶' ۲ طلباء کو شریک کر دیا گیا۔ اس سال تو ۱۵ نشستیں خالی ہیں ان میں ۷ طلباء
ہیں جو ۱۵ فیصد یا ۵۰ میں سے ½۷ نمبرات بھی نہ لے سکے اور ۸ طلباء اسکول
غائب ہو گئے۔

اہمیت و افادیت =

اردو میڈیم رہائشی اسکول جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان
یہ پہلا اسکول ہے۔ اس کا سہرا موجودہ حکومت کے سر ہے۔ ۱۴ ر ڈسمبر ۱۹۸۷ء
مسٹر نے نظام آباد، گلبرگہ اور کرنول میں ایک ایک اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکول کے
اعلان کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سارے حضرات جنھوں نے اسکولوں کے
منظوری کے لیے کوشش کی ہے، وہ سب اردو داں طبقے کے شکریے کے
ہیں۔

قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھاریٹی نے ہر طالب علم یونیفارم کتب
روق کے لئے چھ سو روپے منظور کر کے ایک مستحسن اقدام کیا۔ اس اسکول کا
اگر مبالغہ نہ سمجھو تو ایسا ہے کہ کسی نے میڈیکل کالج یا انجینئرنگ کالج کھول دیا ہے۔
وجہ یہ ہے کہ ان کالجوں میں انٹرمیڈیٹ کے بعد ٹسٹ پاس کرنے کے بعد
ہے لیکن جو بچہ رہائشی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ کا مستحق ہو گیا وہ ان
آٹھ سال قبل ہی داخلہ پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔ وہ خود آپ اپنی جگہ حاصل
گا کیوں کہ اس کی تعلیم کی بنیادیں ٹھوس چٹان پر ہوتی ہیں، ریگستان کی ریت پر نہیں۔
لتی امتحان میں وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ شریک ہو سکے گا۔

عدم دلچسپی کی وجوہات =

زیادہ تفصیل میں گئے بغیر اس اسکیم سے عدم دلچسپی کی دو وجوہات سمجھ
ں۔ ایک تو عام اردو داں طبقہ اقامتی اسکولوں کی افادیت سے قطعاً ناواقف
زیادہ حیرت کا مقام ہے۔ کہ اردو میڈیم کے ہیڈ ماسٹرس کو بھی
معلومات؟ ایسے نام بھی نہیں ہیں۔

دوسری بنیادی وجہ عام مسلمانوں کا رجحان رہا ہے کہ حکومت کی ہر نئی اسکیم کو سمجھنے اور پانے میں کئی برس ضایع کر دیتے ہیں۔ ان کی بے حسی اور لاپرواہی فطرت بن چکی ہے۔ اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ داری قیادت کے فقدان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

اُردو میڈیم رہائشی اسکول سے متعلق عام تاثرات:

گذشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں میں ساری ریاست بھر میں کبھی کسی اُردو میڈیم اسکول کے نتائج اچھے نہیں رہے۔ شہر کے بعض اردو میڈیم کا نتیجہ کئی برسوں سے میٹرک میں صفر چلا آرہا ہے۔ یہ اسکول آج بھی اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اردو میڈیم رہائشی اسکول سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ حال ہی میں جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے میرے نام ایک خط میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اردو میڈیم رہائشی اسکول حیدرآباد کے دوسرے سال بھی طلباء کی تعداد کم ہونے کی وجہ پہلے سال کا خراب معیار تعلیم ہو سکتا ہے۔ یہاں عرض کرنا ضروری ہے کہ ذریعہ تعلیم ہمیشہ مادری زبان ہی ہونا چاہیئے۔ چاہے وہ اردو ہو یا تلگو۔ معیار تعلیم سے قطعاً اس کا تعلق نہیں، بلکہ مادری زبان ہی اعلیٰ معیار تعلیم کی سو فیصد ضامن ہو سکتی ہے۔ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم کا یہی خیال ہے۔ تعلیم مادری زبان کے ذریعے جتنی اچھی اور خالص ہوتی ہے وہ کسی اور زبان کے ذریعے ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ مادری زبان بچہ ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے (ذاکر حسین) زبان جسم و جان، رگ و پے، خون و پوست میں جذب ہو کر اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ دوسری کسی زبان میں مہارت تو حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ جسم و روح کا حصہ نہیں بن سکتی۔ آخر وقت تک تصنع، بناوٹ اور غیر فطری پن سے گریز نا ممکن ہے۔

اردو میڈیم اسکولوں کے خراب نتائج اور زبوں حالی کی ذمہ داری بے چاری اردو پر ہرگز نہیں اس کے بالکل ہی دوسرے وجوہات میں اسکول کا انتظامیہ، ٹیچرس کی کمی، ٹیچرس کی عدم دلچسپی، والدین کی لاپرواہی ان کی غربت و فلاکت، اسکولوں میں فرنیچر، کھیلنے کے گراؤنڈ، پانی وغیرہ کا عدم انتظام، ایک ایک جماعت میں ۷۰، ۹۰ طلباء کا ہجوم تاریک کمرے وغیرہ۔ یہ سب اسکول نہیں چھوٹے بچوں کے لئے قید خانہ سے کم نہیں، جہاں پر روحانی و جسمانی اذیت میں کمسن طلباء مبتلا رہتے ہیں وہاں تعلیمی ماحول تو کیا خاک مل سکتا ہے، بلکہ یہ اسکول تعلیم سے نفرت پیدا کرنے کی فیکٹریاں

~~پیچھے~~ مسلم طلباء ابتدائی جماعتوں میں اگر ۱۰۰ شریک ہوتے ہیں تو میٹرک تک صرف
پاتے ہیں۔ (ہمدرد سوسائٹی کا سروے) ۹۰ فیصد ڈراپ آوٹ" انسانی وسائل
عظیم نقصان ہے۔ اگر حیدرآباد کے بعض انگلش میڈیم اسکولوں کا اچھا معیار ہے
یزی زبان" میں کوئی جادو نہیں ہے بلکہ وہاں کا بہترین انتظامیہ، ٹیچرس کی لگن بچوں
ن باپ کی غیر معمولی دلچسپی، خانگی ٹیوشن، بچے کے نام خارج کر دینے کا توقف
ا کی دلچسپی۔ یہ سب باتیں وہاں کے اچھے نتائج کے ذمہ دار ہیں ۔

مسلم طلباء کے داخلے کے لئے "نام" کی اسکیم:

نیشنل ایسوسی ایشن آف مسلم فاونڈیشن (NAM) حیدرآباد نے مسلم طلباء
ت سے متعلق سنجیدگی سے جائزہ لیا۔ جب کہ ۱۷ برس پہلے سے آندھرا پردیش
۱۰ رزیڈنشیل اسکولس میں کوئی ۳۰ ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں اور مسلم طلباء ان میں
ائے نام صفر کے برابر ہیں۔ چنانچہ صرف طلباء کے داخلے کو ایک مہم کے طور پر شروع
کے لیے اس سال ۲۵ ہزار روپے اس غرض کے لیے منظور کیے گئے۔ اس اسکیم کے
حال یہ ہیں

جہاں تک ممکن ہو اضلاع کے دیہات اور شہری علاقوں میں قائم اسکولوں کا
کرکے ایسے غریب اور ذہین طلباء کے نام اور پتے اکھٹے کیے جائیں جو اس
تھی، پانچویں جماعتوں میں تعلیم پا رہے ہیں ۔

ان طلباء کو رہائشی اسکولوں میں داخلے کے لیئے جو انٹرنس ٹیسٹ ہوتا ہے،
ن شریک کروایا جائے اور انھیں ٹیسٹ کے نمونے پر کم از کم دو ماہ کوچنگ
ا جائے ۔

کوچنگ کے لیئے ضروری لٹریچر تیار کیا جائے جو کوچنگ سنٹرس کے
ار طلباء کے لئے کارآمد ہو۔ اس قسم کے لٹریچر کی تیاری کے لئے ماہرین
مدد لی جائے ۔

رہائشی اسکولوں کی اہمیت و افادیت سے مسلم طبقہ قطعی ناواقف ہے۔
ے لیے تشہیری لٹریچر تیار کیا جائے اور یہ لٹریچر تعلقہ، ضلع اور قصبات کی
مختلف دینی، ملی، سماجی اور سیاسی جماعتوں کے ذریعے پہنچایا جائے۔
ہر ضلع سے ایک ایسی کمیٹی قائم کی جائے جو ان اسکولوں میں داخلے کے لیئے

ایک واضح پلان کے تحت کام کرتی رہے۔

۶ ۔ جو طلباء انٹرنس ٹیسٹ میں کامیاب ہو جائیں ان کے فارموں کی خانہ پری، ضروری سرٹیفکیٹس کی فراہمی اور جہاں ضرورت ہو تھوڑی بہت ان طلباء کی داخلہ فیس سے مدد کر کے انہیں رہائشی اسکولوں میں شریک کروایا جائے۔ یہ کام اس لیے ضروری ہے کہ اکثر والدین پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے لاپرواہی سے یہ قیمتی موقع کھو دیتے ہیں۔

یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آج کرنے کا کام یہی ہے۔ اس کے بڑے دور رس نتائج نکلیں گے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس کام میں مدد دیں اور اس کو ایک عملی تحریک میں تبدیل کرنے کے لئے وقت دیں۔ اس تحریک کے چلانے کے لئے بہت بڑے سرمایے کی ضرورت نہیں بلکہ ملی ہمدردی رکھنے والے سرگرم کارکن حضرات کی ضرورت ہے۔ دیہات کے غریب اور ذہین طلباء کے لئے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی میں اقامتی اسکولوں کا قیام ایک انقلاب سے کم نہیں۔ ★★

سلسلہ صفحہ ۱۰ ---

میں سمجھتا ہوں کہ شہر میں ہزاروں ایسے مرد اور عورتیں ہیں جو دل سے مسلمان ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا اعلان اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں رسم رواج کا لحاظ ہے اور وہ نکتہ چینی اور الزامات سے ڈرتے ہیں۔ اور اس اعلان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل سے بچنا چاہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اپنے پورے یقین کے ساتھ قبولِ اسلام کے اعلان کے بعد میرے بہت سے دوست احباب اور رشتہ دار یہ سمجھیں گے کہ میں بری طرح گمراہ ہو گیا ہوں اور کوئی نصیحت یا دعا مجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ یہ میرا اپنا عقیدہ نہیں بلکہ گزشتہ بیس برسوں سے میں اسی پر کاربند ہوں۔ صرف اعلان میں تاخیر ضرور ہوئی۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے اس اقدام سے میں پہلے سے زیادہ بہتر مسیحی بن گیا ہوں۔ میں اسے ہی مخلصانہ طور پر سیدھا راستہ سمجھتا ہوں اور میری یہ خواہش ہے کہ دوسرے لوگ بھی سعادتمندی کے راستہ کو اختیار کریں۔ جس میں کسی بھی صورت مسیحیت سے دشمنی کا شائبہ نہیں ہے۔

عبدالعلی*

طالبات کے لئے ایم پی سی کی اہمیت

اقلیتی طالبات مضمون ریاضی کے حصول تعلیم سے کترانے لگی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دیگر مضامین کے مقابلہ میں ریاضی کا جدید نصاب قدرے مشکل اور دقت طلب ہے۔ حکومت نے ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کی ترقیات کے نقطہ نظر سے سائنس و ریاضی کے نصاب کو بہت زیادہ معیاری بنادیا ہے۔ اس وجہ سے ماضی کی کاروباری ریاضی کی جگہ جدید ریاضی نے لے لی ہے جس کی وجہ سے طالبات میں یہ تاثر پیدا ہوگیا ہے کہ ریاضی از خود بہت مشکل مضمون ہے۔ مضمون ریاضی میں اہل اساتذہ کی عدم دستیابی بھی طلباء کی ریاضی میں غیر دلچسپی کا باعث بن گئی ہے۔

یہ جان کر بہت تعجب ہوگا کہ شہر حیدرآباد میں جی۔ ایڈ کورسس سال ۸۹-۱۹۸۸ء میں تین اقلیتی جی۔ ایڈ کالجس میں ایک فیصد طالبات نے بھی ایم پی سی کو نہیں اپنایا ہے اگر یہی صورت حال رہی تو ہمارے تعلیمی اداروں میں ہائی اسکولس کی سطح پر ریاضی۔ فزکس اور کیمسٹری کی تدریس کے لئے اساتذہ کہاں سے دستیاب ہونگے۔ بدقسمتی سے طالبات کی کثیر تعداد انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ایم پی سی گروپ کو اختیار کرنے سے گریز کرتی ہے۔ اب جبکہ ہر میدان میں عورت مردوں سے مسابقت کر رہی ہے افسوس ہے کہ حیدرآباد کی طالبات کی بہت ہی قلیل تعداد انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ایم پی سی گروپ میں تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل ہے۔ میرے ناچیز خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ طالبات کو بچپن ہی سے مستقبل شناس نہیں بنایا جاتا ہے جبکہ طالبات کے ذہن میں یہ بٹھلایا جاتا ہے کہ آخرکار انھیں شادی کر کے گھر بسانا ہے۔ اور ایک معمولی سی ڈگری ان کے لئے کافی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہائی اسکولس اور کالجوں میں ریاضی کی تدریس کے لئے قابل اساتذہ عدم دستیاب ہیں جس کی وجہ سے ریاضی کی تعلیم دینے کی

---

* رکن انتظامی مدینہ پبلک اسکول حیدرآباد اے پی

ذمہ داری غیر ریاضی داں اساتذہ پر ڈالی جاتی ہے۔ جو کسی بھی صورت میں اس سے انصاف نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ کالجوں کی سطح پر ریاضی، فزکس اور کیمسٹری کے مضامین کی تدریس کے لئے خاتون لکچررس نہیں دستیاب ہو رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر طالبات کا ایم پی سی گروپ کی تعلیم سے گریز کرتی ہیں اور اکثر طالبات بی پی سی گروپ کو ترجیح دیتی ہیں کیوں کہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ بی۔ پی۔ سی گروپ کی وجہ سے انھیں میڈیسن میں داخلہ حاصل ہو سکیگا مگر طالبات کا ایک فیصد بھی بڑی مشکل سے میڈیسن میں داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے اور مابقی طالبات مجبوراً بی پی سی گروپ سے بی ایس سی کی تکمیل پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ جس سے ان کا کوئی شاندار مستقبل نہیں بن سکتا ہے۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ایم پی سی گروپ سے تعلیم ان کے مستقبل کو درخشاں بنا سکتی ہے۔ ڈگری کی سطح پر ایم پی سی گروپ کی تعلیم کے حصول کے بعد طالبات ریاضی، کیمسٹری اور فزکس کے کسی ایک مضمون سے پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کر لیں تو ان کو بہتر مستقبل کی ضمانت مل سکتی ہے۔ خصوصاً طالبات تدریسی پیشہ کو اختیار کر سکتی ہیں جس کی بہت مانگ ہے۔ وقت کا اہم تقاضہ یہ ہے کہ طالبات انٹرمیڈیٹ کی سطح پر ایم پی سی گروپ اختیار کرنے کو ترجیح دیں۔ میری دانشوران شہر اور ماہرین تعلیم اور اولیائے طالبات سے گذارش ہے کہ طالبات میں مضمون ریاضی کی اہمیت اور اس کی افادیت کو ان کے ذہنوں میں مرتسم کریں اور اس کے علمی اور معاشی فائدے سے انھیں واقف کروائیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ طالبات انٹرمیڈیٹ سطح پر ایم پی سی گروپ اختیار کرنیکو ترجیح دیں، تو وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

سلسلہ ص ۱۵ :-

خیریت تھی - مہاتما گاندھی اور قائد اعظم کی نسبت سے توجی سہم سا گیا

فروغ تجلی لبوں ترد پہ ہم (ص ۱۴۳)

خواجہ احمد فاروقی کے مکتوبات میں ان کے شاعرانہ رنگ کے علاوہ ایک منفرد ادبی لب و لہجہ ہے اور ساتھ ہی ان کی گوناگوں ادبی سرگرمیوں کی آئینہ دار بھی۔ دیگر مشاہیر کے خطوط ان کی روز مرہ زندگی کی مصروفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد عبدالقادر نے ان خطوط کی اشاعت سے اردو زبان و ادب کی ایک نمایاں خدمت کی ہے۔

ڈاکٹر محمد انور الدین

ابن نشاطی اور پھول بن

(قسط دوم)

پھول بن میں کردار نگاری۔ ابن نشاطی نے واقعہ نگاری بھی خوب کی ہے۔ اس مثنوی میں سب کردار اپنے تمام تر انفرادی وجود کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں اور چند کردار تو یقیناً ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ اور ہماری یادداشت کا حصّہ بن جاتے ہیں، جیسے تمہیدی قصّے میں درویش کی تصویر۔

سو دیکھا خواب میں درویش کامل ایک — دنیا کے عاقبت اندیش کوں ایک
ہے تن پہ پیرہن اُجلے چھبیلے — کمر باندیا ہے یک باریک سیلے
بندیا ہے چھوڑ شملا سر پہ دستار — عصا پکڑیا ہے یک رنگیں طرح دار
لیا ہے ہات میں اپنا مصلا — ریاضت سوں کیا ہے دل مصفّا
اگرچہ لعو سوں تھا سب آنگ خالی — ولے سجدے کی تھی اس مکھ پہ لالی
کھڑا ہے آگے یوں دربار انگے وو — شہنشہ کے مبارک دار انگے وو
کھلے اچھتے ہیں جوں بہریک کئی آ — رضا کی انتظاری سمات گویا

اسی طرح کی تصویریں اس مثنوی میں بار بار ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کسی عورت کا جوگن کی وضع اختیار کرنا قدیم ہندوستانی حالات میں مناسب ترین طریقہ تھا اور ابن نشاطی نے ایک ایرانی شہزادی کے کردار کو ہندوستانی روپ میں کس کامیابی سے پیش کیا ہے

سے بھبوتی اپنے موں کو پھر لگا کر — ہنم کا چاند بادل میں چھپا کر
برہ کے درد دکھ سوں پرسی ہو — چلی بوا اس لیے بیراگتی ہو
پڑی دکھ غم کی آ سینے اُپر سیل — چلی پھرتی جنگل کی ہو کوئیل
یو نازک نازکی ناری تو یلی — یہ تازک چھند کے چھب کی چھبیلی
کہ جیا چند ن لگاتی تن کوں دو نار — لگے چند ہو کر تن پہ اُسے بھار
وہ ایسی نازکی تے ہات دھو شوخ — دیکھو نکلی ہے کیوں پردیس رے شوخ

اسی طرح ستونتی کا کردار بھی ہمارے ذہن پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اور ایک اچھا اور دیرپا تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ ابن نشاطی کا فن ان

کرداروں کی تصویر کشی میں بہت ہی کامیاب ہے ۔ اور یہیں دکن کی دوسری مثنویوں کے نسوانی کردار جیسے مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" میں چندر بدن کا کردار نصرتی کی مثنوی "گلشن عشق" میں مدمالتی کا غواصی کی مثنوی "مینا ستونتی" میں مینا کا کردار یاد آجاتا ہے ابن نشاطی نے سمن بر اور ستونتی کی کردار نگاری میں دکنی ادب کی روایات کا بھی خیال رکھا ہے گو کہ سمن بر فارسی ادب کے معاشرے کا کردار ہے لیکن وہ یہیں جاندار جاتا پہچانا معلوم ہوتا ہے ۔

پھول بن کے دوسرے قصے کا اہم کردار رانی ستونتی ہے جو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت اور حسن عمل سے بھی مالامال ہے وہ اپنے شوہر سے والہانہ محبت کرتی ہے اسی کے ساتھ وہ وفادار، پاک دامن اور عفت وعصمت کا پیکر ہے یہ پھول بن کا ایک مثالی کردار Ideal Character ہے ابن نشاطی نے بہت ہی موثر انداز میں اس کی تصویر کشی کی ہے اسی طرح پھول بن کے تیسرے اور آخری قصے میں عجم کی شہزادی سمن بر کا کردار بھی ستونتی سے کسی طرح کم نہیں ۔ وہ بھی ستونتی کی طرح اپنے محبوب سے والہانہ محبت رکھتی ہے اور آخر دم تک اسی کی وفادار رہتی ہے اس کا کردار اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب وہ اپنے محبوب کی موت کی خبر سنتی ہے ۔

سمن بر جب سنی یوں بات اس کے غرق ہونے کی — نکل تن تے گیا جیو سب، ہوئی بیتاب بے جانی
پڑی غش ہو منڈی لے ڈھال کر یوں — ہرن جوں تیر کھایا سو پڑتے تھوں
لگی پھوڑنے چھاتی مار چھاتی — [illegible] اجو پھر پھوڑاتی
ہوا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوت تھوں پھوٹ — لگی لینے دکھوں سر ہو اسینا کوٹ
لگی بارے نمن مانی اڈرانے — لگی بادل نمن رو رو بلانے
دریغی سوں لیتی بال آپنے نوچ — کجل انجواں سوں انکھیاں کا ستی پونچ
انگاراں سوں انجو کی نین گئے جل — ہوئے جل کر دو نیناں جو کہ کاجل
پڑا واتن پوتے اپنے کری دور — کنگن ہور چوڑ ہاتاں کے کری چور

پھول بن میں کردار نگاری کے تعلق سے ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابن نشاطی کو کردار نگاری پر مکمل عبور حاصل تھا اس نے مختلف کرداروں کی بہت ہی جاذب نظر اور متحرک تصویر پیش کی ہے اور یاد رہے کہ یہ تصویریں بہت چھوٹی ہیں۔

پھول بن میں مرقع نگاری اور تہذیبی بیانات:۔

پھول بن کی ایک نمایاں خوبی اس کی مرقع نگاری اور تہذیبی روایات کا بیان ہے۔ اس میں مرقع نگاری تخلیقی و ادبی دونوں سطح پر کامیابی سے کی گئی ہے۔ ابن نشاطی کا شاعرانہ بیان اُسے بہت ہی دلچسپ اور پر لطف بنا دیتا ہے۔ یہاں، مرقع نگاری میں شاعری کا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ بقول عبدالقادر سروری قدیم قصوں کی مقبولیت کا ایک اہم عنصر بھی یہی مرقعے اور ان کے اظہار کی بے ساختگی ہے۔ یہ نہایت جزوی تفصیلات پر حاوی ہوتی ہے۔ جیسے:۔ پھول بن میں جہاں خط لکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں محض یہ کہہ کر بات آگے نہیں بڑھائی جاتی کہ خط لکھا گیا اور اس کا مضمون یہ تھا بلکہ اس میں منشی کو طلب کرنے، اُس کے بیٹھنے کی وضع، قلم کی خوبی، کاغذ کا رنگ، روشنائی کی خصوصیت، القاب کے لوازم اور سب سے بڑھ کر مضمون کی سادہ پُرکاری ایسے جزئیات ہیں جو خط کو بھی ایک زندہ چیز بنا دیتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی جزئیات میں ایک حد تک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ بعض اور مثنویوں کی طرح پھول بن کی فضا پورے طور پر ایک نصب العینی فضا نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پس منظر اُسی زمانے کی عوامی اور درباری زندگی ہے۔۔

مثلاً ابن نشاطی جہاں سمن بر کے جزیرے کے محل کا نقشہ کھینچتا ہے اس کی دیواروں پر قطب شاہی بزم کی تصویریں دکھاتا ہے۔ اسی طرح سندھ کے بادشاہ کی طرف سے جب اس کا وزیر، شہزادی سمن بر کو شہزادے ہمایوں فال کی موت کی خبر سناتا ہے تو سمن بر کی حرکات و سکنات کا جو نقشہ کھینچا ہے اسی میں بڑی حد تک خود اس کے ماحول کا عکس موجود ہے۔ ابن نشاطی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مرقع نگاری کے فن کو برتتے ہوئے کبھی جزئیات نگاری نظر انداز نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے دور کی معاشرتی تصویروں کو بھی ابھارتا ہے اسی اعتبار سے پھول بن میں تہذیبی نوعیت کے کئی بیانات ملتے ہیں۔ تہذیبی بیانات مرقع نگاری کا حصہ ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر زور "پھول بن میں قطب شاہی دور کی معاشرتی تصویریں پائی جاتی ہیں" ان تہذیبی بیانات میں شادی بیاہ کی تقاریب کی رسومات کا جہاں ذکر ہے۔ وہ بالکل نیچرل اور حیات انسانی کے بالکل مطابق ہے۔ ان مرقعوں اور مناظر کے پہلو بہ پہلو پھول بن میں کے وہ مرقعے بھی ہیں۔ جن کا مقصد محض شاعرانہ کمالات دکھانا ہے۔ ان میں وہ مرقعے بھی شامل ہیں جو استان گوئی کی خصوصیت سمجھے

جاتے تھے ہیں ۔ جیسے جہاں کھانوں کا ذکر آتا ہے ۔ تو ابن نشاطی داستان گویوں کی طرح کھانوں کی کل قسمیں گنا کر ہی دم لیتا ہے ۔ اسی طرح جہاں ہتھیاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ وہاں وہ ہر طرح کے ہتھیاروں کا ذکر ضروری سمجھتا ہے ۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پھول بن میں ابن نشاطی نے ادبی انداز میں گولکنڈہ کے معاشرت کی مرقع نگاری کی ہے ۔

پھول بن میں جزئیات نگاری :- پھول بن میں ابن نشاطی نے موقع و محل کی مناسبت سے اپنی وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے ۔ اسے پڑھ کر میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ ابن نشاطی میر حسن ہی کی طرح جزئیات پر قادر تھا ۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کا قدیم داستان گویوں میں پایا جانا اس لیئے ضروری تھا کہ داستانوں کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر تھا ۔ پھول بن کی پہلی داستان میں جب تاجر زادہ اپنے والد کی تجارت کا ذکر کرتا ہے تو اس موقع پر ابن نشاطی کپڑوں کی مختلف اقسام مثلاً حریر، سالو، مشجر، سمور، خطائی، کربلائی اور اطلس وغیرہ کا ذکر کرتا ہے ۔ اور یہ دکھانے کے لیئے کہ وہ تاجر اپنی تجارت کے سلسلے میں کن کن ہنروں میں جاتا تھا ۔ ابن نشاطی مختلف شہروں کے نام بھی بے تکان گنتا چلا جاتا ہے ۔ اسی طرح جب وہ دوسری داستان میں نقلِ روح میں راجہ کے شکار کا ذکر چھیڑتا ہے تو وہ مختلف چرندوں اور پرندوں کی ایک طویل فہرست پیش کر دیتا ہے ۔ جب تیسری داستان میں شاہ سندھ مچھلیوں کے شکار کے بہانے نجم کی شہزادی سمن بر کو دیکھنے کے لیے کشتی میں روانہ ہوتا ہے ۔ تو اُس وقت ابن نشاطی مچھلی کی مختلف قسموں کا ذکر کرتا ہے ۔ آگے چل کر وہ مالن کے ذکر میں مختلف گجروں اور ہاروں کے نام بھی بے تکان گنتا ہے اور بزم عیش کے بیان میں مختلف سازوں مثلاً طنبورہ، رباب، دف، جھلا جھل (جلاجل) وغیرہ وغیرہ کے ناموں کی تفصیل پیش کر دیتا ہے ۔

پھول بن میں جذبات نگاری :- پھول بن کی ایک بنیادی خصوصیت اس کی جذبات نگاری ہے ۔ ابن نشاطی نے بہت ہی پر کشش انداز میں مختلف کرداروں کی جذبات نگاری کی ہے ۔ جس کی وجہ سے جذبات نگاری مثنوی کے فن کا ایک حصہ بن گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مثنوی اعلیٰ درجہ کا ایک شاہکار بن گئی ۔ ابن نشاطی کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے انسانی جذبات کی عمدہ تصویر کشی کی ہے ۔ خصوصاً عاشق و محبوب، شوہر و بیوی کے علاوہ بادشاہ اور وزیر کے جذباتی و نفسی تعلقات کی تصویر کشی بہت ہی موثر انداز میں

کی گئی ہے اور یہ تصویریں بڑی جاذب نظر اور دل کو چھو لینے والی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ شعر

سمن بر تین دن تھی دکھ میں پڑ کر # رہی تھی پیو کے بچھڑے سوں اڑکر
نہ سُک تھا دیس کوں نا نیس کو آرام # بیتے تھا روئے بن دو جا تھا کام
لگیا سو پیو کے بچھڑے سوں پردیس # کرتی بھڑکیاں سوں دل کی رات کو دیس
نہ دیکھ سکی سو زدل کا عشق کے ساتھ # دھویں سوں آہ کے دن کوں کری رات
سجن کوں یاد کرتی غم سو روتی # گہر انجواں کے بن دھاگے پروتی
لگی یوں بول کر آپس میں روتے # دریکھی سات لکھ انجواں سوں موتی

مندرجہ بالا اشعار میں شہزادی سمن بر کے جذبات کو پیش کیا گیا ہے۔ محبوب سے جدائی ان اشعار کا موضوع ہے۔ جدائی کے ردِ عمل سے جو ذہنی اور جذباتی کیفیات پیدا ہوگی ہیں۔ ان کا شاعرانہ استعمال ابن نشاطی نے بہت ہی موثر انداز میں کیا ہے۔ جدائی کے منظر کی ایک اور تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ نظم

گرفتار اس جو پھاندے میں ہوا جب # لگیا یوں گل سوں کہتے کر مخاطب
کہ اے جیو کے مرے ساقی، سنگاتی # اے راحت روح کی اے دل کے ساقی
ترے رُخ سوں تھے روشن تھی میرے # تیرے لب سوں تھے تیرتیں بین میٹھے
اٹھا تج دھر کے تازہ بھرنگ میرا # جدائی میں تری ہے مرگ میرا
جدھر تھی توں ادھر سنگات تھا میں # ہر ایک دن رات تیرے ساتھ تھا میں
میں سنپڑیاں ہوں سو غم نیں مجہ کوا ے جور # یہی غم ہے جو میں تجہ تے پڑیا دور

(باقی آئندہ)

سلسلہ صفحہ ۱۸ ۔

...ل الکبیر کی جنگ میں اعرابی کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور انگریزوں کو خطرہ نہیں ...ہا تو افغانی کی نظر بندی ختم ہوئی۔ ۱۸۸۲ء کے آخر میں وہ کلکتہ سے روانہ ہو کر ...ندن پہنچے اور وہاں مختصر قیام کے بعد پیرس چلے گئے جہاں ان کی زندگی اور عملی ... جد کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

+ +

پیکرِ خیال

مصنف :- شیخ حسین سعد صدیقی
ناشر :- پیرا ماؤنٹ ایجوکیشن بورڈ
خیرت آباد حیدرآباد
طبع اول ۱۹۸۸ء

ضخامت ۱۹۲ - ص
قیمت :- ۲۵ روپیے -
طباعت :- ڈائمنڈ پریس کوچہ نسیم منڈی میر عالم حیدرآباد
تبصرہ نگار :- ڈاکٹر محمد منصور خان
(پروفیسر پی جی کالج بھینسہ واڑہ)

"پیکرِ خیال" شیخ سعد حسین سعد صدیقی کے انگریزی سے اردو انگریزی میں منظوم تراجم اور اُردو کلام کا مجموعہ ہے - اس کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - حصّہ اول یعنی "آئینۂ خیال" میں سورۂ فاتحہ کو اُردو اور انگریزی میں منظوم کرنے کے علاوہ انگریزی اور امریکی شعراء کے کلام کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے - اسی حصّہ میں ایک حدیث شریف کو اُردو اور انگریزی میں اور غالب کی ایک غزل اور خود اپنی اُردو میں شعری تخلیقات کا بھی میں اُردو سانٹ اور چند دیگر نظمیں شامل ہیں، منظوم انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے -

اس تصنیف کا دوسرا حصّہ یعنی "رعنائی خیال" سعد کے اُردو کلام پر مبنی ہے جس میں سلام، نعت، منقبتیں، غزلیں اور نظمیں شامل کی گئی ہیں - اور اسمیں لطف پیدا کیا گیا ہے -

کتاب کی ابتداء میں سعد کے ترجموں پر پروفیسر سیدہ جعفر کے مختصر نوٹ کے علاوہ سعد کی شخصیت اور شاعری پر پروفیسر یوسف سرمست کا ایک طویل اور بسیط مقدمہ ہے - ان کے علاوہ مابعد کے صفحات پر خود مصنف کے انگریزی کی شاہکار نظموں کے منظوم اُردو تراجم کے متعلق دو نثری مضمون زیب قرطاس ہیں جن میں ان شاہکار نظموں کا خلاصہ اور ان کے محاسن پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے -

سعد طبعاً شاعر واقع ہوئے ہیں اور شاعرانہ ماحول میں تربیت بھی پائی ہے - ان کے منظوم تراجم اور اُردو کلام میں اس فطری موزونیٔ طبع کا ایک سیلاب سا امڈتا نظر آتا ہے جسے علم العروض سے نابلدی روکنے سے قاصر رہی - انہوں نے یہ اعتراف

یا ہے کہ ۱۹۸۳ء تک وہ عروض سے نا واقف تھے ۔ انہوں نے جو آیاتِ قرآنی ' غالب کی ایک
زل اور خود اپنی چند نظموں کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا اس کے متعلق ایک اور
زانی کوتاہی سے گریز کیا ہے ' ممکن ہے غیر دانستہ طور پر - انگریزی میں ان کے یہ منظوم
رجمے انگریزی عروض (Prosody) اور بحروں (metres) پر پورے نہیں اترتے ۔
گریزی بحروں کا سارا دارو مدار Stressed & unstressed syllables
ہوتا ہے جن سے (feet) کی تشکیل ہوتی ہے ۔ ان کے مخصوص اشعار پر بحروں کا تعین ہوتا ہے۔
stres. کا علم ایک بحر ذخار ہے اس سے سعد کے ترجموں کی افادیت ، انکی موزونیت
وش لفظیت اور روانی سے انکار مقصود نہیں ہے ۔ انگریزی زبان و ادب سے نابلد اردو
اں طبقہ کے لئے یہ ایک گرانقدر خدمت ہونے کے علاوہ اردو ادب کی بیش بہا خدمت بھی ہے۔

منظوم ترجمہ کے متعلق جہاں عمومی طور پر وضع اصول کرنا یا اظہار رائے
سہل ہے وہیں مترجم کیلئے مداری کے ہوا میں معلق رسّی پر چلنے کے فن (Trapeze) سے کم
ال نہیں ہے ۔ اصل کے خدو خال کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھنا اور ساتھ ہی ترجمہ کی زبان میں
ماثل لفظی ڈھانچے (Idiom) ڈھونڈھنا کچھ اسی طرح کا کام ہے ۔ پھر سعد کا یہ حتمی طور پر کہنا
کہ "اردو کے مزاج میں جو شعریت رچی بسی ہے وہ انگریزی کو بھی نصیب نہیں" غالباً ایک ایسی
لوی اور متعصب رائے (Prejudice) کہے جو ایک مادری زبان بولنے والا دوسری زبانوں
کے بارے میں رکھتا ہے ۔ اس میں ایک لطیف سا فرق یہ ہے کہ شعریت ہر زبان میں بدرجہ ء
تم موجود ہوتی ہے ۔ (خصوصاً انگریزی شاعری سے گہری دلچسپی اور اس کے وسیع مطالعہ کی
ت تو کجا ' خاطر خواہ واقفیت ہی سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگی ۔) البتہ اس شعریت کا
ظہار اور اس کی ادائیگی ہر زبان میں اس کے تہذیبی اور معاشرتی ڈھانچے کے مطابق مختلف
نوع ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر تغزل کا اظہار اردو شاعری میں اس کے تہذیبی پس منظر
یں جس والہانہ جذباتی انداز میں ہوا ہے وہ اس کا ایک مخصوص [illegible] بیان (mode)
ہے ۔ انگریزی شاعری میں شدتِ جذبات میں بھی عنصر تفکر (intellection) کی حسین آمیزش
ہے ۔ شکسپیر ' اسپنسر ' کیٹس ' بائرن ' شیلی ' وڈسورتھ ' سینٹ [illegible] کی شاعری
سانٹ اور اوڈس) کا سرسری مطالعہ ہی اس بات کی توثیق کیلئے کافی ہے ۔

اگر شاعری کی غنائیت عمل کی محرک ہے اور خداوندی اور بندگی
کے رشتے میں جذباتی گداز کے لمحات آتے ہیں جو حیاتِ انسانی کا بیش بہا سرمایہ ہیں سے

؎ متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

اور اس کی کمزوری بھی ؎

بٹھا کر عرش پر رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا جو بندوں سے احتراز کرے

تو سعد کا قرآنِ مجید کا شعری ترجمہ اس رشتہ کو استوار کر کے ان کی فلاحِ عاقبت کا ضامن تو انشاءاللہ ضرور ہوگا اور ساتھ ہی تفہیمِ قرآن میں معاون بھی۔ اس باب میں انگریزی میں "مالکِ یوم الدین" کا "Day of Account" جدت آمیز لیکن غیر مستند ترجمہ ہے کیونکہ انگریزی میں "Day of Judgment" زیادہ مستعمل ہے۔

غالب کی غزل کے انگریزی ترجمہ میں "روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں" کا ترجمہ "Weeping by volition a thousand times I never mind" نہ غالب کے مصرعے کے جذباتی انداز پر حاوی ہے اور نہ انگریزی لب و لہجہ کا حامل، اسی طرح "لمحاتِ رنگین" کے دوسرے بند کا انگریزی ترجمہ اصل سے بعید اور انگریزی میں اس کے لئے دستیاب موزوں الفاظ سے عاری لیکن بے ساختگی کے فقدان کے باوجود سعد کے یہ انگریزی ترجمے تحسین آفریں اور انگریزی سے انکی گہری دلچسپی کے مظہر ہیں۔ بادی النظر میں "اکھیں ترماسے" کے تیسرے بند کے انگریزی ترجمہ میں "nearest dears" کی ترکیب صیغۂ جمع میں غلط ہے۔ تاہم سعد نے اردو کے شعر کے خیال کو انگریزی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے

اب آیئے انگریزی شاہکار نظموں کے اردو منظوم ترجموں کی جانب۔
یہاں سعد کا اشہبِ قلم ایک تیز رو گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتا نظر آتا ہے اپنی تیز رفتاری اور روانی میں کہیں کہیں یہ اصل انگریزی کے متن کو پامال کرتا بھی نظر آتا ہے۔
رابرٹ فراسٹ کی "Stopping by woods" کے دوسرے بند میں "To stop with out a farm house near" کا یہ اردو ترجمہ

نہ تو اس جا ہے کوئی میخانہ اور نہ حسین سے چہرے

نظم کے سیاق و سباق کو مسخ کرتا ہے اس جگہ لفظی ترجمہ اس کا مداوا ہو سکتا تھا۔
برف باری کے موسم میں جبکہ شام کی تیرگی کا یہ عالم ہو کہ ایسی تاریکی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہو صفت کا تیسرا درجہ darkest آیا ہے اور پھر گھوڑا سوار کو گھر جلد از جلد پہنچ کر اپنے ادھورے وعدے بھی پورے کرنے ہیں۔

تیزی سے جو خوف غالب ہو سکتا ہے وہ فطری طور پر جبلت اور مزاج دہقان سے
استان میں برف باری تھمنے تک قیام کا متلاشی ہو گا نہ کہ "میخانہ" اور "حسین سے چہرے" کا
دو مند ـــ یہ الگ بات ہے کہ امریکی طرز معاشرت میں ایسی عارضی ضیافت میں بھی شراب
پیش کی جاتی ہے ۔

اسی طرح تیسرے بند میں :-

"I ask if there is some mistake" کا ترجمہ "کہیں
غلطی سے میں نہ ٹھہرا ہوں مجھ کو نہ رہ کے یہ جتاتا ہے" اصل کو بدل دیتا ہے " ہرو" کا مصرعہ
شرطیکہ گھوڑے کے لئے ایک ایسے لمحۂ تعجب و تشکیک کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کہیں
گھوڑا سوار خلاف عادت غلطی سے یہاں نہ رکا ہو یا کہیں خود اس کی (گھوڑے کی)
سمجھ میں کوئی خطا سرزد ہو رہی ہے ۔ گھوڑے کی یہ کیفیتِ ذہنی لفظ "Queer" سے
ہی نمایاں ہے ۔ وہ الجھن میں ہے ، ششدر ہے ۔ اس کیفیت ذہنی کا انداز استفہامیہ
ہے نہ کہ ہدایتی جیسا کہ مترجم کے لفظ "جتانا" سے ظاہر ہے ۔

شیکسپیر کی سانٹ "Consolation" میں پہلے بند کے تیسرے مصرعے کے
دو ترجمہ میں "مجھے نفرت ہے خود سے بھی' کچھ اتنی تیرہ بختی ہے' غالباً "اپنی" کی
جگہ "اتنی" طباعتی غلطی معلوم ہوتی ہے ـــ فراسٹ کی دوسری نظموں اور لانگ فیلو
کے Psalm (نغمۂ حیات) کے ترجمے بہت خوب ہیں ـــ اور لطیف شعری ترجمانی کرتے ہیں۔

"رعنائی خیال" یعنی مسعود کے شعری مجموعے کے حصۂ دوم میں جو ان کے اردو
کلام پر مبنی ہے ۔ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں ۔ ان کا اردو کلام ۱۹۵۳ سے ۱۹۸۷ تقریباً
چار دہوں پر محیط ہے ۔ اس طویل مدت میں ایک تصنیف یا مجموعۂ کلام (برخلاف پروفیسر
یوسف سرمست کے خیال کے) "پرگوئی" علامت تو نہیں بن سکتا ۔ البتہ اس بات سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے کلام میں جو برجستگی اور بے ساختگی ہے اور روانی و نغمگی جا بجا کیف زا
آتی ہے وہ ان کے طبعاً شاعر ہونے کی شاہد ہیں ۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ رنگ غالب ہے۔
اپنی ایک غزل میں وہ کہتے ہیں ـــ

درد سے غم سے بے خودی سے ملے
ہم ملے تم سے زندگی سے ملے

ــــ شاعری کو مری نئے اسلوب ٭ تیرے اندازِ دلبری سے ملے ۔

اور ــــ اک جنتِ خیال ہے ہر شعر تیرا سنو ٭ حسن و جمالِ یار کو عنوان کئے ہوئے

ایک دوسری غزل میں یہ شعر ــــ

خوابوں کا حسن اور تمنا کی دلکشی
پیکر تمہارا یا مری غزلوں کا بانکپن

پیکرِ محبوب کے خد و خال سے لمس اور بوس و کنار کرتی ہوئی یہ شاعری اپنی لطیف ــــ ایمائی (Romantic) اور احساس انگیز (Sensuous) کے اظہار کے لئے لفظی تراکیب، زبان کی بندش، تلمیحات، اشاریت و کنائیت کے اسالیب کے نئے روایتی ڈھانچوں پر اکتفا کرنے پر مجبور نظر آتی ہے ۔ وہی دار و رسن کے قصے، وہی موسیٰ و طور کی باتیں، وہی گل و بلبل کی داستاں، گو ضیا کے غزل کا ہیولیٰ تو ضرور شاعر کا خونِ گرم ہے ۔ اور عشق کا ولولہ صادق ہے ۔ لیکن پابندِ روایت ــــ

نہیں اشکِ غم یہ میرا یہ ہے دل کا ایک شعلہ
یہ شرار ہے وہی جو رہا بجلیوں میں پل کے

اسی غزل میں ابتدا میں کہتے ہیں ــــ

ہے نشاطِ زندگی تو کہیں جذب و شوق و مستی
مجھے زندگی ملی ہے تری آرزو میں ڈھل کے

ایک اور غزل میں یہ شعر ــــ

تمہیں سا رنگ گلوں میں سہی مگر پھر بھی ٭ گلوں کے حسن میں شادابیاں کہاں اتنی
خرامِ یار کی مستی تو ہے غزالوں میں ٭ جنوں نواز مگر شوخیاں کہاں اتنی

آتشِ عشق کی شعلہ باری کے تمام قصے ہیں مگر اردو غزل میں اندازِ رومانیت کے لئے فیض اور ان کے بعد جو نئی لفظیات تراشی گئیں اور نئے پیرایہ ہائے سخن اختراع کئے گئے ان کے بعد بھی روایتی لفظی تراکیب، تلمیحات، تشبیہات و استعارات پر اکتفا کرنا اور بوسیدہ سانچوں کے لئے یہ شاعرانہ رجحان ارتقائی علامت نہیں کہا جاسکتا ــــ

ــــ ہجومِ نکہتِ گل سے گماں گذرتا ہے ٭ تمہاری زلف کی خوشبو صبا چرا لائی
ــــ یہ شاخِ گل نے لچکنا کہاں سے سیکھا ہے
تمہیں نہ دیکھا ہو اس طرح لیتے انگڑائی ۔

شاعری جذبات کی دو آتشہ اور معنی بہ مست کے باوجود زبان کے روایتی شکنجہ میں کسی نظر آتی ہے ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سعد کی شاعری میں ندرتِ بیان کا یکسر فقدان ہے ۔ ان کے یہ اشعار ؎

ہم نے ان کو دیکھا ہے ایک ایسے عالم میں
حرفِ آرزو بن کر جب حجاب آتا ہے

؎ دل میں افسوس ہے تیرے پھول تمنا کے کھلے　　ورنہ ویرانے گلستاں نہیں ہونے پائے
؎ تمہارے ہی سوزِ عشق سے چمکی مہک اٹھی　　وہ تیری انجمن ہو کہ تاروں کی انجمن
؎ ہے چاک دامنِ گل سے فروغِ حسنِ چمن　　شگفتہ پھول ہی جانِ بہار ہوتے ہیں

؎ مسجد میں ایسی جنگ چھڑی واعظوں میں آج
میخوار جام چھوڑ کے ہنسنے کو آ گئے

عشقیہ رنگ سے ہٹ کر ان کی غزلوں میں دوسرے موضوعات پر شعر بہت کم نظر آتے ہیں

؎ رکھتے ہیں ستاروں پر اب نظر جنوں والے
دشت میں جو پھرتے تھے کہکشاں پہ چلتے ہیں

؎ دو جہان جس پہ تڑپ اٹھے ہیں سعد کے عرش لرز اٹھے
جو دلِ وجود بھی چیر دے مجھے اس فغاں کی تلاش ہے

؎ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پتھراؤ ہوگا سعد　　شیشے کے اک مکان میں بسنے کو آ گئے
؎ بھٹک رہا ہوں فضاؤں میں ماہ و انجم کی　　نہ منزلوں کا پتہ ہے نہ راستہ معلوم

سعد نے کچھ نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں ہیں ۔

شہر حیدرآباد کے آسمانِ شاعری پر جہاں کئی درخشندہ کواکب اپنی درخشانی سے خیرہ نظری کرتے رہے ہیں وہیں یہ ایک نیا ستارہ بھی ضو افشاں ہے ۔ اس خاک کی زرخیزی سے کون انکار کر سکتا ہے؟

تبصرہ

سیّدہ مہر

"ذکرِ رفتگاں" از جناب رشید الدین

حال ہی میں رشید الدین صاحب کی تصنیف ذکرِ رفتگاں پڑھنے کا اتفاق ہوا یہ اردو کے بارہ مشہور مرحوم شعراء و ادباء پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔

رشید الدین صاحب ادبی دنیا کے لئے نئے نہیں ہیں۔ پروفیسر یوسف سرمست لکھتے ہیں "رشید الدین محکمۂ ترجمہ حکومت آندھراپردیش میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ جن کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری ہے مطلب یہ کہ اب جامعہ عثمانیہ سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں"۔ خود اُن کی تحریر کے مطابق وہ ۳۰ سال کے عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔ ۳۰ سال کا عرصہ ادبی دنیا کے لئے کیا ستی کا درجہ رکھتا ہے۔ تحریر میں پختگی آتی ہے۔ اور ادیب کو صاحبِ طرز بناتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان دلکش ہے ان کی اور دو تصانیف علامہ حیرت بدایونی اور خواہ مخواہ (انشائیے) اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں خاطر خواہ (انشائیے) زیرِ ترتیب ہے۔ ذکرِ رفتگاں ان کی تیسری تصنیف ہے۔ ادب میں معنوی اولاد کا اضافہ اگر وہ صالح قدروں کا حامل ہوں تو ہمیشہ خوش آئند ثابت ہوتا ہے۔ رشید صاحب اس قول پر پورے اترتے ہیں۔ رشید صاحب نے ان ہی ادیبوں اور شاعروں پر قلم اٹھایا ہے جن سے ان کے بڑے پرخلوص شخصی روابط تھے گویا یہ مضامین ایک لحاظ سے خراجِ عقیدت یا خراجِ محبت ہے۔ جو ایک ادیب اپنے بچھڑے ہوئے بزرگوں اور ساتھیوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ مصنف نے ان میں سے ہر ایک کی جدائی کو اس طرح محسوس کیا ہے کہ ان کے دل کا دکھ اور احساس کا کرب قاری کے دل کو چھوتا ہے۔ انہیں مرحوم بزرگوں سے اس لئے عقیدت تھی کہ علم و دانش کی دولت سے مالا مال تھے۔ لہٰذا کتابوں سے زیادہ ان عالموں کی صحبت کو ترجیح دیا کرتے۔ اور ان کی عقیدت میں رہ کر فیض حاصل کرتے یوں تو کسی عظیم المرتبت ادیب یا شاعر کی موت ایک بڑا سانحہ ہوتی ہے۔ اور اگر ان سے ذاتی مراسم ہوں تو

بمعرفت ڈاکٹر جاوید۔ گنگارام تعلقہ وقار آباد، ضلع رنگا ریڈی۔ اے۔ پی

سانحہ اور بھی دل شکستہ کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ ذکر رفتگاں میں جن ادیبوں یا شاعروں کا تذکرہ ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ ہر ایک کی خطرناک مزاج طرز معاشرت آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ دیگر ادیبوں اور شاعروں کا حاضر دماغی تبحر علمی اعلیٰ ظرفی ذہانت اور صبر و استقلال کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے دکھ سکھ جھیل کر وہ کس طرح خفتگان خاک کی صف میں جا ملے۔

رشید صاحب نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے ان میں سے ۲ ہستیوں سے میں بھی واقف ہوں۔ ہر دو کا تعلق اورنگ آباد کی سرزمین سے رہا ہے۔ یعقوب عثمانی صاحب کا وطن اتر پردیش ضلع بارہ بنکی تھا۔ لیکن اورنگ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ یہیں پیوند خاک ہوئے۔ عثمانی صاحب جیسی قابل عالم و فاضل ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ خوش اخلاقی نفاست اور خودداری ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اشعار ترنم سے اور ایسے جذبے کے عالم میں سناتے کہ ایک سماں بندھ جاتا۔ اسی طرح اورنگ آباد کے ایک اور شاعر سکندر علی وجد جو یعقوب عثمانی صاحب کے ہمعصر تھے۔ دونوں میں آپسی خلوص بھی تھا۔ ملک کی مایہ ناز ہستیوں میں تھے ان کی نظمیں ایجنٹا اور ایلورا زبان زد خاص و عام تھیں۔ ترنم بھی اتنا دل کش تھا کہ ہزاروں کا مجمع دم بخود رہتا۔ بہرحال رشید صاحب کی یہ تصنیف آخر تک قاری کی دلچسپی کا باعث بنی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایتھنز کا ایک مشہور فلسفی دیو جانس کلبی دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ پوچھنے پر کہتا کہ مجھے انسان کی تلاش ہے ہر طرف بہائم ہی بہائم نظر آرہے ہیں۔ لیکن رشید صاحب نے ان مرحوم شاعروں اور ادیبوں میں وہ جوہر تلاش کئے ہیں۔ جو انسانیت کے لیئے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ جانے وہ ابھی ایسے کتنے انسانوں کو کھوج نکالیں گے۔

ٹائٹل شعیب نے رفتگاں کی رعایت سے فکر انگیز بنایا ہے۔

طباعت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان۔ سنہ اشاعت مارچ ۱۹۸۸ء

ٹائٹل "شعیب" قیمت ۱۵ روپئے چھپائی دیدہ زیب

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب

حنائے علی گڑھ

مولف پروفیسر محمد عبدالقادر

و مرتب سابق صدر شعبۂ اردو سینٹ جوزف کالج، میسور

طباعت "سالار" پبلیکیشنز سینٹ جانس چرچ روڈ، بنگلور

سالِ اشاعت جنوری ۱۹۸۶ء قیمت ۲۰ روپئے ۱۷۶ صفحات

تبصرہ نگار ڈاکٹر محمد منصور خاں پروفیسر پی جی کالج چھندواڑہ

عبدالقادر: بیدل کا شعر ہے۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویشتن ... من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

جناب رشید احمد صدیقی کی علی گڑھ سے غیر معمولی وابستگی کے پیش نظر پروفیسر محمد عبدالقادر نے رشید صاحب کو اپنے ایک خط میں مصرعہ بیدل میں تھوڑے سے تصرف سے لکھا۔ ان پر یہ صادق آتا ہے کہ من بستہ ام "حنائے علی گڑھ" بہ پائے خویش۔

چونکہ زیر نظر مجموعہ میں رشید صاحب کے ایک بسیط خاکہ کے علاوہ وہ مکاتیب شامل ہیں جو علم و ادب اور ثقافت کے جامعاتی گہوارے "علی گڑھ" کی نادر عکاسی کرتے ہیں اور اس کے مقامی اور جامعاتی ایک تاریخی دور کے "حجاب رشیدی" کی نمائندگی بھی۔ اس لئے مرتب نے اس مجموعہ کا نام "حنائے علی گڑھ" رکھدیا۔ "حنائے علی گڑھ" میں مشاہیر کے ان مکتوبات کو پڑھ کر وہی تاثر ذہن پر مرتب ہوتا ہے جس کا بیان غالب کے اس شعر میں ہے۔ ؎

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اب "حسینوں" (مشاہیر) کے یہ خطوط جن میں طنز و مزاح اور ظرافت کی کیفیت ہے۔

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتا ہے' کے مصداق ہے، اردو سوانح نگاری میں ایک گرانقدر اضافہ ہیں۔ یہ مشاہیر تو بقول غالب ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ان کی گمشدگی کی تو کوئی تلافی نہیں ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

البتہ پروفیسر عبدالقادر نے ان خطوط کو شائع کر کے ان مشاہیر کی زندگی کی ایسی جھلکیاں فراہم کی ہیں۔ جو ان کی ادبی نگارشات اور فن کے پس پردہ چھپی ہوئی شخصیت کو قریب سے سمجھنے میں معاون ہیں۔ پھر مکتوب نگاری کا ایسا خاصہ ہے جو سوانح نگاری میں بھی مفقود ہے کہ مکتوب نگار کو اپنی ذات سے ایک ایسا نفسیاتی قرب حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی خود نوشت سوانح (autobiography) تحریر کرے تو بھی حاصل نہ ہوتا۔ مشاہیر ادب کے خطوط پڑھ کر خصوصاً اس احساس کو تقویت ملتی ہے بالخصوص رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری میں ان کے شہ[illegible]

ہیں۔ مرتب پروفیسر محمد عبدالقادر کے نام رشید احمد صدیقی کے ۳۳ ۔ ۔ ۱۹۷۶ تک جملہ (۴۷) خطوط ڈاکٹر ذاکر حسین کے ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۵ کے دوران لکھے گئے (۱۲) خطوط ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے (۵) علاوہ ازیں نیاز فتحپوری اختر انصاری احمد ندیم قاسمی کے کاروباری نوعیت کے خطوط شامل ہیں۔ اول الذکر تین اصحاب کے خطوط بالخصوص اہمیت کے حامل ہیں۔ مرتب نے پیش لفظ اور رشید احمد صدیقی پر بصیرت افروز خاکہ رقم کرنے کے علاوہ مکتوب الیہان میں سے چند کی اپنے عائلی مجموعہ تصاویر سے تصاویر فراہم کی ہیں جو باعث دلچسپی ہے

رشید احمد صدیقی کے خطوط نہ صرف ان کے فنکارانہ اور انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کے مزاج کی شگفتگی، بے ساختگی اور مارک ٹوین (امریکی مزاح نگار) کے طنز و مزاح جیسی خصوصیات ظاہر کرتے ہیں کہ قارئین ان میں پوشیدہ ظرافت سے ان کے مضامین اور دیگر نگارشات کی طرح محظوظ ہوتے ہوئے بھی ان کے واحد متکلم کے لب و لہجہ میں مکتوب نگار کی پوشیدہ شخصیت کی سرگوشیاں سننے لگتے ہیں۔ رشید صاحب جیسے کم سخن شخص کو ان کے مکتوبات میں ایجادات کی تلاش پر غالباً اسی طرز کا احتجاج

کو تنے دیکھا تھا؟ جیسے اقبال کے اس شعر میں ہے۔ ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ان کے مزاج کے ذاتی لب و لہجہ کی بے پایاں، نہ سمٹنے والی سیال مادہ کی طرح ظرافت کو دیکھئے آپریشن جیسے نازک موقع پر بھی کتنی آسانی کے ساتھ رشید رواں ہے۔ خدا سے مخاطب ہیں :۔ "زندگی میں میں نے تجھے اکثر بھلا دیا اس کے گواہ بہت مل گئے۔ لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہوں، اس کا گواہ صرف تو ہے"

گھر میں بچوں کی علالت سے بہت جلد فکر مند ہو جاتے تھے اور جب بچے تندرست ہوتے اور بیماری سے شفا پاتے تو خدا کے مشکور ہوتے اس شکر گزاری کے بیان میں حسن ظرافت ملاحظہ ہو۔

"جب وہ کسی سخت مرض سے نجات پاتے تو میں خدا سے اس درجہ خوش ہوتا ہوں جیسے وہ کسی اور کا خدا نہیں صرف میرا خدا ہے صرف میرا نہ ہوتا تو اتنا فضل کیوں کرتا۔ آپ سن کر ہنسیں گے کہ میرا یہ تصور مجھے عجیب مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ یعنی میں خدا کو اپنا فیملی ممبر سمجھنے لگتا ہوں"

ان کا یہ کہنا کہ زندگی کی تجربہ گاہ میں "میرے نزدیک تو اشخاص ہی سب کچھ ہوتے ہیں" ان کے انانیت کے جذبہ اور شخصی عنصر کی اہمیت کا آئینہ دار ہے۔ مکتوب الیہ کے انہیں سمجھانے پر کیسا معنی خیز فقرہ چست کرتے ہیں۔

کئی دن ہوئے ایک عزیزہ آپ کی بھیجی ہوئی شہد کی دو بوتلیں لائے تو میں یہ سمجھا کہ ادھر آپ کو خط لکھنے کی کیوں خلش تھی!! ۔۔۔ آپ کی اور سہیل کی میرے ساتھ ارادت و محبت معلوم نہیں کیا رنگ لائے گی ۔۔۔ خیال کرنے لگتا ہوں کہ ایسے محبت کرنے والوں کے صدقے میں اگر گناہوں کے ارادہ معاف نہ کروں گا تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ (صفحہ ۵۷)

مولویت پہ یہ طنز کہ "کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آدمی نہیں مولوی ہوں! اور مولوی ہوتا تو شریفوں کے لیے مستقل عذاب بن جاتا" آپ کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ مرتب کا یہ خیال کہ رشید صاحب کا غالب کے الفاظ و تراکیب کو اپنے خیالات کے اظہار میں اس طرح پیوست کرنا کہ وہ غالب سے زیادہ خود

ان کی تخلیق نظر آتے ہوں تو غالب کی زبان کی بے پناہ پوشیدہ صلاحیتوں کا مظہر ہے اور غور طلب ہے علامہ اقبال جب بھوپال میں راس مسعود کے یہاں تھے تو قیام گاہ میں ان کے تکیہ کے نیچے مثنوی مولانا روم اور دیوان غالب یہ دو کتابیں ایک صبح برآمد ہوئیں - اقبال نے اس کا برملا ذکر کیا ہے کہ اردو ان کے افکار و معانی کی متحمل نہیں تھی اس لئے ان کو فارسی کی طرف وسیلۂ اظہار کے لئے رجوع ہونا پڑا - اردو شاعری کے لئے نئے الفاظ و تراکیب کے وضع کرنے کے فن کی اگر کہیں نظیر مل سکتی تھی تو وہ غالب کے دیوان میں تھی سے

ہر معنی پیچیدہ در حرف نمی گنجد ۔۔۔ یک لحظہ بہ غالب شو شاید کہ تو دریابی

یہ مماثلت، غالب اور رشید صاحب کے خطوط میں موجود ظرافت کی نسبت اور زیادہ صادق نظر آتی ہے - مکتوب الیہ کے تحائف کے جواب میں اپنی جانب سے جواباً کچھ نہ بھیجے جانے کے عذر کو کس ظریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں :

> بارہا خیال آیا کہ یہ بھیجوں گا وہ بھیجوں گا، وقت آنے پر معلوم ہوا کہ کچھ نہ کر پاؤں گا - خیر پھر دیکھا جائے گا - اگر صرف اچھی نیت اور نیک ارادے کا ثواب ملتا ہوتا تو قادر صاحب آپ یقین فرمائیں مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی اور نے ثواب کمایا ہوتا - (ص ۷۹)

رشید احمد کے یہ خطوط اردو ادب اور انشاء کے لئے ایک نئے باب کا اضافہ ہیں علاوہ ازیں ان کی اشاعت سے رشید صاحب کی علی گڑھ دوستی، جامعاتی نظام کی بڑھتی ہوئی پیشہ ورانہ اقدار معمول کے واقعات و سانحات پر مصنف کا ذاتی ردعمل اور اسی طرح کے بیشمار نئے تذکرے ہمارے علم میں آتے ہیں۔ اور ہماری معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں ان سے مکتوب نگار اور ادیب کی شخصیت کا خاکہ واضح ہوتا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین کے خطوط مختصر اور غیر ادبی نوعیت کے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی اعلیٰ ظرفی کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں سید قیصر قادری سے ندوہ میں قیام کے مشورہ پر لکھتے ہیں :

> ندوہ جانے کا خیال اسی وقت چھوڑ دیجئے - آپ نے اس کی جو تعریف لکھی ہے اس سے جی ضرور للچایا مگر قسمت میں یہ نہیں ہے پھر ٹیپو سلطان تک

باقی ص ۳۴

قمرالاسلام

آزاد ہند فوج

قسط اول

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب میں وطن واپس آیا تو مجھ سے سب کچھ چھن چکا تھا۔ ابھی تک ہندوستان غیر منقسم تھا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے شروع کا زمانہ تھا۔ میں نے مشرق بعید کے محاذ پر کم و بیش چھ سال گزارے تھے۔ ان برسوں میں عیش و عشرت کے خوشگوار دن بھی دیکھے۔ اور کٹھن گھڑیاں بھی۔ میں نے آگ اور خون کی ہولیاں دیکھیں۔ انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کو کشتے دیکھا۔ بموں کی صورت میں آسمان سے آگ برستے دیکھی۔ اور اس آگ سے انسانی جسموں کو کھلونوں کی طرح بکھرتے دیکھا تھا۔ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح میرے دل و دماغ میں پیوست ہے۔ یہی تلخ و شیریں یادیں میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ نوجوانی کے بیش قیمتی سال جنگ کی نظر ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی میرے پاس صحت و جوانی اولوالعزمی اور تجربہ موجود تھا۔ اس مالک حقیقی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری حفاظت فرمائی۔ زخمی ہونے کے باوجود صحیح سالم رکھا۔ ساتھ ہی آئندہ زندگی گزارنے کا خدا تعالیٰ نے حوصلہ عطا فرمایا۔ مشرق بعید میں تقریباً پانچ برس میں لے سنگاپور۔ ملایا۔ پینانگ تھائیلینڈ کا چپہ چپہ دیکھ لیا۔ اس خطہ زمین پر جو بھی حکمران آیا عیش و نشاط میں یاد خدا بھلا بیٹھا۔ اور طیش و غضب میں خوف خدا کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی۔ جو بھی آیا انسانی روپ میں ملک الموت بن کر آیا۔ قدرت کی آنکھ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ مگر خاموش تھی۔ انگریزوں کا راج تھا تو حاکم و محکوم دونوں عیش و عشرت میں خود فراموش تھے۔ مشرق بعید کے شہر اس وقت روشنیوں کے شہر تھے مگر گناہوں کی چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ہر قسم کی آزادی تھی مختلف قومیں اور نسلیں پہلو بہ پہلو گناہ کو فیشن کے طور پر اپنائے ہوئے تھیں۔ شراب عورت جوا پر کوئی پابندی نہ تھی انگریز کلبوں کی رونقیں بڑھاتے رہے۔ اور کھیلوں

مصنف، افسر آزاد ہند فوج ۳۹۳-بی - جدید آغاپورہ۔ حیدرآباد

کو شخصی آزادیاں دیتے رہے۔ یہ گویا انسانی حقوق کی ادائیگی تھی۔ ناچ گانے عام تھے
بلکہ عریاں رقص پر بھی کوئی پابندی ہی نہ تھی۔ شہر سنگاپور میں ہر سو طوائفیت کا دور تھا۔
مختصر یہ ہیں زمین کا یا ذاآدم اور تھا

مشرق بعید کا نقشہ جو میں نے بیان کیا ہے۔ یہ عام مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ پھر اللہ کی اپنی زمین پر انسانی غفلت دیکھ کر قہر آگیا۔ عالمگیر جنگ کا اعلان ہوگیا۔ ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں ہٹلر نے جنگ شروع کردی۔ ساری دنیا اس خبر سے دہل کر رہ گئی۔ مگر انگریزوں کی غفلت بدستور جاری رہی۔ اور انگریز یہی کہتے رہے کہ مشرق بعید ہمارا ناقابل تسخیر قلعہ ہے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ جنگ صرف یورپ میں ہوگی۔ مشرق بعید میں خشکی پر ہماری بیڑیاں اور توپ خانے ہیں۔ ٹینک اور طیارہ شکن توپیں ہیں۔ سمندروں میں بحری بیڑے کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ جس کی لیڈ پرنس آف ویلز جیسے جہاز کر رہے ہیں وہ جہاز جدید قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ ہمارے پاس وہ جہاز ہے جسے (Pride of England) کہا جاتا ہے۔ ہماری فوج دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ الفاظ برٹش گورنمنٹ کے پرائم منسٹر ونسٹن چرچل کے تھے۔

گلوب کے کثیر رقبے پر واقعی برطانیہ کا یونین جیک قومی نشان بن کر لہرا رہا تھا۔ اور ان کی سلطنت میں کبھی بھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء تک مشرق بعید کے شہروں میں روشنیاں جگمگ جگمگ کرتی رہیں ہر چند کہ جنگ کے بادل ساری دنیا پر چھا گئے تھے مگر یہاں ابھی تک امن تھا۔ یورپ میں ہٹلر اور مسولینی کی فوجیں فتح پر فتح حاصل کر رہی تھیں۔ ہر طرف آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ بستیاں ویران ہو رہی تھیں۔

۸ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپانی بھی میدان عمل میں کود پڑے اور مختلف شہروں پر شدید بمباری کی۔ اس وقت ہماری رجمنٹ جزیرہ جارج ٹاؤن میں تھی۔ جو پیانگ اور سنگاپور کے قریب ہے۔ حملہ اچانک اور بغیر اعلان جنگ کے ہوا تھا۔ لوگ بالکل بے خبر تھے۔ اور رات کا وقت تھا بچاؤ کا کوئی سامان بھی نہیں کیا تھا۔ اس لئے بے خبری میں بہت سے لوگ مارے گئے۔

ہماری رجمنٹ شہر سے دور جنگل میں ایک ایسے حصہ میں مقیم تھی۔ جہاں درختوں میں قدرتی کیموفلاج تھا۔ لیکن افسروں اور نوجوانوں کی آدھی سے زیادہ تعداد شہر میں رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ میں خود دستائی نہیں کروں گا میں خود بھی اُن لوگوں میں شریک تھا

خطرے کے سائرن پر سب کیمپ کی طرف بھاگے۔ مگر پھر بھی کچھ دیر بمباری کی زد میں آ ہی گئے۔ اس رات ہماری رجمنٹ کے چودہ آدمی ہلاک اور بارہ آدمی زخمی ہوئے تھے۔ چنانچہ ہماری رجمنٹ کو تھائی لینڈ کی سرحد پر بھیج دیا گیا۔

اور وہاں سے ہم پیچھے ہٹتے ہٹتے سنگاپور شہر میں آ گئے۔ آخر کار وہ دن آن پہنچا۔ جس کا ہم کو مدت سے انتظار تھا۔ یعنی برٹش آرمی کو انتہائی شرمناک شکست اٹھانی پڑی۔
۱۵/ فروری ۱۹۴۲ء کو برٹش فوج نے غیر مشروط اطاعت تسلیم کر لی۔

ماہ سات دن کی گھمسان کی جنگ کے بعد جاپانیوں نے اپنی طاقت کا لوہا منوا لیا۔ انگریزوں کی کمر اسی وقت بیٹھ گئی۔ جبکہ ۱۰/ فروری ۱۹۴۲ء کو جاپانیوں نے برٹش کا مایہ ناز جنگی جہاز کو بحر ہند میں غرق کر دیا۔ اس جنگی جہاز کو غرق کرنیکا سہرا ایک جاپانی فلائٹ کمانڈر کے سر ہے۔ جو خود بھی شہید ہو گیا۔ جس کا نام (Shalonaonter) تھا۔ اپنی جان کی قربانی دیکر بہادری کا سکہ بٹھا دیا۔ ایسے بہادر لوگ ہی ملک و قوم کے لیے باعث فخر ہوتے ہیں
اسی روز رات کے ۸/ بجے (Cease Fire) کا سائرن بجا دیا گیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ برٹش آرمی کے دو کمانڈر سر لفٹیننٹ جنرل پرسول اور میجر جنرل بنیٹ نے ہتھیار ڈال دیے۔ جاپانی جنرل توجو اور جنرل یاماشیتا نے ایک لاکھ آٹھ ہزار فوج کو جو انگریز اور ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔ اور پورے سامان حرب لے لیں تھی۔ جنگی قیدی بنا لیا۔ یہ دنیا کی عظیم ترین فوج کی شکست تھی۔ مشرق بعید میں سلطنت برطانیہ کا درخشندہ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ یہ برطانیہ کی اس عظیم سلطنت کا حصہ تھا۔ جس کے حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ ہندوستان کی آزادی کا پیش خیمہ تھا۔

ادھر ہندوستان میں کانگریس کے قائدین بھارت کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جو ایک دیرینہ مطالبہ تھا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کر دی تھی۔ یورپ کی جنگ شدت اختیار کر چکی تھی۔ مشرق بعید میں چراغ گل ہو چکا تھا۔ سلطنت برطانیہ زوال پذیر ہو رہی تھی۔ ہندوستانی فوج کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ کہ ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ اپنا ملک رکھتے ہوئے غلامی کا طوق ہندوستانیوں کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔

یہ تھی تمہید میرے فوج میں بھرتی ہونے کی۔ اور کچھ ایسے جذبات پیش نظر ۲۰ ۱۹۴۳ء کو میں کچھ ساتھیوں کے ہمراہ پونہ روانہ ہوا۔ اور انگریزی فوج کے ۱۵

برگیڈ کی ایک یونٹ میں بھرتی ہوگیا۔ اس بات کا احساس ہمیں بعد میں ہوا کہ انگریزوں کا منشاء ہی یہ تھا کہ ایسے ہندوستانی نوجوان جو سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ فوج میں بھرتی ہوکر کام کریں تاکہ انھیں اپنی غلامی کا احساس ہو۔

چنانچہ میں اپنی ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد یعنی جون ۱۹۴۱ء کو انسٹرکٹر کی حیثیت سے کوئٹہ چھاونی بھیج دیا گیا۔ شمالی ہند کی مختلف چھاونیوں میں کارگذار دیا۔ ہمارے سیاسی شعور کو انگریزوں کے امتیازی سلوک نے بیدار کرنا شروع کردیا تھا۔ باہر کی خبروں پر برٹش گورنمنٹ نے فوجوں کے لئے سخت پابندی عاید کردی تھی۔ لیکن ہمارے تجسس نے بہت کچھ حاصل کرلیا تھا۔ ہمارے دلوں میں بغاوت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ ہماری فوج کی اکثریت انگریزوں کے خلاف تھی۔

۷/ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہمارے برگیڈ کو ۱۴ آرمی کے ساتھ سنگاپور بھیج دیا گیا۔ جہاں کے حالات جہاں کے حالات گذشتہ صفحات پر بیان کرچکا ہوں۔

۱۶/ فروری ۱۹۴۲ء کو ہماری زندگی کا خوش نصیب دن تھا۔ جس دن سے ہماری جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ سنگاپور شہر کے فری پارک گراونڈ میں ہتھیار ڈالنے کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ برٹش سروس کو جن کی تعداد ۲۸ ہزار تھی۔ دونوں جنرلوں کے ساتھ چانگی جیل... بھیج دیا گیا۔ باقی ماندہ ۸۰ ہزار ہندوستانی فوج کو روک لیا گیا۔

اس کے بعد ہمارے فوجی افسروں اور سیاسی قائدین نے اپنی اپنی تقریروں سے ہندوستان میں انگریزوں کے جور و استبداد پر اظہار خیال کیا بھارت کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالی تو ہمیں صحیح طور پر جنگ آزادی کا مفہوم معلوم ہوا۔

مقررین میں خصوصاً لالہ ہماری کھویش جوانہ ڈین۔ لیگ کے صدر اور ان کے دست راست سردار پریتم سنگھ تھے۔ بہت ہی جوشیلی اور جامع تقریر کی فوجی افسروں میں کیپٹن موہن سنگھ کیپٹن محمد اکرم۔ جہانگیر۔ الرشید۔ عزیز۔ شہسوار خاں گلزارہ سنگھ۔ جے کے بھونسلے سی ایس جیڑجی صاحبان نے اپنی تقریروں سے حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے۔ ہندوستان کے کانگریس قائدین اور خصوصاً نیتاجی سبھاس چندر بوس جو اس وقت جرمنی میں سیاسی پناہ لئے ہوئے تھے ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اور ہم لوگوں کو ذہنی طور پر انگریزوں کیخلاف آمادہ پیکار کرلیا بتایا گیا کہ جرمنی میں نیتاجی نے ایک آزاد ہند فوج کی بنیاد رکھی ہے۔ جو وہاں کے ہندوستانیوں پر مشتمل ہے۔ نیتاجی یہاں آنے والے ہیں۔ جو لوگ خوشی سے ملک و قوم کو انگریزوں

کے نتیجہ استعمار سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کے خلاف لڑنے کے لیئے تیار ہو جائیں۔ اور جن لوگوں کو انگریزوں کا خوف ہے۔ وہ لوگ جاپانی افسروں یا کمانڈرس کے مرضی کے مطابق جنگی قیدی بن کر رہیں۔ چنانچہ اس وقت جو فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ وہ قابل سماعت تھے۔

انقلاب زندہ باد مہاتما گاندھی زندہ باد۔ نیتاجی ہمارے لیڈر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ پوری فضاء نعروں سے گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لوگ دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ پر جشن منا رہے ہیں۔ لہٰذا ہم نے خود کو ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیئے پیش کر دیا۔ اس کے بعد ہم کو ہمارے فوجی افسروں کے ساتھ مختلف کیمپس سنگاپور کے قریب و جوار میں بھیج دیا گیا۔

۱۵/مارچ ۱۹۴۲ء کو سری راس بہاری گھوس کی قیادت میں پہلی آزاد ہند فوج کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے جنرل موہن سنگھ صاحب بنائے گئے اور ان کی زیر کمانڈ پندرہ ہزار فوج کو تیار کر کے برما فرنٹ کے طرف بھیج دیا گیا۔ اور باقی فوج کو مزید ٹریننگ کے لیئے روک لیا گیا جو سنگاپور اور ملایا اسٹیٹ کے مختلف شہروں میں رکھی گئی۔

اسی اثنا میں ہمارے اور جاپانی افسروں کے درمیان کچھ نظریاتی اختلافات بھی رہے اور جاپانی حکومت نے ہماری فوجوں کو استعمال نہیں کیا۔

آخر کار ۲/جولائی ۱۹۴۳ء کو جرمنی سے نیتاجی سبھاس چندر بوس بذریعہ آبدوز کے ذریعے تشریف لے آئے۔ میجر عابد حسن صفرانی ان کے ہمراہ باڈی گارڈ کی حیثیت سے آئے جو حیدرآباد کے باشندے تھے۔ وہ یہاں ٹولی چوکی میں مقیم تھے حال ہی میں اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایسا فقیدالمثال استقبال میں نے اپنی عمر میں کسی لیڈر کا نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن ایک جلسۂ عام منعقد ہوا اور نیتاجی نے انتہائی جوشیلے انداز میں عوام اور فوجیوں کو مخاطب کیا۔ ہر ہندوستانی جو وہاں موجود تھا۔ رضاکارانہ طور پر برٹش کے خلاف آمادہ پیکار ہو گیا۔ چنانچہ دوسری مرتبہ از سر نو آزاد ہند فوج کو مکمل طور سے ترتیب دیا گیا۔ اور محمد زمان خان کیانی کو جنرل بنایا گیا۔

چار بریگیڈ ترتیب دیے گئے۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) نہرو بریگیڈ جس کے کمانڈر کرنل عزیز احمد گاندھی بریگیڈ جس کے کمانڈر کرنل گلزارہ سنگھ سبھاس بریگیڈ جس کے کمانڈر بریگیڈیر شہنواز خاں اور آزاد بریگیڈ جس کے کمانڈر کرنل الرشید تھے۔ پہلا رجمنٹ جو

۔ر کیپٹن لکشمی تھیں۔ جس کا نام رانی آف جھانسی رجمنٹ تھا۔ ایک ٹریننگ
لول کھولا گیا۔ جس میں ہمہ مقصدی تعلیم دی جاتی تھی۔ سپلائی ڈپو۔ ایم ٹی کمپنی
نل کور۔ انٹیلیجنس گروپ۔ بہادر گروپ، جس کے کمانڈر کرنل برہان الدین تھے
۔ اسی بہادر گروپ میں سب افسر کی حیثیت سے لیا گیا۔ بہادر گروپ میں آٹھ
شن تھے ہر سکشن میں بارہ آدمی تھے۔ ایک لفٹننٹ ایک سب افسر ایک حوالدار
، نائک ایک لانس نایک اور سات جوان پر تھی۔ سکشن کی ترتیب ایک ہمارے
فی سید شریف الدین سب افسر اب بھی حیدرآباد میں قیام پذیر ہیں۔ ایک حیدر
رآبادی کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا۔

رائروپ نمبر ۲ تھا جس میں لفٹننٹ فتح علی صاحب سب آفسر راقم الحروف
دار ٹیک بہادر نایک ہری بھگت سنگھ لانس نایک مقصود علی اور سات سپاہی
۔ ہمارا کام دشمن کے علاقے میں گھس کر معلومات فراہم کرنا تھا۔ دشمن کے اہم
شں کو تباہ کرنا۔ ریلوے لائن اور ریلوں کو ڈائنامیٹ لگا کر اڑانا یہ ٹریننگ ہمیں
نگاپور میں دی گئی تھی یہ کورس مکمل کرنے کے بعد ہمیں ۱۵ اکٹوبر ۴۳ء کو رنگون (برما)
جدیا گیا تھا۔ پھر وہاں سے مانڈلے اراکان کو ہیانک اپنے مورچے بنائے اور دشمن سے
مدآزما رہے۔

(باقی آئندہ)

غزل

نعیم جاوید

نغمۂ جانفزا سب کو سنالوں تو چلوں
ساز الفت پہ نیا گیت میں گالوں تو چلوں

زلفِ جاناں کی طرح طول ہیں راہیں میری
راہ دشوار کو آسان بنالوں تو چلوں

بادہ نوشی ہو اگر ہوش و خرد ائے ساقی
میکشی کا بخوشی الزام اٹھالوں تو چلوں

حسن کافر ہو اگر غمزہ ہو خونریز تو سن!
سوئے مقتل بھی ایمان سنبھالوں تو چلوں

حضرت امجد حیدرآبادی

ایک قطعہ اور ایک مرثیہ

[جناب محمد اکبر الدین صدیقی وظیفہ یاب استاد جامعہ عثمانیہ اور رکن ادارہ ادبیات اردو اپنے ذخیرہ سے حضرت امجد حیدرآبادی کا ایک قطعہ اور ایک مرثیہ برآمد کیا ہے دونوں غیر مطبوعہ نہ کسی کتاب میں طبع ہوئے نہ کسی رسالے میں۔ قطعہ نواب بہادر یار جنگ اور نواب احمد علاء الدین یار کے بارے میں ہے۔ اور مرثیہ نواب احمد علاء الدین کے بارے میں ہے]

ذوالنشان

خداوند دو عالم کے خدائی کارخانے میں
بنے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں سینکڑوں انساں
مگر امجد نے دو انساں دیکھے اپنی آنکھوں سے
سخاوت میں علاء الدین خطابت میں بہادر خاں

بر علاء الدین خدا رحمت کند

اے علاء الدین اے بحر سخا — تو نے دامن مفلسوں کا بھر دیا
تیرے احسان و عطا و جود نے — حاتم طائی کو بھی سطے کر دیا

بر علاء الدین خدا رحمت کند
بر طریقش آل و اولادش زید

تیرے غم میں رو رہے ہیں مرد و زن — سب ہیں سینہ چاک مثل پیرہن
تو تو ہم سب کو بھلا کر چل دیا — یاد کرتے ہیں تجھے اہل وطن

بر علاؤالدین خدا رحمت کند
برطریقش آل واولادش زید

راہ حق میں اپنا سب کچھ دے دیا　　اپنی دولت ساتھ اپنے لے گیا
اہلِ جنت کہہ رہے [illegible] یہ صف　　مرحبا اھلاً وسہلاً مرحبا
بر علاؤالدین خدا رحمت کند　　برطریقش آل و اولادش زید
اہلِ دولت چل بسے سب چھوڑ چھوڑ　　تجھ کو رکھا حق نے اس لعنت سے دور
کیا خطر اب تجھ کو حشر و قبر کا　　جا خوشی سے حق تعالیٰ کے حضور
بر علاؤالدین خدا رحمت کند　　برطریقش آل واولادش زید
ہم نے تو دیکھا نہیں ایسا سخی　　موت پر جس کی تصدیق زندگی
آہ افسوس ایسا تاجر اب کہاں　　حق تعالیٰ سے تجارت جس نے کی
بر علاؤالدین خدا رحمت کند　　برطریقش آل واولادش زید
کیسے کیسے اہلِ دولت چل بسے　　کوئی پوچھا بھی نہیں وہ کون تھے
رہ کے دنیا میں جو ہو جو پائے دین　　لے سبق احمد علاؤالدین سے
بر علاؤالدین خدا رحمت کند　　برطریقش آل اولادش زید
اے خدا کے دوست اے عبدِ خدا　　حقِ عبدیت کیا تو نے ادا
تجھ پہ جو احسان مولا نے کئے　　اپنی حد تک تو نے بھی احساں کیا

بر علاؤالدین خدا رحمت کند
برطریقش آل واولادش زید

رحمتِ بے حد خدا کی تم پہ ہو　　آ رہے ہیں ہم بھی تم آگے چلو
تم ہو مقبولِ خدائے ذوالجلال　　ہم دعا کرتے ہیں، تم آمیں کہو

بر علاؤالدین خدا رحمت کند
برطریقش آل واولادش زید

اے خدا اے خالقِ ہر دوسرا　　سر بہ سجدہ ہو کے کرتا ہوں دعا
بخش دے امجد کے سب جرم و گناہ　　واسطہ احمد علاؤالدین کا

بر علاءالدین خدا رحمت کند
برطریقش آل واولادش زید

ماہنامہ شاداب حیدرآباد **غزل** ۶۰ **سکندر توفیق** اگست ۱۹۸۸ء

ہونٹوں نے جو چھو لیے تیرا نام لیا ہے
کرنوں نے سدا دامنِ دل تھام لیا ہے

دل ہے مرے جذبۂ الفت کا بھلا کون
تو نے تو ازل سے عجب کام لیا ہے

آئی نہ شبِ ہجر مگر مہر و وفا کا
پیمان مرے دل سے سرِ شام لیا ہے

کس درجہ بھی ہو کے تجھے ہم نے پکارا
ہاں ایک خوشی ہے کہ تیرا نام لیا ہے

تھا نہ جا وید کہ وہ چشم عطا ہے
ہر دستِ تمنا نے نیا جام لیا ہے

اوروں کی ہے تسکین ستاروں کی چمک میں
ہم نے تری یادوں سے یہی کام لیا ہے

بہلا نہ دلِ سادہ کو جنت کی ہوا سے
دیدار کا وعدہ ہے سرِ عام لیا ہے

ہاں تیری مشیئت سے نہ دل تنگ ہوئے ہم
خود اپنی تباہی کا بھی الزام لیا ہے

ناوک ہی سہی سینہ میں آئے تو دل کی
یا کہ یہ تسلی کہ تہہ دام لیا ہے

وہ نام ہی مونس ہے خوشی ہو کہ غمی ہو
جو راہ کوئی اس کو یہ ہر گام لیا ہے

جو بات سرِ بزم تھی دہرائی ہمارا
ہم نے کبھی نجت سے نہ کچھ کام لیا ہے

(بیت تمیم۔ تلک نگر۔ حیدرآباد-۲۴..۵

غزل

(مرزا غفار بیگ اثر گلشن آبادی)

اشارے ان کے تباہی میں پائے جاتے ہیں۔
یہ فتنے اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں۔

یہ مصلحت کوئی دیکھے ادائے قاتل کی
ہماری لاش پہ آنسو بہائے جاتے ہیں۔

ادھر عدو کے عمل سے بھی چشم پوشی ہے
ادھر خیال پہ پہرے بٹھائے جاتے ہیں

نہ جانے کب تک اس طرح سبزہ و گل میں
یہ روندے جاتے ہیں وہ مسکرائے جاتے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ ہم جیسے با اثر ہو کر
انھیں کے سامنے گردن جھکائے جاتے ہیں۔

مرکز ادب حیدرآباد کا طرحی مشاعرہ ۱۱ جون ۱۹۸۸ء

مصرعہ طرح: اس زندگی کا قرض نہ پھر بھی ادا ہوا

طرحی غزلیں

عزیز بھارتی

شہر خموش میں یہ عجیب واقعہ ہوا
سناٹا اب تو لگتا ہے کچھ بولتا ہوا

حیران ہوں کہ آج اچانک یہ کیا ہوا
جو میرے حق میں سنگ تھا وہ آئینہ ہوا

لو جا رہا ہے، وقت کا تازہ شکار وہ
اپنے مکان کا ہی پتہ پوچھتا ہوا

کیوں بھاگنے لگے ہیں سبھی لوگ یک بیک
کیا زندگی سے بڑھ کے، کوئی حادثہ ہوا

ہر چیز جوں کی توں ہے، مگر اے عزیز من
اپنائیت کا ایک وہ احساس کیا ہوا

حیرت سے دیکھتے رہے محکوم وقت سب
جب وقت میرے سامنے بے دست و پا ہوا

کیا جانے اس کو کون سے لمحے کی ہے تلاش
اک حرف مدعا ہے زباں پر رکا ہوا

ہر شخص مجھ کو پڑھنے کی کوشش میں ہے یہاں
چہرے پہ میرے کیا پتہ، کیا ہے لکھا ہوا

تب جا کے ہم پہ اپنی حقیقت کھلی عزیز
خود اپنے ہی وجود سے جب آشنا ہوا

عزیز بھارتی　صدر مرکز ادب 12-1-922/10 آصف نگر حیدرآباد 500028-

مومن خاں شوق

پتھر ہوا، سراب ہوا، آئینہ ہوا　　میرا وجود کیا پتہ، اب کیا سے کیا ہوا
اچھا ہوا، برا ہوا جو بھی ہوا نصیب　　ہر شخص جی رہا ہے یہی سوچتا ہوا
ہر سانس ہم نے سود کی صورت ادا تو کی　　"اس زندگی کا قرض نہ پھر بھی ادا ہوا"
بے چہرگی نے فصلِ تمنا اجاڑ دی　　جیسے ہر ایک چہرہ پہ چہرہ لگا ہوا
آدابِ زندگی ہے، نہ اقرار آرزو　　یادوں نے ایک شہر بسایا تھا کیا ہوا
ہر روز قتل و خون، فسادات، لوٹ مار　　تم ہی بتاؤ آج کے انساں کو کیا ہوا

یادوں کی انجمن میں وہ چل چل رہی ہے شوق
جیسے کتابِ دل ہو کوئی کھولتا ہوا

معتمد عمومی مرکز ادب　　اشرف ولا ۲۳-۳-۱۱ محلہ پلی حیدرآباد ۰۰۰

محمود شریف محمود

تہذیبِ نو میں شرم کا پردہ ہوا ہوا　　حیرت تو یہ ہے غیرتِ انساں کو کیا ہوا
اب ارتقاء کے نام پہ سب کچھ الٹ گیا　　اچھا برا ہوا ہے تو کھوٹا کھرا ہوا
ٹوٹا نہ تھا یہ دل تو کسی کام کا نہ تھا　　کھا کر نظر کی چوٹ بڑے کام کا ہوا
رعنائی حیاتِ گلِ تر نہیں رہی　　ڈالی سے ٹوٹ کر جو چمن سے جدا ہوا
اپنی برائیوں پہ کسی کی نظر نہیں　　کہتے ہیں سب کہ یار زمانہ بُرا ہوا
بے رہروی کے داغ کہاں چھپ سکے کبھی　　چادر ریا کی لاکھ جو اوڑھے تو کیا ہوا
آگے کی فکر کیجیئے منزل کی کھوج میں　　پیچھے نہ مڑ کے دیکھیئے جو کچھ ہوا ہوا

مر مر کے ہم حیات پہ محمود مٹ گئے
"اس زندگی کا قرض نہ پھر بھی ادا ہوا"

شریک معتمد مرکز ادب

شہاب حیدرآبادی

ہنگامہ بے سبب نہ سرِ رہ بپا ہوا
وہ سچ تھا، جس پہ جھوٹ کا سب کو شبہ ہوا

یہ بھی تو وقت ہی کی نوازش ہے دوستو
کل تک جو سنگِ راہ تھا وہ دیوتا ہوا

اغیار ہی سے پائی ہیں میں نے سہولتیں
اپنوں سے تو مجھے نہ کبھی فائدہ ہوا

حالات کی تپش کا اثر ہے مزاج پر
انسان اپنے آپ نہیں ہے جلا ہوا

دستک دیئے بغیر ہی آجائیے حضور
دروازہ آپ ہی کے لئے ہے کھلا ہوا

رہبر کا روپ دھار لیے [illegible] شہاب
منزل کی سمت [illegible] رواں قافلہ ہوا

عزیز ناگپوری

اب وقت کا مزاج ہے ایسا بنا ہوا
جو بے وفا ہوا وہ بڑا با وفا ہوا

حیرت ہے مجھ کو یہ کہ زمانے کو کیا ہوا
کتنے دلوں میں آج ہے کینہ بھرا ہوا

کیوں اشکبار سامنے تو ہے کھڑا ہوا
پہلے ہی رنج و غم سے ہے یہ دل بھرا ہوا

اتنا ملال کرنے سے کچھ فائدہ نہیں
چھوڑو ذرا سی بات میں کیا ہے رکھا ہوا

کردار بھی بڑے ہوں بڑائی کے واسطے
کب اپنے منہ سے آپ بھی کوئی بڑا ہوا

ہم تو عزیز جان بھی اپنی لٹا چکے
اُس زندگی کا قرض نہ پھر بھی ادا ہوا

کب تک جفائیں [illegible] سہیں گے عزیز ہم
کیوں حق کے منہ پہ اب بھی ہے تالا پڑا ہوا

نام پلی روبرو درگاہ یوسفین حیدرآباد دکن آندھرا پردیش

محمد ابراہیم خلیل

سائیکل پہ جا رہا تھا عجیب حادثہ ہوا
ٹکراؤ ان سے ہو گیا جب سامنا ہوا

برہم وہ مجھ پہ ہو گئے رستہ جدا ہوا
میں سوچتا ہی رہ گیا آخر یہ کیا ہوا

میں تو جہاں کھڑا تھا وہیں ہوں کھڑا ہوا
تم بن گئے وزیر مرا بھی بھلا ہوا

چہرہ پہ داغ اس کے اگر ہے تو کیا ہوا
پھرتا ہے شہر شہر وہ ہیرو بنا ہوا

ہر شخص پوچھتا ہے کہ آخر یہ کیا ہوا
جو واقعہ نہ ہونا تھا وہ واقعہ ہوا

مقروض ہو گئے گھر میں چھپے بیٹھے ہیں حضور
باہر سے دیکھیے تو ہے تالا لگا ہوا

جب سے سنا ہے آئیگی شوٹنگ کو پدمنی
ہے عاشقوں کا شہر میں میلہ لگا ہوا

گلشن میں دور زاغ و زغن کا ہے آج کل
ہے شاخ شاخ گل پہ الّو بسیرا لیا ہوا

لوٹا مشاعرہ وہ ترنم کے زور پر
لیکن وہ تھا کلام کسی کا لکھا ہوا

اشعار اپنے جوں ہی سنانے لگے خلیل
محفل میں زور و شور سے کیا واہ واہ ہوا

مکان نمبر 23-1-646/6 مغلپورہ ـ حیدرآباد

ج : ۵
ش : ۹

ستمبر ۱۹۸۸ء

ماہ نامہ

شاداب

حیدرآباد

قیمت فی پرچہ
5
روپئے

ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری

مینیجنگ ایڈیٹر: نعیم جشاوید

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
انہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپے
ال	90 "	270 "	65 "	36 "	225 " "
یات	1000 "	2500 "	450 "	300 "	2000 " "

سیل زر کا پتہ :- ماہ نامہ شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

یڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان
چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004
آندھرا پردیش سے شائع کیا YS

فہرست

حرفِ اوّل

اُردو: دوسری سرکاری زبان اُردو کے لئے آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا موقف حاصل کرنے کے لئے گذشتہ تین چار مہینوں سے اردو والوں کی جانب سے جدو جہد جاری ہے۔ یکم اگسٹ کو تاریخی چار مینار سے قانون ساز اسمبلی تک اُردو بچاؤ تحریک کی جانب سے جلوس کے اعلان سے قبل جناب بشیر الدین بابو خاں نے صحافتی بیان دیا کہ چیف منسٹر جناب این ٹی آر یکم اگسٹ کو ایوان اسمبلی میں اُردو کے ضمن میں حکومت کے موقف اور فیصلہ کو اعلان کرینگے، اُردو زبان کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا موقف دینگے اور اس سلسلہ میں قانون سرکاری زبان میں مناسب ترمیم کرینگے۔ موصوف نے یہ بتایا کہ ۲۹/جولائی کو ان کے بشمول وزیر اوقاف و اردو اکیڈمی جناب این محمد فاروقی، وزیر سیاحت ڈاکٹر الاڈی راجکمار اور صدر نشین ریاستی اقلیتی کمیشن جناب ایم الفر بیگ سے بات چیت کی اور مندرجہ بالا تصفیے کر کے جناب بشیر الدین بابو خاں کو ہدایت دی کہ وہ اردو داں عوام کو بذریعہ صحافت اس سے مطلع کردیں۔

چیف منسٹر کے اس بالواسطہ اعلان کے بعد یکم اگسٹ کے جلوس کو ملتوی کردیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ مگر جلوس نکالا گیا اور ڈاکٹر چنا ریڈی نے چار مینار سے جلوس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ چیف منسٹر اُردو سے انصاف کرتے تو جلوس کی نوبت ہی نہ آتی۔ جناب سلطان صلاح الدین اویسی نے کہا کہ اگر حکومت ایک ہفتہ کے اندر اردو والوں کو مطمئن کرنے والی قانون سازی میں ناکام رہے تو احتجاجی تحریک میں شدت پیدا کردی جائے گی۔ انتہائی محدود وسائل اور ناسازگار حالات کے باوجود اس تحریک نے ساری ریاست میں جو ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ہے وہ فقید المثال ہے۔

اس عظیم الشان اور پرامن جلوس کے بعد اسمبلی میں تقریباً دو گھنٹے اس بارے میں مباحث ہوئے تمام جماعتوں سے تعلق رکھنے والے (۲۶) ارکان نے قاعدہ ۳۰۴ کے تحت اس مسئلہ کو موضوعِ بحث

بنایا، چیف منسٹر نے جناب بشیرالدین بابو خان کے بیان کے مطابق اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان تو نہیں کیا مگر یہ تیقن دیا کہ حکومت ایک ایسا جامع جی او جاری کرے گی جو اردو پر عمل آوری کی غرض سے اب تک جاری کردہ متعدد احکام پر مبنی ہوگا۔ اردو پر عمل آوری کی نگرانی کرنے کے لئے مختلف سطح پر کمیٹیاں بھی تشکیل دی جارہی ہیں، نیز دیگر تجاویز جیسے ایک علحدہ اردو سیل کا قیام اور سرکاری زبان کمیشن میں ایک اُردو داں نائب صدر نشین کی شمولیت پر غور کیا جائے گا۔

اُردو بچاؤ تحریک کی جانب سے اسپیکر اسمبلی جناب جی نارائن راؤ کی ایک یادداشت پیش کی گئی جس میں خواہش کی گئی ہے کہ وہ چیف منسٹر کو ترغیب دیں کہ وہ تمام مسائل کی یکسوئی کے لئے بات چیت شروع کردیں۔ اس لئے کہ اُردو تحریک کے پیچھے کوئی سیاسی مقاصد کارفرما نہیں ہیں۔ ہم جناب جی نارائن راؤ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اُردو مسئلہ کے حل کے لئے اپنی کوششوں سے دریغ نہ کریں کہ اردو کے مسئلہ کا حل ملکی و قومی اتحاد و اتفاق کا باعث ہوگا۔ اور ملک کی سیکولرزم کو مضبوط بنائے گا۔

حج کمیٹیوں کی مجرمانہ بدانتظامی :-

حج اڑانوں کے آخری تین دنوں میں دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کمپلکس میں بڑی افراتفری رہی۔ حاجی روزانہ لائن میں لگتے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہنے کے بعد انہیں جواب ملتا کہ ان کا پاسپورٹ نہیں آیا۔ ویزا نہیں لگا۔ سیٹ کنفرم نہیں ہوئی یا ان کے کاغذات دستیاب نہیں ہورہے ہیں، لیکن ساتھ ہی سفارش کا بازار گرم رہا۔ عام لوگ لائن میں کھڑے دھکے کھاتے رہے۔ اور دفتر کے دروازے شکل دیکھ کر کھولے جاتے رہے اور اپنے لوگوں کو کاغذات دیئے جاتے رہے۔ جب عام زائرین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ زبردستی دفتر میں گھس گئے تو پولیس کے ڈنڈوں نے انہیں نکال باہر کیا۔ اور یہ لوگ وہ تھے جنہیں حج کمیٹی نے ڈاک سے اطلاع دے کر دہلی بلایا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کے رہنے سہنے کا انتظام نہیں کیا گیا بلکہ ان سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کی گئی۔ مجبوراً وزارت خارجہ و سیاحت و شہری ہوابازی کے وزراء سے ربط پیدا کیا گیا تو ان کی مداخلت پر ان زائرین کی روانگی کا انتظام کیا گیا پھر بھی تمام رقومات جمع کرانے اور تمام کارروائیوں کی تکمیل کے بعد بھی تقریباً ہزار حاجیوں کو واپس ہونا پڑا اور حج کی سعادت سے محروم رہے۔

اس تمام بدانتظامی اور بددیانتی کی ذمہ داری بڑی حد تک دہلی حج کمیٹی ہے۔ جس نے ایسے نااہل اور ناتجربہ کار لوگوں کو بطور خدام مقرر کیا جو خدمت کا جذبہ نہیں رکھتے تھے بلکہ خود ہی عازمین کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف تھے اور دیگر کارندے بھی نہ صرف اپنا مفوضہ کام نہیں کر رہے تھے بلکہ عازمین سے بدسلوکی کے مرتکب تھے۔

صدر صاحبہ دہلی حج کمیٹی اس افراتفری کی ذمہ دار مرکزی حج کمیٹی کو قرار دیتی ہیں۔ ضرورت ہے۔ کہ ذمہ داری کا تعین کیا جائے۔ اور ان بحرمانہ کوتاہیوں کے مرتکب افراد کو کم سے کم اس ذمہ داری سے سبکدوش کردیا جائے۔ اور خدمت کے جذبہ سے متاثر لوگوں کو حج کمیٹی میں شریک کیا جائے۔ تاکہ یہ تکلیف دہ صورت حال دوبارہ وقوع پذیر نہ ہو —

سلسلہ ص ۲۶

ع۳ حساب سے مراد ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، مساحت اور گراف ہے۔

ع۴ مادری زبان سے مراد اردو ہو سکتی ہے۔ اور قومی زبان کا مطلب ہندی ہے

ع۵ مختلف مدارس میں گھنٹوں کی تعداد مختلف ہے۔ مناسب ہوگا کہ روزانہ آٹھ گھنٹے ہوں اور ہفتے میں ۴۸ گھنٹے ہوں۔

ع۶ فی الحال یہ مناسب ہوگا کہ ترقی اردو بورڈ یا یو۔پی بورڈ کی سائنس کی کتابیں درسی نصاب کرلی جائیں اور یونیورسٹی میں داخلے کی شرط کم از کم ہائی اسکول کے معیار کے مطابق سائنس سے واقفیت ہونی چاہیے جس میں کچھ پریکٹیکلس (PRACTICALS) بھی شامل ہوں۔

دوازدہم کے بعد اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس کو طویل تجربہ کے بعد دنیا نے مفید پایا ہے۔ دورِ حاضر میں علوم اس قدر وسعت اختیار کر چکے ہیں کہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل ہونا ممکن نہیں ہے۔

فرانسیسی نومسلم روجر گیراوڈی

صیہونیت

[روجر گیراوڈی ۱۹۱۳ء میں مارسیلز میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں فرانسیسی فوج میں شامل ہوا لیکن ۱۹۴۰ء میں اسے الجزائر کے ایک کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں سے اس کی رہائی ۱۹۴۳ء میں ممکن ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں روجر گیراوڈی نے فرانس کی قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا اور منتخب ہونے کے بعد ڈپٹی اسپیکر اور پھر سینیٹر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد اس نے خود کو تعلیم و تدریس اور تحقیق و تصنیف کے لئے وقف کر دیا اور یونیورسٹیوں میں سیاسیات اور تہذیبی فلسفے پر لیکچرز دینے اور لکھنے لگا۔ کئی سال تک بطور مارکسسٹ تھیوری کے ماہر ہونے کی حیثیت سے خود کو متعارف کروانے کے بعد اس کا رجحان اسلامی تعلیمات کی طرف ہوا اور اسلام کی عظیم تعلیمات سے متاثر ہونے کے بعد ۱۹۸۲ء میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اپنی کتاب (R. GARAUDY THE CASE OF ISRAEL) میں فاضل مصنف نے اسرائیل کی سیاسی دہشت گردی کا جائزہ مکمل غیر جانبدارانہ پیش کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی ہے کہ صیہونی سیاسی فلسفے کی بنیاد ہی ایسے اصولوں پر رکھی گئی ہے جو عالم انسانیت کے لئے بڑے تباہ کن اثرات کے حامل ہیں۔

مصنف نے بائبل کے حوالے سے صیہونی مملکت اور موجودہ صیہونی ریاست کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہودیوں کے خود ساختہ دعویٰ "خدا کا انعام" کو غلط ثابت کیا ہے اور یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ موجودہ فلسطینی ریاست کو ہڑپ کر کے اسے اسرائیل میں تبدیل کرنا در اصل خدا کے دعوے کا پورا ہونا ہے، غلط اور بے ہودہ پراپیگنڈا کے سوا کچھ نہیں۔ مصنف نے اسرائیل کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیتے ہوئے دنیا کو مستقبل میں لاحق ہونے والے خطرات کی نشاندہی کر دی ہے۔ جو صیہونی استعماریت کی موجودگی میں عالم انسانیت کو پیش آ سکتے ہیں۔]

میں نے ایک دبے ہوئے

عنوان کو دوبارہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرانس میں آپ کیتھولک چرچ اور مارکسزم پر کھل کر تنقید کر سکتے ہیں۔ لامذہبیت یا نیشنلزم پر لعن طعن کر سکتے ہیں امریکہ، روس، افریقہ کے نظام سیاست پر کوئی بھی رائے کھل کر دینے کا حق رکھتے ہیں۔ الا یہ کہ اب "تشدد" اور "توڑ پھوڑ" کا پرچار بھی بلا روک ٹوک کر سکتے ہیں کوئی آپ پر قدغن نہیں لگائے گا نہ ہی آپ کو کچھ کہا جائے گا۔

لیکن جیسے ہی آپ نے صہیونیت کے مکروہ چہرے پر پڑی نقاب کو سرکانے کی کوشش کی آپ کو بالکل مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑے گا نہ صرف غیر قانونی بلکہ قانونی ہتھکنڈوں کو بروئے کار لا کر آپ کو اپنے مقصد سے الگ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ خاص طور پر ۲۹ جولائی ۱۸۸۱ء کو بننے والے ایک قانون کے شکنجے میں آپ کو ضرور پھنسانے کی کوشش کی جائے گی۔ جس کی رو سے آپ اسرائیلی ریاست اور صہیونی سیاسی دہشت گردی پر کوئی تنقید اس نوعیت کی نہیں کر سکتے جس سے اسرائیل کی "اسٹیٹ پالیسی" پر زد آتی ہو۔

ایمانداری سے تنقید کو تو ایک طرف رکھئے کبھی اگر آپ نے ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے ہی صہیونی سیاسی غنڈہ گردی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو آپ پر "نازی" کا لیبل چسپاں کر دیا جائے گا اور اس کے بعد آپ کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ کسی بھی لمحے آپ کی اچانک موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ غیر طبعی موت ہی ہو۔ کسی بھی پر اسرار طریقہ سے آپ کی ہلاکت ممکن ہے اور میرے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ مجھ پر "نازی" ہونے کا الزام لگایا گیا۔ قاتلانہ حملے کئے گئے اور دھمکیاں تو روزانہ کا معمول بن چکا ہے صہیونی سیاسیات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ کہ ہم مذہبی صہیونیت اور سیاسی صہیونیت اور یہودیت کے درمیان فرق کا جائزہ لے لیں۔ اس طرح بائبل میں بیان کردہ "اسرائیل" اور صہیونی اسرائیل کے درمیان فرق جاننا ضروری ہے۔

مذہبی صہیونیت اور سیاسی صہیونیت اصل میں دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور صرف الگ الگ نام دے کر انہیں دو متضاد چیزیں نہیں کہا جا سکتا۔ مذہبی صہیونیت پر بات عموماً بائبل کے اس حوالے سے کی جاتی ہے۔ کہ بالآخر مسیح

کی بادشاہت قائم ہوگی اور وہی "خدا کی بادشاہت" کہلائے گی لہٰذا بادشاہت جس خطہ زمین پر قائم ہوگی وہ اسرائیل ہوگا اور دنیا کو صرف اس خطہ زمین پر امان میسر آئے گی اور یہ وہی مقام ہے۔ جہاں ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کا نزول ہوا۔ اس مذہبی تصوری کا سے یہودیوں میں "مقدس سرزمین" کے نظریئے کو جنم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کونے کونے میں موجود یہودی چاہے ان کا تعلق کسی کمیونسٹ ملک ہی سے تھا اس مقام پر اکھٹے ہوا شروع ہوئے پھر ایک ایسا دور ۱۹ ویں صدی میں آیا جب یہودیت کے پرستار زیو قرنامی تنظیم نے اس مقام کو یہودیوں کا "مرکز روحانیت" قرار دے دیا۔ اور یہ بات بھی یہودیوں کے ایمان کا حصّہ بن گئی۔

تاریخ کے مطالعے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی اس نقطہ نظر کی مخالفت نہیں کی کیونکہ حضرت ابراہیمؑ مسلمانوں کے لئے بھی بہت قابل احترام نبی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی اس مذہبی سوچ کو فلسطین کے عرب باشندوں نے خواہ مسلمان تھے یا عیسائی کبھی ہدف تنقید نہیں بنایا۔ یہاں تک کہ یہودیوں نے انہیں بے دخل کرکے ان کے گھر بار چھیننے شروع کردیئے اور خود فلسطین کے مالک بن بیٹھے سیاسی صیہونیت کا آغاز در اصل تھیوڈور ہرزل (1860-1904) نامی یہودی اسکالر نے کیا جس نے ۱۸۹۲ء میں "وی آنا" میں اپنی ڈاکٹریٹ کے حصول کے وقت اس نظریئے کو متعارف کرایا اور پھر ۱۸۹۶ء میں اپنی کتاب میں "یہودی ریاست" کا باقاعدہ نقشہ بھی پیش کردیا۔ پھر اس کے حصول کے لئے پہلی مرتبہ ۱۸۹۷ء ہی میں پہلی بین الاقوامی یہودی کانگریس بھی طلب کرلی۔ یہ کانفرنس "بسلے" میں بلائی گئی اسی کانگریس میں یہودی ریاست کے لئے باقاعدہ آئین تیار کیا گیا۔ اس کے بعد سے ہرزل نے باقاعدہ اپنے نظریات کا پرچار شروع کیا اور اس نے ضمن میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان لوگوں کی بھی مخالفت کی جو یہودیت کو صرف ایک مذہب کی حیثیت دیتے تھے۔

ہرزل کے نظریات پر مذہب سے زیادہ سیاست کا رنگ غالب تھا۔ اس نے صیہونیت کو درپیش مسائل کا ایک الگ انداز سے تجزیہ کرنا شروع کردیا۔ اس کے نظریات کا نچوڑ کچھ اس طرح سے ہے۔

۱۔ یہودی خواہ وہ دنیا میں کہیں بھی رہتا ہو، قانونی طور پر ان کی حیثیت "ایک آدمی ملک کی ہے۔

۲۔ یہودی ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ستم رسیدہ کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔
۳۔ وہ جس قوم میں بھی موجود ہوں اپنی الگ شناخت برقرار رکھیں گے۔ اور اس قوم کا حصہ متصور نہیں ہوں گے۔

اگر ہرزل کے نظریات کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو کچھ ایسی صورت سامنے آتی ہے کہ مشرقی یورپ روس میں تو یہودیوں کو اپنی الگ حیثیت منوانے کی اجازت نہیں تھی جبکہ مغربی یورپ خصوصاً فرانس میں انہیں یہ حیثیت حاصل تھی۔

ہرزل نے یہودیوں کو بتایا کہ ایک "روحانی گھر" ہی نہیں بلکہ ایک علیحدہ یہودی وطن چاہیئے۔ جہاں وہ اپنی روایات کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ ہرزل کہتا ہے ایسی ریاست کو ایک "خالی اور الگ تھلگ" مقام پر معرض وجود میں لایا جائے۔ اس بات سے ایک "نوآبادیاتی نظام" کا نقشہ سامنے آتا ہے اور ہرزل اور اس کے پیروکاروں نے بالآخر اس نظریئے کے تحت عربوں کو بے دخل کر کے جبراً فلسطین میں اسرائیل قائم کیا

۔یہودی ریاست کے قیام کے لئے کون سی جگہ منتخب کی جائے؟ ہرزل اس درد سر میں نہیں گیا۔ اس نے خاص طور سے فلسطین ہی کو اسرائیل میں تبدیل کرنے پر زور نہیں دیا بلکہ اس کے پیروکار بائیروں ہرش نے تو اس سلسلے میں یوگنڈا اور ارجنٹائن کے نام بھی لیا ہے یوں دکھائی پڑتا ہے کہ جیسے اس مقصد کے لئے ہرزل نے جنوبی آفریقہ کو منتخب کیا تھا۔ کیونکہ ہرزل کے بقول "نوآبادیات" کا تصور آفریقہ جیسے پسماندہ برصغیر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جہاں تک حد سدی کا تعلق ہے۔ تو ہرزل فلسطین کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ اسے "صیہونیت کے عاشق" کی اصطلاح اس مقام پر متعارف کروانے میں زیادہ آسانی دکھائی دیتی ہے اس کا خیال تھا اگر وہ تلم جیسے مقدس مقام پر یہ ریاست معرض وجود آگئی تو دنیا بھر کے یہودیوں کے نزدیک خود بخود اسے زبردست مذہبی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہرزل خود کبھی "مذہبی یہودی" نہیں رہا۔ ہرزل کی مکارانہ خواہش کو باقاعدہ عملی جامہ برطانیہ نے پہنایا۔ جب اس نے ۱۹۱۷ء میں "بالفور ڈیکلریشن" کے ذریعے فلسطین میں الگ یہودی ریاست کو یہودیوں کی بقا کے لئے ضروری قرار دیا۔ بعد میں یہودیوں کی سیاسی لیڈرشپ نے اسی "بالفور ڈیکلریشن" کو ایکسپلائیٹ کیا اور تمام اصول اخلاق و سیاست بالائے طاق رکھتے ہوئے غنڈاگردی اور مکاری کے ذریعے مغربی گماشتوں کی پشت پناہی سے سارا فلسطین ہتھیا کر وہاں اپنی حکومت اسرائیل کے نام سے قائم کر لی۔ یہودی سیاست

کے عاصبانہ کردار کی بہترین مثال ہے۔ اور انسانیت کے لئے ایک بدترین مثال تھی۔ خاص طور سے دنیا بھر کے امن پسند انسان خواہ ان کا تعلق کسی بھی قوم سے ہو اس سے نفرت کا اظہار کریں گے۔

صیہونیت اور یہودیت ۱۸۹۴ء میں برنارڈ لازاری کی کتاب کی اشاعت کے فلسفے سے تقویت پکڑی اور ۱۹ویں صدی کے آخر میں یہودیوں میں یہ نظریہ بہت تقویت پکڑ گیا کہ وہ دنیا کی "معزز ترین" قوم ہیں اور دنیا بھر کے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق ان کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔ اس طرح یہودی بھی جرمنوں کی طرح استعماریت پسند اور متشدد آمرانہ نظریات کی حامل قوم بن گئے۔ لازاری نے بتایا تھا کہ اس گھناؤنے منصوبے کا آغاز یہودیوں نے ۱۲ویں صدی میں کر دیا تھا۔ ان کے صیہونیت اور یہودیت سے متعلق عزائم کو ۱۲ویں صدی میں مبسوط شکل دے دی گئی تھی۔ یہودیوں کی یہ مقدس دستاویز اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔

۱۸۹۶ء میں دوبارہ لازاری نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس دستاویز کے حوالے سے لکھا تھا کہ اسرائیل کی شکل میں یہودی ایک ایسی ریاست قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں جو دنیا بھر کی اقوام سے الگ تھلگ ایک ریاست ہوگی اور جس کے مکیں خود کو دنیا کے اعلیٰ ترین باشندے تسلیم کریں گے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہودیوں نے توریت اور زبور کے کئی قدیم نسخے جلا کر تباہ کر ڈالے جو ان کی اہمیت بیان کرتے تھے۔ اور بائبل اور توریت کے صرف ان حصوں کو محفوظ رہنے دیا جو ان کے مطلب پر پورے اترتے تھے۔ اس سلسلے میں جس طرح بائبل کے قدیم نسخوں میں رد و بدل کیا گیا وہ ساری دنیا پر آشکار ہے۔ یہودی سازشوں ہی کی وجہ سے آج دنیا میں ایک کے بجائے بے شمار بائبل موجود ہیں اور اسرائیل کو دنیا بھر کے یہودیوں کا مرکز توجہ بنانے کے لئے سازشوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔ مقدس کتابوں میں رد و بدل کے ذریعہ اسرائیل کے بیٹوں کے فلسفے نے جنم لیا۔ جنہیں دنیا کے مقدس ترین لوگ قرار دیتے ہوئے دنیا کی قیادت بھی انہی کو سونپنے کا حق تفویض کر دیا گیا۔ اور اسرائیل کا بزعم خویش یہ فرض بھی بن گیا کہ وہ انسانیت کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دے۔

۱۸۹۷ء میں "باسل کانگریس" کے موقع پر اس دستاویز کی ترتیب سے روس کی خفیہ پولیس نے یہودیوں کے ہاتھ ہر طرح مضبوط کئے۔ اصل میں روسی یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک نئی لڑائی کی ابتدا کروانا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔

(ماخوذ)

سید ہاشم علی

اساتذہ سے خطاب

یہ خطبہ صدارت مرکز فروغ سائنس کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے مسلم زیر انتظام اسکولوں کے اساتذہ کے ریفریشر کورسوں کی افتتاحی نشست میں دیا گیا ۔

ان ریفریشر کورسوں کے بارے میں جو رپورٹیں ابھی پیش کی گئیں اور جو تفصیلات میرے سامنے آئیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس ٹریننگ پروگرام کا کافی اچھا اثر ہوا ہے ۔ میں اس کے لئے مرکز فروغ سائنس کے کارکنان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے اپنے فرائض منصبی سے آگے بڑھ کر یہ ذمہ داری قبول کی ہے مجھے یقین ہے کہ اس تربیتی پروگرام سے آپ حضرات کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا اور آپ کی کارکردگی اور تندہی پر ایک مثبت اثر پڑیگا ۔ یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے اسکولوں کی خدمت بہتر طور پر انجام دے سکیں گے اور اپنے طلبا کو زیادہ بہتر طور پر پڑھا سکیں گے ۔

آپ مسلم زیر انتظام اسکولوں کے اساتذہ ہیں ۔ کانسٹی ٹیوشن کے لحاظ سے ہندوستان کے سب شہری برابر کے حقوق رکھتے ہیں لیکن چند تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر کچھ لوگوں کو نامواقف حالات کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ۔ چنانچہ اگر آپ نے ساتویں پلان کے ڈاکومنٹس (Documents) کو پڑھا ہوگا اور نئی ایجوکیشن پالیسی کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی ہوگی تو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ اب خود ہماری حکومت کو اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کے سب سے پسماندہ لوگ ہیں اور جب حکومت کے کسی اعلان یا پالیسی پیپر میں اس بات کا ذکر ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حکومت

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

کے پاس ایسے اعداد و شمار ہیں جن کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ اس لئے ہمیں مان کر چلنا ہوگا کہ آج مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیم کے میدان میں سب سے پچھڑے گروہ ہیں۔

میں اس جھگڑے میں نہیں پڑوں گا کہ اس تعلیمی پسماندگی کی وجہ کیا ہے؟ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں حکومت اور اقلیتوں دونوں کا برابر کا ہاتھ ہے۔ میں حکومت کی کئی ایسی پالیسیوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں جن کی وجہ سے لسانی اقلیتوں کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ اور جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنی ہیں۔ مثلاً تعلیم کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے مگر ہماری حکومت کو زبان کی بابت کوئی فیصلہ کرنے میں کئی برس لگ گئے اور جب اس نے اس بابت سہ لسانی فارمولے کی شکل میں ایک فیصلہ کیا بھی تو وہ ریاستی، قومی اور بین الاقوامی زبانوں پر مبنی تھا۔ اس کے باوجود یہی سہ لسانی فارمولا ہندی ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کے لئے بڑا کارآمد ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر یوپی اور بہار میں ایک کافی بڑی اقلیت کی زبان اردو ہے۔ ان ریاستوں میں چونکہ قومی زبان یعنی ہندی ہی ریاستی زبان بھی ہے۔ اس لئے سہ لسانی فارمولے کے ایک ایماندارانہ عمل درآمد کے طور پر بہار کی اردو اقلیت کے بچوں کو بہ آسانی یہ سہولت فراہم کی جاسکتی تھی کہ وہ اردو بہ حیثیت مادری زبان، ہندی بہ حیثیت ریاستی اور قومی زبان اور انگریزی بہ حیثیت بین الاقوامی زبان کے پڑھیں۔ اس طرح ان ریاستوں کی اردو اقلیت میں وہ بے اطمینانی اور ناراضگی نہ پائی جاتی جو آج ہے۔ ہر دوراندیش حکمراں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ملکی آبادی کا کوئی قابل لحاظ حصہ ان سے بلا وجہ ناراض نہ رہے۔ لیکن یہاں دوراندیشی اور فراست کو بالائے طاق رکھ کر بلا وجہ ہی ایک بڑی تعداد کو ناراض کر دیا گیا ہے۔ حکومت کی یہ لسانی پالیسی کی ایک بڑی وجہ ہے جو مسلمان بچے ابتدائی تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں کیونکہ اردو میں جو کہ بالعموم ان کی مادری زبان ہے، ابتدائی تعلیم کا حکومت کی طرف کوئی خاطر خواہ نظم نہیں ہے۔ مسلمان بچے یا تو مکتب کی طرف رُخ کرتے ہیں یا تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ اس طرح ہماری تعلیمی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ حکومت کی پالیسیوں میں وہ فراخ دلی نہیں ہے جو ایک دوراندیش حکومت میں ہونی چاہیے۔

اسی نوع کی ایک بات اور ہے۔ کچھ دنوں پہلے این سی سکسینہ نے مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب پر تحقیق کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ بتایا کہ جن جن جگہوں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ وہاں پر بالعموم پولیس اسٹیشن قائم کئے گئے ہیں اور

جگہوں پر مسلمانوں کی آبادی جہاں پر کم ہے یا دوسرے فرقے کے لوگ زیادہ ہیں وہاں پر اسکول۔ اس قسم کی اقلیتوں کی ترقی میں مانع غلط پالیسیوں کی ایک بڑی وجہ تعصب ہے۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ جس تعصب سے ملک کا اتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے کہ آبادی کا ایک قابل قدر حصہ پسماندہ رہ جائے، اس سے آپ دور رہیں۔ آپ اسکولوں کے اساتذہ ہیں۔ آپ نہ صرف خود کو تعصب سے پاک رکھیں بلکہ یہ کوشش کریں کہ تعصب کے جراثیم آپ کے طلباء میں نہ پھیلنے پائیں۔ آپ کا شاگرد چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا کوئی اور اسے آپ کی طرف سے انصاف ملنا چاہئے۔ اگر وہ کلاس کا سب سے ہونہار ہے تو خواہ آپ کا کوئی مذہب ہو، اس بچے کو پورے نمبر ملیں تاکہ اس میں یہ احساس نہ پیدا ہو کہ فلاں مذہب کے استاد نے میرے ساتھ یہ ناانصافی کی۔ اور جب اس قسم کی ناانصافیوں کا احساس بچپن سے دلوں میں نہ رہے گا تو مستقبل کا ہندوستان کچھ اور ہی ہوگا۔ ایک استاد کا مذہب یہ ہے کہ سارے شاگرد بلا تفریق مذہب و ملت اس کی نگاہ میں برابر ہیں اور اس کی یکساں توجہ کے مستحق ہیں۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا، یہ ہے کہ اکثر اقلیتی اداروں میں باوجود یہ کہ ان کا انتظام اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اقلیتی فرقے سے زیادہ دوسرے مذاہب کے طلباء پڑھتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اوّل اقلیتی فرقے کی معاشی بدحالی ہے۔ دوم غریب والدین (جو بالعموم اہل حرفہ ہوتے ہیں) کی یہ خواہش ہے کہ ان کے بچے جلد از جلد چند پیسے کمانے لگیں تاکہ گھر کی آمدنی بڑھے۔ سوم والدین کا یہ احساس کہ جب نوکری نہیں ملتی تو پڑھانے سے کیا فائدہ؟ لہذا یہ دیکھا گیا ہے کہ اقلیتی فرقے کے بچے داخلے کے بعد جلد ہی اسکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس لئے آپ لوگوں کو نہ صرف تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے بلکہ والدین کو بھی تعلیم کے دور رس فوائد سے آگاہ کرنا ہے۔ تاکہ تعلیم کو ادھورا چھوڑنے کے رجحان میں کمی آئے۔

یہاں یہ جتلا دینا مناسب ہوگا کہ تعلیمی اداروں میں مختلف مذہبی فرقوں کے طلبا کا ہونا فائدہ مند ہے۔ اگر کسی ادارے میں صرف ہندو ہی طلبا ہوں یا صرف مسلمان ہی طلبا ہوں تو اس سے بچوں میں یہ ذہنیت پیدا ہوگی کہ صرف ہم ہی ہیں کوئی اور نہیں۔ اس لئے ہندوستان جیسے ملک کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کے عصری تعلیمی اداروں میں کچھ نہ کچھ تعداد میں ہر مذہب کے بچے ہوں۔ اس سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا اور پرکھنے کا موقع ملے گا۔ ایک دوسرے کے ساتھ ملکر آگے بڑھنے کا رجحان بڑھے گا۔ کلاس روم میں وہی حالات پیدا ہوں گے جو کہ ملک میں ہیں اور جن حالات میں آگے چل کر بچے کو رہنا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اقلیتی اداروں میں دوسرے مذاہب کے بچوں کا ایک مناسب تعداد میں ہونا فائدہ مند ہے۔

میری تیسری گذارش یہ ہے کہ آپ ایک تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیت کے تعلیمی اداروں میں پڑھا رہے ہیں۔ اس لئے آپ کے پاس آنے والوں میں اکثریت ان طلبا کی ہوگی جن کی پہلی نسل اسکول میں آئی ہے یا جن کی پہلی نسل انگریزی اور جدید سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ ایسے طلبا بالعموم اردو یا ہندی میڈیم کے ہوتے ہیں اور آگے چل کر میڈیم بدلنے کے باعث کلاس میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ایسے طلبا آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں تاکہ وہ ان طلبا کے ساتھ آگے بڑھ سکیں جو شروع ہی سے انگریزی میڈیم لے کر چلے ہیں۔ جب تک انھیں آپ کی خصوصی توجہ حاصل نہ ہوگی وہ کلاس میں ابھر نہ سکیں گے۔ وہ تعلیم سے بددل ہو کر غلط راہوں پر پڑ جائیںگے۔

چوتھی بات کے طور پر میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ آپ اساتذہ کی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو پوری قوم کو ابھارنا ہے۔ یہ صرف اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کی حد تک ہی کام کرنے سے ممکن نہ ہوگا۔ آپ اپنے فرائض منصبی سے آگے بڑھیں اور کمزور شاگردوں پر زیادہ توجہ دیں۔ آپ یہ کوشش کریں کہ کلاس کا ہر طالب علم آپ کے درس کو سمجھے۔ ہندوستان میں بہت سے اساتذہ ایسے ہیں جو اپنے فرائض منصبی سے بڑھ کر کام کرتے ہیں۔ آپ ان کے نقش قدم پر چلیں۔ یہاں آپ کو ٹیچنگ اور لرننگ پروسس (Teaching and learning process) کی بابت بتایا گیا ہوگا۔ اکثر اساتذہ اس کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے۔ وہ محض حفظ کر لینے کو ہی تعلیم سمجھتے ہیں۔ انہیں شاید یہ علم نہیں ہے کہ حفظ کی عادت سے عقل و فہم کی ترقی پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے طلبا میں استدلالی صلاحیتوں اور خود اعتمادی کا فروغ رک جاتا ہے۔ جس سے انہیں آگے چل کر آزادانہ فیصلے کرنے سے دقت ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ طلبا چیزوں کو سمجھ کر پڑھیں۔ وہ نصابی کتابوں اور کلاس روم تک ہی سمٹ کر ہی نہ رہ جائیں۔ وہ لائبریری جائیں، اخبار و سنجیدہ رسائل پڑھیں، اساتذہ کی مدد سے اپنی مشکلات دور کریں اور اپنی سطح کی عام معلوماتی کتابوں کو بھی اپنے مطالعے میں رکھیں یہی طریقہ ہے جس سے آپ کے شاگرد دوسروں کے مقابلے میں کھڑے ہو سکتے ہیں ایک بار پھر مجھے یہ عرض کرنے دیجئے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ کو beyond the call of duty کام کرنا ہوگا۔ میں خود زندگی بھر beyond the call of duty کام کرتا رہا ہوں۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر آپ کو یہ یقین دلانا چاہوں گا کہ کام کرنے کی ایک خاص لذت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری لذت نہیں کر سکتی۔ جب آپ جی جان سے اپنا کام کریںگے اور یہ کوشش کریںگے کہ آپ کے شاگرد پڑھ لکھ کر قابل بن جائیں تو شام کی تھکن میں بھی ایک خاص قسم کی فرحت محسوس کریںگے۔ جب آپ کا کوئی شاگرد

آپ کی محنت اور کوششوں کی بدولت کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرلے گا۔ اس وقت آپ جو لذت اور جو خوشی محسوس کرینگے، اسکا بیان کرنا بھی محال ہے۔ یاد رہے کہ اس سے آپ کی ذات کو کوئی مادی فائدہ حاصل ہوگا۔ میں نے تو دیکھا ہے کہ ایک استاد اپنے شاگرد کے کسی اعلیٰ مقام پر پہنچنے پر کتنی خوشی اور فخر محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا فخر جسکا مقابلہ کوئی دوسرا فخر نہیں کرسکتا۔

اپنی آخری بات کے طور پر میں یہ کہونگا کہ یہ یونیورسٹی جس میں آپ نے کچھ دن گذارے ہیں نہ صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لئے اس کے بانی سرسید احمد خاںؒ کا ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ ادارہ سرسید کی اولوالعزمی، روشن خیالی اور دور اندیشی کا مظہر ہے۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے جب سرسید اس ادارے کی بنیاد رکھ رہے تھے اور علی گڑھ تحریک کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کی کوشش کر رہے تھے تو ان کی مخالفت کس کس طرح نہ کی گئی۔ مگر آج یہ ثابت ہوچکا ہے کہ سرسید کی فکر اور ان کی برپا کی ہوئی تعلیمی تحریک درست تھی اور ان کی مخالفت کرنے والے غلط۔ اس بابت اب کسی قسم کے شبہے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ علی گڑھ تعلیمی تحریک کو دوبارہ بڑے زور و شور سے برپا کیا جائے۔ اسے ہر ہر گاؤں اور ہر ہر شہر تک پہنچایا جائے۔ لوگوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا جائے اور اس کے فائدوں کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں یہ جتایا جائے کہ جب تک ہم جدید تعلیم حاصل نہ کرینگے ہمارا سر فخر سے بلند نہ ہوگا۔ ہم ہر چیز کے لئے دوسروں کے محتاج رہینگے۔ انھیں یہ یاد کرایا جائے کہ بڑے بڑے مگر تعلیمی طور پر پسماندہ ممالک آزاد ہونے کے باوجود یورپ اور امریکہ کے غلام ہیں۔ صحیح معنوں میں سیاسی اور معاشی آزادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک میں جدید تعلیم عام ہو۔ اس کے بغیر ہمیں آزادی کو برقرار رکھنا بھی ممکن نہ ہوسکے گا۔

میری دلی تمنا ہے کہ آپ سب لوگ اس ادارے کے قیام کے پس منظر کا ایک گہرا تاثر لے کر جائیں۔ یہاں سے قومی خدمت کا وہ جذبہ لے کر جائیں، جس کے ہاتھوں یہ عظیم ادارہ وجود میں آیا۔ میری دعا ہے کہ یہ تاثر اور قومی خدمت کا جذبہ یہاں سے جاتے ہی ختم نہ ہوجائے بلکہ قائم و دائم رہے۔ آپ خود اس جذبے سے سرشار رہیں اور اپنے طلبا کو بھی سرشار کریں۔ خدمت کی وہ روح جو سرسیدؒ نے یہاں کے لوگوں میں پھونکی تھی وہ آپ لوگ اپنے طلبا میں بھی پھونکیں۔ آپ اپنے تعلیمی مشن میں کامیاب ہوں، آپ کے شاگرد صحیح معنوں میں انسان ہوں اور مثالی شہری بنیں۔ آپ کی شخصیت اور اخلاص کا اتنا گہرا اثر ہو ان پر کہ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی وہ آپ کو اور آپ کے درس کو تاحیات یاد رکھیں۔

شکریہ۔

ماہنامہ شاداب حیدرآباد
ستمبر ۱۹۸۸ء

محمد اسحاق

مسلم طلبا کے لئے کوچنگ سنٹرس

مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر چند دنوں سے اچھے مضامین شایع ہو رہے ہیں مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پستی کے اسباب کا اعداد و شمار کی روشنی میں تجزیہ کیا جا رہا ہے اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عملاً اس وقت کیا کچھ کیا جاسکتا ہے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کا مسئلہ' ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی زبان میں سیاست کی طرح کوئی پہاڑی نالا نہیں ہے جو اچھلتا کودتا کہیں وادی میں جا گرتا ہے تعلیم تو ایک خاموش دریا ہے جو اطراف و اکناف کی وادیوں کو لہلہاتی کھیتوں میں تبدیل کر دیتا ہے' مگر اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تعلیم کا کام بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور برسوں کی مسلسل کوشش کے بعد نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس میں بعض حضرات جتنی جلد بازی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں' اتنا ہی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تعلیم نہیں وہاں جہالت و غربت' افلاس و نکبت بے روزگاری و بے کاری' بدقسمتی اور فاقہ مستی' وقت گزاری و نامرادی' تنگ نظری و تعصب' ایک ہی مقام سے وابستگی و پابہ زنجیری عام روگ ہیں! اور یہی وہ اسباب ہیں جو کئی ایک معاشی و معاشرتی اور سیاسی مسایل کو جنم دیتے ہیں۔ ان کا مداوا حکومت اور لیڈران قوم وقتی مسایل کے طور پر حل کرنے میں بہت وقت اور توانائی ضایع کرتے ہیں لیکن مسایل جوں کے توں رہ جاتے ہیں۔ ان سب کا علاج صرف ایک اور ایک ہی ہے وہ ہے تعلیم کا عام کرنا تعلیم ہی ایک ایسا پارس ہے جو خود انسان کو بدل دیتا ہے اور ایسا کمال پیدا کر دیتا ہے کہ وہ جو ہر قابل دوسروں کو بھی پارس بنا سکتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے جناب سید حامد صاحب' سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی'

جناب محمد اسحاق سابق پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن حیدرآباد

علی گڑھ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ مدینہ پبلک اسکول میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر ایک نہایت جامع اور پُرمغز تقریر کی تھی جس میں ایک بات تو کہنے کی یہ تھی کہ سرسید کے انتقال کو آج ۸۸ برس ہوگئے لیکن سرسید کے بعد پھر کسی مسلم دانشور یا لیڈر نے کبھی مسلمانوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ نے بتلایا کہ ایک عرصے سے تعلیم کے شعبے سے وابستگی کی وجہ اور سارے ہندوستان کی سیر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے اہم تعلیمی مسایل کیا ہیں موصوف نے مندرجہ ذیل مسائل کی نشان دہی کی۔

۱۔ مسلم طلباء کے لیے کوچنگ سینٹرس کا قیام

۲۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دینا

۳۔ مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھانے کے لئے اپنی دوسری مصروفیات کو کاٹ کر کم از کم ایک گھنٹے کا وقت روزانہ دینا

۴۔ پرائمری اسٹیج پر مسلم طلبا کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنا۔

دوسرے الفاظ میں جتنا BASE یا بنیادی تعلیم کا پھیلاؤ وسیع ہوگا، اتنا ہی اوپر اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امیدواروں کی تعداد بڑھے گی اور بھی بہت سی کام کی باتوں کے ساتھ یہ کہا کہ اس وقت سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسایل میں وہ "کوچنگ سنیٹرس" کے قیام کو نمبر ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ذرا چونکا دینے والی تھی کیوں کہ عام طور پر اس طرف کبھی ذہن گیا نہیں تھا غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دانشور کی نظر اس بنیادی مسئلہ پر گئی۔ آپ نے یہ بھی بتلایا کہ آئی۔اے۔ایس، آئی۔پی۔ایس بنکنگ وغیرہ کے لیے کوچنگ کا انتظام گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ کے بعد ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ یہاں پر جناب سید حامد صاحب کی پرزور تائید کے ساتھ کوچنگ سنیٹرس کی بات کو اور ذرا پھیلا کر پیش کرنا مقصود ہے تاکہ مسلم ادارے اور با اثر شخصیتیں جن میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اس پہلو پر سنجیدگی سے غور فرمائیں "کوچنگ سنیٹرس" دراصل متوازی تعلیمی نظام کی ایک شکل ہے۔ حکومت اور مختلف اداروں کی جانب سے جن اسکولوں میں نارمل یا روایتی تعلیم دی جاتی ہے، وہاں پر طالب علم پر انفرادی توجہ جتنی دی

جانی چاہیے وہ کسی حال ممکن نہیں۔ سبق کے بعد سبق آگے پڑھتے جاتے ہیں، جو بنیادی کمزوریاں ابتدائی تعلیم کے زمانے میں کچھ ایسی رہ جاتی ہیں کہ وہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر پہنچنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ خصوصاً ریاضی، انگریزی اور سائنس، یہ تینوں مضامین کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اگر ابتدائی جماعتوں میں خاص طور پر پرائمری اور سکنڈری درجوں میں ان مضامین کی خاطر خواہ تعلیم اور کمزوریاں دور نہ ہوں تو پھر آگے کی تعلیم کی ہر منزل پر یہ نقص کسی نہ کسی طرح سامنے آتا رہتا ہے اور خوبی یہ ہے کہ جو خلاء یا نقص بنیادی تعلیم کے زمانے میں ایک معمولی نقطہ معلوم ہوتا ہے، وہ پھیل کر رفتہ رفتہ ایک دائرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ساری تعلیمی ترقی کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ سب کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوچنگ سینٹرس، دراصل ساتویں جماعت ہی سے شروع کرنا ضروری ہے جب کہ طلباء کی عمر ۱۲ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ اور انہیں اہم مضامین نے کوچنگ دینے کا مناسب زمانہ یہی ہے اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ ان کے سامنے ۴ سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ اس عمر کے طلباء کے لئے یہ ایک نہایت اہم امتحان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ طلباء اپنی چند ایک کمزوریوں کی اصلاح کرتے ہیں، اپنے ہم جماعت طلباء کے مقابلہ میں تیز ہو جاتے ہیں جو انہیں کلاس میں ممتاز بنا دیتا ہے اور یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو طالب علم کو آگے بڑھانے میں بجلی کے کرنٹ کے طور پر کام کرتا ہے۔ ماہرین تعلیم جانتے ہیں کہ یہ شوق اور جذبہ کا پیدا کرنا ہی تعلیم کی اصل روح ہے۔ یہ پیدا ہو گیا تو پھر آگے کا کام آسان ہے یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ طالب علم کی کمزوریاں ابتدائی جماعتوں ہی میں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ اس میں وہ خود اعتمادی پیدا ہو جو ایک اچھے طالب علم کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسکولوں میں اتنا وقت کہاں، وہاں تو مقررہ نصاب پورا کرنے کی دھن رہتی ہے۔ اوسط طالب علم اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں کمزور تو کبھی کے ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ ذہین طالب علم بھی اپنی تشنہ کامی سے کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسکول کی تعلیم سے کوئی بھی خوش نہیں رہتا۔ دیکھتے دیکھتے امتحان آجاتا ہے جس کے نام سے ہمارے طلباء کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں جب تک گھر پر روزانہ دو گھنٹے طلباء کی تعلیم پر خاص

توجہ نہ دی جائے، خاطر خواہ نتائج نکلنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جو ماں باپ خود تعلیم یافتہ ہیں وہ تو اپنے بچوں کی تعلیم پر کسی نہ کسی طرح توجہ دیتے ہیں، ٹیوشن کا انتظام کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تعلیمی ریکارڈ کا حال بھی پوچھ لیتے ہیں۔ بعض مائیں، باپ سے زیادہ بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتی ہیں اور خود پڑھاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اکثر ماں باپ خود پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ گھر کا تنگ و تاریک ماحول سکون سے پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ غربت اور جہالت کا سایہ غریب مگر ذہین طلباء پر کچھ ایسا مسلط رہتا ہے کہ اس کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے طلباء کے لئے کوچنگ سنٹرس بہت کچھ کر سکتے ہیں اس سلسلے میں مدینہ ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر کے کوچنگ سنٹر کی مثال قابل تقلید ہے کوئی چھ سال قبل تک مستقر محبوب نگر کے ۱۲ فوقانی اسکولوں سے بس دو چار مسلمان طلباء مشکل سے میٹرک میں کامیاب ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات ان کا نتیجہ صفر تک جاتا تھا۔ اس سوسائٹی نے بڑی دور اندیشی سے ایک کوچنگ سنٹر قائم کیا، جہاں پر ساتویں سے دسویں تک جماعتیں طلباء و طالبات کے لیے باضابطہ شام میں ۵ تا ۹ بجے رات تک چلائی جاتی ہیں کوئی ۱۸ اساتذہ جو اپنے مضمونوں کے ماہر ہیں، پڑھاتے ہیں۔ طلباء سے فیس بھی لی جاتی ہے اور اساتذہ کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے چند ہی برسوں میں مسلم طلباء کی تعلیم کا معیار مستقر اسکولوں میں بہتر ہو گیا۔ گذشتہ سال ۳۰ طلباء میں ۱۳ درجہ اول اور کوئی ۱۵ درجہ دوم اور طالبات میں ۵ درجہ اوّل اور نصف کے قریب درجہ دوم رہے اردو ماڈل اسکول کے ساتویں جماعت کا نتیجہ ڈسٹرکٹ میں اوّل رہا اور صد فی صد رہا ——— اس اسکول کی تعلیم مثالی ہے اور نقل کرنے کا کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سوسائٹی نے خاموش کام کو ترجیح دی ہے اس کی مثال دینا ضروری تھا تاکہ دوسرے کام کرنے والوں کی مناسب رہنمائی ہو۔ اسی طرح کا کام محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں چند سال قبل "محفل علم و فن" کی جانب سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس کام کو بہت تیزی سے مختلف سینٹرس پر ایک ساتھ پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے دوسرے یہ کہ میٹرک کے طلباء کے لئے چار چھ مہینوں کی کوچنگ سے اس پتھر میں جونک لگنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ کوشش قابل داد ہے اور قدم صحیح سمت پر ہے لیکن نتائج صرف اسی وقت بہتر ہو سکتے ہیں۔ جب کہ سینٹرس کی تعداد

محدود کر کے کام میں باضابطگی پیدا کی جائے۔ مسابقتی امتحانات میں اکثر نوجوان باوجود تعلیمی شاندار ریکارڈ رکھنے کے وہ اپنی کمزوریوں سے واقف رہتے ہیں۔ اس لئے شریک ہونے سے ہی گریز کرتے ہیں۔ ان میں دوسری کمزوری یہ ہوتی ہے کہ وہ زبانی انٹرویو سے بہت گھبراتے ہیں انہیں اس کی ٹریننگ نہ تو اسکول یا کالج میں دی جاتی ہے اور نہ اس طرف عام طور پر توجہ دی جاتی ہے۔ کالج اور اسکول کی تعلیم ہر بات کی گہرائی اور گیرائی احاطہ کرنے کے لیئے کافی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اطراف واکناف جو کچھ دیکھتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی معلومات بہت مایوس کن ہوتی ہیں اعلیٰ امتحانات میں انٹرویو تو میں امید واروں کو اتنا کھنگالا جاتا ہے کہ کوئی جوہر آبدار ہو تو تہہ سے اوپر آجاتا ہے اور کہیں کنکر پتھر رہ گئے ہیں تو وہ سب سے پہلے اچھل کود کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اچھے طالب علم بھی جن سے توقعات تھیں، مایوس کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کوچنگ کے لیئے چاہے مضامین میں کمزوریاں دور کرنا ہو یا انہیں اعلیٰ مسابقتی امتحانات کے لیئے تیار کرنا ہو، اس کی پلاننگ انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن کے بعد نہیں بلکہ آٹھویں جماعت ہی سے شروع ہونا ہے یہ کام ضرور مشکل ہے لیکن جب تک اس کی بنیادی اہمیت کو نہ سمجھا جائے۔ کوئی زیادہ مفید نتائج کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ جب تک پودوں کی نشو و نما کے وقت جڑوں کی کھاد اور آبیاری کا انتظام نہیں ہوتا وہ محض موسم کے رحم و کرم پر اُگ آنے والے درختوں کی چند ہری بھری شاخوں اور پھول پتیوں پر توجہ دینے سے یہ کام نہیں ہو سکتا اس کے لیئے مندرجہ ذیل چند باتیں درج ہیں۔ جو عملی کام کرنے والوں کے لیئے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ہر بڑے شہر اور ضلع کے ہیڈ مستقر پر دو چار چھ محلوں کو ملا کر کسی مرکزی مقام پر ایک کوچنگ سینٹر قائم کیا جائے اور ہر تعلقہ کے مستقر پر کم از کم ایک کوچنگ سینٹر تو ضرور ہو۔

۲۔ اس اسکیم کے لیے سرمایہ اور کام کرنے والوں کی ایک فوج درکار ہوگی سرمایہ کے لیے مسلم وقف بورڈ، فلاحی ادارے اور ایجوکیشن سوسائٹیز اس طرف توجہ دیں۔ البتہ کام کرنے والوں کا ملنا مشکل ہے۔ ایسی ہر اسکیموں پر ہم زبانی حیثیت سے تو بہت کچھ کہہ سکتے ہیں، لیکن اصل کام آگے کرنے والوں کے

باقی بر صفحہ ۲۱

یونس عثمانی

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم

دینی مدارس اور سائنسی تعلیم کا موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت وسعت رکھتا ہے۔ اس کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کے بنیادی مسائل پر ہی گفتگو کی جا رہی ہے۔

اس وقت بھارت میں چھوٹے بڑے دینی مدارس کی تعداد ۱۲۸۶ ہے لیکن باضابطہ اور قابل ذکر دینی مدارس صرف ۱۷۳ ہیں۔ ان تمام دینی مدارس میں نصاب تعلیم میں ہم آہنگی اور یکسانیت نہیں ہے۔ جہاں تک دینیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریق تعلیم کا تعلق ہے، اس کے ناقابل اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جو جماعت بجماعت کے نصاب اس وقت رائج ہیں وہ یقیناً ناقص ہیں۔ گزشتہ دس سال سے دینی نظام تعلیم پر جو کچھ لکھا گیا ان کے مطالعے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہمارے دینی رہنماؤں کے پیش نظر صرف مروجہ نصاب میں ترمیم کا سوال رہا ہے اور غالباً یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چند کتابوں کا اضافہ کر دینے سے دینی مدارس کا صحیح سمت سفر متعین ہو سکے گا۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو عرض کروں گا کہ یہ موجودہ حالات کا نامکمل اندازہ ہے۔ دراصل ہم زیادہ گہرائی میں دیکھیں کہ قرآن، حدیث، فقہ اور عقائد کی تعلیم کے باوجود ہمارے طلبا میں حقیقی اور مقصدی زندگی کا جذبہ کیوں مفقود ہے؟ قومی خدمت اور ملی تشخص کا احساس کیوں نہیں ابھرتا؟ اگر محض نصاب تعلیم کا نقص ہی اصل سبب ہے تو اس نقص کو فوراً رفع کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں اور ہماری مکمل تعلیمی پالیسی میں بنیادی نقائص موجود ہیں تو اصلاح کے لیے

ڈاکٹر یونس عثمانی ۔ استاد مرکزی درسگاہ اسلامی ۔ رامپور۔ یوپی

صرف دینی نصاب میں ترمیم ہرگز ہرگز کافی نہیں ہو سکتی لہذا' اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا۔ خواہ اس کام میں محنت و مشکلات کا ہی سامنا کرنا پڑے

(۱)

ملک کی آزادی کو چالیس سال ہوئے اس مدت میں ہمارا تعلیمی نظام روایتی رہا۔ ہم علم کو متحرک اور ترقی پذیر عمل کی تشکیل نہیں دے سکے۔ ہم بے مقصد کو صلہ شکنی کی کیفیت میں خود مبتلا رہے۔ اور اپنے شاگردوں کو صرف و نحو کی میکانکی تعلیم دیتے رہے۔ ہم جن کتابوں کے ذریعے تعلیم دیتے رہے۔ وہ صدیوں بیشتر لکھی گئی تھیں۔ ان کی تیت (?) ایسی نہیں جو عصری ذہنوں کو اپیل کر سکے اور عصر حاضر کے مسائل کو حل کر سکے۔ نیز اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت کوئی زندہ ماحول اور کوئی عملی برتاؤ نہیں ہے۔ اس تعلیم کی حیثیت بس اسی قدر ہے کہ آثار قدیمہ کی طرح ان کا احترام کیا جائے۔ دراصل تاریخی اعتبار سے بنو امیہ کے آخری دور میں مجوسی اور مسیحی بکثرت مسلمان ہوئے تو ان کے مجوسی و مسیحی رہنماؤں کو سخت پریشانی ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے مناظرہ کرنا شروع کیا۔ عرب ان کے فلسفیانہ سوالات سے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ ابتدا میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پھر جلد ہی انھوں نے منطق اور فلسفہ پڑھا اور اپنے حریفوں کو واضح شکست دی۔ یہ انداز قرآن و حدیث کی طرح سادہ نہ تھا۔ اس کی حیثیت محض وقتی ہتھیار کی تھی۔ مگر ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ یہ یونانی فلسفہ اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ داخل نصاب کر دیا گیا۔ اس طرح یہ اسلامی تعلیمات کا جزو بن گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ علم العقائد' علم الفقہ' علم الکلام اسی مخصوص فنی زبان میں مرتب کر دیے گئے جس علم کو اسلام کی برتری اور غیر مسلموں کو قریب لانے کے لئے بطور علمی ہتھیار استعمال کیا گیا تھا وہی علم قرآنی اسلام سے دوری کا سبب بننے لگا

اسلام مسیحیت کی طرح دینی اور دنیوی تعلیم کو جدا نہیں کرتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لئے ایک ایسا اصول بتاتا ہے جو یہاں سے آخرت کی زندگی تک سلامتی عزت اور برتری حاصل کرنے کا طریقہ ہے اس مقصد کے لئے صحیح اور صورت مند فکر و نظر' اخلاق حسنہ' کردار کی بلندی مطلوب ہے۔ وہ مقصد کے حصول کے لئے واضح حقوق اور فرائض متعین کرتا ہے اس طرح اجتماعیت حقیقی کا نظام وضع کرتا ہے۔ افراد کی فکری و عملی تربیت کے باب میں اسلام دوسرے مذاہب سے بالکل مختلف ہے لیکن اگر کوئی ایسی تعلیم موجود ہو جہاں زندگی

اس کے معاملات سے اس کا کوئی ربط باقی نہ ہو تو وہ بے رو ۔ اور بے معنی ہے سیکڑوں ورکشاپ سے فارغ ہونے والے عالم دین بے کار ہیں جو اسلام کے عقائد اور اصول سے تو واقف ہیں لیکن علم وعمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے موجودہ دور میں ان کو برتنا نہیں جانتے ہیں۔

ڈاکٹر حسن ترابی فرماتے ہیں۔

" اسلام کی بنیاد علم پر قائم ہے ظاہر ہے سارا کا سارا علم نقلی نہیں ہے۔ نقلی علم صرف شریعت کا علم ہوتا ہے جیسے رسولؐ ہم تک پہنچاتا ہے اور ہم اس سے اس سے لے لیتے ہیں۔ علم کی ایک قسم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ، دل اور عقل سے حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس علم کا تعلق اشیا اور ان کے (NATURE) سے ہے مثلاً نباتات و [illegible] کے نیچر مادہ کے خواص اور سماج کی خصوصیات۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو عقل سے نوازا ہے۔ تاکہ ہم اس علم تک پہنچ سکیں۔ عقل کبھی کبھار غلطی تو کر سکتی ہے لیکن وہ برابر آگے بڑھتی اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتی رہتی ہے اس علم کا تعلق ان احوال وظروف کے سمجھنے سے ہے [illegible] میں ہم اپنی سمجھ کے مطابق شریعت کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر ہم اس علم سے کام نہ لے سکے تو ہم ان حالات کو جاننے کے قابل نہ ہو سکیں گے [illegible] ان احکام کو عملاً منطبق کرنا چاہتے ہیں اس واقفیت کے بغیر ہماری تطبیق [illegible] ہوگی اور [illegible] زبردست غلطی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے انتہائی مہلک ہوگی۔ دراصل دین کے نئے فہم میں علوم جدیدہ کا پورا [illegible] ہونا چاہیے۔ (اس وقت) شریعت کا علم پیچھے رہ گیا جب کہ عقلی علوم [illegible] کے یہاں مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عملی زندگی سے ہمارا تعلق [illegible] ٹوٹ گیا اور ہم نے علوم عقلیہ کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ [illegible] میں بہت آگے بڑھ گئے۔ اور ان میں اہم ترین نتائج تک پہنچ گئے جن سے کسی بھی صورت میں ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔"

(اقتباس از المجتمع کویت ۲۶ فروری ۱۹۷۳ء) مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ =

" ہم کو چاہیے کہ یورپ کا مقابلہ کرنے سے پہلے یورپ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اس سے زیادہ واضح طور پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" میں اس بات پر زور دیا کہ

"مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی پر کافی توجہ دینی چاہیئے غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں ان کی کمزوری گناہ کے مترادف ہوگی"۔

مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب نے نہایت کرب کے ساتھ فرمایا:

"ماضی قریب کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغرب کے فکر و فلسفہ نے ہماری ملت کو چیلنج کیا ہے تو اس کے باوجود کہ ہمارے ہاں مسجدیں اور خانقاہیں آباد تھیں، مدرسے اور کتب خانے بڑی تعداد میں موجود تھے، تبلیغی ادارے قائم تھے، یہ چیزیں ملت کو بچا نہ سکیں۔ مغربی تہذیب کا جو سیلاب آیا وہ ملت کے تمام آثار کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔"

(تدبر۔ فروری ۱۹۸۲ء۔ لاہور)

تاریخ کے ان المناک حادثات سے محفوظ رہنے کے لیئے شبلی مرحوم لکھتے ہیں:

"علماء کو اس بات کا مطلق خوف نہیں کرنا چاہیے کہ علوم جدیدہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں اور ان کی تعلیم سے عقائد مذہبی میں خلل آجاتا ہے۔ کیونکہ جب امام غزالیؒ کی طرح وہ ان علوم کو خود حاصل کریں گے تو ان کو وہ مسائل معلوم ہو جائیں گے جن میں مذہبی مخالفت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان مسائل کی تردید یا اسلام سے ان کی مطابقت بخوبی کر سکیں گے۔ اور جدید تعلیم یافتوں کو مذہبی شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب تک ہماری قوم کے علماء جدید فلسفہ اور جدید علوم کو بذات خود حاصل نہ کریں ناممکن ہے کہ وہ ان اعتراضات کا جواب دے سکیں جو یورپ کے ملاحدہ مذہب اسلام پر کرتے ہیں۔ اور جن کا اثر ہماری قوم کے جدید تعلیم یافتوں پر پڑتا ہے۔"

(خطبات شبلی ص ۹۰)

ہمارے علمائے کرام کے یہ اقوال زریں ہیں جو ٹاکویلی (TOCQUEVILLE) ~~کے ان الفاظ~~ کی تشریح کرتے ہیں

A NEW SCIENCE OF POLITICS IS INDISPENSABLE TO A NEW WORLD.

(نئی دنیا کے لیے ایک جدید سیاسی سائنس ضروری ہے۔)

ہم اگر اپنے ماضی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ جابر بن حیان سے لے کر رستم اللہ

السویں صدی تک نہایت درجہ ترقی کا دور تھا۔ یہی دور ملتِ اسلامیہ کا تابناک دور کہلاتا ہے اس پورے دور میں کہیں بھی علم کی تفریق یا سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ تمام علوم 'علوم الہٰیہ' سمجھے جاتے تھے۔ لیکن پندرھویں صدی تک جب مسلمانوں سے یہ تمام علوم مغرب کی طرف منتقل ہو گئے تو مسیحی علوم کی غلطیاں واضح ہونے لگیں۔ پھر جب جدید تحقیقات شایع ہونے لگیں تو مسیحی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ چرچ نے ابتداء میں تو ان علمائے سائنس کو گمراہ کہا پھر پوپ کے خاص حکم سے عدالتی کاروائی ہوئی جس کے نتیجے میں تقریباً تین لاکھ افراد کو سزائیں دی گئیں اور تیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان سزا پانے والوں میں گلیلیو اور برونو (BRONOE) جیسے اہم لوگ شامل تھے چوں کہ مذہب ہی غیر فطری ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ ٹکراؤ چرچ اور سائنس کے درمیان واقع ہوا جو بالآخر ڈارون کی کتاب (ORIGIN OF SPECIES) شایع ہونے کے بعد (SECULARISM) کی صورت میں ختم ہو گیا۔

اب منصب امامت پر مغرب فائز تھا اور مسلمان اس سے تہی دامن تھے۔ لہٰذا یہاں بھی علم کو UNITS میں منقسم کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس رضائے الہٰی کا ذریعہ نہیں مانی جب کہ علم سائنس سراپا رضائے الہٰی کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے اس کی تحصیل فرض کفایہ ہے غلط یا تصور میں کسی علم کا ہونا ہمیشہ ہولناک ہوتا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ رحم مادر اور لطفے کا کاروبار ہو رہا ہے اور یہ تو کنڑول سے انسانیت کو مسخ کر رکھا ہے۔ ہم بحیثیت مسلمان تمام علوم کے وارث ہیں ہم پر اسلامی اور انسانی اعتبار سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ان میں پہلو تہی ہم سب کو گنہگار بنانے کے مترادف ہے۔ اس لیئے ایک انقلابی نظام آنا ناگزیر ہے۔

(۲)

اس نیئے نظام تعلیم میں دینی اور دنیوی علوم کی تفریق مٹا کر ایک جان کر دیا جائے۔ تا کہ طالب علم اس وسیع کائنات میں خدا کی حکمت، قدرت اور عظمت کے آثار کا مشاہدہ کر سکے۔ اس کے ذہن میں کائنات اور مقصدی زندگی کو موہنا نہ جاکہ سمجھا دیا جائے۔ اپنی مادری زبان، عربی، قومی زبان، انگریزی، سائنس، ریاضی، تاریخ اسلام، جغرافیہ آرٹ اور کرافٹ اس قدر جان لے کہ جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے۔ عملی۔ اگر یوں بنا لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

(ا) ابتدائی تعلیم = اول تا پنجم I یہاں درجہ اوّل و دوّم میں مادری زبان میں (۱) اسلامیات II ریاضی III جنرل سائنس زبانی IV آرٹ و کرافٹ۔

II سوم میں قومی زبان اور انگریزی کا اضافہ کردیا جائے باقی مذکورہ بالا مضامین پڑھائے جائیں۔

III چہارم و پنجم درجات میں عربی کا اضافہ کردیا جائے۔

(ب) ششم و ہفتم = اس میں مندرجہ ذیل مضامین ہوں گے

اسلامیات، مادری زبان، قومی زبان، انگریزی عربی، ریاضی سائنس، تاریخ اسلام، جغرافیہ

(ج) ہشتم تا دہم :-

(۱) اسلامیات (فقہ و عقائد، سیرت تاریخ اسلام)

(۲) قرآن (ترجمہ و تشریح) (۳) عربی (۴) حدیث و اصول حدیث

(۵) تاریخ و ہند جغرافیہ (۶) سائنس (تاریخ کے ساتھ)

(۷) حساب، الجبرا، جیومیٹری (۸) انگریزی (۹) مطالعۂ سماج و تمدن

د) یازدہم و دوازدہم :

(۱) اسلامیات =

I قرآن (تفسیر و اصول تفسیر) II حدیث منتخبات و اصول حدیث

III فقہ (مع اصول)

(۲) ادیان عالم تقابلی مطالعہ (۳) تاریخ اسلام

(۴) سیرت صحابہ رض مع ثقافت اسلامی و معاشرت

(۵) سائنس (انٹر کے معیار کے مطابق فزکس کیمسٹری، بایولوجی) سے منتخب اجزاء نیز فرسٹ ایڈ اور نرسنگ۔ (۶) عربی ادب مع تاریخ ۔

تشریحات ع۱ اسلامیات میں پنجم تک ناظرہ، سیرت، فقہ اور تاریخ شامل ہے اور ششم و ہفتم تک اخلاق و معاشرت، فقہ و عقاید، سیرت و تاریخ اسلام شامل ہے۔

ع۲ سائنس میں فزکس، کیمسٹری، بایولوجی شامل رہے گی۔ یہاں ہفتم دوازدہم پریکٹیکل کا نظم بھی ہونا چاہیئے۔

باقی صفحہ ۵

سید حامد

اُردو کے لئے جدوجہد کے تین محاذ

اُردو نے آزادی کے بعد کیا کھویا' کیا پایا' اس کا جائزہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ چالیس سال گذر چکے وہ زبان جس نے سب سے بڑھ چڑھ کر ہندوستان کی آزادی کے گیت گائے تھے۔ نعرے لگائے تھے۔ جنگ آزادی کی رجز خوانی کی تھی لوگوں کو قربانی اور جاں نثاری پر اکسایا تھا۔ آزادی ملنے کے بعد وہی زبان کدورت اور تغافل کا نشانہ بن گئی۔ تاریخ طنز کی مثالیں پیش کرتی چلی آئی ہے۔ لیکن اتنی بھیانک مثال شاید اس سے پہلے، اُس کی دسترس سے باہر تھی ہمارا نظام حکومت جمہوری ہے۔ ہمارے وطن عزیز کا ضمیر سالم وثابت ہے۔ پھر یہ ناانصافی کیونکر عمل میں آئی۔ تاریخ نے یہ طنز کیسے ڈھایا؟ یہ سارا کھیل غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور چھپی ہوئی کدورتوں کا ہے۔ سیاست نے جسے [illegible] سے بہت زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ غلط فہمیوں پر پردہ ڈالا۔ بدگمانیوں پر ملمع کیا۔ اُردو کے ساتھ [illegible] پیمان وفا باندھا اور در پردہ وہ اسباب فراہم کردیئے کہ اس کے لئے جینا دشوار ہو گیا۔ اردو کے [illegible] کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اور اس کے قلب پر بیدردی کے ساتھ تاخت و تاراج کی۔ اُردو کا قلب کیا ہے۔ دلی' اتر پردیش اور بہار۔ اور دائرہ کو اور تنگ کیجئے تو اتر پردیش اور اس سے متصل دلی کا علاقہ اُردو کا دل ہے۔ سو اگر غفلت سے باز آیا جفا کی، تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

رفتہ رفتہ ایک عام بے مہری اور بے التفاتی کی فضا تیار ہو گئی جس میں سانس لینا اُردو والوں کے لئے مشکل ہو گیا سو

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ۔
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔

لیکن دلوں میں اگر دھوکا کھانے کی حسرت تھی تو وہ بار بار پوری ہوئی۔

صدر انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی

غریب اُردو کے ساتھ تحفظِ حقوق اور حسنِ سلوک کے وعدے ہوتے رہے۔ ایفائی نیت یا اس کے اہتمام سے کوسوں دور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت بھی بدگمانی کی نذر ہو گئی۔ یو پی اور دِلّی میں عام طور پر ابتدائی تعلیم کا یہ نقشہ رہا کہ اگر بازار میں اُردو کی کتابیں مل گئیں تو اُردو میں پڑھانے والے جیسا ہے استاد خود اُردو سے بھاگنے لگے۔ ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے کو اس طرح توڑا اور مروڑا گیا کہ اُردو پڑھانے کا امکان باقی نہ رہا۔ سب سے کاری ضرب تو جب لگی جب اُردو کا ناطہ روزگار سے توڑ دیا گیا۔ اُردو کے ساتھ ناانصافی حکومت نے کی، اس کے نفاذ میں سرکاری ملازمین نے کی۔ اور خود اُردو والوں نے کی۔ سرکار نے اُردو کی اشک شوئی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اُردو اکیڈیمیاں قائم کیں، ان کو عطیات سے نوازا۔ اُردو کی ترقی کے لیے بیورو قائم کیا۔ ترقی اُردو کی مرکزی اور ریاستی انجمنوں کو مالی امداد سے زیر بار کیا۔ لیکن دراصل جس بات کی ضرورت تھی وہی نہ کی۔ اُردو کو بیساکھیوں کا عادی بنا دیا۔ مگر اس کی صحت اور توانائی کی کوئی فکر نہ کی چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ اکیڈیمیوں اور انجمنوں کی امداد سے اُردو کی کتابیں چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کے خریدنے والے اور پڑھنے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اہلِ قلم کی فکر جب ہی آزاد رہ سکتی ہے جب انھیں فکرِ معاش کے لئے کسی حکومت یا ادارہ یا فرد کا منہ نہ تکنا پڑے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے، ان کی کتابیں بکیں، یہی چیز اب تقریباً ناممکن ہو گئی ہے انجمن ترقی اُردو نے اُردو کی تحریک چلائی۔ ۲۲ لاکھ دستخط اُردو کے حقوق کی حمایت میں جمع کیے بائیس لاکھ اینٹوں سے جو عمارت اٹھائی گئی تھی۔ وہ ڈھادی گئی۔ یہ اُردو کی تاریخ کا دوسرا بڑا طنز یہ ہے۔ انجمن دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئی۔ نہ اس نے بھی سوچا اور نہ اُردو کی دوسری انجمنوں اور اداروں نے کہ زبان کے پڑھنے لکھنے والے باقی نہ رہیں گے۔ تو پھر کتابیں پڑھے گا کون، انجمن عوام سے کٹ گئی۔ اور دانشوروں کے حصار میں آگئی۔ عوام سے کٹنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ خواص کے ہاتھوں استحصال۔ چالیس سال کے تجربات اور پیچ وخم کا جائزہ لینے کے بعد انجمن نے فیصلہ کیا کہ وہ ادارہ کو تحریک کی شکل دے گی۔ "اُردو گھر" سے نکل کر اُردو والوں کے گھروں تک پہنچے گی۔ خواص کے حلقہ سے نکل کر عوام سے ربط ضبط پیدا کرے گی کوشش کرے گی کہ ہندوستان بھر کے اُردو اداروں اور انجمنوں کو وحدت مقصد اور اشتراکِ عمل کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اس کی نیت ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی کے پر شبخون مارے اس کا ارادہ صرف یہ ہے کہ سب کو ساتھ لیکر اُردو کے دفاع اور فروغ کی مہم پر نکلے تاکہ اُردو اجتماعی طاقت کا فائدہ اٹھا سکے۔ اور اس کی آواز حکومت کے

اور سیاست کے بازاروں میں احترام کے ساتھ سُنی جائے۔ ابھی تک اُردو کے سربراہوں نے وقفوں کے ساتھ صرف ایک محاذ پر کام کیا ہے۔ یعنی حکومت اور اہلِ سیاست کا محاذ۔ سینہ سے بیدار ہوئے تو ایک نعرہ دھیمے سروں میں لگایا احتجاج کی نحیف صدا بلند کر دی۔ عام چناؤ سے پہلے ان کی کچھ آؤ بھگت بھی ہوتی رہی، وعدوں کا موسم آیا تو ان کی جھولی بھی بھر گئی۔ فصل کاٹنے چلے تو کچھ ہاتھ نہ آیا خدا خدا کر کے ایک وعدہ پورا کیا گیا۔ وہ بھی جزوی طور پر یعنی بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کا نفاذ بھی پورے بہار میں ہنوز نہیں ہوا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سیاست سے کوئی مفر نہیں ہے، حکومت کو موافق کئے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس محاذ کو جو ہماری واحد جولانگاہ رہا ہے۔ نظر انداز کرنا مہلک ہوگا۔ لیکن سیاست اور حکومت کے محاذ کا احترام ہم پر فرض ہے۔ اور احترام کی شکل یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اتحاد، تنظیم، ترتیب اعتدال اور تواتر کے ساتھ اپنی بات اُن تک پہونچاتے رہیں۔ یہ نہیں کہ اچانک کچھ آوازیں بلند کیں۔ کچھ نعرے لگائے۔ اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اور یہ بھی نہیں کہ گفتگو اور پہچان پر ابہام کا سایہ پڑنے دیا پیمان کو جب تک پالیسی کی وضاحت اور پالیسی کو جب تک پروگرام کی صراحت نہ ملے دم نہ لینا چاہیئے۔

آپ نے کبھی یہ سوچا کہ ہمارے جمہوری اور سیکولر ملک میں جس کا دستور لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ اُردو کے ساتھ ناانصافی کیوں ہو رہی ہے؟ اوّل تو حکومتوں نے دستور کا صحیح انعکاس اُردو پالیسی میں نہیں کیا۔ اور تھوڑا بہت جو کچھ کیا وہ بیشتر اہلِ نفاذ کے تغافل یا تعصب کی نذر ہو گیا۔ اُردو کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔ یہیں سے ہمیں اُردو کے دوسرے محاذ کا سراغ ملتا ہے۔ اس محاذ پر ہم نے ابھی تک کوئی کام نہیں کیا ہے۔ ہندوستان کے عوام ایک بڑے طبقہ اور خصوصاً ہندی بولنے والوں کے دلوں میں اُردو کی طرف سے جو بدگمانیاں ہیں۔ انھیں دور کرنا ہے۔ وہ بدگمانیاں دور نہ ہوئیں تو ہمارے ہمدرد بھی ہماری مدد نہ کر سکیں گے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر جگہ، ہر سطح اور ہر موقع پر اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے نہ تھکیں کہ اُردو کو دوسری ہندوستانی زبانوں سے اُلفت اور محبت ہے۔ اُردو سراسر خود ہندی الاصل ہے۔ اس کا خمیر اسی خاک سے اُٹھا ہے۔ اسی کی ساخت اور نمو دہی ہے۔ جو ہندی کی ہے۔ اس کے ذخیرہ الفاظ کی غالب اکثریت ہندی ہے۔ ہندی تو اُردو کی جڑواں بہن ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روئے الارض پر کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب اور مماثل نہ ہوں گی۔ جتنی ہندی اور اُردو ہیں یہ بات بھی بار بار دہرانے کی ہے

کہ اُردو نے آزادی کی لڑائی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس نے ہندوستان کے سارے مذاہب کی کتابوں کو اپنے دامن میں عزت و احترام اور ذوق و شوق کے ساتھ جگہ دی ہے۔ اس زبان کا پیغام محبت ہے اس میں نہ جانے کتنی زبانیں اور بولیاں شیر و شکر ہو گئی ہیں۔ اس کی شاعری تصوف اور یگانگی اور صلح کل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ فراخدلی اور رواداری اور انسان دوستی کا سبق سکھاتی ہے۔ اُردو کی ہندی سے کوئی رقابت نہیں ہے۔ وہ ہندی کی بالادستی کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتی ہے۔ دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے لئے تغذیہ اور تقویت کا سامان ہے۔ ان کے درمیان باہمی لین دین کا کاروبار برابر چلتا رہا ہے۔ اور چلتا رہے گا۔ اُردو اخباروں کے علاوہ ہندی اور انگریزی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے اخبارو اور رسائل میں بھی باتیں پہنچنی چاہئیں۔ اُردو والوں کی بساط اور حوصلے اور لگن کے مطابق آپ نے دیکھا کہ پہلا محاذ اہم ہے۔ دوسرا اس سے زیادہ اہم۔ وہ سر ہو جائے تو پہلا سرنگوں ہو جائے۔ تیسرا محاذ دونوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس محاذ پر جو کچھ ہم نے اب تک کیا ہے۔ وہ نہ کرنے کے برابر ہے۔ پہلے دونوں محاذوں پر کامیابی کا انحصار ایک حد تک دوسروں کے تعاون اُن کے مثبت ردّعمل پر ہے۔ لیکن تیسرا محاذ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ملک گیر پیمانے پر ایثار، اخلاص، لگن اور محنت کو بروئے کار لے آئے تو یہ مورچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خواہ سارا زمانہ مخالف کیوں نہ ہو۔ یہ محاذ ہے بچوں کو گھر پر اُردو پڑھانے کا گھر گھر یا کم از کم محلہ محلہ اُردو پڑھانے کا انتظام کیجئے۔ اُردو والوں کی سب سے بڑی اور کڑی آزمائش یہی ہے اگر اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے سے وہ اسی طرح غفلت برتتے رہے تو چاہے حکومتوں اور اہلِ سیاست اور جمہور کی اکثریت کا رُخ اُردو کے حق میں ہو جائے تو بھی اُردو پنپ نہ سکے گی۔ خود اُردو والے جب اُردو کی مدد نہیں کریں گے۔ اس کو اپنے گھر میں جگہ نہ دیں گے تو حکومت یا ہمسائے اُردو کو کیا سہارا دے سکیں گے۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے طے کیا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں محاذوں پر تنظیم اور مداومت اور قرینہ کے ساتھ کام کیا جائے گا۔ لیکن انجمن، اُردو کے مسائل پر غور و فکر کر سکتی ہے۔ اس کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ رہبری کر سکتی ہے۔ تعاون کے لئے التماس کر سکتی ہے۔ اُردو بولنے والے اگر اس کی صدا پر لبیک کہیں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اُنھوں نے اس نازک موڑ پر بھی تغافل سے کام لیا تو انجمن کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ اور اُردو کے جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ خدا کرے کہ اُردو والے اس جانب متوجہ ہو جائیں کہ وقت بہت کم ہے۔

روزنامہ شاداب حیدرآباد ۵ ستمبر ۱۹۸۸

پی۔ آئی۔ بی

لاکھوں افراد کے لیے خواندگی

ہمارا قومی عہد

ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے سماجی قوتوں کو یکجا کرنے اور عوام کو شریک کرنے کے معینہ مدت کے پروگرام "قومی خواندگی مشن" کا افتتاح ۵ مئی ۱۹۸۸ کو نئی دلی میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کیا۔ اس مشن کی شروعات کے سلسلے میں ایسے ہی پروگرام ریاستی راجدھانیوں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور اضلاع و پروجیکٹ کی سطح پر منعقد کیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی کام کاج کے لائق خواندگی کا عوامی پروگرام بھی شروع کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں این سی سی، نیشنل سروس اسکیم، نہرو یووک کیندروں اور بھارت اسکاؤٹس و گائڈز کے تقریباً پانچ لاکھ طالب علم رضا کار شرکت کریں گے ان رضا کاروں کو خواندگی سے متعلق ساز و سامان مفت فراہم کیا جائے گا اس مشن کے لیے ۱۰ ہزار نوجوان کارکنوں کو تربیت دینے کا پروگرام بھی شروع کیا جائے گا۔

قومی خواندگی مشن کا مقصد سیاسی وابستگی سے قطع نظر سماج کے تمام طبقوں کو اس کام میں شریک کرنا ہے ٹریڈ یونین، آجر، رضا کار تنظیمیں نوجوان، خواتین، مسلح افواج کے اراکین اور دیگر افراد کو بھی اس مشن میں شامل کیا جائے گا۔ اس مشن کا مقصد لاکھوں عوام، خاص کر ۱۵ سے ۳۵ برس کی عمر کے لوگوں کی زندگی اور ماحول کے معیار میں تبدیلی لانا ہے۔ اس سماجی مشن کی خاص توجہ دیہی علاقوں، درمیان میں تعلیم چھوڑ دینے والے بچوں، خواتین اور سماج کے کمزور طبقوں پر ہوگی کیونکہ خواندگی، ترسیل اور انسانی وسائل کی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے اس لیے اس مشن سے بالآخر ملک کی مجموعی ترقی میں مدد ملے گی۔

چیلنجوں کی سمیتی | خواندگی کا مذکورہ قومی پروگرام ناخواندگی کے مسئلے سے نپٹنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ناخواندہ افراد کی تعداد ماضی میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور تعلیم بالغاں پر خاص توجہ دیئے جانے کے باوجود برابر بڑھ رہی ہے سماجی اور اقتصادی پسماندگی اور خواندگی کے فقدان کی وجہ سے ایسی مثالیں سامنے آئی ہیں۔ جب کہ بہت سے لوگ اپنی مدد آپ کے پراجیکٹوں کے لیے دی جانے والی اقتصادی امداد کا بھی پورا پورا فائدہ نہیں اٹھا پائے ہیں۔ دیہی ترقیات اور عوامی شرکت سے متعلق پروگراموں پر اب چونکہ کافی زور دیا جا رہا ہے۔ اسی لیے قومی خواندگی مشن جو اب عوام کے رہن سہن اور کام کاج کے حالات کو خصوصی طور پر دیہی اور پسماندہ علاقوں میں، بہتر بنانے کے پانچ قومی ٹکنالوجی مشنوں کے ایک حصے کے طور پر تیار کیا گیا ہے۔

قومی خواندگی مشن کے تحت ۱۵ سے ۳۵ برس کے عمر والے گروپ کے ۸ کروڑ افراد کو کام کے لائق خواندگی دینے کی تمام کوششیں کی جائیں گی جن میں سے ۳ کروڑ کو ۱۹۹۰ تک اور ۱۹۹۵ تک مزید پانچ کروڑ کو اس لائق بنایا جائے گا۔ ان افراد کے اندر قومی یکجہتی، اتحاد خواتین کی مساوات، ماحولیات کے تحفظ اور چھوٹے کنبے کی افادیت سے متعلق اقدار کو قبول کرنے اور انہیں فروغ دینے کا شعور بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مسلسل تعلیم | قومی خواندگی مشن کے تحت مسلسل تعلیم میں، "جن شکشا نیلایم" کا ایک نیا تصور بھی ہے ایک نیلایم تقریباً ۵۰۰۰ آبادی والے چار پانچ گاؤں کے لیے ہوگا۔ نیلایم میں شام کی کلاسیس لائبریری، ریڈنگ روم، کھیل کود، مطالعاتی سرگرمیاں ثقافتی پروگرام اور ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے ساتھ ایک ترسیلاتی مرکز کی سہولیات بھی مہیا کی جائینگی۔ متعدد عنوانات پر عمل اور آسان تربیت کے پروگرام ہوں گے اور ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں ایک ہی جگہ سے تمام اطلاعات مہیا کی جائینگی۔

آجرین، ٹریڈ یونینوں، کالجوں اور پالیٹکنیکوں کو بھی توسیعی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ مذکورہ پروگرام کے علاوہ بڑے پیمانے پر کتابوں کے فروغ،

وگرام بھی شروع کیے جائینگے۔ تعلیمی اداروں میں لائبریریوں اور ریڈنگ روم عوام کے لیے شام کو کھول دیا جائے گا۔

تعلیمی نظام کی جدید کاری | قومی خواندگی مشن کے تحت پڑھانے اور سکھانے کے لیے بہتر سہولتیں فراہم کی جائیں گی ان سہولیات ن نئی قسم کی سلیٹیں، گلوب، نقشے، ریڈیو کیسٹ، سلائیڈس اور فلموں وغیرہ استعمال بھی شامل ہے۔ جلد سکھانے والی موجودہ تکنیکوں کا جائزہ لیا جائیگا ر خواندگی کے بعد والے اور مسلسل تعلیم کے شعبوں کو بہتر بنایا جائیگا۔ مشن پروگرام ے انتظام، پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی اعداد و شمار کا تجزیہ وغیرہ کرنے میں کمپیوٹروں کا استعمال بھی کیا جائے گا۔

بالغ افراد کے لیے تعلیم کے مراکز | قومی خواندگی مشن کے تحت بالغ افراد کے لیے تعلیمی مراکز، گاؤں یا محلہ کی سطح پر کام کرینگے۔ مقامی علاقہ کا ایک شخص آٹھ سے دس تک مراکز کی نگرانی کریگا اور اسے پریرک کہا جائیگا۔ "وہ جن شکشا نیلائیم" کے ذریعہ خواندگی کے بعد کے پروگرام بھی بنائیگا۔ ضلع کی سطح پر تعلیم سے متعلق ضلع بورڈ تمام منصوبہ بندی اور انتظام کے لیے ذمہ دار ہوگا۔ ضلعی وسائلی یونٹ تکنیکی وسائل فراہم کریگا۔ ضلع تعلیمی بورڈ مختلف اداروں کے درمیان ذمہ داریوں کا بھی تعین کریگا اور ضلعی وسائلی یونٹوں کی مکمل رہنمائی بھی کریگا ضلعی وسائلی بورڈ ضلع کی سطح پر تکنیکی امداد فراہم کریگا اور کارکنوں کو تربیت بھی دے گا مذکورہ یونٹ بنیادی اور خواندگی کے بعد کے پروگراموں کے لیے مواد وسامان تیار کریگا۔ یہ یونٹ ذرائع ابلاغ کی مدد حاصل کرنے کے لیے بھی کوشش کریں گے اور اس کی دیکھ بھال کرینگے۔

تکنیکی مظاہرہ | ملک کے چالیس اضلاع کو تکنیکی جانکاری کی نمائش کے لیے منتخب کیا گیا ہے اور خواندگی کی کوششوں کی تکنیکی درسیات فراہم کرنے کی غرض سے ملک کے سائنسی اور ٹکنالوجیکل اداروں سے اشتراک حاصل کرنے سے متعلق انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ خیال ہے کہ دیگر اضلاع میں کے استعمال سے قبل ان چالیس اضلاع میں نئے طریقوں اور نئے تکنیکی

ساز و سامان کی جانچ کر لی جائے یہ ملک میں خواندگی بالغاں کے شعبے میں اعلیٰ تخلیقی کوششوں میں سے ایک ہے اور اس سے پروگرام کو کافی مدت سے درکار عملی امداد مہیا کیا جانا متوقع ہے۔

شرمک ودیا پیٹھ - ہر ملک میں نظام روزگار مہیا کرانے والوں، ٹریڈ یونینوں اور محنت کشوں ... کے عمل میں تیزی پیدا کرنے کے لیے ایک ادارے کی حیثیت سے کام کرے گا اور ان اداروں کو شریک کرے گا جو کام کاج کے لائق خواندگی کے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ کارکنان اور ان کے کنبوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے متعلقہ تعلیمی پروگراموں کا اہتمام بھی کریں گے ضرورت پڑنے پر شرمک ودیا پیٹھ ادارے اپنی ہم خیال ایجنسیوں کی مدد بھی لیں گے۔

۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران شرمک ودیا پیٹھ نے ضرورتوں پر مبنی کورسوں کا اہتمام کیا اور صرف دسمبر ۱۹۸۷ تک تقریباً ۹۰۹۷ لوگوں نے اس سے استفادہ حاصل کیا۔

تربیتی ادارے - رضاکار اداروں، یونیورسٹیوں، ٹریڈ یونینوں، نہرو یووک کیندروں اور سماجی اور محنت سے متعلق تحقیقی اداروں کی تربیتی اداروں کے طور پر نشاندہی کی جائے گی - ہر ادارہ ۵۰ سے ۷۵ افراد کو ہر برس منتخب کر کے تین ہفتوں کی تربیت دیگا - مذکورہ تربیت یافتگان، سماجی ترقی سے وابستہ نوجوان، سابق فوجی پنچایت کے اراکین اور دیگر فرض شناس افراد ہونگے۔ جن میں خواتین کی تعداد پورے گروپ کا کم از کم تیسرا حصہ ہوگی۔ تربیت یافتہ افراد میں سے 2000 سے 2500 افراد قومی خواندگی سے متعلق اسکیم کے پوری مدت یا تھوڑی مدت کے رضاکاروں کے طور پر خواندگی انسپکٹروں اور تعلیم کے سرگرم کارکنوں کے طور پر کام کریں گے۔ رضاکار تنظیموں کی تعداد ۸۸-۱۹۸۷ء کی تین سو... کے مقابلے میں تجاوز کر کے ۹۰-۱۹۸۹ء تک ۱۰۰۰ ہو جانے کی توقع ہے۔ مذکورہ تنظیموں کی نشاندہی ریاستی حکومتوں، سماجی بہبود کے بورڈوں کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن، سماجی اور تحقیقی مراکز جیسے راجستھان میں تلونیا اور المورہ میں اتر کھنڈ سیوا ندھی وغیرہ کے ذریعہ کی جائے گی

باقی پر صفحہ ۵۹

کلدیپ نیر

مولانا آزاد کے تیس صفحات

میرا خیال صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب کے غیر مطبوعہ تیس صفحات کے مندرجات کے بارے میں کچھ معقول "قیاس آرائیاں" کر سکتا ہوں۔ میں پروفیسر ہمایوں کبیر کو بخوبی جانتا تھا۔ جنھیں مولانا اپنی کتاب کا مواد اردو میں سمجھایا کرتے تھے۔ پروفیسر کبیر ان دنوں ویسٹرن کورٹ میں مقیم تھے جہاں ہم دونوں روزانہ ملاقات کر کے تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ کبیر پورا دن مولانا آزاد کے ساتھ گزارتے شام میں ہم دونوں چہل قدمی کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ مولانا آزاد ان سے جو کچھ لکھواتے کبیر اس کے بارے میں اکثر مجھے بتایا کرتے ہے۔ جب کتاب کا مسودہ مکمل ہو گیا تو کبیر نے مجھے بتایا کہ مولانا نے اس کے کچھ حصے شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے؛ یہ ۱۹۸۸ء میں کسی وقت شائع کئے جائیں گے۔

ایک ابھرتے ہوئے صحافی کی حیثیت سے میرے اندر ان صفحات کے مندرجات معلوم کرنے کا زبردست شوق پیدا ہوا۔ لیکن میں کبیر سے جب بھی اس کا ذکر کرتا وہ گفتگو کا موضوع بدل دیتے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ جاری رہا۔ بالآخر اسی گفتگو کی بنیاد پر میں کوئی قیاس آرائی کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ یہ کام میں نے پہلے اس لئے نہیں کیا کہ میرا خیال تھا غیر مطبوعہ صفحات جلد ہی منظر عام پر آجائیں گے۔ لیکن اب جبکہ پورا معاملہ عدالت کے زیر سماعت ہے اور صفحات کو جاری کرنے کے اختیار کی قانونی لڑائی جاری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے طویل مدت تک انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ان صفحات کے بارے میں میرا جو خیال ہے۔ اس کے اظہار میں میں خود کو حق بجانب پاتا ہوں۔

مجھے اس امر میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ مولانا آزاد نے ان صفحات میں جواہر لال نہرو سے متعلق کچھ تنقیدی باتیں کہی ہیں۔ مولینا کے دل میں نہرو کا زبردست احترام تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان کی کمزوریوں کو نظر انداز کردیتے۔ یہ بہت معلوم و معروف حقیقت ہے کہ مولینا آزاد تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے۔ نہرو کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے اپنا موقف تبدیل کرلیا کیونکہ ان کے اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کے سامنے منقسم آزاد ہندوستان اور غیر معینہ مدت کے لئے برطانوی راج میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا سوال تھا۔ غالب گمان ہے کہ مولینا آزاد نے غیر مطبوعہ صفحات میں کہا ہو کہ نہرو برطانیہ کے خلاف لڑی جانے والی لڑائی سے تھک چکے تھے۔ اور انھوں نے اس لڑائی کی طوالت سے بچنے کے لئے یہ اقدام کیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ مجھے آزادی کے بعد دوسرے ذرائع سے بھی نہرو کے اس ریمارک کے بارے میں معلوم ہوا کہ "ہم نے ہندوستان کی تقسیم اس لئے قبول کی کہ ہماری عمریں ڈھل رہی تھیں اس لئے ہم اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر کے لئے کچھ وقت چاہتے تھے۔"

ان صفحات میں مولانا نے نہرو کی بے صبری کا تذکرہ کرتے ہوئے سخت زبان استعمال کی ہوگی۔ کیونکہ نہرو ان صفحات کو پڑھ کر بہت رنجیدہ ہوگئے تھے۔ نہرو نے جب لوک سبھا میں ان صفحات کا ذکر کیا تو میں ایوان کی پریس گیلری میں موجود تھا۔ نہرو کا لہجہ رقت آمیز تھا اور وہ ایک ایسے شخص کی طرح بول رہے تھے جسے خواہ مخواہ تکلیف پہنچائی گئی ہو۔ مجھے یاد آتا ہے انھوں نے کہا تھا کہ مولینا کے خیالات سے متفق نہیں ہوں لیکن چونکہ یہ ان کے (مولینا) احساسات ہیں اس لئے میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ نہرو نے یہ بھی کہا تھا کہ مولینا کی اس خواہش کا احترام کیا جائے گا کہ ان صفحات کو ۳۰ سال تک شائع نہ کیا جائے۔ مولینا کے غم و غصہ کا اندازہ کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کے اس باب سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جس کا عنوان "منقسم ہندوستان" ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر اس وقت بھی واضح تھی کہ کانگریسی لیڈروں نے تقسیم کو کھلے دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ مولانا آزاد نہرو کے اس ریمارک پر بھی بہت ... تھے جو انھوں نے کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں دیا تھا۔ اس منصوبے میں مرکز میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مساوات اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے

علیحدہ گروپوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نہرو نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان منظور کر لیا ہے۔ کہا تھا کہ کانگریس آئینی اسمبلی میں کسی بھی قسم کے سمجھوتہ سے آزاد ہو کر داخل ہو گی اور اپنی صوابدید کے مطابق صورت حال کا مقابلہ کرے گی۔ مولانا آزاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جواہر لال کا یہ بیان قطعی غلط تھا اور یہ کہ کانگریس نے لازمی امور (کمپلسری سبجیکٹس) کی مختصر سے مختصر فہرست اپنے پاس رکھنے سے اتفاق کر لیا تھا نیز یہ کہ ہندوستان کے مخصوص حالات کے پس منظر میں وفاقی نظام کی پیچیدگیاں بھی اس پر بالکل واضح تھیں۔ خیال ہے کہ زیر بحث ۳۰ صفحات میں کہا گیا ہو کہ نہرو نے کس طرح کیبنٹ مشن پلان کو سبوتاژ کیا جبکہ یہ پلان ہندوستان کو متحد رکھ سکتا تھا۔ مولانا نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اس پلان کی منظوری دینے پر آمادہ کر لیا تھا نیز گاندھی جی کو بھی اس سے مکمل اتفاق تھا۔ مولانا کا موقف یہ تھا کہ مرکز اپنے ہاتھ میں صرف دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے محکمے رکھے۔ اور آئین کا ڈھانچہ اس طرح تیار کیا جائے کہ صوبوں کی خود مختاری یقینی ہو جائے مولانا لکھتے ہیں کہ اس موقف پر گاندھی جی نے مجھے یہ کہہ کر مبارک باد دی تھی کہ آپ نے ایک ایسے مسئلہ کا حل تلاش کر لیا ہے جس نے ہر شخص کو پریشان کر رکھا تھا۔" کیبنٹ مشن پلان کے ایک ممبر پیتھک لارنس نے بھی مولانا کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کر لیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد نے نہرو کی اُن باتوں کی بھی شدید نکتہ چینی کی ہوگی جس کی وجہ سے ملک کو متحد رکھنے کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کی طرح مولانا آزاد کا بھی پختہ خیال تھا کہ تقسیم ہند ہندو مسلم مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

مولانا نے اپنے ایک نوٹ میں کہا تھا کہ "میں نے کانگریس کو جو فارمولہ منظور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو پاکستان کی اسکیم میں ہے جبکہ اس کی تمام خامیوں سے بچا گیا ہے۔ تحریک پاکستان کی بنیاد یہ اندیشہ ہے کہ مرکز میں ہندو اکثریت میں ہوں گے اور وہ (مرکز) مسلم اکثریت کے علاقوں میں مداخلت کرے گا۔ کانگریس نے صوبوں کو مکمل خود مختاری دے کر اس اندیشے کو دور کر دیا ہے۔"

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج متعدد پاکستانیوں کی خواہش ہے کہ کاش کیبنٹ مشن پلان پر عمل درآمد کیا گیا ہوتا۔ میں نے پاکستان میں وکلا اور دانشوروں

سے اس مسئلہ پر بارہا گفتگو اور تبادلہ خیال کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیبنٹ مشن پلان ہندو مسلم مسئلہ کا بہترین حل تھا۔ بیشتر کے خیال میں بعد میں جو کچھ ہوا وہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش کا نتیجہ تھا پروفیسر کبیر نے مولانا آزاد کے حوالے سے ایک بڑی اہم بات کہی تھی انھوں نے بتایا کہ ایک بار مولانا نے گزشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پنڈت نہرو کو صدر جمہوریہ اور سردار پٹیل کو وزیر اعظم بنایا جانا چاہیئے تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ مولانا آزاد سردار پٹیل کو ان کے ہندو نواز خیالات کی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے لیکن مولانا ایک حقیقت پسند شخص بھی تھے لیکن ہندوستان سے ان کی محبت بہت گہری تھی۔ سردار پٹیل کو وہ اس لئے وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے کہ انھوں نے شاہی ریاستوں اور اور دیگر اداروں کو بہت کامیابی کے ساتھ ہندوستان میں ضم کرلیا تھا۔

مولانا آزاد کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ وہ ملک کی فلاح وبہبود کے راستہ میں اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو آڑے نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کی طرف سے قرارداد منظور کرنے کے بعد متعدد مسلمان ایک علیحدہ وطن کے تصور میں گم ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان سخت حالات سے دوچار ہوجائیں گے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پروفیسر کبیر نے سردار پٹیل کو وزیر اعظم بنانے کے سلسلہ میں مولانا کا جو ریمارک نقل کیا تھا۔ اس پر یقین کرنا دشوار نہیں ہے۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کے موہوم تصورات اور ناقابل عمل خیالات سے بخوبی واقف تھے یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ پٹیل کے برخلاف پنڈت نہرو مغربی خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ مولانا نے اپنی کتاب "غبار خاطر" میں جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں احمد نگر میں اپنی نظر بندی کے دوران لکھی تھی۔ لکھا ہے کہ نہرو خواب بھی انگلش میں دیکھا کرتے تھے کیونکہ میں نے انھیں کئی بار نیند کی حالت میں انگریزی میں بڑبڑاتے ہوئے سنا ہے۔

یہ بات بھی عام طور سے کہی جارہی ہے کہ غیر مطبوعہ تیس صفحات میں مولانا آزاد نے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے بارے میں سخت تنقیدی باتیں کی ہیں لیکن کبیر کے ساتھ اپنی گفتگو سے مجھے یہ تاثر نہیں ملتا ۱۹۵۲ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری اور ان کی جگہ بخشی غلام محمد کے تقرر کی کارروائی مبینہ طور سے مو

باقی بر صفحہ ۵۹

خلیل اکمل

بڑھاپا ۔ سائنسی و نفسیاتی تجزیہ

انسان اپنی زندگی میں عمر کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر ولیم شیکسپیر نے ان منزلوں کو سات نام دیئے ہیں۔ یعنی پیدائش بچپن بلوغیت۔ شباب۔ ادھیڑ عمر۔ بڑھاپا اور موت۔ یوں تو انسان اپنی ابتدائی زندگی میں ہی بعض اوقات کسی حادثہ یا وبائی بیماری سے فوت ہو سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ طویل عمر پاتے ہیں۔ ان کو بڑھاپے سے گزرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ جس کا ساتھ موت تک رہتا ہے۔ آج ہم یہ جانیں گے کہ سائنس نے بڑھاپے کے متعلق کیا نظریات قائم کیئے ہیں۔ اور اس کا نفسیاتی پہلو کیا ہے۔

سائنس نے بڑھاپے کے دو وجوہات بتائے ہیں۔ ایک تو جسم میں حیاتین بنانے والی مشنری میں خرابی دوسرا ہارمون کنٹرول کرنے والے نظام میں انحطاط۔ امریکہ کی اسٹان فورڈ یونیورسٹی کے سائنسداں Lahy & leek نے دریافت کیا ھیکہ انسان کا جسم کئی خلیوں پر مشتمل ہے۔ جو عمر کے لحاظ سے بڑھتے یا گھٹتے رہتے ہیں۔ بچپن میں ان کے بڑھنے کی شرح ۲ تا ۳ گنا ہوتی ہے۔ جبکہ جوانی میں یہ شرح ۴ تا ۶ گنا ہو جاتی ہے۔ لیکن بڑھاپے میں یہ شرح گھٹ جاتی ہے کئی محققین نے یہ دریافت کیا ھیکہ ان خلیوں کے بننے یا بگڑنے کا تعلق پروٹین سے بھی ہے۔ جو ہمارے جسم میں خاص قسم کے تعملات کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ عموماً بعض پروٹین کی کارکردگی بڑھاپے میں کم ہو جاتی ہے۔ جس سے بڑھاپے میں ایک عمر کے بعد بہت تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ ان پروٹین میں Lacto dehydrogenase اور Acetyl - Cholinestrase ہیں۔

بہر حال جسم میں خلیوں کی پیداوار کا تعین وہ حیاتیاتی گھڑی کرتی ہے۔ جو خلیہ کے مرکزی حصہ میں واقع ہوتی ہے۔ عموماً انسان کی عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے

خلیل اکمل ۔ سائنٹسٹ ۔ ریجنل ریسرچ لیباریٹری۔ حیدرآباد۔

خلیوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ بعض خلیے تو ایک عمر کے بعد بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ پیدا نہیں ہوتے۔ جس کی مثال جلد کے خلیوں سے دی جا سکتی ہے۔ اس لیے بڑھاپے میں جلد میں جھریاں پڑنا ایک لازمی امر ہے۔ اس کے برخلاف دماغ اور قلب کے خلیے جو تقسیم نہیں ہوتے ہمیشہ برقرار رہتے ہیں۔ بلکہ ان میں عمر کی پختگی کے بعد اضافہ ہی ہوتا ہے اگر وہ ایک مرتبہ ختم ہو جائیں تو پھر دوبارہ پیدا نہیں ہوتے۔ نیز جگر اور گردوں کے خلیوں میں بننے کا عمل بہت ہی سست ہوتا ہے۔

انسان عموماً بڑھاپے میں کئی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔ یہ بیماریاں بڑھاپے کی وجہ سے نہیں بلکہ جوانی میں اختیار کردہ غلط عادتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جیسے شراب اور سگریٹ نوشی منشیات کا استعمال یا پھر غذا میں ملاوٹ وغیرہ۔ جس سے جسم کے کسی ایک عضو پر مسلسل بار پڑنے سے وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتا ہے۔

چونکہ جوانی میں جسم کی غیر معمولی مدافعتی قوت کے باعث بیماریوں کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن بڑھاپے میں یہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔

بڑھاپے میں بیماریوں سے رغبت کا انحصار خون کے سفید جسیموں کے دو اقسام پر ہے۔ پہلی قسم جو Lymphosites کہلاتی ہے۔ جو ہڈیوں کے اندر گودے سے وجود میں آکر ایک خاص قسم کے پروٹین پیدا کرتی ہے۔ جو بیماریوں کے جراثیم کو ہلاک کرتے ہیں۔ دوسری قسم کو) T-Lymphosites نام دیا گیا ہے۔ یہ جیسے خون بنانے اور جسم کی نشوونما کرنے والے غدود سے پیدا ہو کر بیماریوں کی روک تھام کرتے ہیں۔ بڑھاپے میں ان غدود کی کارکردگی میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے انسان بیماریوں کا شکار ہوتا ہے۔

آسٹریلیا کے سائنسداں Gernet کا خیال ہے کہ سفید جسیموں کی دوسری قسم یعنی T- Lymphosites میں کسی قسم کی تبدیلی بھی جسم کے خود کار مدافعتی نظام کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جس سے ہمارے کئی کلیدی اعضاء میں بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے اور بڑھاپے کی بیماریاں جیسے گنٹھیا وغیرہ لاحق ہو جاتی ہیں۔

بڑھاپے میں ہضمی نظام میں خلل ایک عام بات ہے جس کی علامتیں یوں ظاہر ہوتی ہیں جیسے۔ ذائقہ میں کمی۔ پیٹ کا درد۔ متلی۔ قبض۔ وزن میں کمی اور سستی و کاہلی وغیرہ۔ قبض کے اسباب غذا میں ریشہ دار اجزا کی کمی۔ عضلاتی ریشوں میں انحطاط

اور بواسیر پائے جاتے ہیں۔ دائمی قبض کینسر کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لئے اس کو دور کرنے کے لئے مسہل ادویہ کم سے کم اور ریشہ دار رسیلی غذا زیادہ استعمال کی جائے۔

آج کل ضعیف اصحاب گیسس کی شکایت عام ہے۔ چربی والی غذا اور مٹھائیوں کے بے دریغ استعمال، ہاضمہ کی کمزوری، آنتوں کے فعل میں سستی اور چلنے پھرنے میں کمی کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ افعال درست ہو جائیں تو گیسس کی شکایت بھی دور ہو سکتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ضعیف لوگ جسمانی درد کو کم کرنے والی اور دست آور یا ملین کی دوائیں زیادہ استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ان میں اعتدال سے کام لیا جائے ورنہ بڑھاپا تکلیف دہ بن جائیگا۔

ایک بوڑھے آدمی میں جو جسمانی طور پر تندرست ہو چند پیرانہ کردار نظر آتے ہیں۔ جوش غائب ہو جاتا ہے اور تھکن جلد پیدا ہو جاتی ہے۔ حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی سابقہ کامیابیاں کم بھولتا ہے۔ اور انھیں فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی عادتیں نہیں بدلتا۔ نئی نسل کی باتوں پر اعتراض کرتا ہے۔ شکی مزاج ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ جدت پسندی سے گریز کرتا ہے۔ پرانی آزمائی ہوئی عادتوں کو زیادہ پسندیدہ اور محفوظ سمجھتا ہے۔

بڑھاپے میں تین قسم کے نفسیاتی بار نمودار ہوتے ہیں۔ پہلا بار وہ ہے جس سے انسان کو ہر وقت موت کا ڈر لاحق رہتا ہے۔ یوں تو یہ خوف ہر عمر میں ہو سکتا ہے لیکن بڑھاپے میں یہ خیال ہر وقت مسلط رہتا ہے کہ آپ کے کوچ کا وقت قریب آرہا ہے۔ اگرچہ کہ ضعیف شخص اس خیال کو ٹالنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ لیکن بیماری اور بڑھاپے کا قلعہ اس خیال کو دور نہیں کر سکتا۔

بڑھاپے میں دوسری قسم کا بار سماجی تعلقات کے بدل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کاروبار ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آمدنی محدود ہو جاتی ہے۔ سماجی تعلقات کم ہو جاتے ہیں۔ قدر و منزلت گھٹ جاتی ہے۔ مفلسی کا ڈر رہتا ہے۔ بیوی و بچے بے قدری اور نااتفاقی برتنے لگتے ہیں۔ مکان یا محلہ بدلنا پڑتا ہے۔ دوست احباب کھو جاتے لگتے ہیں۔ سارا ماحول بدل جاتا ہے۔ اور جینا بار معلوم ہوتا ہے۔

بڑھاپے میں تیسری قسم کا نفسیاتی بار پرانے دوستوں کی رفاقت سے محرومی سے

پڑتا ہے۔ کیونکہ کتنے ہی ان کے دوست دنیا سے چل بسے ہونگے چند جو بستر مرگ پر ہونگے دنیا سے کوچ کرنے کی تیاری کر رہے ہونگے۔ غرض ساری دنیا تاریک دکھائی دیتی ہے۔ ان حالات میں بوڑھے شخص کے سامنے موت رقص کرتی نظر آتی ہے۔

بڑھاپے کی سختی کا انحصار انسان کی سوچ پر ہے۔ بعض وقت لوگ جوانی میں زندگی کی تلخیوں سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو وہ بوڑھے جیسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف بعض ضعیف لوگ بڑھاپے سے غیر متاثر معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل مزاج۔ خود اعتماد اور مضبوط شخصیت کے حامل لوگ بڑھاپے کا بار بخوبی برداشت کر سکتے ہیں۔ مگر کمزور طبیعت والوں کے اعصاب اور دماغ متزلزل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ نفسیاتی بار برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے مستقل مزاج بوڑھے احساس شکست خوردگی کو دبا سکتے ہیں۔ اور ان پر بڑھاپے کا کوئی اثر نہیں ہوتا

بڑھاپے کو پر سکون اور آرام دہ بنانے کے لئے اس کی پیش بندی ضروری ہے۔ اس لئے رہنے کو گھر۔ گذر بسر کے لئے معقول وظیفہ اور اوقات گزاری کے لئے دلچسپ مشغلہ اختیار کیا جائے۔ اگر بڑھاپے میں آمدنی اور کچھ کام کا انتظام ہو جائے تو بڑھاپے کے نفسیاتی خوف اور اندیشوں کا سد باب ہو سکتا ہے اسی لئے ضعیف شخص کو چاہیئے کہ وہ نفع بخش کام تلاش کرے۔ دلچسپی کے مشغلہ کی خاطر خاندانی مصروفیات۔ مذہبی۔ سماجی اور سیاسی تحریکات میں حصہ لے۔ فنی مطالعہ کرے اور فنون لطیفہ سے رغبت بڑھائے نقل مقام اور تبدیلی محلہ سے گریز کرے۔ حلقہ احباب کو وسیع کرے۔ اور رکھ رکھاؤ اور لباس پر زیادہ توجہ دے۔ اور تنہا شخص شادی کر لے تاکہ زندگی کی کٹھن منزل میں ایک ساتھی کے مل جانے سے آسانی ہو جائے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں انسان کی عمر کا اوسط ۴۰ سال تھا۔ لیکن اوسط سائنس کی ترقی کے باعث تقریباً دوگنا ہو گیا ہے۔ خصوصاً روس میں EARK نامی مقام پر رہنے والوں کی عمر کا اوسط ۱۰۰ سال سے بھی زیادہ کیونکہ یہاں کے لوگ زیادہ کام کرتے ہیں۔ چشمے کا پانی پیتے ہیں۔ دما

باقی بر صفحہ ۱۸

رشید الدین

قمر اقبال مرحوم

۲۰/جولائی ۱۹۸۸ء کے اخبارات میں افسوس ناک خبر پڑھنے کو ملی کہ اورنگ آباد میں (مہاراشٹرا) میں اُردو کے جواں سال شاعر اور صحافی قمر اقبال کا اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ میں ان سے ابھی ڈھائی تین ماہ قبل ہی اورنگ آباد میں ملا تھا اور اپنی تصنیف تازہ "ذکرِ رفتگاں" کا ایک نسخہ ان کی نذر کیا تھا اس وقت کیا معلوم تھا کہ بہت جلد میں ان کا تذکرہ بھی ذکرِ رفتگاں کے ذیل میں کروں گا۔ انتقال کی خبر پڑھتے ہی ان کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ جس پر ہمیشہ ایک دلنواز مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ وہ صرف ۴۴ سال کی عمر میں ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی عمر مرنے کی ہوتی ہے۔ خصوصاً ایک فنکار کیلئے جس کا فن ۴۰ کے بعد ہی جلا پانے لگتا ہے۔

قمر اقبال اورنگ آباد کے ایک روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" سے وابستہ تھے۔ ویسے تو اب اورنگ آباد سے بہت سے اُردو روزنامے نکلنے شروع ہوگئے ہیں لیکن ان میں "اورنگ آباد ٹائمز" ہی شروع سے ایک معیاری روزنامہ رہا ہے۔ اور اب تو عزیز خسرو صاحب (ایڈیٹر اورنگ آباد ٹائمز) نے اسے قمر اقبال کی اعانت سے ایک مثالی روزنامہ بنادیا تھا۔ وہ اس اخبار کے جائنٹ ایڈیٹر تھے۔ اور اس کا بہت سارا کام اکیلے ہی نمٹالیتے تھے۔ وہ روزانہ اس اخبار کا اداریہ لکھتے۔ ہر روز ایک مزاحیہ نظم لکھتے جو علامہ گمنام اورنگ آبادی کے نام سے چھپتی۔ نثر کا مزاحیہ کالم "بال کی کھال" رقم کرتے اس کے علاوہ ہفتہ وار ادبی ایڈیشن بھی مرتب کرتے جو ہر اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ اتنا سب کرنے کے بعد بہت سی خبروں کا ترجمہ بھی کرتے یا انھیں ایڈیٹ کرتے تھے۔

ان کی ڈیوٹی بارہ بجے دن سے شروع ہوتی اور شام چھ بجے تک رہتی۔

ریسرچ اسکالر شعبہ اُردو و مترجم محکمہ ترجمہ، حمایت نگر، حیدرآباد۔۔۔۲۹۔

اس اثناء میں بہت سے مقامی ادیب و شاعر ان سے ملنے چلے آتے ۔ کوئی باہر سے آنے والا شاعر یا ادیب بھی بغیر "اورنگ آباد ٹائمز" کے دفتر کو گئے بنا اورنگ آباد سے روانہ نہیں ہوتا وہ ہر مہمان ادیب یا شاعر سے ملتے ۔ اس کی آمد کی اطلاع اپنے اخبار میں شائع کراتے ۔ اسے چائے پلاتے ۔ کچھ ادھر اُدھر کی اسے سناتے کچھ اس کی سنتے ۔ غرض دن بھر اچھا گذر جاتا پھر یہ بھی نہیں کہ صرف باتیں ہی ہوتیں ۔ کام کچھ نہ ہوا بلکہ ساتھ ساتھ کام بھی جاری رہتا کیونکہ اخبار کے دفتر میں کام کبھی نہیں رُکتا ۔

کوئی بھی باہر کا شاعر یا ادیب عزیز خسرو صاحب سے ملنے آتا تو وہ سب سے پہلے یہی پوچھتے " آپ قمر اقبال صاحب سے ملے ؟" اگر جواب نفی میں ہوتا تو خود ہی انھیں (قمر اقبال) اپنے کمرہ میں بلا لیتے یا مہمان کو اوپر ان کے کمرہ میں لے جاتے ۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتیں ۔ چائے کا دور چلتا اور پھر کام شروع ہو جاتا ۔ باتوں کے دوران وہ کاتبوں اور دیگر عملہ کو ضروری ہدایات بھی دیتے جاتے اور پان بھی چباتے جاتے ۔

قمر اقبال ایک اچھے صحافی کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے بلکہ میں کہوں کہ بہت اچھے شاعر تھے ۔ ان کا کلام بے حد متاثر کن تھا ۔ سیدھا دل میں اثر کر جاتا تھا ۔ وہ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں تھے ۔ ان کا کلام نہایت کم عمری ہی میں ملک کے رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکا تھا ۔ اس طرح وہ اُردو کے ایک جانے مانے شاعر تھے ۔ ہندوستان کے اکثر مقامات پر مشاعرے پڑھ چکے تھے ۔ خود ان سے میری پہلی ملاقات شولاپور میں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی ۔ فروری ۱۹۸۰ء کا آخری ہفتہ تھا مہاراشٹر اُردو اکیڈمی نے شولاپور میں فانی پر ایک سیمنار رکھا تھا جس میں مقالہ پڑھنے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا ۔ سیمنار کا آخری اجلاس کل ہند مشاعرہ تھا جس کی صدارت موسیقار نوشاد نے کی تھی ۔ ساحر لدھیانوی مرحوم بھی اس مشاعرہ میں شریک تھے ۔

یہیں میری پہلی ملاقات قمر اقبال سے ہوئی ۔ اونچا قد، ستواں ناک، بڑی بڑی بھرا بھرا جسم اور سرخ و سفید رنگ، پیشانی کافی چوڑی جیسے سامنے کے بالوں نے جا کر چوڑی کر دیا تھا ۔ چہرہ پر دلنواز مسکراہٹ ۔ بشر نواز نے ہم دونوں کو ملایا ۔ ویسے تو ایک دوسرے کے نام اور کام سے واقف تھے ہی ۔ اب شخصی طور پر بھی ملاقات ہو گئی ۔ میں ۱۹۶۰ء کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد آ گیا تھا ۔ اور قمر اقبال بھی سرکاری ملازمت میں منسلک ہونے کی وجہ سے ناندیڑ میں رہتے تھے ۔ اس لئے اورنگ آباد جانے پر ملاقات نہ ہوتی تھی ۔ بعد میں انھو

سرکاری ملازمت چھوڑکر " اورنگ آباد ٹائمز " جوائن کر لیا تھا۔ وہ پڑھتے بھی بہت اچھا تھے۔ مشاعرہ میں انھیں اُس رات میں نے پہلی بار سنا۔ تحت اللفظ سے پڑھتے تھے اور بہت متاثر کرتے تھے۔

یہ سعید ادھی پہلی ملاقات کی۔ اب آخری ملاقات کا احوال بھی سن لیجئے۔
ابھی کوئی ڈھائی تین ماہ قبل میں اورنگ آباد گیا تھا۔ حسب معمول اورنگ آباد ٹائمز کے دفتر بھی گیا تو حسب توقع وہ موجود تھے اور پان چباتے ہوئے کوئی خبر کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو علیک سلیک کے بعد کاغذات ایک طرف رکھ دیئے اور بولے " سنائیے رشید صاحب! کب آئے اور کب تک قیام ہے "؟ میں نے جواب دیا کہ خاندان میں کچھ شادیاں ہیں اس لئے چلا آیا ہوں کچھ دن رہونگا "۔ یہ سن کے خوش ہوئے۔ پھر چائے منگوائی۔ جوان کا وطیرہ تھا۔ وہ بہت چائے پیتے تھے اور پان بھی اتنے ہی کھاتے تھے اور ان دونوں سے زیادہ سگریٹ پیتے تھے۔ دوسرے دن اخبار دیکھا تو میری آمد کی اطلاع موجود تھی۔ سمجھ گیا کہ یہ قمر اقبال صاحب کی کرم فرمائی ہے۔

جب بھی اورنگ آباد جاتا تو مضمون طلب کرتے۔ اگر کوئی مضمون ساتھ ہوتا تو دے دیتا۔ بہت اہتمام سے سنڈے ایڈیشن میں چھاپتے۔ کسی اچھے کاتب سے کتابت کرواتے واپس آنے سے دو دن قبل ڈاکٹر یوسف عثمان صاحب کے گھر پر ان سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوگئی۔ بشر نواز اور رفعت نواز بھی موجود تھے۔ یوسف صاحب نے کہا تھا کہ رات کا کھانا میرے پاس کھانا۔ میں رفعت نواز کے ساتھ پہنچا تو وہاں بشر نواز اور قمر اقبال بھی موجود تھے۔ یوسف صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی کہا " اب میں نے سوچا ان دونوں کو بھی مدعو کر لینا چاہیئے "۔ اب میں نے جواب دیا " یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ کھانے میں زیادہ لطف آئے گا "۔ اس دن (بلکہ رات) وہاں دنیا جہاں کی باتیں ہوئیں۔

جب ہم اٹھنے لگے تو قمر اقبال نے پوچھا " رشید صاحب آپ کہاں جائینگے "؟ میں نے جواب دیا " بڈّی لین " تو جواب دیا " ٹھیک ہے مجھے جیب کالونی جانا ہے آٹو لے لیتے ہیں۔ آپ راستے میں اتر جائیے "۔ رفعت نواز اور بشر نواز وہیں گھاٹی میں رہتے ہیں جو جیسے سنگھ پورہ (یوسف عثمانی کا محلہ) سے قریب ہی ہے۔ ہم دونوں نے آٹو لیا۔ ۱۱ بجے رات سے شہر میں کرفیو نافذ ہونیوالا تھا۔ اس لئے آٹو ڈرائیور بہت جلدی کر رہا تھا۔ قمر اقبال نے اسے دلاسہ دیا کہ " میاں اتنی جلدی مت کرو۔ ہم اخبار والے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا "۔ اتنے میں بڈّی لین آگئی اور میں آٹو رکوا کر اتر گیا۔ قمر اقبال سے

مصافحہ کیا اور جاتے جاتے کہا "حیدرآباد آئیے تاکہ آپ بلا لیجئے تو سہی" ان کا مطلب کسی مشاعرہ وغیرہ کے دعوت نامے سے تھا۔ میں نے جواب دیا "ضرور"۔ کسے معلوم تھا کہ میری اور ان کی یہ آخری ملاقات رہے گی۔

قمر اقبال جدید لب ولہجہ کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے یوں تو کئی مجموعے تھے لیکن "موم کا شہر" بہت مشہور تھا جسے مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی نے ایک گراں قدر ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ ان کی شہرت جب اورنگ آباد اور مہاراشٹرا سے نکل کر پورے ہندوستان اور پاکستان میں پہنچ چکی تھی۔ نثر بھی وہ بہت اچھی لکھتے تھے۔ وہ ایک باشعور فنکار تھے۔ ساحر کی طرح ان کی شاعری پڑھنے والوں کو بہت متاثر کرتی تھی۔ ان کے پاس حیات اور حقیقت کا بڑا حسین امتزاج تھا۔ غزلیں اور نظمیں دونوں کہتے تھے۔ مزاح کا ذوق بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن صرف بے تکلف دوستوں سے ہی مذاق کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں بڑی شائستگی تھی۔

قمر اقبال پٹھان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے بزرگ بہت عرصہ قبل افغانستان سے آکر اورنگ آباد میں بس گئے تھے اور ان کا ایک محلہ بھی آباد ہوگیا تھا جو روہیلہ گلی کہلاتا ہے۔ ان کا اصل نام اقبال محمد خاں تھا۔ ان کے بہت سے رشتہ دار اب بھی اسی محلہ میں رہتے ہیں افسانہ نگار رفعت نواز اور شاعر بشر نواز 'دونوں بھائی بھی ان کے رشتہ دار ہیں۔ ان لوگوں کا اپنا ایک قبرستان بھی ہے جو روہیلہ گلی کا قبرستان کہلاتا ہے۔ یہ وہی قبرستان ہے جہاں اردو کے مشہور شاعر سراج اورنگ آبادی کا مزار بھی ہے۔ یہ مزار آج بھی محفوظ حالت میں ہے، کیونکہ یہ ایک چھوٹے سے پختہ گنبد میں محصور ہے۔ وہ تین سال قبل جب اورنگ آباد میں جشن مزاح منایا گیا تھا تو قاضی سلیم کی کوششوں سے اس سڑک کو جو چوک سے قلعہ روک کر جاتی ہے۔ اور جس پر محلہ روہیلہ گلی اور گلی کا قبرستان واقع ہے۔ شاہ سراج روڈ کا نام دیا گیا اور ایک تختی بھی نصب کی گئی ہے۔ غالباً اقبال مرحوم بھی اسی قبرستان میں سراج کے پہلو میں آرام کر رہے ہیں کیونکہ وہ ان کا خاندانی قبرستان ہے۔ انھیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے۔۔۔ ایک حقیقت ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ اسی اللہ سے جس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا دعا ہے کہ وہ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

پی آئی بی

یوم عالمی ورثہ

اقوام متحدہ کے ادارہ "یونیسکو" کا شعبہ، بین الاقوامی کونسل برائے تاریخی عمارات ہر سال ۱۸/اپریل کو "یوم عالمی ورثہ" مناتا ہے۔ اس کا مقصد انسانی تہذیب کے ورثہ کے تحفظ و تشہیر کے لئے کی جانے والی عالمی سطح کی کوششوں کو منظم و مربوط کرنا ہے۔

بھارت عظیم تہذیبی ورثہ اور مختلف اقسام کی تاریخی عمارات کا بیش قیمت محافظ ہے جن میں چند ایک ۵۰۰۰ سال قدیم ہیں۔ ان کا تحفظ محکمہ آثار قدیمہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کرتا ہے۔
ان قدیم و نادر عمارات میں چند ۱۳ کو ان کی عالمی اہمیت کے پیش نظر دنیا کی قدیم عمارات کی فہرست میں رکھا گیا ہے ان میں ایلیفنٹا، اجنتہ، ایلورہ، مہابلی پورم، پٹاڈکل، برہادیشوری مندر، سورج مندر، (سن ٹمپل) کونارک، کھجوراہو اور ہمپی میں واقع قدیم عمارات کا کامپلکس، قرون وسطی کی قدیم عمارات، آگرہ کا قلعہ، تاج محل اور فتح پور سیکری بھی شامل ہیں۔ گوا کے چرچ اور کانونٹس کے علاوہ نوآبادیاتی دور کے کھنڈرات ہندستانی فن تعمیر کے عظیم ورثہ کی زندہ مثالیں ہیں۔

ان تقاریب کے سلسلہ میں محکمہ آثار قدیمہ نے جو اپنی نوعیت کا قدیم ترین ادارہ ہے۔ عوام کی زیادہ شرکت کے ساتھ مناسب انداز میں "یوم عالمی ورثہ" منایا۔ عالمی تعاون کے میدان میں ۱۹۷۲ء کے دوران یہ ایک یادگار یوم تھا۔ جبکہ یونیسکو کی جنرل کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں دنیا کے ثقافتی اور قدرتی ورثہ کو محفوظ کرنے سے متعلق کنونشن طلب کیا گیا۔ اس کنونشن کے بعد غیر معمولی اہمیت کے حامل "عالمی ثقافتی و قدرتی ورثہ" کے تحفظ کی خاطر مختلف حکومتوں پر مشتمل "عالمی وراثت کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی یونیسکو نے ۱۹۷۶ء میں قائم کی۔

اس فورم کا اصل مقصد "عالمی ثقافتی و قدرتی ورثہ کی تعریف متعین کرنا اور رکن ممالک سے ایسے مقامات و عمارات کی فہرست طلب کرنا تھا۔ جو غیر معمولی اہمیت اور دلچسپی کا موجب ہیں اور جس کی حفاظت سے عالم انسانیت کو دلچسپی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کمیٹی کے مقاصد میں آئندہ نسلوں کے لئے ان بیش قیمت خزانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے دنیا کی تمام اقوام سے تعاون حاصل کرنا بھی شامل ہے۔

عالمی ورثہ کے لئے ۲۸۷ مقامات:۔

عالمی ورثہ کے ۲۸۷ مقامات کی فہرست مرتب ہوئی جن میں قدرتی اور ثقافتی عجائبات شامل ہیں۔ جس کی حفاظت سے ہر کسی کو تعلق خاطر ہے اور جو سارے عالم انسانیت کی میراث ہیں۔ مئی ۱۹۸۷ء تک ۹۵ ممالک نے اپنی فورم (کمیٹی) میں شرکت کی۔ ہندوستان ۱۹۷۷ء ہی سے عالمی ورثہ کی ایما کی فہرست کا ایک اہم و کارکرد رکن ہے۔ اور آئیکوس، آئی۔یو۔سی این۔ آئی سی سی آر وَیم۔ جیسے عالمی اداروں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ کمیٹی برائے عالمی ورثہ کی رکنیت بھارت کو ۱۹۸۵ء میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس کے ۲۳ ویں سیشن میں ملی، بھارت اس کے بعد سے عالمی ورثہ فنڈ میں برابر اپنا حصہ ادا کرتا رہا ہے۔ اور اس عظیم ورثہ کو برقرار رکھنے کے لئے چلائی جانے والی مہم میں صف اول کا ملک سمجھا جاتا ہے۔

دس ثقافتی سائٹس:۔

بھارت نے ابھی تک ۸ثقافتی اور ۳ قدرتی سائٹس کی نشاندہی کی ہے۔ ان عالمی اہمیت کی حامل تاریخی عمارات و مقامات میں اجنٹہ کے غار ایلورہ کے غار، آگرہ کا قلعہ، تاج محل، سورج مندر (سن ٹمپل) کونارک مہابلی پورم کی تاریخی عمارتیں، گوا کے چرچ اور کانونٹس، کھجورا ہو کی تاریخی عمارتیں ہمپی کی تاریخی عمارتیں فتح پور سیکری اور منگول سٹی شامل ہیں۔ اس فہرست میں عالمی ورثہ کمیٹی نے اس سال مزید تین کا اضافہ ۲۳/تا ۲۶ جون کو پیرس میں منعقدہ میٹنگ میں کیا۔ ان میں ایلیفنٹا غار (بمبئی) پٹا دھکل کی تاریخی عمارتیں (کرناٹک) اور برہا دیوی سرا مندر..... (تنجور تمل ناڈو) شامل ہیں۔ فن تعمیر کے اعلیٰ ترین نمونوں کی حیثیت سے مزید ۱۲ ایسے مقامات جو غیر معمولی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں انکو عالمی فہرست میں شامل کرنے کی سفارش کی جارہی ہے۔ ان میں دہلی کا لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ (دہلی) قطب مینار (دہلی)

نوتھل (گجرات) آیہول (کرناٹک) مرتانڈ مندر (کشمیر) کارلے (مہاراشٹرا) چتوڑگڑھ (راجستھان) کالی بنگن (راجستھان) پرکھ دائیوں والی سائیٹ) اکبر کا مقبرہ (سکندرا آگرہ۔ اترپردیش) اعتماد الدولہ کا مقبرہ (آگرہ اترپردیش) شامل ہیں۔

دس قدرتی سائٹس:- عالمی فہرست میں بھارت نے جو دس قدرتی سائٹس پیش کئے ہیں۔ ان میں کیلیاڈیو نیشنل پارک (راجستھان) بناس وائلڈ لائف سینکچوری (آسام) اور کازی رنگا نیشنل پارک (آسام) اس کے علاوہ قدرتی حسن کی دولت سے مالا مال سندربن (مغربی بنگال) گر نیشنل پارک (گجرات) چھوٹا رن کچھ (گجرات) رنتھمبور نیشنل پارک (راجستھان) کہنا نیشنل پارک (مدھیہ پردیش) نندی دیوی نیشنل پارک (اترپردیش) وہ مقامات ہیں۔ جن کی عالمی فہرست میں شمولیت کا امکان ہے۔

بھارت کے عوام نے اپنے اس تہذیبی و قدرتی ورثہ کے تحفظ سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ چند برس پہلے سابقہ وزیر اعظم آنجہانی مسز اندرا گاندھی کی کوششوں سے انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچرل ہیریٹیج قائم کیا گیا۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی اس کے موجودہ چیرمین ہیں۔ اس ادارہ نے ملک کے اس عظیم ورثہ کے بارے میں بیداری پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اس کے علاوہ چند اہم عمارتوں کے تحفظ کے لئے اقدامات بھی کئے ہیں۔ بھارت کے لئے جو بات اور بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ قدیم عمارتوں اور عبادتگاہوں کو محفوظ رکھنے سے اس کو گہری دلچسپی ہے اور یہ ہماری قدیم روایت ہے جس کا ثبوت قرون وسطی الاسلام سے قبل کی عمارات سے ملتا ہے۔

بھارت سرکار محکمہ آثار قدیمہ اور دیگر اداروں کے توسط سے اپنے قدیم عمارتوں کی حفاظت کی کوشش کر رہی ہے اپنے قیام کے ۱۲۵ سال سے زیادہ کے عرصہ میں نہ صرف عمارتوں کے ڈھانچوں کی حفاظت کے لئے کیمیائی طریقوں میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ بلکہ تحفظ کے لئے خود اس کے اپنے اصول اور پالیسیاں بھی مدون ہوچکی ہیں۔ ایک قدیم ترین اور منظم ادارہ کی حیثیت سے محکمہ آثار قدیمہ کی اپنی روایات ہیں اور ہندوستان یا بیرونی ممالک میں عمارات کو محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں عالمی شہرت حاصل ہے چنانچہ بحرین، مالدیپ، مصر، بھوٹان اور افغانستان میں اس کے کاموں کا شہرت ہے۔ اس وقت بھارت کے ماہرین کمپوچیا میں واقع عالمی شہرت یافتہ انگکور واٹ مندر کے تحفظ کا کام کر رہے ہیں۔

* * *

امین مالوف / قاضی جلیل احمد

(قسط ۱۹)

صلیب کے سائے میں

لیکن اب وقت آگیا تھا کہ فرنگی حصار پر ایک ضرب لگائی جاتی۔ فرنگی اتحاد مقاصد اور ان کے حصول کے لئے عسکری طاقت دونوں میں جھول آناد کھائی دینے لگا تھا۔ ابن قلانسی کو حیرت ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ فرنگی آپس میں ایک دوسرے سے دست بگریباں ہیں۔ [illegible] اس دور تعجب کا حد نہیں جب زنگی کے پاس بالڈون ثانی کی دختر ایلکس کا پیغام پہنچا۔ جس میں اُس نے اپنے باپ ہی کے خلاف زنگی سے مدد طلب کی تھی۔

اس واقعہ کی ابتدا سنہ ۱۱۲۶ء میں ہوئی جب انطاکیہ کا حکمران پرنس بوہمنڈ ثانی شمالی علاقوں میں جنگ کرتے ہوئے ایک معرکہ میں دانشمند کے بیٹے غازی کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اُس سے ۲۵ سال پہلے بوہمنڈ اول بھی دانشمند کے ہاتھ گرفتار ہو چکا تھا لیکن بوہمنڈ ثانی اس جھڑپ میں مارا گیا اور غازی نے اسکا سر کاٹ کر تحفہ کے طور پر خلیفہ بغداد کو روانہ کیا۔ جب اس موت کی اطلاع انطاکیہ پہنچی تو اسکی بیوہ نے وہاں ایک طرح کا فوجی انقلاب برپا کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوہمنڈ ثانی کی بیوہ ایلکس کو شہر انطاکیہ کے یونانی، ارمنی اور شامی نصرانیوں کی تائید حاصل تھی۔ شہر پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے بعد مدد کے لئے اُس نے زنگی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ فرنگیوں کے بارے میں ایک نئی حکمت عملی کا آغاز تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایشیا میں ایک نئی فرنگی نسل جنم لے رہی تھی، جسکو سابقین سے کوئی نسبت نہ تھی۔ یہ نئی نسل [illegible] نے یورپ کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اپنے آپ کو [illegible] شہزادی سمجھتی تھی۔ ایلکس نے زنگی کو ایک مرصع ساز ڈالا گھوڑا [illegible] روانہ کیا تھا اور انکی مدد طلب کرتے ہوئے اقرار کیا تھا کہ وہ [illegible]

بلادمتی کو تسلیم کرے گی. لیکن یہہ ایلچی راہ میں بالڈون ثانی کے ہاتھوں لگا جس نے اُسے اسی وقت قتل کرادیا اور پھر حملہ کرکے انطاکیہ پر قبضہ کرلیا اور ایلکس کو گرفتار کرکے لتاکیہ کو جلا وطن کردیا۔

لیکن اسکے کچھ ہی عرصے بعد یعنی اگست ۱۱۳۱ء میں یروشلم کے بادشاہ بالڈون ثانی کا انتقال ہوگیا۔ اسکے متعلق ابن قلانسی یوں لکھتا ہے ــ

"بالڈون ثانی، وہ مرد ضعیف جو وقت اور بد بختیوں کے ہاتھوں پس کر منجھ گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور پھر ان سے اپنی حیلہ سازیوں کی بدولت گلو خلاصی بھی حاصل کی۔ اسکی موت سے فرنگیوں نے ایک نہایت معاملہ فہم اور لائق حکمراں کھودیا۔ یروشلم کا تخت یورپ سے تازہ وارد کاونٹ اف انجو کے قبضے میں آیا جس میں نہ مناسب قوت فیصلہ تھی اور نہ انتظامی صلاحیت۔ بالڈون کی موت سے فرنگیوں میں خلفشار اور بدامنی پیدا ہوگئی"

یروشلم کا یہہ تیسرا فرنگی بادشاہ کاونٹ فلک اف آنجو سرخ بالوں والا لحیم و شحیم شخص تھا۔ اسکی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ اسکی شادی ایلکس کی بڑی بہن میلیسنڈا سے ہوئی تھی۔ بالڈون ثانی کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اور چونکہ یہہ نووارد فرنگی اپنے ان رسوم و رواج میں اتنے گھرے تھے کہ وہ مشرقی کلچر کو بالکل اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ اور نہ اصول حفظان صحت سے واقف تھے کہ اسکے لحاظ سے اپنے طرز معاشرت میں کچھ ضروری تبدیلی کرسکتے۔ لہذا ان میں بچوں کی اموات کا تناسب بہت بڑھا ہوا تھا۔ اور جسکا اثر لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں پر زیادہ پڑتا تھا: یعنی لڑکے زیادہ موت کا شکار ہوتے تھے۔ کافی مدت کے بعد انہیں حمام کی اہمیت اور مشرقی حکیموں کی مہارت کی طرف دھیان دینے کا خیال آیا۔

ابن قلانسی ان نوواردوں کے امور مملکت کے انصرام کی قابلیت کا بھی بہت ہی حقارت کیساتھ ذکر کرتا ہے۔ خصوصاً فلک آف انجو کے دور میں تو ملکی بد انتظامی حد سے گزر گئی تھی۔ اسکے بر [illegible] اقتدار [illegible] سے پہلے تو اسے ایلکس کی بغاوت سے سابقہ پڑا جسکو [illegible] نے [illegible] معزول کے عدم فرد کیا۔ اسکے بعد فلسطین میں بھی بغاوت ہوگئی۔ پھر یہہ [illegible] کہ ملکہ میلسینڈا اسکے ایک [illegible] سے کیساتھ [illegible]

اسکے بعد عرصہ دراز تک میلیسنڈا کے عاشق اور اس کے شوہر کے حمایتوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں اور نوبت یہ ایں جا رسید کہ ہیو اف پوسیٹ بھاگ کر مصریوں کے پاس عسقلان میں پناہ لی اور مصریوں کی مدد سے جافہ کی بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا جہاں سے اسے کاونٹ اف اجو نے بڑی مشکل سے ہٹایا۔

دسمبر ۱۱۳۲ء میں جب فلک جافہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی غرض سے اپنی طاقتوں کو مجتمع کر رہا تھا اس وقت دمشق کے نئے اتابک اسماعیل نے ایک اچانک حملے کے ذریعے بانیاس کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہی قلعہ تھا جسے باطنیوں نے ۳ سال پہلے اہل فرنگ کے حوالے کیا تھا۔ لیکن بانیاس کی فتح مگر دراصل محض ایک استثنائی واقعہ تھی۔ ورنہ عام طور پر مسلمان امرا آپسی جھگڑوں اور جنگ و جدل ہی میں مصروف تھے۔ جسکی وجہ سے وہ فرنگیوں کی آپسی خانہ جنگیوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ خود اتابک عماد الدین زنگی بھی شام کو اپنے ایک ساتھی سردار کے حوالے کر کے خلیفہ بغداد کے خلاف بڑھ دوڑا تھا۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ بغداد کے سلطان محمد سلجوقی کا عین عنفوان شباب میں انتقال ہو گیا تو حسب معمول اسکی گدی کے لئے ورثاء میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ خلیفہ مسترشد باللہ نے ایک بار پھر موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور بغداد میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ خلیفہ کی اس مطلق العنانی کو زنگی نے اپنے لیئے خطرہ کا باعث جانا اور اس بغاوت کو دبانے کے لئے فوج لیکر بغداد کی طرف بڑھا تاکہ ایکبار پھر خلیفہ مسترشد کو محلوں کی چار دیواری کے اندر ڈھکیل دے۔ لیکن اس بار خلیفہ زنگی کیلئے پوری طرح سے تیار تھا تغریط کے مقام پر خلیفہ کی فوجوں نے زنگی کو شکست فاش دی اور اتابک خود بمشکل ایک کرد امیر ایوب کی مدد سے اپنی جان بچا سکا۔ یہ شخص تغریط کا گورنر تھا اور اس نے خلیفہ کے بجائے زنگی کا ساتھ دینا مناسب سمجھا اور اسے لیکر موصل جا پہنچا۔ اسکے صلے میں اتابک عماد الدین زنگی ہمیشہ ایوب کا ممنون احسان رہا چند سال بعد اس دوستی کے اور بھی فیصلہ کن نتائج برآمد ہوئے اور ایوب کے بیٹے یوسف نے تاریخ میں صلاح الدین ایوبی کے نام سے شہرت پائی۔

عماد الدین زنگی پر فتح و نصرت پانے کے بعد خلیفہ مسترشد کا ستارہ اقبال عروج پر جا پہنچا لیکن اسکا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ سلجوقی ترک اپنے اقتدار کو [illegible] ایک داعی مسعود کے گرد جمع ہو گئے اور اس کو [illegible]

تاکہ خلیفہ کے ہاتھوں تخت نشینی کی رسم ادا کر دی جائے۔ اس تقریب کی تفصیل ابن قلانسی یوں لکھتا ہے۔

"مسلمانوں کے امام، امیرالمومنین تشریف فرما تھے۔ سلطان مسعود نے خلیفہ کے حضور میں پیش ہو کر کورنش بجا لائی اسکے جواب میں خلیفہ نے اسے سات پارچہ خلعت زر نگار ایک خنجر مرصع، سونے کے کنگن اور ہار، اور جواہرات سے مزیں تاج شاہی عطا کرتے ہوئے کہا۔ اس تحفہ کو شکریے کے ساتھ قبول کرو اور حاضر و ناظر خدا سے ڈرتے رہو۔ سلطان نے قدم بوس ہو کر زمین چومی اور پھر تخت زر نگار پر جلوہ افگن ہوا۔ خلیفہ نے پھر کہنا شروع کیا جو شخص دوستی سے انحراف کرتا ہے اُسے حکومت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ وزیر سلطنت نے جو دربار میں موجود تھا فارسی میں امرائے دربار کے لئے اس جملے کا ترجمہ کیا اور اپنے عہد پر مستحکم رہنے کی قسم کھائی اسکے بعد خلیفہ نے مرصع تلواریں اور دو پرچم منگوا کر پوری احترام کے ساتھ سلطان کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ ان پرچموں کو خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے گرہ لگائی تھی۔ اس کاروائی کے اختتام کے بعد امیرالمومنین نے یہ الفاظ کہے، جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور ہمیشہ اپنے آپ کو شکر کرنے والوں کے زمرے میں شامل رکھو۔"

عباسی خلیفہ نے اس موقعہ پر بڑی خود اعتمادی کا اظہار کیا تھا گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اُس میں محض دکھاوا کتنا تھا اور حقیقت کتنی اس نے بڑی خود اعتمادی کیساتھ ترک سرداروں کو لکچر دیا گو وہ یہ جانتا تھا کہ اُن کا یہ اپسی اتحاد اسکے اقتدار کے لیئے سم قاتل ہے۔ تاہم اُسے مسعود کو سلطان تسلیم کرنا پڑا اور اُس نے پھر ۱۱۲۳ء میں اُسے پھر سے اقتدار کے خواب دکھائی دینے لگے اور وہ فوج لے کر موصل کی طرف بڑھا تاکہ زنگی کو ختم کر کے شہر پر قبضہ کرے سلطان مسعود نے بھی خلیفہ کی مخالفت نہیں کی بلکہ اُسے شہہ دی کہ شام و عراق کو سلطنت میں شامل کر کے اسکی طاقت میں شامل کر کے اسکی طاقت میں اور اضافہ کرئے۔ لیکن دوسری طرف اُس نے فوج بھیج کر زنگی کی مدد بھی کی۔ خلیفہ تین ماہ تک موصل کا محاصرہ کیئے پڑا رہا۔ اس ناکامی نے المسترشد باللہ کو تقدیر کے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔

خلیفہ کے بہت سے ساتھی امیر اُس کا ساتھ چھوڑ کر زنگی سے جا ملے اور خلیفہ کو شکست فاش ہوی۔ سلطان مسعود نے خلیفہ کو قید کر دیا۔ اور ایک دن وہ اپنے کمرے میں مُردہ پایا گیا۔ کہ اسکا جسم برہنہ اور ناک اور کان کٹے ہوئے تھے اور اسکے جسم پر چاقو کے بے شمار زخم۔

زنگی جب تک ان جھگڑوں میں الجھا رہا اسے شام کے معاملات میں دلچسپی لینے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اور شاید وہ موصل میں اس وقت تک مزید قیام کرتا تاکہ سلجوقیوں کے خلاف عباسی خلافت کے دعویداروں کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا۔ لیکن اسی زمانے میں اسے بورّی کے فرزند اتابک اسماعیل کا ایک دعوت نامہ اصول ہوا جس میں اس سے دمشق آکر شہر پر قبضہ حاصل کرنے کی درخواست کیگئی تھی۔ اسماعیل نے مزید تنبیہ یہہ دی تھی کہ اگر اس نے آنے میں دیر کی تو وہ خود فرنگیوں کو بلا کر یہہ شہر اُنکو حوالے کر دیگا۔ اور اسکی ذمہ داری اُسی کے سر ہوگی۔ واقعہ یہہ ہے کہ اسماعیل کو ہر گلی اور موڑ پر موت کے سائے منڈلاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد زنگی کی پناہ میں قلعہ سرحد میں اپنی زندگی گزار دے۔

بورّی کے فرزند اسماعیل کا دورِ حکومت ویسے تو بڑے نیک شگون کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوکر اسنے بڑی مستعدی اور بہادری کے جوہر دکھلائے تھے۔ قلعہ بانیاس کی تسخیر اسکی جرأت اور بہادری کی دلیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مغرور اور خود سر حکمران تھا۔ اپنے باپ کے صلاح کاروں کی رائے کو اس نے کبھی خاطر میں نہیں لایا۔ اور نہ اپنے دادا تغتگین کے صلاح کاروں کی۔

لوگ اسکے اس عمل کو اسکی نوجوانی اور ناتجربہ کاری پر محمول کر کے معاف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اہل دمشق اسکی بڑھتی ہوئی حرص و ہوس سے تنگ آنے لگے تھے کیونکہ وہ ہر روز نئے نئے محاصل عاید کرنے لگا تھا۔ سنہ ۱۱۳۴ء تک حالات پھر بھی پرسکون رہے۔ لیکن ایک رات تغتگین کی ایک لونڈی نے سلطان کو قتل کرنے کی کوشش کی، جسکا نام ایلبا تھا۔ سلطان کے دماغ میں سماگئی کہ وہ لونڈی کی زبانی اسکے جرم کا اقبال سنے۔ اگر میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی، لونڈی نے کہا

نو اسکا مقصد خلق اللہ کو تمہارے ظلم سے نجات دلاکر خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ تم نے رعیتوں اور بے کسوں پر ظلم کیا ہے۔ تم نے امرائے لشکر اور اُمرائے دربار دونوں کو بے زار کیا ہے۔ اس پر اسماعیل نے ایلیا کو حکم دیا کہ وہ اُن لوگوں کے نام بتائے جنکی اُس کے خیال میں بے عزتی ہوئی تھی۔ بعد اسماعیل نے ان سب کو گرفتار کرواکر قتل کر دیا۔ لیکن اس قتل ناحق سے بھی اسکا دل نہیں بھرا اُسے اپنے بھائی پر بھی شبہ تھا۔ اس لیے اُسے بھی گرفتار کرکے تکلیفیں دے دے کر ہلاک کیا۔ اسکے ظلم و تعدّی کی کوئی حد باقی نہ رہی ہر قتل کے بعد اُسے انتقام کے سائے سرسراتے دکھائی دیتے جن سے ڈر کر وہ پھر قتل و خون کی ہولی کھیلتا۔ ایک گرداب تھا جس میں پھنس کر وہ غوطے کھانے لگا تھا۔ اور تب اُسے سوچا کہ دمشق کی حکومت زنگی کے حوالے کر کے خود سرحد کے قلعے میں گوشہ نشین ہو جائے۔ لیکن خود اہل دمشق زنگی سے نفرت کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ ۱۱۲۹ء میں زنگی نے دمشق کے سلطان بوری کو لکھا کہ وہ فرنگیوں کے خلاف جہاد میں اسکی مدد کرے۔ بوری نے پانسو منتخب سرداروں کا ایک دستہ اپنے لڑکے ساونج کی قیادت میں زنگی کی مدد کیلئے روانہ کیا۔ زنگی نے دھوکے سے ان کے ہتھیار رکھوا لیے۔ اُنہیں قیدی بنالیا اور بوری کو لکھ بھیجا کہ اگر مستقبل میں کبھی اُس نے سرکشی کی جرات کی تو ان یرغمالوں کا سر قلم کر دیا جائیگا۔ خود ساونج بھی دو سال تک زنگی کی قید میں رہا۔ ۱۱۳۵ء میں اہل دمشق زنگی کی یہ غداری بھولے نہ تھے۔ چنانچہ جب امرائے دمشق کو اسماعیل اور زنگی کے بیچ اس نامہ و پیام کی ہوا لگی تو انہوں نے اسے ہر طرح ناکام بنانے کی ٹھان لی۔ اور ان کے آپسی صلاح مشورے ہونے لگے ان امرا میں سے بعض نے اسماعیل کی ماں ملکہ زمرد کو بھی اس سازش میں شامل کرلیا۔

ملکہ زمرد نے بیٹے کو بلاکر سخت سرزنش کی۔ وہ ایک بے حد نیک بخت ملکہ تھی۔ اور اسے اپنی اولاد سے زیادہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اسکی سرزنش کا اسماعیل پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے۔ لہذا وہ اسماعیل کا خاتمہ کرنے پر آمادہ ہوگئی اور ایسا موقعہ تلاش کرنے لگی جب اسکا بیٹا تنہا ہو اور اسکے اطراف اسکے سردار یا غلام موجود نہ ہوں چنانچہ موقعہ پاتے ہی اس نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ اسماعیل کا خاتمہ کر دیں۔ اس قتل پر لوگوں نے بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور شکر خدا بجالائے۔

کیا ملکہ نے اسماعیل کو دمشق زنگی کے حوالے کرنے سے باز رکھنے کیلئے قتل کیا؟

تھا۔ قرائن اسکے خلاف نہیں۔ کیوں کہ تین سال بعد اسی ملکہ نے زنگی سے شادی کرلی تھی اور اُس سے درخواست کی تھی کہ آکر شہر پر قبضہ کرلے۔ نہ تو یہہ قتل ساویج کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے ہو سکتا ہے کیونکہ ساویج بوری کی دوسری بیوی سے تھا۔ اسلئے ہم کو ابن الاثیر کی بتائی ہوئی یہہ وجہہ تسلیم کرنی پڑیگی کہ ملکہ زمرد کے دراصل اسماعیل کے سب سے بڑے مشیر اور صلاح کار سے ناجائز تعلقات تھے۔ اور جب اُسے پتہ چلا کہ اُس کے لڑکے نے اسکے محبوب کے قتل کا ارادہ کرلیا ہے تو اُس نے خود اسماعیل کو قتل کروادیا۔

وجہہ خواہ کچھ ہو ملکہ کے اس عمل سے زنگی کی راہ میں مشکلات کھڑی ہوگئیں ملکہ نے اسماعیل کے قتل کے بعد اپنے دوسرے لڑکے محمود کو تخت نشین کیا۔ اس وقت زنگی کا لشکر دمشق پہنچنے کے لئے دریائے فرات کو عبور کررہا تھا۔ اس تازہ حادثے سے ناواقف زنگی نے اپنے ایلچی دمشق روانہ کیے تاکہ تسلیم شہر کے متعلق قطعی گفتگو ہوجائے۔ اور طریقۂ کار کا تعین ہوجائے۔ شہر میں ان کا اچھا استقبال ہوا لیکن شہر کی تازہ صورت حال سے انہیں ناواقف ہی رکھا گیا۔ ان حالات کی جب زنگی کو خبر ملی تو وہ سخت غضبناک ہوا اپنے واپس جانے سے انکار کردیا۔ شہر کا محاصرہ کرلیا اور اپنے جاسوسوں کو شہر کے کمزور مقامات کا پتہ چلانے کا حکم دیا۔ لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ شہر کے لوگ اسکے خلاف مرنے مارنے کے لئے تیار ہیں۔ اور ان کی قیادت اس شخص معین الدین انتار کر رہا تھا۔ جو تغتگین کا ساتھی ایک دلیر اور بہادر ترک امیر تھا۔ چند ہی جھڑپوں کے بعد اتابک نے صلح صفائی کی کوشش شروع کی۔ اور یہہ طے پایا کہ زنگی کو بدنامی سے بچانے کیلئے سردار شہر زنگی کو نذر پیش کرے اور اسکی بالادستی تسلیم کرلے۔ چنانچہ حسبِ عمل ہوا۔ وغیرہ

سلسلہ صفحہ ۲۰

پاس رک جاتا ہے خود کو نے والوں میں ضروری قابلیت، صلاحیت، دیانت داری اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ اس کے لیئے سب وظیفہ یاب حضرات چاہیئے ان میں بہت سے قابل ترین لوگ پائے جاتے ہیں۔ انہیں وقت بھی ہے۔ فرصت بھی ہے اور فراغت بھی ہے۔ اگر وہ بچوں کی تعلیم کے کام کو اپنے ہی مقام پر اپنے ہاتھ میں لیں تو یہ ملت پر بڑا احسان ہوگا۔ دیکھنے میں یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن یقین مانیے بنیادی طور پر اس سے زیادہ عظیم الشان کام اس وقت کچھ اور نہیں ہے

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تو

[illegible] ممکن ہے"

بشیر و نذیر

ہفتہ وار "بشیر و نذیر" کے دو شمارے ۱۸/ و ۲۵/ جولائی ۱۹۸۸ء ہو پیش نظر
ں یہ دو زبانی رسالہ ہے پہلے شمارہ میں ٹائٹل کور کے علاوہ ۱۷ صفحے اردو اور ۱۵ صفحے
نگریزی میں اور دوسرے شمارے میں ۱۰ صفحے اردو اور ۶ صفحے انگریزی میں۔ دونوں شمارے
ہایت دیدہ زیب ٹائٹل اور تصاویر کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ پہلے شمارے کا ٹائٹل بڑا
کشش ہے، دوسرے شمارے میں تصاویر ٹائٹل کی کشش میں کمی کا باعث ہیں کہ پہلے شمارے
ی نہج ہی کو جاری رکھا جائے تو ذوقِ لطیف کی تکمیل ہو۔

یہ ہفتہ وار حیدرآباد کے پرجوش اور فعال نوجوان جناب سید علی عباس مولوی
کی ادارت میں جاری ہوا ہے۔ یہ حقیقت رسالہ کی ترقی و استحکام کی ضامن ہے۔

ہفتہ وار کا نام، بقول مدیر موصوف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات کے
ئینہ دار قرآنی آیت پر مبنی ہے پہلے اداریئے سے ظاہر ہے کہ قلم کے ذریعہ سچائی، مساوات اور
نصاف کا پیغام عام کرنے کی تمنا عرصہ دراز سے تھی جو "بشیر و نذیر" کی صورت میں پیش ہے
ور اس میں ایسے مضامین پیش کئے جائنگے جو سچائی، مساوات اور انصاف کے نقیب ہوں۔

پہلے شمارے میں "حج اور قرآن" شہید آیت اللہ بہشتی کے عالمانہ مضمون کا ترجمہ تحریک
ہے، نیز آیت اللہ شہید باقر الصدر کے مضمون "قرآن کا فلسفہ تاریخ" کا ترجمہ بھی۔ "معرفت خدا"
یت اللہ العظمیٰ منتظری کے ایک درس کا ترجمہ ہے، یہ درس اس سلسلہ کا جز ہے جو انہوں نے
ج البلاغہ کے شہ پاروں کی تشریح کرتے ہوئے نوجوان نسل کے استفادہ کے لئے شروع کیا ہے۔
ریزی حصہ میں امام رضا علیہ السلام کے حالات درج ہیں۔

دوسرے شمارہ میں نہج البلاغہ کے سلسلہ کے ساتھ جناب مفتی سید طیب جزائری
الہ "آنحضرت صلعم کا مکتوب قیصر روم کے نام" ہے اور انگریزی حصے میں "قرآن کا انوکھا پن"
ید مرتضیٰ مطہری کے مقالہ کی ایک قسط ہے۔

"بشیر و نذیر" کے مندرجات کے ایک سرسری اشارہ سے ہی ظاہر ہے کہ یہ
مضامین کیسے فکر انگیز اور خیال آگیں ہیں ہمیں یقین ہے کہ حیدرآباد کے آسمانِ صحافت پر یہ نیا
ستارہ روشنی کا مینارہ ثابت ہوگا ــ

ملنے کا پتہ :ــ

ہفتہ وار بشیر و نذیر

13/6/822-1

لنگر حوض حیدرآباد :. 500008 (اے۔پی)

قیمت فی شمارہ ایک روپیہ ــــ سالانہ ۴۵ روپئے

سلسلہ صفحہ ۴۲

استعمال کرتے ہیں
کاشکار نہیں ہوتے۔ دودھ کی بنی ہوئی اشیاء اور سبزیاں
تمام سواریوں پر گھوڑ سواری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کھلی ہوامیں رہتے
ہیں۔ طبی ماہرین کا خیال ہے کہ دماغی کام۔ بلندی پر رہائش اور متوازن
غذا طویل عمر کی ضمانت دیتے ہیں۔ جو لوگ ایک ہزار سے ۱۵ سو میٹر کی
بلندی پر رہتے ہیں۔ وہ فضائی آلودگی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور جو لوگ
متوازن غذا میں ۳۵ گرام پروٹین۔ ۲ سو تا $2\frac{1}{2}$ سو گرام نشاستہ
اور ۴۰ گرام چربی استعمال کرتے ہیں۔ مختلف بیماریوں کا شکار نہیں
ہوتے۔ اور ان کو ۱۲ سو حرارے کی توانائی میسر آتی ہے جو تندرستی کا
رکھنے کے لیے ضروری ہے ــ
بہر حال ہر وقت اپنی صحت کو برقرار رکھیں تاکہ ہماری محدود
زندگی ملے نہ کہ زندگی کو بڑھاپے کی سختی ــ

راد کے مشورے سے پڑھی گئی تھی سرینگر کے دورے سے واپسی پر مولینا نے نہرو کو بتایا تھا کہ شیخ کی تقریریں اور سرگرمیاں ہندوستان کے مفاد میں نہیں ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ مولینا نے ۳۰ صفحات میں الحاق کے خلاف کوئی بات کہی ہوگی۔ یہ اس لئے بھی کہ مولینا نے شیخ پر الزام لگایا تھا کہ وہ نئی دہلی اور سرینگر کے تعلقات خراب کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنی کتاب "آتش چنار" میں ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو چیلنج کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بیگم عبداللہ اور فاروق عبداللہ کی ایما پر اس کتاب کے ۱۹ صفحات روک لئے گئے ہیں۔ ان صفحات میں شیخ نے خود اپنے فیصلے کو چیلنج کیا تھا۔ اس خیال کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا ہے کہاں تک صحیح اور کتنا غلط ہے۔

سلسلہ صفحہ ۳۴

ترغیب کے سلسلے میں ذرائع ابلاغ عامہ کا کردار

ذرائع ابلاغ عامہ، قومی خواندگی مشن میں عوامی اشتراک پیدا کرنے کے لیے بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ دیہی تعلیمی کمیٹیاں اور "رضاکار" یا ثقافتی کارواں، اساتذہ اور فنکار دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ کر کے عوام کو ان کے حقوق اور خواندگی کی اہمیت سے واقف کرا سکتے ہیں۔ سماج کے محروم طبقات کے مفاد کے لیے خصوصی فلمیں بھی تیار کی جائینگی۔

مالی اخراجات: قومی خواندگی مشن کے اخراجات کا تخمینہ ۱۹۹۵ تک ۵۰۰ کروڑ روپے ہوجانے کی توقع ہے مذکورہ تخمینے کی رقم میں سے ۲۸۰ کروڑ روپے کے اخراجات، مرکز اور ۲۱۰ کروڑ روپے ریاستیں برداشت کریں گی مرکز میں انسانی وسائل کی ترقیات کے مرکزی وزیر کی قیادت میں تعلیم بالغاں کا ایک قومی ادارہ قائم کیا جائے گا اور ریاستی سطحوں پر بھی ایسے ہی ادارے قائم کئے جائینگے۔

غزل

فارسی — حافظ شیرازی

اردو ترجمہ — قاضی سید حسین

دل می رود ز دستم صاحبدلان خدا را

اے دل والو خدا کے لئے میرے ہاتھ سے دل نکلا جاتا ہے

دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست و افسوں

زمانہ کی دس روزہ محبت افسانہ اور طلسم ہے

کشتی شکستگانیم اے بادِ شرطہ برخیز

ہم کشتی ٹوٹے ہیں، اے موافق ہوا! چل پڑ

در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل

گذشتہ رات پھول، اور شراب کی محفل میں بلبل کیا خوب گا رہا

اے صاحبِ کرامت شکرانۂ سلامت

اے کرامت والے، سلامتی کے شکرانہ میں

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست

دونوں جہاں کی راحت ان دو حرفوں کی تفسیر ہے

در کوئے نیکنامی ما را گذر ندادند

نیکنامی کے کوچے میں انھوں نے ہمیں گذرنے کا موقع نہ دیا

آئینہ سکندر جام جم ست بنگر

سکندر کا آئینہ جمشید کا جام ہے! دیکھ!

سرکش مشو کہ چوں شمع از غیرتت بسوزد

سرکش نہ بن، تجھے غیرت کی وجہ سے موم بتی کی طرح جلا دیگا

گر مطربِ حریفاں ایں پارسی بخواند

اگر دوستوں کا گویا یہ فارسی غزل گائے گا

آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند

وہ کڑوی صوفیوں نے جس کو ام الخبائث کہا

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی

تنگدستی کے وقت مستی اور عیش میں لگ جا

خوبانِ پارسی گو بخشندگانِ عمر اند

کہدو کہ پارس کے معشوق عمر بخشنے والے ہیں

دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

افسوس! پوشیدہ راز کھل جائے گا

نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

اے دوست! دوستوں کے ساتھ نیکی کو غنیمت سمجھ

باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنا را

شاید اس آشنا یار کو ہم پھر دیکھ سکیں

ھَاتِ الصَّبُوحَ ھُبُّوا یَا اَیُّھَا السُّکَارٰی

صبوحی لا! اے مستو! آ ...

روزے تفقدے کن درویشِ بینوا را

کسی دن بے سامان فقیر پر مہربانی کر

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

دوستوں کے ساتھ مہربانی اور دشمنوں کے ساتھ ...

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

اگر تو پسند نہیں کرتا ہے، تقدیر کو بدل دے

تا بر تو عرضہ دارد احوالِ ملکِ دارا

تاکہ تجھ پر دارا کے ملک کے احوال پیش کرے

دلبر کہ در کفِ او موم ست سنگِ خارا

وہ معشوق جس کی ہتھیلی میں سنگِ خارا موم ہے

در رقص حالت آرد پیران پارسا را

نیک بزرگوں کو رقص میں لے آئے گا

اَشْھیٰ لَنَا وَ اَحْلٰی مِنْ قُبْلَۃِ الْعَذَارٰی

وہ ہمارے لئے باکرہ لڑکیوں کے بوسے سے زیادہ مرغوب ...

کایں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

اس لئے کہ ہستی کی یہ کیمیا فقیر کو قارون بنا دیتی ہے

ساقی بدہ بشارت پیرانِ پارسا را

اے ساقی یہ نیک بوڑھوں کو خوشخبری دے

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود — اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را

یہ شراب میں تر گدڑی حافظ نے خود نہیں پہنی — اے پاک دامن شیخ! ہمیں معذور سمجھ

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا

منظوم ترجمہ غزل حافظ

محمد احتشام الدین حقی دہلوی

ہاتھوں سے دل چلا اے صاحبدلاں خدارا — ہے ہے کہ رازِ پنہاں ہوتا ہے آشکارا
دو روزہ مہر گردوں افسانہ ہے و افسوں — یاروں سے کر لے یاری جب تک ہے آئی یارا
تختے پہ بہہ رہے ہیں چل جا ہوا موافق — بچھڑے اس آشنا سے پھر جا ملیں دوبارا
شب جلسۂ گل و مُل میں کیا ہی چہکی بلبل — ہات الصَّبوحُ هُبّوا یا ایها السکارا
اے صاحبِ کرامت دے صدقۂ سلامت — بیچارہ بے نوا کا ایک روز تو ہو چارا
تا کوئے نیکنامی جانے ہی ہم نہ پائے — حکمِ قضا بدل دے ہو جس کو ناگوارا
دونوں جہاں کی راحت اس ایک بات میں ہے — یاروں کے ساتھ یاری، دشمن سے بھی مدارا
آئینہ سکندر ہے جامِ جم کے اندر — دیکھو اس میں تاکہ بن کر انجامِ ملکِ دارا
سرمت اٹھا میادا جوں شمع سوز پائے — دلبر وہ موم جس کی مٹھی میں سنگِ خارا
مطرب ہو دوستوں کا، یہ شعر پارسی ہو — پیرانِ پارسا کا پھر دیکھئے نظارا
خوبانِ پارسی گو دیدیں گے عمر رفتہ — پیرانِ پارسا کو ساقی کا ہے اشارا
وہ تلخ شے کہ صوفی کہتا ہے پاپ کا جڑ — اشہیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا
ہنگامِ تنگدستی دے دادِ عیش و مستی — پارس بنائی ہستی قاروں کا مال دارا

حافظ نے کب تھا پہنا یہ خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن چھوڑ اس کو تو خدارا

ڈاکٹر ندیم الرحمٰن خاں ندیم

غزل

سونے پڑے ہیں مصر کے بازار کیا کریں   یوسف ہی جب نہیں تو خریدار کیا کریں
پیچ و خم حیات میں الجھے ہوئے ہیں ہم   زلفِ بتاں میں خود کو گرفتار کیا کریں
چہرے پہ چھا گیا ہے پشیمانیوں کا رنگ   اب وہ زباں سے جرم کا اقرار کیا کریں
یہ اپنا درد لے کے تو آئے ہیں اُن کے پاس   قاتل بنیں طبیب تو بیمار کیا کریں
مال اپنا جان کر وہ اُڑا لے گئے ہیں دل   ہم سوچتے ہی رہ گئے تکرار کیا کریں
اُن ہی سے جب ہے رونق و زینت حیات کی   شکوہ طرازی غم و آزار کیا کریں
ہم آپ ہی کے ہیں تو پھر اپنی وفاؤں کا   تازہ ثبوت پیش ہر اِک بار کیا کریں
جن سے ندیم فرطِ محبت کی تھی اُمید   ہاتھوں میں اُن کے آج ہے تلوار کیا کریں

استاد کی ٹاؤن، صدر، ناگپور

الفت شرفی

غزل

حوصلہ میرے دل کا اور پختہ ہوتا ہے   جب بھی کوئی اشکوں سے اپنے منہ کو دھوتا ہے
رونے والا ہر صورت صبح شام روتا ہے   اُس کو جو بھی ہے منظور وہ ضرور ہوتا ہے
ایک دن وہ گرتا ہے ہر کسی کی نظروں سے   بیج نفرتوں کے جو سب کے دل میں بوتا ہے
عمر جس نے کاٹی ہے بارِ غم میں سہہ سہہ کر   مسکرا کے خاروں پر آدمی وہ سوتا ہے
اس لیئے تو الفت کا ہے مقام شعرا میں   ہر خیال خوبی سے شعر میں سموتا ہے

مکان نمبر ۵-۶-۵۶۵ نامپلی۔ حیدرآباد

غزلیں

ثریا صولت حسین

آزردگی میں اب کے بہاریں گذر گئیں
زنجیرِ در ہلا کے ہوائیں گذر گئیں

بلبل کو بے ثباتیٔ گلشن سے تھا گلہ
تنکے جمع کئے تو بہاریں گذر گئیں

دل بجھ گیا تو چاند کی رونق ہوئی تمام
یاں ظلمتوں میں چاند سی راتیں گذر گئیں

آہٹ پہ کوئی دھڑکے کوئی منتظر رہا
وہ کارواں گیا وہ صدائیں گذر گئیں

لٹے سحر ثریا تو ہو شام کی طلب
بے رنگ و نور ساری فضائیں گذر گئیں

ثریا صولت حسین
۳۳ نزد ہائی کورٹ
سول لائنس ۔ ناگپور ۴۴۰۰۰۱

(مقبول احمد مقبول)

شام غم مختصر ہو گئی
آپکی جب نظر ہو گئی

آپکے غم میں ڈوبے رہے
زندگی یوں بسر ہو گئی

کیسے آیا ہمارا خیال
کیوں عنایت ادھر ہو گئی

دل کے لٹنے کا کیا ہو ملال
عاشقی ہم سفر ہو گئی

ہاتھ اٹھنے کو اٹھتے رہے
ہر دعا بے اثر ہو گئی

کس سے مقبول شکوہ کریں
دل کی حالت دگر ہو گئی

۵۵۵۵۵

سیتارام پیٹھ ۱۴-۱-۱۸۴
حیدرآباد

(شاداں احسانی)

پوچھتے نہیں وہ حال کیسا ہے
کیا کہیں یہ سوال کیسا ہے

میری صورت سے صاف ظاہر ہے
کیا بتاؤں کہ حال کیسا ہے

حسن کو دیکھ کر تعجب ہے
نشۂ ماہ و سال کیسا ہے

جب کوئی حادثہ نہیں گذرا
پھر یہ دل پر ملال کیسا ہے

سارے کانٹوں کو گلستاں کر لیں
باغباں یہ خیال کیسا ہے

کوئی واعظ ملے تو ہم پوچھیں
قوم پر یہ زوال کیسا ہے

اُن کی تصویر کھینچ دی میں نے
شعر میں یہ کمال کیسا ہے

اُن کے قدموں پہ جان دی شاداں
دیکھئے انتقال کیسا ہے

شاداں احسانی
رامیشور روڈ ۔ پردیسی پورہ کھنڈوہ ام ۔ پی ۔ ۴۵۰...

غزل پروفیسر انیس سلطانہ

یادوں نے نازِ شام کا مارا ہوا تھا سب جہاں
ہنسنے لگے چراغ سب چہرہ مگر دھواں دھواں

میرے جنوں کے ہاتھ سے بجھنے لگے تھے سب دیئے
شامِ الم کی اک طرف ضبط کا میرے امتحاں

صحبتِ شب بکھر گئی، شامِ الم کا ذکر کیا
لالہ و گل دیا سا تھا اور تو سب جہاں تہاں

دستِ طلب کو عمر بھر رنجشِ پیرہن رہی
ایک فسردہ دل کتاں، راہ کے غم میں نیم جاں

موجِ ہوا نہ چھیڑ دے، سوئے ہوئے ہیں شام
سنتے نہ پائے بھی ابھی شامِ الم کی داستاں

مستِ جنوں رہی خزاں، شاخ و شجر نہ برگ و گل
بادِ سموم چھو گئی، چہرہ بہار کا دھواں

شہر بنا ہے آئینہ دیکھ لیا بہار نے
پھر جو بہار طرار کی کھول رہا ہے کوئی یار

رمز شناس تتلیاں گھوم رہی ہیں چار سو
نرگس کی کاکلیں کہاں، الجھی ہوئی ہیں مستیاں

اہلِ ہوس کی بات ہے عشق ستم نہ عشق غم
پل میں اٹھے چلے گئے بیٹھ چکے تھے درمیاں

مستِ مئے ازل رہا پھول کے ساتھ خار بھی
چاک رفو سئے کہاں، گل کو لگی ہیں دھجیاں

آخرِ شب کے ہم سفر ڈھونڈ رہے تھے منزلیں
تارے ٹھٹک کے رک گئے بڑھ گیا آگے کارواں

شامِ الم کہ صبحِ غم ایک ہے منزلِ ستم
آؤ انیس دیکھ لو چھا کے رہی ہیں بدلیاں

ہیڈ شعبہ ایم ایل بی کالج ۔ مکان ۶۳ عقب موتی مسجد بھوپال ۔ ایم پی

ماہنامہ

جلد ۵ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۸ء

شاداب

قیمت فی پرچہ 5 روپیے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر نعیم جاوید
مینجنگ ایڈیٹر کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپیے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپیے
دو سالہ	90 روپے	270 "	65 "	36 "	225 " " "
تاحیات	1000 روپیے	2500 "	450 "	300 "	2000 " " "

ترسیل زر کا پتہ ماہنامہ شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن آرٹ پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

اردو ذریعہ تعلیم: اردو والوں کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ اردو کے بچوں کو ابتدائی سے لے کر اعلیٰ ثانوی تک تعلیم ان کی مادری زبان اردو میں دی جائے۔ نیز یہ بھی مطالبہ رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کم از کم ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مادری زبان میں تعلیم سے کسی کو انکار نہیں۔ اور سابق ریاست حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کے کامیاب تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو میں سائنس و ٹکنالوجی کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اور اردو میں تعلیم حاصل کر کے تمام شعبوں میں ایسے اہل علم پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی علمی خدمات کا سکہ بٹھا کر علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

مگر اردو کا المیہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہ زبان سیاست کی لپیٹ میں آگئی۔ آزادی سے پہلے ہی یہ زبان پورے ملک کی زبان بن گئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا کہ ملک میں جو زبان رائج ہے اسے فارسی رسم الخط میں لکھا جائے تو اردو کہلاتی ہے اور ناگری رسم الخط میں لکھا جائے تو ہندی۔ اسے قومی زبان بنا کر دونوں رسم الخط میں لکھا جائے اور اسے ہندوستانی کا نام دیا جائے۔ مگر اس مشورہ پر عمل نہ ہو سکا۔ اور جب دستور ساز اسمبلی میں قومی زبان کے تعین کا مسئلہ پیش ہوا تو اردو اور ہندی کو مساوی رائیں ملیں اور صدر نشین کے ترجیحی ووٹ سے ہندی کو قومی زبان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد سے اردو کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کی جاتی رہیں، چونکہ اردو ایک عوامی زبان ہے اس لئے وہ زندہ رہی اور آج وہی زبان نہ صرف پورے ملک کے لئے رابطہ کی زبان ہے بلکہ ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

آزادی کے وقت اردو سابق ریاست حیدرآباد کی دفتری زبان تھی جب کہ

ہمارے ملک کی کسی اور زبان کو یہ درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن یہ یک جنبش قلم اُردو کو ختم کرکے انگریزی
کو دفتری زبان بنا دیا گیا جب کہ ہمارا دستور یہ کہتا ہے کہ انگریزی کو ختم کرکے ملکی زبان کو دفتری
زبان بنایا جانا چاہیئے۔

جامعہ عثمانیہ میں طلبہ سائنس و ٹکنالوجی کی اعلیٰ ترین تعلیم اُردو میں نہایت کامیابی
سے دی جا رہی تھی۔ اسے بھی بلا کسی وجہ کو ظاہر کئے چپ چاپ ختم کر دیا گیا۔ اور ذریعہ تعلیم کسی ملک
زبان کو نہیں بلکہ انگریزی کو بنا دیا گیا۔

ان اقدامات سے زیادہ بڑا صدمہ جو اردو کو پہنچایا گیا وہ اُردو ذریعہ تعلیم کے ابتدا
اور ثانوی مدارس کو ختم کرنا ہے۔ اُردو مدرسوں سے اُردو داں مدرسین کو تبادلہ کرکے غیر ا
مدارس پر بھیج دیا گیا اور غیر اردو داں کو اردو مدرسوں پر متعین کیا گیا۔ سائنس و ریاضی جیسے
اہم مضامین کے مدرسین کی جگہیں خالی رکھی گئیں۔ اُردو میڈیم کتب کو فراہم نہیں کیا گیا، ان مدرس
کے تعلیمی وسائل بہت زیادہ متاثر کر دیئے گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان مدرسوں کی تعلیم متاثر ہوئی۔ معیارِ تعلیم گر گیا، نتائج متاثر ہو
اور نتیجہ یہ ہوا کہ اردو والے دوسرے میڈیم کے مدارس میں اپنے بچوں کو شریک کروانے لگے۔

اُردو دشمنوں نے یہ پروپگنڈہ کرنا بھی شروع کر دیا کہ اُردو پڑھانے سے روز
نہیں ملے گا اس لئے روزی روٹی کے لئے انگریزی یا کسی مقامی زبان کے مدرسوں میں تعلیم د
چاہیئے۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ اردو والے شہروں میں اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں
میں بھجواتے ہیں اور دیہی علاقوں میں مقامی زبانوں کے مدرسوں میں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ا
زبان کا تعلق روزی روٹی سے نہ پہلے کبھی تھا اور نہ اب ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ا
ایک بھی مدرسہ نہیں ہے جہاں صرف اُردو ہی پڑھائی جاتی ہو، اُردو میڈیم اسکولوں میں
اور قومی اور مقامی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اُسی طرح جس طرح مقامی زبان کے مدرسوں میں
پڑھائی جاتی ہے۔ اور اردو یا مقامی زبان والے اعلیٰ تعلیم انگریزی میں حاصل کرتے ہ
اُردو والے اس تعلیم میں اپنے اُردو میڈیم کی وجہ سے کسی طرح پیچھے نہیں ہوتے۔

ضرورت ہے کہ اس غلط خیال کو دور کیا جائے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظا
میں کیا جائے اور ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں انگریزی، قومی اور مقامی زبانوں کی
دی جائے تا کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی میں حاصل کی جا سکے۔

قرآن اور سائنسی علوم

قرآن حکیم اگرچہ سائنس کی تعلیم دینے یا بنی نوع انسان کو محض سائنسی معلومات کی فراہمی کے لئے نازل نہیں ہوا تاہم اس میں جابجا سائنسی حقائق کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن میں کائنات کا ذکر بھی جگہ جگہ ملتا ہے اور بہت سی آیات کائنات اور اس کے خالق اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو معلومات فراہم کرتی ہیں وہ طلوع اسلام کے وقت عام لوگوں کے لئے نہایت عجیب سی تھیں کیونکہ ان کی لاعلمی اور جہالت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ زمین ہی کائنات میں ہر شئے کا مرکز ہے۔ آج کل سائنس دان زمین کے علاوہ کائنات کے کسی دوسرے سیارے پر بھی ممکنہ زندگی کے آثار کھوجنے کی جستجو میں ہیں کیونکہ اس کائنات کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کائنات میں اربوں، کھربوں ستارے ہیں، ان میں سے بعض تو ہمارے ایک ستارے یعنی سورج کے مقابلے میں کئی گنا بڑے ہیں۔ سائنس داں زمین کے علاوہ کسی دوسرے سیارے پر زندگی کی موجودگی کے امکانات کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جس طرح سورج کا سیاروں کا نظام ہے اور اس کے ایک سیارے یعنی زمین پر زندگی پائی جاتی ہے۔ تو اربوں ستاروں میں بھی کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے سیاروں کا اپنا نظام ہوگا اور ان میں سے ایسے سیارے بھی ہو سکتے ہیں جن پر زندگی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے ہی سیاروں کے ماحول ہماری زمین کے ماحول سے کئی درجہ بہتر ہونے کے باعث وہاں کے افراد ہم سے زیادہ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوں۔

قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر اور عوامل یعنی بارش کا ہونا، انسان کی پیدائش، پودوں کی جنسیات، زراعت، پھلوں، پانی، پہاڑوں، سمندروں، ہوا اور حتیٰ کہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں ذکر بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ تقریباً ساڑھے سات سو آیات ہیں جو کسی نہ

کسی طرح سے سائنسی مظاہر اور عوامل کے بارے میں ہیں اور اس طرح قرآن حکیم کا تقریباً آٹھواں حصہ سائنسی معلومات سے متعلق ہے ہم اپنی کم علمی کے باعث سائنسی مظاہر اور عوامل کے متعلق قرآن پاک کی بہت سی آیات کے حوالوں کو ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمانوں پر تشریف فرمائی، اللہ تعالیٰ سے ملنا اور پھر واپس زمین پر لوٹ آنا ہمیں بظاہر تو ایک انوکھا سا واقعہ لگتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے مشہور سائنس داں البرٹ آئن سٹائن نے اپنا خصوصی "نظریہ اضافیت" پیش کر کے ایک انوکھا پیش کیا تھا۔ نظریہ اضافیت کے مطابق کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ نہیں اور اگر کسی چیز کی رفتار روشنی کی رفتار ہو جائے تو اس کے لیے وقت بھی تھم جاتا ہے۔ طبیعیات کے نظریہ اور اسی طرح کے بہت سے دیگر بنیادی تصورات کا انحصار روشنی کی رفتار کی استواری تبدیل نہ ہونے پر ہے جو کہ سائنسی اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اسلام میں روشنی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ظاہر کرتا ہے۔

ہماری سائنسی معلومات نہایت محدود ہیں ہم اس کی سطح سے بھی پورے طور پر نہیں ہوئے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے سائنسی علم کی مقدار ایک ذرہ خاک سے زیادہ نہیں تو ہوگا قرآن آج سے ۱۴۰۰ سے زائد سال قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور یہ اس وقت پوری مقبولیت کے ساتھ برحق ہے اور اس کی حقانیت تمام زمانوں میں متمکن رہے گی۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا وہ تحفہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانوں کی ہدایت اور رہبری کے لئے عطا کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کا جس قدر مطالعہ کیا جائے اس شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ایسی لازوال کتاب ہے جو پوری نوع انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر خواہ وہ معاشرتی ہوں یا سائنسی ہوں، نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ ان میں بہتری کی سمت ہماری رہنمائی کرتے ہوئے رہنما اصول بھی متعین کرتی ہے۔ قرآن حکیم ہمیں سوچ اور فکر کی ہدایت کرتا ہے جو بنیادی طور پر علوم کی اساس ہے۔

اب میں کچھ ایسی آیات کا ذکر کروں گا جن کا علم فلکیات سے براہ راست تعلق ہے۔ قرآن نے سورۂ لقمان میں کشش ثقل اور اجسام کی باہمی کشش کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"اس نے آسمان پیدا کیے جو بغیر ستون کے کھڑے ہیں۔ اور تمہیں تم دیکھتے ہو اور زمین پر پہاڑ جو مضبوطی سے کھڑے ہیں"۔

قرآن نے سورہ نوح میں فرمایا ہے " سورج ایک چراغ کی طرح ہے جو روشنی دیتا ہے۔ اور چاند صرف روشنی ہے "

اس آیت میں ہمیں یہ پتہ چلا کہ چاند خود روشن نہیں بلکہ وہ صرف سورج کی روشنی منعکس کرتا ہے یہ سائنسی تحقیق ہے۔ آج بھی بہت سے لوگ اگرچہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند خود روشن ہے۔

سورہ رحمٰن میں بالائی فضا اور خلاء میں تحقیق سے متعلق اشارہ ملتا ہے " اے گروہ جن و انسان، کہ تم کو اگر یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکل کے دیکھو۔ تم ایسا نہیں کرسکتے، سوائے اس قدرت کے ذریعہ جو قدرت کے علم سے تمہیں حاصل ہو جائے "

سورہ الغاشیہ میں آیت نمبر ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بادل کس طرح بنتے ہیں اور کس طرح فلک (آسمان) کو اوپر اٹھایا ہوا ہے اور کس طرح پہاڑوں کو اپنی جگہ جمایا گیا ہے یعنی قائم کیا گیا ہے۔

سورج، چاند اور ستارے کس طرح خلا میں قائم ہیں۔ وہ کس طرح ایک معین اصول کے تحت گردش کرتے ہیں۔ کس طرح رات اور دن بنتے ہیں، یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا مکمل طور پر جواب دینے میں آج کل کی جدید سائنس بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی بہت سی باتیں معلوم ہونے کے باوجود کچھ سوالوں کے جواب ابھی تشنہ ہیں یہ بیسویں صدی عیسوی کی باتیں ہیں جب کہ ان کا ذکر قرآن نے چودہ سو برس پہلے کر دیا تھا۔

سورہ یونس کی پانچویں آیت میں کہا گیا ہے " یہ وہ [illegible] اللہ ہے جس نے سورج کو اس کا محیط دیا، چاند کو روشنی دی، اور اس کے راستے متعین کئے تاکہ سال اور حسابوں کا شمار کیا جا سکے "

اس سورہ میں اگلی آیت میں رات اور دن کے بدلنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے " فلکیات کا ایک اہم حصہ ہے اسی آیت میں پھر زمین اور آسمان کے پیدا کرنے کی بات کی گئی ہے " دن اور رات کے تغیر " میں اور جو کچھ اس نے آسمان اور زمین میں پیدا کیا ہے "

سورہ نور میں بھی قرآن حکیم اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

" وہ اللہ ہے جو دن کو رات میں اور رات کو دن میں بدلتا ہے (ایک کے بعد ایک) یقیناً اس میں نشانیاں (سبق) ہیں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

یہی بات پھر سورہ آل عمران میں الفاظ کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

"آسمان اور زمین کے بننے میں، دن اور رات کے تبدیل ہونے میں نشانیاں ہیں ان کیلئے جو سمجھ رکھتے ہیں ---

سورہ الانعام میں آیت نمبر ۹۷ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "یہ وہ (اللہ) ہے کہ جس نے ستارے بنائے کہ جن کی مدد سے تم اندھیرے اور صحراؤں میں اور سمندروں میں اپنا راستہ معلوم کرتے ہو"

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آج کل کے جدید دور میں بھی ستاروں کو راستوں کی سمتیں معلوم کرنے کے لیے اکثر استعمال کیا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ خلائی جہاز وغیرہ کے راستوں کا حساب بھی مختلف ستاروں کی مدد سے رکھا جاتا ہے۔

ہمارا مشاہدہ ہے اور سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج، چاند، ستارے اور سیارے وغیرہ یونہی نہیں گھوم پھر رہے بلکہ ان کی گردش سائنسی ضابطوں اور اصولوں کے تحت ہے۔

یہی بات سورہ الاعراف کی آیت نمبر ۵۴ میں بیان کی گئی ہے "اور سورج اور چاند ستارے اس (اللہ) کے تابع ہیں" گویا اپنی مرضی سے نہیں گھوم رہے بلکہ کسی نہ کسی ضابطہ کے تحت گردش میں ہیں۔

سورہ یٰسین میں ہے۔ "ان کے لئے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گذرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے --- نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں" تقریباً یہی بات سورہ الانبیاء میں کہی گئی ہے ---

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں"۔ یہاں یہ جملہ، کہ "سب ایک ایک فلک میں تیر رہے" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہمارے عام مشاہدہ میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند اور سورج کا راستہ ایک ہے کہ وہ ایک ہی سمت سے نمودار ہوتے ہیں اور ایک ہی سمت میں غائب ہوتے ہیں۔ لیکن سائنس کی جدید ترین معلومات ہمیں بتاتی ہیں کہ ہر ستارے اور سیارے بلکہ نظام کائنات کے راستے عام معمول میں الگ الگ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ

مداروں میں ہیں۔

قرآن حکیم میں سورج، چاند اور ستاروں کا ہی نہیں بلکہ دُم دار ستاروں کا بھی ذکر ہے۔ سورۃ التکویر جس کے لفظی معنی پھینک دینا ہے، میں کہا گیا ہے۔ "قسم ہے ان فلکی اجرام کی جو ظاہر ہوتے ہیں اور پھر بلا کسی رکاوٹ کے تیرتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں"۔ اس آیت میں دو الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں "خناس" جس کا مطلب ہے خاموشی سے لوٹ جانا اور "جوار" کا مطلب ہے بہت تیزی سے اور بلا کسی رکاوٹ کے حرکت کرنا۔ اجرام فلکی میں ایسے اجسام جو ظاہر ہوتے ہیں اور پھر خاموشی سے غائب ہو جاتے ہیں اور عرصے تک غائب رہتے ہیں" وہ دمدار ستارے ہی ہیں کہ جن میں سے ایک "ہیلی" کے دمدار ستارے" کا مطالعہ ہم نے گذشتہ دنوں کیا ہے اور جو ۷۶ برسوں میں ایک دفعہ نمودار ہوتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی رو سے کائنات کیسے وجود میں آئی اور کیسے تباہ ہوگی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کائنات ایک مسلسل پھیلتی ہوئی ترقی پذیر صفت کی حامل ہے۔ اور کائنات کی ابتدائی شکل عالم نور کی سی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد کائنات کے ایک حصہ نے عالم آتش یعنی آگ کی دنیا کی شکل اختیار کر لی جس میں توانائی مرتکز تھی۔ اس توانائی سے اس میں دھماکہ ہوا اور اس کے مختلف ٹکڑے ہوئے جو بکھر گئے۔ یہ واقعہ اب سے تقریباً چھ سے دس ارب سال پہلے ہوا دھماکے کے نتیجے میں جو ٹکڑے پیدا ہوئے ان میں بڑے ٹکڑے ٹھنڈے ہونے کے بعد سکڑے اور ٹھوس حالت کے ہو گئے۔ کچھ ٹکڑے الگ ہو گئے اور خلاء میں تیرنے لگے اور اس طرح فلکی نظام وجود میں آئے اور مختلف کہکشائیں بنیں۔

آج کل کی جدید ترین تحقیقات کے نتائج کائنات کی پیدائش کے بارے میں یہی کچھ بتاتے ہیں۔ کائنات کی پیدائش کے بارے میں سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۳۰ میں بیان کیا گیا ہے۔ "کیا ان لوگوں کو جو یقین نہیں رکھتے، معلوم نہیں کہ آسمان و زمین ایک تھے، اور ہم نے انھیں الگ الگ کیا"

یہ آیت بھی کائنات کی پیدائش کی طرف ایک اشارہ ہے کائنات کا جو دھماکہ ہوا ہے ابھی ختم نہیں ہوا ہے ستارے اپنی جگہ سے مسلسل دور ہو رہے ہیں اور اب بھی ہماری کائنات پھیل رہی ہے۔

جوں جوں کائنات پھیلے گی اس کے اجسام کی اپنی توانائی پھیلاؤ اور حرکت کی وجہ سے کم ہوتی جائے گی اور بالآخر اتنی کم ہو جائے گی کہ یہ اجسام اپنے مرکز کی طرف پھر سکڑنا شروع کر دینگے

اور اس طرح کائنات سکڑنا شروع ہو جائے گی اور سکڑتے سکڑتے پھر ایک دھماکے سے ختم ہو جائے گی۔

قرآن مجید اس سلسلے میں سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۴۸ میں اس طرح خبردار کرتا ہے
"ڈرو اور خبردار ہو اس دن سے کہ جب یہ زمین دوسری زمین سے اور آسمان دوسرے آسمان سے بدل دیئے جائیں گے اور یہ سب اپنے اللہ کی طرف واپس آجائیں گے۔"

سورہ الحاقہ میں بھی اس طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ "اور آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا" سورہ فرقان میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ "اس دن آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

اس سے ملتی جلتی آیت سورہ دخان میں آئی ہے "اس دن سے ڈرو جب آسمان دھوئیں کی مانند ہو کر لوگوں کو لپیٹ لیں گے اور یہ سخت عذاب کا دن ہوگا۔"

سورہ طور میں اس بات کو پھر ایک دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ "اس روز ایک زوردار دھماکہ کے ساتھ پاش پاش ہو جائیں گے۔"

سورہ طور ہی کی آیت نمبر ۱۰ میں زمین پر پہاڑوں کے تباہ ہونے کا ذکر آتا ہے "پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔"

کائنات میں رونما ہونے والی ان بڑی بڑی تبدیلیوں کا جا بجا ذکر آتا ہے اور ہر ایک نے عمل اور سائنسی مظہر کو بیان کیا گیا ہے۔

سورہ التکویر میں سورج اور سیاروں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ "ڈرو اس دن سے جب سورج تہہ کر دیا جائے گا اور سیارے اپنی روشنی سے محروم ہو کر گر جائیں گے۔"
اس سورہ کی آیت نمبر گیارہ میں آسمان کے پھٹ جانے کا پھر ذکر آیا ہے۔ "اور جب آسمان پھٹ جائے گا۔"

کائنات کا قانون ٹوٹنے کی کیفیت جس میں ستارے اور کہکشائیں اپنے مدار کی افراتفری کا عالم ہوگا کچھ اس طرح سورہ النازعات میں بیان کی گئی ہے۔
"قسم ہے ان کی جو گھسیٹ کر چلتے ہیں اور تباہ ہو جاتے ہیں۔ قسم ہے شہابِ ثاقب کی جو ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے ہیں۔ قسم ہے ان (تنہا ستاروں) کی جو تیر رہے ہیں قسم ہے (فرشتوں کی) جو یہ سب جلدی جلدی کر رہے ہیں اور ان کی جو ان امور کو رکھتے ہیں۔ اور اس دن ہر شئے افراتفری کے عالم میں ہوگی۔ شدید افراتفری اور ہیجان برپا

محمد نہال احمد صدیقی

اسلام اور عورت

اسلام وہ قانون اور دستور ہے جو سارے بنی آدم کیلئے ہدایت کا سرچشمہ ہے ۔ کسی بھی قوم کے عروج و زوال اور اخلاق و تہذیب کی بلندی کا دارومدار اس قوم کی عورت پر ہوتا ہے ۔ معاشرہ کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ اور بہترین عورت ہی صالح معاشرہ کو جنم دے سکتی ہے ۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکیزہ اخلاق و کردار والی نیک صفت عورت ہی متاع زیست کی انمول ترین چیز ہے ۔

مذہب اسلام نے عورت کو معاشرے میں اس کی اہمیت و ضرورت سے واقف کروایا تاکہ وہ کامیاب اور با مقصد عزت و احترام کی زندگی بسر کر سکے ۔

طلوعِ اسلام سے پہلے عورت ایک ناقابل برداشت بوجھ سمجھی جاتی تھی لڑکی کا جنم رسوائی اور غم و الم کا پیام تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی درگور کردی جاتی تھی ، تعلیم سے آراستہ کرنا اسے فضول سمجھا جاتا تھا ۔ بہرحال کوئی ایسا ظلم و جبر و تشدد نہ تھا جو اس صنفِ نازک نے برداشت نہ کیا ہو ۔ تمام دنیا میں ذلالت و گمراہی اور سیہ کاریوں کی سخت آندھیاں چل رہی تھیں اور ہر گوشہ دنیا کا تاریک ہو رہا تھا کہ رحمت خداوندی جوش میں آئی ۔ اور ماہتاب رسالت حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم پرچم اسلام لئے ظلمت کدے میں ظہور فرمایا ۔ تو نور محمدی کی ضیاپاش کرنوں سے سارا عالم جگمگا اٹھا ۔ ساری فضاؤں سے نبوت کی انگڑائی نے عدل و مساوات کا پرچم بلند کیا ۔ مظلوم و بے بس مجبور عورت نے پرچم اسلام کے تلے سکون و راحت محسوس کرنے لگی ۔ تاریخ عالم میں عورت پہلی بار عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگی اسلام نے بہ بانگ دہل اعلان کیا کہ عورت عزت و احترام قدر و منزلت کی اولین مستحق ہے ۔ اسلام نے عورت کے تقدس و احترام کا جو

۱۱-۵-۲۱۳ لال ٹیکری حیدرآباد

اعلیٰ معیار پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا کی کوئی قوم یا مذہب آج تک پیش نہیں کر سکا۔ عورت کے متعلق یہ مشہور کہاوت ہے۔ " وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ " اگر اس کہاوت پر ذہن کی گہرائی اور عدل کی نظر سے غور کیا جائے تو یہ سو فیصد صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ عورت قدرت کی بہترین تخلیق ہے۔ ایسی تخلیق جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اس لئے عورت کو کائنات کا سرمایا کہا جاتا ہے۔

اسلام کی نظر میں عورت بیٹی کے روپ میں الفت و رحمت کی مستحق، بہن کی شکل میں بے انتہا پیار کی حقدار، بیوی کے روپ میں باہمی حسن و سلوک اور ایثار و وفا اور خلوص و پیار کی اولین حقدار اور ماں کے روپ میں تقدس و احترام کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

عورت محبت ایثار اخوت اور وفا کا پیکر ہے۔ اسلام نے عورت کو اپنے گھر کی حکمران و نگہبان قرار دیا ہے۔ اور وہ اپنے گھر والوں کیلئے مددگار قرار دی گئی۔ اسلام نے کردار و پرہیزگاری حسن عمل کو برتری کا معیار بنایا۔ اسلام نے عورت و مرد کو ایک دوسرے کی ضرورت اور طاقت قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔

" مرد عورت کی پوشاک ہیں اور مرد کی پوشاک عورتیں "

یعنی کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کی خاص ضرورت ہیں۔ عورت کے بارے میں قرآن مجید میں جگہ جگہ نصیحتیں کی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں عورت محض تمہاری تفریح کا ذریعہ نہیں ہے۔ تم کسان ہو اور وہ تمہاری کھیتی جس طرح محنت کروگے اتنا ہی پھل پاؤگے اور پیداوار بھی ویسی ہی ہوگی جتنی رہنے دیتے ہو تم مستقبل کو محفوظ اور تابناک بنانا چاہتے ہو تو اپنی کھیتی (عورت) کی دیکھ بھال اور خاطرداری بہتر سے بہترین کرو۔

" ہم نے تم کو ایک مرد آدم سے پیدا کیا ہے۔ اور ان کی پسلی سے ان کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے سارے عالم میں بے شمار عورتیں پیدا کیں اور انہیں پھیلا دیئے تم اپنے رب سے ڈرتے ہو۔ بے شک وہ بڑا رب کریم ہے۔

رحمتہ اللعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لوگو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اور تم میری وصیت کو قبول کرو عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائیگی۔ پس ان کے ساتھ سختی مت کیا کرو۔ نرمی کے ساتھ پیش آ

کے ساتھ بہترین حسنِ سلوک کیا کرو۔ یقیناً وہ تمہاری محبت و ہمدردی کی اولین مستحق ہے۔ عورت کو دنیا کی عظیم ترین نعمت کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہیکہ :۔

"جس گھر میں عورت دکھی ہوتی ہے اس گھر میں امن و سکون غارت ہوجاتا ہے غربت افلاس فکر و پریشانیاں ڈیرہ ڈال دیتے ہیں" اس لئے عورت پر ظلم و جبر کرنے والے کے لئے ...ت عذاب کی وعید آئی ہے۔

اس حدیث شریف سے عورت کی برتری اور بزرگی کا کھلا ثبوت ملتا ہے۔ ...سول کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ۔

"جو کوئی اپنی لڑکیوں کی پرورش عمدہ طریقے سے کرے تو وہ شخص اور میں جنت میں ...س طرح ساتھ ساتھ ہوں گے جس طرح کہ میرے ہاتھ کے دو انگلیاں"

اسلام عورت کو مرد کا دستِ راست قرار دیتا ہے۔ اور ایک دوسرے پر مطلق العنانی ...رنے کی کوئی گنجائش نہیں فراہم کرتا۔ اسلام عورت کو مرد کے دوش بدوش قدم سے قدم ملاکر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نے جہاں مرد پر صلوٰۃ حج و زکوٰۃ کی فرضیت عائد کرتا ہے ویسا ہی عورت پر بھی ان کی فرضیت عائد کی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اور دوسرے شعبۂ حیات میں بھی عورت کو وہی حقوق حاصل ہیں جو کہ مرد کو حاصل ہیں یعنی کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے" اگر کوئی عورت اپنی ذہانت و قابلیت اور غیر معمولی صلاحیت کے ذریعہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام کی راہ میں مزاحم نہیں۔ اسلام نے عورت کو معاشی استحکام عطا کرنے کے لئے بہترین قوانین وضع کئے ہیں۔

اسلام نے عورت کو غزوات میں بھی شامل ہونے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی گو کہ عورت پر جہاد فرض نہیں لیکن عورت اگر چاہے تو جنگ و غزوات میں بھی شامل ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے اس کا دائرہ عمل وسیع ہوگیا ہے۔ عورت گھریلو کاموں سے لے کر میدان جنگ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دے چکی ہے۔

اسلام نے عورت کو تمدنی طور پر بھی بہت سے حقوق عطا کئے ہیں۔ حکم دیا گیا ہے کہ کنواری کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ اس کی مرضی حاصل نہ کرلی جائے۔ اسلام نے عورت پر جہاد کی فرضیت عائد نہیں کرتا بلکہ اس کو یہ حکم دیا گیا کہ جو عورت مرد کے جہاد میں جانے کے بعد اپنے گھر اور بچوں کی بہترین ڈھنگ سے نگہبانی کرے گی اس کا مقام جہاد کرنے

والے مرد کی طرح ہے۔

اسلامی احکامات کی روشنی میں ماں کے روپ میں عورت نے دنیا کی سب سے عظیم ترین نعمت پائی ہے۔ جس کا نعم البدل کوئی نہیں۔

ماں کا مقام عورت کے لئے وقار اور عزت و احترام کا باعث ہے عورت کا یہ سب سے بہترین روپ ہے۔

ماں کے بارے میں رسول اکرم صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "لوگو میں تم کو اپنی ماؤں کی نافرمانی کرنے سے منع کرتا ہوں تم اپنی ماؤں کو خوش رکھو ان کی دعائیں لو بے شک روئے زمین پر محبت و حسن سلوک اور تمہاری توجہ کی مستحق تمہاری مائیں ہیں۔ اسلام نے عورت کو ماں کا درجہ دے کر فرمایا "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔

عورت کو بیوی کے روپ میں اسلام نے اہم ترین اختیارات بخشے ہیں۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی حکمراں و نگہبان ہے۔ وہ شوہر کی جائیداد کی مالک و مختار ہے۔

مرد کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ عورت کے پر لطف جذبات و احساسات کی پذیرائی کرے۔

اسلام سے پہلے عورت حق زندگی سے تک محروم تھی اور اسلام نے اسے وسیع اختیارات و حقوق عطا کئے ہیں۔ اور اسلام ہی کے طفیل عورت معاشرہ کی ایک اہم ترین ہستی مانی جانے لگی ہے۔

سلسلہ صفحہ ۱۲

اور آگ ہی سے کے اندر اترنے والی (یہی ہوگی)"

اس عبارت میں آسمان کی حالت سے مراد کیا ہوگی؟

سورہ المعارج کی آیت نمبر ۸ میں فرمایا گیا ہے "اور آسمان سماء پگھلے ہوئے تانبے کی طرح دکھائی دے گا"

الغرض یہ کہ قرآن ہماری رہنمائی ہر علم میں کرتا ہے اور اس میں سب کچھ ہے جیسا کہ سورہ الانعام میں آیا ہے۔ "ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی" جو علم سامنے آچکا ہے اور جو آنے والی صدیوں میں تا قیامت انسان کو حاصل ہو سکے گا اس سے بھی کہیں زیادہ قرآن میں مجموعہ ہے۔ سائنسی اصول و ضوابط اگر قرآن حکیم کے مطابق ہیں تو وہ صحیح ہے۔ اگر کوئی سائنسی نظریہ قرآن سے میل نہیں کھاتا تو اس بات میں مزید تحقیق کے بعد وہ نظریہ قرآنی نظریہ کے مطابق ہو جائے گا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم سائنس پڑھیں تحقیق کریں۔ اگر کوئی اصول قرآن سے مطابقت نہ کرے تو اس میں مزید تحقیق کریں تاکہ قرآن سے اختلاف باقی نہ رہے

(ماخوذ از دعوت نئی دہلی)

محمد اسحاق

تعلیم، منصوبہ بند کوششوں کا نتیجہ

۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا ہم بالکل ابتدائی جماعتوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسی سال اس قصبے سے محبوب نگر ہائی اسکول سے تین طلبہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور صرف ایک صاحب درجہ سوم سے کامیاب ہوئے۔ اخبار میں نام آیا۔ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ سارے گاؤں کے بڑے لوگوں کی ضیافت برپا کی گئی۔ یہ ایک [illegible] ان پر صرف ایک ہی جملہ تھا "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ ایک ریونیو انسپکٹر میرے پاس آئے اور اپنے لڑکے کو انجینیر بنانے کے سلسلے میں مشورے کے طلبگار ہوئے۔ یہ لڑکا میٹرک میں دو سال فیل ہو کر تیسرے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس صاحبزادے کی قابلیت پر مجھے شک تو تھا ہی، میں نے ان صاحب کو مشورہ دیا کہ یہ لڑکا انجینیر نہیں بن سکتا۔ بہتر ہے کہ انھیں کوئی دکان لگا دیجئے یا پھر اپنے اثرات سے کسی تحصیل میں انھیں جمعدار بنا دیجئے۔ باپ بیٹا دونوں سخت مایوس ہو گئے۔ لڑکے کی یہ ضد وہ انجینیر بن کر رہے گا۔ اور باپ کی یہ تمنا کہ وہ لڑکے کو انجینیر بنا کر ہی رہیں گے۔ کچھ مدت کے بعد میں نے مشورہ دیا کہ لڑکے کو حیدرآباد کے کسی کالج میں شریک کروا دیجئے۔ ماہانہ روپے بھیجئے اور دعا کرتے رہیے۔ یہ صاحبزادے انٹرمیڈیٹ کے دو سال [illegible] امتحان میں [illegible] سال ناکام ہوتے رہے اور آخر کار ہار گئے اور وظیفہ پر ریٹائر ہوتے وقت اس لڑکے کو تحصیل میں کسی [illegible] تقرر کروا سکے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی، شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

ان دو مثالوں سے ہٹ کر تیسری مثال ان دیہاتیوں [illegible] کی ہے۔ [illegible] والدین نے کبھی اپنے بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی لیکن انھوں نے خود محنت و مشقت کر کے مندر و مسجد کے چراغوں کے نیچے پڑھ کر تعلیم [illegible] آج [illegible] اور

ریٹائرڈ پرنسپل، کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد۔

ع میں ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور پروفیسر بن جائیں گے جن کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے۔ ورنہ
جدوجہد بھی حیرتناک ہوگی اور یہ بات بھی قریب قریب ہر ایک کے تجربے میں ہوگی کہ ان ہی کے خاندان کے قریبی
رشتہ دار ان کی تعلیم کے سخت مخالف رہے ہوں گے۔ جہاں تک وہ پست ہمت کر سکتے تھے کر چکے ہوں گے
اور یہ بھی مشورہ دے چکے ہوں گے کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ پگھل جاتا ہے اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے اور
جب ان کی ایک نہ چلی تو وہ دل میں شرمندہ ہوں گے اور بالآخر کہیں گے کہ "تعلیم قسمت کی بات ہے"۔

گزشتہ پچاس برس سے ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ تعلیم قسمت کی بات ہے۔ اور آج بھی یہ خیال عام ہے۔ اتنے برسوں میں پہلے سچ مچ تعلیم اتنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ غربت و جہالت کی وجہ سے ایک ہزار بچے اسکول میں شریک ہوتے تو بس دس پانچ میٹرک تک پہنچ پاتے۔ اس کے علاوہ اسکولوں کا تنگ و تاریک ماحول اور سخت سزاؤں کا رواج عام تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ بچہ کو جتنی سزا ملے گی اتنا ہی وہ تعلیم میں اوپر آئے گا۔ جو استاد سزا دینے میں استاد ہوتا ہے اس کی گاؤں میں اتنی ہی قدر ہوتی مگر ان اساتذہ نے کتنے معصوم طلباء کی زندگی اجاڑ دی، اس کی شاید انہیں خبر نہ ہوگی۔ جو مار کے خوف سے اسکول چھوڑ بیٹھے۔ ان حالات میں سخت جاں طالب علم آگے نکل جاتا تو ظاہر ہے کہ یہ قسمت ہی کی بات ہو سکتی تھی۔

تعلیم منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے۔

تعلیم قسمت کی بات ہرگز نہیں۔ بچوں کی بات ایک سوچے سمجھے دور رس واضح منصوبے کا نام ہے جو بچے کی ۴، ۵ سال کی عمر سے شروع ہو کر پندرہ سولہ سال کی عمر تک جاری رہتا ہے جب کہ یہ لڑکا میٹرک کا امتحان کامیاب کر لیتا ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے تھوڑے سے بہت سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات سرمایہ نہیں بلکہ یہ بات ہے۔

آپ نے اپنے بچے کی تعلیم پر کتنی توجہ دی کتنی دلچسپی لی اور اپنا کتنا وقت اس کی تعلیم پر۔ یہی تو اصل سرمایہ ہے جو بچے کی تعلیم کیلئے مشغول کرنا ضروری ہے۔ کم از کم یہ منصوبہ بند جدوجہد دس برس دو پنج سالہ منصوبوں پر محیط ہے۔

یہاں پر تعلیمی منصوبہ بندی اور عام منصوبہ بندی کے بنیادی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کوئی مکان، ڈیم یا برج بنانا ہو تو یہ منصوبہ پہلے کاغذ پر تیار کیا جاتا ہے۔ کاغذی نقشے کی تکمیل کے ضروری سرمائے کی فراہمی اور پھر اصل کام نقشے کے مطابق شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ جانچ کی جاتی ہے کہ جو منصوبہ ہم نے بنایا تھا وہ کہاں تک کامیاب رہا اور ہم نے جو نشان مقرر کئے تھے کس حد تک کس حد تک تشفی بخش طریقے پر حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

آپ کے بچوں کی تعلیمی منصوبہ بندی بالکل الگ چیز ہے ۔ وہاں کاغذی پلان یا نقشہ کی طرح بچے من وینے جاتی نہیں ہے ۔ کاغذی پلان پوری طرح پلانر اور انجینیر کے قابو میں ہوتا ہے وہ جب چاہتے ہیں رد و بدل کر سکتا ہے لیکن یہاں جس کیلئے پلان بنایا گیا ہے ۔ وہ خود ذی روح اچھلتا کودتا زندگی کی ساری توانائیوں کا مرکز ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اکثر چھوٹے بڑے منصوبے کام ہو جاتے ہیں ۔

ذاکر حسین تعلیمی فارمولا :-

ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے ملک کے بڑے ماہر تعلیم ہوئے ہیں ۔ کوئی چالیس برس لے ایک کالج کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انھیں ایک تعلیمی فارمولا دیا جو کامیابی کا ضامن ہے ۔ ہے کہ یہ فارمولا یوں ہی ضائع نہ ہو جائے ۔ کیوں کہ ذاکر صاحب پر جو کتابیں انگریزی یا اردو میں ا کہیں پر اس تقریر کا ذکر نہیں ہے ۔ فارمولا یہ ہے :-

"شدت × مدت = مقصد"

شدت مراد مقصد کو حاصل کرنے کا جوش، جذبہ، ولولہ، لگن اور دھن کا پیمانہ ہے ۔ اس کو ہم یہاں ۱۰۰ درجوں یا ڈگریوں میں ظاہر کریںگے ۔ مدت اس مقصد کے حاصل کرنے کا جوش یا جذبہ کتنے دن تک اقی رہا کیونکہ مقصد کے حصول کے لئے جتنی مدت درکار ہے وہ دلچسپی باقی رہی یا اس میں اتار چڑھاؤ تے رہے ۔ کیا یہ دلچسپی درکار مدت تک ایک ہی سطح اور ڈگری پر قائم رہی یا نہیں ۔ مقصد اگر ہم غور یں تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کے کئی ایک مقاصد قلیل مدتی اور طویل مدتی اسی فارمولے کے تابع ہیں سکا اطلاق آسانی سے تعلیمی منصوبہ بندی پر ہوتا ہے ۔ ایک بات یہاں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ جو مقصد نا اونچا ہوگا اسی کے حصول کا جذبہ (شدت) بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور پھر درکار مدت بھی اتنی ہی درکار ہوگی ۔

مثال کے طور پر ہم یہاں ۳ طلبا کا ایک فرضی جدول پیش کرتے ہیں جو اس میٹرک کے ان میں شریک ہیں ۔ ان کے نتائج اسی فارمولے کے تحت دیکھئے ۔

شدت × مدت = مقصد (نتیجۂ امتحان)

طالب علم ۹۰٪ × ۳ ماہ = ۲۷۰ نشانات ۔ ناکام

" ۶۰٪ × ۸ ماہ = ۴۸۰ " = کامیاب

" ۸۰٪ × ۱۲ ماہ = ۹۶۰ " = درجہ اول

لب علم امتحان کے سر پر آجانے سے شدت کا پارہ بہت زیادہ ہے لیکن درکار مدت بہت کم ہے ۔

باقی بر صفحہ ۳۹

تعلیمی معیار:۔ ہندوستان کے دستور نے مذہبی اقلیتوں کو یہ خصوصی حق دیا ہے کہ وہ حکومت کی اعانت پر اپنے تعلیمی ادارے قائم کر سکیں۔ اس رعایت کا اطلاق جن مذہبی اقلیتوں پر ہوتا ہے۔ ان میں سے دو اقلیتیں خاص ہیں۔ ایک مسلمان، دوسرے عیسائی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں جن کو حکومت کے خزانہ سے باقاعدہ طور پر مالی امداد دی جاتی ہے۔

مگر دونوں اقلیتوں میں انتہائی نمایاں فرق ہے۔ مسلمانوں نے "اقلیتی ادارہ" کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس میں مسلم اقلیت کو خصوصی رعایت دی جائے۔ مثلاً مسلمان لڑکے کم نمبر لائیں، حتی کہ فیل ہو جائیں تب بھی انھیں جگہ دی جائے۔ کسی مسلمان طالب علم کو داخلہ سے محروم نہ کیا جائے۔ عیسائی حضرات نے اپنے اقلیتی اداروں میں اس کے بالکل برعکس اصول کی پیروی کی۔ انھوں نے یہ کوشش کی کہ اپنے ادارہ کو اعلیٰ ترین تعلیمی معیار پر ترقی دیں۔ مسلمانوں نے اقلیتی ادارہ کا مطلب اقلیتی رعایت کا ادارہ سمجھا تھا۔ مگر عیسائی حضرات نے اقلیتی ادارہ کو اقلیتی آئیڈیل کا ادارہ بنانے پر ساری توجہ لگادی۔ انھوں نے داخلہ کے معاملہ میں حد درجہ سختی اور اصول پسندی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی تعلیمی ادارے ملک کے سب سے زیادہ اچھے ادارے سمجھے جانے لگے۔ ان کے معیار کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ "کرسچین اسکول" ہے۔

ایک طرف مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ہیں جو کمتر معیار کے لیے نمونہ بن گیے ہیں۔ دوسری طرف عیسائی حضرات کے تعلیمی ادارے ہیں جو سارے ملک میں برتر معیار کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ حتی کہ اب خود صاحب حیثیت مسلمان بڑی بڑی فیس ادا کر کے اپنے بچوں کو عیسائی تعلیمی اداروں میں داخل کرتے ہیں۔ اور ان کو وہاں کا طالب علم بنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ مزاج میرے نزدیک علمی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر آج کی دنیا میں باعزت زندگی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے اداروں کو رعایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر چلانا ہوگا۔ اور اس پر حد درجہ سختی کے ساتھ عمل کرنا ہوگا تاکہ مسلمانوں کے ادارے اعلیٰ معیار کا نمونہ بنیں۔ حتی کہ سارے ملک میں وہ طالبان علم کے لیے "فرسٹ چوائس" بن جائیں۔ نہ کہ "سکنڈ چوائس" یا "تھرڈ چوائس"، جیسا کہ آج وہ عملاً بنے ہوئے ہیں۔

الرسالہ سے ماخوذ

سید حامد

مسلمانوں کا انگریزی روزنامہ

انگریزی روزنامے کے بارے میں جو پہلے اداریے اور مضمون شائع کیے گئے اور ملک کے مختلف ں میں جو تقریریں کی گئیں، جو جلسے ہوئے ان میں اس کی اہمیت کھول کر بیان کی گئی تھی۔ کہا گیا تھا کہ بت ہیں ملک کے عوام اور ان کی اکثریت کو متاثر کیے بغیر کوئی گروہ نہ انصاف پا سکتا ہے اور نہ ہ سکتا ہے۔ ان اقلیتوں کے لئے جو پچھڑ گئی ہیں اور اس بنا پر نت نئے مسئلوں اور مشکلوں سے ہیں۔ حکومت اور عوام کو اپنی صورتِ حال سے آگاہ کرنے اور انھیں اپنے دکھ میں شریک کرنے اور پر آمادہ کرنے کیلئے یہ امر ضروری ہے کہ وہ اپنی بات انگریزی، ہندی اور علاقائی اخبارات کے ذریعہ نائے وطن اور حکومتوں تک پہنچائیں۔ مسلمانوں کے لیے جو سب سے بڑی اور سب سے درماندہ اقلیت ہوگی اختیار کر کے سلگنا اور کڑھنا اور اپنے مسائل کو منظرِ عام پر نہ لانا خودکشی کے لئے سب سے قدم ہے۔ اگر وہ جہدِ بقا میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور اپنے وطنِ عزیز میں عزت، غیرت اور سربلندی اتھ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں کم سے کم مرکز میں ایک عدد انگریزی اور ایک ہندی روزنامہ اور غیر ہندی ستوں میں علاقائی زبانوں میں روزنامے نکالنے چاہئیں۔ وسائل کو دیکھتے ہوئے انگریزی زبان کے ے کو ترجیح دی گئی۔ کیونکہ انگریزی زبان کی پہنچ پورے ملک تک ہے اور اسے وہ لوگ پڑھتے ہیں جن ھوں میں یا تو اختیار ہے یا سیاست ہے یا وہ رائے عامہ کو بناتے ہیں اور اربابِ سیاست ندازہوتے ہیں۔

چنانچہ انگریزی روزنامہ کے لئے ایک ابتدائی پروجکٹ رپورٹ بنوائی گئی تھی۔ بھی اب دو سال سے زائد ہو گئے۔) اس وقت لاگت کا تخمینہ سوا دو کروڑ روپیہ تھا۔ قیمتیں جس سے بڑھی ہیں انھیں دیکھتے ہوئے اس وقت ساڑھے چار کروڑ روپئے درکار ہوں گے۔

ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کو رجسٹر کرایا گیا اور بینک میں اس کا اکاونٹ کھولا گیا۔ جن

نل النار میشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ و انڈین پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ہمدرد نگر نئی دہلی ۶۲ —

لوگوں نے اس کا بیڑا اٹھایا تھا ان کو اُمید تھی کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لئے یہ کچھ مشکل نہیں کہ اس اہم کام کے لئے سال بھر کے اندر ڈھائی تین کروڑ روپیہ جمع کر دیں۔ ایک روپیہ فی کس بھی دیں گے تو دس کروڑ ہو جائیں گے۔ ان کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا جب ہر طرف سے یہ صدائیں آئیں کہ انگریزی اخبار سے زیادہ ضروری شئے ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے کوئی بھی نہیں ہے۔

یہ وہ خواب ہے مسلمان جسے ۴۰ سال سے دیکھ رہے ہیں، لیکن جب کہا گیا کہ از راہ کرم چندہ دیجیے تو بعض صاحبان کا جوش ٹھنڈا پڑنا شروع ہوا۔ طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ سوالات اور اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مثلاً اخبار کا نام کیا رکھا جائے۔ ایڈیٹر کہاں سے آئیں گے؟ مسلمان اُردو اخبار تو خرید تے نہیں، انگریزی اخبار کیسے خریدیں گے؟

انگریزی اخبار نکالنا مسلمانوں کے بل بوتے کی بات نہیں ہے پہلے جو تین بار کوششیں کی گئیں ان کا کیا حشر ہوا۔ روپیہ بھی سوخت ہوا۔ اگر بات ابناء وطن تک پہنچانی ہے، تو وہ مسلمانوں کا اخبار کیوں خریدیں گے؟ مسلمانوں کے اخبار کو اشتہار کون دے گا؟ حکومت تو دینے سے رہی، اردو ہندی اور علاقائی زبانوں میں اخبار کیوں نہیں نکالتے؟ پہلے ہی ایسی زبان میں اخبار نکالئے جو خود پایہ رکھا ہے ایک ٹٹ پونجیا روزنامہ، دیو قامت قارون دولت اور تجارت اساس اخبار و رسائل جو سو دو سو سال سے قدم جمائے ہوئے ہیں، لوہا کیسے لے گا؟ دہلی سے اخبار نکالا تو لکھنؤ، کانپور سے آگے نہ پہنچ سکے گا۔ کسی نے کہا "رسیلیوں میں کوئی کانگریسی نہیں ہے"۔ گویا اخبار اہل سیاست اور ارباب اختیار کی طمانیت قلب اور ضیافت طبع کے لئے معرض وجود میں آئے گا۔ کسی نے کہا، مسلمانوں کے جملہ مسالک کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ بعض لوگوں نے اشارتاً یا صراحتاً اپنے تعاون کو ٹرسٹ میں شمولیت پر مشروط رکھا۔ یہ انوکھی بات تھی کہ چند لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑا دل دیا ہے۔ انھوں نے ایک سوال بھی ایسا نہیں پوچھا، بلکہ اپنی بساط سے زیادہ امداد کی۔

جن لوگوں نے سوالات کی بوچھار کردی انھوں نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ اس عبرت ناک دوڑ دھوپ کا نتیجہ کیا ہوا؟ اتنی طویل کاوش کے بعد کل ستر لاکھ جمع ہو پایا۔ ہم مطلوبہ وسائل کے نشانہ سے بہت پیچھے رہ گئے اور تاریخ کے نشانہ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ دانشمند، دولت مند اور موشگاف حضرات کا رویہ جس قدر حوصلہ شکن تھا، اتنا ہی ہمت افزا رویہ کم مایہ اہل اخلاص کا تھا۔ پانچ دس اور بیس روپیے کے منی آرڈر چھوٹی چھوٹی جگہوں سے آنا شروع ہو گئے اہل اخلاص نے اپنے شہروں میں چندے جمع کیے اور چندے کی رقوم لے کر بہ نفس نفیس چلے آئے۔ مالیگاؤں کے ایک طالب علم نے اپنے مہینے بھر کا خرچ اخبار کی نذر کر دیا۔

ایک قلیل تنخواہ والے اہل کار نے اپنی آدھی تنخواہ اس کا ذخیرہ میں دے دی۔

حالات کا پورا جائزہ لینے کے بعد ٹرسٹیوں نے یہ کہا کہ اخبار مذکورہ کے لئے فراہمی زر کی مہم کو تیز کردیا جائے اور اس اشاعت جلد سے جلد ایک ہفتہ وار انگریزی رسالہ نکالا جائے ہماری منزل مقصود بہر حال انگریزی روزنامہ ہی ہے۔ اس انگریزی ہفتہ وار رسالے کے لئے تقریباً ایک کروڑ روپے درکار ہوں گے۔ فی الحال ساری توجہ اس رقم کی فراہمی پر مرکوز کی جائے گی۔

اس اثناء میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کو ہم اپنے ہمدردوں کی اطلاع کے لئے اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

انڈین پبلیکیشنز لیمٹڈ کے نام سے ایک کمپنی بنائی گئی ہے اور اس کے رجسٹریشن اور شروعات کے لئے مراحل طے ہو چکے ہیں۔ کوشش کی جائے گی کہ مطلوبہ رقم پرائیویٹ پلیسمنٹ کی بنیاد پر دستیاب ہو جائے تاکہ اس میں ان ہی لوگوں کا عمل دخل رہے جو اخبار کے ملکی اور ملی مقاصد کے ہم نوا ہوں۔ کمپنی کا اکاؤنٹ بمبئی مرکنٹائل بنک دہلی، دریا گنج میں کھول دیا گیا ہے۔

۲۔ ٹرسٹ نے حکیم عبدالحمید صاحب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ، اور سید حامد کے توسط سے اپنے دس لاکھ روپے صرف کر کے نوئیڈا میں تقریباً ۸ سو مربع میٹر کا ایک پلاٹ برائے عمارت پریس لگانے کیلئے حاصل کر لیا ہے، یہ پلاٹ طویل پٹے پر ہے۔

۳۔ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی میں ایک جدید، خوبصورت اور کشادہ عمارت (۱۲۲-A) میں ٹرسٹ کا دفتر کھول دیا گیا ہے۔ جس کا افتتاح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھوں سے ۱۷/مارچ ۸۸ء کو ہوا۔ دفتر مذکور کو چلانے کے لئے ایک صاحب کو مامور کردیا گیا ہے۔ اس عمارت میں انڈین پبلیکیشنز لیمٹڈ کا دفتر بھی کھولا جائے گا۔ یہ عمارت دو سال کے لئے حاصل کی گئی ہے۔ دہلی کے مرکزی علاقہ میں مکان حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ مالک مکان کو عمارت مذکور کرائے پر اٹھانے میں تامل تھا اس لئے یہ طے پایا کہ ٹرسٹ سے مبلغ تین لاکھ روپے مالک مکان کو بطور امانت دے دیئے جائیں۔ جس کو وہ دو سال کے خاتمے پر ٹرسٹ کو لوٹا دیں گے۔ اور رقم سے انتفاع کو بطور کرایہ محسوب کیا جائے گا۔

۴۔ میگزین مذکور کی فیزی بلیٹی رپورٹ زیر تشکیل ہے۔ ایک موٹے تخمینے کے مطابق ایک اعلیٰ درجہ کے با تصویر اور با رنگ ہفتہ وار رسالہ کے لیے تقریباً ایک کروڑ روپیہ درکار ہوگا جس کو حصص (Shares) کی شکل میں جمع کیا جائے گا۔ کمپنی کا آغاز مذکورہ ذیل حضرات کے دستخطوں سے ہوا ہے یہ اس کے ابتدائی ڈائرکٹران اور پہلے حصے دار (Share holders) بھی ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، مسٹر آئی کے گجرال، مسٹر عابد علی خاں، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، سید حامد اور مسٹر کمال فاروقی صاحب۔

ٹرسٹ کی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ حسب ذیل ہے۔

(رقوم ۳۰ جون ۱۹۸۸ء تک کی)

کل آمدنی ۳۱ - ۲۰,۹۸۹,۱۷ روپیہ

کل خرچ ۴۵ - ۷۰,۹۴۰,۱۳ روپیہ

(بشمول امانات تین لاکھ روپیہ نقد)

بقایا ۹۲ - ۴۸,۵۰,۳ روپیہ

اخراجات کی بڑی مدیں :—

پریس کی زمین اور اس پر بنی عمارت -/۲۵۰,۹۴,۹ روپیہ

(اس میں رجسٹری کی فیس شامل نہیں ہے۔)

اسفار ۶۰ - ۸۴,۳۰ روپیہ

ٹیلی فون کے لیے ڈپازٹ -/۹,۰۰۰ روپیہ

مشاہرہ و اعزازیہ ۲۵ - ۸,۱۹۲

چھپائی و کاغذ وغیرہ ۸۵ - ۵,۴۷۴

ڈاک کا خرچ ۴۰ - ۱,۹۴۰

ٹرسٹ کا بینک اکاؤنٹ نمبر 8610 ہے جو بینک آف انڈیا، نہرو پیلس ایکسٹینڈ کاؤنٹر، نہرو نگر میں واقع ہے۔

قارئین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ روزنامہ اور ہفت روزہ کی مہم کے لئے ساری بنیادی کار روائی کی جاچکی ہے۔ پریس کے لیے جگہ، عمارت اور ٹرسٹ کے لئے دفتر کا انتظام ہو گیا ہے۔

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات استثناء (80G) کے تحت آ گئے ہیں۔ ٹرسٹ کے ذریعہ اس کے بعض مقاصد کے لئے کمپنی وجود میں لائی گئی ہے۔ کمپنی پہلے میگزین نکالے گی پھر اخبار۔ یہ ٹرسٹ کمپنی کو ایک مضبوط انفرا اسٹرکچر کی منفعت دے گا۔ اشتراک الاکین نے ندیم اور غیر رسمی لیکن موثر انداز میں اس کی پالیسی متعین کر سکا۔ اور نفاذ پر نظر رکھے گا۔ اس لحاظ سے اخبار اور رسالہ کے حصول مقصد کے لئے ٹرسٹ کا وجود اور اس میں دل چسپی اور نگرانی ضروری ہے۔ ٹرسٹ اور کمپنی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ ٹرسٹ اپنے ان

مقاصد کی تکمیل بھی کرے گا، جن کی نوعیت فلاحی، اصلاحی، تعلیمی اور تعمیری ہے۔ ان دونوں اداروں میں ہر قسم کی امداد کو جذب کرنے اور اسے بہترین ڈھنگ سے خرچ کرنے کی صلاحیت ہے۔ ٹرسٹ کو اپیل، عطیات اور چندوں کے لئے ہو گی۔ رسید اور کوپنوں پر یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرسٹ علاقائی زبانوں میں اخبارات یا رسائل کے اجراء کے لیے محرک کی حیثیت سے کام کرے۔

کمپنی، یعنی انڈین پبلیکیشنز لمیٹڈ دردمند اور بیدار مغز اہل زر اور ارباب صنعت و تجارت کو سرمایہ کاری کی دعوت دے گی۔ ٹرسٹ بیرونی امداد قبول نہیں کر سکتا۔ لیکن کمپنی میں سرمایہ باہر کے لوگ بھی لگا سکتے ہیں۔

، سالہ کی اجراء تو اسی سال ہونا چاہیئے تاکہ اس کے تجربے کی روشنی میں بڑھتے ہوئے اعتماد کی ولولہ گرمی اور معتبر وسائل کے ساتھ منزل مقصود یعنی انگریزی روزنامے کی طرف مضبوط قدم بڑھائے جا سکیں۔ تنگ حوصلہ اور اندیشہ مند لوگوں سے حذر بہتر ہے جو تاریکی میں شمع روشن کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں آگ دامن نہ پکڑ لے۔

ہماری تو اپنے بھائیوں سے مؤدبانہ یہ درخواست ہے کہ ہمت کو بلند رکھیے۔ اور ذاتی اغراض سے اوپر اٹھ کر ملک و ملت کی فروغ اور مقاصد پر غور کیجیے۔ ملت کو تباہی اور پستی سے نکالنے کے لئے روپے پیسے سے دریغ نہ کیجئے آپ جو پونجی اس کمپنی میں لگائیں گے وہ رسالہ اور اخبار کے ذریعے دوسروں کو غلط فہمی اور آپ کو غلط اندیشی سے بچائے گی اور آپ کی بات کو اپنائے وطن تک پہنچائے گی۔

سلسلہ صفحہ ۲۷

حسب سابق قائم و جاری رہے۔ ہر مذہب پر عمل کی آزادی رہے اور بقائے باہم کے ساتھ خوشحالی ترقی اور امن و امان کے راستے پر ہم آگے بڑھتے رہیں

"تاریخ ہند کا المیہ" کامیاب پریس کمام گاؤں میں چھپی ہے۔ خوشنویس، قیوم رضا نے اچھی کتابت کی ہے لیکن کبھی کبھی غالباً عجلت کی بنا پر حسن تحریر متاثر ہوا ہے۔ سر ورق شکیل اعجاز نے سیکولرزم کا عکاس اور فکر انگیز بنایا ہے۔

قیمت (۲۵) روپیے نسبتاً مناسب اور اردو والوں کی قوت خرید کا لحاظ کرتے ہوئے مقرر کی گئی ہے۔

مندرجات کتاب اس قابل ہیں کہ غیر مسلموں میں بھی عام ہوں۔ اگر یہ ناگری رسم الخط میں بھی چھاپی جائے تو بڑی نفع بخش ہو گی اور تحریر کا مقصد بھی بدرجۂ اتم پورا ہو گا۔

تبصرہ

تاریخ ہند کا المیہ

نام کتاب : تاریخ ہند کا المیہ
مصنف : محمد ضیاء الحق خاں
تبصرہ نگار : محمد کلیم الدین احسن

"تاریخ ہند کا المیہ" کا ذیلی عنوان "سلاطین ہند کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ" ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ سلاطین ہند کے بارے میں جو غلط بیانیاں کی گئی ہیں اُسے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جناب بشمبرناتھ پانڈے گورنر اڑیسہ نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے۔ کہ انگریزوں نے ہندو مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کے بیج بونے کی کوشش میں تاریخ کو توڑا مروڑا اور ایسا گھپلا پیدا کر دیا۔ جو آزادی کے بعد بھی ذرا سی ٹھیس لگنے پر رسنے لگتا ہے۔ ضروری ہے کہ انگریز مورخوں کی لکھی ہوئی غلط تاریخ ہم پھر سے درست کریں۔ محترم ضیاء الحق صاحب نے یہی کوشش کی ہے۔ جسے پڑھ کر لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور یک جہتی کی بھولی ہوئی روایات پھر سے قائم ہوں گی۔

جناب بشمبرناتھ پانڈے خود ایک حوصلہ مند اور بے لاگ مورخ ہیں۔ جنہوں نے غیر ملکی مورخین کے ساتھ ملکی مورخین کے تعصب کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب "ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایات" میں لکھا ہے کہ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی ڈپارٹمنٹ کے صدر مہا مہو پادھیا ئے ڈاکٹر ہرپرشاد شاستری کی تحریر دیکھی جس میں لکھا تھا کہ "تین ہزار برہمنوں نے خودکشی کر لی۔ ٹیپو سلطان انہیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا" جناب پانڈے نے تحقیق کی۔ میسور کے پروفیسر سری کانتہ نے انہیں لکھا کہ یہ واقعہ میسور

سی کہیں نہیں ہے۔ بر خلاف اس کے ٹیپو سلطان کا سپہ سالار کرشن راؤ برہمن تھا، وزیر ۴... پورنیہ برہمن تھا۔ ٹیپو سلطان ۱۵۶ مندروں کو ہر سال تحفہ اور چڑھاوا بھیجا کرتا تھا۔ سلطان کے قلعہ کے اندر سری رنگناتھ کا مندر تھا۔ جہاں روز صبح سلطان سوامی کے درشن کرتا تھا۔ یہ تمام تفصیل جناب پانڈے نے کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بھجوائی جس نے فوراً شاستری صاحب کی کتاب کو نصاب سے خارج کر دیا۔

جناب ضیاء الحق نے جناب بشمبر ناتھ پانڈے جیسے نیک نفس، غیر متعصب اور حقیقت پسند دانشوروں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے تلاش اور جستجو کے بعد تاریخ ہند کا جائزہ لیتے ہوئے ان غلط بیانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں بد طینت مورخین نے اپنے ناپاک عزائم کی پیشی رفت میں داخل کتاب کر دیا تھا۔ اور کچھ اس انداز سے کیا تھا کہ بقول جناب پانڈے "مسخ شدہ واقعات اور غلط بیانیاں الہامی درجہ پا چکی ہیں۔ اور الٹا ان لوگوں کو مطعون اور بدنام کیا جاتا ہے۔ جو واقعے کو قصہ سے، حقیقت کو غلط بیانی سے اور سچ کو جھوٹ سے ممیز کرنا چاہتے ہیں۔"

جناب ضیاء الحق نے اپنی کتاب میں یہ امر بجا طور پر واضح کیا ہے کہ مسلمان مورخین نے مسلم سلاطین اور ہندو راجاؤں کے مابین جنگوں کا ذکر کیا ہے تو غیر مسلم مقتولین جنگ کو بجہنم رسیدہ لکھا۔ مسلمان مقتولین کو "شہید" قرار دیا۔ اور مسلمان فاتحین کو "غازی" کا لقب دیا۔ ان الفاظ پر انحصار کرتے ہوئے بعد کے مورخین نے ان جنگوں کو "جہاد" قرار دیا اور بتایا کہ مسلم سلاطین یہ جنگیں اسلام پھیلانے کے لئے لڑ رہے تھے۔ حالانکہ یہ جنگیں اسلام اور کفر کی آویزش قطعاً نہیں تھیں بلکہ صرف ملک گیری کے لئے تھیں۔ اور ان جنگوں کے نتیجہ میں کسی غیر مسلم نے اسلام قبول نہیں کیا۔ محمد بن قاسم اُن بحری قزاقوں کو سزا دینے کے لئے سندھ آیا تھا۔ جنہوں نے عرب تاجروں کے جہاز لوٹ لئے تھے۔ اور سندھ کے برہمن راجہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مقامی ہندو سرداروں اور بدھ بھکشوؤں نے مسلم حملہ آور کو کھلے بندوں مدد دی، جس نے انہیں مقامی ہندو راجہ کے ظلم سے نجات دلائی۔

سلطان محمود غزنوی کے مشہور جملے "میں بت فروش نہیں بت شکن ہوں" کے سہارے سلطان کے تمام حملوں کو اسلامی جہاد کا نام دیدیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ

نہ اپنے مذہب کا تبلیغ تھا نہ اس کے حملے جہاد تھے۔ یہ سب حملے ہندوستان کی دولت کے لیے تھے۔ اور مندروں پر حملہ اس لیے ہوتا تھا کہ وہاں راجاؤں کے خزانوں سے زیادہ دولت جمع ہو گئی تھی۔ سلطان محمد غزنوی نے ہندوستان سے دولت منتقل کر کے پایہ تخت غزنی کو حقیقی معنوں میں عروس البلاد بنا دیا تھا۔ مگر سلطان کے بعد علاءالدین نے غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تاخت و تاراج کیا۔ اور ایک ہفتہ تک مسلسل یہ شہر جلتا رہا جس کی وجہ سے علاءالدین جہاں سوز مشہور ہو گیا۔

واضح رہے کہ اس واقعہ کے ظالم و مظلوم دونوں نہ صرف ہم مذہب بلکہ ہم قوم بھی تھے

محمد غوری نے غزنی کا صوبیدار ہوتے ہی ہندوستان پر پہلے حملے میں مسلمان حاکم ملتان کو شکست دی۔ دوسرے میں پنجاب کے حکمران خسرو ملک کو ہرایا۔ تیسرے حملے میں پرتھوی راج چوہان سے شکست کھا کر پسپا ہوا اور اس شکست کی ذلت مٹانے کے لیے دوسرے سال میں ۱۱۹۲ء میں دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اور پرتھوی راج کو شکست دے کر یہاں مستقل حکومت قائم کر لی۔ جسے اس کے ترک غلام و نائب قطب الدین ایبک نے مزید وسیع اور مستحکم کیا۔ اصل میں یہ دونوں سلاطین ہندوستان میں مسلم حکومت کے بانی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے حملوں کو جہاد کا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اپنی رعایا میں بلا تفریق مذہب انصاف کیا۔ اور کسی کو بزور شمشیر مسلمان نہیں بنایا۔

خاندان غلاماں، خلجی اور تغلق کے بارے میں بھی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ مصنف نے مشہور دانشور و مورخ جناب سیتو مادھو راؤ کا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح حکومت کی سند یافتہ خاتون گائڈ چتوڑ میں غیر ملکی سیاحوں کو یہ بتا رہی تھیں۔ کہ چتوڑ کے رانا کی بیوی پدمنی کو علاءالدین جنگ کے باوجود حاصل نہ کر سکا تو یہ طے پایا کہ وہ آئینہ میں رانی کی جھلک دیکھ کر چلا جائیگا۔ جناب سیتو مادھو راؤ نے اُس خاتون گائڈ کو بتایا کہ یہ روایت فرضی اور من گھڑت ہے۔ حکومت اور ذمہ دار مورخین کا فرض ہے کہ ایسے غلط واقعات کی چھان بین کر کے انہیں تاریخ سے خارج کر دیں۔

امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ صرف اس لیے تھا کہ خود اس کے سردار اس دور [illegible] حملہ کے لیے رضامند ہو جائیں ورنہ دہلی کی مسلم حکومت کو تاخت و تاراج

"جہاد" کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

مغلوں کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو بھی فاضل مصنف نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکبر کے زمانے میں مغلوں اور راجپوتوں میں ہلدی گھاٹ کی جنگ ہوئی اس کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ اکبر کی فوجوں کا سپہ سالار راجپوت راجہ مان سنگھ تھا۔ جس کا ہراول دستہ راجپوت سپاہیوں پر مشتمل راجہ جگناتھ کی سرکردگی میں تھا۔ اور رانا پرتاپ کا ہراول دستہ حکیم خاں سور کی قیادت میں تھا جو اپنے قبیلہ کے افغانوں کے ساتھ شریک جنگ تھا۔ یہ جنگ دو مختلف المذہب حکمرانوں میں ضرور تھی۔ مگر اکبر تو وسیع مملکت کے لیئے لڑ رہا تھا تو رانا پرتاب نے اپنے وقار اور بقائے سلطنت کے لیئے جان کی بازی لگا دی تھی۔

اکبر اور اس کے جانشینوں نے سلطنت کی توسیع کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور اس کے لیئے مسلم حکومتوں کے خلاف فوج کشی کر کے انہیں ختم کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ فاضل مصنف نے ان واقعات کو اپنے حقیقی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اورنگ زیب کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کہ اس حکمران کے خلاف غلط بیانیاں بھی کچھ زیادہ ہی کی گئی ہیں۔ مہاراجہ جسونت سنگھ کا کئی دفعہ اورنگ زیب سے وعدہ خلافی کر کے اس کے اعتماد و یقین کو ٹھیس پہنچانا لیکن ہر دفعہ اورنگ زیب کا مہاراجہ کو معاف کر دینا۔ قلعہ داری اور بڑے بڑے مناصب پر راجپوتوں کو مقرر کرنا۔ غیر مسلم رعایا پر جزیہ عائد کرنا لیکن تخت نشین ہوتے (۸۰) ٹیکس معاف کر دینا جس سے رعایا ناراض تھی۔ اور جن میں جاتراؤں وغیرہ کے مذہبی قسم کے ٹیکس بھی شامل تھے۔ یہ سب ٹیکس معاف کر کے صرف جزیہ نافذ کرنا ان کی حفاظت کی ضمانت تھی جس سے اورنگ زیب خاطر خواہ عہدہ برآ ہوا۔ ہم مذہب پٹھانوں سے طویل لڑائیاں جن میں شاہی فوج میں راجپوت اور غیر مسلم سپاہیوں اور سرداروں کی بڑی تعداد تھی۔ اورنگ زیب کے مرہٹوں سے تعلقات غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور مندروں کی سرپرستی کے دستاویزی ثبوت ان تمام امور پر فاضل مصنف نے تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے اورنگ زیب کے خلاف غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اور ہمارے ... کی مسلسل سیکولرزم کو زیادہ تقویت بہم پہنچائی ہے۔

...رت ہے کہ ایسی تحریریں زیادہ سے زیادہ عام ہوں۔ تاکہ ہماری سیکولرزم

باقی بر صفحہ ۲۳

شیخ سلیم

موضوعِ تحقیق کا انتخاب

موضوع کا انتخاب تھیسس یا مقالے کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں جس موضوع سے دلچسپی ہوتی ہے اور جس کا مواد ہمیں بہ آسانی فراہم ہو سکتا ہے۔ اس پر پہلے ہی مقالہ لکھا جا چکا ہوتا ہے، یا کسی دوسرے نے کام شروع کر دیا ہے یہ دیکھ کر ہم مایوس ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع میں ایسے گوشے موجود ہیں جو اچھوتے ہیں اور جن پر تحقیق سے عظیم فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ لہذا موضوع اختیار کرنے سے پہلے خود بھی غور و خوض کریں اور اپنے اساتذہ اور دیگر ماہرین سے بھی مشورہ کریں، اگر موضوع قابلِ بحث معلوم ہو تو مندرجہ ذیل سوالوں کے تحت اس کو جانچا جائے جس موضوع کے متعلق ہر سوال کا جواب اثبات میں ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اگر ایک کا جواب بھی نفی میں ہو تو اس کو مسترد کر دیا جائے۔

(۱) آیا موضوع پر تحقیق سے حاصل شدہ نتائج اتنی اہمیت رکھیں گے کہ اس پر صرف ہونے والے وقت اور کوشش کی قیمت قرار پا سکیں

(۲) کیا اس موضوع میں اتنی گنجائش ہے کہ مستقل مقالہ لکھا جائے؟

(۳) کیا اس پر کام بس میں ہے؟

(۴) کیا اس موضوع سے طالب علم کو دلچسپی ہے، اور اس کے مزاج سے ربط رکھتا ہے۔

---

* ریسرچ اسکالر۔ حیدرآباد یونیورسٹی۔ حیدرآباد۔

ہر موضوع اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر بحث و تحقیق کریں اور تحقیق کا مقصد کسی بھی موضوع پر تھیسس یا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کر لینا۔ نہ ہونا چاہیئے بلکہ کسی ایسے موضوع کو منتخب کرنا چاہیئے جو اہل علم کے لئے باعث فکر و نظر ہو اور دنیائے علم میں کچھ اضافہ ہو، کوئی مسئلہ سلجھے اور کوئی الجھن دور ہو۔ بہتر ہے کہ ایسا موضوع منتخب کریں جو آئندہ عالمی زندگی سے مربوط ہو اور جس سے آئندہ تعلق باقی رہنے والا ہو۔

کبھی موضوع تو مفید ہوتا ہے اور نیا بھی ہوتا ہے۔ لیکن اتنا مواد موجود نہیں ہوتا کہ اس پر مقالہ لکھ سکیں۔ کبھی موضوع بھی نیا ہوتا ہے اور مواد بھی کافی ہوتا ہے، لیکن اس تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہوتی مثلاً موضوع کے متعلق معلومات ایسی زبانوں میں ہوتی ہیں جن سے ہم واقفیت نہیں رکھتے اور دوسروں سے ترجمہ کراتے ہیں تو اس میں دوسروں کا محتاج رہنا پڑتا ہے اور پھر ترجمے پر پورا بھروسہ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ مطلب صحیح ادا ہوا یا نہیں۔

موضوع کے انتخاب میں مالی امکانات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں کیونکہ بعض اوقات موضوع سے متعلق مواد ایسے دور دراز مقامات سے حاصل ہوسکتا ہے۔ کہ سفر اور قیام کے اخراجات امکان میں نہ ہوں تو اصل ماخذ تک پہونچنے اور اُسے حاصل کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ موضوع اتنا پھیلا ہوا بھی نہ ہو کہ معلومات کے جمع کرنے ان کی ترتیب و تدوین اور نتائج اخذ کرنے کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کی گنجائش اس میں نہ ہو جتنا وقت تحقیق کے لئے اس کو دیا گیا ہے۔ موضوع بہت وسیع اور بسیط نہ ہو، وسیع موضوع کی صورت میں کامل کا ایک جزو تحقیق کے لئے منتخب کرنا بہتر ہوگا مثلاً "اردو نثر کے اسالیب بیان" یہ ایک وسیع موضوع ہے اور متذکرہ موضوع کو مختلف موضوعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

بعض موضوعات سے کچھ لوگوں کو فطری تعلق اور خصوصی میلان ہوتا ہے، کسی کو ادب کا ذوق ہوتا ہے، کوئی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے اور کسی کا لگاؤ سائنس کے مضامین سے ہوتا ہے۔ اگر اپنے میلان اور طبیعت کے

مطابق موضوع منتخب کریں تو اس کی دلچسپی آخر تک قائم رہے گی۔ جذبات اور میلانات سے تھوڑے دور ہٹا جاسکتا ہے۔ لیکن مقالے کے موضوع سے تو برسوں تک رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔

تحقیق کے لئے کبھی ایسا موضوع نہ منتخب کرنا چاہیئے جس کے موافق یا مخالف رائے پہلے سے ذہن میں موجود ہو اور اپنے عقیدے کی پختگی کی بناء پر اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو۔ اسی طرح ایسے موضوع سے بھی انصاف ممکن نہیں، جس کی موافقت میں پہلے سے خیالات موجود ہوں اور جس کے خلاف سوچنے کی جذبات اجازت نہ دیتے ہوں اس کے علاوہ زندہ لوگوں کو بھی موضوعِ تحقیق بنانا غیر مناسب ہے۔ تحقیق کے مدارج میں سب سے اہم منزل موضوع کے انتخاب کی ہے اگر اسکالر نے اپنی صلاحیت، مذاق اور اپنی پسند کی روشنی میں موضوع کا انتخاب نہیں کیا تو اس کی تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوگی۔ اور اگر مکمل ہو بھی گئی تو اس سے مفید نتائج بر آمد نہیں ہوں گے۔ موضوع کی مناسبت اور اسکالر کے مزاج کے مطابق نگراں کا وجود بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسے بھی موضوع سے اتنی دلچسپی ہونی چاہیئے جتنی کہ اسکالر کو ہوتی ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مواد کی حصول یابی اور اعداد و شمار کی یکجائی اور تجربے و تجزیے کے دوران رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔ موضوع منتخب کرتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ دائرہ اتنا وسیع نہ ہو کہ وقتِ مقررہ پر کام مکمل نہ ہو پائے اگر مواد کی حصول یابی کے ذرائع دسترس میں نہ ہوں تو تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔

ماہرین تحقیق کی رائے ہے کہ محقق خود موضوع کا انتخاب کرے تو بہتر ہے۔ اور یہ موضوع ایسا ہو جس سے اسے پہلے سے دلچسپی ہو اور وہ اس سے متعلق تھوڑا بہت پڑھ چکا ہو۔ موضوع کا انتخاب اپنے نقطۂ نگاہ سے اور اپنی علمی سطح سے کرنا چاہیئے اور اگر اتفاق سے دونوں باتیں یکجا ہو جائیں یعنی موضوع محقق کی دلچسپی کا نہ ہو اور اس کی علمی سطح سے اونچا بھی ہو تو اس کی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں اور موضوع کا انتخاب اپنی دلچسپی اور علمی سطح مطابق ہو تو کام کی رفتار بھی

حسب خواہش ہوگی اور نتیجہ بھی خوشگوار ہوگا۔ اکثر یونیورسٹیوں میں رہنمایا نگراں اپنے طلباء کو اپنا پسند کیا ہوا موضوع اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کوئی اچھا اور موزوں طریقہ نہیں ہے بہتر یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو موضوع کا انتخاب اسکالر خود کرے تاکہ وہ اس کی دلچسپی کا بھی ہو اور اس کی صلاحیت کے مطابق ہو، البتہ وہ اپنے موضوع کی اہمیت، افادیت، جدت اور مواد کی فراہمی کے امکانات کے متعلق اپنے رہنما یا نگراں سے مشورہ کرے۔

موضوع کا انتخاب کرتے وقت ذیل کی چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے

(۱) موضوع نیا ہو اور اہم ہو، تکرار مضمون سے نہ علم و ادب میں اضافہ ہوگا۔ اور نہ تحقیق کا کوئی فائدہ ہو پہنچے گا، اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ صرف ایسے موضوع کا انتخاب کیا جائے جس پر اب تک کچھ نہ لکھا گیا یا بہت کم لکھا گیا ہو۔

کوئی کتاب یا مقالہ حرف آخر نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی تحقیق سے موضوع میں نئے نئے پہلو پیدا کر سکتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر دہشتی "تحقیق میں جدت ایک اضافی صفت ہے"[۱]

اس لئے ایسے موضوع کا انتخاب بھی کیا جا سکتا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ البتہ موضوع جس نقطۂ نظر سے پیش کیا جائے وہ نیا ہو پرانے موضوع میں بھی جدت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ترتیب مواد، اخذ نتائج وغیرہ کے ذریعہ اسے نیا بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ موضوع سے علم کی شاخ کو جس میں تحقیق کی جا رہی ہے، کیا فائدہ پہنچے گا۔

علم میں چھوٹے چھوٹے اضافے کر کے بھی تحقیق انسانی بہبودی کے لئے فرض ادا کر سکتی ہے۔ ہمیں اس نکتہ پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس موضوع کے متعلق مواد آسانی سے دستیاب ہو جائے ایسے موضوع سے حتی الامکان بچنا چاہیئے۔ کیوں کہ جب مواد کی کثرت ہوگی تو اس کا ترتیب دینا اور نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہوگا۔ اور اگر یہ بھی ہو جائے تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس میں جدت پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

---

[۱] عبدالرزاق قریشی مبادیات تحقیق صفحہ ۳۳

موضوع کے انتخاب میں اسکالر کو موضوع سے واقفیت فرر
اور غور و فکر کے بعد نقطۂ نظر متعین کرنا بھی ضروری ہے اور پھر موضوع
سے اتنا انہماک ہو کہ اپنے وجود کی شرکت کا احساس بھی ہو۔
جمیل جالبی نے کہا کہ موضوع کے انتخاب کر لینے کے بعد صرف اسی موضوع
پر خیالات مرتکز کریں اور اس پر غور و فکر کریں۔ اپنے ذہن اور اپنی
صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک نیا نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہیے اور
اپنے موضوع میں اس قدر محو ہو جانا کہ القا کا گمان ہو۔ اسکالر کو اس بات
کی آزادی اور اختیار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ موضوع کا انتخاب کر سکے
اگر وہ اس ضمن میں اسے اپنے نگراں یا رہنما سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے لیکن بہرحال
موضوع کا انتخاب ہرگز نگراں کو نہیں کرنا چاہیے جس موضوع سے محقق کو دلچسپی
ہو اس موضوع پر ہی کام کرنا چاہیے۔ موضوع زیادہ وسیع نہ ہو اور نہ
ہی زیادہ مختصر بھی ہو، بلکہ موضوع مختصر اور چھوٹا ہونا چاہیے تاکہ گہرائی
سے تمام مخفی گوشوں کا مطالعہ کر سکیں اگر موضوع وسیع ہوگا تو اس پر
گہرائی سے کام کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہیگی۔ اور صرف سرسری تحقیق کرنے
پر مجبور ہو جانا پڑے گا اور یہ کام جو سرسری ہوگا وہ ادب میں نہ ہی
مفید ہوگا اور نہ ہی منفرد۔ تذکرہ نما موضوعات سے بھی گریز کرنا چاہیے
ورنہ اس میں معیار باقی نہیں رہے گا اور تذکروں پر موضوع اگر منتخب
کریں تو کام بہت بڑھ جائے گا۔
موضوع کے انتخاب میں یہ احتیاط بھی برتنی ضروری ہے کہ آیا یہ گروہی اور
علاقے پر مبنی موضوع تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ متنازعہ موضوع ہوگا
اور اس سے محقق کو احتیاط ضروری ہے۔ ایسا موضوع بھی نہیں جو
سعی رائیگاں تصور کیا جائے" اور شاید اسی کی طرف گوئٹے نے اشارہ کیا
ہے۔

"جو لوگ بھولے جانے کے لئے پیدا ہو گئے ہیں
انھیں زندہ کرنے کا فعل عبث ہے"

موضوع کا انتخاب کرتے وقت یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اردو
ادب کو کن موضوعات کی ضرورت ہے اور اردو ادب میں کہاں کہاں

خلاء ہے اور یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ مواد کتنا فراہم ہوسکتا ہے اور کن پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے۔ موضوع کا انتخاب ایسا ہو جن کے بارے میں دوسروں کو کم معلوم ہو اور جن موضوعات کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ معلوم ہے اس پر مقالہ نہیں لکھنا چاہیئے۔ موضوع کی اہمیت کو بھی مد نظر رکھنا از حد ضروری ہے جس سے بہت زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں۔ اور جن کی ادبی اہمیت ہو، ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ مواد کا اپنے ہی شہر میں فراہم ہونا ضروری ہے اور مواد کے سلسلے میں مصنفوں تک رسائی ہو تو بہتر ہے ورنہ بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موضوعات سے گریز ہی کریں تو بہتر ہے جن کی پہلے اور بعد میں اردو ادب میں اہمیت نہیں رہتی۔ موضوع کے انتخاب میں نگراں کی دلچسپی اور اہلیت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ بہت زیادہ محدود موضوع کا انتخاب بھی مناسب نہیں اس صورت میں محقق کے ہمت ہارنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ جس موضوع سے اسکالر کو کسی قسم کی نفرت ہو یا کسی خاص قسم کے تصورات اس نے قائم کرلئے ہوں، اس کا انتخاب کرے کیونکہ ایسی تحقیق سے تحقیق کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

سب سے اہم بات جو ہمیں موضوع کے انتخاب کے ضمن میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ موضوع نہ صرف محقق کے لئے دلچسپی کا حامل ہو۔ بلکہ طبع و اشاعت کی صورت میں قاری کی بھی دلچسپی کا باعث بن سکے۔ اور کتاب کے مطالعہ سے اس کے علم میں اضافہ بھی ہو اور اسے مسرت بھی حاصل ہو۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت متعلقہ زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقفیت ہو تو بہتر ہے اس سے دوسری زبانوں سے مدد لے کر تحقیق میں استفادہ کیا جاسکتا ہے، اگر دوسری زبانوں سے عدم واقفیت ہوگی تو ترجمہ کے لیے محتاج ہونا پڑے گا۔ اور ترجمہ پر بھروسہ بھی نہیں کیا جاسکتا ہے لہذا اہم متعلقہ زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے اور اس کے علوم رموز و نکات اور اصطلاحات سے واقف رہیں تو تحقیق میں آسانی ہوگی۔

مینول آف تھیسس رائٹنگ (A Manual of Thesis Writing) کے مصنفین کی رائے میں محقق کو موضوع کا انتخاب کرنے سے پہلے اپنے آپ سے چند سوالات کرنے ہونگے جو مندرجہ ذیل ہیں اور یہ محقق کے لیے مفید ثابت ہونگے۔

۱) کیا یہ موضوع اس لائق ہے کہ اس پر تحقیق کی جائے۔
۲) کیا اس موضوع پر تحقیق مکمل ہو سکتی ہے؟
۳) کیا اس موضوع پر تحقیق کرنا میرے لیے ممکن ہے؟
۴) کیا اس موضوع پر میں تحقیق کر سکتا ہوں؟

مندرجہ بالا سوالات میں کسی ایک کا بھی جواب نفی میں ہو تو محقق کو موضوع مسترد کر دینا ہوگا اور پھر از سرنو اپنی صلاحیت، اور اپنے طبعی رجحان اور میلان کا جائزہ لینا ہوگا۔ تحقیق میں موضوع کیسا ہو؟ اور کیسا نہ ہو ان دونوں پہلوؤں پر بھی ہمیں غور کرنا ہوگا اور ان کے منفی و مثبت اثرات کا جائزہ بھی ضروری ہے۔

موضوع کیسا ہو :- ایسا موضوع ہونا چاہیئے کہ جس پر تحقیق ضروری ہو اور اس میں دلچسپی اور رجحان کا ہونا ضروری ہے۔ موضوع ایسا منتخب کرنا چاہیئے۔ جس سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو سکے اور موضوع سے قارئین کی دلچسپی بڑھے اگر عام طبقے یا حلقے میں نہیں تو کم از کم خاص طبقے یا حلقے کی دلچسپی ضرور ہونی چاہیئے اگر ایسا نہیں ہے تو ضرور اس موضوع میں کچھ کمی یا پھر خامی موجود ہے۔ ایک سے زائد موضوعات (Interdiciplinary) موضوعات مثلاً اردو ہندی اور معاشیات وغیرہ بھی تحقیق کا موضوع ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لئے دوسری زبان اور بالخصوص معاشیات کے لیے مغربی نقادوں اور ماہرین کے نقاط نظر کا بہت گہرائی سے مطالعہ ضروری ہے۔

موضوع کیسا نہ ہو :- ایسا موضوع منتخب نہ کریں جس پر پہلے سے کسی نے کام کیا ہو یا پھر کر رہا ہو۔ موضوع خالص تنقیدی نہ ہو کیونکہ ایسے تحقیق سے لوگوں کو زیادہ فائدہ نہیں ہوتا موضوع نیم تنقیدی اور نیم تحقیقی ہونا چاہیئے۔ موضوع زیادہ وسیع نہ ہو جیسے دکنی ادب کی تا

وغیرہ کیونکہ زیادہ وسیع موضوع میں ایک مدت صرف مواد جمع کرنے میں الجھ جاتی ہے۔ موضوع زیادہ عمومی اور عام نہ ہو اگر موضوع عام نوعیت کا ہوگا تو اس پر گہرائی سے گہری تحقیق ممکن نہیں ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ بڑے مصنفین پر عمومی تحقیق ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ جتنا چھوٹا موضوع ہوگا اتنا ہی گہرائی اور یکسوئی سے کام کرنا آسان ہو جاتا ہے اسکالر کو اس بات کا بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ مواد صرف ایک ہی کتاب سے فراہم ہو جائے تو وہ بالکل ناقص ہوتا ہے۔ اور ایسے موضوعات سے بچنا ضروری ہے۔ جن شخصیتوں پر آزادی سے کام کرنا ممکن نہیں ان موضوعات پر کام کرنا نہیں چاہیئے۔ زندہ شخصیتوں پر اکثر صاحب اقتدار لوگ کام کرتے ہیں تاکہ کچھ فائدہ ہو جائے۔ بہت زیادہ حالیہ موضوعات سے بھی گریز کرنا چاہیے زیادہ تکنیکی موضوع بھی منتخب کرنا نہیں چاہئیے کیونکہ ان میں پہلے پہل آسانی دکھائی دیتی ہے لیکن بعد میں دشواری ہوتی ہے۔ اور پھر جو دلچسپی ابتداء میں رہتی ہے وہ کیفیت بعد میں قائم نہیں رہتی۔ نزاعی موضوعات سے بھی احتیاط ضروری ہے اور شدید جذباتی لگاؤ اور عناد جس میں ہو ایسے موضوعات سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔ الغرض تحقیق میں اسکالر کو موضوع کا انتخاب کرنے سے قبل تمام متذکرہ نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

سلسلہ ص ۴۲

کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ جس کی ایک نظیر یونیسکو اور یونیسیف ہے۔ لیکن سیاسی میدان، امن و سلامتی ہنوز اقوام متحدہ کے لئے ایک چیلنج ہے۔ خلیجی جنگ اور افغانستان میں اسے کامیابی حاصل ہوئی ہے، لیکن کئی ایک بین الاقوامی مسائل ایسے ہیں۔ جن کے لئے اقوام متحدہ کو مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆

سلسلہ ص ۴۸

جو ابھی اور نوے برس تک آزادی کا انتظار کرتا تھا اور اس کی قیمت چکا رہی تھی۔ ہمیں جو سبق جنگ آزادی نے دیئے وہ کچھ اس طرح ہے اتحاد محض نعروں کا ہی نہیں دلوں کا بھی ہونا چاہیے۔ دوست اور دشمن کے درمیان فرق کی تمیز ہونی چاہیے چھوٹے چھوٹے ذاتی فائدوں پر قومی مفادات کو ترجیح دینا چاہیے۔ جب یہ تکثیریت ... سوچ سے ہم آہنگ رکھنا اور ملک کے ہر فرد کو ترقی کی شاہراہ پر ہمراہ لے کر چلنا چاہیے۔

سیدہ مہر

مشاعرے ماضی و حال کی روشنی میں ...

آئے دن مشاعروں کی محفلیں سجتی ہیں۔ اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی لوگ آج بھی اسی طرح مشتاق ہیں جس طرح پہلے ہوا کرتے تھے۔

سچ پوچھا جائے تو مشاعروں کی تاریخ بڑی قدیم ہے جو ہمیں مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی طرف رجوع کرتی ہے۔ عرب قوم اپنی زبان آوری اور شعر گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ عربوں کی پُرگوئی کا یہ حال تھا کہ حرف تہجی کے ایک ہی حرف سے شروع ہونے والے کئی کئی قصائد کہہ جاتے۔ یہ شعرائے بازار عکاظ میں جمع ہو کر اپنا اپنا کلام سناتے۔ شعر کے حسن و قبح پر تنقید بھی ہوتی اس طرح وہ اپنی اس ودیعت کا اظہار کرتے جو مبدائے فیاض سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔

اردو میں مشاعروں کا باضابطہ تذکرہ مغل دور میں ملتا ہے شعرائے کی ایک کثیر تعداد اور ان کے دواوین اردو کا سرمایہ ہیں۔ دہلی لکھنؤ، لاہور اور حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کے اور بھی شہروں میں ادب کے شائقین موجود ہیں جو کے دم قدم سے یہ سارے شہر مشاعروں کا مرکز رہے۔ زیادہ تر مشاعروں کی محفلیں مخصوص ہوتیں اور عوام کی دسترس سے باہر ہوتیں۔ البتہ مقبول ہونے والی غزلیں پڑھنے اور سننے کو مل جاتیں جیسے غالب اور میر کا کلام لوگ بطور سوغات ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے۔ شائقین اسے سر آنکھوں پر رکھتے۔

مشاعرے منعقد ہونے سے پہلے بڑے اہتمام کئے جاتے طرح مصرعہ منتخب ہوتا۔ صدر مشاعرہ ایسی ہستی کو بنایا جاتا جو برگزیدہ بھی ہو اور دیگر شعراء ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے ہوں۔ شمع اُن ہی کے اختیار سے دیگر شعرائے کرام کے آگے رکھی جاتی۔ اچھے کلام پر دل کھول کر داد دی جاتی۔

الف ا ط ا ۱۱ اے کشش آفس ۔ ۲-۱۳۱-۲/۲/ بی وقارآباد۔ ضلع رنگا ریڈی (اے پی)

استاد شعراء کے شاگردوں کی کثیر تعداد اس کار خیر کے لئے شامل ہوا کرتی۔ کبھی کبھی تو دو استاد شعراء کے شاگردوں [illegible] نوک جھونک بھی ہو جاتی۔ سامعین صبر و استقلال سے طویل غزلیں مستزاد دو غزلے بلکہ [illegible] بھی سنتے نئے شعراء کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔

یہی حال درباروں اور امراء کی محفلوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ سامعین دم بہ خود رہتے جہاں مصلحت دیکھی داد دی۔ نئے شعراء کی ہمت افزائی کی جاتی مگر کلام کی خوبی ہر وقت مدِ نظر ہوتی۔ غرض کہ مشاعرے شعر فہمی و سخن سنجی کا بہترین ذریعہ تھے۔

موجودہ دور کے مشاعروں کے سلسلے میں علی سردار جعفری نے دور درشن بمبئی کے ایک مشاعرے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "آج سے ۱۰۰ برس پہلے اس قسم کے مشاعروں کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا جس کی ابتدا تالیوں سے ہو۔ اس عہد سے ذرا پیچھے چلے جائیں تو غالب، ذوق و مومن کا عہد تھا۔ اس زمانے میں مشاعروں کی شان یہ تھی کہ شاعر اور احباب جو سخن فہم ہوتے تھے ان ہی کو آنے کی اجازت تھی کوئی دوسرا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف تازہ کلام ہی پڑھا جاتا۔ پرانا کلام سنانے کی اجازت نہ تھی۔ جس شاعر کو کلام سنانا ہوتا اس کے آگے شمع لا کر رکھ دی جاتی۔ کبھی دو شمعیں ہوتیں ایک داہنی طرف اور ایک بائیں طرف تاکہ جدھر صدر مشاعرہ چاہیں کلام سنانے کی خواہش کریں۔ دوسری چیز یہ تھی کہ مشاعرے میں جو کامیاب ہو جاتا وہ ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے مشہور ہو جاتا۔ اب شمع کی جگہ مائک نے لے لی ہے۔ اور شعرا کے ساتھ سامعین ہر طرح کے ہیں۔ اس لئے کہ جمہوری عہد ہے لیکن آپ کے ذوق و شوق سے ہم یہ توقع ضرور کر سکتے ہیں کہ اگر شعر اچھا لگے تو یقیناً آپ کا شوق اور بڑھے گا اور اردو پڑھنے کا شوق بھی بڑھے گا ورنہ اس مزدور کی طرح جس نے مجروح سلطان پوری کا ایک شعر سگریٹ کی ڈبیہ پر لکھ لیا تھا۔

— جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق — خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا۔

اور ان سے پوچھا آبلہ پایانِ شوق کا کیا مطلب"۔

اس مختصر سی تقریر میں جعفری صاحب نے مشاعروں کی بڑی جامع تصویر کھینچی ہے۔

دور بدلتے رہے اور مشاعرے رنگ دکھاتے رہے لوگ سہل کلام ترنم کے ساتھ سننے کے مشتاق بنتے لگے۔ چنانچہ جن شاعروں کا لحن اچھا ہوتا ان شعراء نے شعر کہنے کے بعد مشقِ ترنم بھی شروع کر دی۔ اب محفلِ مشاعرہ فنِ موسیقی سے مربوط ہونے لگی۔ سامعین کی تعداد روز بہ روز بڑھنے لگی، کیونکہ مشاعرے مقبول ہونے لگے۔ لہٰذا صدر کے منصب جلیلہ کے ساتھ ساتھ ایک اور

عہدہ نظامت کا شروع کیا گیا۔ اس انتخاب پر بھی انہی ہستیوں کو مدِنظر رکھا جاتا ہے جو علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تاریخ پر بسیط معلومات رکھنے کے [illegible] زبان کی نفاست و نزاکت سے بخوبی واقف ہوں۔ موافق و مخالف ہر دو مطالب کے اشعار نوک زبان [illegible] ہوں، خاص طور پر عوام کی نفسیات سے واقف ہوں ناظم مشاعرہ اسٹیج پر کلام سنانے والے شعرا کا خوبصورت انداز میں تعارف کرواتا ہے۔ ان کے کلام سے اچھے اشعار کا انتخاب سناتا ہے۔ لطیفوں چٹکلوں اور واقعات کے بیان کے ذریعہ مشاعرے کو رنگ پر لاتا ہے کبھی دلچسپ نوک جھونک کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ اکثر ناظم مشاعرہ کی ذہانت سے بگڑتے مشاعرے بن جاتے ہیں، کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ ہوٹنگ کرنے والے سامعین کو اخلاقی درس دے کر کبھی مقامی لوگوں کی بلند حوصلگی اور مہمان نوازی کی تعریف کر کے نعرہ بازی کے نرغے سے نکال لاتا ہے۔ وہ اپنی خوش مزاجی اور موقعہ شناسی سے عوام کو قابو میں رکھتا ہے۔ برجستہ گوئی سے محفل میں جان ڈال دیتا ہے مگر کبھی کبھی یہ نوک جھونک اور لطیفہ گوئی رکاکت کے درجہ پر بھی اتر آتی ہے، جس کو کوکسی حیدرآبادی نے "بے لباس لطیفوں" سے تعبیر کیا ہے۔ اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں "آج سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے علی گڑھ کے مشاعروں کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ جو شاعر ڈائس سے کامیاب اترا وہ سارے ہندوستان کا مشہور شاعر ہوگیا" مگر آج اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی (صرف چند شعرا کو چھوڑ کر) کسی مشاعرے میں جو شاعر نہایت کامیاب رہا دوسرے کسی اور مشاعرے میں بری طرح ناکام ہو جاتا ہے۔ البتہ عوام کی نفسیات بھانپ کر کلام کا انتخاب کرنے والا شاعر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اور بار بار اسٹیج پر طلب کیا جاتا ہے۔

اکثر مشاعروں میں شرکت کرنے والے اصحاب کا مقصد سخن فہمی کی بجائے تفریح طبع ہوا کرتا ہے۔ شعر کی نزاکت سے جن کو دور کا بھی واسطہ نہیں وہ بھی بصد شوق بلکہ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لائٹ موڈ میں آنے والوں کو غور و خوض کی زحمت کہاں اٹھانی ہے۔ مخصوص مشاعروں کی نشستوں سے قطع نظر جہاں عوام الناس کی کثیر تعداد ہو، وہاں شعرا کا موقف کس قدر نازک ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ کر کے شعرا خود ہی ایسے کلام کا انتخاب کرتے ہیں جو پسندِ خاطرِ عوام الناس ہو۔

اگر ہر سال ہونے والے مشاعروں کی روئداد جمع کی جائے تو بیسوں واقعات ایسے "ملینگے جو پرلطف واقعات سے بھرپور ہوں گے۔ سامعین بار بار مقبول عام غزلوں اور نظموں کی جا و بے جا فرمائش کرتے ہیں، شاعر کو مجبوراً اپنا تازہ کلام

سنانے کے بجائے فرمائشی کلام سنانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے ۔

اورنگ آباد کے ٹاؤن ہال میں مخدوم اپنا کلام سنا رہے تھے مگر فرمائش ہو رہی تھی "چنبیلی کا منڈوا" آخر بار مان کر وہی نظم سنانی پڑی ۔ وجد سے ہر مشاعرے میں "رقاصہ" کی فرمائش ضرور کی جاتی، اسی طرح "موج و ساحل سے ملو" اور "کب تک میرے مولا" کی فرمائش تکرار سے ہونے لگی تو تنگ آکر شاذ نے کہا "یہ تو آپ کو وارثی صاحب سنائیں گے مجھ سے تازہ کلام سنیے "

غرض آج بڑے مشاعرے "تہذیبی جشن" ضرور بن گئے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اس بات کے متقاضی ہیں کہ شاعر کے کلام کو سمجھ کر داد دی جائے بے جا شور شرابے اور نادر رسائی کی بے داد سے پرہیز کیا جائے ۔ شاعر کے طوفانِ جگر سے آفریدہ مہ پاروں کو تحسین ناشناس کی بجائے ہر وقت داد دی جائے ۔ ہم سب کو اس بات کا احساس ہے کہ مشاعرے ہماری تہذیب کا عطر ہیں ۔ اردو کے اس زبوں حالی کے زمانے میں مشاعروں کے ذریعہ عوام الناس کی ایک بڑی تعداد مستفید ہوتی ہے اور نئے شعراء کی حوصلہ افزائی کے لئے مواقع فراہم ہو سکتے ہیں ۔

حالیہ دور میں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے مشاعرے بے حد کامیاب رہتے ہیں۔ سامعین سکون سے کلام سنکر محظوظ ہوتے ہیں ۔ اور شعرائے کرام اطمینان سے اپنا اپنا کلام سناتے ہیں یعنی سامعین سے داد ملتی ہے اور شعراء بیداد سے بچ جاتے ہیں ۔

سلسلہ صفحہ ۱۲ . . .

[illegible]

دوسرا طالب علم میں کامیابی کا جذبہ ٹھیک ہے اور محنت بھی اوسط ہے ۔ درجہ سوم یا دوم بہ ہر کامیاب ہے ۔ لیکن تیسرا طالب علم وہ ہے جس نے شدت کے پارہ کو ایک برس تک اسی سی کی ڈگری پر قائم رکھا، اسی لئے درجہ اوّل میں کامیاب ہوا ۔ اس کا مقصد بھی اونچا تھا اور جذبہ بھی بہت تھا اور طویل مدت تک وہ آئندہ زندگی میں کوئی معتبر مقام حاصل کر سکے رہے گا ۔ اس مثال میں ذہانت کے اعتبار سے ہم تینوں کو مساوی سمجھتے ہیں ۔

آپ کے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہوں گی ۔ ہمیں یہاں ایک بات پورے [illegible] سے کہنا ہے کہ "تعلیم ایک منصوبہ بند جد و جہد کا نتیجہ ہے" جو اس دلچسپی اور ولولے کو ایک [illegible] تک برقرار رکھنے سے حاصل ہوتی ہے ۔

ہماری آرزو ہے کہ ذاکر حسین تعلیمی فارمولا ہر گھر میں آویزاں ہو ۔ اور ہر طالب علم کی [illegible] کی زینت بنے ۔

سید زین العابدین

یوم اقوام متحدہ

۲۴ اکتوبر کا دن ساری دنیا میں یوم اقوام متحدہ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ اس ادارہ کا تاسیس کا دن ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں نازی حکومت کے خلاف دنیا بھر کے ممالک کے اتحاد کے نتیجہ میں ۴۳ سال قبل اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

سال ۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں صدر امریکہ فرانکلن ڈی روز ویلٹ اور وزیر اعظم برطانیہ ونسٹن چرچل کے درمیان بات چیت کے بعد عالمی امن اور باہمی اشتراک کے اصولوں کو قطعیت دی گئی اس بات چیت کے تقریباً دو سال بعد ۱۹۴۳ء میں ان قائدین نے دوبارہ تہران (ایران) میں وزیر اعظم روس جوزف اسٹالین سے بات چیت کی جس میں عالمی امن کے لئے ایک موثر و کارکرد ادارہ کی ضرورت ہے۔ اتفاق کیا گیا ۱۹۴۴ء میں واشنگٹن میں منعقدہ ایک کانفرنس میں اقوام متحدہ کا پہلا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا۔ امریکہ نے اس سلسلہ میں کلیدی رول ادا کیا۔ ان تینوں قائدین نے ۱۹۴۵ء میں یالٹا میں پھر ایک اجلاس منعقد کیا۔ اور اقوام متحدہ کے لئے ووٹنگ کے قواعد و طریقہ کار کو قطعیت دی۔ ۵ ممالک کے نمائندوں نے ملکر ۱۹۴۵ء میں سین فرانسسکو میں عالمی ادارہ کے لئے بنیادی منشور تیار کیا اس ادارہ کا بنیادی مقصد برقراری امن اور ناخواندگی' غربت امراض اور کہنہ بیماریوں کے خاتمہ کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنا ہے۔ سین فرانسسکو میں کافی غور و خوض کے بعد ماہرین نے منشور کے ابتدائی مسودہ کو قطعیت دی جسے ۲۹ ممالک نے تسلیم کیا

اقوام متحدہ کے اہم مقاصد میں عالمی امن و صیانت کی برقراری مختلف ممالک کے رابطہ تعلقات کو بہتر بنانا، عالمی سماجی معاشی و تہذیبی مسائل کے حل کی تلاش میں اشتراک اور انسانی حقوق و آزادی کا احترام اور پھر ان تمام عام مقاصد کے حصول میں ملکوں

اقدامات میں اشتراک وتعاون شامل ہیں۔

اقوام متحدہ کا ہیڈ کوارٹرس نیویارک (امریکہ) میں ہے۔ جنرل اسمبلی کی عمارت کا افتتاح ۱۹۵۲ء میں عمل میں آیا۔ جس میں ایک وسیع و عریض کانفرنس ہال اور ایک لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں ۴ لاکھ سے زائد کتابیں ہیں۔ اقوام متحدہ کی عمارت کی تعمیر کے لئے امریکہ نے ۶ ہزار ۵۰۰ ڈالرس کا عطیہ دیا تھا۔

اقوام متحدہ میں چھ زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جن میں چینی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، اطالوی اور عربی شامل ہیں۔ عربی کو ۱۹۷۳ء میں جنرل اسمبلی اور ۱۹۸۲ء میں قومی اسمبلی نے تسلیم کیا جبکہ مابقی مذکورہ زبانوں کو اس کے قیام سے استعمال کیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے تقریباً تمام ممالک رکن ہیں۔ جس میں مباحث ہوتے ہیں ہر رکن ملک اسمبلی کے لئے ۵ مندوبین یا چھ متبادل مندوبین روانہ کرسکتا ہے۔ ہر ملک کو ایک ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اہم مسائل مثلاً امن وسلامتی، نئے ارکان کا انتخاب بجٹ پر غور وخوض کی سفارش سے متعلق قرار دادوں کی منظوری کے لئے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے۔ دوسرے مسائل پر معمولی اکثریت کے ووٹوں سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ جنرل اسمبلی میں کسی کو حق تنسیخ حاصل نہیں ہے۔

جنرل اسمبلی کا اجلاس سال میں ایک بار باقاعدہ طور پر ستمبر کے تیسرے منگل سے شروع ہوتا ہے۔ اور جب کبھی ضرورت ہو اس کے خصوصی اجلاس بھی ہوتے ہیں۔ جنرل اسمبلی، صیانتی کونسل (سلامتی کونسل) کے ایجنڈہ سے ہٹ کر کسی بھی علاقہ کے کسی بھی مسئلہ پر بحث کرسکتی ہے۔ سلامتی کونسل جب کبھی امن واتحاد کی قرارداد کے تحت معمولی اکثریت سے سیاسی کارروائی کرنے سے قاصر رہتی ہے تو وہ یہ مسئلہ جنرل اسمبلی سے رجوع کردیتی ہے۔ جو مسئلہ سے نمٹتے ہوئے اپنی سفارشات پیش کرتی ہے۔

جنرل اسمبلی معاشی وسماجی کونسل اور ٹرسٹی کونسل کے رپورٹوں کے حصول کے بعد اپنی سفارشات پیش کرتی ہے۔ اس حیثیت سے جنرل اسمبلی سیاست قانون معاشیات سماجی بھلائی تعلیم وصحت اور انسانی حقوق پر بین الاقوامی [illegible] کا جائزہ لیتی ہے۔ اور پھر اپنے منصوبے تیار کرتی ہے۔

اس سلسلے میں عوام کے شکوک وشبہات کو بر وقت دور نہیں کیا گیا۔ ان کارتوسوں کو منہ سے کھولنے کا حکم منسوخ تو ہوگیا۔ مگر اس پر فوری عمل درآمد نہ ہوسکا۔ ان کارتوسوں کو ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے مذاہب سے محروم کرنے کی ایک سازش سمجھی اور اس طرح بغاوت کے پہلے آثار پیدا ہوئے جسے بری طرح کچل دیا گیا اور منگل پانڈے کو جس نے بیرک پور، بنگال میں سب سے پہلے پرچم بغاوت بلند کیا ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت تک خبر چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ سپاہی قید میں تھے۔ انہیں ان کی مرضی اور سمندر پار کرنے کے معاہدے کے خلاف برما کے محاذ پر جانے کے لئے سمندر پار جانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جو کہ قدامت پرست ہندوؤں کے لئے ایک "پاپ" کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور افغانوں کے ساتھ جنگ نے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا۔ جب کہ برطانوی فوج کے ہندوؤں کو قید ہو جانے پر افغانوں کے ذریعہ تبدیلی مذہب کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں سپاہیوں کو برطانوی وعدوں اور یقین دہانیوں پر کوئی اعتماد باقی نہ رہا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو غبارہ پھٹ گیا۔ میرٹھ کے سپاہیوں نے بغاوت کے بعد دلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جہاں کہ برطانوی توپوں اور افسروں کے سائے تلے بھارت کا نام نہاد فرمانروا رہتا تھا۔ اور مجبور کیا، نحیف وناتواں، کمزور اور اسلحہ سے زیادہ شاعری کی دنیا میں کم رہنے والے بہادر شاہ ظفر کو کہ وہ اس بغاوت میں سپاہیوں کی کمان سنبھالے۔ فوجی دستے لال قلعے میں گھس گئے۔ اور انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ان کے احکامات کے منتظر ہیں۔ اور فرنگیوں کی (سفید فام لوگوں کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا) قابل نفریں حکومت کا قلع قمع ہونا ہی چاہیے۔ اس پر بھی بہادر شاہ ظفر نے آگرہ کے برطانوی لیفٹیننٹ گورنر کو اپنی مدد کے لیے۔ اور سپاہیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے بلانے کی کوشش کی۔ آخر کار انہیں باغیوں کی مرضی کے آگے ہتیار ڈالنے ہی پڑے اور ایک جنگی مجلس شوریٰ تشکیل دی گئی۔ باغی برطانوی رجمنٹ کے ایک دیر صوبے دار بخت خاں کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ بہادر شاہ نے نظام وضبط برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ ان کی کوششیں بہت کارگر ثابت نہیں ہو سکیں گو کہ یکم اگست، بقرعید کے موقع پر انہوں نے گاؤکشی کی بھی ممانعت کی جس سے برطانوی حکمرانوں کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا ہو گی۔ جو کہ ان کے خلاف ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ جنگ کر رہے تھے۔ بغاوت ہر جگہ پھیل گئی خصوصاً شمال میں، جہاں کانپور میں پیشوا کے

نشین نانا صاحب کو باغیوں نے کمان سنبھالنے پر مجبور کیا۔ لکھنؤ میں جہاں انگریزوں نے واجد علی شاہ کے لڑکے برجیس قدر کو جو کہ کلکتہ میں انگریزوں کے تحفظ میں تھے اودھ کا بادشاہ بنا دیا اور آہستی ارادوں والی اس کی ماں حضرت محل نے پس پردہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالی۔ بنارس۔ الہ آباد (گونڈہ جو آج بہار میں دانا پور راجہاں ایک متمول زمیندار کنور سنگھ نے کمان سنبھالی) جھانسی جہاں باغی دستوں نے رانی لکشمی بائی کو قیادت سنبھالنے پر مجبور کیا۔ اور متعدد دیگر مقامات پر بغاوت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ تاہم جنوب متاثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حیدرآباد نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا لیکن وسطی بھارت اور بمبئی پریزیڈینسی میں متعدد مقامات پر بغاوتیں ہوئیں۔

تاہم، ہندوستانیوں کے پاس ایک منظم لائحہ عمل اور کامیاب منصوبہ کا فقدان تھا۔ میدان جنگ میں فوج کی قیادت بہادر شاہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اور تقریباً ۔۔ ہزار فوجیوں نے جن میں سے بیشتر برطانوی فوج میں رہ چکے تھے۔ اور انہیں اچھی تربیت ملی تھی۔ اور برطانوی فوجی حکمت عملی کا بھی علم تھا۔ لیکن اچھا قائد اور سپہ سالار نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے بالآخر ۹ ہزار یوروپی اور ان کے وفادار ہندوستانی سپاہیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ ستمبر کے وسط میں ہوا اور دلی کی ہزیمت نے ملک بھر میں ناامیدی کی لہر دوڑا دی اگرچہ کہ ۱۱ مئی کو باغی افواج کے دلی میں داخلے کے وقت عوام کے دل میں غیر ملکی اقتدار کے خاتمے کی شمع روشن ہو چکی تھی۔

برطانوی حکمرانوں کی پوزیشن بہتر۔ برطانوی افواج کے پاس نہ صرف اچھی تنظیم، نظم و ضبط، قیادت اور جنگ کی سائینس کی اچھی معلومات تھیں بلکہ ان کے پاس رسل و رسائل کی سہولت بھی تھی۔ جس کے ذریعہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی فوجوں کی کمک اور امدادی ساز و سامان پہنچا سکتے تھے یہاں تک کہ ان کے پاس برطانیہ سے کمک منگانے کی سہولت بھی تھی۔ بھارتی سپاہی فوجی حکمت عملی سے بالکل ناواقف تھے۔ اگرچہ وہ بہت بہادری کے ساتھ لڑے تاہم وہ انگریزوں کو دلی کی پہاڑیوں کے باہر نہ کھدیڑ سکے یہاں تک کہ وہ یہ احتیاطی اقدام بھی نہ کر سکے کہ وہ برطانوی فوج کو پنجاب سے حاصل ہونے والی کمک کو روک سکیں۔

بہت سے رجواڑوں نے بھی اس بغاوت کی کوئی حمایت نہیں کی اور جنہوں نے

اپنے علاقوں میں باغی افواج کی موجودگی سے مجبور ہو کر کچھ تعاون دیا بھی تو وہ در پردہ برطانیہ سے ملے رہے۔ تاہم عام ہندوستانی اس بغاوت میں پوری طرح شریک تھے۔ اس میں نہ صرف اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان شامل تھے جو اس سے قبل اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے بلکہ اس بغاوت میں سنتھال، بھیل، پاسی اور دیگر پسماندہ طبقوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اگرچہ برطانوی افواج میں سکھ بھی شامل تھے تاہم باغیوں کے ساتھ بھی سکھ تھے جو اپنے بھائیوں سے نبرد آزما تھے۔

یہ بغاوت کامیاب ضرور ہو سکتی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی بھارتی رجواڑوں اور نوابوں کی طرف سے برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کے منصوبے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور برطانوی فوج کے باغی سپاہی ہی اس جنگ کے دوران پیش پیش رہے۔ تاتیا ٹوپے جیسے صرف چند فرمانروا ہی آخر تک اس عظیم الشان مقصد کے لیئے ایک میدان جنگ سے دوسرے میدان جنگ تک برابر لڑتے رہے۔ ان میں فیض آباد کے مولوی احمد شاہ بھی تھے۔ جو برطانوی حکمرانوں کے خلاف مذہبی جذبے سے لڑے بخت خاں پہلے دلی میں لڑے اور پھر لکھنؤ پہنچ کر میدان جنگ میں شہید ہو گئے۔

ناکامی کے اسباب :- بغاوت اس لیئے کامیاب نہیں ہو سکی کہ ہندوستانیوں میں استحکام، اتحاد، ایک مخصوص منصوبہ عمل اور قیادت کی کمی تھی۔ اور وہ اپنی بہتر پوزیشن کا فائدہ اٹھانا نہیں جانتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی بجائے کوئی بھی دوسرا موثر حکمراں ہوتا تو یہ تحریک پورے ملک کی تحریک بن سکتی تھی اور اس نے انگریزوں کو کبھی کا نکال باہر کیا ہوتا۔ ہندو اور مسلمان دونوں انہیں اپنا قائد تسلیم کرنے کو تیار تھے۔ کانپور میں انہوں نے پیشوا کو اپنا سپہ سالار بنایا تھا۔ اور لکھنؤ میں انہوں نے اودھ کے شاہ ولی کی قیادت قبول کی تھی۔

جنگ آزادی سے برطانوی حکمرانوں نے چند سبق ضرور سیکھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہندوستانیوں کے جذبات اور روایات میں بالکل دخل نہ دینگے اور نہ ہی کسی مزید علاقے کا انضمام کرینگے۔ انگلینڈ کی ملکہ نے منافع کمانے والی کمپنی کی بجائے حکومت کی باگ ڈور سیدھے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان سب سے بڑھ کر انہوں نے یہ بھی سیکھا کہ اگر انہیں اپنی حکومت قائم رکھنی ہے۔ تو انہیں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنی ہوگی۔ باغیوں اور عوام پر ان کی زیادتیاں تو ختم ہو گئیں تاہم "مذہب" برطانوی حکومت کے نام پر بھارت کا استحصال برابر اسی طرح چلتا رہا۔ شاید اس لیئے کہ بھارت

باقی بر صفحہ ۳۵

خلیل احمد

جوہری جنگ کے اثرات

یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے مرکزی کردار ادا کیا ہے اور آئے دن انسان کو راحت پہنچانے کے لئے نت نئی ایجادات وجود میں آرہی ہیں۔ جس سے ہمارے معاشرہ کے ارتقاء میں کافی مدد مل رہی ہے۔ سائنس زندگی کے مختلف شعبہ جات۔ جیسے طب، انجینیرنگ، صنعت اور دفاع وغیرہ میں سرایت کرچکی ہے۔ لیکن اس کا یہ تعمیری پہلو جس قدر روشن اور خوش آئند ہے اس کا تخریبی پہلو اتنا ہی مہیب اور تاریک ہے جس کا اندازہ جوہری جنگ کے اثرات کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔

قدیم ہندوستانی اور یونانی فلاسفروں کا یقین تھا کہ ہر مادہ، شئے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کو جوہر یا ایٹم کا نام دیا گیا۔ انیسویں صدی میں J.J. THOMOSON، RUTHERFORD اور NEIL BOHR جیسے سائنسدانوں نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کرایا کہ جوہر الکٹران، پروٹان اور نیوٹران نامی ذرات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جوہری مرکزی حصہ پروٹان اور نیوٹران پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور الکٹران اس کے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ پروٹان اور نیوٹران سے کسی عنصر کے وزن کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جوہر میں غیر معمولی طاقت چھپی ہوئی ہوتی ہے جس کو پُرامن مقاصد یا پھر اس کو جوہری ہتھیار جیسے میزائل اور بم کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایٹم بم چند وزنی جوہروں میں انتشار پیدا کرکے بنایا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر اس مقصد کے لئے ہائیڈروجن اور لیتھیم (Lithium) جیسے کم وزنی عناصر کے جوہروں کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن آج تابکاری عناصر یورانیم یا پلوٹونیم سے تیار کئے جانے لگے ہیں۔ ایک عام جوہری بم بنانے میں کوئی ۱۰ کیلو گرام یورانیم یا پلوٹونیم دھات کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

* سائنٹسٹ، میڈیکل ریسرچ لیبوریٹری، حیدرآباد۔

جوہری بم ایک زبردست دھاکہ سے پھٹتا ہے جس سے بے شمار ننھے ذرات فضا میں بکھر جاتے ہیں۔ پہلے تو یہ ذرات ایک آگ کے گولے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ گولہ سوپر سانک رفتار سے پھٹتا ہے۔ جس سے فضا میں ایک سیاہ ٹکٹیف دھوئیں کا ہالہ نمودار ہوتا ہے۔ جس کو MUSHROOM یا غولہ بم کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ نیوکلیائی بادل ہے جس کے ذرات زمین پر گرد و غبار کی شکل میں گرتے ہیں۔ جس سے ہر جاندار اس کے زیر اثر ابدی نیند سو جاتا ہے۔ اس عمل کو انگریزی میں FALL OUT بھی کہتے ہیں۔ جوہری بم کے پھٹنے سے ماحول میں ناقابل برداشت گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فضا کا ٹمپریچر کوئی ایک کروڑ ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ جو سورج کی اندرونی تپش سے بھی بہت زیادہ ہے۔ ساتھ ہی فضا میں ہوا کا دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ درخت، پہاڑ، مکانات اور عمارتیں اس دباؤ کی شدت سے پھٹ جاتے ہیں۔ اس کے بعد انتہائی گرم طوفانی ہوائیں چلتی ہیں جن کی رفتار اوسطاً ۸۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے اور جو بھی جاندار ان ہواؤں کی لپیٹ میں آتا ہے نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

جوہری جنگ میں بم کا دھماکہ فضا یا پھر زمین پر کیا جا سکتا ہے جس کا انحصار تباہی اور بربادی کی وسعت پر ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے شہر کی آبادی۔ اس کے جغرافیائی حالات، مواصلاتی نظام اور غذائی ذخائر کی تعداد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بم کے فضا میں پھٹنے سے اس کا تخریبی دائرہ انتہائی وسیع ہو جاتا ہے۔ جب یہ زمین سے ڈیڑھ کیلو میٹر بلندی پر پھٹتا ہے تو فضا کا دباؤ نارمل سے ۹ گنا بڑھ جاتا ہے، اور آندھی کی رفتار ساڑھے سات سو کیلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جیسے جیسے یہ بلندی بڑھتی جاتی ہے۔ فضائی دباؤ اور آندھی کی رفتار میں بتدریج کمی واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۸ کیلو میٹر بلندی پر بم کے پھٹنے سے آندھی کی رفتار صرف ۵۵ کیلو میٹر ہوتی ہے اور ہوا کا دباؤ نارمل رہتا ہے۔ جوہری بم جب زمین پر پھٹتا ہے تو اس میں کئی سو فٹ کا غار پڑ جاتا ہے اور پانی ایک لخت بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر جوہری بم کا دھماکہ سمندر میں کیا جائے تو اس میں مد و جزر پیدا ہوں گے اور تمام سمندری جاندار ہلاک ہو جائیں گے۔

پہلا جوہری بم دوسری جنگ عظیم کے دوران ۶ ؍ اگسٹ ۱۹۴۵ء کو جاپانی شہر ہیروشیما پر کوئی ۵۵۰ میٹر کی بلندی سے گرایا گیا۔ اس شہر کی آبادی ۳ لاکھ تھی جس کے ۷۸ ہزار افراد فوراً لقمۂ اجل ہو گئے اور کوئی ۸۴ ہزار زخمی ہوئے جن میں اکثر

بینائی سے محروم ہوگئے اور ۶۰ ہزار مکانات منہدم ہوئے۔ لیکن یہ مکانات مقام حادثہ سے ۸ کیلومیٹر دور تھے انھیں جزوی نقصان پہنچا۔ ہیروشیما پر دھماکہ سے ہونے والی تباہی وبربادی کے ایک عینی شاہد نے یوں بیان کیا کہ پلک جھپکتے ہی لوگ راکھ کا ڈھیر بن جاتے تھے دریا، تالاب اور سوئمنگ میں پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ انھیں کھولتے ہوئے پانی میں غوطہ دے کر نکال لیا گیا ہو۔

دوسرا جوہری دھماکہ ۹/اگسٹ ۱۹۴۵ء کو یعنی اس کے تین دن بعد ہی جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر کیا گیا۔ یہ شہر بہت ہی چھوٹا پہاڑوں سے گھرا ہوا، صرف ۳ کیلومیٹر تک پھیلا ہوا تھا جس کی آبادی ۸۷ ہزار تھی یہاں اس دھماکہ سے کوئی ۴۷ ہزار لوگ جاں بحق ہوئے اور ۴۱ ہزار زخمی ہوئے۔ جاپان کے شہروں پر جو بم گرائے گئے وہ خام بم تھے جنکی طاقت ۱۲ ½ کیلو ٹن ڈائنامیٹ کے برابر تھی لیکن آج سائنس کی ترقی کی بدولت طاقتور جوہری ہتھیار بنانے میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ چنانچہ آج ۳ تا ۵ میگا ٹن قوت کے بم بنائے جانے لگے ہیں جن کے فضا میں پھٹنے سے ہزاروں میل کا رقبہ آن واحد میں آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اگر ایک میگا ٹن قوت کا بم گرایا جائے تو اس سے جو لرزہ خیز تباہی ہوگی اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی کویلو کا مکان مقام حادثہ سے آدھے کیلومیٹر پر واقع ہو تو اس مکان کی کویلو پگھل جائیگی دو میل کے فاصلے پر تمام مکانات، عمارتیں حتیٰ کے R.C.C کی پختہ بلڈنگیں زمین بوس ہوجائیں گی اور ۴ میل پر واقع ایک عام مکان بھی ڈھیر ہوجائے گا۔ غرض ۸ میل تک قیامت ہی قیامت ہوگی۔

جوہری دھماکے کے بعد اس کے تابکاری شعاعوں کے اثرات کئی سال تک انسانی صحت پر مرتب ہوں گے۔ یہ شعاعیں انسان کے لئے بہت ہی مضرت رساں ثابت ہوئے ہیں چنانچہ ان سے مہلک بیماریاں جیسے کے عدود کا کینسر، آنکھوں کا عارضہ اور جلدی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ نباتات اور حیوانات بھی ان شعاعوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جاپان کے شہروں پر جوہری بمباری کے بعد ہزاروں افراد تابکاری شعاعوں کے اثرات کی نذر ہوگئے۔ لوگوں کے سر کے بال گر گئے۔ ناک سے خون جاری ہوگیا، جلد کے عضلات پھٹ گئے، خون کی قے ہونے لگی۔ غرض عجیب وغریب بیماریوں میں مبتلا ہوکر سسک سسک کر دم توڑ دیئے۔ اور جو لوگ دور دراز مقامات پر سکونت پذیر تھے وہ دماغی تناؤ اور ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہوئے۔

جوہری جنگ کے بعد غذائی قلت کے باعث لاکھوں افراد فاقہ کشی کے سبب مرجائیں گے کیونکہ تمام غذائی ذخائر تابکاری اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اس کے علاوہ ایندھن کھاد اور زرعی ادویات اور بیج ختم ہو جائیں گے۔ زمین میں پیداوار کی صلاحیت کم ہو جائیگی جس کے نتیجہ میں زرعی پیداوار پر بہت زیادہ لاگت آئے گی۔ معاشی بحران پیدا ہوگا۔ موسم بدل جائیں گے۔ پانی کے ذخائر خشک ہو جائیں گے۔ بارش برائے نام ہوگی۔ سبزی، ترکاری پھل گوشت اور دودھ وغیرہ زہر آلود ہو جائیں گے۔ زرعی اور دیگر ترقیاتی پراجیکٹ بری طرح متاثر ہوں گے غرض قحط کے آثار پیدا ہو جائیں گے اور خاص بات یہ کہ ایسے حالات دھماکہ سے متاثرہ مقام تک ہی محدود نہیں رہیں گے بلکہ یہ زہریلے مادے اور تابکاری شعاعیں ہوا کے بہاؤ کے ساتھ ہر سمت میں پھیل جائیں گے۔ جن کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کسی بھی ملک کی دفاعی قوت کا پیمانہ صرف جوہری ہتھیار سازی بن گیا ہے۔ روس اور امریکہ عظیم جوہری طاقتیں تصور کی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ فرانس، برطانیہ اور چین بھی اس صف میں شامل ہیں لیکن ترقی پذیر ممالک کی بھی یہ کوشش ہے کہ وہ کسی بھی طرح جوہری طاقت بن جائیں۔ حالانکہ یہ اقدام ان کی معیشت کو بری طرح متاثر کرتا ہے اور ساری انسانیت کے لئے مستقبل میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جوہری جنگ کی ہولناکیوں کا اندازہ کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۸۲ء واشنگٹن میں نیشنل اکیڈمی آف میڈیکل سائنس اور سائنسی کمیٹی برائے ماحولیاتی آلودگی کے ادارہ کے سائنس دانوں نے ایک مباحثہ منعقد کیا جس میں مختلف ممالک کے کوئی دو سو سائنس دانوں نے حصہ لیا۔ اس مباحثہ میں جوہری جنگ سے انسانی صحت پر مرتب ہونے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اور آخر کار یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جوہری جنگ سے کروڑوں انسانوں کی موت ناگزیر ہے۔

جب تک جوہری ہتھیاروں کی یہ دوڑ چلتی رہے گی جنگ کا خطرہ ہم پر ہمیشہ مسلط رہے گا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے ممالک جوہری اسلحہ کی تیاری اور ان کے استعمال کی پابندی عائد کرنے کے لئے آپس میں کوئی ٹھوس معاہدہ کرلیں۔ ورنہ اس دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے نتیجہ میں ساری انسانیت کا روئے زمین سے خاتمہ ہو جائے گا۔

گیتا چاری

گنتار سے کمپیوٹر تک

انسان نے سب سے پہلے اشیاء کی گنتی کے لئے اپنے ہاتھ اور پیر کی انگلیوں کا استعمال کیا۔ پھر اسے زیادہ اشیاء کی گنتی کے لئے ان انگلیوں کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شروع میں انسان نے جانوروں کے شمار کے لئے پتھروں کا استعمال کیا۔ گنتی کے لئے پہلے آلے گنتار یہ کی تیاری چینیوں نے کی۔ یہ ایک مستطیل لکڑی کا فریم ہوتا ہے جس میں متوازی سلاخوں پر گولے ہوتے ہیں۔ اب نرسری کے بچے حساب کا بنیادی سبق سیکھنے کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں۔

گنتار سے اگلی منزل اسپیڈو میٹر تھی۔ اس سے جوڑنے اور ضرب دینے کے آلات کی تیاری کی راہ ہموار ہوئی۔ اگلی منزل جون نیپئر کی لوگارتھم ٹیبل تھی۔ جنھوں نے گنتی کے طریقوں کو آسان بنایا۔ سلائڈ رول نے بھی تیز گنتی میں سہولت پیدا کی۔ ۱۶۴۲ء میں اس کی جگہ حساب کی میکانکی مشینوں (میکانیکل کیلکولیٹر) نے لے لی۔ تیز رفتار اور پیچیدہ گنتی نے انسان کو مشینوں کی ایجاد کے لئے مجبور کر دیا۔

پہلی مشین

پہلی میکانکی حساب کی مشین فرانسیسی ریاضی داں بلیز پیکسل نے تیار کی۔ یہ مشین گیئر، پہیوں اور ڈائلوں پر مشتمل تھی۔ پہیوں کے دس حصے تھے۔ یہ اس اصول پر مبنی تھی کہ جب پہیہ ایک چکر پورا کر لیتا ہے تو دوسرا پہیہ صرف ایک حصہ ہی گھومتا ہے۔ اس حسابی مشین سے ان پہیوں کو گھما کر جوڑنے اور گھٹانے کا کام کیا جاسکتا تھا۔ جن پر ۰ سے ۹ تک نمبر تھے پاسکل کے اس کیلکولیٹر میں بعد میں جرمنی کے گوٹ فریڈ لیبنسز نے کچھ تبدیلیاں کیں۔

۱۸۲۲ء میں چارلس بیبیج نے "ڈفرینشل انجن" نام کی مشین تیار کی جو الجبرے اور

ریاضی کی تحقیقوں کا حساب ۲۰ ڈیسیمل تک لگا سکتی تھی۔ بیبیج کی مشین کو آج سپر کمپیوٹر کے مقابلے میں قدیم کمپیوٹر کہا جا سکتا ہے۔ بعد میں خودکار حساب کی مشین تیار کی گئی جو ۶۰ فی منٹ کی شرح پر جوڑنے کا کام بھی کر سکتی تھی۔ اور اس کی یادداشت بھی ہوتی تھی۔

حساب کی دنیا میں ایک اور ماہر امریکہ کے ڈاکٹر ہووی من ہولیرتھ تھے جنھوں نے موجود حسابی مشین کی صلاحیت اور بعد میں حساب کرنے کے لئے درمیانی نتائج کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت کا اضافہ کیا۔ اس طرح اعداد و شمار کی نقل کرنے اور انھیں دوبارہ درج کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اعداد و شمار کے عمل کو تسلسل کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ جو کارڈ کے ذریعہ از خود انجام پاتا ہے۔ کمپیوٹر کو اطلاع آج بھی کارڈ کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہے۔

ابتدائی کمپیوٹر

موجودہ تیسری دہائی کے آخر میں مختلف قسم کے کمپیوٹر تیار کئے گئے۔ لیکن یہ سب میکانکی مشینیں تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں بجلی سے چلنے والا ایک کمپیوٹر ہارورڈ یونیورسٹی میں لگایا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کمپیوٹر کی تیاری میں کافی بہتری آئی۔ عالمی جنگ کے بعد کمپیوٹر کی تیاری میں تیزی کا تعلق پانچ مختلف مرحلوں سے ہے جنھیں نسلیں کہہ سکتے ہیں۔

پہلی نسل کے کمپیوٹر

یہ کمپیوٹر ریڈیو جیسے والوں استعمال کرکے بنائے گئے تھے۔ اس نسل کا پہلا کمپیوٹر الیکٹرانک نیومیریکل انٹیگریٹر اور کیلکولیٹر تھا۔ یہ ایک سیکنڈ میں ۵۰۰۰ جوڑ اور ۳۵۰ ضرب دے سکتا تھا۔ پہلی نسل کے کمپیوٹر ضخیم تھے۔ اور ان کے کام کرنے کی رفتار سست تھی۔

دوسری نسل

ٹرانزسٹر کی ایجاد سے دوسری نسل کے کمپیوٹر کی شروعات ہوئی۔ ٹرانزسٹر سلیکان کے ٹکڑے سے بنی چھوٹی الیکٹرانک مشین ہوتی ہے۔ ان ٹرانزسٹروں کو چلانے کے لئے کم وولٹیج درکار ہوتا ہے جس سے چھوٹے کرنٹ کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ والو کی جگہ ٹرانزسٹر کے استعمال نے کمپیوٹر کے سائز اور تیاری پر آنے والی لاگت کو کم کر دیا۔

ا. ماہ شاداب حیدرآباد ... اکتوبر ۱۹۸۹ء

تیسری نسل

تیسری نسل کے کمپیوٹروں میں ٹرانزسٹروں کو دیگر اجزاء کے ساتھ چھوٹے پیکج میں سیل کر دیا گیا
بوط سرکٹ کے استعمال نے کمپیوٹر کے سائز کو مزید کم کر دیا۔ اس طرح کے کمپیوٹروں کو منی
پیوٹر کہا گیا۔

چوتھی نسل

تیسری نسل کے کمپیوٹروں میں مربوط سرکٹ سائز میں بڑے اور مہنگے تھے۔ سائنسدانوں کے
ہن میں یہ نیا خیال آیا کہ سیمی کنڈکٹر چپ کے ایک پیس پر کمپیوٹر کے تمام اجزاء کو رکھا جائے۔
ایک زبردست نظریاتی قدم تھا۔ اور ڈیزائن سے متعلق کوششوں کے بعد اس کے اچھے نتائج برآمد
ئے۔ ایسے مربوط سرکٹ کو جس میں کمپیوٹر سرکٹ کا نظام ایک سیمی کنڈکٹر چپ میں ہو مائکرو
وسیسر کہلاتا ہے۔ ان چپس کو مائکرو کمپیوٹر کہتے ہیں۔
جاپانیوں نے جیبی کیلکولیٹر کے حصول میں کامیابی حاصل کی جیسے آج ہم استعمال کرتے ہیں
ج کے جیبی کیلکولیٹر جاپانی مائکرو کمپیوٹر سے ہی بنے ہیں۔

پانچویں نسل

کمپیوٹروں کی پانچویں نسل کمپیوٹروں کی اعلیٰ نسل ہے۔ اس میں اطلاعات بھی جمع ہوتی ہیں اور
، سوچنے اور فیصلہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسانی ذہن کو پچھلے ہزار برسوں میں تیار شدہ
سب سے غیر معمولی کمپیوٹر سمجھا جاتا ہے۔ کیا مشین سوچ سکتی ہے؟ اس کی ذہانت کی نوعیت
کیا ہوگی؟ یہ سوالات ہمیشہ سائنسدانوں کو الجھاتے رہتے ہیں۔

مائکرو پروسیسر

مائکرو پروسیسر کی ایجاد نے انسان کو مصنوعی ذہانت کی تشکیل سے قریب کر دیا ہے۔ اب ایک
لیکٹرانک چپ ایک میزائل کی رہنمائی سے لے کر روٹی پکانے تک سب کام انجام دے سکتا ہے۔
سائنسدان انہیں "ڈمب پروڈنس" یعنی ایک مشین ہی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ صرف وہی کام انجام
دیتے ہیں جس کے لئے ان سے کہا جاتا ہے۔
ایک ... کی سوچ اور فیصلہ لینے کی صلاحیت اس بات پر مبنی ہوتی ہے کہ اگر یہ سچ ہے
... یا جھوٹ ہے یا سچائی کچھ اور ہے تو یہ کرو"۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی سے مثال لیں تو اگر

کوئی شخص ۲۵ برس کا ہے۔ اور اس نے سیاسیات یا سماجیات میں ایم اے کیا ہے۔ تو کمپیوٹر میں یہ آجائے گا کہ یہ شخص فلاں فلاں ملازمت کے لئے اہل ہے۔

سوچنے اور فیصلہ لینے کا کام بولین الجبرا کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ جس میں شمار کے نظام میں ۰ اور ا کے ہندسے ہوتے ہیں۔ مکائشین نے بولین الجبرا اور قوت و منطق کے درمیان ربط پیدا کیا ہے۔ کمپیوٹر سے فیصلے کرانے میں اسے موثر انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔

موجودہ دور کے کمپیوٹر سیریل پروسیسر ہیں کیونکہ ان میں مرحلہ وار کام ہوتا ہے۔ اور اگلے قدم کا فیصلہ پچھلے کے مطابق لیا جاتا ہے۔ جبکہ انسان میں سوچ کے دھارے متوازی بھی ہوتے ہیں۔

کمپیوٹر کی ذہانت

کمپیوٹر کی صلاحیتیں زبردست رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ جبکہ انسانی ذہانت کی پیش رفت اگر ہے تو بہت سست۔ مصنوعی ذہانت نے اپنی حالیہ پیش رفت سے صنعتی مفادات کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ وہ پیچیدہ کام انجام دینا ہے۔ جو انسانی مہارت سے منسوب تھا۔

زبان کی مصنوعی سمجھ اور بصارت کے معاملے میں بھی مصنوعی ذہانت کی اہمیت ہے۔ سائنسداں ایک عرصے سے ایسی مشین کا خواب دیکھتے رہے ہیں۔ جو انسانی آواز کو پہچان سکے اور اس پر اپنا ردعمل ظاہر کر سکے۔ برطانیہ میں آواز کی پہچان کی تحقیق کے پروگرام سے متعلق سائنسداں اسی خواب کو حقیقت بنا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک سیدھا سادہ نظام موجود ہے۔ لیکن اس سے آواز کی صحیح پہچان نہیں ہو پاتی آئی۔ بی۔ ایم کمپیوٹر نے ۵۰۰۰ الفاظ پر مشتمل ذخیرہ الفاظ کو سمجھنے میں ۹۵ فیصد صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

چہرے کا تجزیہ

کاروباری اور فوجی شعبے اور صحت و تعلیم کے میدان میں مصنوعی ذہانت کی تحقیق کے ذریعہ تشکیل کردہ تکنیکوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ایک ایسی تکنیک کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ جسے چہرے کے تجزیے، تقابل اور مسترد کرنے کا نظام کہا جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ کمپیوٹر میں گواہ کا بیان کردہ حلیہ مجرموں کی تصاویر کی پہچان کی جاتی ہے۔

۱۹۹۰ء تک بہت زیادہ ذہانت کی حامل مشینیں ہمارے بہترین ذہنوں کے اشتراک سے کام پائی مرتب ۶۳

شری ایس۔سی۔بھٹ

چار دہوں کے دوران صنعتی ترقی

نوآبادیاتی حکومت نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ بھارت میں صنعتی انقلاب نہ آنے پائے۔ مگر پھر بھی جمشید جی ٹاٹا جیسے عظیم رہنماؤں نے حوصلہ شکنی اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سرکاری کٹرپن کے خلاف جدوجہدی ۱۱۔ ملک میں صنعت کاری کی بنیاد رکھی۔ "وہ پہلے انہیں پن بنانے دو" ایک نوآبادیاتی افسر نے کہا، لیکن جمشید جی ٹاٹا نے فولاد کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ مانچسٹر لنکی ملوں سے آزادانہ طور پر درآمد شدہ کپڑے کا مقابلہ کرنے کے لیے بمبئی اور حیدرآباد میں نیز گجرات کے آس پاس کے علاقے میں سوتی کپڑے کی ملیں قائم کی گئیں۔

ایک نئے صنعت کار نے بمبئی میں موٹر گاڑیوں کا ایک کارخانہ، جنوب مشرقی ساحل پر وشاکھاپٹنم میں ایک بحری جہاز ساز کارخانہ اور جنوب میں بنگلور کے مقام پر ہوائی جہاز بنانے کا ایک کارخانہ لگایا۔ برطانوی حکمرانوں نے جو اس قسم کی ہمت و حوصلہ کو شبہہ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بنگلور کے کارخانے کو کافی کارآمد پایا۔ متعلقہ طاقتوں کو جنوب مشرقی ایشیا سے نکال دیا گیا تھا نیز مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں ان کی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ لہٰذا انہیں مشرق میں ہوائی جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کی سہولت کی سخت ضرورت تھی ہندوستان ایرکرافٹ (جو اب ہندوستان ایروناٹکس کہلاتا ہے) ایک ایسا کارخانہ تھا جس کی انہیں تلاش تھی۔

تحریک آزادی کے رہنماؤں نے ملک میں اقتصادی تبدیلی لانے کا تہیہ کر رکھا تھا جس کے لیے تیز رفتار صنعتی ترقی ایک اہم جز تھی کیونکہ صنعت کی بہت سی بنیادی

ضرورتوں میں ایک ملک کو خودکفیل بنایا تھا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ میں حصول آزادی کے بعد جدید بھارت کے معماروں اور بعد میں منصوبہ سازوں نے فولاد، کان کنی، مشین سازی اور انجینئرنگ جیسی بنیادی صنعتوں کی ترقی و فروغ پر زیادہ زور دیا۔ دراصل منصوبہ بند اقتصادی ترقی کے ابتدائی برسوں میں صنعت کا غلبہ تھا۔

صنعت کے مقابلے میں زراعت کو کم اہمیت دیئے جانے کا الزام ان لوگوں نے لگایا تھا جو اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ پانچ لاکھ دیہاتوں کی ترقی جو مہاتما گاندھی کو بہت ہی عزیز تھی۔ صنعت کاری پر زیادہ زور دے کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ الزام غیر ممالک میں رہنے والے ان لوگوں نے بھی لگایا جو اپنے اس خیال سے چھٹکارا نہیں پا سکے کہ اس ملک کو بنیادی طور پر زرعی ملک بنے رہنے پر ہی موقوف کر دیا گیا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زراعت اور صنعت کے درمیان صحیح توازن پر زور دیا گیا۔ خود زراعت کو صنعتی ترقی سے فائدہ پہنچا۔ مثال کے طور پر کیمیاوی کھادوں کو ہی لے لیجئے۔ دیگر صنعتوں کا تو ذکر ہی کیا کرنا جن سے زراعت کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ کھیتی باڑی کے نتیجے میں ملی گئی ترقی اور "سبز انقلاب" کی آمد کی وجہ سے مشینوں اور ساز و سامان کی مانگ میں جس کی سپلائی صرف جدید صنعت ہی کر سکتی ہے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں "صنعتی پالیسی کی بابت قرارداد" اپنائی گئی۔ تب سے ہی صنعت کاری کے شعبے میں ملک نے ترقی کی غرض سے عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔

تب سے لے کر گذشتہ چار دہوں کے دوران بھارت ایک بڑی صنعتی طاقت بن گیا ہے اور اپنی مجموعی صنعتی پیداوار کے مطابق دنیا کے پہلے دس ملکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ صنعتوں کی توسیع کے لیے سائنس اور تکنیکی ترقی کی [illegible] ترقی کی ضرورت ہوتی ہے اور [illegible] افرادی قوت کا ایک بڑا ذخیرہ [illegible] سائنس [illegible] اس شعبے میں بھارت کا شمار اب دنیا کی دو عظیم طاقتوں کے بعد تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔

گذشتہ چالیس برسوں سے بھارت میں صنعتی پیداوار کی شرح اضافہ ۹ فیصد یا

سے تھوڑا زیادہ رہی ہے اس کی وجہ سے خراب مانسونوں کے باعث ہوئی زراعت کی نقصانات کی تلافی ہوئی ہے اور اقتصادی ترقی کی مجموعی شرح یقینی طور سے مقصد سے تھوڑی زیادہ ہو گئی ہے۔ وسیع سرمایہ کاری کی بنیادوں صنعتیں قائم کی جا چکی ہیں نیز بنیادی اور بڑے سرمایہ دارانہ سامان کی صنعتوں میں بہت زیادہ خودکفالت حاصل کر لی گئی ہے۔

کوئی بھی ملک دوسرے ملک پر انحصار سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی فاضل پرزے اور دیگر اجزاء کا درآمد کرنا کم لاگتی معلوم ہوتا ہے۔ تجارت کے معاملے میں بہت سی مصنوعات کی مانگ اس کی تعداد، قیمت اور معیار کے مقابلے میں کافی بڑھ رہی ہے اور کئی معاملات میں ملکوں میں زبردست اضافے کی وجہ سے خودکفالت حاصل کرنے کا نشانہ پیچھے رہ جاتا ہے جیسا کہ کیمیاوی کھادوں کے معاملے میں ہوا ہے۔ تاہم کم و بیش ایک ایسا مرحلہ آ چکا ہے جہاں ہر بات صنعت لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتی ہے، علاوہ مزید صنعتی ترقی کے لئے بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کر سکتی ہے۔

یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ اس میں سب زیادہ آزادی کے بعد سے طور سے حاصل ہوئے ہیں جیسے منفرد انفرادی قوت کا ایک متوقع دور تیار ہو گیا ہے اس طرح صنعت کاری کو فروغ حاصل ہوا ہے اور صنعت کی منصوبہ بند ترقی کے برسوں میں صنعت کے دہائیوں اور تربیتی کالجوں کی ایک نئی نسل تیار ہو گئی ہے۔ بھارت کے صنعت کاروں نے عمارتوں، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر یا پھر دیگر پراجیکٹوں کے لئے دنیا بھر سے ٹھیکے حاصل کئے ہیں ان میں سے بہت سے اہم ٹھیکے یورپ کے ترقی یافتہ ممالک یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا جاپان سے سخت مقابلے میں حاصل کئے گئے ہیں۔

منصوبہ سازوں نے شروع سے ہی صنعتی ترقی کو یہیں تک ہی محدود نہ رکھا تھا اس ترقی کو نہ صرف ملک کو آگے لے جانے روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے اور اس کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک آلہ کار سمجھا گیا بلکہ اس کو کچھ سماجی و اقتصادی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بھی سمجھا گیا۔ ان مقاصد میں یہ امور شامل ہیں کہ صنعتوں کو علاقائی سطح پر پھیلا...

پسماندہ علاقوں کی اقتصادی ترقی میں مدد کرنا، میٹرو پولیٹن شہروں اور بڑے قصبوں پر دباؤ کو کم کرنا تاکہ گاؤں میں گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینا، بڑی صنعتوں میں اجارہ داری میں اضافے کو روکنا اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں اقتصادی طاقت آجانے کی روک تھام کرنا۔

اس زمانہ میں جبکہ منصوبہ بندی نہیں کی جاتی تھی صنعتی ترقی عام طور سے صرف ساحلی اور میٹرو پولیٹن شہروں تک ہی محدود تھی۔ اب پہلی بار فولاد کے کارخانے وسطی بھارت میں مدھیہ پردیش میں بھلائی، مشرقی بھارت میں روڑکیلا، جنوبی بھارت میں کرناٹک میں کدرے مکھ نیز وسطی بھارت میں بیلاڈیلا جیسے مقامات پر قائم کئے گئے ہیں حالانکہ بھلائی اور روڑکیلا کے قرب و جوار میں ہی کوئلہ اور خام لوہا موجود تھا لیکن سیکڑوں کلومیٹر کے رقبہ میں صنعتی ترقی کی کوئی گزشتہ تاریخ موجود نہیں ہے۔ یہ پراجیکٹ سرکاری سیکٹر کے تحت قائم کئے گئے ہیں لیکن بہت سی دیگر صنعتیں نجی ملکیت میں قائم ہوئی ہیں جس کے لئے صنعتوں کی ترقی و فروغ کی پالیسی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کیونکہ اس پالیسی کے تحت ہی نئے صنعت کاروں اور ایسے علاقے میں صنعتیں لگانے کے لئے ترغیبات دی جاتی ہیں جہاں پہلے سے کوئی صنعت قائم نہیں ہے۔

بھارت چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں اپنی کامیابیوں پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ملک کی تقریباً آدھی صنعتی پیداوار اب چھوٹے اور لا مرکزی شعبے سے حاصل ہوئی ہے اس شعبے کی ترقی اقتصادی ترغیبات [illegible] رعایتی شرحوں پر قرضے ریاستوں کے ذریعے ان کی مصنوعات کی خرید [illegible] دینے نیز چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی سروس کے اداروں اور صنعت کے ضلعی مرکزوں کے ذریعہ توسیعی سہولیات کے ایک ملک گیر نظام کی پالیسی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔

(۱) چھوٹی صنعتوں کی تعداد اب تقریباً ۱۲ لاکھ ہے اور یہ تقریباً ایک کروڑ لوگوں کو روزگار مہیا کرتی ہیں۔ ان صنعتوں کی سالانہ پیداوار کی کل مالیت ۶۱۱۶۰۰۰ لاکھ روپے سے زائد ہے اور ان کی برآمدات ملک کی کل برآمدات کا تقریباً ۲۲.۵ فیصد ہے (مذکورہ اعداد و شمار مارچ ۱۹۸۷ تک کے ہیں)

تقریباً ۸۶۳ مصنوعات کی تیاری کا کام چھوٹے پیمانے کے شعبے کے لئے

خصوصی ہے ان کارخانوں کو ایکسائز محصول میں رعایت دی جاتی ہے تاکہ وہ بھی
مقابلہ میں شریک ہو سکیں۔ ۱۵ لاکھ روپے کی مالیت کے کاروبار تک یہ صنعتیں
سیل ٹیکس سے مکمل طور سے مستثنیٰ ہیں اور ۲۵ لاکھ روپے کی مالیت کے کاروبار
سے کے لئے انہیں رعایتیں دی جاتی ہیں۔ چھوٹے کاروبار کو بینکنگ کے ریاستی
اداروں سے رقم حاصل کرنے میں ترجیح دی جاتی ہے۔

منصوبہ بندی کے ابتدائی دور سے ہی اور خاص طور پر صنعتی پالیسی کی قرارداد کے
تحت سرکاری دائرہ کار کے شعبے کو صنعتی ترقی میں ایک اعلیٰ مقام دیا گیا ہے اسی
لئے برطانوی حکومت سے ملک کو جو ریلوے نظام ملا تھا کیونکہ لندن کی کمپنیوں
نے جنھوں نے اس نظام کو دلی سرکار کی پوری پوری مدد سے قائم کیا تھا، اسے زیادہ
نافع بخش نہیں پایا تھا اور نو آبادیاتی انتظامیہ کو اس ریلوے نظام کو قومیا لئے
جانے پر مجبور کیا تھا مگر اب بھارتی ریلوے کو جدید ترین بنایا جا چکا ہے اور یہ
ملک میں سرکاری دائرہ کار کے شعبے کا سب سے بڑا حصہ بن گیا ہے۔

صنعتی بنیادی ڈھانچے کے دیگر پہلو مثلاً "بجلی کوئلہ اور تیل بھی سرکاری
کمپنیوں یا قانونی اداروں کی ملکیت میں ہیں جو بڑے نجی شعبے کی بھی خدمت کرتے
ہیں۔ فولاد کی تیاری اور کان کنی کے اہم شعبوں کو سرکاری دائرہ کار کے شعبے
کے تحت ترقی و فروغ دی گئی ہے اگرچہ فولاد کا کارخانہ جیسے جمشید جی ٹاٹا نے
قائم کیا تھا اور ان کے جانشینوں نے اسے وسعت دی اور جدید بنایا، ابھی
تک نجی شعبے کے تحت ہی ہے۔ یہ ضابطہ پرستی کے کچھ اشاریہ ہیں جو صنعت میں
سرکاری دائرہ کار کے شعبے کی تعمیر میں کارفرما ہیں۔ کیمیاوی کھاد، ادویہ
اور کیمیاوی اشیاء بڑی بڑی مشینوں کی تیاری، تیل کی صفائی اور اس کی
فروخت پیٹرو کیمیکلز کی صنعتیں سرکاری دائرہ کار کے شعبے کی بجائے صنعت
میں ساتھ ہی بڑھتا ہوا اور ترقی پذیر امداد باہمی کا شعبہ بھی ہے جس میں
چینی، کیمیاوی کھادیں، سوتے کی کتائی اور وسیع پیمانے پر بڑھتا ہوا
ڈیری کا کاروبار وغیرہ شامل ہیں۔

گزشتہ دو برسوں میں صنعتی ترقی کے شعبے میں نئی پیش قدمیاں دیکھنے میں
آئی ہیں جو حکومت نے عام طور سے صنعتی شعبے کو درپیش کچھ سخت مشکلات

کو دور کرنے کے سلسلے میں کی تھیں۔ گزشتہ برسوں میں نظم و نسق کے ایک طریقہ
اور قواعد و ضوابط کے ایک طریقہ کار کو فروغ دیا گیا ہے تاکہ بنیادی طور پر
صحیح سمت میں ترقی کی جائے اور فنڈز کا استعمال ٹھیک ڈھنگ سے کیا جائے۔
لیکن یہ نظم و نسق اور قواعد و ضوابط ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگے کیونکہ
ان سے ترقی کی رفتار میں کمی آنے لگی اور ان کی وجہ سے راستہ کی رکاوٹیں دور
نہیں ہو سکیں۔ نئی شروعات کا مقصد طریقوں کو آسان بنانا، پالیسی کو معقول
بنانا اور اس کی از سر نو تشکیل کرنا، متعدد صنعتوں کو لائسنس سے مستثنیٰ کرنا،
صلاحیت میں اضافہ کرنے اور ٹکنالوجی کی ترقی کے بیچ رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔
ٹکنالوجی اور ساز و سامان کی درآمدات پر لگائی گئی پابندیوں میں نرمی کی گئی
تاکہ ٹکنالوجی اور ساز و سامان [illegible] سے ان مقاصد کے حصول میں مدد ملے۔ ان
کارخانوں کو جو اپنی صلاحیت کا استعمال کر رہے تھے اپنی پیداوار میں اضافہ کرنے کی
اجازت دی گئی اور اگر یہ کارخانے [illegible] منصوبے حاصل کر لیتے تھے تو ان کو اپنی پیداوار
میں مزید اضافہ کی بھی اجازت دی جاتی تھی۔ پیداوار میں اضافے نے اس پالیسی
کو حقیقی بنا دیا تھا کہ کامیاب یونٹیں پیداوار کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیت
کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اور نئے لائسنسوں کے لیے انہیں قطار میں لگنے کی ضرورت
نہیں ہے۔

پالیسی کو آسان بنانے کے ان اقدامات کا نتیجہ اچھا رہا ہے۔ بہرحال گزشتہ
چند برسوں میں ریکارڈ کی گئی زیادہ پیداوار جس کا آٹھ فیصد یا اس
سے زائد شرح ترقی سے ظاہر ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ نظم
ضبط میں نرمی اور آزادی سے درآمدات کی سہولیات کی وجہ سے [illegible]
طور پر صنعتوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

ساتواں پنجسالہ منصوبہ (اپریل ۱۹۸۵ء سے مارچ ۱۹۹۰ء تک) میں
بجا طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بھارتی صنعتیں پہلے سے تیار شدہ [illegible]
کو استعمال کریں، لاگت کم کریں اور معیار کو بہتر بنائیں۔ ان صنعتوں کی
ترجیح دئے جانے کی غرض سے نشاندہی کی گئی ہے کیونکہ ان ہی صنعتوں سے
[illegible] یونٹ اور ناکامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ سماجی انصاف [illegible]

میں ہمارا اصل مقصد ہے مگر تیار شدہ صلاحیتوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے پالیسی سے نئے اقدامات، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ان ہی مقاصد سے متعلق ہیں۔

شرح ترقی کا نشانہ سالانہ سالانہ کے لحاظ سے ۸ فیصد مقرر کیا گیا ہے اور ساتویں منصوبہ کے ابتدائی برسوں میں یہ نشانہ حاصل کیا جا چکا ہے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پورے منصوبہ میں یہ شرح ترقی حاصل نہ کی جا سکے۔ ٹکنالوجی کی ترقی اور جدید کاری کو اعلیٰ شرح ترقی اور مجموعی طور پر صنعتی ترقی کے لیے جد و جہد میں ایک آلہ کار سمجھا جاتا ہے۔ نئی ٹکنالوجیاں ایک ایسی آلہ کار ہیں جن کی مدد سے زیادہ سے زیادہ صلاحیت کے نشانے کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ ٹکنالوجی پر زور خصوصی طور سے الیکٹرانکس کے شعبے میں دیا گیا ہے۔ اس شعبے میں گزشتہ دو برسوں میں شرح ترقی ۴۰ فیصد رہی۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں تقریباً ۱۳۸۰۰۰ لاکھ روپے کی مالیت کا الکٹرانکس ساز و سامان تیار کیا گیا جس کی مالیت ۸۶-۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۲۸۸۰۰۰ لاکھ روپے ہو گئی۔ نتیجتاً بہت سی چیزوں کی قیمتوں میں زبردست کمی آئی۔ کمپیوٹروں کی قیمت میں ۵۰ فیصد کی کمی آئی اور ٹیلی ویژن سیٹوں کی قیمتوں میں بھی کچھ کمی واقع ہوئی۔ [illegible] اہم شعبوں مثلاً [illegible] تیل، بجلی، مواصلات وغیرہ کی صنعتوں میں [illegible] کو مد نظر رکھتے ہوئے الکٹرانکس کی صنعت پر خصوصی توجہ دی گئی اور اس کے نتائج سب کے سامنے نمایاں ہیں۔

٭ ٭ ٭

بسلسلہ صفحہ ۵۶

کرے گی۔ انسان کے ذہن کی پیداوار یہ مشین بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے اس دور میں انسان کے لئے بے حد معاون ہوگی۔ برطانیہ میں کمپیوٹر کے ذریعہ کام کرنے والی لائبریری نے بہت سے ممالک کی توجہ اپنی جانب مرکوز کی ہے۔ اس کے ذریعہ کتابوں کے لیے آرڈر دیا جا سکتا ہے۔ اور بہت سی غیر ملکی کرنسیوں کی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔ یہ کمپیوٹر آرڈر کی تکمیل نہ ہونے کی حالت میں یاد دہانی کراتا ہے۔ اور کتابوں کے لین دین کی بھی پوری طرح سے خبر رکھتا ہے۔ ٭٭٭

سچی کسوٹی

گاندھی جی نے کہا تھا "جب کبھی آپ کسی شک کی حالت میں ہوں ... تو کسی ایسے کنگال ترین اور انتہائی بے بس انسان کے چہرے کی کیفیت یاد کیجئے، جسے آپ نے دیکھا ہو، اور پھر خود سے سوال کیجئے کہ جو کام آپ کرنے کی سوچ رہے ہیں، کیا اس سے اسے کوئی فائدہ پہنچے گا؟ کیا اس کی بدولت اس کی اپنی زندگی اور تقدیر پھر سے اس کے اختیار میں ہو جائے گی؟"
گاندھی جی کے رائے میں فقط یہی کسوٹی ہمارے منصوبوں اور پروگراموں کو با مقصد بنا سکتی ہے۔



ج ۵ ش ۱۱

نومبر ۱۹۸۸ء

ماہنامہ شاداب

قیمت فی پرچہ 5 روپے

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

مینجنگ ایڈیٹر
نعیم جوہر شادیہ

مجلس مشاورت

زر تعاون

	ہندوستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	سو روپئے	150 روپئے	35 ڈالر	20 پونڈ	125 پاکستانی روپئے
	90 روپئے	450 روپئے	65 ڈالر	26 پونڈ	[illegible]
	1000 روپئے	1000 روپئے	500 ڈالر	300 پونڈ	[illegible]

زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب [illegible]

پرنٹر، پبلیشر محمد قمر الدین صابری نے [illegible] سے چھپوا کر دفتر شاداب 147-5-11، ریڈ ہلز، حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو جب آندھرا پردیش کی ریاست کا آندھرا، تلنگانہ اور رائلسیما کے علاقوں کے انضمام کے ساتھ [illegible] عمل میں لایا گیا تھا [illegible] کے دو علاقوں تلنگانہ اور رائلسیما میں اردو کا ایک خاص حلقہ تھا خصوصاً علاقہ تلنگانہ [illegible] اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی کہلاتی تھی۔ اسی لئے اردو والوں [illegible] اور وسیع ریاست میں اردو کو اس کا مستحق مقام [illegible] آندھرا پردیش کے پہلے وزیر اعلیٰ [illegible] (جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند بھی بنے) [illegible] اردو کو آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ پہلے چند سال تک اس پر بڑی حد تک عمل بھی ہوتا رہا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس میں ڈھیل آتی گئی۔ تلگو دیشم حکومت [illegible] اور تیر [illegible] اردو [illegible] حاصل مراعات [illegible] رفتہ رفتہ [illegible] جاری [illegible] وقتاً فوقتاً [illegible] حال ہی میں یہ اعلان کیا گیا کہ [illegible] نومبر ۱۹۸۶ء سے [illegible] حکومت [illegible] اخبارات [illegible] میں [illegible] کئے جائیں گے۔ اس [illegible] تلگو ریاست کی سرکاری زبان [illegible] تیزی [illegible] کسی دوسری زبان کی بنیاد [illegible] بلکہ کسی دوسری [illegible] کے باوجود ایک نئی عمارت [illegible] حکومت اور اس کی پارٹی کو بہت سی شکایتیں اور بدگمانیاں [illegible] نہیں [illegible] خلیج بڑھتی [illegible] کی [illegible] کیا گیا جیسا [illegible] کیا گیا

ریاست آندھرا پردیش [illegible]

کہ اتنی بڑی تعداد کو ناراض رکھ کر تلگو دیشم کس طرح اس ریاست پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر سکتی ہے، کیونکہ کسی جمہوری حکومت کی اچھائی کی پہچان یہ ہے کہ وہاں کی اقلیت اس سے مطمئن ہوں۔ اُردو بولنے والے اس ریاست کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور اسے بہر حال مطمئن کرنا ہی ہوگا ورنہ ایک بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ موجودہ حکومت نے اُردو کے ساتھ جو سوتیلی ماں کا سا سلوک روا رکھا ہے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کو لیجیے کہ برسہا برس سے ریاست اندھرا پردیش کا جو رسالہ اسی نام سے اُردو میں نکل رہا تھا اسے بغیر کوئی وجہ بتائے بند کر دیا گیا ہے۔ محکمہ اطلاعات سے جو اشتہارات اُردو اخباروں اور رسالوں کو جاری کئے جاتے تھے وہ بند کر دیئے گئے۔

ریاست میں اُردو کے سب سے بڑے ادارہ اُردو اکیڈمی کا حال تو سب پر عیاں ہے۔ حد یہ ہے کہ کئی ماہ سے اس کی کوئی باڈی ہی نہیں، صرف عملہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تنخواہیں پا رہا ہے۔ جب اس کی باڈی موجود تھی اس زمانے میں بھی اس اکیڈمی نے کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے۔

اندھرا پردیش اُردو اکیڈمی سے سارے ہندوستان میں اُردو والوں کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، لیکن افسوس کہ یہ پوری نہ ہو سکیں۔ چھوٹی چھوٹی غیر اُردو داں ریاستوں کی اُردو اکیڈمیاں جو بہت بعد میں قائم ہوئیں اپنی کارکردگی میں اس سے کہیں آگے نکل گئیں۔

اُردو تعلیم اور اُردو مدارس کا حال تو اور بھی بُرا ہے۔ حکومت نے اُردو جماعتوں میں کم از کم ۱۵ طلباء کی شرط عائد کی ہے جب کہ بہت سے مقامات پر (خصوصاً دیہی علاقوں میں) اتنی تعداد میسّر نہیں آ سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر اُردو تعلیم کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ کسی بھی قوم کی نئی نسل جب کسی زبان کا مطالعہ نہیں کر سکتی تو وہ زبان کس طرح آگے بڑھ سکتی ہے اور کب تک زندہ رہ سکتی ہے۔ آج یہ بات ہم سب کے سوچنے کی ہے۔ آندھرا پردیش میں اُردو پر اتنا برا وقت آئے گا یہ ہم نے کبھی سوچا نہ تھا۔ یہ ہم سب کا مشترکہ المیہ ہے اور اس صورتِ حال کو باہمی اتحاد، اتفاق اور کوشش کے ذریعہ ہی بدلا جا سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُردو کے تعلق سے اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں اور حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ اس زبان کی تعلیم، ترویج و اشاعت بھی اس کا فرض ہے۔ ہمیں تلگو سے کوئی پرخاش نہیں لیکن ہم اُردو کا حق کھوتا نہیں دیکھ سکتے۔ آپ اس بارے میں کیا کر رہے ہیں؟

● ● ● ● ● ● ●

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جنرل محمد ضیاالحق شہید

کچھ باتیں ، کچھ یادیں

جو لوگ راقم سطور کے افتادِ طبع، مذاق و مزاج، مشاغل اور خاندانی روایات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کا حلقۂ تعارف و احباب، اور دائرہ کار علمی اور فکری اور دعوتی و اصلاحی حلقوں تک محدود رہا ہے، وہ عالم اسلام کے حالات پر اثر ڈالنے والے واقعات سے گہرے تعلق و تاثر، ممالک اسلامیہ اور خود اپنے ملک کی لائق قدر اور قابل احترام شخصیتوں کی پوری قدر شناسی اور احترام کے ساتھ ان سے ایک ایسا محدود و محتاط علاقہ اور ربط رکھتا ہے، جو اس کے علمی و تصنیفی مشاغل پر اثر انداز نہ ہونے پائے، اور اس کو ان کے فیصلوں اور رویہ اور طرز کار میں شریک و ذمہ دار اور جواب دہ نہ بنادے عرصہ سے اس کا عقیدہ اور عمل علامہ اقبال کے اس شعر پر ہے۔ ؎

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

سربراہانِ مملکت اور اپنے ملکوں کے صاحب اقتدار اور صاحب اختیار شخصیتوں میں سے صرف شاہ فیصل شہید مرحوم (والی مملکت عربیہ سعودیہ) کا استثناء کیا جاسکتا ہے۔ جن سے حجاز یا حرمین شریفین اور اس سب سے بڑی عربی اسلامی مملکت کے سربراہ اور ذمہ دار ہونے کی بناء پر جو عالم اسلام کا قلب، بلد امین اور مہبط وحی ہے اس کی اسلام سے نہ صرف وابستگی بلکہ اس کی تعلیمات و اثرات کا نمائندہ اور داعی و ترجمان ہونا قرار دی ہے۔ اور وہاں کی صورت حال عالم اسلام کے لئے مقیاس الحرارۃ والبرودۃ (بیرومیٹر) کی حیثیت رکھتی ہے۔ راقم سطور نے ان کی ولی عہدی اور وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں ان سے ملاقات کی اور ان

کو سرزمین مقدس پر اثر انداز ہونے والے بعض واقعات منصوبہ بندی اور تعلیم و تربیت کے بعض پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا اور باہمی اعتماد و احترا[م] کی فضا میں ان سے تخلیہ میں گفتگو کی۔ سربراہ مملکت ہو جانے کے بعد متعدد ان سے نجی طور پر ملاقاتیں اور گفتگو ہوئی، لیکن یہ گفتگو ہمیشہ خود انہیں ملک کے حالات، ضروریات، حال و مستقبل اور اداروں اور شعبوں تک محدود رہتی ہے، انہوں نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور اس کی قدر کی کہ ملاقاتوں سے نہ اپنے لئے ذاتی طور پر نہ کسی تعلق رکھنے والے ادارہ یا منصوبہ کے سلسلہ میں اجتماعی طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، انہوں اپنی خداداد ذہانت سے (جس میں مشکل ہی سے ان کی مثال ملے گی) اس بڑی قدر کی، اور بعض اوقات جب میری طرف سے ملاقات کے لئے وقت حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی تھی، ان کی طرف سے ملاقات کا اشارہ ہوتا

اس محتاط طرز عمل کا سبب سے بڑا (منظاہرہ) پاکستان کے صاحب اقتدار اور ذمہ داروں کے معاملہ میں ہوا۔ قیام پاکستان ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک جب کہ مختلف ضرورتوں سے جن میں سب سے بڑا محرک اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کا لاہور میں طویل قیام اور مریدانہ استفادہ اور صحبت وہاں کا سفر اور ہفتوں قیام تھا) نیز اس بنا پر کہ خاندان کا تقریباً دو تہائی حصہ پاکستان میں سکونت پذیر تھا، بارہا پاکستان کا سفر ہوا اس تیس سال کے عرصے میں صدر مملکت اور وزیر اعظم تو ایک طرف پاک[ستان] کسی وزیر یا ذمہ دار حکومت سے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی گئی، نہ ادھر تحریک ہوئی۔ خدا کو یہ منظور نہ تھا کہ زندگی کا یہ آئین اور یہ مسلسل روایت پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے معاملہ میں ٹوٹ جائے

اس کی تقریب یہ پیش آئی کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے اس مجلس تاسیسی کا میں روز اول سے رکن ہوں) جون ۱۹۷۸ء کے آخر میں کراچی میں اپنی ایشیائی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ اور اعلان ہوا۔ یہ کانفرنس ۱۹۷۸ء سے منعقد ہو رہی تھی، میں اس زمانہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ کی کمیٹی میں شرکت کی وجہ سے حجاز ہی میں تھا، میری اس کانفرنس

طرح سے قرین قیاس تھی، اور رابطہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے اس کے لیے اصرار تھا، میں عزیز گرامی مولوی محمد معین اللہ صاحب ندوی کی معیت میں جو میرے رفیق سفر تھے، ۵ رجولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی کے لئے روانہ ہوا۔ ہندوستان سے رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے علاوہ جو رابطہ کے مجلس تاسیسی کے رکن ہیں، میرے دو عزیز رفیق برادرزادہ عزیز سید محمد الحسنی مرحوم "مدیر البعث الاسلامی" اور مولوی اسحاق جلیس ندوی مرحوم "مدیر تعمیر حیات" کو بھی مدعو کیا گیا تھا، ہندوستان کا ایک موقر وفد بھی کانفرنس میں شریک تھا، کانفرنس کی صدارت میزبان ملک کے ایک موقرہ نمائندہ جناب اے۔ کے بروہی صاحب (جو اس وقت وزیر قانون اسلامی امور اور جنرل محمد ضیاء الحق کے خاص معتمد اور مشیر قانونی تھے) کر رہے تھے، نائب صدر کے طور پر راقم سطور اور انڈونیشیا کے نمائندہ ڈاکٹر رشدی اور فلپائن کے ابوبکر صاحب کا انتخاب ہوا۔

جنرل صاحب نے کانفرنس کا افتتاح کیا، عالم اسلام کے مختلف حصوں سے موقر شخصیتیں اور مجلس تاسیسی کے تقریباً تمام اہم ارکان شریک اجلاس تھے، صدر اجلاس اے۔ کے بروہی صاحب سے میرا تعارف حجاز کی اس عالمی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے موقعہ پر ہوا تھا جو اس سے کچھ ہی پیشتر مکہ معظمہ میں منعقد ہوئی تھی۔ انھوں نے میری بعض تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا تھا، بروہی صاحب ہی نے جنرل صاحب سے کانفرنس کے اختتام پر ملاقات کا وقت مقرر کیا، جنرل صاحب سے کسی نے اس سے پہلے میرا تعارف کرا دیا تھا، اور ان کو حضرت سید احمد شہید سے میرے خاندانی تعلق کا علم تھا، بروہی صاحب نے جنرل صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا، کہ مولانا نے میری درخواست پر مجھے وہ دعا تلقین کی جو ان کی والدہ صاحبہ نے ان کو سکھائی تھی اس کے الفاظ ہیں،

اللّٰھم اجعلنی بفضلک افضل ما تؤتی عبادک الصالحین ○

(اے اللہ مجھے اپنے فضل سے وہ بہتر سے بہتر شئے عطا فرما جو اپنے نیک بندوں کو عطا فرمایا کرتا ہے) بروہی صاحب نے کہا کہ مجھے بہت سے بزرگوں نے مختلف وقتوں میں مختلف دعائیں اور اذکار بتلائے لیکن اس دعا نے میرے دل کو پکڑ لیا۔ اور مجھ پر حاوی ہوگئی، اس پر جنرل صاحب نے فرمایا کہ میری والدہ بھی میرے

لئے بڑی دعائیں اور مجھے خدمت اسلام کی تلقین کرتی تھیں، اور ان کی تمنا تھی کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے کام آؤں، آپ مجھے بھی کوئی دعا بتایئے جس کا میں ورد رکھوں" راقم نے عرض کیا کہ آپ درود شریف ہی کو مضبوط پکڑ لیجئے، یہی سب ضرورتوں کے لئے کافی ہے، مجھے حال میں معلوم ہوا کہ جنرل صاحب نے درود شریف کا اپنی زندگی میں خاص اہتمام کیا، مدینہ طیبہ ان کی حاضری، مسجد نبوی میں نماز اور مواجہہ شریف میں بڑے ذوق و اہتمام کے ساتھ سلام پیش کرنا اور اتنی دیر تک وہاں ٹھہرنا کہ سرکاری طور پر حفاظتی انتظامات کے ذمہ داروں کو مشکل پیش آجاتی اور وہ درخواست کرتے کہ اب آپ اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلیں۔ لیکن وہ وہاں ٹھہرنے پر اصرار کرتے، یہ واقعات میں نے مدینہ طیبہ کی حاضری پر ذوق و شوق احباب سے بار بار سنے ہیں، میں نے اس مجلس میں حجاز مقدس، حرمین شریفین کے بارے میں (سب سے بڑی اسلامی مملکت کے صدر اور تاجدار افواج اور مسلمان سپاہی کی حیثیت سے) ان کو اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھنے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنی خدمات اور مساعی صرف کر دینے کی طرف بھی متوجہ کیا، جس کو انہوں نے بہت توجہ اور مسرت کے ساتھ سنا، مجھے اس پوری مجلس میں یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک صاحب ایمان، مسلمان سپاہی اور ایک مسلمان سربراہ مملکت سے گفتگو کر رہا ہوں۔ جس کا ایسا احساس مجھے متعدد ذمہ دار اور صاحب اقتدار شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگو کرتے میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

۱۹۷۶ء کے اسی سفر میں اسلام آباد میں صدر کے محل میں میری ان سے دوسری ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں صرف جسٹس افضل چیمہ صاحب موجود تھے، جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے پاکستانی دفتر کے انچارج منتخب ہوئے، اس وقت وہ مجلس قوانین اسلامی کے صدر و ذمہ دار تھے، جنرل صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں میں نے کہا کہ سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان سے اچھے تعلق رکھیں، تاکہ ہم اطمینان سے معتدل اور پرسکون ماحول میں اپنے تع و تعلیمی و رفاہی کام انجام دے سکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بالکل یہی میرا ک

دیا ہے، اور میری اس سلسلہ میں مرارجی ڈیسائی سے (جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے) ٹیلی فون پر گفتگو ہوتی رہتی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ یہاں لوگ جذباتی بہت ہیں ان کے بعد کے مسلسل طرز عمل نے (جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رکھا) ثابت کر دیا کہ وہ اس اُصول اور طریق کار کے سختی سے پابند ہیں اور نازک موقعوں پر بھی انہوں دماغی توازن، ضبط نفس اور حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑا۔

جنرل صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رح کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے ان کے آبائی وطن قصبہ ڈھڈیاں ضلع سرگودھا جا رہا ہوں (مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان کے والد صاحب کا بھی حضرت سے بیعت و ارشاد کا تعلق ہے جس کی مجھے تحقیق نہیں ہو سکی) تو انہوں نے چیمہ صاحب کو اشارہ کیا وہ میرے لیے سرگودھا جانے کے لیے خصوصی ہوائی انتظام کر دیں۔ میں نے مصلحتاً اس کو منظور نہیں کیا، اور بطور خود ٹرین کے ذریعہ سرگودھا کا سفر کیا۔

۱۹۷۸ء کی ان دو ملاقاتوں کے بعد سے میرا جنرل صاحب سے نہ ملنا ہوا نہ کوئی رابطہ قائم ہوا، غالباً ۸۵ یا ۸۶ میں انہوں نے استاد محترم علامہ سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب سیرت النبیؐ کے ساتویں حصہ کا مطالعہ کیا جو معاملات اور اسلام کے نظام حکومت اور سیاست پر ہے، اور جو مختصر ہونے کے باوجود بڑی فکر انگیز، کتاب و سنت، عہد خلافت راشدہ، تاریخ اور طریقہائے حکومت کے وسیع اور گہرے مطالعہ اور اسلامی سیاسی تحریکات کا نچوڑ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنرل صاحب کو حکومت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے اور ایک اسلامی مملکت کی تشکیل جدید کے لیے ایک ایسی رہنما کتاب کی ضرورت تھی، وہ اس کو پڑھ کر متاثر ہوئے اتفاق سے اس پر پیش لفظ اور تعارف میرے قلم سے ہے۔ جو محترمی سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب مرحوم ناظم دارالمصنفین کے اصرار پر میں نے لکھا تھا کہ اور اس میں صفائی سے لکھ دیا تھا کہ "سید صاحب کی تصنیف پر میرا مقدمہ لکھنا آثار قیامت میں سے ہے لیکن چونکہ یہ کتاب ناتمام اور مختصر ہے اس لیے کسی ناقص کا اس پر

کچھ لکھنا قابلِ عفو و درگذر ہے کہ ع

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

معلوم نہیں جنرل صاحب کو سہو ہوا، یا انہوں نے اظہارِ تعلق و قدر دا
کا ایک راستہ اختیار کیا کہ مقدمہ نگار کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے
لاکھ روپیے کے عطیہ کا اعلان کیا، میں نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ میں
عطیہ کا کسی طرح مستحق نہیں، براہِ کرم اس کا نصف حصہ ادارہ دار المصنفین
کو پیش کر دیا جائے جس نے یہ کتاب دریافت کی اور اس کی اشاعت
انتظام کیا، بقیہ نصف حضرت سید صاحبؒ کی بیگم صاحبہ (والدہ عزیز گرامی ڈا
مولوی سید سلمان ندوی سلمہٗ) کی خدمت میں پیش کر دیا جائے جو پاکستان ہی
مقیم ہیں، اس کارروائی میں خاصی دیر ہو، لیکن بحمد اللہ اس کی تکمیل ہ
جنرل صاحب سے ایک ملاقات مئی ۱۹۸۲ء میں شرق اردن، یمن اور ح
واپسی کے دوران کراچی میں ہوئی، جنرل صاحب نے اس ملاقات کے
مجوزہ پروگرام میں کچھ ترمیم بھی کی، محترمی جناب مولانا ظفر احمد صاحب ا
اس ملاقات کے خاص محرک اور اس میں واسطے تھے، میں جنرل صاحب کو
میں قبۃ الصخرۃ (مسجد اقصیٰ) کا وہ خوبصورت مرمری ڈھانچہ پیش کیا
مجھے عمّان میں پیش کیا گیا تھا۔ اس ہدیہ میں (زبانِ حال سے) اس کا اشارہ
کہ مسجد اقصیٰ کی بازیافت اور اس کا استخلاص بھی ایک صاحبِ ایمان مسلم
مملکت کی ذمہ داریوں میں ہے۔ غالباً اسی سفر میں کراچی کے ایک کثیر الاشاعت
کے نمائندہ نے مجھ سے انٹرویو لیا اور یہ سوال کیا کہ صدرِ مملکت نظامِ اسلام
جاری کرنے اور اس کو حقیقی معنی میں اسلامی مملکت بنانے کا عرصہ سے
رہے ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے کی ابھی تک نوبت نہیں آئی، اس سلسلہ
کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ ایسے موقع پر دو رویے ہو سکتے ہیں، ا
مسلمان جو صورتِ حال سے شرح نظر نہ آتا ہو، آپ سے کہے کہ میں ایک
کرنا چاہتا ہوں، آپ ان سے کہیں کہ یہ صورت اور خانۂ خدا
آپ کو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق بھی ہوئی، اور آپ کے ہا
یہ کام کیا تو اگر وہ مسجد بنانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے تو کا

اس ارادہ سے باز آجائے گا، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ کہیں کہ سبحان اللہ ارادہ مبارک ہو، آپ ہی جیسے لوگوں نے مسجدیں بنائی ہیں۔ ہم بھی اس کارِ خیر میں شریک ہیں اور آپ کا ہاتھ بٹائیں گے تو اگر اس کو اس کام میں تردد تھا تو وہ اس کا عزم کرے گا، اور مسجد کی تعمیر کی سعادت حاصل کرے گا۔ مجھے اس موقع پر یمن کے ایک عالم کی وہ گفتگو یاد آگئی جو حکمت یمانی کا ایک نمونہ ہے [۱] یہ اسی سال مئی ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے، راقم سطور کو صنعاء کے ایک قدیم محلہ میں ایک یمنی عالم سے ملایا گیا جو میری عربی تصنیفات کا مطالعہ کر چکے تھے اور میرے خیالات سے واقف تھے، انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں دو راستے ہیں جن کو دینی جدوجہد کرنے والے اختیار کر سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایمان کرسی والوں (اہلِ حکومت) تک پہونچا دیا جائے، دوسرا یہ کہ اہلِ ایمان خود کرسیوں تک پہونچ جائیں (یعنی حکومت کی ذمہ داریاں براہِ راست سنبھال لیں) انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ پہلے طریقِ کار کو ترجیح دیتے ہیں میں نے کہا کہ آپ نے بالکل صحیح فرمایا، ہمارے برصغیر میں گیارہویں صدی ہجری میں امام ربانی مجدد الف ثانی نے یہی طریقِ کار اختیار کیا، اور اپنے لوگوں کو حکومت کی کرسیوں تک پہونچانے یا خود پہونچنے کی کوشش کے بجائے اس وقت کے سربراہ مملکت تک ایمان کی دعوت اور حمیت اسلامی کی دولت پہونچانے کی کوشش کی اور اس کو اطمینان دلایا کہ وہ کرسی حکومت تک پہونچنے کی کوشش تو الگ رہی اس کا وسوسہ بھی دل میں نہیں لاتے، یہ کام انہیں کو کرنا ہے اور ہر طرح سے وہ اس کے اہل ہیں ان کی رگوں میں حمایتِ اسلام اور صاحبِ حمیت، فاتحین اور بانیانِ سلطنت کا خون ہے اسی کے ساتھ اہل دربار اور اساطینِ حکومت سے رابطہ قائم کر کے ان کے دلوں میں دینی حمیت کا جوش اور خدمتِ اسلام کا جذبہ پیدا کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا جو اس سے کہیں بہتر تھا، اور جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت پر آیا جو اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پابند مذہب تھا، اور شاہجہاں کے بعد ہندوستان کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسا متبع حامیِ دین اور فقیہ و صاحب بادشاہ آیا، جس کو ہمارے ایک اہل نظر

عرب فاضل دوست نے "خامس الخلفاء الراشدین" (پانچویں خلیفہ راشد) کا لقب دیا ہے۔

جدید تحریکوں نے تو اس میں اور اضافہ کیا ہے کہ بعض جماعتیں صرف اہل ایمان کا کرسیوں تک پہونچنا فرض ہی نہیں سمجھتیں بلکہ اسی سے آگے خاص زندہ پوش اہل ایمان پہونچنا ضروری سمجھتی ہیں۔ اور اس سے کم پر راضی نہیں، جنرل ضیاء مرحوم کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں یہ جملہ معترضہ آگیا، لیکن اس سے اس صورتحال پر روشنی پڑتی ہے، جس سے ان کو اپنے پورے دور اقتدار میں واسطہ رہا۔ اب ہم پھر موضوع کی طرف آجاتے ہیں اور اس سلسلہ میں آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔

جون ۱۹۸۶ء میں میرا عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے جلسہ میں شرکت کے لئے استنبول (ترکی) جانا ہوا، اس سے فارغ ہو کر ۲۸ جون کو دہلی جاتے ہوئے ڈھائی تین دن کے لئے کراچی کو ہوا، غالباً ۲۹ جون کو اپنے ایک مرحوم دوست منصور ... صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے پر تھا، کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، انہوں نے کہا جنرل یہاں دوپہر ہیں، اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ ٹیلی فون پر ہیں، اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ ٹیلی فون پر ہیں، ان کو کہاں سے ہوئی، میں نے ریسیور ہاتھ میں کراچی پہونچنے کی اطلاع ان کو کہاں سے ہوئی، میں نے ریسیور ہاتھ میں ... صاحب خود بول رہے تھے، انہوں نے ہماری آمد پاکستان پر خوشی ... اسلام آباد آنے کی دعوت دی، میں نے وہاں آنے سے معذرت کی، اور کہا کہ اس وقت اس کا موقع نہیں ہے، بات ختم ہو گئی اور ... دارالعلوم ... ٹاؤن میں جہاں قیام تھا ان کا ٹیلیفون آیا، انہوں نے کہا کہ ... سکتے تو میں آتا ہوں، میں کل کراچی آپ سے ... اتفاق سے وہی دن میری ...

... ہو ... دیا ...

... آپ

... یہ کام

...لانا محمد ناظم صاحب ندوی اور چند احباب کا نام بتادیا، اگلے دن صبح
...ل صاحب تشریف لائے، صدر کے محل میں ہم ان کے ساتھ کھانا کھایا اور
...احاطے کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، جنرل صاحب بڑی سادگی
...ر خلوص ملے، سیرت نبویؐ کے عطیہ کا ذکر آیا، جس کی اس وقت تک اس
...دائی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، جس کی، ہم نے درخواست کی تھی انہوں
...فرمایا کہ اگر آپ قبول کر لیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی، میں نے کہا کہ
... نے اس سے پہلے بھی ایسے موقع پر یہی طرز عمل اختیار کیا۔
معلوم ہوا اور حیرت ہوئی کہ جنرل صاحب کو فیصل ایوارڈ کے
...سلہ میں میرے طرز عمل کا علم تھا،
...یرت کی بات یہ تھی کہ پرسنل لا کے معاملہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا
...ڈ کی طرف سے نفقہ مطلقہ اور سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سلسلہ میں جو
...گیر مہم چلائی گئی تھی اور وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی صاحب
... پارلیمنٹ میں ایک نیا بل پیش کر کے (جو بہت کچھ علماء و ارکان
...سنل لا بورڈ کے مشوروں کی روشنی میں تیار ہوا تھا) جس حقیقت
...ندی اور دانشمندی کا ثبوت دیا اس کا جنرل صاحب کو علم تھا، اور انہوں
...اس سلسلہ میں راجیو جی کے اقدام کی تعریف کی، یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ
...ی کے متعدد باخبر شرکاء کو اتنی واقفیت نہیں تھی، اور ان میں بعض بالکل
...ر نکلے
...رل صاحب مرحوم سے یہ آخری ملاقات تھی، اس وقت بالکل یہ اندازہ
...تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شہداء کی فہرست میں ان کا نام لکھا ہوا ہے اور
...خدا کے دربار میں پہونچنے کا وہ راستہ معین ہو چکا ہے جس کی بڑے
...اولیاء اللہ نے تمنا کی اور جس کی فضیلت اور علوئے مرتبت پر قرآن
... ناطق ہیں۔ ؎ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
...س سانحہ میں اس ملک کے افراد یا کسی فرد کا ہاتھ نہ ہو
...یت کے لئے انہوں نے اپنی بہترین توانائیاں اور صلاحتیں

صرف کیں، اور اسلامی نظام اور قوانین کے نفاذ کے سفر کی کچھ منزلیں طے کیں، اور اس کی تکمیلی منازل کی طرف وہ رواں دواں تھے۔ اندیشہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد (اور متعدد تجربوں کے بعد) پاکستان کے بعض حق گو اور حقیقت پسند اہل نظر کی زبان پر لکھنؤ کے ایک قدیم شاعر کا یہ شعر نہ ہو۔ ؎

اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے انہیں کے ہزاروں گلے ہوئے

اللہ تعالیٰ شہید مرحوم کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگذر فرمائے جن سے کوئی بشر خالی نہیں، ان کی نیت اور ارادوں اور ان کی دینی حمیت اور اسلام سے تعلق کو قبول فرمائے، اور دونوں پڑوسی ملکوں کے رہنماؤں اور قائدین و سربراہان مملکت کو اس کی توفیق دے کہ وہ شریف، حقیقت پسند، بلند نگاہ، اور عالی ظرف پڑوسی سربراہان مملکت کی طرح دونوں ملکوں کی رہنمائی کریں، ان کی بہترین توانائیاں اپنے اپنے ملک کی تقویت اور استحکام، معاشرہ کی اصلاح، بڑھتے ہوئے انتشار، بدنظمی، فرض ناشناسی، اور دولت پرستی کے مرض سے ان کو بچانے کی کوشش کریں جو ان ملکوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے تاکہ ایشیا میں ایک ایسی باوقار، باوزن، موثر اور مفید قیادت کو ابھرنے کا موقع ملے، جو بین الاقوامی امور میں بھی، اور قوموں اور ملکوں قسمتوں کا (بزعم خود) فیصلہ کرنے والی طاقتوں کو بھی روشنی دکھا سکے۔ اور عہد حاضر کے لئے بہتر، زیادہ پرسکون اور محفوظ اور باعزت ماحول پیدا کرنے میں مدد دے۔

سلسلہ صفحہ ۲۸

سطح پر بھی انعامات پیش کیے جا چکے ہیں۔ اور جبنیل تخیل اور تصنیف میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ دعا گو ہوں کہ آزاد صاحب کو طویل عمر حاصل ہو اور وہ اسی طرح حقیقی علم و دانش کے مشعل بردار رہیں۔

متین الرحمن مرتضیٰ

مولوی عبدالحق ۔ تضادات سے بنتا ابھرتا انسان

قسط اوّل

مولوی عبدالحق صاحب کو خود احتسابی کے لمحوں میں اپنے بارے میں حالی کی یہ رباعی یاد آتی تھی ؎

جیسا نظر آتا ہوں، نہ ایسا ہوں میں　　اور جیسا سمجھتے ہیں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے بھی، عیب ہوں چھپاتا اپنے　　بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

یہ ان مولوی صاحب کا اپنے بارے میں تاثر ہے۔ جو شخصیات کو سمجھنے اور پرکھنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں اور سیرت نگاری میں باکمال ہیں۔ "چند ہمعصر" میں انہوں نے جیسے جیتے جاگتے اور حقیقت پسند شخصی مرقعے پیش کئے ہیں، ان کا لحاظ رکھ کر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اپنے بارے میں ان کا یہ تاثر بھی ویسا ہی درست ہوگا، جیسا دوسروں کے بارے میں ان کا مشاہدہ قرینِ حقیقت ہوتا ہے۔

حالی کی رباعی میں مولوی صاحب نے خود اپنا جو جائزہ پیش کیا ہے، اسے محض مولوی صاحب سے عقیدت و احترام کی خاطر ان کا "انکسار" قرار دے کر نظر انداز کر دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہ ایک منصف مزاج، بے لاگ اور بے رحم سیرت نگار کی خود احتسابی و آگاہی ہے جو بجائے خود واجب الاحترام ہے۔

مجھے مولوی صاحب کی بانوے سالہ زندگی میں محض ایک ماہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس مختصر سی مدت میں ان کے بارے میں میرا وہ تصور ٹوٹا جو محض ان کی عظمت و شہرت اور بزرگی کے حوالے اور ان سے اپنی طالب علمانہ عقیدت و ارادت کی کمزور جذباتی بنیاد پر قائم تھا اور اس شکستہ تصور کی جگہ اس نئے تاثر نے لے لی جو مشاہدے اور ان سے قربت کے تجربے کی مضبوط بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ لگ بھگ گیارہ سو مہینوں پر پھیلی ہوئی ان کی طویل زندگی کو محض ایک ماہ کے مشاہدے و تجربے کی میزان پر تول دینا انصاف نہ ہوگا۔ میں ایسی بے انصافی کی نیت بھی نہیں رکھتا۔ بس تو محض اتنی سی بات

کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ماہ کی قربت میں ان کی شخصیت کے متعلق میں نے جو نیا تاثر لیا، اس سے مولوی صاحب کے بارے میں خود ان کے اپنے تاثر کی تردید نہیں توثیق ہوتی ہے ۔

میرے ذہن میں جذبات عقیدت نے مولوی صاحب کا جو بے بنیاد تصور پہلے سے ڈھا رکھا تھا اس کے مطابق وہ تمام عیبوں سے پاک، اپنے اخلاق و کردار اور سیرت و مزاج کی خوبیوں میں انسانوں کی سطح سے بالا کہیں فرشتوں سے قریب تر تھے ۔ یہ محض انفرادی نہیں ہمارا اجتماعی مرض ہم انسانوں کے فرشتے یا شیطان کے معیار پر پرکھ تول کر قبول کرتے یا مسترد کرنے کے عادی ہیں ۔ اور شاذ ہی انسانوں کو خالص انسانی سطح پر سمجھنے اور قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مولوی صاحب کے مرض الموت کے زمانے میں مجھے ایک ماہ مولوی صاحب کے ساتھ جناح ہسپتال کراچی میں رہنے انہیں شب و روز قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ ہر چند کہ بیماری کے دن کسی فرد کی معمول کی زندگی کی نمائندگی نہیں کرتے، مگر پھر بھی میں نے اس عرصہ میں مولوی صاحب کی شخصیت کو تمام تکلفات، رکھ رکھاؤ اور وضع و احتیاط کے حجابات سے دور اس طور پر دیکھا کہ وہ مجھے اپنے تصور سے مختلف نظر آئے یعنی فرشتہ نہ شیطان، بلکہ صرف اور صرف انسان دکھائی دیئے ۔ وہ انسان جو عظمتوں اور رفعتوں کے ساتھ ساتھ کمزوریاں اور پستیاں بھی رکھتا ہے ۔ میں نے ان کی شخصیت میں بہت سے تضادات یکجا دیکھے ۔

وہ شگفتہ مزاج بھی تھے اور غصہ ور بھی ۔ با اخلاق بھی تھے اور بے لحاظ بھی، دل دار تھے دل آزار بھی ۔ مذہب پسند بھی، مذہب بیزار بھی ۔ غرض یہ کہ قدم قدم پر تضادات سے بنتا ابھرتا انسان ان کی شخصیت کے آئینے میں اپنا چہرہ نمائی کرتا تھا ۔ اس نشست میں ان کے ساتھ گزرے ہوئے ایک ماہ کے واقعات کی کچھ جھلکیاں دیکھ لیجئے ۔ یہ جھلکیاں ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف گوشوں کی عکاس ہیں ۔

پیرانہ سالی اور بیماری سے بے حال زندگی میں بھی مولانا صاحب کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا رنگ باقی تھا ۔ جو اچھے دنوں میں نہ جانے کتنا شوخ رہا ہوگا ۔ ہسپتال میں متعدد نرسیں ان کی خدمت پر مامور ہیں ۔ ایک معمولی صورت، گہری سانولی رنگت اور بجھی بجھی سی شخصیت والی نرس جو اپنے بارے میں پسندیدہ کلمات کے لئے ترسیدہ ہی رہتی ہوگی، مولوی صاحب کی شگفتہ مزاجی سے ایسی تازگی پاگئی کہ اس کی شخصیت مولوی صاحب کے کمرے میں آتے ہی بدلی بدلی اور بالیدہ سی

آتی تھی ۔ یہ نرس عام طور پر دوپہر کے کھانے کے بعد لال دوا کا مکسچر پلانے آتی تھی ۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مولوی صاحب نے گرجدار الفاظ میں جوش کے ساتھ اس کا استقبال کیا ۔ " آ گئیں مس روح افزا " مولوی صاحب نے " روح افزاء " دوا کی سرخ رنگت اور شربت روح افزاء سے اس کی مماثلت کے سبب کہا تھا ۔ نرس نے اسے اپنی شخصیت کے لئے مولوی صاحب کا خراج تحسین سمجھا اور ایسی نہال ہوئی کہ اس کی ڈیوٹی خواہ ہسپتال کے کسی وارڈ میں ہوتی ، وہ روزانہ ایک چکر مولوی صاحب کے کمرے کا ضرور لگاتی اور مولوی صاحب اسے روح افزاء پکار کر شاد کر دیتے تھے ۔

ان کے غصے کا تجربہ بھی مجھے ہسپتال میں ان سے اپنی ملاقات کے پہلے ہی گھنٹے میں ہو گیا تھا ۔ میں اس زمانے میں اردو کالج کا طالب علم تھا ۔ حکیم اسرار احمد صاحب کریوی نے مجھے مولوی صاحب کی تیمار داری کی ذمہ داری تفویض کی تھی ۔ جسے میں نے اپنے لئے سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا مولوی صاحب کو میرے بارے میں یہ اطلاع دے کر کہ میں انکی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہوں گا حکیم صاحب کچھ دوائیں بازار سے لینے کے لئے چلے گئے ۔ میں مولوی صاحب کے بستر کے سامنے دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا ۔ میں نے دیکھا مولوی صاحب مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں ۔ میں نے رخ پھیر لیا ۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب کو دیکھا تو وہ بدستور تک رہے تھے ۔ میں نے بے چینی سی محسوس کر کے پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا ۔ تھوڑی دیر بعد پھر مولوی صاحب پر نظر پڑی تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر مسلسل گھور رہے تھے ۔ اب میں پریشان ہوا ۔ " کیا کر رہے ہو ۔ ؟ "

مولوی صاحب کی گرجدار آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا ۔

" جی کچھ نہیں " میں نے عرض کیا ۔

" اپنا کام کرو " مولوی صاحب بولے ۔

میں نے وضاحت کی کہ " اس وقت مجھے سوائے اس کے کوئی کام نہیں کہ آپکی خدمت کے لئے حاضر رہوں ۔ " میری یہ وضاحت غضب ہو گئی ۔ مولوی صاحب پھٹ پڑے ۔

" نکل جاؤ میرے کمرے سے ۔ مجھے اپنے قریب ایسے نوجوان پسند نہیں ہیں ، جن کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ ہو نکموں کو میں اپنے پاس نہیں بٹھاتا "

میں اس اچانک اظہار غضب سے گھبرا گیا اور اپنی نادانستہ غلطی کی معافی چاہی جسے انہوں نے بڑی آسانی سے قبول کیا اور بڑی نرمی سے سمجھایا ۔

ماہنامہ شاداب حیدر

کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ماد

مولوی صاحب کے بارے

میرے ذہن میں جذبات

رکھا تھا اس کے مطابق وہ تمام عید

انسانوں کی سطح سے بالا کہیں فرشتوں

ہم انسانوں کے فرشتے یا شیطان کے معی

اور شاذ ہی انسانوں کو خالص انسانی

کے مرض الموت کے زمانے میں مجھے

انہیں شب و روز قریب سے

کی نمائندگی نہیں کرتے، مگر وہ

اور وضع و احتیاط کے ح

یعنی فرشتہ نہ شیطان،

ساتھ ساتھ کمزو

یکجا دیکھے

تھے

ہوئے، تھوڑی دیر بعد مدرسے کے سکوت کو مولوی صاحب

آئندہ یہ رسالہ تم کبھی مت پڑھنا۔ اصل میں

والے تمام طرح کے رسالے، اخبارات، کتابچے، اشتہارات اور

خیال سے پڑھتے ہیں کہ ہمیں اردو میں لکھی جانے والی اچھی اور

ان سب کا پڑھنا ہماری ضرورت ہے، تمہاری نہیں۔ تمہیں

...ہے "

...پی کتاب پر نظریں گاڑے جواب دیا اور بہت دیر تک سوچتا
...اولاد نہیں ' وہ زندگی میں تربیت اولاد کے جھمیلوں میں پڑے اور نہ اس
...کے باوجود ان کے یہاں بچوں کی تربیت کا شعور کتنا صاف اور گہرا ہے ۔

...تھے اس کا مشاہدہ ہسپتال میں روز ہوتا تھا جو لوگ ان کی عیادت
...کرتے تھے ۔ بعض اوقات یہ نشستیں گھنٹوں طویل بھی ہو جاتی تھیں
...پیش آتی تھی کہ کیسے یہ مجلس درہم برہم کریں اور کس طرح مولوی صاحب کے
...کو کھسکائیں ۔ ایک روز مولوی صاحب دوپہر کے وقت آرام کر رہے
...علم حاضر کی دیواریں کود پھاند کر آ نکلے اور کمرے پر دستک دی ۔ میں باہر نکلا
...سے آئے ہیں اور بابائے اردو سے ملنا چاہتے ہیں ۔ میں نے انہیں سمجھایا
...بہت بے آرام ہوتے ہیں ۔ انہیں ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا ہے
...کیجئے ۔

...صرف دور سے مولوی صاحب کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں ۔ ہم بے کبھی
...اس لئے سکھر سے آئے ہیں ۔

...پردہ ہٹا دیتا ہوں ۔ مولوی صاحب کھڑکی کے برابر ہی بستر پر دراز ہیں ۔ آپ
...دیکھ لیجئے "

...نے طالب علموں کو اس تجویز پر آمادہ کر کے پردہ ہٹا لیا تو پردہ کھسکانے کی آہٹ پر
...صاحب نے آنکھیں کھولیں اور پوچھ لیا ۔

...کیا ہو رہا ہے ۔ ؟" میں نے صورت حال کی وضاحت کی تو انہوں نے فوراً طالب علموں کو اندر
...اور ان سے پانچ دس منٹ تک باتیں کیں ۔ طالب علموں نے خود ہی سمجھداری سے اجازت
...لی تو یہ مجلس ختم ہوئی ۔

...طالب علموں کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے میری خبر لی اور کہا کہ آئندہ عیادت کے لئے
...والوں اور خصوصاً طالب علموں کو بالکل نہ روکا جائے ۔ انہوں نے سمجھایا ۔
"دور سے عیادت کے لئے آنے والوں کو کمرے کے باہر سے ہی لوٹا دینا بد اخلاقی ہے "

میں نے اپنے وفاع میں عیادت کی خاطر آنے والوں کیلئے ڈاکٹروں کی ممانعت کا ذکر کیا تو کہنے لگے "ڈاکٹر صرف علاج کرنا جانتے ہیں۔ آداب و اخلاق کے تقاضے نہیں سمجھتے تم ان کی عائد کردہ ممانعت کی پرواہ مت کرو۔ وہ کرو جو اخلاق کا تقاضا ہے۔

اور صاحبو ایک روز اسی پیکر اخلاق کی ایسی بے مروتی اور بے لحاظی کا بھی مشاہدہ ہوا جو آج بھی پسینہ لا دینے کو کافی ہے۔ مولوی صاحب کے ایک ملازم بنارس خاں نے جو ہسپتال میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ کمرے میں آکر اطلاع دی۔

"جی۔ ایک بیگم صاحبہ۔ بابا جی سے ملنے آئی ہیں"!

بیگم صاحبہ کا نام سنتے ہی حکیم صاحب (اسرار احمد کریوی) کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ بڑی عجلت کے ساتھ مجھے ہدایت دیکر ملحقہ غسل خانے میں گھس گئے کہ

"بیگم صاحبہ سے یہ کہہ کر معذرت کرلو کہ مولوی صاحب سو رہے ہیں۔

میں ابھی حکیم صاحب کی بدحواسی پر اپنی حیرت کو سمیٹ بھی نہ پایا تھا کہ بیگم صاحبہ نے دروازے کا پردہ ہٹاکر بلند آواز سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ مولوی صاحب نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا اور گرجدار آواز میں پوچھا۔

"کون ہے۔؟

"بندی ....آداب عرض کرتی ہے۔"!

مگر ابھی شاید بیگم صاحبہ کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ پوری گھن گرج کے ساتھ "زادی" پر ختم ہونے والی ایک گالی کمرے میں پھیلی اور دفع ہوجاؤ" کے الفاظ سے مکمل ہوکر ایک ہولناک سناٹے میں گم ہوگئی ایسا سناٹا جس میں بیگم صاحبہ کے لوٹتے قدموں کی چاپ بہت دیر تک سنی جاتی رہی۔ حکیم صاحب غسلخانے سے برآمد ہوئے اور بہت دیر تک اس تکلیف دہ واقعے پر کف افسوس ملتے رہے۔

ان سے مجھے معلوم ہوا کہ اردو ہی کی ترقی کے ایک سرکاری ادارے میں ان خاتون کی رفاقت کار کے زمانے میں کچھ اختلافات ہوئے تھے۔ جن کے زخم مولوی صاحب کی طبیعت سے ہنوز مندمل نہیں ہوئے تھے مجھ پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا اور کئی روز تک کبیدہ خاطر رہا۔ بلکہ آج بھی ان خاتون سے جو اپنے تمام اختلافات کے باوجود بڑے اخلاص اور محبت سے محض ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوئی تھیں مولوی صاحب کی بدسلوکی پر صدمہ اور حیرت محسوس کرتا ہوں۔ (باقی آئندہ شمارہ میں)

پروفیسر کوشلیا ولی / مترجم ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

جگن ناتھ آزاد اور اقبالیات

برسوں پہلے جموں یونیورسٹی کے شعبۂ سنسکرت کے قریب ہی میں شعبۂ اُردو کے صدر کا کمرہ تھا۔ جہاں پروفیسر آزاد رات بھیگنے تک مصروف کار دیکھے جاتے تھے حتیٰ کہ اگر بجلی چلی جاتی تو گیس کا لیمپ روشن ہو جاتا تھا۔

وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے، پروفیسر موصوف کا ذوق مطالعہ و نگارش یونیورسٹی کے حلقوں میں نیز دانشوروں میں تسلیم کیا جانے لگا۔

اُردو دنیا میں جگن ناتھ آزاد صاحب ۵ رڈسمبر ۱۹۱۸ء کو ضلع میاں والی پاکستان کے ایک قصبے عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور اپنے والد بزرگوار کی تخلیقی فضاء میں جو مشہور و معروف اُردو شاعر تھے پرورش سے مستفید ہوتے رہے۔ نتیجتہً دوران حصول تعلیم ہی آزاد صاحب لاہور سے شائع ہوتے والے مشہور ماہنامہ "ادبی دنیا" کے عارضی مدیر ہو گئے اور مولانا صلاح الدین کی غیر حاضری میں چھ ماہ تک اس موقر جریدے کو کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے۔ آزادیِ وطن سے پہلے آزاد صاحب لاہور کے ایک کالج میں گریجویٹ سطح تک اُردو کا درس دیتے رہے۔

آج کل آزاد صاحب کو مشرق و مغرب میں اقبال پر مستند ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اقبال پر جو بلیغ کام کیا ہے اُس سے اُردو اسکالروں نے اکتساب فیض کیا ہے۔ اقبال کی تاریخ ولادت جو متنازع بنی ہوئی تھی۔ آزاد صاحب ہی کی تحقیق سے تعین کی جا سکی۔ آزاد صاحب نے فقیر سید وحید الدین اور میاں محمد شفیع کی حمایت میں با ثبوت دلائل پیش

صدر شعبہ سنسکرت جموں یونی ورسٹی، جموں و کشمیر

کہیے کہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ورنہ اکثر اُردو داں اقبال کی پیدائش فروری ۱۸۷۳ء سمجھتے آتے تھے۔

پروفیسر موصوف ہمہ جہتی ادیب و قلم کار ہیں۔ لہٰذا اُردو ادبیات میں اُن کی کارکردگی کو Multi Dimensional یعنی کثیر الابعاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاصے طویل عرصے کے بعد مجھے آزاد صاحب کی تصنیف IQBAL MIND AND ART پڑھنے کو ملی۔ اقبال کی شاعری سے متعلق جملہ یعنی فلسفۂ اسلامیات، انسانیت، حُبِّ وطن وغیرہ موضوعات پر اس تصنیف میں وافر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب ہذا کو بہ حسن و خوبی ترتیب دیا گیا ہے۔ اور ڈاکٹر محمد معروف نے پیش لفظ سپردِ قلم کیا ہے۔ کتاب کا مطالعہ یہی تاثر پیدا کرتا ہے کہ بہ حیثیت ادیب آزاد صاحب اوصافِ بے خوفی اور صاف گوئی کے حامل ہیں، آج کل کی علمی دنیا میں یہ خوبی ذرا مشکل ہی سے دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ تصنیف جو چھ ابواب، ضمیمات اور کتابیات کو محیط ہے فلسفہ، مذہب، سیاست اور شاعری کو زیرِ بحث لاتی ہوئی علامہ اقبال کی شاعری، ان کا فلسفہ اور اُن کے اسلوبِ شعر پر معیاری نقد و نظر پیش کرتی ہے۔

اقبال کا صد سالہ جشن منانے کے سلسلے میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش اور سن کا موضوع بہت متنازع ہو گیا تھا۔ سوانح نگاروں نے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو صحیح تاریخ پیدائش قرار دیا جس کی تائید محکمہ آثار قدیمہ لاہور نے بھی کی۔ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو صحیح تاریخ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کالج کا رجسٹر جو پرنسپل کے آفس میں ترتیب دیا جاتا تھا۔ خاموش دکھائی دیا۔ علامہ اقبال کی نے بتایا کہ اقبال بروز جمعہ ذوالقعدہ ۱۲۹۴ ہجری کو پیدا ہوئے تھے۔ کراچی کے جناب سردار علی صابری کے یہاں اُردو، ہندی اور انگریزی وغیرہ کے تقاویم، جنتریاں اور کیلنڈر (۱۸۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک) تھے۔ اور انھوں نے اُن پر غائر نظر ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ ۳ ذوالقعدہ ۱۲۹۴ ہجری جمعہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے مطابق تعین ہوتا ہے۔ پروفیسر آزاد نے جملہ ثبوت پیش کرتے ہوئے اقبال کا یومِ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بتایا۔ انھوں نے ملک راج آنند کے

ایک مضمون بعنوان ... جو رائل اکیڈمی جرنل لندن میں شائع ہوا تھا۔ اور تب علامہ حیات تھے۔ ملک راج آنند نے ۱۸۷۷ء کو سن ولادت لکھا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، مطبوعہ ۱۹۷۴ء کا اندراج بھی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ کی پیدائش بتاتا ہے۔ یہی نہیں آزاد صاحب نے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے پرانے فائلوں کی بھی ورق گردانی کی اور اس میں بھی یہی تاریخ ملی۔ یعنی ۹ نومبر ۱۸۷۷ء۔

پروفیسر آزاد نے علامہ کی شاعری کے ہندوستانی تناظر پر بھی کامیابی سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کی نظم "ہمالہ" سے مثالیں پیش کرتے ہوئے اور اقبال اور ٹیگور اور ہندو کا موازنہ کرتے ہوئے یہ واشگاف کیا ہے کہ اقبال کا وژن (VISION) متعدد و مادی، روحانی، غیر فلسفیانہ منازل پر مرتکز ہے۔ اردو و فارسی کے بعض نقادوں نے اقبال کے نظریئے کو رجعت پسندانہ جذبات کا حامل قرار دیا ہے۔ اقبال کی شاعری کو بہترین ماہرین ادبیات و سیاسیات نے حب الوطنی سے بھرپور جذبات کے منافی قرار دیا ہے۔

اقبال کی پوری شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے آزاد صاحب نے اپنے اس موقف کو پیش کیا ہے کہ اقبال کو وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ترجمان کی حیثیت سے اقبال کی شاعری عدیم المثال ہے۔ اردو اور فارسی کے شعراء میں اقبال کو ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی شاعری ہمارے دل و دماغ پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک ہندوستان کے کسی اور اردو یا فارسی شاعر نے ہندوستانی ثقافت و تفکریات کے لئے اتنی گرمجوشی نہیں دکھائی ہے۔ جتنی اقبال نے۔

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شاعری نیز علامہ کے ملفوظات کا معروضی مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کو ہندوستان اور ہندوستانیت دونوں سے والہانہ عشق تھا۔ سیاسی، تاریخی نیز مذہبی روایات، ویدا اور اپنشدوں سے ماخوذ فلسفیانہ طور و طریق پر استوار رشیوں منیوں کی زندگی وغیرہ۔ بی طرح کے تمام امور ہندوستانی ثقافت و تمدن کے

محنت لیئے جاتے ہیں۔ اور یہی سب کچھ نسل در نسل ہمیں ورثے میں ملتا چلا آیا ہے
اس ورثے کی ریشوں، مینوں اور رفیقوں کے اثر کی نشاندہی عصرِ حاضر کے
ہندوستان کے تعلق سے بھی کی جا سکتی ہے۔

آزاد صاحب لکھتے ہیں کہ بانگِ درا میں مشمول نظم "ہمالہ" سے اردو
شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

اقبال کی نظم "آفتاب" کا (جو گایتری کا ترجمہ ہے) تجزیہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر
آزاد نے نظم ہذا کے خاص خاص نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کی شاعری
پر سرسری نظر ڈالنا بے انصافی ہے۔ اقبال ایسے باکمال شاعروں کے کمالات پر
پردہ ڈالنا اور سیاست کو دغابازی اور بہتان سے ملوث کرنا بڑی غلط اقدامی
ہے۔ ایسی پُرفریب چالبازیوں ہی سے کمزور طبقوں کا استحصال ہوتا آیا ہے۔
اور اسی طرح طاقت رکھنے والے اپنا تسلط قائم کرتے رہے ہیں۔

آزاد صاحب کی رائے میں پچھلے چھ سو برسوں میں اقبال سے بڑا مفکر و سیاست
دان مسلم دنیا نے پیدا نہیں کیا ہے۔ اقبال کی عظمت کا راز ان کے سیاسی خیالات
میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس اضطراب میں پنہاں ہے۔ جو سوالات کی صورت میں
شاعر، فلسفی اور سیاست دان اقبال کے دل میں ابھرتا رہا۔ اقبال کی عظمت
ان ماخذ سے بھی عبارت ہے جن سے انھوں نے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ وہ ماخذ
ہیں اسلامیات، مغربی فلسفہ، ہندو فکریات اور ان کی "خودی"۔

بعض سطحیں اہلِ قلم نے اقبال جیسے بلند قامت شاعر کو بے رحمانہ تنقید کا
نشانہ بنایا۔ احسان دانش نے ان کو ناظم بتایا۔ سچانند سنہا نے اقبال کی
شاعری کو بے غنائی اور ترنم سے عاری قرار دیا۔ پروفیسر ایم۔ ایم شریف نے اپنے
ایک نامکمل مکتوب میں سنہا صاحب کو لکھا کہ "۔۔۔ سب سے زیادہ تعجب مجھے
اس بات سے ہوا کہ آپ کے نزدیک اقبال کی شاعری ترنم و موسیقیت سے عاری
ہے جبکہ اقبال کی سینکڑوں نظمیں نغمگیت و موسیقیت سے بھرپور ہیں"
اس کا حوالہ پروفیسر آزاد نے اپنی تصنیف IQBAL-MIND AND ART میں
دیتے ہوئے اقتباس پیش کیا ہے۔ فلسفہ۔ شعر۔ اقبال کی تشریح کرتے ہوئے
آزاد نے بالتشریح اقبال کی شخصیت کو ہمہ جہتی شخصیت قرار دیا ہے،
ان کی رائے میں اقبال کی شخصیت میں شاعر و عارف کی خصوصیات اکٹھا

ہوگئی تھیں۔ اقبال بہ حیثیت فلسفی زندگی کے مقاصد پر ایمان رکھتے تھے کہ انسانیت کو ساتھ لے کر چلنے ہی سے ہم مسرت سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر آزاد کا جائزہ 'بغایت' اکتشافی اور اور بیحد original ہے۔ اقبال کی شاعری میں استفہامیت ہے۔ رواں دواں تنقید ہے اور وہ قاری پر تشکیکی اثرات مرتب نہیں کرتی۔ اقبال کے نزدیک فلسفیانہ خیالات میں قطعیت ایسی کوئی شئے نہیں ہوتی اور وہ کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتے۔

اقبال کی شاعری فنکارانہ خصوصیات آگیں اور کمالاتِ خیالات سے بھرپور شاعری ہے۔ گہرے خیالات کو مکمل ترین جذبات کے ذریعہ پیش کرنے میں اقبال کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

پروفیسر آزاد کہتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ محض مفروضہ نہیں ہے' اقبال کا فلسفہ باعمل زندگی بسر کرنے کے رہنمایانہ اصول پیش کرتا ہے۔ اقبال کو ہندوستانی فلسفے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے اقبال کا فلسفہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے' وہ زندگی سے نظریں ملانا سکھاتا ہے۔ ہندوستانی فکر کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ زندگی کی توانائیوں کی مزاحمت کرنے والی قوتوں کو معلوم کرکے ان کو اپنے شعور سے ہم آہنگ کیا جائے صرف یہی نہیں کہ ہم مشہود کو بیان کرتے رہ جائیں اور اسی پر اپنی تلاش و جستجو کو مرکوز رکھیں۔ فکرِ اقبال زندگی کے قریب رہتی ہے۔ علمی تشنگی کو بجھانا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اقبال کی تصنیفات انسانی زندگی سے رشتہ منقطع نہیں کرتیں بلکہ انسانی زندگی کے آدرشوں اور جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اقبال کے حوالے سے آزاد لکھتے ہیں کہ دنیائے اسلام روحانی طور پر حرکت پذیر ہو کر مغرب کی جانب گامزن ہے۔ عصر حاضرہ کی تاریخ کا یہ درخورِ اعتنا رجحان یہی ہے۔ اقبال کے نزدیک یوروپی ثقافت علمی سطح پر اسلامی تہذیب و تمدن کے متعدد اہم پہلوؤں کی ایک صورت ہے۔ اقبال کو صرف خدشہ ہے کہ یوروپی تہذیب و تمدن صرف باہری کروفر کی چکا چوند ہی میں پھنس کر نہ رہ جائے اور ثقافت کے بطون رسائی ہی حاصل نہ کر سکے۔ تلاش و جستجو کی ناقابلِ دفع تشنگی اقبال کے ہاں نکتہ فکر ہے۔ علم ہمیشہ محوِ کار رہے اور معمہ ہائے حیات کو حل کرنے پر ہوتا رہے۔ بے عمل دانشمندی سعیِ رائیگاں سے زیادہ کچھ نہیں کہی

جا سکتی۔ قرون وسطیٰ میں اسلامیت اوج کمال کو پہنچ چکی تھی، جب سے موجودہ دور تک انسانی فکر اور اسالیب بیان کے ایوان میں لامحدود پیش رفت ہو چکی ہے۔ انسانی فکر و تجربہ کی رفتار سے قدم ملا کر چلنے ہی سے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات دریافتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور اسی اعتبار سے اسلام ابھی تک زندہ قوت ہے اسی تناظر میں اقبال اسلامی خیال و فکر کی تشکیل نو کرنے پر زور دیتے رہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت گذشتہ روایات کا احترام بھی ضروری ہے۔ اسی طرح ترقیاتی تنظیم دنیوی میں شریک رہنا چاہیے یہ تھا اقبال کا نظریہ۔

آگے بڑھتے ہوئے آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ اقبال نے اسلام کو تعقلی بنیادیں RATIONAL FOUNDATIONS فراہم کیں۔ اس ضمن میں اقبال رسول اکرم کی اس دعا کا کہ "اللہ مجھے علم الاشیاء سے نوازے" خاص طور سے حوالہ دیتے ہیں۔

اقبال کی شاعری اور فلسفیانہ نظریات کے مواخذ اسلامی تعلیمات اور سیرت رسول اللہ تھے۔ اقبال تغیر پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ہم اور تغیر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بنیادی حقیقت حرکت MOVEMENT ہی کا دوسرا نام ہے۔

آزاد صاحب ان قرآنی تعلیمات کی جانب توجہ مبذول فرماتے ہیں۔ جن کا اقبال نے حوالہ دیا ہے۔ اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ "قرآن کی تعلیم جو انسانی رویے میں پیش رفت کے امکانات پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ نہ تو رجائیت ہے نہ قنوطیت۔ یہ عقیدۂ اصلاح و ترقی (MELIORISM) ہے۔ جو کائنات کی بتدریج ترقی کی نشاندہی ہے انسان کی یہ امید کہ بالآخر اس کو شر پر مکمل فتح حاصل ہو جائے گی۔ بغایت جاندار امید ہوا کرتی ہے۔"

اقبالیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو آزاد کے مطالعہ میں نہ آیا ہو۔ روسی مستشرق ایم۔ٹی۔ سٹیپنینٹس (M.T. STEPANYAN) کا حوالہ دیتے ہیں جس نے لکھا ہے کہ "۔۔۔ مزید براں وہ (اقبال) مغربی فلسفے اور سائنس سے بخوبی واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ جدید مذہبی خیالات کو نظریاتی ترغیب کے ساتھ کس طرح پیش کیا جائے۔ اقبال نے فکر مغرب سے وہ سب کچھ جو ان کے اپنے خیالات سے ہم آہنگ معلوم ہوا لے لیا۔ جدت سے آشنا کیے ہوئے اسلام پر پہلا منظم خیالات کو پیش کرنا اپنا نصب العین بنا لیا۔ اور انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی کہ فلسفۂ اسلام فرسودہ نہیں ہے بلکہ ضرورت صرف یہ ہے کہ اسلام کے فلسفے کو ٹکنالوجی اور موجودہ دور کے نئے خیالات کے ذریعہ پیش کیا جائے" آزاد نے مسز اسٹیپنیٹ کے خیالات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

"تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" سات خطبات پر مشتمل تصنیف ہے۔ یہ خطبات اقبال نے سپرد قلم کر کے پیش کئے۔ اقبال کے نزدیک فلسفہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ زندگی کے لیے لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ فلسفہ محض تخیل میں منطقی سطح پر لاتے ہوئے نظریات کو نہیں کہتے۔ ایسی کاوش کو کبھی سیر حاصل نہیں کہا جا سکتا۔ فلسفہ صداقت کو سمجھنے کے لیے سنجیدہ کاوش ہے۔ ایسی کاوش جو صداقت کو روبرو دیکھ سکے۔ ایسی کاوش جو دنیا و مافیہا پر وجدانی ادراک کر سکے۔ اقبال کے نزدیک فلسفہ بشمول مذہب موضوعات کے مطالعہ ہی کے لیے تنظیم نہیں ہے۔ اقبال کا فلسفہ زندگی سے منقطع نہیں ہوتا۔ آزاد صاحب کی رائے میں، اقبال ایسے دماغ کے شخص تھے، ہمیشہ تلاش و جستجو میں منہمک ذہن کے حامل تھے، ایسا ذہن جو نو بہ نو جستجو کے لیے دھڑکتا تھا۔ اقبال کا مشہور شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ خودی کو اتنا بلند کیا جائے کہ خداوند کریم بندے کی رضا کے مطابق اس کو مقدر عطا فرما سکے۔

محولہ فوق شعر قدر اور آزادی عمل سے متعلق اقبال کا نظریہ واشگاف کرتا ہے۔ کسی منزل پر مقدر اور آزادیٔ عمل میں تضاد دکھائی نہیں دیتا دونوں ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے نزدیک، رضائے الٰہی پر سر تسلیم خم کرنا اور اپنی رائے کا آزادانہ استعمال دونوں اسلامی تصوف کے جزو لاینفک ہیں۔ اقبال کو بے پناہ خود اعتمادی حاصل تھی۔ اسی لیے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو اپنی خودی کے وسیلے سے تلاش کرنا [illegible] نوع انسان کو [illegible] نجات دلانے کے لیے اور فلاح و بہبود کی [illegible] کے لیے اقبال [illegible] [illegible] تھا [illegible] [illegible] سمجھتے تھے انسانی زندگی [illegible] ہونا چاہیے۔ کوئی [illegible] حرکت کی

نگاہ سے نہ دیکھے۔ بارگاہِ الٰہی میں اقبال یہی دعا مانگتے تھے کہ اُن کا دل محبت سے بھرپور ہے اور وہ دنیا کو اخوت و مساوات کا پیغام پہنچا سکیں۔

اقبال کی شاعری عشق و اخوت کے جذبات سے بھرپور شاعری ہے اور اقبال نے حُبّ الوطنی کے جذبات پر بھی خاصا کچھ کہا ہے۔

مغرب کی طاقت ٹکنالوجی اور سائنس سے عبارت ہے لہٰذا اقبال یہی قارئین کو یہی تلقین کرتے ہیں کہ تسخیرِ فطرت کے لئے جیسا صحیفۂ خداوندی میں حکم دیا گیا ہے سائنسی مزاج پیدا کرنا چاہیئے اور علوم متداولہ کو حاصل کرنا چاہیئے

اقبال شاعرِ انسانیت تھے "جاوید نامہ" سے حوالہ دیتے ہوئے آزاد کہتے ہیں کہ اقبال گئی گزری سیاست سے بالاتر تھے وہ انسان کی عظمت کی عزت کرتے تھے اور اپنے قارئین سے بھی یہی مطالبہ کرتے تھے۔ انسانیت ربطِ باہمی سے پروان چڑھتی ہے۔ وہ یہی ترغیب دیتے ہیں کہ راہ محبت پر گامزن ہو کر ہم خدا کے حضور میں پہنچ سکتے ہیں۔ اقبال وسعت دل کے حامی تھے ایسی وسعت جس میں سب کچھ سما جاتا ہے افسوس کا مقام ہی تو ہے کہ دلوں کے درمیان فاصلے حائل ہو جائیں۔ وحدت زندگانی ان کا نظریہ تھا۔ ایسی وحدت جس میں ذات پات، فرقے، رنگ، قومیت وغیرہ کے تعینات مٹ کر ایک آغوش میں آجاتے ہیں۔ انسانی شخصیت کا مرکز وحدت انسانیت ہی ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اقبال کا مشورہ یہی رہا کہ دورِ حاضرہ کے علوم کھلے دل و دماغ سے حاصل کیئے جائیں۔

پروفیسر آزاد کی پیشِ نظر تصنیف ہمیں اقبال کو دیکھنے کے لیے "چشم بینا" عطا کرتی ہے۔ آزاد صاحب کی یہ تصنیف اتنی جامع اور مکمل ہے اور اتنی عمدہ زبان میں لکھی گئی ہے کہ اقبال کے کلام تک براہِ ... رسائی نہ رکھنے والے اہلِ نظر حضرات بالخصوص اور انسانیت بالعموم بھی اس کتاب سے مستفید ہوتی رہے گی۔

آزاد صاحب نے بے شمار کتابیں سپردِ قلم کی ہیں، وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل دانشور ہیں۔ اندرونِ ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی پروفیسر آزاد نے مشرق و مغرب کی دارالعلوموں میں خطبات پیش کیے ہیں۔ آزاد صاحب کو بین الاقوامی

باقی بر ص ۱۴۳

پروفیسر عبدالسلام

سائنس کی مستقل پیرائے ترقی

قسط اول

"بنیادی سائنسی تحقیق کے لیے گورنمنٹ کی امداد ایک وفاقی فریضہ ہے .... بنیادی تحقیق ایک قوم کی پائندار صحت کے لیے ضروری غذا ہے۔ کیوں کہ اس کے فوائد انتہائی وسیع اور جامع ہیں لہٰذا بنیادی تحقیق ہماری قومی اصلاح کا ایک اہم ستون ہے"

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے صدر امریکہ کے سائنسی مشیر جارج اے کیورتھ دوم George A. Keyworth نے سائنس اور ٹکنالوجی کی ہاؤس کمیٹی ۱۹۸۴ء کے سامنے بنیادی تحقیق کے فروغ کی وکالت کی۔ ترقی پذیر ممالک میں بنیادی سائنسی علوم کی نظر اندازی ہے ان الفاظ کے ساتھ اظہار خیال کے آغاز کی اجازت دیجیے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو اس لیے اہل سمجھتا ہوں کہ (س) راقم کا تحقیقی طبیعات کا تعلق ایک ترقی پذیر ملک سے ہے اور دوسرے مجھے اٹلی کے شہر ٹریسٹ (TRIESTE) میں واقع ایک بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعات I.C.T.P کے ناظم ہونے کا اعزاز بھی ہے ۱۹۶۴ء میں I.C.T.P کے قیام کے وقت سے اب تک کوئی ۲۲،۰۰۰ تجرباتی اور نظریاتی ماہرین طبیعات اس مرکز میں آئے جن میں سے ۱۱،۰۰۰ کے قریب ترقی پذیر ممالک کی جامعات اور تحقیقی اداروں سے وابستہ تھے۔

پچھلے بیس سالوں کے تجربے کی روشنی میں جو نکتہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ماسوائے چند استثنا جیسے برازیل، چین، اور بھارت کے تیسری دنیا کے باقی ممالک نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائنس اور ٹکنالوجی رگِ جاں ہے اور معاشی خوش حالی کی سب سے بڑی امید بھی، سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ

اپنا رکھا ہے اس حد تک کہ وہ سائنس کو ٹکنالوجی کے مقابلہ میں ایک اضافہ سرگرمی سمجھتے ہیں۔ یہی سوچ امیر ممالک کے امداد دینے والے اداروں اور اقوام متحدہ کی مختلف ایجنسیوں کی ہے اور بدقسمتی سے یہی انداز فکر ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ ان سائنس دانوں کا بھی ہے جن سے یہ امید تھی کہ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کے خاص الخاص ساتھی بنیں گے۔

اس مقالہ کا بنیادی مقصد تیسری دنیا میں سائنس کی ناگفتہ حالت کا جائزہ لینا اور اقوام متحدہ اور دوسرے اداروں کے لیے اس راہ کی نشاندہی کرنا ہے جس سے اس صورت کو بہتر بنایا جا سکے

میں اس بات پر کیوں مُصر ہوں کہ ترقی پذیر ممالک میں سائنس ایک اضافی سرگرمی جاتی ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

اول : پالیسی ساز، معزز کمیشن (مثال کے طور پر برانڈ کمیشن) اور امداد دینے والے ادارے سب کے سب ترقی پذیر ممالک کو ٹکنالوجی کی منتقلی کے مسئلے پر ایک ہی طرح کی سوچ رکھتے ہیں اور یہ وہ کہ بس ٹکنالوجی کی منتقلی ہی کافی ہے اس پر یقین کرنا مشکل ہے لیکن یہ سچ ہے کہ برانڈ کمیشن رپورٹ میں کہیں بھی لفظ سائنس درج نہیں ترقی پذیر دنیا میں بہت تھوڑے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دیرپا اثرات کے لیے ٹکنالوجی کی منتقلی سائنس کی منتقلی کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ آج کی سائنس کل کی ٹکنالوجی ہے یہاں ہم لفظ سائنس کو اس کے وسیع تر معنی میں استعمال کر رہے ہیں جس سے مراد یہ بھی ہے کہ ایسی سائنس جو بآسانی بروئے کار لائی جا سکے۔ میں تو یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ اگر کوئی دوہری چال کھیل رہا ہے تو اس کے ان شرارت آمیز ارادوں کو تاڑ لینا چاہیئے جو ہمیں ٹکنالوجی کی منتقلی بغیر سائنسی علوم کی منتقلی کی تجویز پیش کرتے ہیں تیسری دنیا میں اس سے زیادہ نقصان ہمیں کسی نے نہیں پہنچایا جتنا کہ امیر ممالک کے مناسب سائنس (Relevant Science) کے نعرہ نے بڑا قابل افسوس ہے کہ اس نعرہ کو ہمارے ممالک نے بغیر سوچے سمجھے ہر قسم کی سائنس کی ترقی کے لیے موافق اور مناسب گردانا۔

دوم : سائنس کی منتقلی سائنس دانوں کی برادری سے متاثر بھی ہوتی ہے اور اسے متاثر بھی کرتی ہے۔ ایسی کمیونٹی یا برادری کے لیے لازم ہے کہ اس کی افرادی قوت اور ضروری ابتدائی ڈھانچہ (Infrastructure) ... صلاحیتوں کو ایک خاص حد تک بڑھایا

یہ منشور قابل دانشمندانہ طویل مدتی سائنس پالیسی بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہمارے ممالک میں اعلیٰ صلاحیت کے سائنس دانوں کو قوم کی تعمیر میں برابر کا شریک ہونے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اسی طرح جب ایک ماہر معاشیات یا ایک ٹکنالوجسٹ کو شریک کیا جاتا ہے ابھی تک چند ہی ترقی پذیر ممالک نے ایسا طرز عمل نافذ کیا ہے اور چند ہی امداد دینے والے اداروں نے سائنسی علوم سے ضروری ڈھانچہ ([illegible]) کی تعمیر میں حوصلہ افزائی کرنے اور امداد دینے کا منشور بنایا ہے

سائنس کی منتقلی کیوں؟

جن سائنسی علوم کی میں بات کر رہا ہوں ان کا ([illegible]) کیا ہے اور کیوں؟ اول اور سب سے مقدم ہمیں ہر سطح پر اور خاص کر اعلیٰ سطحوں پر (کم از کم، انجینئرز اور ٹکنالوجسٹ کے لیے سائنسی خواندگی اور سائنسی تدریس کی ضرورت ہے اس کام کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کے اساتذہ کی خدمات چاہئیں اور اس وقت تک کوئی بھی اعلیٰ استاد نہیں بن سکتا جب تک کہ اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے کیریر کے کسی حصہ میں کچھ نہ کچھ جدید سائنس میں تحقیق و تجربے سے استفادہ نہ کیا ہو۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہماری تجربہ گاہیں ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہوں (اس سائنسی تیز رفتاری دور میں) جدید ترین جرائد اور کتب دستیاب ہوں یہ کسی ملک کے سائنسی ([illegible]) کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اس کے بعد ترقی پذیر ممالک کے ادارے اور ابھرتی ہوئی صنعتیں اپنے اپنے ممالک کے سائنس دانوں سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ بلا امتیاز کے مشورہ دیں کہ ملک کے لیے کونسی ٹکنالوجی مناسب اور قابل حصول ہوگی۔

مزید برآں ترقی پذیر ممالک کی قلیل تعداد کے لیے اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ بنیادی سائنس کے ماہرین اپنے اطلاقی سائنس کے رفقائے کار کی تحقیقی کام میں مدد کریں۔ کسی بھی معاشرہ کے لیے اس کے زراعتی مسائل، نقصان پہنچانے والے کیڑوں اور بیماریوں کے اور مقامی مال کے ضروری اجزا کے مسائل کا حل مقامی طور پر ہی ہونا چاہیے ان شعبوں میں اطلاقی تحقیق کے لیے بنیادی سائنس میں اعلیٰ درجہ کی بنیاد کا سہارا ضروری ہے۔

ایک ترقی پذیر ملک میں اطلاقی سائنس کی پرورش بنیادی سائنس کی پرورش

سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ اطلاقی کام کی مناسبت سے جس بنیادی علم کے جاننے کی ضرورت ہے وہ پڑوس سے یا ٹیلی فون کے ذریعہ میسر نہیں ہے۔

اور آخر میں ایک ملک کی اعلیٰ سطح کی تعمیر کے لیے بنیادی سائنس میں تحقیق ایک اہم ضرورت ہے جو مستقبل میں ٹکنالوجی کی صورت میں فائدہ پہنچائے گی۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں ذہن میں آتی رہیں۔

میرے تحقیق کے میدان میں ہی ہونے والی ترقیوں کی مثال لیجیے یعنی فطرت کی بظاہر مختلف قوتوں میں وحدت کی تلاش۔ اس سلسلے میں فیراڈے (FARADAY) نے پچھلی صدی میں برق و مقناطیسی قوتوں کی پوشیدہ وحدت کے انکشاف کی جو شروعات کی وہ یقیناً ایک بہت ہی روشن مثال ہے فیراڈے (FARADAY) اپنے تجربات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب ساکن برقی بار اپنے گرد برقی بار پر برقی اثر ڈالتا ہے تو متحرک برقی بار ایک مقناطیسی میدان پیدا کرتا ہے اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات تک نہ تھی کہ یہ معمولی دریافت جو کہ لندن میں (Wimbledon) میں قائم شدہ تجربہ گاہ میں ہوئی ہے وہ بجلی پیدا کرنے کی ٹکنالوجی کی بنیاد ثابت ہوگی۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے فیراڈے کے کام کو اس کے ہم عصر کتنا بے سود سمجھتے تھے ذرا چارلس برنی کے ان تاثرات کو سنیں جو اس نے برق اور میوزک کے فوائد کا موازنہ کرتے ہوئے رقم کیا ہے "عام طور پر برق ایک نہایت دلچسپ اور حیران کن مظہر قدرت سمجھی جاتی ہے لیکن اکثر اس بات پر اظہار تاسف بھی کیا جاتا ہے کہ اسے اب تک یقینی طور پر کسی علاجی مصرف میں نہیں لایا جا سکا۔ جبکہ یہ بتلانا آسان ہے کہ کس طرح موسیقی کو انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال میں لایا گیا ہے اس سے نہ جانے کتنے یتیموں کی پرورش ہوتی ہے اور درد و چنگی کی شدت میں کمی آتی ہے جس سے جان جانے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

برق مقناطیسی قوتوں کی وحدت کو واضح طور پر میکسویل (MAX WELL) نے ثابت کیا جو فیراڈے کے فوراً بعد آیا خالص نظریاتی بنیاد پر (MAX WELL) نے یہ پیشن گوئی کی کہ حالت اسراع میں ایک چارج برق، مقناطیسی شعاع پیدا کرے گا ۱۸۷۹ء میں (MAX WELL) کے انتقال کے چند سال بعد جرمنی میں HERTZ نے

اس پیشن گوئی کی توثیق کی اور یہ پایا کہ میکسویل کا تجویز کردہ شعاعی طیف، نوری امواج لمبی طول والی ریڈیائی امواج اور چھوٹی طول موج والی ایکس ریز پر مشتمل ہے اس طرح ایک غیر معروف پروفیسر کے پیش کردہ بظاہر معنوی نظریہ کی قیاس سے ریڈیو، ٹیلی ویژن جیسے جدید نظام خبر رسانی نیز انسانی جسم کے اندر دیکھنے والی X-Rays جیسے نمو پیدا ہوئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں فیراڈے کے وقت سے یعنی میکسویل کے سو سال بعد حالات کیسے بدلے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں میرے ہم عصر گلیشو (Glashow) اور واشنگ برگ (Weinberg) اور یورپ میں میں نے اپنے اپنے طور پر اگلا قدم اٹھایا جو قدرت کی دو اور قوتوں کو یکجا کرنے کے متعلق تھا یعنی برقنا طیسی اور کمزور نیوکلیائی قوتوں کی وحدت۔ اس پر لندن نے پرزور الفاظ میں مستقبل کے تاجروں کو مشورہ دیا کہ اس نئی دریافت کے معاشی نتائج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

پچھلے سال جنوری ۱۹۸۳ء میں جنیوا میں قائم عظیم یورپین مرکز برائے نیوکلیر تحقیق (CERN) نے ہمارے نظریے کی براہ راست تصدیق کی۔ یہ کارنامہ اعلیٰ ترین تکنیکی مہارت کی وجہ سے تقریباً ۵۰ ملین ڈالر کی لاگت سے ممکن ہوا۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا ہوں کہ ترقی پذیر ممالک CERN کے طرز کی (Accelerators) تجربہ گاہیں تعمیر کریں اور پھر لندن کی طرح نئی قوتوں کے وحدت کے نظریے کے براہ راست [illegible] کی طرف سے اچھی امید رکھے ہوئے ہیں لیکن اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ (Accelerator) تجربہ گاہیں (Micro-electronics، Semi Conductor [illegible]

Material Science Technology

صنعتوں میں اعلیٰ ترین ٹکنالوجی کا منبع ہیں میں اس خبر کو مسرت [illegible] [illegible] نے لیباریٹری سے منسلک ایک خاص ادارہ قائم کیا ہے۔ کا مقصد [illegible] [illegible] اور اس کے متعلق ٹکنالوجی لاطینی امریکہ کے ماہرین طبیعیات [illegible] CERN لیباریٹری نے اپنی (Microprocessors) [illegible] [illegible] کو مستعار دی ہیں۔ مضمون نے پہلے ہی چار مضمون [illegible] معیار کے Microprocessors فزکس اور ٹکنالوجی کالج، ترقی پذیر ممالک کے [illegible] کے لیے منعقد کیے۔ جون ۱۹۸۴ء میں یہ ٹیم سری لنکا میں [illegible] ۶۴ ماہرین طبیعیات کے لیے چار ہفتے کا ایک Microprocessor کالج [illegible]

انعقاد ہو رہا ہے اسی مضمون میں بعد میں ۱۹۸۵ء ۱۹۸۶ء سے ۱۹۷۷ء ۱۹۸۸ میں چار بین [illegible]
کے ملاوہ چین، کولمبیا، آئرلینڈ اور مراکو میں بھی منعقد ہوں گے۔

مختصر یہ کہ موجودہ حالات میں نکلتا ہو جی اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتی جب [illegible]
[illegible] ساتھ سائنس بھی فروغ نہ پا سکے حال ہی میں [illegible] کا پانچواں [illegible]
[illegible] سلطان سلیم II نے ۱۷۹۹ء [illegible]
[illegible] دھات گری کی تدریس [illegible]
[illegible] مضمون میں خاص [illegible]
[illegible] یورپی طریقہ [illegible]
[illegible] ترکی [illegible]
[illegible] سائنس کی امداد کے بغیر [illegible]

[illegible] علوم کی صورت حال

[illegible]

اور سائنس [illegible]

[illegible] مثال [illegible]

کیمبرج اور [illegible] والے

کے لیے واپس آ گیا [illegible]

تھا جس نے اس مضمون میں بھی کام کیا تھا۔ [illegible]

یعنی ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی تعداد

شمولیت کے لیے کسی قسم کا کوئی فنڈ میسر نہ تھا

میں کانفرنس میں شرکت کی تو اپنی ایک سال کی [illegible]

تیس سال سے بعد پاکستان میں صورت [illegible]

۸ کروڑ کی آبادی والے ملک میں ۱۶ [illegible] میں طبیعیات

دانوں سے ماہرین کی تعداد ۴۶ ہے (امریکہ کے [illegible]

ملک کے لیے یہ تعداد ایک سو کتنا زیادہ ہو [illegible]

ماہرین طبیعیات ابھی [illegible] مسائل کا سامنا کر سکتا [illegible]

تباہی، مقالوں کی اشاعت کے اخراجات، کانفرنس میں شرکت وغیرہ وغیرہ سے ہے
...ں آج بھی بین الاقوامی یونین برائے خالص اور اطلاقی طبعیات کا ممبر نہیں ہے
ہمارے ناظمین سائنس کا خیال ہے کہ وہ ۱۵۰۰ ڈالر کی فیس ادا نہیں کر سکتے
ماہرین طبعیات کو ابھی ایسا بتلایا جاتا ہے کہ تمام بنیادی سائنس حتیٰ کہ وہ
جو اطلاقی طبعیات کے لیے ضروری ہیں - پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے
...ت ہی بھیانک عیاشی لگتی ہے - [illegible] پاکستان [illegible] ایک اور خصوصی
کے حامل ۳۰ ممالک کے گروپ جس کا ذکر بعد میں آئے گا باقی ۶۰ ممالک ترقی
... میں صورت حال بالکل ایسی ہی ہے جیسی پاکستان کی ۱۹۵۱ء میں
سب سے اہم مسئلہ سائنس دانوں کی مناسب تعداد کا ہے ان میں سے
...ممالک میں ریسرچ میں تربیت یافتہ ماہرین طبعیات کی تعداد ایک ہاتھ
... شمار کی جا سکتی ہے۔

...ین نے جن شعبوں میں تربیت حاصل کی ہے وہ بیشتر کسی منصوبے
...یں بلکہ اتفاقی ہے ان کی اپنی کوئی برادری نہیں۔

۱۹۶۰ء کے عشرہ میں ٹریسٹ (TRIESTE) میں ایک بین الاقوامی مرکز برائے نظری
... معرض وجود میں آیا جب تیسری دنیا میں سے ہم میں سے بعض لوگوں نے
...حدہ کے اداروں خاص کر IAEA اور UNESCO سے اصرار کیا کہ وہ نظریاتی طبیعیاتی
... اس صورت حال کو سدھارنے میں ہماری مدد کریں۔ اس سلسلے میں بعض
...فتہ ممالک کی ناسمجھی بھی ہمارے سامنے آئی - یہ وہ ممالک ہیں جہاں فزکس
...وتی ہے IAEA میں ایک ترقی یافتہ ملک کا مندوب یہاں تک کہہ گیا۔
...ریاتی طبیعیاتی سائنس کی رولز رائس Rolls Royce ہے ترقی پذیر ممالک کو
...یل گاڑیوں کی ضرورت ہے۔

...ن صاحب کے لیے یہ ۵۰ ماہرین جو تمام کے تمام اعلیٰ تربیت یافتہ تھے پاکستان
... کے لیے جس کی آبادی اس وقت ۱۲ کروڑ ہے [illegible] محض ۵۰ ہے
... مسلمان تھے - ریسرچ میں ان کی شمولیت کی بات تو ایک طرف یہ لوگ
...ان میں طبیعیات اور ریاضی کی تعلیم کے پورے نظام کو تربیت دینے والے
...کو [illegible] ضوابط کے ذمہ دار تھے۔ ان کی یہ بات [illegible] - وہ [illegible]

تھے جو IAEA جیسے سائنسی ادارے میں داخل ہوئے وہ یہ تو پوری طرح سمجھتے تھے کہ ہمیں اعلیٰ معیار کے ماہر معاشیات درکار ہیں لیکن ریسرچ میں تربیت یافتہ ماہرین طبعیات اور ماہرین ریاضی ان کے نزدیک عیاشی تھی۔

کافی دباؤ ڈالنے پر تجویز پیش کرنے کے چار چار سال بعد IAEA طبعیات کا ادارہ قائم کرنے پر رضامند ہوا اور ہمیں ایک تحقیقی بین الاقوامی مرکز بنانے کے لیے ۵۱۰۰۰ ڈالر کی رقم مختص کی گئی۔ خوش قسمتی سے اطالوی گورنمنٹ کی فیاضانہ سالانہ ایک تہائی ملین ڈالر کی گرانٹ میسر آ گئی اور یہ مرکز ٹریسٹ TRIESTE میں قائم ہو گیا بین الاقوامی فزکس برادری نے ہماری مستقل حوصلہ افزائی کی۔ مرکز کی پہلی سائنٹفک کونسل میٹنگ میں R. J. Bohr, Aage Bohr, Weisskopf, Heisenberg, Abdus Salam, Oppenheimer نے مرکز کے آئین کی تشکیل دی۔

مرکز نے ۱۹۶۴ء میں کام کرنا شروع کیا یونیسکو نے IAEA کے ساتھ برابر کا شریک کی حیثیت سے ۱۹۷۰ء میں شمولیت اختیار کی۔ مرکز اس وقت سے بڑھتا جا رہا ہے ان کی حمایت سے بھی جو کبھی اس کے جواز پر شک کرتے تھے اس کے فنڈ کا بیشتر حصہ جو کہ اب ۵.۶ ملین ڈالر ہے اٹلی IAEA اور UNESCO سے دستیاب ہے چھوٹی عارضی گرانٹ وقتاً فوقتاً ان جگہوں سے بھی ملی ہیں اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (U-N-D-P) اقوام متحدہ کا مالی امداد سسٹم برائے ترقی سائنس اور ٹیکنالوجی۔ یونیورسٹی اقوام متحدہ انٹیل جدا اور برآمد کرنے کی کارپوریشن (....) کا فنڈ امریکی محکمہ توانائی فورڈ فاؤنڈیشن بین الگورنمنٹ ادارہ برائے اطلاعات (IBI) کینیڈا لیبیا قطر، سویڈن، جرمنی، سری لنکا، نیدرلینڈ، جاپان، ڈنمارک۔ ان سالوں کے عرصہ میں جب سے یہ مرکز قائم ہوا ہے اس نے اپنی توجہ خالص طبعیات کی بجائے خالص اور اطلاقی فزکس دونوں کے سرحدی شعبوں کی طرف تبدیل کر دی ہے مثلاً اس طرح نئے شعبے مادی طبعیات اور مائکرو پروسیسر طبعیات، توانائی کی طبعیات فیوژن کی طبعیات، اعصابی طبعیات، لیزر طبعیات، سمندر اور صحرا کی طبعیات، معدنی طبعیات، طبعیات شمسی اور غیر توانائی، ارضی طبعیات، حیاتی طبعیات اور سسٹم کے تجربے۔ یہ جدید توا

پیر توکھلر

انسانی وسائل کا فروغ... کیونکر

بھارت دنیا کا ساتواں سب سے بڑا ملک ہے اور ۳۲،۸۷،۲۶۳ مربع کلومیٹر کے رقبے پر مشتمل ہے جس میں ۱۵۲۰۰۰ مربع کلومیٹر کی طویل اس کی سرحد ہے۔ جبکہ ساحلی علاقہ ۷۵۱۶.۶ کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ بھارت کے پاس پوری دنیا کا صرف ۲.۴ فیصد زمینی علاقہ ہے جبکہ انسانی آبادی کا تقریباً ۱۵ فیصد حصہ یہاں آباد ہے۔ سال ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق بھارت کی آبادی ۶۸،۵۱،۸۴،۶۹۲ ہے۔ سال ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مقابلے میں سال ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی میں تقریباً ۲۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ شرح پیدائش میں قدرے کمی ہونے کے باوجود آبادی میں اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ صحت عامہ کی بہتر سہولیات، وبائی بیماریوں کا مؤثر طور پر روک تھام، رہن سہن کے معیار میں عام طور پر بہتری اور اقتصادی ترقی ہے۔ بھارت کی موجودہ شرح خواندگی صرف ۳۶.۲۳ فیصد ہے۔ مردوں میں ۴۶.۸۹ فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں جبکہ خواتین کی شرح خواندگی صرف ۲۴.۸۲ فیصد ہے۔ ۱۵ سال سے ۳۵ سال کی عمر تک کے گروپ میں ۲۵.۳۲ فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ نوجوانوں کی کل آبادی کے ۷۴ فیصد لوگ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ پیدائش اور فوقی اعداد و شمار ... ۱۹۹۱ء تک نوجوانوں کی آبادی بڑھ کر ۲۹۳۵.۰۵ لاکھ ہو جائے گی اور ... ۳۱۲۵.۸ لاکھ ہو جائے گی جو کہ دنیا بھر کے نوجوانوں کی کل آبادی کا ۲۴ فیصد ہوگا۔

بھارت پنجسالہ منصوبوں کے ذریعہ منصوبہ بند ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبہ کا خاص زور انسانی وسائل اور مادی نیز معاشی وسیلوں کی ترقی اور فروغ پر ہے۔ ملک نے ۱۹۸۶ء سے ایک نئی تعلیمی پالیسی اختیار کی ہے۔ جس کی تشکیل ۲۱ ویں صدی کے چیلنجوں اور ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے تحت بہت سی سرگرمیوں مثلاً غذا، صحت، ثقافت، تعلیم، محنت، زراعت اور خوراک شامل کیا گیا ہے۔ پیدا ہونے والے ہر بچے کو ان سرگرمیوں کے فوائد پہنچنے چاہییں۔ حمل ٹھہرنے سے لے کر گریجویشن تک کا مرحلہ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے دائرہ کار میں آتا ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے شعبے کا مقصد تمام مرد اور خواتین کی تعلیم کو جاری رکھنے اور انہیں ایک باعزت اور باوقار زندگی مہیا کرنے سے بھی وابستہ ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی وفروغ کی وزارت:۔ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی وزارت ۲۵ ستمبر ۱۹۸۵ء کو عمل میں آیا۔ جس کے پانچ اہم محکمہ ہیں۔ جن میں تعلیم کا محکمہ، ثقافت کا محکمہ، فنون کا محکمہ، خواتین اور بچوں کی [illegible] و فروغ کا محکمہ اور نوجوانوں کے امور نیز کھیل کود کا محکمہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں [illegible] لئے ان تمام ترغیبات میں تال میل پیدا کرنا اور ہر طرح کی موجودہ نابرابری کو ختم کرنا نہایت [illegible]

بہت سی وزارتوں کی منظم کوششوں سے ایک ایسا طریقہ وضع کرنا ہوگا۔ جس میں تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم کردار ہو۔ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کا محکمہ اخراجات میں کمی لانے، کارکردگی اور زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کا، جیسا کہ جاپان، کوریا اور دیگر ممالک میں ہوا ہے۔ کام انجام دے گا۔

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کا ڈھانچہ ابھی تک تو صرف مرکزی ہی رہا ہے۔ ایک یا دو ریاستوں نے بھی انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے محکمے قائم کئے ہیں۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ ریاستی ڈھانچے کا شکل اختیار کریں گے۔ بچوں، خواتین اور نوجوانوں نیز تعلیم کے سلسلے میں انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے معاملے میں مرکز اور ریاست دونوں کو ایک مربوط منصوبۂ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

منظم شعبے میں انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کا بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر انتظامی امور کے ماہرین ملازمین کی قابلیت کا پتہ لگانے اور تربیت، کیریئر، منصوبہ وغیرہ کے ذریعہ ان قابلیتوں کو فروغ دینے کی غرض سے ایک منظم منصوبہ اختیار کرنے کیلئے اس کا استعمال کرتے ہیں۔

خواتین کا کردار:۔ ساتویں پنجسالہ منصوبہ کا ایک خاص مقصد سماجی ترقیاتی شعبوں میں عورتوں کو مردوں کے برابر کا شریک کار بنانا اور فوائد ان تک پہنچانا

ترقیاتی سرگرمیوں میں ان کو ان کا جائز حق اور مقام دلانا۔ اور ان کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے منصوبہ بندی کی کارروائی میں اور پالیسیوں پر عمل آوری کے سلسلے میں خواتین کو ایک بالکل ہی الگ نشانے کا گروپ شمار کیا جاتا ہے۔ مادّی نشانوں اور متعلقہ وزارتوں کی ترقیاتی اسکیموں میں خواتین کا حصہ الگ سے مخصوص ہے۔ جس کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ مطلوبہ توجہ صرف پالیسی سازی کے وقت ہی مرکوز نہ ہو بلکہ خواتین کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لئے عمل آوری کے سلسلے میں بھی اس کو مرکوز کیا جائے۔

پارلیمنٹ نے ۱۹۸۳ء میں ضابطۂ فوجداری کے دو ترمیمی بلوں کی منظوری دی ہے۔ جس کے تحت خواتین پر ان کے شوہروں اور دوسرے رشتہ داروں کے ذریعہ کئے جانے والے مظالم اور جنسی [illegible] تشدد سے نمٹنے کے لئے مخصوص اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ ان معاملوں میں ثبوت [illegible] کے مسئلے کو مقدمہ دائر کرنے والے سے منتقل کر کے ملزم پر ڈال دیا گیا ہے۔ [illegible] خواتین اور لڑکیوں میں انسداد جسم فروشی سے متعلق ۱۹۵۶ء کے ایکٹ میں بھی کچھ ترامیم کی گئی تھیں۔ تاکہ اس کی قانونی خامیوں کو دور کیا جاسکے۔

ملک بھر میں لڑکیوں کو بارھویں درجہ تک مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کچھ ریاستوں میں تو یہ سہولت یونیورسٹی سطح تک بھی مفت حاصل ہے۔ ان سب کے باوجود سبھی شعبوں میں خواتین کی نمائندگی ایک خاص سطح سے نیچے ہی ہے۔ مزدوروں کی قوت کا ایک چوتھائی حصہ خواتین پر مشتمل ہے۔ حکومت سنہ ۲۰۰۰ء تک سبھی کے لئے بنیادی صحت سے متعلق سہولیات کے حصول کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس مقصد اور نئے بیس نکاتی پروگرام کی مطابقت سے رضاکارانہ طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے فروغ کو ایک مقبول عام تحریک کے طور پر بڑھاوا دینے کی تجویز بھی ہے۔

مربوط وقف:- انسانی وسائل کی ترقی و فروغ صرف ایک نیا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ترقی کے لئے ایک مربوط کی تشکیل کرتا ہے۔ جو غریبوں اور دیگر پسماندہ طبقوں اور گروپوں سمیت سبھی افراد کی صلاحیتوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ نیز سماجی اور ثقافتی پیش رفت میں آنے والی دشواریوں کو دور کرنے میں ان کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ ایشیاء اور بحرالکاہل کے لئے اقتصادی اور سماجی کونسل (ای ایس سی اے پی) نے انسانی وسائل کی ترقی وفروغ پر مربوط منصوبۂ عمل سے متعلق مودے میں جامع طور پر تمام

پروگراموں کو شامل کیا گیا ہے۔ جس میں پالیسی سے متعلق ۲۰۳ بڑی بڑی تجاویز اور عمر کے لیئے ۱۰۶ خصوصی تجاویز بھی شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر شعبہ جاتی ہیں۔

بھارت کے سلسلے میں ثقافت انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کا ایک اہم پہلو ہے ہمارا خیال ہے کہ ثقافتی پہلو پر بھی خاص توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ تجدید کا اور یہاں کا بیش بہا ثقافتی ورثہ ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی تجدید اور اس عظیم وراثت اور اقدار کا ایک بہترین امتزاج اپنائیں۔

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کا نظریہ، افرادی قوت کو بروئے کار لانے اور اقتصادی ترقی نیز ثقافتی فروغ کے لیئے قدرتی وسائل کو دوبارہ استعمال میں لانے پیدا کرنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی دریافت شدہ افرادی قوت کو محفوظ کرنے ایک مستحکم نظام بھی ہونا چاہیئے کہ مجموعی قومی ترقی کی تقسیم مساوی رہے۔

لہذا بنیادی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان ہی ہے۔ جو ترقی اور فروغ کا فی الحال ملک کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ انسانی وسائل کی ترقی کے نظریہ کو محض تعلیمی مباحثوں اور ترقیاتی مطالعوں کی سطح سے اوپر اٹھا کر کسی اہم حکمت عملی کی سطح پر لایا جائے اور اسے پالیسی کا ایک عملی پہلو کس

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کیا ہے

وسائل کی ترقی و فروغ کے ذریعہ علم و ہنر اور سماج کے سبھی طبقوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتصادی معنوں میں اس کی وضاحت تور اور معیشت کی ترقی و فروغ کے سلسلے میں اس کی موثر کی جا سکتی ہے۔

سماجی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے انسانی وسائل کی ترقی و فروغ بھرپور اور کارآمد زندگی، جس میں روایتوں کی شکستیں کم ہوں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ ہمارے لیئے جدید اگر ہم اس ترقی کے عمل کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ انسانی وسائل کا سے زیادہ بنیادی اور عملی ہے۔ اور چونکہ تعلیم کے بغیر انسانی وسائل کا اس لیئے تعلیم کی اس کے لیئے اہمیت بہت زیادہ ہے۔

مختلف اجزاء: ۔ اگرچہ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے مختلف اجزاء مثلاً [illegible] اور خوراک، پوشاک، مکانات، صفائی، صحت عامہ کی سہولیات، تعلیم، اطلاعاتی ذرائع ابلاغ، توانائی، توانائی کی کھپت اور نقل و حمل کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ لہٰذا انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی طرف ایک مربوط نظریے اور پالیسیوں اور پروگراموں [illegible] منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی نظامِ تقسیم کی مؤثر لامرکزیت ہیں جس کا زیادہ [illegible] مقامی [illegible] کی شرکت اور دیگر پروگراموں کی عمل آوری میں ان کی شرکت پر ہوتا [illegible]

[illegible] اور ثقافت، نوجوانوں سے متعلق خدمات اور کھیل کود، بچوں اور خواتین [illegible] متعلق [illegible] طرح کی سرگرمیاں جن کا شمار انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی وزارت [illegible] کیے [illegible] میں کیا جاتا ہے۔ ان کا آپسی ربط [illegible] انسانی وسائل کی ترقی [illegible] مقصد کا پہلا قدم ہونا چاہیے۔

پالیسی: تعلیم سے متعلق قومی پالیسی [illegible] اوپر کیا جا چکا ہے۔ [illegible] اور تعلیم مثلاً ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور تکنیکی نیز انتظامی تعلیم کے [illegible] اور [illegible] پروگراموں کی شروعات کے ذریعہ تعلیم کی ازسرِنو [illegible]

[illegible] تعلیم اور ترقی کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانا ہے۔ ترقی کے لئے [illegible] ہوتی ہے۔ ان میں تعلیم کو پیشے سے منسلک کرنا، کام کا عملی [illegible] نوکریوں سے ڈگریوں کو الگ کرنا، ذرائع ابلاغ اور ٹکنالوجی [illegible] نظام کے تحت [illegible] تحقیقی اور ترقیاتی [illegible] کو مضبوط [illegible]

[illegible] تعلیمی [illegible] اور [illegible] کو مزید اشتراکی، قابلِ عمل اور مقامی [illegible] ساتھ ہی [illegible] پالیسی [illegible] اور انتظامی میں [illegible] رضاکار ایجنسیوں، تعلیمی بورڈوں اور تعلیم کے ریاستی بورڈوں کی [illegible] ذریعہ ان کو زیادہ کارگر اور مؤثر بناتی ہے۔

[illegible] پالیسی کا مقصد، تعلیم بالغاں کے پروگراموں کو مستحکم بنانا اور اس کی ازسرِنو

ترتیب بھی ہے۔ جو اس کو قومی نشانوں سے جوڑتی ہے۔ اور جس کا زیادہ تر زور ہمہ
اور اس کے فروغ پر ہے۔

اس کے علاوہ اس پالیسی کا مقصد فنی اور ثقافت کے تئیں لوگوں میں پیدا کرنا ا
اقدار کو فروغ دینا بھی ہے۔

علاوہ ازیں اس پالیسی کا مقصد جسمانی تعلیم اور کھیل کود کے لیئے قومی سطح پہ
بنیادی ڈھانچے کی تشکیل بھی ہے۔ چونکہ تعلیمی سرگرمیوں کا ایک مربوط اور اہم حصہ
انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی وزارت نے ایک تفصیلی منصوبہ عمل تیار کیا ہے۔
ذیل اہم شعبے تعلیم اور دیگر متعلقہ شعبوں کے درمیان ایک اہم رابطہ فراہم کرتا

عمل کے لئے پروگرام :- خواتین اور بچوں کی تیز تر ترقی ا
انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی پالیسی کے ایک اہم جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بچوں کی ش
کے مجموعی ارتقا اور فروغ کے لیئے تعلیم، صحت عامہ اور اچھی خوراک مہیا کرنے کی غرض
وسائل کا مربوط استعمال بہت ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ابتدائی اسکول کے
ابتدائی سے قبل کی تعلیم اور بچوں کی دیکھ ریکھ سے متعلق پروگراموں کو بچوں کی ترق
کی خدمت کے مربوط پروگرام کے ساتھ مناسب طور پر منسلک کر دیا جانا چاہیے۔

سماجی اور اقتصادی ترقی میں تعلیم بالغان کے پروگرام ایک اہم کردار ادا کر
اس سلسلے میں موجودہ پروگراموں کو مضبوط بنانے پر زور دیا جائے گا۔ اور انہیں
کی مساوات کے فروغ ماحولیاتی تحفظ اور قومی یکجہتی جیسے قومی نشانوں کے س
جوڑ دیا جائے گا۔ خواتین کی خواندگی میں قابل ذکر اضافہ کے حصول کو سب سے
ترجیح دی جائے گی کیونکہ اس سے چھوٹے کنبے کے نظریے کو اپنانے صحت کے ب
اور بچوں کی ترقی و فروغ پر اثر پڑے گا۔

مذکورہ قومی پالیسی، انفرادی روزگار میں اضافہ کرنے، یا ہنر افرادی قوت
اور سپلائی کے درمیان فرق کو کم کرنے اور بغیر کسی خاص دلچسپی یا مقصد
حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کو ایک متبادل فراہم کرنے کے لیئے منظم، منہ
اور پیشہ وارانہ تعلیم کے پروگراموں کو تیزی سے عمل میں لانے کی ضرورت پر
دیتی ہے۔ اس کام کے لیئے پیشہ وارانہ کورسوں کو ماہرین صنعت اور مختلف

میں یا ہنر افرادی قوت کی ضروریات بشمول زراعت، خرید و فروخت (مارکیٹنگ) اور ملازمتوں کے مطابق تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ نیم طبی اور صحت عامہ سے متعلق افرادی قوت کے مناسب زمروں کی تربیت کو بھی نرسنگ جیسے صحت عامہ سے متعلق پیشہ ورانہ کورسوں والے تعلیمی پروگراموں کے ساتھ جوڑے جانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں موثر نصابی ہم آہنگی، مسلسل تعلیمی پروگراموں پر عمل آوری، دیگر شعبوں کی سہولیات کے فوائد اور امدادی خدمات کی سہولیت کی فراہمی اور پیشہ ورانہ، تکنیکی، تعلیمی اور عام تعلیمی پروگراموں کے درمیان موثر روابط قائم کئے جارہے ہیں۔ اس قسم کے روابط کے لئے متوازی اداروں اور ایجنسیوں سے صلاح مشورے کے بعد تکنیکی تعلیم سے متعلق کل ہند کونسل ایک خصوصی نظام تشکیل دے گی۔

رسمی اور غیر رسمی دونوں شعبوں میں سود مند اطلاعات کی ترسیل میں تعلیم سے متعلق ٹکنالوجی کا مزید استعمال، اساتذہ کی تربیت اور پھر سے تربیت تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے فن اور ثقافت کے تئیں بیداری میں اضافہ کرنے اچھی اقدار کو ذہن نشین کرانے کے لئے وزارت اطلاعات و نشریات کے ساتھ قریبی تال میل کی ضرورت بھی ہوگی۔ تاکہ مختلف ذرائع ابلاغ کی مدد اس مقصد کے لئے لی جاسکے۔

چند مسائل:- پروگرام پر کامیابی کے ساتھ عمل آوری کی راہ میں متعدد مسائل درپیش ہیں۔ مختلف وزارتوں کے درمیان روابط سے متعلق ذرائع ابھی تک قائم نہیں کئے جاسکے اور اطلاعات کے تبادلے کا کام ابھی تک شروع نہیں ہوسکا۔ ہنوز اس طرح کے بین محکمہ جاتی تعلقات بہت ہی کمزور ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ زیادہ تر ترقیاتی کوششیں مرکزی اور ریاستی حکومت کے محکموں کے ذریعہ شروع کی جاتی ہیں۔ تعلقات قائم کرنے کی کارروائی کے نتیجے میں تعلیم سمیت بنیادی خدمات مہیا کی جانی چاہئیں۔ اور اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیے کہ متعلقہ گروپوں تک مذکورہ اسکیموں کے تحت فوائد پہنچ سکیں اور ان کی موثر کارکردگی کے لئے ایک نظام بھی وضع کیا جانا چاہیے۔ مرکزی اور ریاستی سطحوں پر ایسی تال میل والی ایجنسیز کے قیام سے فیصلہ کرنے کے عمل اور عمل آوری کی کارروائی میں آسانی ہوگی۔

فنڈ لے:- انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ساتویں پانچسالہ

منصوبے میں تعلیم کے لئے خصوصی طور پر ۸۸-۱۹۸۷ء کے لئے مختص میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ریاستی شعبے میں بھی تعلیم، صحت اور سماجی بہبود کے تحت کی جانے والی مختص ساتویں پانچسالہ منصوبہ میں مخصوص کی جانے والی رقم سے کچھ بڑھ جائے گی۔ اس کے باوجود مسائل کی وسعت کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سرکاری بجٹوں میں جو رقم مخصوص کی جاتی ہے۔ وہ کافی نہیں ہوگی۔ لہذا تال میل کے بہتر طریقے اختیار کرنے اور انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے لیے فراہم کئے جانے والے فنڈ کے صحیح استعمال کے لئے اقدامات کئے جانے کی ضرورت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی بلاک یا گاؤں میں بہت سے مختلف محکمہ اور ایجنسیاں ایک ہی نشانے والے گروپ کو متعلقہ خدمات فراہم کرتی ہیں۔ خدمات سے متعلق ہر ایک گروپ متفرق اخراجات، اعداد و شمار اکٹھا کرنے، نگرانی کرنے، تربیت دینے، دیکھ ریکھ اور جائزے کے لئے اپنا ایک الگ انتظام رکھتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اخراجات میں کفایت برتتے ہوئے ایسی بہت سی خدمات کو یکجا کیا جائے۔ اور ایک مربوط نظام کے تحت لایا جائے تاکہ پروگراموں کو زیادہ موثر بنایا جاسکے۔ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ سے متعلق سرگرمیوں کی منصوبہ بندی اور عمل آوری میں عوام کو شریک کیا جائے۔

* * *

سلسلہ صفحہ ۱۵

والی طبیعیات کے شعبوں کے علاوہ ہیں یعنی کوانٹم کشش، علم کائنات، اٹامک اور نیوکلیر طبیعیات اور ریاضی وغیرہ خالص اور اطلاقی طبیعیات کے سرحدی شعبوں کی طرف ایسی تبدیلی اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے یہ ترقی پذیر ممالک کے ماہرین طبیعیات کی اس میدان میں محرومی کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور بین الاقوامی ادارہ نہ موجود تھا اور نہ ہی اب موجود ہے۔

محمد عبدالوحید خان

محنت کی اہمیت

مرحوم پروفیسر نظام الدین مغربی صاحب نے کسی تقریر میں کہا تھا "انسان کی محنت خدا پر قرض ہوتی ہے" ابتدائے آفرینش سے انسانی حیات کی کہانی محنت لگن جستجو سے عبارت رہی ہے۔ قرآنی مزاج یہ ہے کہ "خدا ان کو دوست رکھتا ہے جو محنت کو دوست رکھتے ہیں۔ آج مسلمانوں اور دیگر اقوام کو سب سے بڑھ کر جس تفہیم کی ضرورت ہے وہ ہے محنت اور مقصدیت۔

اکثر اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اقوام و ملل باوجود سعی و کاوش تگ و دو کے ناکام ہو جاتی ہیں واقعہ یہ ہے کہ محنت کا اپنا ایک الگ و منفرد انداز ہے مقصدیت اور خاص نظریات کے تتبع میں خلوص سے مملو ہو کر مخصوص ڈھنگ و نہج سے جو محنت کی جاتی ہے اس سے اقوام و افراد کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ محنت کو عبادت سے ملقب اسی لئے کیا جاتا ہے کہ محنت ہی راحت بتلائی گئی ہے۔ مادی و روحانی تحقیق ریاضتیں عقبیٰ اور دنیا ہر دو کو کامیاب بناتی ہیں۔ اقوام کی ترقی کا راز ان کی سعی و لگن میں مضمر ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسے خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

اس کے مصداق فرد اور افراد کا انفرادا بدلنا اور اپنی اپنی روش کو ٹھیک کرنا امر لازمی ہے۔ محض قیاس نظریات اور "نشستند و گفتند" سے کچھ حاصل نہیں ہوتا "مشورہ دیگر سبھی اصحاب و احباب اٹھ جاتے ہیں" محنت اور سعی تو فرد واحد کو کرنی پڑتی ہے۔ کسی بھی مضمون کو رقم کرنے خیالات و نظریات کی ترتیب اور ضروریات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسلامی روح کے موجب محنت ہی حاصل زندگی

اردو مترجم، نظامت ترجمہ، حمایت نگر، حیدرآباد ۔ ۲۸۔ آندھرا پردیش۔

ہے۔ انسان ابتدائے ہوش و حواس سے محنت ہی کے راستہ پہ گامزن ہے۔ صحیح و غلط راستے اور محنت صحیح و بد ان دو کا حاصل انسان کو اس دنیا اور آخرت میں بھگتنا پڑتا ہے۔

قرآن کے تراجم، قرآنی تفاسیر، احادیث سیرت طیبہ، فقہ و کلام و رموز کلام کتاب عبادات و معاملات اور اسلامی سیرت صحابہ کرام کی محنتیں اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرور کائنات صلعم سرکار دوجہاں نے جو محنت کی وہ قرآنی روح و حزیں کو مد نظر رکھ کر کی۔ اس محنت کے عقب میں اسلامی مقاصد اور انسانی حیات کی داستاں اپنے جلو میں ہم انسانوں کیلئے نمونۂ عمل ہے

عصر جدید میں مسلمانوں میں (Work Shyness) سہل انگاری تن آسانی کی وجہ سے مقصدیت اور علم کے حصول سے گریز ایک خاصہ بن گیا ہے۔ گویا ہم نے مفکر اسلامی تاریخ کے اس قول کو بھولا دیا کہ " انسان کی محنت خدا پر قرض ہوتی ہے مالی و مادی فراوانیوں جاہ و جلال Petro Dollars اور Black gold کی سعادتوں نعمتوں نے تن آسانیوں اور عیش کوشیوں کو ہوا دی ہے۔ آج یہودی انگریز یورپی امریکی تعلیم و تعلم درس و تدریس علم کی دستگاہ میں ہمہ تن گوش مصروف ہیں حدیث ہیکہ " اگر علم ملک چین میں بھی ہو تو اس کی تحصیل کرو " اسے ہم نے بھلا دیا۔ محنت آج مسلمانوں کے لئے شجر ممنوعہ بن گئی ہے۔ محنت سے جی چرانا عام ہے دیگر اقوام علم کے حصول کے باعث خلائی دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ خلائی سفر عام سفر سے ملقب ہوگا۔ سعودی عرب مشرقی وسطی اور عرب علم کے معاملے میں کیوں ہو گئے ہیں۔ حالانکہ قرآن کا لب لباب یہ ہے کہ علم کا حصول مسلمانوں مرد و عورت پر فرض کیا گیا ہے۔ مگر محنت کا دامن مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اگر عمل ندارد ہو تو نتیجہ صفر ہے۔ " مایوسی کفر ہے " انسان آنکھ بند ہونے سے پہلے اپنی سعی و کاوش کے نتائج سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

مولانا حالی نے ایک بار دعا مانگی تھی کہ یا رب تعالیٰ مسلمانوں کو عقل صحیح دے۔ صحیح عقل کی تعریف یہ ہیکہ بہتر انداز سے بہتر مقصد کیلئے کوشش کی جائے۔ آج کا دور " گلو تراشی مقابلہ " (Cut throat competition) کا دور ہے۔ مارو یا مرو Do or die اپنے وجود اور بقا کو قائم رکھنے

باقی صفحہ ۶۳ پر

محمد مقصود جالب

تعلیم کے مسائل

اردو کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ اردو ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ہندستان کے جن علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول ہیں وہاں نصابی کتب کی فراہمی اور ان کا معیار ترقی اردو کی راہ میں سد راہ بنا ہوا ہے۔ پھر یہ مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہی کیوں یا کیوں نہیں —؟ انہیں سے اردو کے روزی روٹی سے جڑنے کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ سکندرآباد شاخ نے ۱۱ر ستمبر کو اردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل پر غور و فکر کرنے کیلئے ایک مذاکرہ منعقد کیا جس کا افتتاح وزیر مملکت برائے صنعت پارچہ بافی جناب رفیق عالم نے کیا۔ صدارت پروفیسر جگن ناتھ نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر مسعود حسین خاں، شیخ الجامعہ جامعۂ اردو علی گڑھ نے شرکت کی۔

جلسے کی ابتداء میں داعیِ مذاکرہ اطہر فاروقی صاحب نے جلسے کی غرض و غایت پر اظہار خیال فرمایا۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمات پر روشنی ڈالی اور انتہائی تفصیل کے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل اور اردو کے مسائل پر پورے ہندستان کے پس منظر میں عموماً اور یوپی کے پس منظر میں خصوصاً اظہار خیال کیا۔ انہوں نے بہت ہی واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ اگر اگلے بیس برس بھی نکل گئے جس طرح آزادی کے بعد چالیس سال حکومت نے عوام کو دھوکا دیکر گزارے ہیں تو پھر اردو کا نام و نشان باقی نہیں رہیگا انہوں نے بہت صاف گوئی سے یہ بات بھی کہی کہ یو پی۔ کی حکومت نے اردو کو منظم طریقے پر قتل کیا ہے اور وعدوں کے علاوہ اردو عوام کو کبھی کچھ نہیں دیا۔ خلیق انجم صاحب نے اس امر پر بھی زور دیا کہ اب اردو والوں کو آپسی رسہ کشی کے بجائے مثبت انداز میں عملی کام کرنے چاہئیں۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے مقالے کی بنیاد اس بات کو بتایا کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہی ہونی چاہیئے ۔ انہوں نے کلی طور پر اس مفروضے کی تردید کی کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم زیادہ طاقت ور اور موثر ہے ۔ اس موقع پر انہوں نے کنیڈا سے آتے ہوئے ایک وفد کا حوالہ دیا جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انہوں نے ملاقات کی تھی اور جس کا ہندستان آنے کا مقصد بھی یہی بتاتا تھا کہ دنیا کا سب سے موثر ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے ۔ اس وفد سے جب مسعود صاحب نے ملاقات کی تو مسعود صاحب نے ان سے سوال کیا کہ آپ مجھے کوئی ایسا ملک بتا سکتے ہیں جو آزاد ہو ابتدائی تعلیم وہاں کی آبادی کی مادری زبان میں نہ دی جاتی ہو ۔ سربراہِ وفد نے اس کا جواب نفی میں دیا ۔ مسعود صاحب نے پھر پوچھا کہ کیا کناڈا، امریکہ یا انگلینڈ میں کوئی خطہ ایسا ہے جہاں بنیادی تعلیم کا ذریعہ انگریزی کے علاوہ کوئی دوسرا ہو ؟ جب سربراہِ وفد نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا تو پھر مسعود صاحب نے ان سے پوچھا کہ پھر آخر آپ ہندستان میں انگریزی کو کیوں ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں ۔ اس پر سربراہ وفد سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم موثر نہیں بلکہ ایک ضرورت ہے ۔

سمینار کا پہلا مقالہ انجمن ترقی پسند مصنفین سکندرآباد کے جنرل سکریٹری شکیل احمد ایڈوکیٹ نے اردو ذریعۂ تعلیم ہمارے قومی اداروں کا کردار کے عنوان سے پیش کیا جو اپنے اسلوب اور [illegible] کے سبب سمینار کا متنازعہ مقالہ تھا ۔ اور تقریباً ہر مقرر نے اپنی تقریر میں یہ تسلیم کیا کہ جو حقائق اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ شکیل صاحب نے بنیادی [illegible] پس منظر اور حکومت کے کردار کو لے کر کی ۔ انہوں نے بہت تلخ لہجے میں یہ بات بھی کہی کہ [illegible] و بربادی کا سبب اردو کی مفاد پرستانہ قیادت ہے اور مسلمانوں کے بڑے اداروں علی [illegible] اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی اردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ انتہائی متعصبانہ [illegible] کا ہے ۔ مقالے پر بحث کرتے ہوئے اطہر فاروقی صاحب نے کہا کہ [illegible] ہے ۔ مگر اندازِ بیان تلخ ہے ۔ مگر اس کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) [illegible] فطرت انصاری نے کہا کہ میں شکیل صاحب کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں [illegible] صرف مسلمانوں کو کرنا ہے ۔ اردو قومی یک جہتی کی زبان بھی ہو سکتی ہے ۔ اور عوامی [illegible] مسلمانوں کے علاوہ اس سے جذباتی وابستگی کسی کو نہیں اور جب جذباتی وابستگی [illegible] ذمہ داری بھی کسی اور پر نہیں ڈالی جاسکتی ۔ اس مرحلے پر بحث میں [illegible]

رکے کہ بحث آگے بڑھتی صاحب صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے مداخلت کی اور کہا کہ وہ اب کسی
مع مقالہ نگار) اس بحث میں حصہ لینے اور وضاحت کرنے کی بھی اجازت نہیں دیں گے۔
مقررہ بیگم سلطانہ حیات صاحبہ نے یوپی اور دہلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمات پر روشنی
الہ حکومت تو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہتی ہے مگر حکومت کے احکامات پر
ہوتا۔ اس کے بعد جناب حیات اللہ انصاری ایم پی نے حکومت کے متعصبانہ رویہ کے متعلق
گزرے ہوئے چند واقعات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اظہار خیال کرتے ہوئے
ذریعہ تعلیم کے مسائل پر غور کرنا ہے مگر اس سے پہلے اس پر بھی اصرار کرنا ہے کہ آئینی طور پر
ں کا تحفظ کس طرح ملے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو کا تحفظ ہوگا تو آئین ہی کے ذریعہ مگر ہمارا
ے ایسی کھٹارا موٹر کار ہے جو کبھی بغیر دھکے کے نہیں چلتی اس لئے ہم اس زاویے کو بھی
ہیں کر سکتے۔ انہوں نے ایک اور بہت بڑی غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ آج کل جو غزل گائیکی اور
نوالی کا فیشن عام ہو رہا ہے اس سے اردو کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا کیونکہ کمرشیل سوسائٹی
بہت تیزی سے بدلتے رہتے ہیں اور کسی فیشن پر زبان کے مستقبل کا انحصار کرنا دانشمندی نہیں
اسلم پرویز کے بعد یو۔ پی کے وزیر صحت سعید الحسن نے تقریر کرتے ہوئے مراعات کی وہی
ہرست سنادی جو ایسے موقعوں پر مسلم ووٹ حاصل کرنے کیلئے اکثر سنائی جاتی ہے۔ اس تقریر
ڈاکٹر خلیق انجم نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یوپی میں تو مراعات کے ذریعہ اردو کی قبر کھودی
میں بار بار یوپی حکومت سے یہ مطالبہ کرتا رہا ہوں کہ آپ ان نام نہاد اردو اداروں کو جو ملبی
تمیں فراہم کرتے ہیں انہیں بند کر کے صرف یہ کیجئے کہ ہر ضلع میں چند اردو میڈیم اسکول کھول
۔ اس کے بعد اردو کے یوپی میں بیشتر مسائل حل ہو جائیں گے مگر ایسا لگتا ہے کہ حکومت توجہ
رکنار کبھی میری بات کو سننا نہیں چاہتی۔ انہوں نے اردو عوام سے ایک بار پھر گذارش کی کہ وہ
ملاقات کو ختم کر کے صرف اردو کی خوشحالی اور ارتقا کے لئے کوشش کریں۔ اس کے بعد جناب
جناب نفیق عالم صاحب وزیر مملکت برائے صنعت پارچہ بافی نے کہا کہ ہماری تہذیب و تمدن کا انحصار
اردو پر ہے۔ اس میں ہماری تمام مذہبی روایات اور ماضی کا ورثہ موجود ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ
نے اپنی تقریر میں بعض بہت بنیادی باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ
رف ادب کا نام ہے اور جو کچھ ادب کے نام پر [illegible]

کے مسائل سائنس اور ٹکنالوجی' معاشیات اور ریاضی کے میدان میں سب سے زیادہ ہیں ۔ ایک ریاضی کے میدان میں سب سے زیادہ ہیں ۔ ایک ادبی فن پارے کا ترجمہ سائنس کے اصطلاحی مضمون کا ترجمہ کرنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے ۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم بعض معاملات میں سیاسی حالات کے پیش نظر اردو کے معاملے کو غلط انداز میں پیش کر رہے ہیں ۔ ہمیں اردو ضرور پڑھنی چاہیئے مگر یہ کہنا کہ صرف اردو ہی پڑھنی چاہیئے ، کوئی دانشمندانہ بات نہیں ہے ۔

اس کانفرنس میں درج ذیل قراردادیں پیش کی گئیں اور اتفاق رائے سے منظور ہوئیں ۔

تجویزیں (۱) اردو کو اترپردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے ۔ انجمن ترقی ار(دو) (سکندرآباد) کا یہ جلسہ اترپردیش کی حکومت اور وزیر اعلیٰ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مزید تاخیر کے بغیر اردو کو اترپردیش کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے اور اردو کو وہ مراعات فراہم کرے جو بہ(ار) کی حکومت نے دی ہیں ۔

اردو کا سہ لسانی فارمولے کے تحت پڑھایا جائے حال ہی میں مرکزی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ شمالی ہند کے صوبوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ہندی اور انگریزی کے علاوہ جنوبی ہند کی کوئی زبان پڑھائی جائے گی ۔ اس نئی پالیسی بنانے والوں کے ذہن میں بچے کی مادری زبان سے زیادہ جنوبی ہند کی زبان ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ پالیسی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر بنائی گ(ئی ہے)

(۲) انجمن ترقی اردو (سکندرآباد) کا یہ جلسہ حکومت کی اس سیاسی پالیسی کے خلاف احتجاج کرتا ہے ا(ور) مطالبہ کرتا ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو تعلیم کے لئے اترپردیش کے ہر اسکول میں کم از کم ایک اردو استاد کا تقرر کرے ۔

(۳) انجمن ترقی اردو (سکندرآباد) کا یہ جلسہ حکومت اترپردیش سے مطالبہ کرتا ہے کہ ریاست کے جن تحصیلوں اور میونسپل علاقوں میں اردو والوں کی آبادی دس فیصدی ہے وہاں اردو میڈیم پرائمری اور سکنڈری اسکول قائم کئے جائیں ۔

(۴) انجمن ترقی اردو کا یہ جلسہ شام کرشن بھٹناگر صاحب کی وفات پر اظہار افسوس کرتا ہے ۔ مرحوم کی عمر وفات کے وقت ۸۷ سال تھی ۔ بھٹناگر صاحب علی گڑھ کے طالب علم تھے ۔ انہوں نے ایم ۔ اے ۔ او کالج کی عالمانہ تاریخ لکھی ہے ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔

★★

* رشید الدین

گردِ کارواں

مقتدر نجم : تبصرہ

دکن میں اورنگ آباد کی سرزمین شعروادب کے معاملہ میں شروع سے بہت مردم خیز رہی ہے۔ اُردو کے اولین شعراء وادباء سے لے کر موجودہ دور تک کسی بھی زمانہ میں یہ تسلسل ٹوٹنے نہیں پایا ہے۔ چنانچہ ولی سے لے کر قمر اقبال مرحوم تک یہاں اُردو کے بے شمار شاعر اور ادیب گزرے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اورنگ آباد میں یونیورسٹی قائم ہوچکی ہے اور نئی فصل کے فارغ التحصیل طلباء میں بہت سے وحید اور قاضی سلیم بھی پیدا ہورہے ہیں، جو ان ہی کی طرح آئندہ برِصغیر میں اپنی دھاک جمائیں گے۔

مقتدر نجم بھی اسی سرزمین کے پروردہ ہیں۔ وہ کوئی ۴۰ سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ لیکن اپنے ہم عصروں قاضی سلیم، وحید اختر عبدالرؤف (جو اب پاکستان منتقل ہوچکے ہیں) شفیق فاطمہ، انور معظم، بشر نواز اور جے پی سعید سے کم معروف نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ مقتدر نجم ملازمت کی ذمہ داریوں میں الجھے رہے (وہ بطور تحصیلدار سبکدوش ہوئے ہیں) ان کی ملازمت کچھ ایسی ذمہ داری کی تھی کہ وہ شاعری کے لئے زیادہ وقت نہ دے سکے۔ حتیٰ کہ شاعروں اور ادبی محفلوں سے بھی وہ دورانِ ملازمت دور ہی رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے اندر کے شاعر نے پھر زور مارا اور انہیں اپنا کلام یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اس وقت وہ "گردِ کارواں" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ۲۰ غزلیں دو نظمیں اور ایک قطعہ شامل ہیں۔ یقیناً مقتدر نجم صاحب نے اپنی ادبی زندگی کے ۴۰ سال میں اس سے بہت زیادہ کہا ہوگا لیکن یہ ان کے کلام کا ایک انتخاب ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پہلا انتخاب ہے۔ کتاب کا پیش لفظ قاضی سلیم نے لکھا ہے۔

*8/4/191-3-10 ہمایوں نگر۔ حیدرآباد - ۲۸

ور ڈاکٹر انور معظم اور جے پی سعید نے بھی اپنی آرا سے نوازا ہے ۔

مقتدر زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں ویسے انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن اس مجموعہ میں صرف دو نظمیں شامل ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ صرف ایک نظم "[illegible]" ہی شامل ہے دوسری نظم "منظر اور پس منظر" تو ایک غزلِ مسلسل ہی ہے۔ ان کی اکلوتی نظم بھی ہمیں مجاز مرحوم کی ایک مشہور نظم کی یاد دلاتی ہے اور اسی فارم میں کہی گئی ہے ۔

مقتدر نجم ایک سیدھی سادی شخصیت کے مالک ہیں اور یہی حال ان کی شاعری کا ہے۔ اس میں کسی قسم کا پیچ و خم اور الجھاؤ ہمیں نہیں ملتا۔ وہ اپنے قلب پر جو کچھ گزرتی ہے وہ بلا کم و کاست غزل کے مروجہ فارم میں کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔ بقول قاضی سلیم "جو دل پر گزرے اور جو کچھ بیتے مقتدر نجم اسی کو شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔" انھیں کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ وہ اپنے آپ کو شاعری میں وہ ظاہر کریں جو وہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس سادگی کے ساتھ ساتھ روایت کا رنگ غالب آگیا ہے۔ ان کی غزلیں چھوٹی بحروں میں ہوتی ہیں اور خاص متاثر کن ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بقول جے پی سعید "ان کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے" لیکن یہ ضرور ہے کہ جب ہم اپنے روزمرہ کے واقعات، حادثات، جذبات و احساسات کو ردیف قافیہ کی بندش میں دیکھتے ہیں تو ایک عجیب قسم کی حیرت آمیز مسرت ہوتی ہے ۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے مقتدر نجم کی غزلیں چھوٹی بحروں میں ہوتی ہیں اور وہ زندگی کے روزمرہ واقعات کو متاثر کن انداز میں سپردِ قلم کرتے ہیں ۔

مثال کے طور پر یہ غزل پڑھیے ؎

زندگی سانحات کی زد میں   ہے سحر جیسے رات کی زد میں
[illegible] کرتے ہی مسکرائے وہ   بات ابھی ہے بات کی زد میں
[illegible] کشمکش کے [illegible]   کچھ نہیں واقعات کی زد میں
[illegible] نے آگہی کو دیکھ لیا   عشق کی [illegible]
[illegible] کمال ہنر کے پابند   کیا نہیں ممکن [illegible]

موت کا ذکر نجم کیا کیجئے
یہ بھی ہے اب حیات [illegible]

"گردِ کارواں" ڈیمائی سائز کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے کتاب (اکنسیٹ پیو) ... ہوئی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ اس لحاظ سے قیمت دس روپیہ بہت ... ہے۔ سرورق ایس۔ ایف حسینی نے بنایا ہے اور ٹائٹل پر شاعر کا اسکیچ ہے۔ ٹائٹل کا آخری ... بالکل خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ بہتر یہ ہوتا کہ اس پر شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی د... دیئے جاتے۔ ... کتابت بہت اچھی ہے جو اورنگ آباد کے مشہور خوشنویس محمد عبدالرزاق کی کاوش کا ... ہے۔ کتاب آزاد ، آفسیٹ پرنٹرس میں طبع ہوئی ہے۔

اردو شاعری مقتدر نجم سے کچھ اور کی طالب ہے۔ اب جب کہ وہ ملازمت ... سے سبکدوش ہوگئے ہیں اور انھوں نے پابندی سے ادبی تقریبات میں شریک ہونا بلکہ اس ... اہتمام کرنا شروع کر دیا ہے اور انھیں مطالعہ کے لئے وافر وقت میسر آچکا ہے ان سے یہ ... امید بے جا نہ ہوگی کہ وہ اپنے اس ملتفت بھی اچھے رشحاتِ قلم صفحۂ قرطاس کی زینت بنائیں ... شہر اورنگ آباد اور اپنے ہم عصروں کے ساتھ ساتھ جدید اردو غزل کا بھی حق ادا کریں۔

ملاحظہ ۴۲

... محنت اس کی کمی ہے۔ آئے ... اجتماعات اور خصوصاً تبلیغی اجتماعات میں ایک نعرہ ... شرت سے لگایا جاتا ہے کہ "یہاں نہیں محنت کرتی ہیں" اس کا حاصل یہ ہے کہ آخرت کو مقبلی ... پیشِ نظر رکھ کر نجاتِ اخروی کیلئے انسان کو عبادت و تبلیغ کے راستہ پر چلنا ہے۔

تاریخ اقوامِ عالم کے ہر صفحہ پر کسی حیات کی کامیابی کا راز محنت اور صحیح ... نت ہے۔ آج تک دنیا میں جتنی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں ہیں وہ محنتوں سے بنی ہیں۔ ... سرکارِ دو عالم حضور پاکؐ کی ۶۳ سالہ حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ صحیح محنت سے روشن ہے۔ آج ... اس پرفتن دور اور پر آشوب حیات میں بھٹکتی اور بے چین متلاشی دنیا کو اسلام اپنی گود ... میں لینے بے چین ہے۔ قرآنیات اور اسلامی ثقافت اسلام کی روح اس کے تقاضوں ... کو سمجھنے اس پر تفکر کرنے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے قرآن کے مزاج و ذہن اور ... اس کے اندازِ تخاطب اور تفسیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن کی روشنی اس کے ... مطالعہ میں محنت کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ مادی اور عارضی کا زمانہ دراصل عمل ... کی ... ہے نعمتوں کے تحفظ اس سے قبل کلے کی نعمتوں سے مالا مال ہونا اور پھر خدائے برتر ... کی رضا انسان کی کامیابی ہے۔

ایک واقعہ: ایک لیڈر صاحب سے میری گفتگو ہوئی۔ ان کے دو لڑکے ایک "غیر مسلم" تعلیمی ادارہ میں اعلیٰ سائنسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے لڑکوں کو مسلم یونیورسٹی میں کیوں نہیں داخل کیا۔ ان کو آپ غیر مسلم ادارہ میں کیوں تعلیم دلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہاں مقابلہ (Competition) کا ماحول ہے۔ جب کہ مسلم یونیورسٹی میں مقابلہ کا ماحول نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کا ماحول بے حد ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آپ جو بیانات دیتے رہے ہیں۔ اس میں آپ نے مسلسل اس نظریہ کی وکالت کی ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں داخلوں کے لیے رعایت (Relaxation) ہونا چاہیے۔ پھر جب بڑی ترقیاں مقابلہ کے ذریعہ ہوتی ہیں تو آپ مسلم یونیورسٹی میں اس کے خلاف ماحول کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عام مسلم طلبہ کے ساتھ اگر مسلم یونیورسٹی میں رعایت نہ کی جائے۔ تو دوسری کون سی جگہ ہے۔ جہاں وہ اپنے رعایت پا سکیں گے۔ پھر ان کا انجام کیا ہوگا۔

میں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کو اس ماحول میں ڈالیں جہاں محنت کا محرک موجود ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے زیادہ سے زیادہ آگے بڑھیں۔ مگر قوم کے بچوں کے لئے محنت کا محرک ختم کر کے انھیں ناکارہ بنا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیمی طور پر پیچھے ہو جائیں۔ اپنے بچوں کو آپ تعلیمی ہیرو بنانا چاہتے ہیں اور دوسروں کے بچوں کو تعلیمی ہیجڑے۔

یہی موجودہ زمانہ کے تمام لیڈروں کا حال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے کچھ پسند کرتے ہیں اور ملت کی اولاد کے لیے کچھ۔ یہی وجہ ہے کہ لیڈر اور ان کے متعلقین کامیابی کی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ مگر ملت کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اور نہ آیا کہ وہ جلسوں کی بھیڑ کے لیڈروں کی شان قیادت میں اضافہ کریں۔ اور اس کے بعد بربادی کا نشان بن کر رہ جائیں۔

الرسالہ سے

قمر الاسلام

آزاد ہند فوج

قسط دوم

اس عرصے میں نیتا جی نے جاپانی حکومت سے معاہدہ کر کے انڈین انٹرم
رنمنٹ بنا کر انگریزوں کے خلاف عمل طور پر اعلان جنگ کر دیا۔ جسے دنیا کے
ثتر ممالک نے جو انصاف پسند تھے تسلیم کر لیا۔ برٹش گورنمنٹ نے یہ اعتراض کیا کہ
ڈین انٹریم گورنمنٹ کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ وہ کسی خطۂ ارضی پر اپنا
ق ملکیت نہیں رکھتی۔

چنانچہ نیتا جی نے حکومت جاپان سے ایک اور معاہدہ کر کے ان کے مقبوضہ دو جزائر
حاصل کیے، وہ تھے انڈیمان نکوبار جن کا نام شہید آئیلینڈ اور بھگت آئیلینڈ کے
نام سے موسوم کیا گیا۔ اور انڈیمان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ جس کے کمشنر کرنل
سی ایس چیٹرجی اور بے کے بھونسلے مقرر کیے گئے۔ آر جی ہیڈ کوارٹر سنگاپور
سے رنگون شفٹ کیا گیا۔ سنگاپور میں ایک آزاد ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا
جہاں سے ہماری انٹریم گورنمنٹ کی نشریات ہوتی تھیں۔

اب ہماری فوجیں جاپان کی معیت میں انگریزوں کے خلاف برسرپیکار
ہو کر اپنے مورچوں پر داد شجاعت دے رہی تھیں اور شمع آزادی
کے پروانے نشۂ حب الوطنی میں اپنی مادر وطن پر نثار ہو رہے تھے۔

بتائیے تمہیں تفصیل سے ہدایت نیتا جی = لڑی تھی ان کی نگرانی میں ہم نے جنگ آزادی
اگر رنگون اور آسام کے جنگل میں جاؤ گے = ہمارے خون کے دھبے ہر ایک ندی میں پاؤ گے۔

مجھے نیتا جی کے وہ الفاظ تا زیست یاد رہیں گے جو انہوں نے ۱۶ اگست ۱۹۴۳ کو

آزاد ہند فوج کی وسعت کمانڈ سنبھال کر ایک جنرل کی حیثیت سے اپنی تقریر میں بہادر شاہ ظفر آخری شہنشاہ ہند کی قبر پر کھڑے ہو کر رنگون میں بیان کیے تھے آپ نے فرمایا = ایک ہندوستانی کے لیے اس سے بڑھکر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے والی فوج کا کمانڈ سنبھالے۔

مجھے اس کام کی وسعت کا پورا پورا احساس ہے میں اپنے آپ کو ایک عظیم ذمہ داری کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ خدا مجھے ہندوستانیوں کے تئیں اپنے فرض کو پورا کرنے کی توفیق عطا کرے خواہ اس سلسلے میں مجھے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے میں مختلف مذاہب کے اعتقاد رکھنے والے ۳۸ کروڑ ہندوستانیوں کا خادم ہوں میں اپنے فرائض اس ڈھنگ سے انجام دونگا۔ ۳۸ کروڑ کا مفاد میرے ہاتھوں میں محفوظ رہے اور ہر ہندوستانی کو مجھ پر اعتماد رہے۔

آزاد ہند فوج کی بنیاد خالص قوم پرستی اور مکمل انصاف کے جذبہ پر ہی رکھی گئی ہے مادر وطن کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونا جس کا مقصد پورے بھارت کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا ہے وہ کام آزاد ہندو فوج کو ہی کرنا ہے۔ یہ قومی فوج ہی آزاد کرانے کے بعد ملک اور قوم کی حفاظت کرے گی۔

اس آزاد ہند فوج کا مقصد ہندوستان کو مکمل آزاد کرانا ہے۔ اس کا ایک نعرہ ہوگا کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ یا اس جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کر کے دنیا کو آزادی کا سبق دینگے۔ جب ہم کھڑے ہوں تو آزاد ہند فوج [illegible] قلعے کی دیوار کی طرح مضبوط اور [illegible] ہمارا قدم [illegible] بڑھے تو آزاد ہند فوج [illegible] آسان نہیں ہماری جنگ طویل [illegible] ثابت ہوئی کیونکہ [illegible] سے جو بہت طاقتور ہے اس کا مقابلہ کرنا ہے لیکن [illegible] ہے پھر بھی اس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس کے حدود میں [illegible] ہوتا۔ اس سے ہم اپنی سپاہ کی برتری لے رہے ہیں۔ مجھے [illegible] اپنے اصول کے لیے لڑ رہے ہیں اور آخر دم تک لڑتے رہیں گے۔ خدا نے چاہا تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے [illegible] ۳۸ کروڑ [illegible]

کی آبادی کا پانچواں حصّہ ہے، آزاد رہنے کا پورا حق ہے۔ اور وہ اب آزادی کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہے لہٰذا اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت آزادی کے پیدائشی حق سے محروم نہیں کر سکتی۔

ساتھیو! افسرو! سپاہیو! آپ کی مکمل حمایت اور وفاداری کے بل بوتے پر آزاد ہند فوج ہندوستان کو آزاد کرانے کا ذریعہ بنے گی۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیت ہماری ہوگی۔ مجھے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔

۳۸ کروڑ ہندوستانی آپ کے منتظر ہیں آؤ آج سے ہم دہلی چلو۔ نعرہ لگاتے ہوئے تب تک اپنی جدوجہد جاری رکھینگے جب تک نئی دہلی کے وائسرائے کی رہائش گاہ اور لال قلعے پر اپنا قومی ترنگا جھنڈا نہ لہرائیں۔ آپ کی آزاد ہند فوج دہلی کے لال قلعے کے اندر میدان میں اپنی پریڈ منعقد کریگی جے ہند۔

چنانچہ ہم نے رنگون سے دہلی چلو نعرے کی گونج میں مارچ ۱۹۴۴ء کو کوچ کیا اور مانڈلے۔ کوہیما۔ اراکان اکیٹر برما کے محاذ پر مختلف صورتوں میں دشمن سے نبرد آزما رہے۔ جس میں ہمارے ہزاروں سپاہی اور افسران جام شہادت سے سرشار ہو کر داد شجاعت لیتے رہے۔

ہمارے بہادر گروپ سکشن نمبر ۲ کا ایک واقعہ درج کرتا ہوں جس سے ہمارے نوجوانوں کو آزاد ہند فوج کے کارہائے نمایاں کا احساس ہوگا۔

یہ کارنامہ دشمن کے ایک پل کو اڑانے کا ہے جو انگریزوں کے لئے بہت اہم تھا۔

۳ر مئی ۱۹۴۵ء کو ہمیں اپنے ہیڈ کوارٹر سے ایک خفیہ ملاکر ہدایت دی جاتی ہے کہ بشن پور کا ریلوے برج ڈائنامیٹ سے تباہ کر کے ۹/ مئی تک مانڈلے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ پیش کیجائے۔ چنانچہ ہم تمام ضروریات سے لیس ہو کر ۵/ مئی ۱۹۴۵ء رات کے دو بجے متذکرہ برج پر پہنچ گئے۔ اس برج سے تقریباً چار فرلانگ پر دشمن کا مورچہ تھا اپنی جانوں پر کھیلتے ہوئے تقریباً ۳ بجے ڈائنامیٹ لگاکر فارغ ہوئے کچھ فاصلے پر جا کر فون کیا۔ بہت زبردست دھماکہ ہوا۔ کمانڈر نے جب اطمینان کر لیا کہ برج تباہ ہو گیا ہے تو واپسی کا حکم دیا۔ دھماکے کی آواز کے بعد دشمن نے ایل۔ ایم۔ جی اور مارٹر کا فائر کھول دیا

لیکن اس وقت تک ہم لوگ ایک پہاڑی پر پناہ لے چکے تھے۔ پھر بھی ہمارے چار سپاہی اور ایک نایک فائرنگ سے شہید ہو گئے۔

ہمارے کمانڈر فتح علی صاحب میرے پاؤں میں گولیاں لگی تھیں لیکن ہمت کر کے ہم چل رہے تھے ہمارا حوالدار اور دوسرے ساتھی سنبھالے ہوئے تھے آخر کار چھپتے چھپاتے چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرتے ہوئے ۱۹ مئی شام میں پانچ بجے ماونڈے ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ اور اپنی کامیابی کی رپورٹ پیش کر دی ہمارے اس عمل سے دشمن کی پیشرفت رک گئی۔

انچارج افسر نے فوراً ہماری میڈیکل بندکا انتظام کیا جو لوگ زخمی تھے دواخانے میں شریک کر دیا گیا۔ میں بھی پندرہ دن ہسپتال میں ایڈمیٹ رہا۔

انگریزوں نے امریکہ سے مل کر برما اور جاپان پر (COUNTER ATTACK) کر دیا تھا آخر کار برما پر ۲۵ مئی ۱۹۴۵ء کو انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا ہم لوگوں کو زخمی حالت میں جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ اور سب کو رنگون لے گئے وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے کلکتہ لایا گیا جہاز میں ہی ہمیں (Criminal Prisoner of war) کا خطاب دیا گیا انگریزوں کی طرف ہمارے لئے یہ نفرت کا اظہار تھا۔ کلکتے سے ۴ جون ۱۹۴۵ء کو ملتان چھاؤنی جواب پاکستانی چھاؤنی ہے لے گئے یہ ہندوستانی فوج کا کیمپ تھا اور وہی لوگ ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ یہ جولائی ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے جب کہ دہلی کے لعل قلعے میں ہمارے بڑے افسروں یعنی شہنواز خان۔ جی ایس ڈھلن۔ جے کے بھونسلے وغیرہ پر مقدمہ چل رہا تھا۔ ادھر شملہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ ہندوستانی کانگریسی قائدین کو رہا کر دیا گیا تھا۔ مکمل آزادی حاصل کرنے کے مذاکرات چل رہے تھے۔

ہندوستانی قائدین اس میں مصروف تھے اور لعل قلعے کے مقدمے کی پیروی بھی کر رہے تھے آزاد ہند فوج کا دفاع سر تیج بہادر سپرو کر رہے تھے پوری قوم آزاد ہند فوج کی مدافعت کر رہی تھی۔ ہمارا ابھی ملٹری رولس کے تحت کورٹ مارشل چل رہا تھا۔

بریٹش کمانڈر کرنل پی ڈی اسٹیفن نے اپنا۔ فیصلہ سناتے ہوئے کہا

ملک معظم کا غدار ٹھیرایا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا دہلی میں آزاد ہند فوج اپنے مقدمے میں کامیاب ہو گئے اور پوری فوج کو باعزت بری کر دیا گیا ہمارا یونیفارم جمع کر کے صرف ریلوے پاس دے کر گھروں کو بھیجدیا گیا۔ دہلی میں دریا گنج میں I.N.A ریلیف کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے چیرمن جی ایس ڈھلن تھے ہم نے حسب ہدایت وہاں آکر رپورٹ کی جہاں ہمارے ناموں کی فہرست بنائی گئی کچھ رقمی مقدار دے کر گھروں میں بھیجدیا گیا چنانچہ میں ۲۲/دسمبر ۱۹۴۵ء کو اپنے وطن حیدرآباد پہنچا۔ ناامیدی میں سب احباب سے ملکر خوشی ہوئی۔

حیدرآباد میں اس وقت نظام کا دور تھا۔ کانگریسی خیالات رکھنے والوں پر پابندیاں تھیں۔ تلاش معاش میں سرگرداں رہا۔ آخرکار جولائی ۱۹۴۶ء میں محکمہ ٹرانسپورٹ سے وابستہ ہو گیا اس وقت یہ محکمہ NSR RTD کہلاتا تھا اس کا افسر اعلیٰ ایک انگریز میجر ڈنلاپ تھا۔

بالآخر ہمارا ملک ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہو گیا اور انگریزوں کا ڈیڑھ سو سالہ تسلط ختم ہو گیا۔ انگریزوں کے آخری گورنر جنرل جسے وائسرائے ہند کہا جاتا تھا جس کا نام تھا لارڈ ماونٹ بیٹن۔ ہندوستان کا اقتدار ہندوستانی گورنر جنرل شری سی راجگوپال چاری کو سونپ دیا لیکن ملک کے دو حصے ہو گئے پاکستان علحدہ بن گیا۔

دستور ہند کی تدوین تک عارضی حکومت بنائی گئی جس کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو مقرر ہوئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی بابائے قوم کو گوڈسے نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ان کی شہادت پر ساری دنیا نے سوگ منایا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ہند کا نفاذ عمل میں آیا اور ہمارا ملک دنیا کا ایک بڑا جمہوریت پسند ملک مکمل آزاد ہو گیا۔

ہندوستان کے پہلے راشٹرپتی یعنی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد منتخب ہوئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو چنے گئے جن کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔

تو نے تقدیریں بدل ڈالیں غلامستان کی
ڈوبتی کشتی بچالی تو نے ہندوستان کی

ایسے میں ہم اپنے ہردلعزیز نیتا محبِ وطن سری سبھاس چندر بوس کو فراموش نہیں کر سکتے جو جنگ آزادی کے سورما تھے۔ اور اس مقصد کے لیئے اپنے آخری سانس تک جدوجہد کرتے رہے ۱۸؍اگسٹ ۱۹۴۵ء کو جب وہ اسی تحریک کی کانفرنس میں شرکت کے لیئے رنگون سے ٹوکیو جا رہے تھے ہوائی جہاز کے حادثے میں سورگباشی ہو گئے ان کا قول تھا ؎

جہنم کے آتشا شعلوں کے بدلے = غلامی کی جنت کو قربان کر دو۔ جو شرکت آزادی کی

خدا ان کی روح کو شانتی عطا فرمائے۔

جنوری ۱۹۴۹ء میں حکومت ہند نے اعلان کیا کہ آزاد ہند فوج کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس کے ارکان کو پورے مراعات دیئے جائینگے جب سے ہی میرا ربط ریکارڈ آفس سے رہا۔ اور ہمیں مختلف صورتوں میں انٹریم ریلیف ملتی رہی جب کہ ۱۵ اگسٹ ۱۹۷۲ء کو آزادی ہند کی سلور جوبلی منائی گئی۔

مجاہدین آزادی کو وظیفہ تاحیات مقرر ہوا۔ پالیمنٹ نے آزاد ہند فوج کے ارکان کو بھی مجاہدین آزادی تسلیم کر لیا یہ ہمارے لیئے ایک اعزاز ہے۔

۱۵ اگسٹ ۱۹۷۲ء سے پولیٹیکل پنشن مقرر ہوئی چنانچہ یہ راقم الحروف بھی اس میں شامل ہے یہ ملک کی طرف سے مجاہدین کے کارناموں کا اعتراف ہے۔

ایسے وقت ہمارے وہ بھائی بہنیں یاد آرہی ہیں جنھوں نے اپنی جان عزیز کو ملک پر قربان کر دیا۔ اور جو اس تحریک میں شریک ہو کر شہید ہوئے اور حکومت کے علم میں بھی نہ آسکے کیونکہ انگریزوں نے ان کا ریکارڈ تلف کر دیا تھا خدا ان کی آتماؤں کو شانتی عطا فرمائے اور ہماری ہندستانی قوم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت عطا فرمائے۔ ؎

شہیدوں کی سمادھی پر لگینگے عمر بھر میلے
وطن پہ مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

غزلیات

طرحی مشاعرہ مرکزِ ادب حیدرآباد

مورخہ ۱۰/ستمبر/۱۹۸۸ء

مصرعِ طرح :- نشاط و عیش میں ہمدم بہت ہیں

محمود شرفی ---- نعت شریف

میرے آقا پہ مرتے دم بہت ہیں
فدا جو جان کر دیں کم بہت ہیں

گنے جاتے نہیں ہم سے تمہارے
یہ احسان رحمتِ عالم بہت ہیں

محمدؐ رہنما ہیں راہِ حق میں
نہیں پروا جو پیچ و خم بہت ہیں

نہ ہو کیوں یہ چمک ارض و سماں میں
کہ انوارِ محمدؐ ضم بہت ہیں

ازل سے میں غلام ان کا ہوں محمود
عدو کم، مونس و ہمدم بہت ہیں

عزیز بھارتی ---- صدر مرکزِ ادب حیدرآباد

حوادث گرچہ مستحکم بہت ہیں
مگر اُن کے لئے اک ہم بہت ہیں

ذرا سا آئینہ دکھلا دیا تھا
وہ ہم سے آج تک برہم بہت ہیں

تمہاری یاد کی دنیا سے ہٹ کر
بہت ہیں اور بھی عالم بہت ہیں

بہت دشوار ہے، اُن کا سمجھنا
اشارے وقت کے مبہم بہت ہیں

نہ کھینچو ہاتھ تم خنجر زنی سے
کہ زخموں کے نشاں مدھم بہت ہیں

خوشی دے کر نہ لوں احسان کوئی
ہمارے واسطے یہ غم بہت ہیں

عزیز اب عظمتوں کا ذکر ہی کیا
یہاں خود ساختہ اعظم بہت ہیں

مومن خاں شوق ---- معتمد عمومی مرکز ادب

مصائب آشنا عالم بہت ہیں — یہاں دامن سبھی کے نم بہت ہیں
مصیبت کا نہیں کوئی بھی ساتھی — "نشاط و عیش میں ہمدم بہت ہیں"
سلے جائیں گے اک دن عزم نو سے — یہ مانا راستے میں خم بہت ہیں
نہیں کوئی بھی رت سچائیوں کی — صلیب و دار کے موسم بہت ہیں

جفائیں ہوں مبارک شوق ان کو
وفا کے واسطے اک ہم بہت ہیں

محمود شریف محمود ---- نائب معتمد مرکز ادب

ترانے کم یہاں ماتم بہت ہیں — جہانِ رنگ و بو میں غم بہت ہیں
فراوانی بہت ہے قاتلوں کی — مسیحا اس جہاں میں کم بہت ہیں
فرازِ دار پر پہنچے ہیں اکثر — وفا کی راہ میں جو محکم بہت ہیں
انوکھا ہے یہ نغمہ زندگی کا — سُروں میں اس کے زیر و بم بہت ہیں

غموں کا ہو مجھے محمود کیا غم
نمٹنے کو غموں سے ہم بہت ہیں

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید ----

"نشاط و عیش میں ہمدم بہت ہیں" — پریشانی میں لیکن کم بہت ہیں
نہ اترا اے فلک مشقِ ستم پر — مقابل میں اکیلے ہم بہت ہیں
ہے کس کے آنسوؤں کی ترجمانی — گلوں پر قطرۂ شبنم بہت ہیں
بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے انساں — زمیں پر گو بنی آدم بہت ہیں
زمانہ کو بدل دیتے ہیں یکسر — ارادے حسن کے مستحکم بہت ہیں
یہ زخمِ دل ہے یہ کیسے بھرے گا — طبیبوں نے دیئے مرہم بہت ہیں
بڑھا دے طاہرہ، لَو کوئی اٹھ کر — چراغِ آگہی مدھم بہت ہیں

سید دلاور علی حزیں ----

بہر عنواں پریشاں ہم بہت ہیں — مسلسل ہے ایک دل اور غم بہت ہیں
سمجھ میں آئیں کیا جینے کے خاکے — اشارے وقت کے مبہم بہت ہیں
حقیقت ہے یہ قصہ اک غم کے آگے — زمانے بھر کے غم بھی کم بہت ہیں

جنوں کا تھام کر بڑھ جاؤ دامن خرد کی رہ میں پیچ و خم بہت ہیں
عزیزو دل کا لہو دینا پڑے گا۔
چراغِ بزم کچھ مدھم بہت ہیں

ابوالفاروق شعور ------

ترے رستے میں پیچ و خم بہت ہیں اکیلا کیا ہوں میں ہمدم بہت ہیں
بظاہر جو نظر آتے ہیں شبنم شرارے وہ مگر برہم بہت ہیں
گلے ملتے تو ہیں ہنس ہنس کے لیکن دلوں میں فاصلے باہم بہت ہیں
شعور آنکھیں کھلی رکھ کر ہی چلئے
ابھی حالات بے ہنگم بہت ہیں

قمر ضیا ------

ہمارے زخم تازہ دم بہت ہیں ستم لیکن تمہارے کم بہت ہیں
میں جب سے شاخ پر رکھا نشیمن چمن میں آندھیاں برہم بہت ہیں
اندھیرے حد سے زیادہ بڑھ گئے یا چراغوں کی لوئیں مدھم بہت ہیں
قمر مجھ کو ذلیل و خوار کر کے
کم از کم وہ خوش و خرم بہت ہیں

مسرور عابدی ----

محبت میں خوشی کم غم بہت ہیں اس اک عالم میں بھی عالم بہت ہیں
وہ ہیں اندر سے کچھ ٹوٹے ہوئے سے بظاہر جو خوش و خرم بہت ہیں
نئے چہرے نہ ڈھونڈو حادثو تم تمہارے واسطے خود ہم بہت ہیں
نہیں ممکن مداوا زخمِ دل کا اگرچہ ہونے کو مرہم بہت ہیں
انہیں مسرور نے اپنا کہا تھا
بس اتنی بات پر برہم بہت ہیں

نوید جعفری ----

حقیقی درد والے کم بہت ہیں "نشاط و عیش میں ہمدم بہت ہیں"
قتیلِ خوش گمانی ہم بہت ہیں یہاں خنجر بہ کف ہمدم بہت ہیں
جو اُن پر رات گزری ہے وہ جانیں گلوں پر قطرۂ شبنم بہت ہیں

کسی کی زلفِ برہم کو بھلا کر — ہم اپنے آپ سے برہم بہت ہیں
نویدِ صبح پھیلی ہے چمن میں — اندھیرے پھر بھی کیوں باہم بہت ہیں

شہاب حیدرآبادی ------

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں — مگر ہم بھی تو مستحکم بہت ہیں ۔
تعجب ہے لبِ ساحل ہمیں سے — ہمارے ناخدا برہم بہت ہیں
خلوص و عشق کے پیکر جدا ہیں — دلوں میں آج بھی قائم بہت ہیں
جلا بھی لو دلوں کی مشعلوں کو — دماغوں کے دیئے مدہم بہت ہیں

شہاب لمحے کو تم لمحہ نہ سمجھو
زمانے اب بھی اس میں ضم بہت ہیں

ساقی ایوبی ------

ہمارے پاس بھی الم بہت ہیں — خوشی تھوڑی ہے دل میں غم بہت ہیں
دلوں کے زخم پھیلا دو فلک پر — ستارے ہیں مگر مدھم بہت ہیں
خوشی مصلحت سے ہے یہ ورنہ — ہمارے پاس بھی دم خم بہت ہیں
فرشتوں کی ضرورت کیا زمیں پر — عبادت کو تری آدم بہت ہیں

نمٹ جائیں گے ہر مشکل سے ساقی
ہمارے حوصلے اور ہم بہت ہیں

محمد ابراہیم جلیل ------

ہماری جان کو جو کم بہت ہیں
مگر وہ تو خوش و خرم بہت ہیں
سہاروں کو سہاروں کی ہے حاجت
جو خود بے دم ہیں وہ محرم بہت ہیں
حسینوں میں اندھیرا بڑھ رہا ہے
چراغ عاشقاں مدھم بہت ہیں
تمہیں کیوں خوف ہے نامحرموں کا
چلے آؤ یہاں محرم بہت ہیں
خلیلِ مسلکِ مشرب کیا تھے گا ؟ تمہاری بزم میں تکرار ہم بہت ہیں

یوسف نظر ------

کہا کس نے کہ تیرے غم بہت ہیں
زیادہ ہو کے بھی یہ کم بہت ہیں
اگلتی ہیں زباں جن کی شعلے
ٹٹولو تو وہ اندر نم بہت ہیں
سنبھلنے دے ذرا اے فرصتِ غم
تقاضے وقت کے باہم بہت ہیں ۔
جنوں کی اینچ شاید کام آ جائے
خرد کے حوصلے تو کم بہت ہیں
نظر، خود ابھی آشنا نہیں ہے اس راستے میں پیچ و خم بہت ہیں

-------- × -------- × -------- ×

ماهنامہ

شاداب

حیدرآباد

ڈسمبر ۱۹۸۸ء - جلد (۵) . شمارہ (۱۲)

- ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری - مینجنگ ایڈیٹر: نعیم جاوید

زرِ تعاون

	ہندستان	خلیجی ممالک	امریکہ	انگلستان	پاکستان
سالانہ	50 روپے	150 روپے	35 ڈالر	20 پونڈ	175 پاکستانی روپے
دوسال	۹۰ روپے	430 روپے	65 〃	36 〃	306 〃
تاحیات	۱۰۰۰ روپے	4000 روپے	500 〃	300 〃	3000 〃

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد- 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر دفتر "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 آندھرا پردیش سے شائع کیا

فہرست

حرفِ اوّل

تلگودیشم حکومت اور اردو :-

تلگودیشم حکومت نے یکم اپریل ۱۹۸۸ء سے ہم نے تلگو میں مراسلت کے احکام جاری کئے۔ اردو والوں کی توجہ دہانی پر چیف منسٹر این ٹی راما راؤ نے وعدہ کیا کہ اردو کے لئے ایک واضح اور مبسوط گورنمنٹ آرڈر جاری کیا جا کر اسے اس کا حق دیا جائے گا۔ لیکن اس وعدہ کی تکمیل کے بجائے یکم نومبر ۱۹۸۸ء سے تمام سرکاری احکامات کی صرف تلگو زبان میں اجرائی کا لزوم عائد کر دیا گیا۔ اور اردو کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی۔

چیف منسٹر خاموش ہیں۔ اور خاموش ہیں۔ اور صدر نشین سرکاری زبان کمیشن ڈاکٹر این رام کرشنا چاریہ نے بتایا کہ تلگو صرف انگریزی کی جگہ لے رہی ہے اور تلگو رائج کرنے کے لئے اردو کے ایک لفظ کو بھی ہٹایا نہیں گیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سرکاری زبان کمیشن اردو کے رائج کرنے کے لئے مناسب اقدامات کر رہا ہے اور اندرون دو ماہ تمام سرکاری احکام تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی جاری کئے جائیں گے۔ لیکن ساتھ میں موصوف نے یہ بھی کہا کہ اردو کا مسئلہ صرف آندھرا پردیش کی حد تک محدود نہیں ہے اور تقریباً تمام ریاستوں میں یہی مسئلہ درپیش ہے۔ اور یہ کہ مرکز کے رہنمایانہ خطوط کے مطابق نظم ونسق میں اردو کو رائج کیا جا رہا ہے لہذا اردو کے رواج کے لئے واضح رہنمایانہ خطوط کو اپنانے کے لئے کل ہند لسانی کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جانا چاہیئے اور اس کانفرنس میں منظور کئے جانے والے خطوط پر چیف منسٹر این ٹی راما راؤ اگر عمل نہ کریں تو صدر نشین سرکاری زبان کمیشن اپنے عہدے سے مستعفی ہونے میں پس و پیش نہیں کریں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو کا مسئلہ دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں آندھرا پردیش میں

بالکل مختلف ہے ۔ یہی ایک [illegible]
تھی اور اسی لئے ۱۹۵۶ء کے شریفانہ معاہدہ میں ایسے تیقنات دیئے گئے تھے
آوری کم سے کم ہوتی گئی اور آج بالکل ختم ہوگئی ہے ۔ ۱۹۵۶ء کے بعد ہی کانگریس
اس منفی عمل کو شروع کیا اور تلگو دیشم حکومت بھی اس شریفانہ معاہدہ پر عمل پیرا نہ
کانگریسی حکومتوں کی پیروی کر رہی ہے ۔ حالانکہ بعد میں آنے والی حکومت کا یہ فرض
حکومت کے ایسے اہم تصفیوں کا تحفظ کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو ۔ اگر
کے لئے مخلص ہے تو اجرائی احکام کے لئے مزید دو ماہ کی ضرورت ہے اور نہ
کانفرنس میں واضح رہنمایانہ خطوط منظور کرانے کی حاجت ۔ آندھرا پردیش کی حد تک
نہایت صاف ہے ۔ اور یہاں اردو کے قومی تقاضوں میں کوئی امر مانع نہیں
اور سرکاری زبان کمیشن سے ہماری اپیل ہے کہ ہمارے چیف منسٹر کے و
اردو کا فوری طور پر نفاذ عمل میں لایا جائے تو ایک دفعہ اور فلاح و بہبود کے کاموں
سہرا ہماری حکومت کے سر ہوگا ۔ اور اردو کے مسئلہ میں بھی ہماری حکو
ریاستوں کے لئے رہنمایانہ حیثیت کی حامل ہوگی ۔

مرکزی اقلیتی کمیشن :- جناب مظفر حسین برنی کے مرکزی اقلیتی کمیشن
فائز ہونے کے بعد کمیشن نے ملک کی گیارہ کروڑ اقلیتی آبادی کے لئے مفید [illegible]
کوشش شروع کر دی ہے ۔ جناب برنی ایمرجنسی سے قبل اور بعد مرکزی ہو
جنتا حکومت نے [illegible] ان کی [illegible] واپس کر دیا تھا تب
[illegible] متعدد خدمات انجام دیں اور میگھالیہ، ہریانہ میں گورنر [illegible]
سے انجام دیئے ۔ گورنری سے سبکدوشی کے بعد مرکزی اقلیتی کمیشن کے صدر
گئے ہیں ۔ اپنی ممتاز خدمات کو جاری رکھتے ہوئے دسمبر/نومبر میں ریاستوں کے اق
کمیشنوں کے صدور کی کانفرنس میں اقلیتوں کے تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل ا
ایک اچھی کوشش کی ہے ۔ اور ایک حتی، فرقہ وارانہ فسادات اور بابری مسجد
کے مسائل کا بھی قومی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے ۔ اس کانفرنس میں ریزرو
کے ڈپٹی گورنر مسٹر پی ڈی اوجھا اور کمشنر لسانی اقلیت لکھنو مسٹر وشنو
شرکت کی ۔

اقلیتی طبقات کی معاشی ترقی کے لئے ریزرو بنک کی طرف سے

...دامات کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب برنی نے بتایا کہ بنکنگ اداروں سے مالی امداد کے
...ول میں آسانی پیدا کرنے ریزرو بنک میں ایک "خصوصی شعبہ" کھولا گیا ہے اور تمام قومیائے
...ے بنکوں کو اس بارے میں ہدایات جاری کی گئی ہیں ۔

کمیشن نے ایک ورکنگ گروپ کی تشکیل کی سفارش کی ہے تا کہ وزیراعظم کے
...رہ نکاتی پروگرام کو روبعمل لانے منصوبہ بند طریقہ پر عمل ہو سکے ، کمیشن نے اقلیتوں کی
...یم کے تعلق سے نئی تعلیمی پالیسی کے باب (۱۴) پر عمل آوری کا مطالبہ کیا ہے ۔ تا کہ
...دی ریاستوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ابتدائی تعلیم ہندی اور اُردو
...نوں رسم الخط میں دی جائے تا کہ دونوں زبانیں قریب ہوں اور مشکل ہندی کی بجائے
...م اور مشترک آسان زبان رائج ہوگی اور غیر ہندی ریاستوں کے لئے بھی قابل قبو
...گی جو آج ملک کی قومی ضرورت ہے ۔ کمیشن نے اقلیتی لسانی کمیشن کو بھی توجہ دلائی
...ریاستی تنظیم جدید سے لسانی اقلیتوں کے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کے حل کیلئے
...س حل کمیشن کی سفارشات پر عمل کرئے ۔

مرکزی اقلیتی کمیشن نے بر وقت اقلیتی مسائل کو اجاگر کرتے اس کے حل
...کے لئے جن سفارشات کی نشاندہی کی ہے ۔ امید ہے کہ بنک اور دیگر ادارے
...ن پر عمل پیرا ہوں گے ۔ اور مرکز اور ریاستی حکومتوں کے مابین مناسب تال میل پیدا
... تا کہ اقلیتوں کی پس ماندگی دور ہو اور وہ قومی دھارے میں شریک ہو کر ملک کی ترقی
...ں اپنا حصہ ادا کر سکیں ۔

انیس چشتی

اردو کے ہندو نعت گو شعراء

میری اس رائے سے دانشورانِ محفل شاید متفق ہوں کہ ہیت FORM سے قطع نظر تمام اصنافِ سخن میں نعت مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ بظاہر نعت کہنا شاعروں کیلئے مشکل کام نہیں، لیکن اس کے آداب ولوازم کو نباہنا مشکل ترین امر ہے۔ غزل اپنے معیار پر ہے تو غزل ہے معیار سے بلند ہے تب بھی غزل ہے، معیار سے پست ہے تب بھی غزل ہے۔ ہم صاف کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کی غزل ہے، یہ میر وسودا ہیں، یہ آتش وداغ ہیں۔ یہ سراپا والی، معاملہ بندی والی، اپنے آپ کو اس زمین سے قریب رکھنے والی جس پر انسان پیر رکھتا ہے، جب ایسی کوئی چیز ادب میں پائیں تو اسے مومن کی غزل کہیے۔ یہ صوفیانہ، عاشقانہ، باغیانہ غزل حسرت کی ہوئی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہیکہ اردو شاعری میں نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مرثیہ، مثنوی ہو یا رباعی یا آج کے جدید ہیئتی تجربوں والی شاعری، یہاں تک کہ حمد ومنقبت بھی، اس میں وہ نزاکتیں (اور خاص طور پر اسلامی عقائد سے متعلق) درپیش نہیں ہیں جو مرحلۂ نعت گوئی میں ملحوظ رکھنی پڑتی ہیں۔ آپ سے ذرا سی غفلت ہو جائے اور مدح میں وارفتہ حال ہو کر کچھ زیادہ کہہ بیٹھیں تو معاملہ کفر وشرک کی حدود کو جالے۔ اس سے بچنے کی سعی میں آپ نے ذرا وسعت اختیار کی تو معاملہ بے قابو ہو کر بے ادبی اور گستاخی کے زمرے میں جا پہونچے گا اور سخن گو ان تمام حدودِ شریعت کا پاس ولحاظ رکھتا ہوا اصل نعت گوئی پر پہونچتا ہے تو بات آمد کی بجائے آورد بن جاتی ہے۔ اس تمہید کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر آپ زیرِ نظر مقالہ ملاحظہ فرمالیں تو شاید آپ کو میری بات سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ہندوستان کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسلامی روایات کا پاس ولحاظ رکھنے والے افراد نے یہاں کا صرف مذہب اسلام کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ یہاں کے دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں اسلام کے رواج

---

۴۲۵ کیداری روڈ، پونہ ۱

کے بارے میں ایسا تاثر دیا کہ اس ملک میں بسنے والے دیگر طبقات سے متعلق افراد نے بھی ایک سچے عاشقِ رسول کی طرزِ زندگی اور اخلاق و عادات کو اپنی زندگی کا خاصہ بنایا اور جب شعر گوئی کی طرف رغبت اختیار کی تو مدحِ رسولؐ کے ایسے جوہر دکھائے کہ بے ساختہ ان کی وابستگی اور نسبت پرستی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے اقبالؒ کے مطابق میرِ عربؐ کو جہاں سے ٹھنڈی ہوا آئی تھی اس سرزمین اور اس وطن میں اردو زبان کی شاعری سے لگاؤ ظاہر کرنے والوں میں جہاں مسلمان [illegible] پیش پیش رہے ہیں ہندوؤں نے بھی علم و ادب کے ایسے جوہر دکھائے کہ ہر پڑھنے والا جھوم جھوم اٹھتا ہے

حضرات! میرے مقالے کا موضوع ہی "اردو کے ہندو نعت گو شعراء" ہے۔ اگر موضوع کا احاطہ تحریر میں لانے سے پہلے صرف غیر مسلم شعرا کے ناموں کی فہرست تیار کی جائے تو یقین مانیے کہ ہندو نعت گو شعراء کے ناموں کی اچھی خاصی کتاب مرتب ہو جائے گی، جنھوں نے ختمیؐ لقبؐ، نبیٔ رحمتؐ، سرورِ عالمؐ اور شمس الضحیٰؐ، بدر الدجیٰؐ سے اپنی والہانہ وابستگی کو ایسے اشعار میں پرو دیا ہے کہ ان کی [illegible] امتِ محمدیؐ سے وابستہ افراد بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

یہ وقت ایسا نہیں کہ لالہ لچھمی نرائن شفیق، راجیشور راؤ اصغر، مہاراجہ چندولال شاداں، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، منوہر لعل بہار، راجہ لعل راجہ، لکھمن لعل لکھمن، رگھویندر راؤ جذب، بہاری لعل رمز اور ایسے ہی بے شمار کئی نعت گو شعراء کے نعتیہ کلام کو پیش کر کے ان کی مدح سرائی کی جائے اور نہ ہی یہ ایسا موقع ہے کہ جگدیش مہتہ درد، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، رتن ناتھ سرشار دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، دیا شنکر نگم جیسے شمالی ہند کے نعت گو شعراء کے نعتیہ کلام کے محاسن کی نشاندہی کی جائے۔ اس موضوع میں اسقدر وسعت ہے کہ اس پر ایک بھرپور مقالہ لکھا جا سکتا ہے اور ان کے تمام عناصر اور عوامل پر بحث کی جا سکتی ہے۔ اردو کے بیشتر نعت گو ہندو شعراء کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے عقیدت کا وہ رویہ اختیار کیا جو نعت میں غلو اور مبالغہ کی حدود کو چھو لیتا ہے۔

رسولِ مقبولؐ کو ایک محبوب کی طرح چاہنا اور ان تمام جذبات کی عکاسی جو ایک محبوب سے منسلک ہیں، اسی طرح نعت کے موقع پر مدحِ رسولؐ کو خدائی صفات سے وابستہ کر دینا، ایسے ہی بے شمار مسائل نعت گو ہندو شعرا کے کلام میں دکھائی دیں گے۔ جن کی طرف نشاندہی بھی طویل وقت اور وسیع مقالہ کی متقاضی ہے میں صرف اس قدر عرض کرتا چلوں کہ نعت گو ہندو شعراء نے اپنے نعتیہ کلام کے ذریعہ ایسا ماحول

ضرور پیدا کر دیا جس کی وجہ سے رسول عربیؐ سے رغبت کا جذبہ غیر اسلامی افراد میں عام ہو گیا۔

اپنے اس مضمون میں بجائے ہندو نعت گو شعراء کے تفصیلی تعارف اور ان کے کلام کے محاسن اور معائب کی نشاندہی کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے کلام کا مختصر سا نمونہ پیش کیا جائے تاکہ ناظرین کو نعت گو ہندو شعراء کے معیار کلام کا اندازہ ہو سکے۔ یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اردو کے غیر مسلم ہندو شعراء نے مسلمان شعراء کی طرح تبرک کے طور پر اپنے مجموعہ کلام میں حمد کے بعد نعت کو بھی جگہ دی ہے۔ جتنے ہندو شعراء کے نعتیہ کلام شائع ہوئے ہیں اگر ان کی نعتوں کے چند نمونے بھی پیش کئے جائیں تو مضمون کئی صفحوں پر پھیل جائے گا۔ نعت سے رغبت رکھنے والے قارئین کی دلچسپی کیلئے چند شعراء کے نعتیہ کلام کے نمونے پیش ہیں۔

جگدیش مہتہ دردؔ دہلی کے متوطن ہیں۔ وہ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے رسولِ عا کے حضور عشق میں ڈوب کر جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا وہ ملاحظہ فرمائیں۔

یا شاہِ عربؐ سے عجب حال ہوا ہے   ہے مرنے میں کچھ لطف نہ جینے میں مزا ہے
اف درد عجب ہے

بیکل ہوں جدائی سے ہے بیتاب مری جاں   بے علم ہو کیوں حال سے یہ درد سوا ہے
اور رنج و تعجب ہے

بیدل ہی میں گھبرا کے چلا آؤں مدینہ   پر تاب و تواں مجھ میں کہاں ایسا رہا ہے
اور راہ صعب ہے

خادم ہوں میں جب آپؐ کا تاخیر یہ کیسی   للہ بتا دو مجھے کیا میری خطا ہے
کیا اس کا سبب ہے

جگدیش مہتہ دردؔ کی اس طویل نعت کے چند اشعار سے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو کے نعت ہندو شعراء نے اپنے کلام میں کس رویہ کو اختیار کیا ہے۔ اس مضمون میں دانستہ طور پر ایسے شعراء کا کلا نہیں پیش کیا جا رہا ہے جنھیں ہم نے قابل التفات نہیں سمجھا۔ نامور نعت گو ہندو شعراء سے اردو واقفیت رکھتا ہے۔ خود جگن ناتھ آزاد کا سلام اردو نعت گوئی میں ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا جا ہے۔ جس میں انہوں نے فخرِ دوراںؐ اور سرورِ کونینؐ کی خدمت میں سلام گذارنا ہے۔ اگر نعتیہ کلام سلام کے موقف کی نشاندہی ہو جائے تو شاید اس موضوع پر کچھ لکھا جا سکے۔ جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں

سلام اس ذات اقدس پر سلام اس فخر دوراں پر — ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیا کے انساں پر
سلام اس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا — رہا جو بے کسوں کا آسرا مشفق غریبوں کا
سلام اس پر جلائی شمع عرفاں جس نے سینوں میں — کیا حق کیلئے بیتاب سجدوں کو جبینوں میں
سلام اس پر کہ جس نے ظلم سہہ سہہ کر دعائیں دیں — وہ جس نے کھائے پتھر گالیاں اس پر دعائیں دیں

اس سلام میں جگن ناتھ آزاد کے خراج عقیدت کا انداز جس قدر پر خلوص ہے اس سے کہیں زیادہ ان کے صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر شعر کے آخری مصرعہ پر آپ غور کریں تو اندازہ ہو جائے گا کہ آزاد نے بیشک اردو کی نعتیہ شاعری میں کمال کر دکھایا ہے۔

لالہ لال چند فلک، آنند نرائن ملاّ، گوپال متّل، نرلیش کمار شادؔ، رتن سنگھ دگل، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے کلام اور منشی مہاراج بہادر برقؔ کے مجموعۂ کلام "مطلع انوار" میں نعت کے زندہ جاوید نمونے موجود ہیں۔ اپنے اس ادھورے مضمون کو دکن کے ایک اہم نعت گو اور حیدرآباد کے آخری نظام میر عثمان علی خاں کے وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کی نعتوں کے چند اشعار سے ختم کرنے کی اجازت چاہتا ہوں :

کافر نہ کہو شادؔ کو ہے عارف و صوفی — شیدائے محمدؐ ہے وہ شیدائے مدینہ
معراج میں حضورؐ جو مدعو خدا کے تھے — خلوت تھی کوئی اور وہاں میہماں نہ تھا

لازم ہے مجھ کو نعتیہ سنجی — رکھتا ہے یہ آرزو جی
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں — مدّاح حبیب مصطفیٰؐ ہوں

کشن پرشاد شادؔ نے واضح طور پر خود کو حبیب مصطفیٰؐ کا مداح قرار دیا ہے اسی طرح لاتعداد ہندو شعراء نے اپنے آپ کو مداح رسولؐ کہلوانے پر فخر محسوس کیا ہے۔ ان شاء اللہ کسی اور محفل میں اس کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ سر دست نمونتاً چند اشعار سنتے چلیئے۔

پنڈت ہری چند اختر

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا — کس نے ذروں کا اٹھایا اور صحرا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا — ایک عربؐ نے آدمی کا بول بالا کر دیا

سالک رام سالکؔ

کیوں نہ دل وجاں سے مجھے بھائے مدینہ — آنکھوں میں بسا ہے مرے مولائے مدینہ
سرمے کی طرح آنکھ میں سالکؔ میں لگا لوں — ہاتھ آئے اگر خاکِ درِ مولائے مدینہ

کرشن لال ادیب لکھنوی

آؤ ہم سب مل کے بیٹھیں پیار کی باتیں کریں — سرزمینِ یثرب و سرکار کی باتیں کریں
پریم کی گنگا بہائی جس نے ریگستان میں — روحِ تازہ پھونک دی مٹتے ہوئے ایمان میں

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

تکمیل معرفت ہے محبت رسول کی — ہے بندگی خدا کی اطاعت رسولؐ کی
اتنی سی آرزو ہے بس اے ربِ دو جہاں — دل میں رہے سحرؔ کے محبت رسولؐ کی

کالی داس گپتا رضاؔ

دوست اور دشمن پہ یکساں مہرباں تو ہی تو ہے
رہگزارِ زیست میں جوئے رواں تو ہی تو ہے
بے قرار دل کو ہے تیرا آسرا بعدِ خدا
روحِ دل تو ہی تو ہے تسکینِ جاں تو ہی تو ہے

خشونت سنگھ

صدر جنرل محمد ضیاء الحق شہیدؒ

۸ اپریل ۱۹۷۹ء کی صبح کو میں اسلام آباد پہونچا ۔ ۱۰ اپریل کو صدر ضیاء الحق سے ملاقات کا میرا پروگرام طے شدہ تھا مجھے "ہالی ڈے ان" ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا ' دنیا کے تمام ملکوں سے آئے ہوئے اخبار نویس اور ٹی وی کے لوگ وہاں مقیم تھے میرے ہوٹل سے صرف چند میل دور راولپنڈی جیل کی کال کوٹھری میں ذوالفقار علی بھٹو بند تھے اور ان کو پھانسی دئے جانے کا معاملہ میرے ہوٹل میں خاص کر موضوع گفتگو تھا میرے آنے سے اور ضیاء الحق سے میری ملاقات کے پروگرام سے متاثر ہوکر غیر ملکی صحافی یہ قیاس آرائی کررہے تھے کہ شاید بھٹو کو پھانسی دینے کا وقت کچھ آگے بڑھادیا جائے کیونکہ صدر ضیاء الحق اپنے سابق وزیراعظم کو پھانسی پر لٹکوانے کے بعد کسی جرنلسٹ سے اور خاص کر کسی ہندستانی جرنلسٹ سے ملاقات کرنا پسند نہ کریں گے۔

دوسرے روز میں ہندستانی سفیر شنکر باجپئی سے پاکستانی سیاست کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ۔ ۱۰ اپریل کی صبح کو اپنی عادت کے مطابق میں صبح صادق سے بہت پہلے جاگ اٹھا تھا میں نے دیکھا کہ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ہوٹل کو گھیرے میں لئے ہوئے ہیں ۔ اسٹین گنوں سے مسلح فوجی سڑکوں پر گشت کررہے تھے میں نے باجپئی کو فون کیا اور ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے انہوں نے فون بند کرتے ہوئے کہا کہ چند منٹ کے بعد ملوں گا چند منٹ کے بعد میں نے پھر ان کو فون کیا "فیصلے پر عملدرآمد ہوگیا باجپئی نے کہا اور میں ان کا مطلب سمجھ گیا ۔ صدر کے سکریٹری نے دس بجے مجھ کو ٹیلیفون پر بتایا کہ صدر سے میری ملاقات کا پروگرام ایک ہفتہ کیلئے ملتوی کردیا گیا ہے ۔ اس پر میں نے ہندستان واپس جاکر دوبارہ پاکستان آنے کا فیصلہ کیا ' دہ دن میں نے

پنڈی میں گذارا، یہ دیکھنے کیلئے کہ کچھ مظاہرے تو نہیں ہوتے تمام دوکانیں، اسکول اور کالج کھلے ہوئے تھے صرف سہ پہر کو نقاب پوش عورتوں نے کالی جھنڈیوں کا ایک چھوٹا سا جلوس نکالا ان کو میدان تک جانے کی اور وہاں غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت دیدی گئی۔

دوسرے روز میں کراچی میں تھا وہ جمعہ کا دن تھا اور مجھے توقع تھی کہ مسجد سے باہر نکلتے ہوئے لوگ بھٹو کے حق میں کچھ مظاہرہ کریں گے میرے میزبان منی شنکر آئر نے جو ہندستانی قونصل جنرل تھے اور ان کی بیوی سونیت نے مجھکو موٹر کار پر شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کرائی کہیں کوئی مظاہرہ نہ ہو رہا تھا میں نے دیکھا کہ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے لوگ سینما گھروں کے سامنے قطار لگائے کھڑے تھے چائے خانے چائے نوشوں سے بھرے ہوئے تھے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بھٹو کا کوئی بڑا وقار نہیں تھا۔ ضیاء کے خلاف احتجاج کا کوئی جذبہ نمایاں نہیں تھا یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ملک کے سپریم کورٹ نے بھٹو کو قتل کا مجرم قرار دیا ہے۔ جنرل ضیاء زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ بھٹو کی سزائے موت حبس دوام میں تبدیل کر دیتے اور یہ خطرہ مول لینے کیلئے جنرل ضیاء تیار نہ تھے کیونکہ مردہ بھٹو کے مقابلے میں مقید بھٹو زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ بہر صورت ضیاء ایک سچے مسلمان تھے وہ سمجھتے تھے کہ معاف کرنا اللہ پاک کا کام ہے مجھ جیسے فانی انسان کا کام نہیں ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد میں اسلام آباد واپس آیا اس مرتبہ میرے زیادہ تر سوالات بھٹو کو پھانسی دیئے جانے اور نظام مصطفیٰ کے قیام سے متعلق تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں جنرل ضیاء سے چبھتے ہوئے سوالات کر کے ان کو غصہ دلاسکوں غصے میں دیئے گئے جوابات اچھی عکاسی کرتے ہیں۔ پریسیڈنٹ کے اے ڈی سی سے چند منٹ گفتگو کے بعد مجھے کمرہ استقبالیہ میں پہونچا دیا گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی ایک دیوار پر مخملی غلاف چڑھا ہوا تھا جس پر سنہرے تاروں سے آیۃ الکرسی کڑھی ہوئی تھی کعبہ شریف اور کچھ دوسری مسجدوں کی تصویریں تھیں، خود جنرل کی اپنی باوردی تصویر بھی تھی مختلف رنگوں کے بہت سے پھول تھے پھر میری نگاہ اپنے سامنے رکھی ہوئی میز پر پڑی میز پر ایک کتابوں کا ایک ڈھیر تھا جس میں سکھوں کی تاریخ کی دو جلدیں بھی تھیں اور میرا ناول "ٹرین ٹو پاکستان تک" بھی تھا یہ کس نوعیت کی شعبدہ کاری تھی۔ جنرل تشریف لائے اور میرے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ قبل اس کے ہم بیٹھ کر باتیں شروع کرتے انہوں نے کہا "براہ کرم ان کتابوں پر میرے لئے آٹوگراف لکھ دیجئے" جو بھی جارحانہ عزائم میرے اندر تھے وہ

جواب بن کر رہ گئے ایک سربراہ مملکت ایک معمولی مصنف سے آٹوگراف دینے کو کہہ رہا تھا اس سے قبل میرے ساتھ عوامی رابطہ کا ایسا سلوک کبھی نہیں ہوا تھا۔

اور وہ کیسے نظر آرہے تھے متوسط قامت کے تنومند انسان مونچھوں کے نیچے دو دانت نمایاں گہری آنکھوں کے گرد سرمہ کی لکیریں لوگ ان کو سرمہ والی سرکار کہتے تھے۔ ان میں مارشل نام کی کوئی چیز نہیں تھی سیاہ شیروانی اور اس پر ہلالی دائرہ میں ان کے چوڑے سینہ پر سے گزرتی ہوئی ان کی جیب گھڑی کی سنہری زنجیر اور ان تمام چیزوں کے ساتھ وہ ایک جنرل سے زیادہ ایک ساہوکار یا ایک قصباتی وکیل نظر آرہے تھے۔

وہ بے حد نرم گفتار اور صاف گو انسان تھے وہ میرے کسی سوال پر برہم نہیں ہوئے اور ہر سوال کا بے لاگ جواب دیا وہ الیکشن اس لئے ملتوی کرتے رہے کہ ان کے نزدیک تاریخیں ایسی مقدس چیزیں نہیں جو بدلی نہ جاسکیں کیا وہ ان ظالمانہ قوانین کے نفاذ کو واقعی پسند کرتے تھے کہ چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اور زنا کرنے والوں کو سنگسار کر کے ہلاک کر ڈالا جائے اس سوال پر ان کا جواب تھا کہ ہاں ان سزاؤں میں کوئی بات ظالمانہ نہیں ہے کیونکہ قرآن نے یہ سزائیں مقرر کی ہے اور مسلمانوں نے اس کو قبول کیا ہے پاکستان میں جرائم کی رفتار میں بڑی تیزی سے کمی ہوئی ہے۔

میرا سوال تھا کہ کتنے لوگوں کو مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بند رکھا گیا ہے اور انہوں نے جواب دیا کہ صرف چند سیاسی لوگ ہیں اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد مزید کہا " اتنے زیادہ لوگ نہیں ہیں جتنے مسز گاندھی نے ایمرجنسی کے دوران جیلوں میں بند کئے گئے تھے ۱½ گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں

انٹرویو کے دوران ہی (جنرل ضیاء) کی بیوی اپنی سب سے چھوٹی بچی کو لیکر داخل ہوئیں تقریباً دس سال عمر کی بہت موٹی اور کمزور دماغ کی بچی بیگم صاحبہ نے ہم کو چائے پیش کی اور واپس چلی گئیں مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کسی جھجھک کے بغیر اپنی کمزور دماغ کی بچی ایک اجنبی کے سامنے لے آئیں میں نے ان سے دو مرتبہ معذرت کی کہ میں نے ان کا بہت قیمتی وقت لیا اور دونوں مرتبہ انہوں نے مجھے پھر بٹھا لیا جب میں جانے کے لئے اٹھا تو وہ کار تک میرے ساتھ آئے اور میرے لئے دروازہ کھولا جو بھی ان سے ملنے آتا تھا وہ اس کیلئے ایسا ہی کرتے تھے۔

دوسری صبح دو پارسل میرے کمرے میں پہنچائے گئے ان میں سے ایک چھوٹا قالین تھا اور دوسرے میں سنگ سلیمانی کا ایک ٹی سیٹ تھا یہ صدر [illegible] کی جانب سے [illegible] تحفہ تھا۔

اس کے بعد ہر سال مجھے ان کا کوئی نہ کوئی تحفہ ملتا رہا اس سلسلہ کا آخری تحفہ علامہ اقبال کی نظموں کی ایک خوبصورت مصور کتاب تھی بہت سے ہندستانی صحافی جو ان سے مل چکے ہیں اور جن کو پاکستان کا دوست بن گیا ان کو ایسے تحفے ملتے رہتے ہیں جنرل ضیاء نے کبھی روابط عامہ افسر کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ ہمیشہ اپنے لئے روابط عامہ کے بہترین ماہر تھے۔

اس انٹرویو کے بعد میں متعدد بار پاکستان گیا بھٹو کے واقعہ کے باوجود اور ان کی بیٹی بے نظیر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود میرا تاثر یہ ہے کہ پاکستانی عوام خواہ جنرل ضیاء سے محبت نہ کریں وہ ان سے نفرت ہرگز نہیں کرتے ان کے معترضین بھی ان کا اور ان کی سیاست و ڈپلومیسی کا احترام کرتے ہیں وہ انتہائی چالاک اور مکار سیاست دانوں کو تیمپا دکھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میری ان سے آخری ملاقات اس استقبالیہ میں ہوئی تھی جو پاکستانی سفیر نے نئی دہلی میں دیا تھا اس میں ایک ہزار سے زیادہ مہمان تھے مجھے یقین تھا کہ ان کو میری ملاقات یاد نہ ہوگی لیکن یا تو ان کو یادداشت بہت اچھی تھی یا مہمانوں کے متعلق جب وہ ان سے ہاتھ ملانے جاتے تھے تو ان کو تفصیل سے بتایا جاتا تھا جب ان سے میری ہاتھ ملانے کی باری آئی تو انہوں نے کہا "سردار صاحب مجھ سے پہلی ملاقات کے بعد آپ کئی بار پاکستان آئے لیکن مجھ سے پھر کبھی نہیں ملے اب آپ پھر کب آرہے ہیں میں نے سنا ہے کہ آپ اپنا آبائی گاؤں دیکھنا چاہتے ہیں ہم آپ کے وہاں پہونچنے کا انتظام کریں گے مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں نے جواب دیا " جنرل صاحب ایسی جگہ کیا لطف آسکتا ہے جہاں چھپ کر شراب پینی پڑے۔"

انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا " پاکستان میں آپ کو شراب پینے سے کس نے روکا ہے میں جانتا ہوں کہ آپ جب بھی یہاں آئے آپ کی اچھی تواضع کی گئی ہے ان کی نگاہوں میں تھا کہ میں کہاں کہاں گیا اور کن لوگوں سے ملا (بشکریہ نئی دنیا دہلی)

سلسلہ ص ۲۵

بہتر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ سرورق دیدہ زیب 'عہد آصفی کا پس منظر لئے ہوئے۔ قیمت گوارہ، کتابت عمدہ، بزم اردو ادب سری سیلم پراجکٹ آفس سے یہ کتاب خریدی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مرتب سے سلطان پورہ نمبر 3-7-8 سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

متین الرحمٰن مرتضیٰ

(آخری قسط)

مولوی عبدالحق

تضادات سے بنتا ابھرتا انسان

اس واقعے کے بعد مجھے کچھ بزرگوں کا پراسرار رویہ بھی سمجھ میں آگیا۔ ان میں ایک میجر لج (اردو کالج) کے سابق پرنسپل میجر آفتاب حسن صاحب اور اسی کالج کے ایک اور استاد باجو آشکار حسین صاحب (مرحوم)، تھے، جو مولوی صاحب کے زمانۂ علالت میں بڑی پابندی سے سرے تیسرے روز ہسپتال آتے تھے۔ مگر ایک دفعہ بھی دونوں حضرات میں سے کوئی ملاقات کیلئے ولوی صاحب کے کمرے میں نہیں آئے بلکہ نیچے لان میں پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ جاتے تھے اور سی ذریعے سے مجھے یا نیاز حسن خاں کو اوپر سے بلاکر تفصیل سے مولوی صاحب کی خیریت اور علاج علاج کی تفصیلات دریافت کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے برسوں کالج کے معاملات پر مولوی صاحب کی ٹھنی رہی اور بالآخر ایوب خاں کے مارشل لا کے ذریعے مولوی صاحب، میجر صاحب کو اردو کالج سے بیک بینی و دوگوش رخصت کردینے میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے باہمی روابط میں اخلاص اور عداوت کی سرحدیں ایسی مربوط و متصل دکھائی دیتی تھیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ ان میں حقیقتاً کون "بڑا" ہے اور کون 'چھوٹا'۔؟ میں آج تک یہ طے نہ کرسکا یہ مولوی صاحب کی عظمت تھی جو باہمی روابط کی بہت سی تلخیوں کے باوجود ان حضرات کا رشتۂ ارادت و عقیدت مولوی صاحب سے منقطع نہ کراسکی یا یہ ان حضرات کی اخلاقی برتری یا عالی ظرفی تھی کہ مولوی صاحب کی گالیوں کے خوف سے ان کے کمرے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پانے کے باوجود یہ لوگ ان کی پرسش احوال کیلئے پابندی سے ہسپتال ضرور آتے تھے۔ وضع داری کی قدیم روایات کو نبھانے والے انسانوں کی یہ جنس اب ناپید ہوتی جارہی ہے۔

اردو کالج میں اگرچہ مولوی صاحب کے ہی ایما پر تبدیلی آئی تھی مگر یہ تبدیلی ان کے حسب خواہ

نہیں تھی ۔ ایوب خاں مرحوم نے مولوی صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں اپنے لئے دوست نوازی کا
سبیل پیدا کرلی تھی جب کبھی ایوب خاں علی گڑھ میں انٹر میں پڑھا کرتے تھے تو عطاء الرحیم صاحب
وہاں ان کے سینیئر تھے ۔ عطاء الرحیم صاحب انجمن طلباء کے صدر یا سکریٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے
اپنی کابینہ کا ایک رکن ایوب خاں کو بھی نامزد کیا ۔ یہ ہر دو حضرات کی دوستی کی ابتدا تھی ۔ پھر
عطاء الرحیم صاحب فوج ہی میں تعلیم کے شعبے سے منسلک ہوئے اور کرنل کے مرتبے تک پہونچے
اردو کالج سے میجر آفتاب حسن صاحب کو رخصت کیا گیا تو ایوب خاں صاحب نے اپنے ان ہی را
دیرینہ کو کالج کا پرنسپل مقرر کردیا ۔

کرنل عطاء الرحیم صاحب بنیادی طور پر شریف آدمی تھے اور بے ضرر بھی ' بس کمزوریاں
تین ہی تھیں ۔ اول یہ کہ ان کی سادہ لوحی حماقت کی حدوں کو چھوتی تھی ۔ دوسرے یہ کہ مولوی صا
سے ان کا اظہار نیازمندی فطری نظر نہیں آتا تھا ۔ اس پر خوشامد اور چاپلوسی کا شائبہ ہوتا
تیسرے یہ کہ اپنے طرز عمل میں وہ مولوی صاحب یا اردو کی تحریک سے زیادہ اپنے مربی ایوب خاں
وابستگی و وضعداری کے رشتے استوار رکھتے تھے ۔

میجر آفتاب حسن صاحب مولوی صاحب کے کھلے "دشمن" سمجھے جاتے تھے اور عطاء الرحیم
اپنی جاں نثاری کا تاثر دیتے تھے ۔ مگر دونوں کے عمل کا یہ فرق میرے ذاتی تجربے کا حصہ بناکر
آفتاب حسن صاحب نے کالج سے اپنے رخصت ہونے سے قبل کالج کے علمی و ادبی مجلّے "برگ
کی مجلس ادارت کو دستاویزی اہمیت کا ضخیم" بابائے اردو نمبر" نکالنے کی ذمہ داری تفویض
چنانچہ میجر صاحب کی کالج میں موجودگی تک کئی مہینے اس منصوبے پر محنت ہوئی اور تقریباً د
صفحات کی کتابت ان ہی کے زمانے میں مکمل ہوئی ۔ مزید تین سو صفحات کی کتابت کا کام ہنوز
کہ میجر صاحب کی جگہ کرنل صاحب پرنسپل ہوکر آگئے ۔ انہیں جب" بابائے اردو نمبر" کے منصو
علم ہوا تو انہوں نے اس منصوبے پر کام روک دیا اور ہدایت کی کہ اس منصوبے کو موخر کرکے
اتنی ہی ضخامت کا "ایوب نمبر" نکالا جائے ۔ مجلس ادارت کو تامل ہوا تو تنبیہہ و تحریص کے
استعمال ہوئے ۔ مجلس ادارت کو اپنے تعلیمی کیریر کی" عاقبت "خراب نہیں کرنی تھی اور کرنل
صاحب کی یہ تحریص کارگر رہی کہ ایوب نمبر کے پانچ سو نسخے" ادارہ تعمیر نو" خرید لے گا اور
علاوہ [illegible] نمبر کی بہتر اہتمام کے ساتھ اشاعت کیلئے فنڈز مہیا ہو جائیں گے ۔ اس طرح

کے مجوزہ "بابائے اردو نمبر" سے پہلے "برگ گل" کا کرنل عطاءالرحیم صاحب کا تجویز کردہ "ایف نمبر" شائع ہوا اور اس کی اشاعت میں کالج کے اپنے تمام فنڈز ضائع ہو گئے۔ "بابائے اردو نمبر" کی اشاعت کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ بچی۔ ادارۂ تعمیر نو سے بھی کچھ نہ ملا۔ برگ گل کی مجلس ادارت نے "بابائے اردو نمبر" پر اپنی محنت اور (۱۰۰۰) صفحات کے قریب کتابت شدہ مواد کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے سودے بازی کی۔ انجمن نے اس کتابت شدہ مواد میں سے اپنے سہ ماہی جریدے "اردو کے بابائے اردو نمبر" کے لئے "بہتر نصف" کا انتخاب کیا اور یوں سات سو صفحات پر مبنی کتابت شدہ مواد کیلئے "بہتر نصف" اور "کہتر نصف" پر مبنی اردو اور برگ گل "کے دو الگ الگ "بابائے اردو نمبر" شائع ہو گئے اور ان کی اشاعت مولوی صاحب کے انتقال کے بعد ہوئی۔

کرنل صاحب باقاعدگی سے ہسپتال آتے تھے۔ ان کی حد سے متجاوز سادہ لوحی اور غیر فطری سی نیاز مندی کے امتزاج سے اکثر ایسے مواقع پیدا ہوتے رہتے تھے جو مولوی صاحب کے لئے اظہار ظرافت یا اظہار غضب کا وسیلہ بنتے تھے۔ جب ایک مرحلے پر یہ طے ہوا کہ مولوی صاحب کو بغرض علاج یوروپ جانا ہوگا تو کرنل صاحب ان کی روانگی کے انتظامات کے سلسلے میں خاصے سرگرم ہو گئے۔ مولوی صاحب کا اصرار تھا کہ یوروپ ہو یا کوئی اور جگہ، وہ جہاں بھی جائیں گے اپنی وضع اور لباس نہیں بدلیں گے۔ وہی ترکی ٹوپی ہوگی، وہی شیروانی اور وہی علی گڑھ کی تراش والا سفید پاجامہ ترکی ٹوپی اور شیروانی کی حد تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر سوتی کپڑے کا سفید پاجامہ ان کے معالجین کے خیال میں یوروپ کی سردی سے ان کی مدافعت کے سلسلے میں ناکافی تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب خاص رد و کد کے بعد اس بات پر آمادہ ہوتے کہ ان کے لئے سفید فلالین کے دو پاجامے سلوائے جائیں جو عام سوتی کپڑے کے مقابلے میں سردی سے زیادہ بہتر مدافعت کر سکیں گے۔ کرنل صاحب نے بڑی خوشی اور گرمجوشی سے اس خدمت کی سعادت اپنے لئے قبول فرمائی۔

تیسرے روز کرنل صاحب سلے ہوئے پاجامے لے کر ہسپتال پہونچ گئے اور بڑے شوق سے پاجامے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔ مولوی صاحب اس وقت کسی قدر خوشگوار موڈ میں بستر پر بیٹھے تھے۔ پاجاموں پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے پوچھا۔

"رحیم صاحب! درزی نے پاجامے بہت میلے کر دیئے"

نہیں تو مولوی صاحب! پاجامے تو صاف ہیں۔ کرنل صاحب نے اپنی کارکردگی کے بارے میں
منفی تبصرے پر کسی قدر پریشان ہوکر کہا۔

"تو پھر کیا آپ نے یہ پاجامے کورے لٹھے کے سلوائے ہیں؟ یہ صاف اور سفید تو نہیں ہیں"۔ مولوی صاحب نے چڑ کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ دراصل آپ کے آرام کی خاطر میں نے کپڑے کو الٹی طرف سے سلوایا ہے تاکہ نرم رواں بدن کی طرف رہے اور کورے لٹھے کی طرح میلا میلا سا نظر آنے والا غیر روئیں دار پہلو' باہر کی سمت رہے"۔

مولوی صاحب کے چہرے پر برہمی اور ناگواری کی لہر آئی اور گزر گئی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مگر ان کا مکمل اور مسلسل سکوت سب کچھ بتا گیا۔ کرنل صاحب اس گمبھیر خاموشی کو توڑنے میں ناکام رہے اور بجھے بجھے انداز میں اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ ان کے جاتے ہی مولوی صاحب پھٹ پڑے

"اسرار احمد! ان پاجاموں کو ایک طرف ڈال دو۔ میں نہیں پہنوں گا۔ عجیب فیل خرمغز ہے یہ شخص۔!

حکیم صاحب نے پاجامے وہاں سے ہٹا دیئے اور کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر میں مولوی صاحب کا غصہ فرو ہوا اور انہوں نے کسی قدر شگفتہ انداز میں حکیم صاحب سے مخاطب ہوکر کہا۔

"بھئی اس فہرست میں حکیم امامی سے اوپر ان کا نام لکھ دو۔ یہ اس اعزاز کے مستحق ہیں"۔

"جی اچھا" حکیم صاحب نے ہنس کر جواب دیا اور بات ختم ہوگئی۔ عطا والرحیم صاحب کی فربہی اور ان کی قابل رحم حد تک سادہ لوحی پر فیل خرمغز والا جامع تبصرہ تو سمجھ میں آیا۔ مگر فہرست' حکیم امامی کا حوالہ اور اعزاز والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں پوچھنے پر حکیم صاحب نے وضاحت کی کہ بنگلور میں مولوی صاحب کے کوئی دوست حکیم امامی تھے جن کی حماقتوں سے مولوی صاحب عاجز تھے۔

مولوی صاحب بیوقوفوں سے بہت چڑتے تھے اور ان کی صحبت کو عذاب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے دوستوں اور شناساوں میں سے ایسے افراد کی فہرست مرتب کر رکھی تھی جن کے فیض صحبت کے عذاب سے وہ پناہ مانگتے تھے۔ اس فہرست میں حکیم امامی برسوں سے نمبر ایک چلے آرہے تھے مگر اس روز مولوی صاحب نے حکیم امامی کو اس اعزاز سے محروم کرکے کرنل صاحب

کو ۳۱ ؍ اعزاز سے سرفراز کردیا ۔

مولوی صاحب کے طویل سفر کے مضمرات پر ان کے معالجین پوری طرح یکسو نہیں تھے اور ابھی بیرون ملک روانگی کی کوئی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی کہ اس اثنا میں صدر پاکستان کی طرف سے سی ۔ ایم ۔ ایچ راولپنڈی میں ان کے علاج کی پیشکش موصول ہوگئی ۔ اخبارات میں اس پیشکش کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں تو بہت سے بے خبروں کو "خبر" ہوئی کہ ان کے شہر میں کوئی بابائے اردو بھی رہتے ہیں ۔ بیمار ہیں اور ایسے اہم ہیں کہ صدرِ مملکت ان کی خدمت کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں ۔ اس خبر کے ملتے ہی بہت سے موقع پرستوں کو مولوی صاحب کی عیادت کا خیال آیا اور ہسپتال میں مولوی صاحب کی عیادت کے لئے آنے والے ایسے اجنبیوں کی تعداد بڑھ گئی جن سے نہ کبھی مولوی صاحب کے مراسم رہے تھے اور نہ ملاقات ۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں بیمار بابائے اردو کی جانِ ناتواں سربراہِ مملکت سے قربت کا وسیلہ محسوس ہوئی اور بس ان کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا ۔

ایک روز ایک خاصے فربہ بدن والے صاحب سوٹ میں ملبوس ٹائی باندھے اور جناح کیپ پہنے ہوئے وارڈ کا زینہ چڑھنے کی مشقت طے کرتے کے بعد پسینے میں نہائے ہوئے مولوی صاحب کے کمرے میں وارد ہوئے ۔ بڑی چاپلوسانہ عقیدت کے ساتھ انہوں نے مولوی صاحب کی دست بوسی فرمائی اور مزاج پرسی کی ۔ مولوی صاحب بستر پر دراز تھے ۔ عینک تکیے کے نیچے رکھی تھی ۔ ایسی کیفیت میں نہ وہ کسی کو پہچان سکتے تھے اور نہ سن کر (ثقل سماعت کے باعث) حکیم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ رئیس بلدیہ ہیں ۔ آپ کی عیادت کے لئے آئے ہیں ۔ مولوی صاحب نے کسی قدر سرد مہری کے ساتھ رسمی علیک سلیک کی اور خاموش ہوکر بے تعلق ہوگئے ۔ وہ صاحب جو رئیس بلدیہ ہی نہیں بڑے صنعت کار بھی تھے کرسی پر بیٹھ گئے اور حکیم صاحب سے مولوی صاحب کی پرسش احوال کے بعد گویا ہوئے : " دیکھئے جی ۔ کیسی بد قسمتی کی بات ہے اتنا بڑا آدمی ہمارے شہر میں پڑا رہا اور ہم اس خدمت سے غافل رہے ۔ بابائے اردو تو جی پورے ملک ، بلکہ ان سب ملکوں کے لئے جہاں جہاں اردو بولی جاتی ہے ، قابل فخر ہیں ۔ یہ اس شہر کا سامان ہیں ۔ ان کی خدمت ہمارے لئے سعادت ہے ۔ صدر صاحب نے علاج کی پیشکش فرما کر بڑی عزت افزائی کی ہے ۔ مگر دیکھیں نا ، ہمارا صدر تو سپاہی ہے وہ ذاتی حیثیت میں کوئی امیر آدمی تو نہیں ہے ۔ اس نے غریب ہوتے ہوئے بابا جی کا

[illegible] کی پیشکش کر کے بڑے دل والی بات کی ہے ۔ مگر یہ تو ہمارے سوچنے کی بات ہے بابا جی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے ۔ ہم یہ بوجھ اپنے غریب صدر پر کیوں ڈالیں ۔ بابا جی اس شہر کا سامان ہیں آپکی خدمت ہمارا فرض بنتی ہے ۔ ان کی آمدورفت ، راولپنڈی میں ان کے تیمارداروں کے قیام وطعام اور علاج معالجے کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے ۔ میں برداشت کروں گا یہ بوجھ ۔ آپ صدر صاحب کو یہ اطلاع دیں ۔ جی ۔" یہ لمبی تقریر کر کے وہ اٹھے اور فرمانے لگے ۔

کسی کو میرے ساتھ بھیج دیجیے ۔ میں ابھی پی آئی اے سے ٹکٹ بنوا دیتا ہوں ۔ انہیں اوپن رکھیں گے ۔ جب روانگی کا پروگرام طے ہو جائے گا تو اسی حساب سے کنفرم کرا لیجیے ۔ میں انشاء اللہ روانگی سے پہلے حاضر ہوتا رہوں گا اور ہر ممکن خدمت کروں گا ! انشاءاللہ !"

ان کے یہ اقدامات اور اعلانات اتنے اچانک تھے کہ ہمیں مولوی صاحب کے مشورے یا اپنے ردعمل کے طے کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی ۔ حکیم صاحب نے مجھے ان کے ساتھ جانے کی ہدایت کی اور میں اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا ۔ پی آئی اے سے انہوں نے مولوی صاحب کے لئے دوہری یا تہری نشست والا ٹکٹ بنوایا تاکہ وہ لیٹ کر سفر کر سکیں اور مزید دو ٹکٹ بنوا کر میرے حوالے کئے اور بتایا کہ وہ کل پھر ہسپتال آئیں گے ۔ انہوں نے اپنی گاڑی ہی میں مجھے واپس ہسپتال پہنچایا ۔ میں کمرے میں پہنچا تو حکیم صاحب نہیں تھے اور مولوی صاحب بستر پر دراز مگر بیدار تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا ۔

"تم کہاں تھے ۔ ؟"

میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ بس غضب ہو گیا ۔ وہ غصے سے کانپنے لگے اور غضبناک آواز میں بولے "تو اب میرے علاج کے لئے شہر میں خیرات اکٹھی ہونے لگی ہے ۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔ تم کیوں گئے تھے اس کے ساتھ ، کس سے پوچھ کر گئے تھے ؟ میں مولوی صاحب کے اس پر اشتعال ردعمل سے گھبرا گیا اور گھگیا کر بولا ۔ "مجھ سے حکیم صاحب نے کہا تھا کہ تم چلے جاؤ ان کے ساتھ ، اس لئے میں گیا تھا ۔

حکیم صاحب تو ......" اور اس کے بعد مولوی صاحب نے حکیم صاحب کی شان میں بہت کچھ سخت الفاظ ارشاد فرمایا اور میں سہم گیا کہ اب واپسی پر جب حکیم صاحب کی بازپرس ہوگی تو وہ مجھ پر الگ برس پڑیں گے اور بعد از آں ہوا بھی ۔ حکیم صاحب پر اپنی برہمی کا اظہار مکمل کرنے کے بعد مولوی صاحب نے [illegible]کم دیا ۔

ابھی یہ ٹکٹ لے کر جاؤ' اور اس کے منہ پر مار کر بتا دو کہ میں نے زندگی میں اپنے لئے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا ہے اور صدر سے بھی کچھ نہیں لوں گا۔ میں اپنا علاج خود اپنے پیسے سے کراؤں گا۔ میں ایسا کنگال نہیں ہوا کہ میرے علاج کے لئے خیرات جمع ہونے لگے"۔ میں یہ حکم پاتے ہی کمرے سے نکل گیا اور برآمدے میں بیٹھ کر حکیم صاحب کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے روز رئیسِ ملدیہ جھومتے جھامتے پھر کمرے میں آن پہنچے اور شامتِ اعمال کہ انہوں نے براہِ راست رقم کی تھیلی مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کرنی چاہی۔ بس پھر کچھ نہ پوچھئے کہ مولوی صاحب نے ان کی کیسی تواضع فرمائی۔ مگر بڑے مضبوط اعصاب کے تھے یہ رئیس کہ ان پہ ہر تیرِ دشنام بے اثر ہوئے جا رہا تھا اور مطلقاً بے مزہ ہوئے بغیر وہ یہ سوغاتِ دشنام ہنس ہنس کر وصول کر رہے تھے اور ہم سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے۔

" دیکھیں نا جی بزرگوں کی تو یہی شان ہوتی ہے۔ ان کی ڈانٹ تو تبرک ہوتی ہے جی۔ جسے یہ تبرک ملے اس کے گناہ دھل جاتے ہیں۔ بس جی ہمارا جو فرض تھا وہ ہم نے پورا کیا۔ بزرگوں کو نہیں قبول تو یہ اللہ کی مرضی۔ اچھا جی۔ اللہ بزرگوں کو صحت دے خدا حافظ۔ یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔

ہماری یہ بے بسی کہ مولوی صاحب کی اس حالتِ غضب میں ہم مظلوم و معتوب رئیس ملدیہ سے نہ اظہارِ ہمدردی کر سکے اور نہ ہی انہیں رخصت کرنے کے لئے کمرے سے باہر نکل سکے۔

ہسپتال کے ایک ماہ کے تجربے میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولوی صاحب خونی رشتوں میں ویسی گرمجوشی، اور تیزی محسوس نہیں کرتے تھے، جیسی گرمجوشی اور تپاک ان کے یہاں جذباتی اور حسی رشتوں میں نظر آتا تھا۔ ہسپتال میں مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن صاحب اور ان کے صاحبزادے ہفتہ میں ایک آدھ بار ملنے آتے تھے اور ہسپتال ہی میں مجھے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب دنیا میں ایسے یکا و تنہا نہیں تھے جیسے سمجھے جاتے تھے۔ ان کے بھائی کا خاندان اور دوسرے اعزہ کراچی میں موجود تھے مگر مولوی صاحب نے نہ صرف تجرد کی زندگی گزاری بلکہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی کٹ کر الگ تھلگ رہے۔ یہ علیحدگی پسندی بھی مولوی صاحب کی طرف سے ایک طرفہ ہی نظر آتی تھی۔ دو طرفہ ہوتی تو شیخ احمد حسن صاحب اور ان کے بچے بھی عیادت کے لئے نہ آیا کرتے۔

ہسپتال میں جب بھی دونوں بھائیوں کو یکجا دیکھا تو ان میں علیک سلیک سے زیادہ کچھ نہ دیکھا باہم ان میں کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ شیخ احمد حسن جو بالکل مولوی صاحب ہی کی وضع قطع کے تھے

رے میں آتے تھے اور سلام کے تبادلے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھے رہتے تھے اور تھوڑی دیر بعد سلام تبادلہ کر کے رخصت ہو جاتے تھے۔ ان خونی رشتوں کی سرد مہری کے مقابلے میں محض جذباتی اور حسنی رشتوں میں مولوی صاحب کی دلچسپی، فعالیت اور گرمجوشی بھی دیکھی۔

حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے ان کے ایک مرحوم دوست نواب منظور یار جنگ کی بیوہ اور ان کے بچے کراچی میں تھے۔ یہ لوگ یہاں کچھ مالی مسائل سے دوچار تھے۔ مولوی صاحب غالباً ان کی کچھ مسلسل مالی اعانت کرتے تھے۔ مگر اس خاندان کے سابقہ اعزاز و اکرام کے خیال سے اپنے اس حسن سلوک کا اخفا کرتے تھے کہ اس خاندان کے افراد کی عزت نفس کو صدمہ نہ پہنچے جنہوں نے ماضی میں بہت اچھے دن گزارے تھے۔ مولوی صاحب کو ہسپتال میں ان لوگوں کی آمد کی پہلے سے اطلاع ہوتی تھی۔ چنانچہ بڑے اہتمام سے ان کی تواضع کے لئے پھل اور مشروبات منگا کر رکھے جاتے تھے۔ مولوی صاحب ان لوگوں کی کچھ مالی اعانت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ بھی مجھے بس یوں ہوا کہ جس روز انہیں آنا ہوتا تھا اس سے ایک روز قبل بنک سے کچھ منگوا کر مولوی صاحب تکیے کے نیچے رکھ لیتے تھے اور جب یہ لوگ آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہمیں ہدایت ہوتی تھی کہ ہم کمرے سے باہر چلے جائیں۔ آخری بار جب مولوی صاحب کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور غالباً وہ ان لوگوں سے زیادہ باتیں نہ کر سکے تو بچیاں اشکبار آنکھوں کے ساتھ کمرے سے رخصت ہوئیں۔

مولوی صاحب کے مذہب کا معاملہ بھی مجھے چیستاں نظر آیا۔ اپنی وضع قطع سے وہ بڑے پاکیزہ اور پکے مسلمان دکھائی دیتے تھے شکل و صورت اور لباس سے بھی وہ خاصے دیندار معلوم ہوتے تھے مگر ایک دو بار مجلسوں میں جب میں نے انہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں اوٹ پٹانگ لطیفے سناتے یا سن کر محظوظ ہوتے دیکھا تو مجھے بڑی اذیتناک حیرت ہوئی۔ مذہب کے بارے میں ان کے فکر و عمل میں بڑا خوفناک تضاد تھا۔ ہر مذہب کا بنیادی تصور خدا ہوتا ہے۔ مگر یہ تصور ان کی ایمانیات سے کم از کم مجھے خارج دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ میرا تاثر اول اول یہی بنا تھا کہ مولوی صاحب محض نام کے مسلمان ہیں ورنہ حقیقتاً وہ بے دین اور ملحد ہیں۔

مگر ایک روز مجھے بالکل دوسری طرح کی خوشگوار حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری (مرحوم) اور ابن انشا (مرحوم) مولوی صاحب کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے ایک صاحب کوئی اور تھے جن کا نام ذہن میں نہیں آ رہا۔ مولوی صاحب کی طبیعت بھی خاصی بحال تھی

ہلکی پھلکی گفتگو ہورہی تھی۔ ابن انشا (مرحوم) غالباً جناب جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب صاحب سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں مولوی صاحب کے علاج معالجے کے انتظامات میں ہونے والی پیشرفت کی تفصیل بتا رہے تھے کہ اسی اثناء میں ڈاکٹر احسن فاروقی (مرحوم) کمرے میں داخل ہوئے اور مولوی صاحب کو سلام کر کے سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گئے مولوی صاحب نے بڑی گرمجوشی سے ان کی پذیرائی کی اور غالباً کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بی۔ اے ہاشمی صاحب سے فاروقی صاحب کے تنازعے سے باخبری کی بنیاد پر پوچھا:

سناؤ فاروقی یونیورسٹی میں کیا ہورہا ہے۔؟

"وہی ہورہا ہے جو مسلمانوں کی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔" فاروقی صاحب نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ان کی تلخی کا سبب یہ تھا کہ وہ بی۔ اے ہاشمی صاحب سے جھگڑے کے نتیجہ میں بالآخر اپنی ملازمت سے محروم ہو چکے تھے۔

"کیا ہوتا رہا ہے مسلمانوں کی تاریخ میں؟" مولوی صاحب نے لہجے میں بڑی برہمی کے آثار تھے جنھیں محسوس کئے بغیر فاروقی صاحب نے فوراً مختصر جواب دیا۔

"غنڈہ گردی۔!

مولوی صاحب کے اعصاب یہ جواب سنتے ہی گویا لوٹ گئے اور انہوں نے دہاڑ کر کہا۔

"جاہل ہو تم۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے، میں جاہلوں کو برداشت نہیں کرسکتا"

فاروقی صاحب نے یہ بات غالباً مولوی صاحب کی "بے دینی اور" الحاد پسندی" کی شہرت کے پیش نظر کہی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مولوی صاحب کے مزاج سے مکمل آگاہی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ مولوی صاحب ان کا یہ جواب پاکر خوش ہوں گے۔ مگر جو ردعمل ہوا وہ ان کے لئے غیر متوقع تھا اور وہ بوکھلا گئے۔ مگر آدمی سمجھدار تھے۔ مولوی صاحب کے غصے کو فرد کرنے کے لئے تعمیل حکم کرتے ہوئے فوراً اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے اور باہر نکل جانے کی بجائے بڑی پرکاری اور خاموشی سے مولوی صاحب کے پلنگ کی پائنتی بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب سمجھے وہ چلے گئے۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب ہی لوگ اس اچانک صورتحال سے دم بخود تھے۔ پھر مولوی صاحب خود ہی بولے:

"ہاشمی نے فاروقی کو بہت ستایا ہے۔ بے چارہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہوگیا ہے۔ تب ہی

شبانہ ہی ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔"

"جی ہاں - مولوی صاحب! بالکل صحیح رائے دی ہے آپ نے۔" فاروقی صاحب نے بول کر پھر اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔

"اچھا۔ تو تم گئے نہیں یہیں موجود ہو؟ مولوی صاحب کا غصہ ڈھل چکا تھا۔

"جی ہاں - مولوی صاحب! میں تعمیل ارشاد نہ کر کے آپ کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور آپ کی صحبت سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے آپ کے قدموں میں آ بیٹھا ہوں۔"

"بہت خوب - ! مولوی صاحب نے شگفتگی سے کہا۔

اور اس کے بعد مولوی صاحب نے اسلام کی تاریخ کے روشن پہلوؤں، تہذیب انسانی پر اسلام کے احسانات اور عالمگیر تمدنی ارتقا پر مسلمانوں کی تاریخ کے اثرات کا بھرپور محاکمہ کرتے ہوئے بہت ہی فاضلانہ قسم کا لکچر دیا۔ جسے سن کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور مذہب کے معاملے میں مولوی صاحب کا جو پہلا تاثر مجھ پر قائم ہوا تھا، اس کی شدت میں کسی قدر کمی آئی۔ خصوصاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت اور ثقافتی میدان میں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا ذکر مولوی صاحب نے جیسی عقیدت و محبت سے کیا وہ بڑا بصیرت افروز تھا۔ مولوی صاحب کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کو غنڈہ گردی کی تاریخ کہنا جہالت ہے یا جھوٹ۔ سچی بات یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کو تمدن، تہذیب شائستگی اور علم کا نکھار دیا ہی مسلم تاریخ نے ہے۔

مذہب کے بارے میں رویّوں کے اس تضاد میں مکمل تعین تو ممکن نہیں بس اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ مولوی صاحب کے ذہن نے اسلام کے نظامِ عقائد و عبادات کو تو قبول نہیں کیا مگر تہذیب و ثقافت کی صورت گری اور ترقی کے سلسلے میں اسلام کے قائدانہ کردار کے وہ محض معترف ہی نہیں تھے بلکہ اس معاملے میں وہ اتنے جذباتی تھے کہ مخالفت میں کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ مگر میں آج تک یہ گتھی نہیں سلجھا سکا کہ مولوی صاحب کے ذہن نے اسلام کے عقائد کو کیوں قبول نہیں کیا۔ جبکہ تاریخ اور تہذیب انسانی پر اس کے مثبت اثرات اور فیوض و برکات سے انہیں انکار نہیں تھا۔

عادل صدیقی

اقبال کی وطن دوستی

اقبال اپنی تہذیب اور عقائد کے پوری طرح وفادار تھے ان کے گرد و پیش ملی تہذیب کے ستون ایک ایک کر کے گر رہے تھے اور وہ ثقافت مسمار ہو رہی تھی جس نے برسہا تک ہندوستان کے عوام کو متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اقبال کی شاعری اور ان کی تحریریں اس رنج و غم کی مظہر ہیں جو انہیں ہندوستان کی غلامی پر تھا۔ شاعر بلاشبہ قوم کا نمائندہ ہوتا ہے لیکن اگر قوم ہی نہ ہو تو پھر شاعر اور اس کی شاعرانہ صلاحیت کا مصرف ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اقبال کا ابتدائی کلام آزادی کی اہمیت و حقیقت کو واضح کرتا ہے ہندوستان کی غلامی پر ان کی مشہور نظم "پرندے کی فریاد" ایک علامتی نظم ہے:-

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ　　وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں اب اپنے گھونسلے کی　　اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں　　ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں　　میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے　　دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے　　دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے

میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اقبال کو اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت تھی۔ مشہور اردو رسالہ "زمانہ" کے مئی ۱۹۰۶ء کے
رے سے اقبال کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"سودیشی کی تحریک ہندوستان کے لئے کیا ہر ملک کے لئے جس کے اقتصادی و
سی حالات ہندوستان کی طرح ہوں، مفید ہے۔ کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل
ں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔ ہمارے اہل الرائے
یاسی آزادی! سیاسی آزادی پکارتے ہیں، مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ
ں کرتا کہ سیاسی آزادی کی شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ
ں سبقت لے جانا ہے۔۔ جس کی طرف خوش قسمتی سے اب اہل وطن کی توجہ ہوئی ہے
..... سیاسی حقوق کے حصول کی بڑی دوسری شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد
دنا ہے۔ اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت پیدا نہ ہوگی اور اگر افراد قومیت کے شیرازے
سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی
سے حرف غلط کی طرح مٹا دیں گے قدرت کسی خاص فرد یا مجموعہ، افراد کی پرواہ نہیں کرتی
گر رونا تو اس بات کا ہے کہ لوگ اتفاق، اتفاق، پکارتے ہیں مگر عملی زندگی اس
سم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو حال کی
رورت نہیں، خدا کے لئے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کرانے
کے لئے آیا۔ نہ کہ جنگ کی غرض سے۔ ---- ہمیں مقدس عہد لینا ہے کہ ہم
بیرونی ممالک کی مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے .... اگر اس تحریک سے
ہندو مسلمانوں میں اتحاد اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو
سبحان اللہ اور کیا چاہیئے۔

ہندوستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام
جلی قلم سے ممتاز اقوام میں لکھا جائے۔"

علامہ اقبال کی مندرجہ بالا تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو۔ مسلم
اتحاد کے زبردست حامی تھے اور سودیشی تحریک سے وابستگی کو ملک کے مستقبل
کے لیے فال نیک سمجھتے تھے۔

بحیثیت شاعر وہ کبھی بھی اپنے فرائض سے غافل نہ رہے۔ انہوں نے قوم کو جسم اور
راد کو اس کے مختلف اعضاء قرار دیا، نیز شاعر کو قوم کی آنکھ سے تشبیہ دی، وہ کہتے ہیں

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

علامہ اقبال اپنی ایک نظم "تصویر درد" میں اپنے پیارے وطن کے حال زار پر اس
طرح آنسو بہاتے ہیں ۔

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہا لیے
تیری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

ان کی نظم "صدائے درد" میں بھی اس تکلیف کا اظہار ہے ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

اس طرح ان کی مشہور نظم "نیا شوالہ" ... دوستی کی اعلیٰ مثال ہے ۔
یال اتحاد، باہمی محبت، دوستی اور قوم پرستی کی بنیاد پر ایک نئے ہندوستان

کی تعبیر کا خواب دیکھتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ــــ ہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے ۔ تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا ۔ جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا ۔ واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے تیرے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ ۔ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے ۔ سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

یہ نظم وطن دوستی کے باب میں علامہ اقبال کا شاہکار کہی جا سکتی ہے ۔
اقبال نے ایک اور نظم "ہندستانی بچوں کا قومی گیت" کے عنوان سے لکھی ۔ اس میں وطن سے محبت کا اظہار یوں کیا ہے ــ ہ

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

علامہ اقبال اہلِ وطن کو ذہنی پستی سے نکال کر اعلیٰ انسانی قدروں سے آشنا کرانا چاہتے ہیں ۔ وہ مسلسل اپنے اشعار کے ذریعے محبت، رواداری اور اتحاد کی تعلیم دیتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ابنائے وطن ایک دوسرے کے شریک درد بنیں کیونکہ جذبہ اتحاد ہی اخوت کی بنیاد بن سکتا ہے ۔

جناب سید مظفر حسین برنی نے اپنی مشہور کتاب "محبِ وطن اقبال" میں لکھا ہے کہ :۔

"اقبال کی وفات کو تقریباً نصف صدی گذر جانے کے بعد بھی قومی یکجہتی سے متعلق اقبال کے پیغام کے بارے میں غلط فہمیاں ہنوز باقی ہیں ۔

اقبال پکے محب وطن، مذہبی رواداری کے علمبردار حامی اور ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ اسلام سے اپنی گہری وابستگی کے باوصف ہندی فکر و فلسفے کے عمیق مطالعے کے بعد اس کی اصل روح سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ان کا پیغام آج ہمارے ملک کی تاریخ کے اس نازک دور میں جب ذات، نسل، فرقے اور علاقائیت کے فتنے سر اٹھا رہے ہیں، خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

"مادر وطن کی محبت ہی قومی یکجہتی کی بنیاد ہے اقبال نے اپنی شاعری کے دور اولیں میں چند بہت ہی متاثر کرنے والی اور جذبۂ حب وطن سے بھرپور نظمیں لکھی ہیں۔ اپنی نظم "ہمالہ" میں اقبال نے ہندوستان کی قدیم تہذیب اور اس وادیٔ کہسار کے دل فریب مناظر کے گن گائے ہیں"

اس کتاب میں فاضل مصنف نے لکھا کہ:

"اقبال نے اس ملک میں بسنے والے مختلف طبقوں اور فرقوں کے میل ملاپ اور بھائی چارہ پر بھی زور دیا ہے۔ خاص طور سے اپنی نظم "ترانہ ہندی" میں انہوں نے کہا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں مختلف فرقے بستے ہیں تاہم ان کی کثرت میں ایک رشتہ وحدت موجود ہے۔ "ترانہ ہندی" ان کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں مادر وطن کے لیے ان کی شدید محبت کا بہت ہی پرتاثیر اور لطیف و نازک اسلوب میں اظہار ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم کا المیہ پیش نہ آیا ہوتا تو مجھے یقین ہے یہ نظم ہمارے ملک کا قومی ترانہ بن گئی ہوتی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "1938 میں ماہنامہ جوہر (دہلی) کے خصوصی اقبال نمبر کے لیے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں مہاتما گاندھی نے ترانہ ہندی کی تعریف کی۔ یہ خط انہوں نے اردو میں لکھا۔ ان کے لفظوں میں:

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودہ جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ایک اور موقع پر گاندھی جی نے اردو ہندی کے تنازعہ کو نمٹانے کی غرض سے ترانہ ہندی کا حوالہ دیتے ہوئے اس ترانہ کو "ہندوستان کی قومی زبان کا نمونہ" کہا تھا۔ سید [redacted] نے یہ انکشاف بھی کیا کہ دور درشن کی نئی علامتی

دیکھیں جو پنڈت روی شنکر نے بنائی ہے وہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پر مبنی ہے اور اسے خود شہیدِ وطن شریمتی اندرا گاندھی نے پسند کیا تھا۔ یہ 76-ء کی بات ہے جب کہ موصوف ، وزارت اطلاعات و نشریات کے سکریٹری تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں یہ تجویز خود شریمتی اندرا گاندھی کی ہی تھی کہ دور درشن کی علامتی دھن اس قومی گیت پر بنائی جائے۔

علامہ اقبال ایک فلسفی تھے ، لہٰذا ہندوستانی کلاسیکی فلسفہ اور ادب سے ان کی دلچسپی قدرتی تھی ، ان کی شاعری ، ویدوں ، اپنشدوں سے بھی بڑی حد تک متاثر ہے۔ علامہ اقبال ، مہاتما بدھ کو پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں۔ اقبال سنسکرت کا اچھا علم رکھتے تھے۔ ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں نظم ہندوؤں کے مقدس منتر "گایتری" سے ماخوذ ہے وہ فلسفہ عمل میں یقین رکھتے تھے اور بھگوت گیتا سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ انہوں نے بھگوان رام، سوامی رام تیرتھ پر بھی نظمیں کہیں۔ "جاوید نامہ" میں وشوامتر اور رودی کی بات چیت سے ہندو اور اسلامی فلسفہ کی ملی جلی حکایت سامنے آتی ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری سے بیک وقت حب الوطنی اور انسانی اخوت کا درس ملتا ہے جس کی اہمیت اور ضرورت دور حاضر میں مسلّم ہے۔ ❀❀

سلسلہ صفحہ ۵۴

کر سکیں اور آگے بڑھ سکیں اور نہ ہی پورے نظام میں مجموعی جائزے کا کوئی نظام موجود ہو۔

اس قسم کا نظام ہمیں اپنے وسائل سے ہی وضع کرنا ہوگا۔ اسکی مثال ایک آرکسٹرا کی جس میں مختلف سازندے اپنے علیحدہ علیحدہ طرز موسیقی کے ذریعہ ایک ایسی مشترکہ دھن تیار کر دیتے ہیں جسے پسند کیا جاتا ہے اور سراہا جاتا ہے۔ اپنی مشکلات کے باوجود ہمارا ملک ہمیشہ مہارت اور تربیت یافتہ افرادی قوت کی شکل میں دیگر ترقی پذیر ممالک کو مدد دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اپنی پالیسی کے پیش نظر ہم نے نا وابستہ دیگر ترقی پذیر ممالک سے کچھ وعدے کئے ہوئے ہیں۔ جنوب ایشیائی علاقائی تعاون انجمن کے ممالک کو بھی تعاون دینے پر خصوصی دھیان دیا ہے۔ ان کے اشتراک سے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ہمیں بھی فائدہ ہوگا۔

کے ایم عارف الدین

ذرا غور کیجئے

نوجواں بیچ کر بھی، جو علم و ہنر ملے ❊ جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

—

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر ❊ دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو ❊ جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

- علم طاقت ہے ایک عالم میں ایک لاکھ جاہلوں کے برابر طاقت ہوتی ہے
- علم ایک ایسا پودا ہے جسے دل و دماغ کی سرزمین میں لگانے سے عقل کے پھل لگتے ہیں۔
- اگر تم نے اپنی اولاد کے لئے فقط اولاد چھوڑی ہے تو مانو کہ انہیں گمراہی اور سستی کی قید میں پھنسا دیا لیکن اگر خالی علم و نیک چلنی سکھادی ہے تو گویا ان کو تمام قیدوں سے آزاد کر دیا۔
- ہر ایک سودے میں نفع یا نقصان کا ہونا قسمت پر منحصر ہے مگر علم کا پھل بدبختی اور ادبار کی دسترس سے باہر ہے۔
- علم بڑی دولت ہے۔ علم سے نجات ہوتی ہے۔ علم کے آگے مال و دولت کی کچھ بھی حقیقت نہیں ایک محتاج آدمی جو دولتِ علم سے بہرہ ور ہے وہ بے علم بادشاہ سے بہتر ہے۔ ایک آدمی کا علم ہزار آدمیوں کی عبادت برابر نہیں ہوسکتی۔ عالم کا ایک دن جاہل کی تمام عمر سے زیادہ ہے۔
- جس آدمی میں علم نہیں، وہ آدمی نہیں جانور ہے اور جس گھر میں کوئی علم والا نہیں، وہ گھر نہیں جانوروں کا دربار ہے۔ اور جس ملک میں علم کا رواج نہیں، وہ ملک نہیں حیوانات کا جنگل ہے۔
- لارڈ میکالے کا قول ہے کہ اگر روئے زمین کی بادشاہت مجھے دیدی جائے اور میرا کتب خانہ مجھ سے لے لیا جائے تو میں اس پر ہرگز رضامند نہ ہوسکوں گا۔
- جو شخص علم حاصل کرنے کا خواہاں ہو، وہ پہلے یہ طے کر لے کہ آیا تحصیل علم سے اس کا مقصد کیا ہے

معتمد مدینہ پبلک اسکول و گرلز کالج - حمایت نگر - حیدرآباد

اگر صرف فخر و مباہات اور نمائش کے لئے پڑھتا ہے تو یاد رہے کہ وہ اپنا دشمن ہے اور اگر علم سے جہالت کا دور کرنا اور دوسروں کو پہچانا اور خدا ئے برتر کی رضا جوئی مقصود ہے اور ظاہری نمائش منظور نہیں تو سبحان اللہ [امام غزالی]

- تھوڑا علم خطرے کا موجب ہے اس چشمے کا پانی یا تو سیر ہوکر پیو ورنہ اس کے قریب مت جاؤ اس کے ایک دو گھونٹ پینے سے انسان مدہوش ہوجاتا ہے لیکن جی بھر کر پیئے تو دل و دماغ روشن ہوجاتا ہے
- حضرت جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے کہ علم کی قیمت ہے ۔ اس لئے قیمت لئے بغیر علم کسی کو نہ دیا کرو اس پر لوگوں نے سوال کیا کہ بھلا علم کی قیمت کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا اس کے لئے ایسے شخص کے پاس رکھنا جو خوبی کے ساتھ اس کا بار اٹھائے اور حفاظت رکھے اور اس کو ضائع نہ کرے ۔
- ہر زمانے میں موسم بہار موجود رہتا ہے ۔ یعنی انسان ہر وقت اور ہر عمر میں علم و ہنر حاصل کرسکتا ہے (ستوطا)
- انسان علم کا بہت زیادہ بوجھ اٹھانے کے باوجود خود کو پھول کی طرح ہلکا محسوس کرتا ہے (ڈیٹی سن]
- مخبر صادقؐ کا فرمان ہے " دنیا میں تمہارے تین باپ ہیں ۔ ایک وہ جو تمہاری پیدائش کا سبب ہے دوسرا وہ جس نے اپنی لڑکی تمہارے نکاح میں دی ۔ تیسرا وہ جس سے تم نے دولت حاصل کی اور ان میں بہترین باپ تمہارا استاد ہے "
- حضرت علیؓ کا قول ہے " جس نے مجھے ایک حرف کی تعلیم دی ہے اس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا "
- عبدالرحمٰن رحؒ بن قاسم فرماتے ہیں " میں نے بیس سال تک امام مالکؒ کی خدمت کی ۔ ان میں اٹھارہ سال آداب و اخلاق کی تعلیم میں صرف ہوئے اور صرف دو سال علم کی تحصیل میں "
- جو شخص محض دنیا کے لئے علم سیکھتا ہے ۔ علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا ۔
- علم خواہ کتنا بھی زیادہ حاصل ہوجائے ۔ لیکن ہمیشہ اس کو تھوڑا خیال کرو ۔ ہمہ دانی کا دعویٰ چھوڑو اور ہیچمدانی کی عاجزی اختیار کرو ۔
- جہاں سورج چڑھتا ہے وہاں رات بھی ضرور ہوتی ہے مگر جہاں علم کی روشنی ہو ، وہاں جہالت اندھیرا کبھی نہیں آسکتا ۔
- مجھے ایک بستر اور اچھی کتاب دے دیجیئے ، میں ہر طرح خوش ہوں [پرسل ممتھ]
- چراغ جس طرح جلائے بغیر روشنی نہیں دیتا ہے ۔ علم بھی بغیر عمل کے فائدہ نہیں پہنچاتا ۔
- عالم بے عمل گدھ کے مانند ہے جو آسمان پر اڑتا ہے مگر زمین پر مردہ کھاتا ہے ۔

عالم کی فضیلت عابد پر ویسی ہے جیسے میری فضیلت امت پر [حدیث]

کوئی کتاب جب پڑھو تو آخر میں چند نتیجے اخذ کرلو۔ ورنہ سرسری طور پر پڑھ جانا ایسا ہے جیسا کہ غذا کو بغیر چبائے ہوئے نگل جانا۔

اگر کوئی شخص ملک شام کے آخر سے چلکر یمن کے آخر تک محض اسلئے جائے کہ حکمت کا ایک بول سن لے تو میرے نزدیک اس کا سفر ضائع نہیں گیا [شعبی]

جب میں کسی جاہل کو عمدہ لباس میں ملبوس دیکھتا ہوں تو مجھے اس لباس کی قسمت پر رونا آتا ہے (مقولہ)

کتابیں ایسے بزرگوں کے مدفن ہیں جو مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے

جب تک آپ حصول علم میں کوشاں رہتے ہیں۔ بڑھاپا آپ کے نزدیک نہیں آتا۔ انسان بڑھاپے کی وادی میں اسوقت قدم رکھتا ہے جب وہ علم حاصل کرنا چھوڑ دیتا ہے

حدیث پاک میں ہے کہ کسی باپ نے اپنی اولاد کو عمدہ ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا

انسان کیلئے کوئی یادگار کتاب سے زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتی۔ عمارات، بت اور تصاویر وغیرہ ایک خاص معیاد کے بعد فنا ہوجاتی ہیں اور وہ ایک ہی جگہ مقید ہوتی ہیں۔ لیکن کتاب ہر جگہ پہنچ سکتی ہے اور اس کے فیض جاریہ سے تمام لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں۔

دس اچھی کتابیں پڑھیں تب کہیں آپ ایک سیڑھی اوپر چڑھتے ہیں لیکن اس کے برعکس صرف ایک گندی کتاب پڑھکر آپ دس سیڑھیاں نیچے اتر جاتے ہیں

واضح رہے کہ ہم غیر آدمیوں کے علم سے عالم تو بن سکتے ہیں مگر اوروں کی عقل سے عاقل نہیں بن سکتے

دنیا میں تمام چیزوں کی ایک حد، ایک مقدار اور ایک شمار ہے، سوائے علم کے کہ یہ بے حد، بے مقدار، بے شمار اور غیر مختتم ہے۔

دارالعلوم علم سے معمور ہیں۔ نئے لوگ اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ جانے والے اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ اس طرح علم میں مستقل طور پر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کسی ملک کی تہذیب کا صحیح معیار نہ تو مردم شماری کے اعداد ہیں، نہ بڑے بڑے شہروں کا وجود نہ غلے کی افراط اور نہ دولت کی کثرت بلکہ اس کا صحیح معیار صرف یہ ہے کہ وہ ملک کس قسم کے انسان پیدا کرتا ہے۔

- مطالعۂ علم اس لئے کرو کہ دل و دماغ کو عمدہ خیالات سے معمور کرو نہ اس طرح سے کہ تھیلیوں کو روپوں سے بھرپور کرو۔
- حضرت رسول کریمؐ کا فرمان مبارک ہے کہ علم تو نور خدا ہے جو گنہگاروں اور بدبختوں کو نہیں دیا جاسکتا
- ابوداؤد میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بوڑھے مسلمان اور عالم و حافظ قرآن بادشاہ عادل اور استاد کی عزت کرنا تعلیم خداوندی میں داخل ہے۔
- یاد رکھو جو استاد شاگرد کے حالات و مزاج سے واقفیت پیدا کئے بغیر اسے تعلیم دیتا ہے وہ ابھی خود تعلیم کا محتاج ہے۔
- معلم کے اوضاع و اطوار ایسے ہوتے چاہئیں کہ وہ نیکی اور پرہیزگاری کا مکمل مجسم نمونہ ہو اور اسکی زیارت ہی سے تعلیم کے مقدس فیض کا عکس متعلم کے دل میں کھینچ جائے۔
- علم کے سمندر میں تیرنے والے بچوں کو کشتی مت بناؤ کہ وہ تمہارے دھکیلنے ہی سے چلیں بلکہ انہیں اپنی ہی ذاتی طاقت سے تیرنا سکھاؤ
- اگر تم روزانہ ایک نئی بات بھی سیکھنی اپنا فرض سمجھ لو تو صرف ایک سال میں ۳۶۵ مسئلوں کے مالک بن جاؤگے۔
- انسان کیلئے سب سے ضروری چیز نیک چال چلن اور تعلیم ہے اس سے اتر کر صحت، باقی مال دولت و حشمت، لیاقت اور شہرت سب اس کے آگے ہیچ ہیں۔
- دنیا میں سب سے بڑی بدبختی جہالت اور علم سے محرومی ہے
- درس گاہ جنت کا روضہ ہے۔

سلسلہ صہ ۳۵

محنت و سعی کد و کاوش خود کرتی ہوتی ہے۔ کسی پر تکیہ کرنا اور دوسروں کی مدد کے متلاشی رہنا تباہی و بربادی کے راستہ لے جاتا ہے۔ اعلیٰ علمی صلاحیتوں سے متصف ہونے کے باوجود، انسان کو عملی ہونا پڑتا ہے۔ عمل کی دنیا آباد نہ کی جائے تو انسان ناکام ہوتا ہے۔ کوشش و عمل اور احساس ذمہ داری کا مثلث ایک بڑی زندہ حقیقت ہے۔ اس سے مفر حیات سے فرار ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

محمد عبدالوحید خان

حرفِ تابندہ

اقوام ملل اکثر حالات کا رونا روتی ہیں، آفات سماوی اور ناگہانی حادثات کا وقوع ان کی پناہ گاہ بن جاتا ہے۔ افراد اپنی شخصی کوتاہیوں نارسائیوں اور بے برکات و سلطنات کو بھول کر الزامات کا تانہ بانہ بن دیتے ہیں۔ اصل میں احساس ذمہ داری کے ادراک کے فقدان کا حتمی نتیجہ یہ ہوتا ہے تعمیری کام مسدود ہو کر تخریب کی دنیا آباد ہو جاتی ہے انسان کی نفسیات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سہل انگاری اور تساہل پسندی کی پردہ پوشی کر کے لوگ حالات کو ذمہ دار گردانتے ہیں۔ دنیا میں جتنے بھی اعلیٰ وارفع کام واقع ہوتے ہیں وہ سب احساس ذمہ داری کے باعث ہوتے ہیں۔ ذمہ داری اور فرائض منصبی سے عہدہ برآر ہونیکا رجحان ہی اصل میں آدمی کا بڑا مصلح ہے۔ اسی لیئے سر سید نے احساس ذمہ داری کو انسان کا بڑا مصلح تسلیم کیا ہے اور اس کی وکالت کی ہے اگر آدمی میں فرائض کی ادائیگی سے پہلو تہی کرنے کی عادت ہو اور وہ اپنے مفوضہ کام سے اجتناب کرے تو یہ دنیا بے رنگ و بو کی ہو جائیگی۔ یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ہر کس و ناکس ذمہ داریوں کی تکمیل اور اسے سر لینے سے ڈرتا ہے اعراض کرتا ہے جبکہ کسی قوم میں ذمہ داریوں سے ڈر پیدا ہو۔ اور وہ اس سے گریز کرنے لگے تو حقیقی ترقی معکوس ہو جاتی ہے۔ انسان کو دنیا میں ہر قدم پر اپنی ذمہ داریوں سے سامنا و مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ انسان کسی حیثیت اور وقعت کا حامل ہو اسے اپنی چھوٹی بڑی ذمہ داریوں کو نبھانا پڑتا ہے۔ اس سے قبل اس کا ادراک آگہی اور احساس ضروری ہے۔ معاشرہ و سماج میں اپنی ذمہ داریوں فرائض سے غفلت کی ایک دنیا آباد ہے۔ حقوق کا مطالبہ فرائض کی ادائیگی سے زائد ہے انسانی سماج کے ماہرین اور اخلاقی عمرانیات کے معلمین کا یہ نقطہ نظر ہے کہ کسی معاشرہ میں ہر شخص کو اپنا اپنا انفرادی ہی کام کرنا ہوتا ہے۔ اور اسے اپنا موقف آپ درست کرنا ہے۔

ایم۔ اے (سوشیالوجی) ایم۔ اے (اردو) ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) متعلم ایل ایل۔ ایم (آخری)

کبیر احمد

آل انڈیا ریڈیو، آزادی کے بعد

حصول آزادی کے بعد نئے مسائل، نئے تقاضے اور نئی اُمنگوں کو لیکر ہند کا کارواں آہستہ آہستہ تگرمام چلتا رہا۔ منصوبہ بند معشیت کی حکمت عملی نے زرعی و صنعتی شعبوں کے علاوہ سائنس و تکنالوجی کے میدان بھی مارے ہیں۔ اور اس کی ایک اہم کڑی موجودہ ذرائع ابلاغ و بالخصوص آل انڈیا ریڈیو کا جال بھی ہے۔

آزادی کے بعد ہی نشریات کو منصوبہ بند اور ایک قومی خدمت کی حیثیت سے وسعت دی گئی۔ جس وقت ملک آزاد ہوا تب صرف چھ ریڈیو اسٹیشن ہی تھے۔ اور ریڈیو سیٹس کی تعداد بمشکل ڈھائی لاکھ کے قریب تھی۔ یہ ملک کے دس فیصدی رقبے اور ۲۵ فیصدی آبادی کی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ حالانکہ اس کی ترقی کے لئے ۱۹۴۵ء میں پہلا منصوبہ مدون کیا گیا۔ لیکن وہ مابعد جنگ عظیم ترقیاتی پروگرام کا ایک جز تھا۔ اس وقت ملک میں ریڈیو کا نظام میڈیم ویو پر منحصر تھا۔

ہر ایک لسانی و تہذیبی علاقے کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ۳۶ء۶ کروڑ روپیے کے تخمینہ سے طاقتور ٹرانسمیٹر کی تنصیب کا منصوبہ بنایا گیا۔ چونکہ رفتہ رفتہ ایسے ٹرانسمیٹرز کی تنصیب کی لاگت میں اضافہ ہوتا جانے لگا اس لیئے ایک کلو میٹر کے مقصد ی ٹرانسمیٹر لگائے گئے جن کی قوت ایک کلو واٹ ہوتی ہے۔

وسعت کا نیا جال: آزادی کے بعد جموں کا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔ سرکردہ مصنف راجندر سنگھ بیدی اس کے سب سے پہلے ڈائرکٹر بنائے گئے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں وجئے واڑہ بشمول مزید چھ اسٹیشن آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں آلہ آباد اور احمدآباد سے

اسسٹنٹ ڈائرکٹر ریجنل ٹریننگ سنٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

منظم نشریات کا آغاز ہوا۔ جبکہ ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو نے سابقہ دیسی ریاستوں سے ٹراونکور، میسور، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے ریڈیو اسٹیشن حاصل کرلیئے۔

صرف تین سال کے عرصے میں یعنی ۱۹۵۰ء تک آل انڈیا ریڈیو نے ۲۵ اسٹیشن ہوگئے۔ اور تمام علاقائی زبانوں میں اس کی نشریات ہونے لگیں اور یہ آبادی کے ۲۱ فیصدی حصہ کو مستفید کرنے لگا۔

۱۹۵۲ء میں شری کیسکر محکمہ اطلاعات و نشریات کے وزیر مقرر ہوئے۔ ان کے دور وزارت میں ریڈیو نے ترقی کے کئی زینے طے کیئے۔ وہ اطلاعات و نشریات کے واحد وزیر تھے جنہوں نے دس سال تک اس وزارت کی خدمت کی اور اس وزارت کی تاریخ میں ان کی میعاد سب سے زیادہ رہی۔ دیسی نشریات کی تیز رفتار وسعت ان ہی کے دور میں ہوئی۔ ملک کے پہلے پنج سالہ منصوبے (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۶ء) کے دوران نشریات کی وسعت کے لیئے چار کروڑ روپیے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا پہلے پنج سالہ منصوبے کے ختم تک ملک میں چھ نئے ریڈیو اسٹیشن قائم کیئے گیئے۔ اور آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشنوں کی تعداد ۲۶ تک پہونچ گئی۔ جن سے آبادی کا ۴۶ فیصدی اور ۳۱ فیصدی علاقہ مستفید ہوتا رہا۔ اس وقت ریڈیو سیٹس کی تعداد بھی بڑھ کر دس لاکھ سے زائد ہوگئی

دوسرے پنج سالہ سالہ منصوبے (۱۹۵۶ء - ۱۹۶۱ء) کے دوران نشریات کی ترقی کے لیئے ۸ کروڑ روپیے مختص کیئے گیئے۔ میڈیم ویو سروس جو پہلے پنج سالہ منصوبے پر آبادی کے صرف ۲۱ فیصدی حصہ کی تکمیل کرسکتی تھی ۱۹۵۷ء تک آبادی کے ۵۶ فیصدی حصہ کو مستفید کرنے لگے۔ اور ۳۷ فیصدی علاقہ اس سے مستفید ہوتے لگا۔

شری کیسکر کے دور وزارت میں کلاسیکی موسیقی کو فروغ دیا گیا۔ اور ریڈیو پر موسیقی کے قومی پروگرام پیش کیئے گیئے۔ علاوہ ازیں آل انڈیا ریڈیو قومی آرکسٹرا بھی قائم کیا گیا ۱۹۵۴ء میں پہلا ریڈیو سنگیت سمیلن منعقد کیا گیا۔ اور ۱۹۵۶ء میں ڈرامے اور فیچر پر مبنی قومی پروگرام پیش کیئے جانے لگے۔ ریڈیو نے اس وقت ایک نئی کروٹ لی۔ جبکہ ۱۹۵۷ء میں ویود بھارتی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ٹی۔ وی شروع ہوا۔ اور اسی سنہ دلی میں دولت مشترکہ نشریات کا نفرنس منعقد ہوئی۔ اے۔ آئی۔ آر نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو پنڈت نہرو کے اقوام متحدہ سے خطاب کو راست پیش کیا تھا۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۶ء) کے دوران میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کی

مات کو بیشمار معاون مراکز کے ذریعہ وسعت دی گئی۔ جو صرف ریلوے اسٹیشن تھے۔ اس منصوبے کے ختم پر آل انڈیا کا جال ۴۵ مراکز پر مشتمل ہوگیا۔ اور اس کا میڈیم ویو آبادی کے ۷۰ فیصد طبقہ کو مستفید کر رہا تھا۔ اور ۲۵ فیصد علاقے اس کے دائرہ کار میں تھا۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں ریڈیو پر تجارتی اشتہارات کا آغاز ہوا۔

اسی دوران ۱۹۶۴ کو ڈی میلو کے فیچر "لارڈ اینڈ دی لائین آف گیتز" کو اٹلی کا انعام حاصل ہوا۔ برصغیر ہند و پاک کے لئے روزآنہ نو گھنٹوں کی ایک خاص اردو سروس شروع کی گئی۔ اور ۱۹۶۹ء میں یووانی کا آغاز ہوا۔ سمست رونہریں اور راجندر پرشاد یادگار لکچرس بھی شروع کئے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو پر ئی سنہ ۱۹۷۰ء سے تجارتی ریڈیو پر اعانت پروگرام شروع ہوئے۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے ۱۹۶۹ء۔ ۱۹۷۴ء ریڈیو کی میڈیم ویو سروس کی توسیع کے لئے ۴۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے۔ اس میں ہر ریاست کی ۸۰ فیصد آبادی تک ریڈیو کی رسائی اور ٹیلی ویژن کی توسیع بھی شامل ہے۔ اس مدت منصوبے میں علی گڑھ اور لاخ میں یہ اسٹیشن قائم کئے گئے۔ جن کی صلاحیت ۲۵۰ کلو واٹ شارٹ ویو ٹرانسمیٹر ہے۔

اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کا یہ کارواں ترقی کی منزل کی سمت رواں دواں ہوا۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں بہترین ڈراموں، فیچر، موسیقی کے پروگرام پر آکاش وانی سالانہ ایوارڈ شروع کئے گئے سنہ ۱۹۷۵ء میں ٹیلی ویژن کے لئے جائے واقعہ پروگرام کی شروعات کی گئی۔
سنہ ۱۹۷۶ء میں ٹیلی ویژن کو جو اب تک آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا۔ علیحدہ کر دیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے سنہ ۱۹۷۷ء میں ملک میں منظم نشریات کے آغاز کی گولڈن جوبلی منائی۔ اسی سال جنتا دور حکومت نے ریڈیو پر پہلی مرتبہ سیاستدانوں کو اظہار خیال کا موقع فراہم کیا۔ اور یہ روایت اب بھی جاری و ساری ہے۔ ریڈیو کے عام رواج کے پیش نظر سنہ ۱۹۸۱ء میں ایک اور دو بیانہ کے ریڈیو پر لائسنس فیس ختم کردی گئی۔ سنہ ۱۹۸۲ء آل انڈیا ریڈیو کی ابتدائی سروس میں اشتہارات شروع کئے گئے۔ اور سکم میں گنگٹوک اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اسی سال ماہ جون میں عادل آباد میں پہلا علاقائی اسٹیشن کے قیام کے لئے سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دیسی ضروریات کے علاوہ بیرون ملکوں ملکوں کے سامعین کے لئے کئی ایک پروگرام شروع کئے گئے۔ خلیجی ممالک

غیر مقیم ہندوستانیوں کی کثیر تعداد کے استفادے کے لیے ۱۹۸۴ء میں ۴۵ منٹ کی
یں خارجی سرویس شروع کی گئی۔ ریڈیو اور ٹی۔وی کی دن بدن مقبولیت کے
نظر ۱۹۸۵ء میں ان پرسے لائسنس فیس برخاست کردی گئی۔

ریڈیو نے عوام میں اتنا مقام بنالیا کہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء کے دوران ریڈیو سٹیس کی
ر سے کہیں زیادہ رہی ۱۹۸۴ء تک۔ میڈیم ویو سروس آبادی کے ۹۰ فیصدی
تک پہونچ سکی اور اس نے ۷۸ فیصدی رقبہ کا احاطہ کیا۔ ملک میں ڈھائی کروڑ
راہ ریڈیو سٹیس ہیں جس میں سے ۵۰ لاکھ دیہی علاقوں میں ہیں۔ اب جبکہ ساتویں
بے (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء) پر عمل درآمد ہورہا ہے۔ اس وقت ملک میں ۹۳ ریڈیو
شن قائم ہیں۔ میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کی تعداد ۱۳۳ ہے اور ۳۵ سارٹ ویو ٹرانسمیٹر
ہیں۔

ساتویں منصوبے کے ختم پر ملک میں نشریات کے ۲۰۵ اسٹیشن ہوجائینگے۔ علاوہ
میڈیم ویو کے ۱۵۰ ٹرانسمیٹر اور سارٹ ویو کے ۵۴ ٹرانسمیٹر بھی نصب ہوجائینگے
طرح ۱۹۹۰ء تک ملک کی آبادی کا ۹۷.۵ فیصد ریڈیو سے استفادہ کرسکے گا۔
ریڈیو ملک کے ۹۱ فیصد رقبہ کا احاطہ کرے گا۔

ریڈیو صرف تفریح طبع، فنون لطیفہ اور ادب و تہذیب کا ہی علمبردار نہیں بلکہ سماجی
اشی تبدیلیوں کا بھی ایک اہم نقیب ہے۔ ملک کی ترقی، غریبی و ناخواندگی کے خاتمے،
یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بہبود اطفال و خواتین، نوجوانوں کی رہنمائی، سماجی
یوں کو قلع قمع کرنے، ماحولیات کو آلودگی سے بچانے اور تعلیم کو عام کرنے میں
یو نے نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ اس کی پہنچ بہت بڑی ہے۔ وہ ان دور افتادہ
توں اور مواصفات میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں ہنوز برقی نہیں پہونچ سکی۔ اس نے
الوں میں شعور پیدا کیا ہے۔ اور وہ زرعی ترقی کا ہم رکاب ہے۔ ریاست تامل ناڈو
سان اچھی قسم کی فصل کو ریڈیو چاول کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔
زادی کے اس ۴۰ سالہ دور میں آل انڈیا ریڈیو نے ترقی کے زینے پر لمبی جست لگائی ہے
ایک نئے طمطراق کے ساتھ ۲۱ ویں صدی کے تقاضوں نبھانے کا منتظر ہے۔
ڈیا ریڈیو کی بیرونی نشریات، عالمی نشریات میں سب سے ممتاز ہیں [illegible]
میں ایک دن میں ۵۷ گھنٹے اس کے لئے وقف کرتا ہے۔ جو دنیا کی دوسری نشریات

تلے بڑا ہے۔
اس کا نیوز سروس ڈویژن "این۔ ایس۔ ڈی" کسی جمہوری ملک میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا شعبہ ہے۔ این۔ ایس۔ ڈی۔ اس وقت ۳۶ گھنٹوں کے دوران ۲۶۹ خبریں نشر کرر[illegible]۔ جن میں دیہی، علاقائی و بیرونی خبریں شامل ہیں۔
دیسی سروس میں دلّی اسٹیشن ایک دن میں ½۱۱ گھنٹے ۱۹ زبانوں میں ۸۰ خبروں کی نشریات کے لئے وقف کئے ہیں۔ یہ ملک میں حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ہے اس نے مصنفین موسیقار، سائنسداں، دانشور، سماجی کارکن، سیاست داں اور عام آدمی کو اپنی جانب راغب کرلیا۔ جو کوئی اس ذریعہ ابلاغ کے ذریعہ اپنی شخصیت کو نکھارنے کے خواہشمند ہیں وہ اس کی جانب کھنچے جانے لگے۔ ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، کرشن چندر، روی شنکر، مجاز، اشک، فرید چودھری، ن۔م راشد، شوکت تھانوی، رائوف صاحب جگیا اور ایسی ہی کئی شخصیتیں ہیں۔ جنہوں نے ریڈیو کے ذریعہ اپنی شخصیت کو نکھارا ہے

تلگو نشریات

:۔ ریاست آندھراپردیش اور بالخصوص تلگو لسانی افراد کے لئے وجئے واڑہ ریڈیو اسٹیشن کے قیام سے قبل مدراس اسٹیشن تلگو میں نشریات جاری کرتا رہا ہے۔ اور یہ تسلسل آج بھی برقرار ہے۔
تلگو میں سب سے پہلے علاقائی خبریں ۱۹۵۶ء میں مدراس سے نشر ہوئیں۔ اور بعد ازاں ۱۹۵۶ء میں یہ حیدرآباد سے نشر کی جانے لگیں۔ کڑپہ اور دیزاگ کے معاون اسٹیشن ۱۹۶۳ء میں عالم وجود میں آئے۔ اور وشاکھاپٹنم نے ۱۹۶۸ء سے حیدرآباد سے یوواتی پروگرام نشر کرنا شروع کیا۔ اس پروگرام کے انچارج جی۔ کے۔ مرالر تھے۔
آندھراپردیش میں پانچ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ وجئے واڑہ ان میں قدیم ہیں۔ تلگو تہذیب و تمدن اور تلگو لسانی عوام کے لئے وجئے واڑہ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کا احاطہ ۲۰ کلوواٹ ہے۔ یہ اضلاع کرشنا، مغربی و مشرقی گوداوری گنٹور اور نیلور کا احاطہ کرتا ہے۔ اور ½۱ کروڑ افراد اس سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔
کڑپہ ریڈیو اسٹیشن کی صلاحیت ایک سو کلوواٹ ہے۔ یہ رائلسیما کے علاقے کڑپہ کرنول، اننت پور کے علاوہ چتور اور نیلور کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ علاقہ

چکی گیتوں کے لئے مشہور ہے۔

عادل آباد کا اسٹیشن علاقائی حیثیت کا حامل ہے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی اصل سروس کا احاطہ ۱۸۴ لاکھ افراد تک ہے جو تلنگانہ کے تمام ضلعوں پر محیط ہے۔ اسٹیشن ایک دن میں ۲۴ گھنٹے نشریات جاری رکھتا ہے۔ فیچر کی اختراع میں حیدرآباد اسٹیشن کو ۱۹۷۷ء میں آکاشوانی ایوارڈ حاصل ہوا علاوہ ازیں ۱۹۸۰ء میں بھی اسے فیچر پر ایوارڈ حاصل ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں دستاویزی فیچر پر، ۸۰ء اور ۸۱ء میں موسیقی پر اسے ایوارڈ جیتا۔

عصری دور میں ریڈیو کے تصور سے کوئی انکار نہیں کرسکتا جس طرح آل انڈیا ریڈیو نے ایک مختصر سی مدت میں جو مقبولیت اور وسعت حاصل کی ہے۔ وہ صرف تنظیمی صلاحیتوں کے باعث نہیں بلکہ اس کے لئے عوام کی خوش ادائی سب سے بڑی کلید ہے۔ وہ ملک کی وحدت و سالمیت کی بقاء کی تشہیر کے علاوہ عالمی بھائی چارگی، انسانیت اور بین الاقوامی شہریت، بہتر افکار و خیالات کے ذریعہ سارے عالم کی خدمت میں جٹا ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

اللہ کی اطاعت :- حضرت مولانا مجدد رہبر سعید میاں [illegible] شاہ رؤف احمد صاحب (۱۲۵۳ - ۱۳۰۱ھ) کی فارسی کتاب "ارکان اسلام" سے ماخوذ

"ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ چار ہزار [illegible] کے بعد [illegible] میں نے کتابیں پڑھیں اور ان میں سے میں نے چار باتیں اصل میں۔ ایک یہ کہ اے انسان، اللہ نے تجھ کو جس چیز سے منع کر دیا ہے اس کو نہ کر [illegible] ... دوسرے یہ کہ اے انسان، اگر تو اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو کر [illegible] کا فرق نہ کھا۔ تیسرے یہ کہ اے انسان، اپنی قسمت پر راضی ہو جا، ورنہ اتنے [illegible] حاصل کرتا کہ وہ تجھ کو زیادہ دے۔ چوتھے یہ کہ اے انسان، اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا تجھ کو نہ دیکھے ورنہ گناہ نہ کر۔"

انسان اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو وہ خدا کی اطاعت کر لے [illegible] ہے۔ اس کے سوا کوئی اور راستہ اس کے لیے [illegible]۔

[illegible] سے ماخوذ

انجمن ترقی اردو ہند

یادداشت ۔ مورخہ ۸/جون ۸۸ء

نئی دہلی

بخدمت مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل وزارتِ ترقی انسانی وسائل حکومتِ ہند، شاستری بھون

موضوع: اردو کے تعلق سے بعض اہم اور عرصے سے معلق مطالبات، جن پر فوری توجہ کی ضرورت ہے،
انجمن ترقی اردو (ہند) کی یادداشت۔

جنابِ عالی،

متذکرہ بالا موضوع کے حوالے سے انجمن ترقی اردو (ہند) حسب ذیل یادداشت پیش کرنا چاہتی ہے
اردو کے تعلق سے حکومت ہند کی پالیسیوں اور پروگراموں اور ان کو جس طرح سے نافذ کیا جا رہا ہے
بے اطمینانی تشویشناک شرح سے بڑھ رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اردو کے تحفظ
وترقی کے تعلق سے حکومت کی دلچسپی حقیقی سے زیادہ زبانی ہے۔ اب تک جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کی حیثیت تو
دکھاوے کی ہے۔ ان کا حقیقی مسائل سے نمٹنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ واحد استثنیٰ یہ ہے کہ بہار میں اردو کو دوسری
زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔

۱۹۷۲ء میں اس وقت توقعات بڑھ گئی تھیں۔ جب حکومت نے شری آئی۔ کے۔ گجرال کی سرکردگی میں ایک اعلیٰ
طاقتی کمیشن تشکیل دی تھی جو اس کے چیرمین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ حیرت انگیز طور پر یہ انتہائی اہم رپورٹ
سرد خانے کی نذر رہی۔ عوامی مطالبہ اور احتجاج کے پیش نظر اس رپورٹ کو شائع تو کیا گیا مگر اس کی سفارشات اور
فیصلے میں غیر ضروری اور ناقابل … سے تاخیر کر دی گئی۔ پروفیسر آل احمد سرور کی سرکردگی میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی تھی
گجرال کمیشن کی رپورٹ کی تفصیلی عمل آوری کے تعلق سے توضیح کرنی تھی۔ دوسری رپورٹ کا حشر بھی پہلی رپورٹ جیسا ہوا۔
اسے بھی آج تک شائع نہیں کیا گیا ہے۔ ایسی سراسر ناقابل گریز تاخیر کی وجہ سے بجا طور پر اردو داں عوام کو اس
کی نیک نیتی کے تعلق سے شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے بہ آسانی گریز کیا جا سکتا تھا۔

یہ اردو بولنے والے عوام کی بدبختی ہے کہ جو کچھ مرکزی حکومت نے تسلیم کیا۔ اسے اپنے سے نافذ کرنے والی ایجنسیوں
نے انکار کر دیا۔ ریاست اتر پردیش نے جس تنگ نظر اور جارحانہ انداز میں سہ لسانی فارمولے کی خلاف ورزی کی ہے
وہ اس کی کلاسیکل مثال ہے۔ اس نے اردو کو نکال باہر کرنے کے واضح مقصد کے ساتھ جدید ہندوستانی زبان کو

سنسکرت سے بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ اردو کا اس کے ہی گھر سے صفایا ہو رہا ہے:
پیڑھیوں کو جان بوجھ کر اپنی مادری زبان سیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کے مواقع سے محروم رکھا گیا۔ اس سے
بارہ بے اطمینانی اور کرب و دکھ ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بددلی غیر صحت مندانہ ایسا شکل ہے
تمام متعلقہ لوگوں کے لئے قابل گریز سر درد کا سبب ہوئی۔

اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش، جس نے اپنی عوامی رابطہ مہم ابھی مکمل کی ہے ۱۹؍ جون ۱۹۸۸ء کو لکھنؤ میں ایک ریاستی کانفرنس کر رہی ہے جس میں وہ اپنے مطالبات کے لئے آواز اٹھائے گی اور انھیں حکام کے سامنے پیش کرے گی۔

وقت آچکا ہے کہ اردو بولنے والے عوام کے منصفانہ اور جائز مطالبات کو تسلیم کر کے بے اطمینانی کے پھیلاؤ کے خلاف قبل از وقت منصفانہ کارروائی کی جائے۔ اس سے پہلے کہ ناجبر ہو جائے، اردو کو اس کا حق دیا جائے۔

یہ بتا دیا جائے کہ اردو نے یونین کی زبان کی حیثیت سے اپنی حزوں اس میں ہندی کے بالاتر درجے کو تسلیم کر لیا ہے ملک کے اعلیٰ ترین اور سب سے نمائندہ اردو تنظیم انجمن ترقی اردو ہند نے ہندی مصنفین اور ہندی رائے عامہ کو ہموار کرتے اور انھیں قائل کرانے کہ اگر اردو کا تحفظ کیا گیا اور اسے ترقی دی گئی تو خود بخود ہندی کو بھی فائدہ ہوگا" کہ ایسی کا اعلان کیا ہے۔ در حقیقت دونوں زبانوں کے مخلصین قریب تر رہے ہیں یہ بہت ہی حوصلہ افزا بات ہے کہ ہندی مصنفین اور ان کی تنظیمیں اردو کے کاز کی حمایت کر رہی ہیں۔ جنوادی لیکھک سنگھ نے اردو کے مطالبات کی حمایت میں مدھیہ پردیش، اتر پردیش وغیرہ میں جلسے کئے ہیں۔

لہٰذا انجمن حکومت کے فوری غور و خوض کے لئے حسب ذیل تجاویز پیش کرتی ہے۔

۱۔ سہ لسانی فارمولا اور اس کی عمل آوری:

مرکزی حکومت اور وزرائے تعلیم کی کانفرنس نے تین مقاصد کے تحت سہ لسانی فارمولا تیار کیا تھا (۱) ہمارے کثیر لسانی ملک کے ہر لسانی فرقے کی زبان کا تحفظ اور ترقی (۲) یونین کی زبان، ہندی کا فروغ تاکہ وہ ہماری ملی جلی تہذیب کے تمام عناصر کے ذریعے اظہار کی خدمت انجام دے سکے [دستور ہند کی دفعہ ۳۵۱] اور (۳) عوام کو انگریزی یا کوئی دوسری غیر ملکی زبان سیکھنے پر آمادہ کرنا تاکہ وہ باہری دنیا سے رابطہ رکھ سکیں۔ جن کی مادری زبان ہندی ہے ان سے امید تھی کہ وہ کوئی دوسری جدید ہندوستانی زبان سیکھیں گے۔

یہ ہیں وہ قابل ستائش مقاصد جو ہمارے سامنے ہیں مگر تجربہ یہ ہے کہ اس فارمولے کا سارے ملک میں یکساں نفاذ نہیں ہو رہا ہے۔ بعض مقامات پر صرف دو لسانی فارمولا ہے بعض دیگر ریاستوں (مثلاً اتر پردیش) نے جدید ہندوستانی زبان کی جگہ ایک کلاسیکی زبان کو شامل کر لیا ہے۔ اس کا مقصد واضح طور پر اردو کو نکال

باہر کرنا اور جو کہ بہ مادری زبان ہے، انھیں اسے سیکھنے کے حق سے محروم کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اتر پردیش میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جو لسانی اقلیتوں کے تعلق سے دستور کی ضمانتوں کی خلاف ورزی کرتی ہے اور ہمارے قومی اتحاد کے سیکولر تانے بانے کو مجروح کرتی ہے۔

اردو لسانی اقلیت کو اس ضمن میں سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو کو اس فارمولے میں (مثلاً اتر پردیش) میں ایک جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے شامل کیا جائے اور اس ضمن میں واضح یقین دہانی کرائی جائے۔

مادری زبان کو پہلی زبان ہونا چاہیئے دستور ہند کی دفعہ ۳۵۰ (الف) میں کہا گیا ہے کہ ہر ریاست اور ریاست کے اندر ہر مقامی اتھارٹی کی کوشش ہوگی کہ بچوں کو ابتدائی (پرائمری) تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ لسانی اقلیتی کمشنر کہہ چکے ہیں کہ "مادری زبان" آٹھویں شیڈول میں درج زبانوں تک محدود نہیں ہوتی۔ اس سے مادری زبان کے ذریعے ابتدائی تعلیم کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے ویسے اردو اس شیڈول میں شامل ہے۔

مندرجہ بالا مقاصد کے لیے سہ لسانی فارمولا حسب ذیل ہوگا۔

ہندی ریاستوں میں اردو طالب علموں کے لیے

پہلی زبان ـ اردو
دوسری زبان ـ ہندی (تیسرے درجہ سے)
تیسری زبان ـ انگریزی (چھٹے درجہ سے)

ب ـ ہندی ریاستوں میں ہندی طالب علموں کے لیے

پہلی زبان ـ ہندی
دوسری زبان ـ اردو سمیت کوئی بھی جدید
ہندوستانی زبان ـ (تیسرے درجہ سے)
تیسری زبان ـ انگریزی (چھٹے درجہ سے)

کلاسیکل زبان تیسری کے بعد کے مرحلے میں ایک مضمون ہو سکتی ہے یا پھر چھٹے درجہ سے ہندی اور سنسکرت کا ایک ملا جلا اختیاری مضمون داخل کیا جا سکتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ سنسکرت میں علیحدہ پاس ہونے کے لیے

ملہ نمبروں میں نہیں جوڑے جائیں گے۔

غیر ہندی ریاستوں میں اکثریتی لسانی فرقہ کے لیے فارمولا یوں ہوگا!

. مادری زبان (ریاست کی زبان)

۱. ہندی (تیسرے درجہ سے)

۲. انگریزی (چھٹے درجہ سے)

غیر ہندی ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کے لیے

۱. مادری زبان (ہمارے معاملہ میں اردو)

۲. ریاست کی زبان (تیسرے درجہ سے)

۳. انگریزی (چھٹے درجہ سے)

یہاں ہمیں ہندی کے فروغ کے لیے راستہ تلاش کرنے ہوں گے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو دھیان میں رکھتے ہوئے والدین حسب ذیل میں سے کسی متبادل کا انتخاب کریں گے،

(الف) اردو ہندی کا ملا جلا نصاب مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہندی میں سے نمبر جملہ نمبر میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔ یا

(ب) چھٹے درجہ سے ہندی یا انگریزی میں سے کسی ایک کا انتخاب۔

ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ اردو طالب علموں کو (الف۔ مادری زبان (ب) ریاست کی زبان (ج) یونین کی زبان اور (د) انگریزی سے محروم نہ کیا جائے۔ ہمارا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم والے طالب علموں پر اضافی بوجھ نہ لادا جائے اور لسانی اکثریت کے مقابلے میں ان کا موقف کمزور نہ ہو۔ سہ لسانی فارمولا، اس کی یکساں تشکیل اور عمل آوری سے تعلق سے ہم اتنا ہی کہنا ہے۔

۲- گجرال کمیٹی اور سرور کمیٹی کی سفارشات پر۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ مارچ ۱۹۸۸ء کو دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی تھی اس نے متفقہ طور پر گجرال کمیٹی کی سفارشات کی عمل آوری کا مطالبہ کیا ہے گجرال کمیٹی کی ان سفارشات نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے وسیع علاقہ کا احاطہ کیا ہے۔ ان سفارشات کا تعلق مرکزی حکومت، اس کے محکمے، ریلوے، محکمہ ڈاک و تار، لوک سبھا، یونین پبلک سروس کمیشن اور ملکی فہرست رائے دہندگان) تک ہے۔ گجرال کمیٹی نے اردو کے اتنے بڑے سرکاری استعمال کی ...

تحصیل، یا میونسپلٹی میں کم سے کم دس فیصد اردو آبادی کی سفارش کی ہے کمیٹی نے سہ لسانی فارمولے سے بھی بحث کی ہے ۔

علاوہ ازیں کمیٹی نے ریاستوں کے سرکاری زبان قوانین میں ترمیم کی تائید کی ہے تاکہ اقلیتی زبان کو ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں تمام یا بعض سرکاری اغراض کے لئے سرکاری طور پر تسلیم کرنے کی گنجائش پیدا ہو ۔

ریاستوں کی تنظیم نو کمیشن نے بھی تائید کی ہے (اور اسے اس یادداشت میں شامل کیا گیا ہے جو مرکزی وزارتِ داخلہ نے ۱۹۵۶ء میں پارلیمنٹ میں پیش کی تھی) کہ مرکزی حکومت ریاستوں سے صلاح مشورہ کرکے ایسی قانون سازی کے لیے رہنما اصول تیار کرے ۔

دستور کی دفعہ ۳۴۷ نے صدر جمہوریہ کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ متعلقہ ریاستوں کو ایسی ہدایات جاری کریں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکزی حکومت اس سلسلے میں صدر جمہوریہ کو مشورہ دے ۔ وقت آپہنچا ہے کہ مرکزی حکومت اس ضمن میں اقدامات کرے ۔

اس سلسلے میں ہم آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ گجرال کمیشن کی سفارشات کی عمل آوری کی تفصیل تیار کرنے کے لیے پروفیسر آل احمد سرور کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس رپورٹ کو بھی شائع کیا جائے اور ضروری کاروائی کے لیے اس پر غور کیا جائے ۔

٭ نوودیہ اسکولوں کے بارے میں ٭

اردو بلکہ تمام غیر ہندی طالب علم جو اپنی مادری زبان کے پرائمری اسکولوں سے آتے ہیں نوودیہ اسکولوں میں داخلہ کے معاملے میں غیر سود مند موقف میں ہوتے ہیں ۔ کیوں کہ چھٹے درجہ میں داخلے کے لیے مقابلے کے امتحانات ہندی میں ہوتے ہیں ۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ داخلے کے امتحان اس زبان میں ہوں جو اس پرائمری اسکول کا ذریعۂ تعلیم تھا ۔ جہاں سے یہ طالب علم آئے ہیں ۔ یہ سوال کہ نوودیہ اسکول میں ذریعۂ تعلیم ہندی ہوگا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا کیوں کہ طالب علم تیسرے درجے سے ہندی پڑھنا شروع کریں گے اور تین برسوں میں اتنی ہندی سیکھ لیں گے کہ ہندی ذریعۂ تعلیم کو اپنا لیں ۔

یہ بھی ضروری ہے کہ نوودیہ اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو بھی ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے ۔

باقی صفحہ (۴۹) پر

ایک معقول تجویز

ھریانہ کے وزیر اعلیٰ دیوی لال نے ۱۷ ستمبر کو مدراس کی ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ میں "ہندی جنونی" نہیں ہوں۔ ہاں آپ مجھے "ہندستانی جنونی" کہہ سکتے ہیں۔ پوچھا گیا۔ "ہندستانی سے آپ کی کیا مراد ہے۔" انہوں نے کہا۔ "وہ زبان جو ہندی اور اردو کو ملاکر بنتی ہے اور تقریباً پورے ملک میں سمجھی جاتی ہے میں چونکہ یہ دونوں زبانیں لکھتا اور بولتا ہوں اس لئے آپ مجھے "ہندستانی جنونی" کہہ سکتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں ایسی زبان کو رابطہ کی زبان بننا چاہیئے۔"

عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ کوئی سیاسی لیڈر یا بڑا سرکاری آدمی کسی زبان کے با ے میں کچھ مثبت باتیں یا تعریفی کلمات اسی مجلس میں کہتا ہے جو اس زبان سے متعلق منعقد ہوئی ہو یا کسی مذہبی پیشوا کی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین عوام کو اسی موقع پر کرتا ہے جب اس پیشوا کا یوم پیدائش منایا جارہا ہو۔ اسی طرح دوسری باتوں کے لئے بھی موقع محل کو ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نے ہندی کے ساتھ اردو کا حوالہ ایک ایسے موقع پر دیا جو ملک گیر سیاست سے متعلق تھا۔ ہوا تھا یہ کہ نو اپوزیشن پارٹیوں پر مشتمل جو متحدہ محاذ قائم کیا گیا ہے ۱۷ ستمبر کو مدراس میں اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس دن مدراس کے لوگوں میں بہت جوش وخروش تھا۔ اس موقع پر ایک بہت بڑا جلسہ عام کیا گیا جس میں لاکھوں لوگ شریک تھے بعد میں پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں محاذ کے چیرمین این ٹی راما راؤ کنوینر وشوناتھ پرتاپ سنگھ ڈی ایم کے لیڈر کرونا ندھی۔ ہریانہ کے وزیر اعلیٰ دیوی لال، کرناٹک کے بومائی، آسام کے پرفل موہنتا، کانگریس (ایس) کے مسٹر چندر سنہا، اڑلیسہ کے سینیر لیڈر بیجو پٹنائک اور دوسرے لیڈر موجود تھے۔ اس موقع پر دیوی لال نامہ نگاروں کے سوالات کا نشانہ اس لئے بن گئے کہ انہیں تامل ناڈو کے کچھ سیاسی لیڈروں نے "ہندی جنونی" مشہور کردیا تھا۔ انا ڈی ایم کے کے کچھ کارکنوں نے انہیں سیاہ جھنڈے بھی دکھائے تھے۔ شمالی ہند کے

رون مں دیوی دلال کے علاوہ کچھ اور لیڈر بھی ہیں جو ہندی کے پرجوش حامی ہیں لیکن ہریانہ کے
راعلیٰ کے ساتھ یہ صورتِ حال اس لئے پیش آئی کہ حال ہی میں کسی مجلس میں انہوں نے کانگریس
ں کے لیڈر رانی کرشنن سے درخواست کی تھی کہ وہ ہندی میں اظہار خیال کریں کیونکہ انگریزی سمجھنے
انہیں دقت پیش آرہی ہے ۔ بس اسی کو بنیاد بناکر تاملناڈو میں کچھ لوگوں نے ان کے خلاف یہ
چھیڑ دی تھی ۔ لہٰذا پریس کانفرنس میں اس سوال کا اٹھایا جانا قدرتی امر تھا ۔ چودھری دیوی لال
ے علاقائی لیڈر سہی، لیکن باخبر لیڈر ہونے کے ناطے وہ تاملناڈو کے عوام کے مزاج سے ضرور
ف ہوں گے کہ وہ زبان کے سوال پر کسقدر حساس واقع ہوئے ہیں اور ہندی سے ان کا بُعد کس انتہا
ہنچا ہوا ہے ۔ یہ مدراسی ہی تھے، جنھوں نے ۱۹۶۵ء میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیئے جانے
خلاف آسمان سر پر اٹھالیا تھا ۔ اور کچھ لوگوں نے احتجاجاً خودسوزی کرلی تھی ۔ البتہ اردو سے
یں کوئی بیر نہیں ہے ۔ شائد اس لئے کہ وہ اسے مظلوم زبان سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ جب ۱۹۶۵ء
ریاست میں ہندی مخالف تحریک چل رہی تھی تو ان سینما گھروں پر بھی حملے کئے جا رہے تھے
ں ہندی فلمیں دکھائی جارہی تھیں ۔ اس غیظ و غضب سے بچنے کے لئے کچھ سینما مالکان نے باہر
لٹکا دیئے تھے کہ " اس فلم کی زبان ہندی نہیں اردو ہے" اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی
ئے تھے ۔ دیوی لال کے سامنے یہ حقائق یقیناً ہوں گے ۔

ویسے ہوسکتا ہے اردو کے بارے میں ہریانہ کے وزیر اعلیٰ نے بہت سوچ سمجھکر متذکرہ بات
ہی ہو اور ان کا مقصد وقتی طور پر صورتِ حال (سچویشن) سے نمٹنا رہا ہو (شبہ کی گنجائش اسلئے
ہ ہیکہ شمالی ہند میں ہندی سامراج کی یلغار کا مقابلہ کرنے کی جرأت فی الحال کسی بھی سیاسی لیڈر
ے اندر پیدا نہیں ہوئی ۔ ہندی کے بعض جنونی اردو کا نام تک سننا نہیں چاہتے ۔ اس صورت میں جو
یاسی لیڈر اردو سے ہمدردی رکھتے بھی ہیں وہ اس کے لئے انصاف کی آواز بلند کرنا خلاف مصلحت
سمجھتے ہیں) لیکن حقیقت یہ ہیکہ چودھری نے رواروی میں ایک ایسی بات کہہ دی جو بہت سے حقیقت پسند
لیڈروں کے دل کی بات ہے ۔ اور پھر یہ کوئی نئی بات نہیں، اس ملک کے سب سے بڑے سیاسی
لیڈر گاندھی جی بھی یہی کہا کرتے تھے کہ " ملک کی زبان ہندستانی ہونی چاہیئے جو ہندی اور اردو کے
امتزاج سے بنی ہو اور دیوناگری و فارسی دونوں رسوم الخط میں لکھی جائے " لیکن کانگریسیوں نے
گاندھی جی کو "راشٹر پتا" قرار دینے کے باوجود جس طرح ان کی تمام اچھی باتوں کو پس پشت ڈال دیا

اسی طرح زبان کے بارے میں بھی ان کی ایک نہ سنی ۔ یہ کانگریسی ہی ہیں جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد اردو کا ہاتھ ہونے کی افواہ پھیلاکر اسے اتر پردیش وغیرہ میں الٹی چھری سے ذبح کر ڈالا ۔

اب جبکہ ایک سرکردہ لیڈر نے ایک انتہائی اہم سیاسی پلیٹ فارم سے ہندستانی کو رابطہ کی زبان بنانے کی بات کہی ہے دیگر سیاستدانوں کو چاہیئے کہ وہ اس پورے مسئلہ پر نئے سرے سے غور کریں ۔ فوری طور سے تو قومی محاذ کو ہی اسے اپنی پالیسی میں شامل کر لینا چاہیئے ۔ اس سے جہاں شمالی ہند میں ایک دیرینہ کشمکش ختم ہوکر خوشگوار ماحول پیدا ہونے کے آثار نمایاں ہوں گے وہیں جنوبی ہند کی ریاستوں کے اندر بھی اعتماد پیدا ہوگا اور وہ ان اندیشوں سے نکل آئیں گے جو ہندی کی یلغار سے متعلق انہیں لاحق رہتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ ہندستان میں اب بھی بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس نے جنوب کو شمال سے بڑی حد تک دور رکھا ہے ۔ اگر قومی محاذ کے لیڈر جرأت سے کام لے کر ہندستانی کو رابطہ کی زبان بنانے کی تحریک چلائیں ۔ علاقائی زبانوں کو مکمل آزادی دینے اور تامل ناڈو وغیرہ میں انگریزی کو برقرار رکھنے کی پالیسی اپنالیں تو ملک میں خیرسگالی کی ایسی فضاء قائم ہوسکتی ہے جو گزشتہ چالیس سال میں شاید کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ ہاں عین ممکن ہے شمالی ہند کے کانگریسی اسے یعنی اردو کو ہندی کے ساتھ جوڑنے والی بات کو قومی محاذ کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کریں ۔ یہ لوگ محاذ کے خلاف شمال کے ہندی جنونیوں کے جذبات بھڑکا کر ان سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرسکتے ہیں ۔ بھڑکانا ان کی عادت ہے لیکن قومی محاذ کو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے ۔ ملک کے وسیع تر مفاد کی خاطر انہیں اس ذہنیت کا ڈٹ کا مقابلہ کرنا ہی ہوگا ۔

(بشکریہ دعوت دہلی)

سلسلہ (۴۶)

یہ ہیں وہ چند امور جو آپ کی فوری توجہ اور جلد از جلد کارروائی کے طلب گار ہیں ۔ ہم ممنون ہوں گے اگر حکومت ان امور کے تعلق سے حتی الامکان جلد ہو سکے ہمیں اپنے فیصلوں کی اطلاع دے تاکہ انجمن اپنے وسیع متعلقین میں اردو کے تعلق سے حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں بروقت وضاحت کی اطلاع ہوسکے ۔

آپ کے مخلص

سید حامد (صدر) پنڈت آنند نرائن ملا ، مالک رام ، سید شہاب الدین دسنوی ، راج بہادر گوڑ ، بیگم حیات اللہ انصاری ، خلیق انجم (جنرل سکریٹری)

نند کشور وکرم

آزاد بھارت میں اردو

حصول آزادی سے پیشتر اردو، برصغیر کی مقبول ترین زبان تھی۔ سرکاری طور پر ہندوستانی زبانوں پر فوقیت حاصل ہونے کے علاوہ اسے عوام میں بھی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا شرف حاصل تھا۔ اپنی شیرینی و سلاست کی وجہ سے یہ زبان صوبہ سرحد سے بنگال تک اور کشمیر سے مدراس تک مروج تھی۔ اخبارات و رسائل اور ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے لاہور، دہلی، لکھنؤ، کانپور، پٹنہ، حیدرآباد، بھوپال، کلکتہ اور بمبئی جیسے متعدد اہم مرکز تھے مگر تقسیم ملک کی وجہ سے جہاں کئی نقصانات ہوئے وہاں اس ملک میں اردو کو بھی اہم نقصان پہنچا۔ تقسیم کے بعد اردو بولنے اور پڑھنے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی۔ لیکن ہمارے ملک میں جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم ہستیاں تھیں جنہوں نے اردو کی بقا و فروغ اور اسے اس کا جائز مقام دلانے کا یقین دلایا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ملک کے دستور میں اردو کو ملک کی چودہ قومی زبانوں میں شامل کیا گیا۔ اور اس طرح اردو کو دوسری زبانوں کی طرح پھلنے پھولنے کے لیے تمام دستوری حقوق حاصل ہوگئے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا اہم قدم سہ لسانی فارمولہ تھا جس کے تحت ہر اردو بولنے والا بچہ اسکول میں اردو تیسری زبان کے طور پر پڑھ سکتا ہے۔ اس طرح اردو کی بقا و فروغ کی داغ بیل ڈال دی گئی [illegible] اس کی تعمیر کا کام بعد میں آنے والوں نے کیا۔

[illegible] اردو کی ترقی [illegible] وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران [illegible] کا پورا [illegible] اہم قدم اٹھائے۔ انہیں [illegible] گجرال کی [illegible] اردو [illegible]

نے متعدد مواقع پر کیا گیا تھا۔

نومبر ۱۹۷۳ء میں اردو ایڈیٹروں کی کل ہند کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ" اردو ایک نہایت زندہ زبان ہے۔ جس میں ایک خاص دلکشی اور حسن ہے میں اسے کسی ایک قوم یا کسی ایک قوم یا کسی ایک ریاست کی زبان نہیں مانتی۔ اگر اردو کمزور پڑے گی تو اس سے ہمارے سارے ملک کو نقصان پہنچے گا۔ ہمیں توقع ہے کہ اردو سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ملک کو متحد کرنے کا کام انجام دے گی۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار انہوں نے نئی دہلی میں کل ہند انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی عمارت " اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے بھی کیا تھا۔

۴ مارچ ۱۹۸۰ء کو جامعہ اردو علی گڑھ میں ایک تقریب میں جو اردو [illegible] کے اعتراف میں انہیں " ڈکٹور ادب" کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لئے منعقد [illegible] نے اردو کی اہمیت و افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اردو ہندوستان کی ایک ممتاز [illegible] زبان ہے اور سرکار اس کی ترقی و فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اردو کی ہر تحریک اور سرگرمی میں ذاتی دلچسپی لیتی تھیں۔ چنانچہ جب ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلہ میں مرکزی کمیٹی بنائی گئی تو انہیں اس کا چیرمین بنایا گیا۔ اسی طرح اقبال صدی میں بھی انہوں نے بڑی دلچسپی لی تھی۔ اور اس یادگار موقع پر علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

علامہ اقبال نے جب " سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور اسی طرح کی دوسری بہت سی نظمیں لکھی تھیں تو انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی انسانی برادری کے اتحاد پر زور دیا تھا۔

دوبارہ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۸۲ء کو آل انڈیا رائٹرز اینڈ رائٹرز جرنلسٹس فورم کی طرف سے منعقدہ اردو کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر کہا تھا۔ "اردو ہماری پرانی تہذیب کی نشانی اور قومی یکجہتی کا ایک نمونہ ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کی ترقی و فروغ سے بے شمار ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی ادیبوں اور شاعروں کا تعلق رہا ہے۔

خبروں کے متعدد بلیٹن نشر کرتا ہے۔ جو سری نگر، جموں، جالندھر، جموں، دلی، لکھنؤ، پٹنہ رانچی اور حیدرآباد سے ریلے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ودودھ بھارتی پروگرام میں بھی اردو کے پروگرام وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ سری نگر، جالندھر، جموں، دلی، لکھنؤ پٹنہ، بھوپال اور حیدرآباد اردو نشریات کے خاص مرکز ہیں۔

دوردرشن کے دلی، جالندھر، سری نگر اور حیدرآباد اسٹیشنوں سے اردو کے بہت سے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ سری نگر سے روزانہ اردو کی خبریں بھی نشر ہوتی ہیں۔

فلمز ڈویژن ہر سال اردو میں متعدد دستاویزی فلمیں بناتا ہے۔ اور ہر نیوز ریل کا اردو ترجمہ ہوتا ہے۔

اردو کی تدریس:- پچھلے بیس برسوں میں اردو کے درس و تدریس میں بھی قابل قدر ترقی ہوئی ہے۔ ملک کی کئی ریاستوں میں پرائمری اور ثانوی سطح پر تعلیم کی سہولیات بہم پہنچائی گئیں اور اسکولوں میں بڑی تعداد میں اردو اساتذہ رکھے گئے ہیں۔ عام اسکولوں کے علاوہ مرکزی اسکولوں میں بھی ان طلبا کے لئے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد میں غیر معمولی اضافے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تعداد بھی کئی گناہ بڑھ گئی ہے۔ ۲۰ سے زیادہ یونیورسٹیوں میں اب اردو پڑھائی جا رہی ہے یہاں اردو اساتذہ کی تعداد ۱۹۶۶ میں ۲۰۰ تھی بڑھ کر لگ بھگ ایک ہزار ہو گئی ہے۔

سلسلہ ص ۶۲

کوشش اسی سمت کو ذہن میں رکھکر کرنی چاہیئے۔

دیہی علاقوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور استعمال میں مرکزی حکومت کے دو درجن سے ۵ ادارے مصروف کار ہیں۔ عام طور پر کارکردگی کی سطح پر ان میں سے بیشتر کو شائد یہ اندازہ بھی نہ ہو اور نہ ہی وہ اس بارے میں سوچتے ہوں گے کہ دوسرے ادارے کیا کر رہے ہیں ان اداروں کے درمیان تال میل کی بات سوچنا تو ایک دور کی بات ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اداروں کے پاس کوئی مرکزی واضح اور مخصوص نصب العین بھی نہ ہو جس کے حصول کے لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

جی۔ ڈی۔ چندن

اردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس

اردو اخباروں کے لیے ٹیلی پرنٹر سے کام کرنے والی [illegible] کے امکانات روشن ہوگئے ہیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بھارت سرکار [illegible] سروس کے قیام کے لیے [illegible] سنجیدگی سے کوشش کر رہی ہے۔

خود وزیر اعظم راجیو گاندھی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں [illegible] برس میں ملک کے پندرہ اردو اخباروں کے ایڈیٹروں سے اپنی رہائش گاہ پر [illegible] ایک خصوصی میٹنگ میں بات چیت کرتے ہوئے مجوزہ سروس کے لیے اپنی [illegible] کا اظہار کیا اور اس توقع کا اظہار بھی کیا [illegible] سروس کو کمپیوٹر کے طریقے سے وابستہ کیا جائے تاکہ [illegible] کے جدید تقاضوں سے وابستہ ہو

انھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات [illegible] ہرکشن لال بھگت کے سپرد کی جو اس میٹنگ میں موجود تھے۔

وزیر موصوف نے [illegible] اس موضوع پر اردو ایڈیٹروں سے بات چیت کی [illegible] ٹیلی پرنٹر اور خبر رسانی کے اداروں کے نمائندوں کو [illegible] کام کی پیش رفت کے لئے [illegible] اعلیٰ افسروں کے ساتھ [illegible] وابستہ کیا۔

چنانچہ اس سلسلے میں ایک جرمن کمپنی کے تیار کردہ اردو کی بورڈ کا انتخاب ہو چکا ہے۔ [illegible] کی بورڈوں کی طرح خط نسخ [illegible] ہے [illegible] کے لئے اس سے آٹھ حروف زیادہ ہیں۔

[illegible] کی بورڈ کو اردو کے مجوزہ ٹیلی پرنٹر میں استعمال کرنے کے کام کی ذمہ داری پونے کی [illegible] کمپنی نے قبول کی ہے [illegible] کے بعد مطلوبہ کی بورڈ والی [illegible] مشہور [illegible] کو مہیا کرے گی

جو اپنی موجودہ سروسوں کے ساتھ اردو کی نئی سروس بھی شروع کرے گی ۔

معلوم ہوا ہے کہ اس ایجنسی کی انگریزی سروس کے خریداروں میں سے تقریباً ستر ارکان اردو پریس سے ملحق ہیں ۔ یہ ستر گاہک فوراً یا تھوڑی ہی مدت کے بعد اردو کی نئی سروس لینے پر آمادہ ہو جائیں گے ۔ ان کے علاوہ سرکاری و نیم سرکاری اور دیگر حلقوں سے بحیثیت مزید گاہک بھی مل جانے کی امید ہے اور اس طرح اس سروس کا آغاز ایک شاندار قافلے سے ہو جائے گا ۔

اگر حالات کی موجودہ رفتار برقرار رہی تو اردو صحافت کا یہ تاریخی کارنامہ تین ماہ کے اندر اندر شروع ہو جائے گا ۔

پڑوسی ملک پاکستان میں جہاں کتابت اور طباعت کے لئے کمپیوٹر کا نظام رائج ہو چکا ہے ابھی تک ٹیلی پرنٹر پر دار اردو نیوز سروس کا آغاز نہیں ہوا لہٰذا ہندوستان میں اس کا آغاز برصغیر میں اپنی نوعیت کا اولین ہوگا ۔ خود ہندوستان میں علاقائی زبانوں میں نیوز سروس کی مالک یہ پہلی صحافت ہوگی ۔ پورے ملک میں انگریزی اور سرکاری زبان ہندی کے بعد یہ تیسری ٹیلی پرنٹر بردار صحافت ہو جائے گی ۔

اس سے صرف اردو اخباروں کے کالموں ہی میں تازگی اور جامعیت نہیں آئے گی بلکہ ملک میں اردو صحافیوں کے لیے روزگار کے مواقع بھی کھل جائیں گے ۔ نئی وائر نیوز سروس کے لیے سینکڑوں اردو مترجموں ، رپورٹروں اور ایڈیٹروں کی ضرورت پیش آئے گی اور اردو صحافت اردو زبان کی بہتری کا ذریعہ معاش بن جائے گی ۔

یہاں یہ بتانا بھی برمحل ہوگا کہ مرکزی محکمۂ تعلیم کا ترقی اردو بیورو بھی پچھلے تقریباً دو سال سے اردو ٹیلی پرنٹر نیوز سروس کو ممکن العمل بنانے کے لیے کوشش کر رہا ہے ۔ اس کے بارے میں اس نے ایک اردو کمپیوٹر اور ٹیلی پرنٹر اکسپرٹ کمیٹی قائم کی جس کے کنوینر کلکتہ کے روزنامہ " آزاد ہند " کے ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی تھے ۔ انھوں نے مجوزہ سروس کی ضرورت پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو ایک مراسلہ ارسال کیا تھا ۔ کمیٹی ہذا نے گزشتہ اپریل میں اپنے وائس چیرمین سید سبط رضی وزیر تعلیم اتر پردیش کی قیادت میں مرکزی وزیر جناب ایچ ۔ کے ۔ ایل بھگت سے ملاقات کی تھی اور انھیں مجوزہ سروس کے بارے میں اپنی قرارداد کی ایک نقل پیش کی تھی ●

ڈاکٹر وسنت گوریکر

بھارت کی ترقی پذیر سائنس اور ٹکنالوجی

آج سے کروڑوں برس قبل سے، جب سے بنی نوع انسان کا وجود اس کرہ ارض پر ہوا، سائینس اور ٹکنالوجی ہمیشہ سے ہی ترقی اور تغیر کے مراحل طے کرتی رہی ہے۔ تاریخی نظریے سے سائنس اور ٹکنالوجی کا ارتقاء ضروریات یا اتفاقات کے تحت ہوا ہے۔ ہو سکتا ہیکہ سائینس اور ٹکنالوجی کے ارتقاء کے سلسلے میں تقریباً یہی اصول اب بھی کارفرما ہے۔ تاہم بھارت کے سلسلے میں سائنس کا فروغ اتفاقات سے زیادہ ضروریات کے تحت ہوا ہے۔

تغیر کا وقت

گزشتہ برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی نے عوام کے دلوں میں اپنے جو اثرات چھوڑے ہیں اور خوش آئیند دور سے متعلق جو آرزوئیں جگائی ہیں، وہ شائد اس سے پہلے کبھی اتنی زیادہ توقعات سے بھرپور نہیں رہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہیکہ سائنس اور ٹکنالوجی، سماجی اقتصادی تبدیلی کے محرک عناصر اور ترقیاتی سرگرمیوں کے محض ایک حصے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک بنیاد کی تعمیر

آزادی کے (۴۰) برسوں کے بعد، اب ملک بھر میں سائنس اور ٹکنالوجی کا ایک کافی بڑا بنیادی ڈھانچہ قائم ہو گیا ہے۔ فی الحال متعدد شعبوں مثلاً زرعی تحقیق، ایٹمی توانائی، الیکٹرانکس، ماحولیات، سمندر، خلاء، بائیوٹکنالوجی نیز غیر رسمی توانائی کے وسائل، دفاعی تحقیق وغیرہ کی دیکھ ریکھ کے لئے قومی کونسلوں، کمیشنوں، محکموں اور وزارتوں کی شکل میں تال میل پیدا کرنے والی بہت سی اعلیٰ انجمنیں موجود ہیں۔ قومی تجربہ گاہوں کی ایک بڑی تعداد سائنس، ٹکنالوجی، انجنیئرنگ، طب اور حیاتیاتی سائنز کے وسیع شعبے میں مصروف کار ہیں۔ سائنس ٹکنالوجی توسیع کے میدان میں ایک مستحکم بنیاد قائم کی جا چکی ہے۔ ایٹمی توانائی اور ۔۔۔ ہم شعبوں میں خود کفالت حاصل کرنے سے متعلق ہمارے پروگراموں نے

ری سائنس اور ٹکنالوجی کی صلاحیتوں کے تئیں ہمارے اعتماد میں اضافہ ہے ۔

آج بھارت اپنے وسائل کی مسلسل نگرانی اور ان کے مثبت ... لئے جائزے اور اعداد
ر "علم الانسانیات" کے متعدد اداروں جیسے حیاتیات آثار قدیمہ ... بقات الارض سے متعلق
وے آف انڈیا ادارے" دی سروے آف انڈیا" دی نیشنل ... یمنسنگ ایجنسی اور اعداد
ادہ کے مرکزی ادارے کی شکل میں ایک مکمل نظام رکھتا ہے ۔

خواندگی میں سست پیشرفت کے باوجود ہمارے تعلیمی نظام میں بہت اہم توسیع عمل میں آئی
۔ ہر برس ہم سائنس اور ٹکنالوجی کی افرادی قوت کے ذخیرے میں تقریباً ۲ء ۱ لاکھ تعلیم یافتہ
امیدواروں اور ٹکنالوجی کے ماہرین کا اضافہ کر رہے ہیں ، اس وقت یہ تعداد ۳۲ لاکھ تک
پہنچ چکی ہے ۔

متعدد شعبوں میں ، سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کی ہماری بڑی اور خصوصی کوششوں کے
ینہ دار ، بنیادی تحقیق سے متعلق ہمارے وہ پروگرام ہیں جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے تعلیمی و تحقیقی
اداروں کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں ۔

اگرچہ کہ آزادی کے بعد سے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر اور صلاحیت میں اضافے پر ہی خصوصی
بر دی جاتی رہی ہے تاہم بہت سے شعبوں میں کافی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں جو کہ زراعت اور
بہت سے لیکر ایٹمی توانائی اور خلاء تک ، اشیائے ... سے لیکر زرعی اور صنعتی آہنی ساز و سامان
ے تیار شدہ خوراک اور ڈیری کی اشیاء سے لیکر زراعت اور صنعت کے لئے کیمیاوی اشیاء کی
اری ... حاصل کی گئی ہیں ۔ مخصوص شعبوں میں چند اہم کامیابیاں مندرجہ ذیل ہیں ۔
آزا ... ئے ہونے والی اناج کی پیداوار کے مقابلے میں تین گنا یعنی ۱۵۰ کروڑ ٹن اناج
سالانہ پیداوار ، چیچک کا خاتمہ ، دق کے مرض کا مقامی سطح پر ہی علاج ، اور غذائی کمی سے نپٹنے
کے سلسلے میں کی گئی پیشرفت ، مصنوعی سیاروں کا خلاء میں بھیجا جانا ، ان کے داغنے ، کنٹرول اور رہنمائی
سے متعلق نظام کی ترتیب ، مصنوعی سیاروں کے ذریعہ مواصلات ، ریموٹ سینسنگ نشریات اور
کلیاتی شعبے میں ایٹمی معدنیات کی تلاش ، اعلیٰ اور اصلی نیوکلیائی ساز و سامان کی تیاری اور
کلیائی ری ایکٹروں کے لئے ایندھن کا انتظام ، ایٹمی توانائی سے بجلی تیار کرنے سے متعلق اسٹیشنوں
تعمیر اور ان کے کنٹرول کا نظام اور زراعت و صحت کے شعبے میں استعمال کے لئے بھاری پانی اور

[illegible]یو آئیسوٹوپ کی تیاری وغیرہ۔

ہماری متعدد کامیابیوں کے باوجود جو کسی بھی طرح سے [illegible] اہم نہیں ہیں آزادی کے بعد بنیادی [illegible] تعمیر کے اس مرحلے میں بھارتی عوام کی اکثریت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے اور [illegible] فوائد سے قطعاً محروم رہے ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی سے حاصل اور امریکہ جیسے دوسرے [illegible] یافتہ ممالک نے اپنے عوام کو بہم کرائے ہیں۔ بھارتی سائنسدانوں اور ٹکنالوجی کے ماہرین پر [illegible] مذکورہ [illegible] صورتحال روز بروز عیاں ہوتی جارہی ہے۔ تاہم معاملات نہایت پیچیدہ ہیں اور ان کے حل فوری طور [illegible] دستیاب نہیں کئے جاسکتے تھا۔ [illegible] خصوصی مسائل [illegible] علحدہ سے [illegible] حل تلاش [illegible] تے ہوں گے یہ ایک ایسی سچائی ہے [illegible] رسوں کی حالت [illegible] ہماری سمجھ میں آگئی ہے [illegible] گزشتہ اہم برسوں میں ملک میں [illegible] لیا ہے وہ ایک عملی حل ہے اس وقت [illegible] بات کی ضرورت ہے کہ کوئی اس میں صحیح قدم [illegible] تاکہ کام کی شروعات ہوجائے اور بعد [illegible] اس میں رفتار بھی آجائے۔

[illegible] سے [illegible] ملک [illegible] موقت [illegible] اور تبدیلی [illegible] دور سے [illegible] ہے جو ہمارے حال کو بدل کر [illegible] ہمارے [illegible] گا جس میں مشکلات کے بادل چھٹنے [illegible] ہیں گے اور ہماری آج کی بیشتر [illegible] ختم ہو [illegible] ہو جائیں گی ہمارے ملک کا شمار [illegible] عالمی برادری کے صف اول کے ممالک میں ہونے لگے گا۔

غریبی، آبادی [illegible] خواندگی [illegible] متعلق ہماری [illegible] بڑی مشکلات کے حل کی تلاش [illegible] مختلف [illegible] نتیجہ [illegible] ہوں گے۔ اس [illegible] طریقے کے تحت ہم نے بنیادی مسائل کو حل [illegible] شروع کئے ہیں جن [illegible] نشانوں کے حصول کے اوقات اور صورت [illegible] وضاحت [illegible] اور یہ کام [illegible] صدی میں قدم [illegible] رکھنے سے پہلے ہمیں انجام دینا ہوگا۔ [illegible] بنیادی مسائل [illegible] ۱۹۹۵ء تک ۱۵ سے ۳۵ [illegible] برس کی عمر کے درمیان کے ۸ کروڑ ناخواندہ افراد کو [illegible] پیداوار [illegible] خود کفالت [illegible] ۲ لاکھ گاؤں [illegible] بہتری اور ان علاقوں میں جہاں عام طور [illegible] بیماریاں [illegible] اور خصوصی طور [illegible] کو ٹیکہ لگاکر وباؤں سے ان کی حفاظت کرنا جیسے کام [illegible] ہیں۔

مذکورہ بالا پانچ مشنوں کے علاوہ واضح مقاصد کے ساتھ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے کئی اور پراجکٹ بھی شروع کئے گئے ہیں جن پر معینہ مدت کے دوران ہی عمل درآمد ہو رہا ہے۔ مذکورہ مقاصد میں کاشت کاروں کو موسمی پیشین گوئی کے میڈیم رینج کے قومی مرکز (این سی ایم آر ڈبلیو ایف) کے ذریعہ جس کا زرعی مراکز کے ساتھ اندرونی رابطہ ہوگا موسم کی بروقت پیشین گوئی بھی کرانا، قدرتی وسائل کے انتظام سے متعلق ایک قومی نظام (این این آر ایم ایس) کا قیام اور بجلی پیدا کرنے کے لئے شمسی خلیے اور فوٹو وولٹیک نمونے تیار کرنے کی غرض سے سلیکون تیار کرنے کے لئے ایک مرکزی پلانٹ کا قیام بھی شامل ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ایک اور پراجکٹ کا مقصد نہ صرف تحقیق و ترقی کے لئے بلکہ معیاری جینیٹس تبادلہ ٹکنالوجی کے فروغ کے لئے ادارہ جاتی سہولیات بہم پہنچاکر دیسی مویشیوں کی پیداوار اور پیداواریت کی صلاحیت میں اضافہ کرنا بھی ہے۔ اس کے ذریعہ اچھے جینیز والے مویشی پیدا ہو سکیں گے۔ ایک اور پراجکٹ کا تعلق انسانی تولید کی باضابطگی کے مطالعات سے ہے۔ ملیریا (فائیلریا) اور دیگر جراثیم والے امراض پر، جو ہر سال کروڑوں افراد کو اپنا شکار بناتے ہیں اور جن کے کنٹرول پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، مربوط کنٹرول کے لئے ایک کم لاگت والے نمونے کے فروغ سے متعلق پراجکٹ بھی شامل ہے۔

مذکورہ بالا تمام پراجکٹوں میں نہ صرف روایتی ٹکنالوجیوں کے استعمال کا خیال ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر جدید ترین ٹکنالوجی بھی استعمال کی جائیگی۔ ملکی ٹکنالوجی سے متعلق صلاحیتوں اور بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کے لئے بھی اقدامات کئے گئے ہیں۔

اپنے محدود وسائل کی وجہ سے ہمیں اپنی توجہ صرف منتخبہ شعبوں میں ہی ٹکنالوجی کی صلاحیتیں تعمیر کرنے پر مبذول کرنی پڑ سکتی ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے ٹکنالوجی سے متعلق اطلاعات، قومی، شعبہ جاتی، ادارہ جاتی اور صنعتی سطح پر پیشین گوئی و جائزہ جاتی نظام قائم کرنے سے متعلق اقدامات کئے ہیں۔

حالیہ کوششوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی قومی کونسل کے ذریعہ عوا نس کی مقبولیت اور ان میں سائنسی ذوق پیدا کرنا، لوگوں میں ماحولیاتی تحفظ کے تیکیں بڑھانا، سائنس اور ٹکنالوجی اور صنعتی ترقیاتی قومی کاموں کے ذریعہ صنعت کاری کو فروغ یا شامل ہے۔ غیر مقیم باصلاحیت بھارتی باشندوں کو رضاکارانہ طور پر سائنس اور

ٹکنالوجی سے متعلق کوششوں میں ان کی مہارت کا فائدہ اٹھانے کے لئے راغب کرنے کی بھی کوشش جارہی ہے ۔ نوجوانوں خصوصاً نوجوان سائنسدانوں اور رضاکار اداروں کو بھی ان کوششوں سے بستہ کرنے سے متعلق اقدامات کئے گئے ہیں ۔

سرمایہ کاری اور اس کا پھل

ملک نے سائنس اور ٹکنالوجی میں گزشتہ چار دہائیوں میں جو سرمایہ کاری کی ہے اس میں صحت مند اضافہ نظر آیا ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے میں سائنس اور ٹکنالوجی کے لئے کی گئی ۲۰ کروڑ روپے کی تخصیص ساتویں منصوبے میں بڑھ کر ۷،۵۳۵ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔ پہلی مرتبہ کل قومی پیداوار میں سے تحقیق و ترقی کے لئے ہماری سرمایہ کاری ۸۵-۱۹۸۴ء میں ایک فیصد رہی ۔

مذکورہ سرمایہ کاری کی رقوم اس لحاظ سے زیادہ ہیں کہ ہمارا ملک ایسا ملک ہے جہاں فی کس قومی پیداوار (جی این پی) ۲۵۰ - ۲۰۰ امریکی ڈالروں کے درمیان ہے ۔ مذکورہ سرمایہ کاری سے ہونے والے فوائد غیر اہم نہیں رہے ہیں تاہم ان میں سے کچھ خاص جن سے عوام کو بالواسطہ یا بلاواسطہ فائدہ پہونچا ہے توقعات سے کافی کم رہے ہیں ۔

فوائد کے سوال پر ایک اہم نکتہ کا ذکر بھی اس وقت مناسب ہوگا جس پر بھارتی خلائی پروگرام کے روح رواں ڈاکٹر وکرم سارابھائی اکثر زور دیا کرتے تھے ۔ سماجی پیچیدگیوں اور ہماری سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق تمام کوششوں کا جائزہ ایک مناسب تناظر کے تحت لیا جانا چاہیئے ۔ انہیں انسانی کاموں کے سلسلے کا ایک حصہ سمجھا جانا چاہیئے ۔

ایک دہائی سے بھی کم عرصہ پہلے بھارت دس عالمی صنعتی طاقتوں میں سے ایک تھا ۔ تحقیق و ترقی میں اضافہ نہ ہونے اور پیداواریت میں تخفیف کی وجہ سے اس پوزیشن میں گراوٹ آئی ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ بھارت کا شمار ان بیس ممالک میں سے ایک میں ہو جنہوں نے اپنی کل قومی پیداوار کا ایک فیصد ۸۴-۱۹۸۳ میں تحقیق و ترقی پر خرچ کیا تھا تاہم ہمیں صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے ذریعہ پہلے ہی حاصل کی گئی ۲ء۵ فیصد کا شرح تک پہنچنے کے لئے ایک طویل سفر طے کرنا ہوگا ۔ تحقیق ترقی کا سیکٹرز کا ایک جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ (۸۰٪) حکومت اور بہت کم (کوئی ۱۲ فیصد) صنعتوں سے آتا ہے ۔

اگر صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی صورتحال پر ہم ایک نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ انہوں نے

شعوری اور ذہنی کاوش ہی کافی نہیں بلکہ فطری صلاحیت اور حسابی قابلیت بھی درکار ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شاعری میں صرف الفاظ کی موزونیت و نشست ہی ضروری سمجھی جاتی ہے برخلاف اسکے تاریخ گوئی میں موزونیت اور ہم آہنگی کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے حروف کے اعداد متعین ہوں کیونکہ حروف کی عددی قیمت واقعہ کے سنہ تاریخ کے برابر ہی ہوتا ہے اور یہ بات آسان نہیں۔

تاریخ گوئی کی ابتداء فارسی شاعری سے ہوئی اور فارسی ہی کے توسط سے اردو شاعری میں داخل ہوئی۔ اردو شاعری کی تاریخ بتاتی ہے کہ تقریباً سبھی اردو شاعروں نے رسمی طور پر تاریخیں کہیں لیکن سب نے اسے ذیلی صنف ہی کا درجہ دیا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاریخ گوئی کی صنف کو کسی نے بھی خصوصیت سے اپنایا نہیں۔ ہمارے یہاں قصیدہ گو شاعر بھی ہیں، رباعی گو بھی ہیں، مثنوی گو بھی ہیں اور غزل گو بھی لیکن "تاریخ گو" شاعر کوئی نہیں۔ ان میں عارف ابوالعلائی کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ ان کا سرمایۂ سخن صرف تاریخیں ہیں۔ ساری زندگی وہ تاریخیں نکالتے رہے اور اہل علم و دانش کو اپنی مہارت سے حیران بناتے رہے۔ دیگر شعراء کی طرح انہوں نے تاریخ گوئی کو تفریحی مشغلہ نہیں بنایا۔ یہ خصوصیت و انفرادیت ان ہی کے حصہ میں۔ ان کی فکر ان کی ساری توجہ تاریخ گوئی ہی پر مرکوز رہی۔ یہی وجہ ہے اس بحر سے انہوں نے ایسے ایسے گہر آبدار چن کر نکالے جنکی آب و تاب آج بھی نگاہوں کو خیرہ کئے ہے۔ ان نایاب تاریخوں میں ادبی رکھ رکھاؤ بھی ہے، برجستگی بھی ہے، آمد بھی ہے اور ادبی شان بھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ حیدرآباد کے بیشتر اہل ذوق عارف ابوالعلائی کی نکالی ہوئی تاریخوں "عثمانیہ عدالت العالیہ" بن گئی باغ عام کی مسجد" سے تو واقف ہیں ان پر سر دھنتے ہیں لیکن ان کے نام سے واقف نہیں۔ اس میں شک نہیں عارف ابوالعلائی اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ تاریخوں کی قدر دانی بھی ہوئی اور انعام و صلہ کی مستحق بھی قرار پائیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انہیں بحیثیت منفرد تاریخ گو شاعر جو مقام ملنا چاہیئے تھا وہ نہیں ملا۔ اس میں جناب عارف کی کم آمیزی، گوشہ نشینی اور عزلت پسندی اور بے نیازی کا بھی بڑا دخل ہے۔

جناب حامد لطیف قادری لائق تحسین و قابل مبارکباد ہیں کہ انکی ذاتی دلچسپی، محنت، لگن اور ادبی ذوق کے سبب یہ تصنیف ایک جامع مجموعہ کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے اور ان کا تاریخی کلام یکجا ہوکر محفوظ ہوگیا ہے۔ اردو ادب میں ایک [illegible] اضافہ ہے۔ ارباب سخن کیلئے [illegible]